DUE DATE

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین بی اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۶/

جلد (۷) بابت فروری ۱۹۴۴ء شمارہ (۲)

ضروری اطلاع

نیا سال شروع ہو چکا ہے جن خریدار اصحاب نے اب تک چندہ ادا نہیں فرمایا وہ براہ کرم اپنا چندہ تقسیم کنندۂ سب رس سے دفتر ہذا کی مطبوعہ رسید حاصل فرما کر عنایت کردیں یا بذریعہ منی آرڈر روانہ فرماویں۔

اضلاع کے اصحاب بھی اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجکر شکریہ کا موقع عطا فرمائیں یا دفتر ہذا کو وی پی کرنے کا آرڈر روانہ کریں۔

جن خریدار اصحاب کے نام رسالہ وی پی سے بھیجا جا رہا ہے ان کی علم دوستی سے توقع ہے کہ وہ ضرور وی پی حاصل فرما کر اپنی اردو نوازی کا ثبوت دیں گے۔ رسالہ ہر ماہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملے تو براہ کرم ۲۰ تاریخ تک دفتر ہذا کو مطلع فرمادیں۔ مہینہ گزر جانے پر اطلاع دینے سے تعمیل ارشاد میں مجبوری ہے۔ کیونکہ مہینے کے ختم پر رسالے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

خواجہ حمید الدین بی اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

غزل

از

جنرل ڈاکٹر والاشان حضرت نواب معظم جاہ بہادر شجیعؔ

وہ کبھی اپنے مقابل نہیں ہونے پاتے
دل میں رہتے ہیں مگر دل نہیں ہونے پاتے

جن کو تقدیر تری راہ پہ لے آتی ہے
پھر وہ آسودۂ منزل نہیں ہونے پاتے

جانے کیا بات ہے اکثر مرے جذباتِ الم
میری فریاد میں شامل نہیں ہونے پاتے

سب پہ یکساں نہیں قاتل کی توجہ یعنی
وہ تڑپتے ہیں جو بسمل نہیں ہونے پاتے

کچھ سمجھ کر مجھے محفل میں بلا لیتے ہیں
جب وہ بیگانۂ محفل نہیں ہونے پاتے

شدتِ درد تری یاد دلاتی ہے ہمیں
ہم کبھی درد سے غافل نہیں ہونے پاتے

مرنے والوں کو محبت میں جلا دیتے ہیں
ان کے انداز جو قاتل نہیں ہونے پاتے

ہر قدم پر تری آواز سی آجاتی ہے
مرحلے عشق کے مشکل نہیں ہونے پاتے

وہ ابھی شوق کی منزل میں نہیں پھر بھی شجیعؔ
نگہۂ شوق سے غافل نہیں ہونے پاتے

حضرت والا شان ڈاکٹر شہزادہ معظم جاہ بہادر "شجیع"

اداریہ

اگلے صفحوں میں ہم نے جو کلام شایع کیا ہے وہ نشرگاہ حیدرآباد کے ایک خاص مشاعرے میں ۱۲؍ بہمن ۱۳۵۳ف کو نشر ہوا تھا۔

اس نشری مشاعرے کی سب سے زیادہ ممتاز اور قابلِ فخر خصوصیت یہ تھی کہ اسے ڈاکٹر والاشان حضرت شہزادہ معظم جاہ بہادر بالقابہ کے کلامِ معجز نظام سے شروع کرنے کی عزت حاصل کی گئی۔ اب خدا کے فضل سے یہ سعادت سب رس کو حاصل ہو رہی ہے کہ وہ صاحبزادہ ممدوح الشان کے نشر شدہ کلام کو شایع کرے۔

حیدرآباد کے اس نشری مشاعرے میں اکثر مقامی سربرآوردہ شعرا نے حصہ لیا جن میں نواب شہید یار جنگ بہادر شہید، حضرت علی اختر، جناب محمد فضل الرحمن، صاحبزادہ میکش، جناب مخدوم محی الدین، جناب صمد رضوی ساز اور جناب حسرت نزہی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ملک کے نوجوان شعرا نے بھی اپنا کلام سنایا۔

عام طور سے نشری مشاعرے میں سننے والوں کو مدعو نہیں کیا جاتا، اگلے صفحوں میں آپ جس نشری مشاعرہ کا لطف اٹھانے والے ہیں اس میں بحیثیت سامع شریک ہونے کیلئے صاحبان ذوق مدعو کئے گئے تھے جن میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ بھی شامل تھے۔

نشرگاہ حیدرآباد کے اکثر سننے والوں نے جو سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اس مشاعرے کی نظموں کے مسودات مانگے تھے۔ چونکہ ان سب کے پاس مسودات کی نقلیں بھجوانا آسان کام نہیں تھا اس لئے ارباب نشرگاہ کی خواہش پر ہم اسے شایع کر رہے ہیں۔ سب رس کے ناظرین میں سے اگر کسی صاحب نظر کو ان نظموں کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو وہ راست مہتمم صاحب نشرگاہ حیدرآباد سے مراسلت فرما سکتے ہیں۔

ادارہ

شالامار

ہمیں مطلوب سیر باغ نہیں
دل میں جا باقی بہر داغ نہیں

کون کہتا ہے شالامار ہے تو
عہدِ ماضی کی یادگار ہے تو

تری ہر جا پہ داستانیں ہیں
جتنے منہ اتنی ہی زبانیں ہیں

غم سے اب غیر حال ہے تیرا
سبزہ بھی پائمال ہے تیرا

تیرے پھولوں کا رنگ باسی ہے
تیرے سبزہ پہ بھی اُداسی ہے

صاف رنگِ خزاں بہار میں ہے
شور نوحے کا آبشار میں ہے

باعثِ ننگِ کاشمیر ہیں پھول
لٹ گیا سارا زر فقیر ہیں پھول

یاد آتے ہیں پہلے نظارے
رو رہے ہیں تمام فوارے

لبِ فوارہ پر سخن جاری
سر بلندی میں ہے نگوں ساری

یوں کبھی تھے ترے گلاب کے پھول
جیسے سینہ پہ ہوں شباب کے پھول

رنگ اب وہ نہیں وہ آب نہیں
اک کتابِ الم گلاب نہیں

سبز ہیں یا کہ زرد ہیں پتے
صاف تصویرِ درد ہیں پتے

آتشِ غم میں جلتے ہیں پتے
کفِ افسوس ملتے ہیں پتے

غم کی تصویر ہیں شکستہ ہیں
جتنی کلیاں ہیں دل گرفتہ ہیں

چار سو جو گلوں کے تھالے ہیں
باغباں کے جگر کے چھالے ہیں

حالِ گلشن ہے اب تو آئینہ
پھٹ گیا غم سے کوہ کا سینہ

ہیں وہ روتے صفیں سفیدوں کی
یا قطاریں ستم رسیدوں کی

کیا گھنی چھاؤں ہے چناروں کی
یہی بستی ہے غم کے ماروں کی

دلِ مجروح کو تسلی ہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں

کوئی آخر کہاں تلک چھانٹے
ہیں گلوں میں ہزارہا کانٹے

ایک حسرت سی آج پھیلی ہے
چاندنی بھی تو میلی میلی ہے

شخص ہر ایک بے قرار سا ہے
پتے پتے میں اضطرار سا ہے

ذکرِ سبزہ سے اب تو افسانہ
تھا جو اپنا بھی ہے وہ بیگانہ

ٹھکانے اک جا بھی یہ نہیں پایا
لوٹتا ہے زمیں پہ سایا

کیا اثر ہو چلا ہے آہوں میں
چھا گیا ہے دھواں نگاہوں میں

چھائی تاریکی ہے سفیدوں پر
پانی اب پھر گیا امیدوں پر

چشم نرگس کی اُف رے حیرانی
ہو گیا خشک آنکھوں کا پانی

دولت دید کھو چکی نرگس
اپنی آنکھوں کو رو چکی نرگس

کس کے ماتم کا ہائے ساماں ہے
زلف سنبل کی جو پریشاں ہے

غم فرقت سے زار و محزوں ہے
پیکر عشق بید مجنوں ہے

غم ہر اک سے فزوں چنار کا ہے
یہ تو پروردہ ہی بہار کا ہے

کب تک آخر مصیبتیں جھیلیں
گلے مل مل کے روتی ہیں بیلیں

کون پرساں ہے غم کے ماروں کا
دل دھڑکتا ہے آبشاروں کا

ہل رہا ہے ہوا سے یوں گل درد
دل میں جیسے کسی کے ہوتا ہے درد

اب کہاں گل عذار جھولوں پر
پڑ گئی اوس تیرے پھولوں پر

بجھ گیا عہد مغلیہ کا چراغ
لالہ کے دل میں آج تک ہے داغ

گل صد برگ کا ہر ایک ورق
بے ثباتی کا دے رہا ہے سبق

کیا ہری دوب ہے کناروں پر
چادریں سبز ہیں مزاروں پر

بلبلوں کے لباس ہیں کالے
قمریوں کے اداس ہیں نالے

چلتی کس زور سے ہوائیں ہیں
انا للہ کی صدائیں ہیں

سرو کو دیکھ کر قرینے سے
آہ نکلی زمیں کے سینے سے

قمقمے ہیں جو ضو فشانی میں
آگ روشن ہے آج پانی میں

کون کہتا ہے شالامار ہے تو
دور اسلام کا مزار ہے تو

وہ تزک ہے نہ احتشام ہے اب
خاص جو تھا وہ باغ عام ہے اب

سب چلے آ رہے ہیں روکے انہیں
کوئی درباں نہیں جو ٹوکے انہیں

کیا عبرت فزا یہ منظر ہے
اب جہانگیر ہے نہ اکبر ہے

ہائے کیا عہد تھا جہانگیری
اب وہ کشمیر ہے نہ کشمیری

ہائے تفریح گاہ شاہ جہاں
اب وہ تفریح کرنے والے کہاں

آئے جہانگیر کی تفریح گاہ
پھر گئی تجھ سے آسماں کی نگاہ

مور چلاتے ہیں تباہی پر　　چغد بیٹھے ہیں قصرِ شاہی پر
تھیں جبینیں جہاں زمینوں پر　　خاک اڑتی ہے شہ نشینوں پر
اب جہانگیر ہے نہ نور جہاں　　سچ ہے یہ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان
مجھ کو غافل کہو نہ دیوانہ　　باغ میری نظر میں ویرانہ
ذکر رہ جائے گا فسانوں میں　　میں بھی ہوں تیرے نوحہ خوانوں میں
نظم یہ مرثیہ نہ ہو جائے　　باغ ماتم سرا نہ ہو جائے

آئے تھے رنج سہہ کے جاتے ہیں
پھر نہ آئیں گے کہہ کے جاتے ہیں

شہید یار جنگ بہادر شہید

رنگین خیالات

جب ظلم کے بادل چھاتے ہیں
اور غم کا سماں دکھلاتے ہیں
جس وقت اندھیری دنیا پر
لعنت کے پرے منڈلاتے ہیں

(۲)

چلتے ہیں ستم کے تیز آرے
چھٹتے ہیں لہو کے فوارے
بیدادِ فلک کے خنجر جب
سنسار کا دل تڑپاتے ہیں

(۳)

جب آگ کی بارش ہوتی ہے
جب موت سے سازش ہوتی ہے
دھرتی کے اکھاڑے میں انساں
شیطان صفت بن جاتے ہیں

(۴)

نومیدی کی آخر سرحد سے
ملتے ہیں نشاں امیدوں کے
اس وقت اندھیری دنیا میں
رنگین خیالات آتے ہیں

(۵)

رنگین خیالات آتے ہیں
اور خلق کا دل بہلاتے ہیں
چاہت کا سندیسا پہنچا کر
راحت کے ترانے گاتے ہیں

(۶)

پھر امن کے سپنے دکھلا کر
سکھ چین کی سندر بنسی پر
تقدیر کی ماری دنیا سے
من موہن گت بجواتے ہیں

(۷)

آزادی کا ہونٹوں پر نغمہ
خوش حالی کا کانوں میں مژدہ
جو راگ بھی دل کو گرمائیں
وہ راگ الاپے جاتے ہیں

(۸)

جب ظلم کے بادل چھاتے ہیں
اور غم کے سماں دکھلاتے ہیں
اس وقت اندھیری دنیا میں
رنگین خیالات آتے ہیں

محمد فضل الرحمٰن

حیاتِ ناتمام

جو مرکزِ تلاش ہے وہ دور ہے مقام ابھی

قدم قدم پہ ہر طرف بچھے ہوئے ہیں دام ابھی رکی رکی سی ہے یہاں ہوائے تیز گام ابھی
کھلے نہیں ہیں دہر پر بہار کے مقام ابھی نہاں ہے بطنِ خاک میں تجلیٔ دوام ابھی

نہیں ہے منزل آشنا حیاتِ ناتمام ابھی

نہ جانے کن حقیقتوں پہ زندگی کو ناز ہے نہ سطح سے ہے باخبر نہ آشنائے راز ہے
نہ حسن کی لطافتیں نہ دل میں سوز و ساز ہے نہ راحتوں سے آگہی نہ غم کا امتیاز ہے

نظر نظر ہے خام ابھی نظر نظر ہے خام ابھی

سرورِ علم و عقل ہے نہ بیخودی کی لذتیں کثافتوں میں غرق ہیں بہار کی لطافتیں
بجھے ہوئے سے ولولے گری ہوئی سی ہمتیں فضائے آب و خاک میں برس رہی ہیں ظلمتیں

پڑا ہے روئے صبح پر وہی نقابِ شام ابھی

ہوئی نہ جاوداں تو پھر حیات کا مقام کیا یہ رقصِ ماہ و مہر کیا یہ ربطِ صبح و شام کیا
یہ بزمِ کائنات کیا یہ حسنِ اہتمام کیا بقدرِ تشنگی نہ ہو اگر تو دورِ جام کیا

بہت ہیں نامراد ابھی بہت ہیں تشنہ کام ابھی

جمی ہوئی ہے ہر نظر فریبِ نوبہار پر جھلک رہی ہیں عبرتیں جبینِ اعتبار پر
یقین جلوہ ہے یہاں حجابِ آشکار پر گماں ہے موجِ نور کا فضا کے اس غبار پر

جو راز ہیں حجاب میں ہوئے نہیں وہ عام ابھی

بساطِ عجز پہ ہے پھر غرورِ عقل حکمراں　　دیارِ زندگی میں ہیں ہوس کی شہریاریاں
لرز رہی ہے عرصۂ یقیں میں ظلمتِ گماں　　امنڈ رہی ہیں بدلیاں اجڑ رہے ہیں آشیاں
گرا رہے ہیں بجلیاں تصوراتِ خام ابھی

وہی ہے بزمِ زندگی وہی فسانۂ کہن　　ہنوز کائنات کی جبیں پہ ہے وہی شکن
وہی کلاہِ فخر ہے وہی ہے اس کا بانکپن　　وہی قضا وہی فسوں وہی صبا وہی چمن
کیا نہیں ہے عشق نے جنوں کا اہتمام ابھی

وہی ہے سطح بینیاں وہی ہیں کم نگاہیاں　　گھری ہوئی سیاہیاں کھلی ہوئی تباہیاں
ہوس کی دلفریبیاں ریا کی بے پناہیاں　　وہی گناہ گاریاں وہی ہیں بے گناہیاں
چلی نہیں حقیقتوں کی تیغِ بے نیام ابھی

نہ علم خود شناس ہے نہ عشق کامیاب ہے　　یہ موت اور یہ زندگی سوالِ بے جواب ہے
نہ لذتِ سکوں ابھی نہ لطفِ اضطراب ہے　　ادھر فریب وہم ہے ادھر فسونِ خواب ہے
ہوئی نہیں ہے گرمِ رقص موجِ خوش خرام ابھی

یہ اہتمامِ آب و گل یہ دورِ ماہ و آفتاب　　مگر یہ کھیل تو نہیں بہ قدرِ شوخیِ شباب
یہ جاگتوں کی انجمن ہے یا کوئی مقامِ خواب　　ادھر ہے مطرب و رباب ادھر ہے ساقی و شراب
ہوائے رقص و رنگ کا زمانہ ہے غلام ابھی

فضا میں اب بھی اڑ رہا ہے موت کا سیہ علم　　ہوا میں اب بھی کانپتا ہے ماتموں کا زیر و بم
رہِ جنون و عقل کے ابھی وہی ہیں پیچ و خم　　مئے طرب کی آڑ میں چھلک رہا ہے زہرِ غم
حریفِ عقل و دل ہے جو وہی تو ہے نظام ابھی

مگر قریب ہے سحر گزر رہی ہے شامِ غم　　زمانۂ خود آزما تمام کر چکا ستم
گلوں میں زندگی سی ہے صبا ہے محوِ رقص و رم　　نکل رہے ہیں گیسوئے حیاتِ نو کے پیچ و خم
اٹھو کہ ابتداء ہے یہ یہاں بہت ہیں کام ابھی

علی اختر

بنگال

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگرس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم
(ترجیع)

وہ در ہندوستاں وہ سحر و نغمہ کا دیار
دیدنی ہے آج اس کی ناتوانی کی بہار
بھوک کا بیماریوں کا بم کے گولوں کا شکار
پیٹھ میں جاپان کا خنجر تو سر پر سود خوار

ایک ہو کر........ (ترجیع)

قبر کے روزن سے اپنا سر نکالا موت نے
بے سہارا جان کر مارا ہے بھالا موت نے
خاندانوں کو بنا ڈالا نوالا موت نے
شیر خواروں کو چبا کر تھوک ڈالا موت نے

ایک ہو کر.......... (ترجیع)

امت مرحوم ہو یا ملت زنار دار
ان کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد و زن شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار
آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ بچوں کی پکار

ایک ہو کر......... (ترجیع)

آج اپنا گھر عدو کی رہ گزر ہی کیوں نہ ہو
ہم بڑھے جائیں گے رستہ پُر خطر ہی کیوں نہ ہو
ہم لڑے جائیں گے دشمن بد گہر ہی کیوں نہ ہو
اپنی وادی خاک و خوں میں تر بتر ہی کیوں نہ ہو

ایک ہو کر.......... (ترجیع)

مخدوم محی الدین

شامِ صحرا

جنگل کی سنسان فضا میں شام کی دیوی آتی ہے
دشت و جبل پر اک ناگن سی تاریکی بل کھاتی ہے

گہرے اودے ابر کے سائے کھیل رہے ہیں کھیتوں میں
جیسے تخیل کی رنگینی ذہنوں میں لہراتی ہے

ایک طرب انگیز مسرت سرد ہوا میں آوارہ
پتی پتی ڈالی ڈالی کھوئی کھوئی جاتی ہے

اک سیلِ پیکر ندی گلپاش شفق کی بارش میں
بنسی بجانے والے چرواہے کی دُھن میں گاتی ہے

جیسے یادِ محبت کی موہوم تصور بن جائیں
یونہی فضاؤں پر اک مردہ حسرت سی منڈلاتی ہے

ایک مکمل بیہوشی سی قلبِ صحرا پر طاری
ایک الم انگیز سکوں میں ڈوبی ڈوبی جاتی ہے

فطرت نے اپنی دولت تقسیم جہاں میں یکساں کی
یہ تفریق ما و تو ایجاد ہے عقلِ انساں کی

(۲)

بولتا ہے املی بن میں مفلس دہقانوں کی اک وادی
یعنی تمدن کی لعنت تہذیب کی خانہ بربادی

جھوپڑیاں خس پوش دھوئیں میں لپٹی ہوئی دولت انکی
جن کے خون پسینے سے رنگیں شہروں کی آبادی

دنیا کے ٹھکرائے ہوئے ارمان و تمنا کیا جانیں
بھوکے ننگے جی لیتے ہیں ہے یہی ان کی آزادی

ذہن میں صدیوں کی تاریکی خون میں پشتوں کی نکبت
ان کے تصور میں بھی نہ آئی موجِ احساسِ شادی

کچلے ہوئے جذبات ہیں مردہ روحیں دل زندہ لاشیں
جن کا شعورِ زیست مسلسل محنت اور پھر بربادی

بھوک جہالت غربت پستی کب تک ان پر چھائے گی
شام و سحر کی رنگینی کب تک ان کو بھلائے گی

کب تک رکھے گی پوشیدہ فطرت کوہ و صحرا میں
وہ بجلی جو قصرِ امارت کی بنیادیں ڈھائے گی

سورج ڈوبا خونیں تارے کھیتوں پر تھراتے ہیں
طوفانوں کی آمد کے آثار سے پائے جاتے ہیں

صمد رضوی ساد

رُباعیاں

سناٹے نے راتوں کو جگایا مجھ کو — رستہ مہ و انجم نے دکھایا مجھ کو
چلنے کا تو حوصلہ نہ تھا قدموں میں — منزل کے خیال نے چلایا مجھ کو

چٹکی میں گریباں کا کنارا لے کر — آنکھوں میں محبت کا اشارا لے کر
رونے کا سلیقہ کوئی ان سے سیکھے — روتے ہیں تبسم کا سہارا لے کر

ترسا کے بہت دیر پلایا اس نے — روٹھے ہوئے میکش کو منایا اس نے
توبہ کے لئے کھول رہا تھا میں زباں — ساغر مرے ہونٹوں سے لگایا اس نے

غزل

دل اور فرصتِ غمِ ہستی شباب میں — جیسے کسی کی چھاؤں نظر آئے خواب میں
رہ رہ کے دیکھنا وہ کسی کا حجاب میں — جلوے سمٹ کے رہ گئے بندِ نقاب میں
فکرِ حیات فکرِ اجل فکرِ دو جہاں — ہلکی سی دھڑکنیں ہیں یہ دل کی شتاب میں
یا ان کی برق پاش نگاہوں کا ہے اثر — یا بجلیاں ملائی گئی ہیں شراب میں
سورج نے اپنی پہلی کرن میں سلا لیا — شبنم ابھی تو جاگ رہی تھی گلاب میں

میکش طلوعِ مہر سے لے نذرِ اولیں
کچھ رہ گئی ہے رات کی جامِ شراب میں

صاحبزادہ میکش

ساقی

پی کے بہکوں یہ نہیں میری مجال اے ساقی — اپنی مخمور نگاہوں کو سنبھال اے ساقی
یوں اٹھا جام کہ انوارِ سحر پیدا ہوں — یہ شبِ تار یہ آثارِ زوال اے ساقی
نامکمل ہے یہ اندازۂ تقسیمِ شراب — میرے حصے کی بھی تھوڑی سی نکال اے ساقی
عالمِ کیف میں احساسِ فنا کیا معنی — ابدیت ہے گزرگاہِ خیال اے ساقی

جام دے جام کہ سہنا ہے مجھے رنج حیات — ہو نہ جائے کہیں ممکن بھی محال اے ساقی
زحمتِ نطق گوارا نہیں تجھ کو نہ سہی — شدتِ کیف میں بس ایک سوال اے ساقی

(ق)

آج میخانے پہ اغیار کا قبضہ کیوں ہے — آ نہ جائے کہیں رندوں کو جلال اے ساقی
کس نے یہ جرعۂ بے کیف دیا تھا مجھ کو — مٹ گئی لذتِ احساسِ جمال اے ساقی
اب تو یہ سہل پسندی مجھے منظور نہیں — کیا ہوئے میرے مقاماتِ محال اے ساقی
چہرۂ عشق پہ مستی نے ابھارا تھا جنھیں — آج دھندلے ہیں وہ سارے خط و خال اے ساقی
ہوش آیا بھی تو پیغام غلامی لایا — کیا یہی ہے مری مستی کا مآل اے ساقی
متغیر تھا زمانہ مری مدہوشی میں — پستیاں بن گئیں معراج کمال اے ساقی
اپنی بنیاد پہ قائم نہیں تعمیر حیات — تو نے دیکھی ہے یہ تخریب خیال اے ساقی

شاہد صدیقی

شراب و شباب

یہ تیری نظریں یہ نیم خوابی — جیسے کوئی بدمست شرابی
دامِ تمنا گیسوئے مشکیں — جامِ تمنا چشمِ شرابی
باغ بہارِ حسن و جوانی — آنکھ نشیلی رنگ شہابی
صبح بہاراں عارضِ تاباں — لالۂ خنداں حسن گلابی
پیکرِ مستی ساغرِ رنگیں — پاؤں میں لغزش آنکھیں گلابی
شادابیوں پر سارا گلستاں — نکھرے ہوئے گلہائے شبابی
ہر ہر قدم پر تازہ قیامت — ہر ہر قدم پہ خانہ خرابی
حسن مجسم کیف سراپا — جانِ گلستاں روحِ شرابی
آنکھ چرانا دل سے نہ جانا — یہ تیرا پردہ یہ بے حجابی

ذکر ترا "حسرت" کا فسانہ
بادۂ رنگیں جامِ شرابی

حسرت ترمذی

زندگی

زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

وقت کے آہنی انداز سمجھتی ہی نہیں
فکر کی لغزشِ پرواز سمجھتی ہی نہیں
خامشی، لذتِ آواز سمجھتی ہی نہیں
کون ہے مونس و دمساز سمجھتی ہی نہیں
ایک مظلوم عقیدت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

چشم مجروحِ نظارہ ہے، نظر خوابیدہ
آہ، محرومِ اثر، ذوقِ اثر خوابیدہ
روح محبوس، غمِ فتنہ و شر خوابیدہ
عقل مفلوج، دلِ حوصلہ گر خوابیدہ
ایک انجانِ ارادت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

نیتِ شوقِ فراواں سے خبردار نہیں
فطرتِ حسنِ بہاراں سے خبردار نہیں
لعنتِ شورشِ دوراں سے خبردار نہیں
ایک دریا ہے جو طوفاں سے خبردار نہیں
ایک سہمی ہوئی لذت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

لاکھ افلاک پہ چمکا ہی کئے شمس و قمر
لاکھ نظروں میں دمکتے ہی رہے لعل و گہر
لاکھ شبنم سے سنورتے ہی رہے غنچۂ تر
رات کی بالیں پہ روتا ہی رہا نجمِ سحر
ایک محسوس حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

قہقہے، انجمنِ ناز میں مہ پاروں کے
زمزمے پہلوئے ناہید میں سیاروں کے
چہچہے فطرتِ فیاض کے شہ کاروں کے
ولولے عہدِ جوانی کے جگر داروں کے
ایک بیباک ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

خونِ خورشید سے رنگین سایہ دامنِ شام
یہ دہکتے ہوئے گلشن یہ سلگتے در و بام
یہ بعنوانِ بغاوت، کسی ساقی سے کلام
یہ دمکتے ہوئے چہرے یہ چھلکتے ہوئے جام

ایک مجبور جسارت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

جس جگہ زہرہ وہاں ساغرِ سرشار بھی ہے — امن ساحل بھی ہے طوفان جفاکار بھی ہے
صبح پُر نور کے ہمراہ شبِ تار بھی ہے — اور یہی صاحبِ کونین کا شہکار بھی ہے

یعنی سب کچھ کسی طاقت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

نظرؔ حیدرآبادی

غزل

آئیں کیوں ہچکیاں نہیں معلوم — کون ہے مہرباں نہیں معلوم
خود بخود جھک گئی جبینِ شوق — کس کا تھا آستاں نہیں معلوم
جا رہا ہوں خزاں میں سوئے چمن — کیا کروں گا وہاں نہیں معلوم
جا رہا ہوں غبار کے پیچھے — ہے کہاں کارواں نہیں معلوم
سن کے کہتے ہیں میرا قصۂ غم — کس کی ہے داستاں نہیں معلوم
ساکنِ عرش تھا کبھی میں بھی — کیوں پھر آیا یہاں نہیں معلوم
بے خودی میں بڑھا رہا ہوں قدم — جا رہا ہوں کہاں نہیں معلوم
یاد ہے آنا برق چمکی تھی — کیا ہوا آشیاں نہیں معلوم

کہتے کہتے فسانۂ غم کا سعیدؔ
رک گئی کیوں زباں نہیں معلوم

عابد علی سعیدؔ شہیدی

غزل

حسن کی جھلکیاں دکھائے جا — ہاں مرے دل کو آزمائے جا
یہ بھی احسان کم نہیں تیرا — عمر بھر یونہی دل دکھائے جا
نگہ التفات کے صدقے — خلشِ زندگی بڑھائے جا
مہربانی تری فریب سہی — دل یہ کہتا ہے آزمائے جا

مڑ نہ سکنے کا نام جینا ہے　　ہمتِ زندگی اٹھائے جا
دیکھتا کیا ہے اب نشیب و فراز　　اور آگے قدم بڑھائے جا
وضعداری تو ہے یہی "خسرو"
چوٹ کھا کھا کے مسکرائے جا

امیر احمد خسرو

یاد

شبِ ماہ عالم پہ چھائی ہوئی سی　　وہ دل کی کلی مسکرائی ہوئی سی
وہ چپ چاپ دریا وہ سنسان گلشن　　خموشی وہ عالم پہ چھائی ہوئی سی
وہ کچھ دور پر کوئی آتا ہوا سا　　شکن چاندنی میں اک آئی ہوئی سی
وہ مستانہ مستانہ رفتار اس کی　　قیامت ہر اک گام آئی ہوئی سی
قریب آتے آتے وہ نازک خرامی　　وہ کچھ کچھ ہنسی لب پہ آئی ہوئی سی
امنڈتی ہوئی کالی کالی گھٹائیں　　وہ زلفِ رسا پیچ کھائی ہوئی سی
جبیں پہ طلوعِ سحر کا سا عالم　　فضا نور سے جگمگائی ہوئی سی
وہ مخمور نظریں وہ اک کیفِ مستی　　جوانی دو عالم پہ چھائی ہوئی سی
جھلکتی ہوئی وہ پسینہ کی بوندیں　　وہ ماتھے پہ افشاں جمائی ہوئی سی
وہ خاموشیوں میں تکلم کا عالم　　مرے دل تک آواز آئی ہوئی سی
وہ بیگانہ بیگانہ اس کی ادائیں　　مگر ہر ادا آزمائی ہوئی سی
وہ چہرہ پہ سنجیدگی کا سا عالم　　طبیعت مگر گدگدائی ہوئی سی
وہ کچھ اجنبی اجنبی سی نگاہیں　　مگر ہر نگہ دل تک آئی ہوئی سی
رگ و پے میں کیفیتِ عشق و مستی　　سموئی ہوئی سی سمائی ہوئی سی
مرے دل سے لے کر نگاہوں تک اکی　　محبت کی دنیا بسائی ہوئی سی
محبت کی دونوں طرف آگ دل میں　　بھڑکتی ہوئی سی بجھائی ہوئی سی
وہ میری تمنائے عرضِ محبت　　بر آنے سے پہلے بر آئی ہوئی سی
وہ کچھ بھولے بھولے سے غم کے فسانے　　حقیقت پر اک یاد آئی ہوئی سی

جوانی کی سرشاریاں اللہ اللہ وہ آنکھوں میں کچھ نیند آئی ہوئی سی
برستی ہے ظالم نہ کھلتی ہے سالک
یہ بدلی نگاہوں پہ چھائی ہوئی سی

علی حسین نقوی سالک

جوانی

خودی کی تیغ جوہر دار چمکانے کے دن آئے
یقیں کا پرچم انوار لہرانے کے دن آئے
نئی صبحیں، نئی راتیں، نئے جلوے، نئی دنیا
حیات نو کے نغمے جھوم کر گانے کے دن آئے
فروغ آرزو، یہ ولولے، یہ عزم بے پایاں
تمناؤں کے رنگیں جام چھلکانے کے دن آئے
مذاق زندگی بدلا نظر ہے اوج گردوں پر
ستاروں کی حسیں محفل میں کھو جانے کے دن آئے
نشاط و کیف کی امواج ہیں رقصاں رگ جاں میں
شعاع مہر کی مانند اٹھلانے کے دن آئے
کہاں ساقی، کدھر کا میکدہ، جام و سبو کیسا
بلا صہبا و ساغر مست ہو جانے کے دن آئے
حدود بزم گیتی سے نگاہوں کی ہے زد آگے
فضائے دو جہاں پر یعنی چھا جانے کے دن آئے
نہ فکر بیش و کم ہے اور نہ جبر و قدر کی پروا
شراب شوق پی کر ناز فرمانے کے دن آئے
ستاروں کو، فضاؤں کو، ہواؤں کو زمانے کو
تڑپ کر موج کی مانند تڑپانے کے دن آئے
فضائے دل پہ ہے چھایا ہوا احساس آزادی
رہ ہستی میں ہر بندش کو ٹھکرانے کے دن آئے

محمد علی نیر

غزل

آزما اور آزمائے جا
خوب مشق ستم بڑھائے جا
ہر قدم ہو نگاہ سے آگے
اس ادا سے قدم بڑھائے جا
زندگانی ہے اضطراب دوام
برق بن اور تلملائے جا
شب غم اتنی مختصر تو نہیں
چاند سے کہہ دو جھلملائے جا
مل ہی جائے گا وہ کبھی افضل
جستجو کر پتہ لگائے جا

افضل حسین افضل

فانی کے نقاد

نواب عزیز یار جنگ بہادر نے فانی بدایونی مرحوم کے دیوان اول (باقیاتِ فانی) پر مرحوم کی زندگی میں کئی سو اعتراضات فراز بصورت کتاب (نقدِ سخن) شائع فرمائے تھے۔ فانی کی حیات میں اور مرنے کے بعد دوسرے نقادوں نے بھی کلامِ فانی پر بہت سے اعتراض کئے ہیں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی (پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی) نے رسالہ ساقی دہلی میں کئی مہینے اعتراضات کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ پھر اب علی گڑھ میگزین کے فانی نمبر میں جناب سیماب اکبرآبادی نے دو سو سے زیادہ اشعار پر زبان و محاورہ، اسلوب بیان، عروض، مضمون و مفہوم کے متعلق اعتراضات کئے ہیں جن میں سے بعض میں نواب صاحب سے توارد ہو گیا ہے۔ بعض اشعار پر سیماب اکبرآبادی صاحب اور نواب صاحب کے اعتراضات بالکل الگ الگ ہیں۔ یعنی جو پہلو سیماب صاحب نے قابلِ اعتراض سمجھا ہے، وہ نواب صاحب کے نزدیک محلِ نظر نہیں ہے۔ بلکہ اسی شعر میں کوئی دوسری بات قابلِ گرفت ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر شادانی کے بعض اعتراضات نواب صاحب سے متوارد ہیں۔ میں بعض اعتراضات پر نظر ڈالتا ہوں اور نواب صاحب کی تنقیدات نقل کر کے اپنی رائے عرض کرتا ہوں۔

(۱)
کچھ اس طرح تڑپ کر میں بے قرار رویا
دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رویا

نواب عزیز یار جنگ بہادر کی تنقید ہے :-

"من بیقرار" کا ترجمہ میں بیقرار" صحیح نہیں۔ اس لئے کہ فارسی ترکیب میں لفظ "من" مضاف واقع ہوا ہے۔

"میں بیقرار رویا" کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ "میں بیقرار ہو کر رویا"۔ جس طرح "بے اختیار رویا" میں (ہو کر) روزمرہ میں ترک کر دیا گیا ہے۔ لیکن مصرع کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ فانی نے (من بیقرار) کے مفہوم میں (میں بیقرار) باندھا ہے۔ اس لئے محلِ نظر ہو سکتا ہے۔

(۲)
آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں
دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

"دونوں مصرعوں میں زمانہ کا تطابق الفاظ سے صحیح نہیں ہے ردیف "رویا" کی بجائے "روتا ہے" چاہیے۔

اسی شعر پر سیماب صاحب نے بھی یہی اعتراض کیا ہے۔ لیکن یہ اختلافِ زمانہ اساتذۂ قدیم کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً فصیح الملک مرزا داغ دہلوی فرماتے ہیں۔

خط میں لکھا ہے جو حالِ دلِ مضطر اپنا
واں بھٹکتا ہی پھرا ہائے کبوتر اپنا

اگر تطابق زمانہ ضروری ہوتا تو حضرت داغ یا پہلے مصرع میں (لکھا تھا) لکھتے یا دوسرے مصرع میں (بھٹکتا ہی پھرتا ہے) بالکل یہی افعال اور یہی زمانے فانی کے شعر میں ہیں۔

(۳)
کیا اس کو بیقراری یاد آ گئی ہماری
مل مل کے بجلیوں سے ابرِ بہار رویا

"دونوں مصرعوں میں ربط نہیں ہے۔ چونکہ پہلے مصرع میں "کیا" حرفِ استفہام ہے اس لئے دوسرے مصرع میں "مل مل" کی بجائے "کیوں مل" ہونا چاہیے۔

اگر (کیوں مل کے) ہوتا تو بلا شبہ درست تھا اور دونوں مصرعوں میں حروفِ استفہام سے حسنِ نظم پیدا ہو جاتا۔ لیکن ربط نہ ہونے کا اعتراض موجودہ مصرعہ پر بھی نہیں ہو سکتا۔ مضمون و اسلوب صحیح ہے اور ربط صاف نظر آتا ہے۔ مضمون میں پہلے مصرع سے پہلے لفظ (جو) یا (کہ)

محذوف ہے۔ یہ تقدیر زبان میں جائز ہے۔ اس خلا کو ذہن بھر لیتا ہے۔ بلکہ تکرار کے ساتھ (ل ل) نے جو بیقراری کا مفہوم پیدا کر دیا وہ حسن مضمون میں اضافہ کر رہا ہے۔

آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں
(۴)
یہ جانتا ہوں دل اِدھر آیا اُدھر گیا

اس شعر پر نواب صاحب کا اعتراض عجیب ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اس شعر میں دل کا آنا کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟
اگر لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے "آنا جانا" تو عاشق کا دل گیند بال ٹھیرا یعنی "ادھر آیا ادھر گیا"۔
مگر "دل آنا" مجازاً عاشق ہونا کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو جب بھی ادھر آیا ادھر گیا سے کیا مراد ہے؟"

نواب صاحب نے تامل نہیں فرمایا ورنہ اس اعتراض کا محل نہ تھا۔ دل کا آنا اور جانا دونوں مجازی معنوں ہی میں استعمال ہو سکتے ہیں اور فانی نے بھی دوسرے مصرع میں مجازاً ہی لکھے ہیں۔ یہاں لغوی معنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن پہلے مصرع میں بطور صنعت قول بالموجب کے لغوی معنوں سے لطف بیان پیدا کیا ہے۔ اور بہت دلچسپ شعر نکالا ہے۔ اس طرح کسی محاورہ کے لغوی و مجازی پہلوؤں سے مضمون پیدا کرنا اصل میں متقدمین کا طرز تھا۔ اُن بزرگوں نے لفظوں سے بہت کھیل کھیلے ہیں۔ فانی کا یہ انداز نہیں۔ پھر بھی ان کے کلام میں کہیں کہیں نظر آ جاتا ہے۔

"دل آنا" کی طرح "دل جانا" بھی مجازاً عاشق ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے (میر تقی میر)

لیکن اس محاورے میں دل کا ہاتھ سے جاتا رہنا بھی مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ مرزا داغ کے اس مطلع میں صاف ہے۔

دل گیا۔ تم نے لیا۔ ہم کیا کریں
جانے والی چیز کا غم کیا کریں

یا جیسے مومن خاں دہلوی اس سے بھی زیادہ وضاحت کرتے ہیں۔

کیا لگا دست دل آرام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ (مومن)

آئینہ جلدی سے پٹک دو کہیں
دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا (مومن)

انہی محاوروں کی بنا پر فانی کہتے ہیں کہ یہاں تو یہ حال ہے کہ دل کا آنا اور جانا ایک ہی بات ہے۔ آنے جانے میں کوئی وقفہ نہیں۔ اِدھر آیا اُدھر گیا۔ کہنے کو آتا ہے، لیکن اصل میں جاتا ہی ہے۔ یا یوں سمجھو کہ دل ادھر آیا (عاشق ہوئے) ادھر گیا (پہلو ہاتھ سے، کام سے) اب اگر کوئی پوچھے کہ "دل آیا کہ گیا؟" تو بتاؤ میں کیا جواب دوں۔

شاید کہ شام ہجر کے مارے بھی جی اٹھے
(۵)
صبح بہار حشر کا چہرہ اتر گیا!

"جی اٹھے" یہ الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ "شام ہجر کے مارے" "کشتگان شام ہجر" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن اردو میں اس کے معنی ہیں "وہ لوگ جن کو شام ہجر نے ستایا ہے" جیسے مصیبت کا مارا، مصیبت زدہ کا ترجمہ ہے، کشتۂ مصیبت کا نہیں۔

جیسا میں نے اوپر عرض کیا فانی کبھی کبھی رعایت الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔ اسی غرض سے "جی اٹھے" کے تضاد کی خاطر "شام ہجر کے مارے" لکھ دیا۔ لیکن اس کے معنی "کشتگان شام ہجر" کے نہیں لئے ہیں بلکہ "شام ہجر کے ستائے ہوئے عاشق بھی جی اٹھے"۔ اس لئے کہ جی اٹھنے کے تذکرے کے لئے کشتے یا مردے کا لفظ لانا ضروری نہیں ہے۔ فانی کے مصرع میں

(مارے) اور (جی اٹھے) آنے سے ایہام تضاد کا حسن پیدا ہو گیا ہے۔

مجھے فانی کے اس شعر پر ایک اور اعتراض ہے جو نواب صاحب کے اعتراض سے الگ ہے۔ یعنی دوسرے مصرع میں لفظ "بہار" نے کوئی خاص فائدہ نہیں دیا۔ "صبح حشر" کہنا کافی تھا۔

اس کے بعد کے شعر میں فانی نے (صدقا ترگیا) لکھا ہے۔

اس پر نواب صاحب کا یہ اعتراض درست ہے کہ "صدقا ترجانا" صحیح نہیں۔ "صدقا اترنا" اردو میں مستعمل ہے۔

اب میں "نقد سخن" کے سلسلے کو توڑ کر مختلف اشعار کی تنقید اور اپنی رائے لکھتا ہوں۔ مجھے "نقد سخن" کے اشعار نمبر ۱۰۔۸۔۹ میں بھی نواب صاحب کی تنقید سے اختلاف ہے۔ لیکن ہر شعر پر کیا لکھا جا سکتا ہے۔ آئندہ اشعار کے نمبر اس مضمون کے سلسلے سے ہیں۔

مجھے خبر ہے! ترے تیر بے پناہ کی خیر
(۹) بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں ملتا

نواب صاحب فرماتے ہیں۔

دوسرے مصرع میں الفاظ سبق کے لحاظ سے ردیف "نہیں ملتا" صحیح نہیں۔ یہ مقام "نہیں ملا" کا ہے۔

میری رائے میں (نہیں ملتا) سے تلاش کا جاری ہونا پایا جاتا ہے۔ اس لئے اسی میں زیادہ معنویت ہے۔ یہ مفہوم ہے کہ ہم بہت دنوں سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن نہیں ملتا۔ (نہیں ملا) کی صورت میں صرف یہ معنی ہوں گے کہ "بہت دنوں سے نہیں ملا" اس میں جستجو ئے پیہم و جاری نہ پائی جائے گی۔

فانی کے اس شعر کا مرزا داغ کے مندرجہ ذیل شعر سے توارد دلچسپ ہے۔

ملتا نہیں ہم کو دل گم گشتہ ہمارا
تو نے تو کہیں اے غم جاناں نہیں دیکھا (داغ)

مرزا صاحب کا خطاب "غم جاناں" سے نہایت موزوں اور معنی خیز ہے۔ فانی نے خود محبوب سے پوچھا ہے۔ اس میں کوئی لطف نہ تھا لیکن "ترے تیر بے پناہ کی خیر" کہہ کر اسلوب بیان میں حسن پیدا کر دیا۔

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں
(۷) مجھے یہ ضد کہ غم جاوداں نہیں ملتا

نواب صاحب کا اعتراض ہے کہ غم کے ساتھ ملنا استعمال نہیں ہوتا۔ "غمگین ہونا" کے معنی میں "غم ملنا" بے شک مستعمل نہیں ہے اور غلط ہے لیکن فانی کے شعر میں یہ معنی نہیں ہیں۔ "غم جاوداں نہیں ملتا" کے یہ معنی ہیں کہ "غم جاوداں میسر نہیں ہوتا"۔ اس مفہوم کے لئے ملنا درست ہے۔

تری تلاش کا فی الجملہ حاصل یہ ہے
(۸) کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

نواب صاحب کا ارشاد ہے ——— مصرع ثانی میں "نہیں" کے عوض دونوں جگہ "نہ" چاہیے۔ جیسے "تو نہ یہاں ملتا نہ وہاں ملتا"

یہ اعتراض عجیب ہے۔ نواب صاحب کی تجویز کے مطابق شعر کی عبارت یہ ہوگی ——— "تری تلاش کا حاصل یہ ہے کہ تو نہ یہاں ملتا نہ وہاں ملتا" میری رائے میں یہ صحیح اردو نہیں ہے۔ (حاصل یہ ہے) کی حالت میں اس طرح درست ہو سکتا ہے۔

"تری تلاش کا حاصل یہ ہے کہ تو نہ یہاں ملتا ہے نہ وہاں ملتا ہے"۔

یہی مضمون فانی کے اسلوب کا ہے۔ (نہیں ملتا) سے یہی مطلب ادا ہوتا ہے۔ (نہیں) کے ساتھ (ہے) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور (نہ) کے ساتھ (ہے) لازم ہے۔ ورنہ (نہ یہاں ملتا نہ وہاں ملتا) کے معنی بدل جائیں گے۔ نواب صاحب نے جو دونوں جگہ (نہ) تجویز کیا ہے وہ اس صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ مصرع اول میں (حاصل یہ ہے) کی جگہ

(حاصل یہ ہوتا) رکھ دیا جائے یعنی مضمون اس طرح ہو ــــــ
"تری تلاش کا حاصل یہ ہوتا کہ تو نہ یہاں ملتا نہ وہاں ملتا"

تبا اب اے جرسِ دور میں کدھر جاؤں
(۹) نشانِ گردِ رہِ کارواں نہیں ملتا

نواب صاحب فرماتے ہیں :-

لفظ "دور" چونکہ حلقہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے
اس لئے "جرسِ دور" کے عوض "جرسِ دہر" بہتر ہے۔

اس اعتراض کا سبب یہ ہے کہ نواب صاحب نے لفظ دُور (بواؤ معروف کو دور (بواؤ مجہول) پڑھا ہے۔ اس شعر میں (جرسِ دُور) کے معنی ہیں دور کا جرس، جو زیادہ فاصلے پر پہونچ گیا ہے جس کی دُور سے آواز آ رہی ہے۔ "جرسِ دہر" بے معنی بات ہے۔

چشمِ ساقی اثرِ مے سے نہیں ہے گل رنگ
(۱۰) دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا

"پیمانے کو دل کا مضاف الیہ قرار دینے کی بجائے اگر یوں کہا جاتا کہ پیمانہ میرے دل کے خون سے لبریز ہے تو شعر با معنی اور تشبیہ کامل ہوتی۔"

نواب صاحب کا یہ اعتراض اور یہ اصلاح نہایت استادانہ ہے۔ بلاشبہ شعر و تشبیہ دونوں میں نقص رہ گیا۔ پیمانہ کے لئے دل فرض کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی جب "پیمانہ" سے صرف چشمِ ساقی کو تشبیہ دینی تھی۔ یہ کام نفس پیمانہ بھی کر سکتا تھا۔ "پیمانہ کا دل خون سے لبریز ہونا" نہ تشبیہ کے لئے مفید ہے نہ مفہوم شعر کے لئے "دل کا خون سے لبریز ہونا" غم و اندوہ کی شدت کے لئے مستعمل ہے۔ اس کو تشبیہ و مفہوم دونوں سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ "پیمانے کے دل کا پیر خون سے لبریز ہونا" بے معنی ہے۔ پیمانے کا دل ہو یا انسان کا، وہ کسی کے خون سے لبریز نہیں ہو سکتا۔ مطلق خون سے لبریز ہونا

بطور مجاز کہہ سکتے ہیں۔

اس شعر کے سلسلے میں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ایسے ہی اشعار ہیں جن پر غزل کے مخالفوں اور ردیف و قافیہ سے آشنائی خواہوں کا یہ اعتراض صادق آتا ہے کہ ردیف و قافیہ کی قید سے شاعر کی فکر گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ یہاں ممکن ہے فانی کے ذہن میں وہی مضمون آیا ہو جو نواب صاحب نے بیان فرمایا ہے لیکن (پیمانے کا) ردیف و قافیہ ٹھہرے۔ ان کی پابندی سے مفر نہ تھا۔ اس لئے "پیمانے کا دل" باندھنا پڑا۔

اب اسے دار پہ لے جا کے سلا دے ساقی
(۱۱) یوں بہکنا نہیں اچھا ترے مستانے کا

نواب صاحب کی تنقید ہے :-

"یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دار پر سلانے کی زحمت ساقی کو کیوں دی جا رہی ہے؟ اور "دار پہ سلانا" کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ اگر "سولی دینا" کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو غلط ہے۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اردو میں "دار پر چڑھانا" مستعمل ہے۔"

فانی کے اس شعر پر سیماب صاحب اکبرآبادی کو بھی اعتراض ہے۔ ان کا تبصرہ یہ ہے :-

"پہلے مصرع میں "لیجا کے" برائے بیت ہے۔ اور دار سے ساقی کا کوئی عملی تعلق بھی نہیں۔"

یہ اعتراضات بہت پر لطف ہیں۔ اس لئے کہ نواب صاحب اور سیماب صاحب دونوں مرزا داغ کے شاگرد ہیں اور دونوں کہنہ مشق استاد ہیں۔ سیماب صاحب کو (لیجا کے) برائے بیت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نواب صاحب اس پر اعتراض نہیں کرتے۔ یہاں یہ احتمال کرنا مشکل ہے کہ نواب صاحب کی نظر سے یہ اعتراض رہ گیا۔

انھوں نے بہت غور و فکر کے ساتھ صرف وہی اعتراضات کئے ہیں جو ان کے نزدیک قابل توجہ اور درست تھے۔ میری رائے میں بھی سیماب صاحب کا یہ اعتراض درست نہیں۔ شعر میں متانے کا ذکر ہے۔ مست و بے ہوش کو لیجانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ خود نہیں جاتا۔ اس لئے (لیجا کے) برائے بیت نہیں برائے ضرورت ہے۔

اس کے برعکس (دار پر سلانا) نواب صاحب کے نزدیک غلط ہے، لیکن سیماب صاحب یہ اعتراض نہیں فرماتے۔ وہ بھی اگر درست نہ سمجھتے تو ضرور لکھ دیتے۔ میں بھی یہاں نواب صاحب کی رائے سے متفق نہیں۔ استعارہ اور اسلوب بیان میں بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ زہر کھلا کر یا گلا گھونٹ کر مار ڈالنے کے لئے (سلا دینا) کہتے ہیں۔ شعر میں "دار" اور "بہکنا" اور "متانہ" منصور کو یاد دلا رہے ہیں۔ بہکتے پھرنے والے متانہ کو کہیں لیجا کر سلا دینے کی تجویز بالکل درست ہے۔ فانی کہتے ہیں کہ تیرا متانہ بہکتا پھرتا ہے یہ اچھا نہیں۔ اب اس کو لیجا کر دار پر سلا دے۔ مست و دیوانہ کو سلانے کا بھی مقصد پیدا ہو گیا اور بہکنے والے کو دار پر چڑھانے کا بھی۔

فانی نے دار پر چڑھانے کے لئے "دار پر سلانا" محاورہ اختراع نہیں کیا۔ بلکہ شعر کے مضمون و الفاظ کے لحاظ سے اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے۔ اس پر کسی اعتراض کا موقع نہیں۔

اب ایک اعتراض نواب صاحب اور سیماب صاحب دونوں کا مشترکہ یہ ہے کہ دار سے ساقی کا کیا تعلق ہے؟۔ اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ ظاہر ہے کہ اس شعر میں ساقی اور متانے سے میخانہ کے لوگ مراد نہیں ہیں۔ دونوں لفظ بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں۔ بہکنے سے متانے کا خیال آیا اور متانے سے ساقی کا۔ جب ساقی نہیں، کوئی اور ہے تو اس کا دار سے کل تعلق ہو سکتا ہے اور اس کو دار پر سلانے کی زحمت دی جا سکتی ہے۔ منصور کا تصور کیجئے اور ساقی سے عشق مراد لیجئے۔

(۱۲)
دل سے پہونچی ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشہ سے ملتا تو ہے پیمانے کا

"بہتر تو یہ تھا کہ پیمانے کی مناسبت سے صرف آنکھ کا ذکر ہوتا۔ یا آنکھوں کی مناسبت سے پیمانے کی جمع لائی جاتی"

نواب صاحب کا یہ اعتراض بھی ان کی استادی کا شاہد ہے۔ بہت خوب فرمایا اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ۔

(۱۳)
جاتے ہوئے کھاتے ہو مری جان کی قسمیں
اب جان سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا

"پہلے مصرع کا مطلب تو صاف ہے، لیکن لفظ قسمیں مصرع کے آخر میں واقع ہونے کی وجہ سے جاتے ہوئے کھاتے ہو" میں جو لطف ہے وہ محتاج بیان نہیں"

یہ پہلو بھی نواب صاحب کی نگاہ دور بین نے خوب دیکھا۔ اور بڑے لطف سے بیان فرمایا۔ بلا شبہ ذم کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایسی بندش سے احتراز لازم ہے۔

(۱۴)
کمال ضبط غم عشق، اے معاذ اللہ
کہیں کہیں سے جو یہ ماجرا بیاں ہوتا

"مصرع ثانی میں "جو" کا لفظ مفید معنی نہیں۔ اگر "جو" کی جگہ "تو" کا لفظ ہوتا تو ردیف بامعنی ہو سکتی"

نواب صاحب کا یہ ارشاد قدیم اسلوب بیان کے لحاظ سے بالکل درست ہے۔ دوسرا مصرع مفہوم میں ناتمام ہے۔ اس کے بعد کچھ مقدرات ماننے پڑتے ہیں۔ مثلاً ——— "کہیں کہیں سے جو یہ ماجرا بیان ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا، کیا حشر برپا ہوتا"۔ لیکن (جو) کی جگہ (تو) رکھنے سے فانی کا یہ مضمون پیدا نہ ہوگا۔ بات بدل جائیگی۔

یعنی یہ مفہوم نکلے گا کہ ــــــ "ایسا بھی کیا ضبطِ غم کہ یہ ماجرا بالکل بیان ہی میں نہ آسکا کہیں کہیں سے تو بیان کیا جاتا۔"

طرزِ قدیم یہ نہ تھا کہ بات کو ناتمام چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اب غزلِ جدید اور نئی شاعری میں یہ اسلوب پیدا کیا گیا ہے' اور یہ انگریزی اندازِ بیان کا اثر ہے کہ بات پوری نہیں کی جاتی۔ کچھ حصہ سامع کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس طرزِ کلام کی عادت اور رواجِ عام کے سبب سے سامع کا ذہن کمی کو پورا کر لیتا ہے۔ مثلاً سراج لکھنوی کا یہ شعر دیکھیے :۔

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے ٭ اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

یعنی اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی' لیکن پاؤں ہٹا لیجیے۔ فصحائے قدیم اس طرزِ بیان کو ناکمل کہیں گے۔ اسی بنا پر نواب صاحب نے اعتراض فرمایا ہے۔

(۱۵)

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا

دولتِ دو جہاں نہ دی اک دلِ مبتلا دیا

بحالتِ اضافت "دو جہاں" میں "واو" کو ملفوظ لانا صحیح نہیں۔ "دو" فارسی کا لفظ ہے۔ فارسی میں اور جب اردو میں فارسی ترکیب کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو واؤ معدولہ ہوگا جیسے ع :۔

"آدم دو بارہ سوئے بہشت بریں گیا" (ذوق)

اور جب اردو کی ترکیب میں استعمال ہوتا ہے تو "واؤ" کو ملفوظ لانا ضروری ہے۔ جیسے ع :۔

"سن لیجیے دو بول ہے افسانہ ہمارا" (میر)

علاوہ اس کے مصرعِ اولیٰ میں حرفِ نفی "نہ" کی تقدیم مخلِ فصاحت ہے اور غلط بھی! یہاں "نہیں" چاہیے۔

نواب صاحب کی پوری تنقید نہایت درست و مناسب' ضروری اور مفید ہے۔ کوئی فارسی یا عربی ترکیب اردو میں استعمال کی جائے تو فارسی و عربی زبان کے اصول کے مطابق لینی چاہیے۔ اردو والوں کو اس کے تلفظ یا ساخت میں تصرف کرنے کا حق نہیں مگر اس وقت ایسا تغیر مستند ہو جاتا ہے جب اردو کے اساتذۂ معتبر اس غلطی کو کسی ضرورت سے درست مان لیں اور استعمال کرنے لگیں۔ مثلاً

(۱) دلِ مضطر (بمعنی دلِ بیتاب) چھیڑ کر نشترِ مژگاں سے کہاں جاتے ہو

دیکھتے جاؤ ہمارے دلِ مضطر کے مزے (داغ)

(۲) عرصۂ محشر :۔ اب کیوں نہ کریں نالہ مجھے ڈر تو نہیں ہے

یہ عرصۂ محشر ہے ترا گھر تو نہیں ہے (داغ)

(۳) تکلیف پردہ داری :۔ شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ

تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی (غالب)

(۴) خوشبو (بمعنی بوئے خوش) دیکھو تو اتحاد ذرا حسن و عشق کا

بلبل کے آنسوؤں میں ہے خوشبو گلاب کی (امیر مینائی)

فانی نے شعرِ زیرِ نظر میں "دولتِ دو جہاں" فارسی ترکیب لی ہے لیکن فارسی تلفظ کے خلاف (دو جہاں) میں واؤ ملفوظ نظم کیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ اس طرح لکھنا چاہیے جیسے میر انیس نے لکھا ہے۔

"غل ہے گھوڑے سے امامِ دو جہاں گرتے ہیں"

یہی "دو جہاں" کا لفظ جب بغیر ترکیبِ فارسی آئے تو "واؤ" صاف پڑھا جانا چاہیے۔ مثلاً

دو جہاں سے کھو دیا تیری کمر کی یاد نے

کھولتا ہے کیوں کفن میت مری کا ڈر ہے (راسخ دہلوی)

اسی پر تمام الفاظ :۔ دو عالم' دو گیتی' دو چار' دو چند' دو نیم وغیرہ کو قیاس کرنا چاہیے۔

نواب صاحب کا دوسرا اعتراض بھی بالکل درست ہے کہ "مصرعِ اول میں صحتِ نفی وزن کی تقدیم مخلِ فصاحت ہے اور غلط بھی ہے (نہیں ہوا ہے)۔ یعنی اس طرح ہونا چاہیئے۔

"مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل کیا نہیں دیا"

ماسوائے دل میں اک ہنگامہ برپا کر گیا
(۱۶) چشمِ کافر کا وہ دل لے کر مکرر دیکھنا

نواب صاحب یہ تنقید فرماتے ہیں:۔

"ماسوا" بمعنی "جو سوا ہو" عموماً ان چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ماسوائے ذاتِ باری تعالیٰ ہیں۔ یعنی موجودات، مخلوقات، لیکن اردو میں "سوا" بمعنی "علاوہ" مستعمل ہے اور اس کے ساتھ لفظ "ما" عموماً نہیں ہوتا۔ یہاں "ماسوائے دل" سے کیا مراد ہے؟ اور دل کے سوا عاشق کے پاس وہ کونسی چیزیں ہیں جن میں ہنگامہ برپا ہو سکتا ہے؟

اس لفظ پر بھی اعتراض ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بھی رسالہ ساقی (بابت نومبر [illegible]) میں کیا ہے۔ نواب صاحب نے نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ اصل اعتراض لکھ دیا۔ لیکن ہمارے دوست ڈاکٹر شادانی عجیب زندہ دل آدمی ہیں۔ انھوں نے یہ ظرافت آرائی فرمائی ہے۔

"ماسوائے دل" کے معنی ہیں "دل کے علاوہ اور جو کچھ ہے"۔ لہٰذا شعر کا مطلب یہ ہوا کہ چشمِ کافر نے دل لینے کے بعد جب مکرر دیکھا تو دل کے علاوہ اور جو کچھ ہے اس میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اب اگر "ماسوائے دل" محدود معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق شاعر کی اپنی ذات سے ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دل کے علاوہ دوسرے اعضا اس سے متاثر ہوئے۔ مثلاً پیٹ چلنے لگا، یعنی چشمِ کافر نے مسہل کا کام کیا۔ اور اگر "ماسوائے دل" وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں بڑے بڑے انقلاب رونما ہو گئے۔ مثلاً اٹلی نے حبش پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر شادانی نے "ماسوا" کی اصل وضع اور معنی اور استعمال بتائے ہیں۔ بہرحال فانی پر یہ اعتراض درست ہے۔ موجودہ زمانہ میں عربی کا علم بہت کم ہو گیا ہے۔ اس لئے دورِ حاضر کے شعر و ادب میں عربی الفاظ، ترکیبیں، اقوال و امثال کے غلط تلفظ اور استعمال نظر آ جاتے ہیں۔

مجھ کو مضطر دیکھ کر ان کو حجاب آنے لگا
(۱۷) ہو چلی ہیں وہ نگاہیں رازدانِ اضطراب

نواب صاحب کا تبصرہ ہے:۔ "ہو چلی ہیں" فصیح نہیں بلکہ "ہوتی چلی ہیں" چاہیئے۔

ڈاکٹر شادانی کی تنقید ہے:۔ اس محل پر "مضطر" کا استعمال غلط ہے۔ "مضطرب" کے معنی ہیں پریشان اور "مضطر" کے معنی عاجز و بیچارہ۔

میری رائے ہے:۔ دونوں حضرات کے اعتراضات غلط ہیں۔ فانی کا شعر بالکل صحیح اور بے عیب ہے۔

نواب صاحب نے ڈاکٹر صاحب والا اعتراض لفظ "مضطر" پر نہیں کیا، اس لئے کہ خواہ عربی میں "مضطر" کے معنی "پریشان" نہ ہوں۔ لیکن جب اردو میں بڑے بڑے استادوں نے اس مفہوم کے لئے استعمال کیا ہے تو اب اردو میں تنہا اور مع اضافت دونوں طرح درست ہے۔ ڈاکٹر شادانی نے نواب صاحب والا اعتراض (ہو چلی ہیں) پر اس لئے نہیں کیا کہ ان کے نزدیک یہ روزمرہ درست و مستعمل ہے۔ اور میرے علم میں بھی فصحا اس طرح کہتے ہیں بلکہ اس موقع پر (ہو چلی ہیں) فصحائے دہلی و لکھنؤ وغیرہ کی زبان ہے

یعنی اس طرح نہیں کہتے ـــــ "وہ نگاہیں رازداں ہوتی چلی ہیں" بلکہ اس طرح کہتے ہیں ـــــ

"وہ نگاہیں رازداں ہوتی جاتی ہیں"

یا "ہونے لگی ہیں" یا پھر وہی ـــــ "ہو چلی ہیں"

مرقع ہے کسی کی ہستی موہوم کا فانی
وہ ان کا دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو جانا (۱۸)

نواب صاحب کا ارشاد ہے "دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو جانا" یعنی فوراً غائب ہو جانا۔ کیا خوب! معشوق ہے یا چھلاوا !!

ڈاکٹر شادانی فرماتے ہیں :۔

مرقع کے تین معنی ہیں :۔ (۱) تصویروں کا البم۔ (۲) خوشنویسی کے قطعات کی کتاب (۳) فقیروں کی گدڑی ـــــ اس شعر میں مرقع کے معنی تصویروں کے البم یا قطعات کی کتاب کے تو معلوم نہیں ہوتے۔ اب رہ گئی گدڑی تو ظاہر ہے کہ کسی کی ہستی موہوم کی گدڑی کو ان کے دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو جانے سے کوئی تعلق نہیں۔ غالباً فانی صاحب نے یہ شعر تصوف میں کہا ہے۔ اسی لئے اس کا مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا۔ "مرقع" کے معنی اگر تصویر فرض کر لئے جائیں تو شعر کا مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ مگر دشواری یہ ہے کہ مرقع تصویر کو نہیں کہتے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ فانی صاحب نے زبان کو وسعت دینے کے خیال سے مرقع کے لئے یہ ایک نئے معنی تجویز کئے ہوں۔

ہمارے ڈاکٹر صاحب کو ظرافت کے علاوہ طول کلام کا بھی شوق مفرط معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال ان کا یہ اعتراض درست نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مرقع کے پہلے معنی ـــــ "تصویروں کا البم" کی سند میں اپنے مفروضہ کے حاشیہ پر مرزا داغ کا یہ شعر پیش کیا ہے ـــــ

کیسی کیسی صورتوں کے اپنے دل میں داغ ہیں
اس مرقع میں بھی ہے کیا کیا ورق تصویر کا (داغ)

اس سند کی ضرورت نہ تھی جب "مرقع" کے اس معنی (البم) سے کسی کو انکار نہیں۔ تصویر کے معنی میں لفظ "مرقع" کے استعمال کی سند درکار ہے۔ وہ حاضر ہے :۔

(۱) کھینچوں مرقع سحر شاہ خاص و عام " (مرزا دبیر)

(۲) گل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوق کے انداز ہیں دیوانوں کے (ریاض خیرآبادی)

البم کھینچا نہیں جاتا۔ تصویر کھینچی جاتی ہے۔ گل کسی چاک گریباں کا البم نہیں ہو سکتا۔ تصویر ہو سکتا ہے۔ نواب صاحب کا اعتراض بہت دلچسپ ہے۔ "معشوق ہے یا چھلاوا"! بے شک چھلاوے کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن چھلاوا ہی سہی۔ یہ بھی تو وصف ہی ہے!

ان کے علاوہ اور متعدد اشعار ہیں جن کے اعتراضات میں سیماب صاحب یا شادانی صاحب کا نواب صاحب سے توافق و توارد ہے۔ خود نواب صاحب نے اپنی تالیف (نقد سخن) میں فانی کے ۱۶۴ شعروں پر تنقید فرمائی ہے۔ ان میں بعض جگہ مجھے نواب صاحب سے اتفاق اور بعض جگہ اختلاف ہے۔ فرصت میں انشاءاللہ پھر کبھی دوسرے اشعار پر نظر ڈالوں گا۔

حامد حسن قادری

داغ دہلوی

فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی دبستانِ سخن کے آخری نمائندہ شاعر تھے۔ ان کے بعد دہلی سے پھر کوئی سرتاجِ سخن پیدا ہو سکا ہے نہ شاید پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچہ بدل گیا۔ وہ زبان و ادب کے جس گہوارے میں انہوں نے پرورش پائی تھی وہ مرزا داغ کے بعد کسی کو نصیب نہ ہوا۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ دہلی کے لال قلعہ میں سلاطین مغلیہ کے آخری تاجدار ابوظفر بہادر شاہ کے ولی عہد مرزا فتح الملک فخرو کی محل سرا میں پروان چڑھ رہے تھے کہ ان کے سرپرست یعنی ولی عہد سلطنت نے وفات پائی اور اپنے بعد ولی عہدی کا ایک ایسا جھگڑا چھوڑ گئے جس کے لئے خود ابوظفر بہادر شاہ اور ان کے اعیان و مقربین کے آپس میں آخری کش مکش پیدا ہوئی۔ خدا خدا کر کے بڈھے بادشاہ کی محبوب ملکہ نواب زینت محل کی دیرینہ آرزو (شہزادہ مرزا جواں بخت کو ولی عہد سلطنت بنانے کی) پوری ہونے پائی تھی کہ خود بساط سلطنت الٹ گئی اور بادشاہ اور ولی عہد دونوں کو جلاوطنی کے عالم میں اپنے زندگی کے بقیہ ایام گزارنے پڑے۔ اس طرح نواب مرزا داغ لال قلعہ دہلی کے محلات شاہی کے آخری پرورش یافتہ ہیں اور ان کے ساتھ صحیح معنوں میں اس اردو کا خاتمہ ہو گیا جو صدیوں سے مغلوں کے عظیم الشان لشکروں اور محل سراؤں میں نشوونما پا رہی تھی۔

نواب مرزا کی ابتدائی زندگی بظاہر شاہی محلات میں گزری لیکن اس امرِ واقعہ سے شاید بہت کم لوگ واقف ہیں کہ اگر زمانہ مساعدت کرتا تو یہ سرتاجِ سخن خود بھی ایک ملک اور ریاست کا والی اور رئیس ہوتا۔ ان کے والد نواب شمس الدین احمد خاں والئ فیروزپور جھرکہ، نواب احمد بخش خاں فخر الدولہ کے بڑے بیٹے تھے اور نواب موصوف کی جگہ فیروزپور جھرکہ کی ریاست کے حکمران تھے۔ ان کے دوسرے بھائی نواب امین الدین احمد خاں کو لوہارو کی ریاست ملی تھی جو اب تک قائم ہے اور جس پر ان کی اولاد حکمرانی کر رہی ہے۔ لیکن شمس الدین احمد خاں ایک بے باک اور تند مزاج رئیس تھے اس لئے ان کے اعزہ و اقربا سے ان کے تعلقات اچھے نہ رہ سکے اور بعضوں کو شکایت پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے باپ نواب فخر الدولہ کی وصیت اور حکومت انگریزی کے فیصلہ کے مطابق اپنے اعزہ کو حصہ نہیں پہنچا رہے ہیں۔ انہی لوگوں میں اردو کے مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب بھی شامل تھے جو بے باکی اور تند مزاجی میں مرزا داغ کے والد سے کسی طرح کم نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے دلی اور بعد کو کلکتہ کے سپریم کورٹ میں اپنے سالے شمس الدین احمد خاں کے خلاف مقدمات دائر کئے اور انگریز عہدہ داروں اور ان کے ہندوستانی ماتحتین کے دلوں میں نواب سے ایسی بدظنی پیدا کر دی کہ ان کا وقار اور اطمینان غائب ہو گیا۔ انہوں نے بھی غالب کو ستانے اور ذلیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ غالب کی قید کے واقعہ کے ڈانڈے بھی اسی سے جا ملتے ہیں۔ دلی کے رزیڈنٹ فریزر اور دیگر حکام غالب کی شاعری اور انگریزی حکومت نیز ملکہ وکٹوریہ کی مدح سرائی کے باعث ان کے قدردان تھے اور نواب شمس الدین احمد خاں سے بدظن۔ بوجوہات چند در چند نتیجہ یہ ہوا کہ ریزیڈنٹ صاحب چاندنی چوک میں قتل کئے گئے اور اس کا الزام مرزا داغ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں پر لگایا گیا اور وہ نہ صرف اپنی ریاست و حکومت بلکہ زیست سے بھی محروم کر دئے گئے اور مرزا داغ جو غالباً ان کے بعد فیروزپور جھرکہ کے حکمران ہوتے ایک مقہور و معتوب یتیم بچے کی شکل میں اپنی ماں کے ساتھ دلی چلے آئے اور چونکہ آگے چل کر ان کو اردو زبان اور شاعری کا سرتاج بننا تھا اس لئے مرزا فخرو فتح الملک ولی عہد سلطنت نے ان کو اپنے زیر پرورش لے لیا۔ اگر قسمت یا زمانہ موقع دیتا اور سلطان فتح الملک مرزا فخرو

بادشاہ ہونے پاتے تو مرزا داغ کو تلاش معاش کی خاطر دلی سے نکلنا نہ پڑتا۔ اور وہ پریشانیاں نہ پیش آتیں جو نواب کلب علی خاں والی رامپور کی وفات کے بعد نواب مرزا داغ کی سرگردانی اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک پا بہ جولانی کا باعث ہوئیں۔

۲

داغ جب سن شعور کو پہنچے تو ہر طرف شعر و سخن کا چرچا تھا لال قلعہ کے سلاطین اور شہزادے اور دربار کے امراء غرض سب کے سب شعر و سخن کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ چونکہ خود بادشاہ کی حیثیت ایک وظیفہ یاب قیدی سے بڑھ کر نہ تھی اس لئے ملک گیری و جہانبانی کے ولولوں کی جگہ شاعرانہ ترنگوں اور بے باکیوں نے لے لی تھی۔ خود دربار میں مشاعرے ہوتے تھے اور بادشاہ سے لے کر عامی تک سبھوں پر شاعری کا نشہ طاری تھا۔ اس بزم کے ساقی خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق جیسے استاد سخن تھے جن کی جودت طبع اور قوت کلام نے شہر کے تمام اساتذۂ سخن کو پیچھے ڈال دیا تھا۔ نواب مرزا داغ نے بھی اس جگت استاد سے شعر گوئی کا فیض حاصل کیا اور پھر اپنی طبعی مناسبت سے اس فن میں وہ کمال اور کامیابی پیدا کی کہ آخر کار خود بھی جہاں استاد فصیح الملک ناظم یار جنگ دبیر الدولہ جیسے خطابات کے مستحق قرار پائے اور اتنی کثیر دولت اور عظیم الشان مشاہرہ پاتے رہے جس کا ان کے استاد خاقانی ہند تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔

داغ ایک حقیقی شاعر تھے اور ان کی شاعری ان کے ماحول کی بہترین آئینہ دار ہے۔ ان کا کلام تصنع اور آورد سے پاک ہے۔ وہ جو دیکھتے اور جس طرح محسوس کرتے تھے اس کی بعینہٖ ترجمانی کرتے تھے اور اسی لئے ان کے بعض شعر عریانی کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اس میں خود ان کی کوئی غلطی نہ تھی ان کی طبیعت کی بے باکی اور رئیسانہ شان نے ان کے کلام میں ایک خاص آن پیدا کر دی ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یا سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ ریاکار نہ تھے۔ اور اردو کے اکثر و بیشتر شاعروں کی طرح فرضی عشق و محبت کی ترجمانی نہیں کرتے تھے۔ ان کی اصلی زندگی اور ان کی شاعری میں کوئی فرق نہیں۔ انھوں نے کبھی اپنی کوئی تخیلی دنیا نہیں بنائی اور نہ ان کے کلام میں عشق و عاشقی کی فرضی وارداتیں محض شعر گوئی کی خاطر شامل ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ داغ غزل گوئی کے میدان میں اردو کے تمام غزل گو شعراء سے اتنے آگے نکل چکے ہیں کہ شاید ہی کوئی شاعر تغزل میں ان کے قریب پہنچ سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے کلام میں میر تقی میر جیسا سوز و گداز، خواجہ میر درد جیسی عارفانہ حلاوت، مرزا غالب جیسی فلسفہ آرائی اور مومن خاں جیسی مضمون آفرینی کی کمی ہے لیکن سلاست زبان، اعجاز بیان، رنگینی محاکات اور شوخیٔ ادا جو تغزل کی جان ہیں داغ سے بڑھ کر کسی کو نصیب نہ ہوئے۔ ان کی شاعری میں جو تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے اس کی نظیر خود نظیر اکبرآبادی جیسے زندہ دل اور لاابالی شاعر کے کلام میں بھی نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری نہیں کرتے گفتگو کرتے ہیں اور گفتگو بھی ایسی جو بڑے بڑے استادان سخن کے فصیح و بلیغ اشعار سے زیادہ رنگین اور شگفتہ ہوتی ہے۔ اردو زبان کا کوئی شاعر اتنا سہل ممتنع کلام شاید ہی اس فراوانی سے کبھی پیش کر سکے گا۔

داغ نے حسن و شباب کی جیسی اعلیٰ نمائندگی کی ہے شاید ہی عہد حاضر کا کوئی ماہر شبابیات کر سکے۔ عشق و عاشقی کی گھاتوں اور جنسی معاملات کی باتوں کو داغ نے جس بے تکلفی اور شگفتگی کے ساتھ قلمبند کیا ہے اس کی تقلید آج کل کے ترقی پسند ادیب بھی اپنی تحریر کو

سبب وہ مبتذل شاعر بغیر ذکر سکیں گے۔ داغ کے بعض اشعار بھی اگرچہ اس الزام سے نہ بچ سکے اور ان کے حریفوں نے ان کی فطری شوخی اور بےتکلفی کی حقیقی ترجمانی کو مبتذل اور سوقیانہ قرار دینے میں کسر نہیں کیا لیکن عہد حاضر کے نئے ادب سے متعلق افسانوں اور کلام میں جو بے حجابی نمایاں ہوتی جارہی ہے اس کے مقابلہ میں داغ کا مبتذل سے مبتذل شعر بھی معصوم معلوم ہوتا ہے اور پھر اس رنگ میں داغ تنہا بھی نہیں ہیں ان کی طرح لکھنؤ کے بعض اور شاعر مثلاً وزیر، صبا، رند اور ملک عریاں نگاری میں داغ سے بہت آگے نکل گئے ہیں، اور خاص کر داغ کے ایک ہم عصر استاد سخن امیر مینائی بھی اپنے زہد و ورع کے باوجود اس حمام میں داغ سے زیادہ بے حجاب نظر آتے رہیں۔

— ۳ —

اردو زبان کی تاریخ میں داغ کو شاعری کے علاوہ ایک اور وجہ سے بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور اس اہمیت کی طرف اب تک نہایت کم توجہ کی گئی ہے۔ موجودہ اردو کے بنانے اور سنوارنے میں لکھنؤ کے مشہور استاد ناسخ کا بہت بڑا دخل ہے لیکن ان کی کاوشیں زیادہ تر دبستان لکھنؤ پر اثر انداز رہیں۔ دہلی کے دبستان نے ذوق و غالب جیسے اساتذۂ سخن کے زمانے تک بھی اپنی لسانی برتری پر نازاں رہنے کے باوجود اردو کی اصلاح اور اس کو تمام ہندستان کے لئے معیاری بنانے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ باہر والوں کی زبان میں تو اہل دلی کو بڑے بڑے عیب نظر آتے تھے لیکن خود اپنی آنکھ کا شہتیر وہ نہ دیکھ سکے۔ اس عیب کو داغ کی نظر نے دیکھ لیا اور انہوں نے اپنے کلام کو ان تمام لسانی معائب سے پاک رکھا جو غالب، مومن، ظفر اور خود ان کے استاد ذوق کے کلام میں کثرت سے موجود تھے۔ مثال کے طور پر اس وقت اس قسم کی دو چار اصلاحوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

برج بھاشا کا اثر اردو زبان کے افعال تا، نے اور تی پر ختم ہوتے ہیں مثلاً آتا ہے، جاتے ہیں، کھاتی ہے۔ اور برج بھاشا میں ان کی جگہ آئے ہے۔ جاؤ ہو وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ چونکہ شمالی ہند میں اردو کے ابتدائی شعرا میں سے بعض بڑے شاعر مثلاً آرزو، آبرو، میر، نظیر وغیرہ آگرہ اور گوالیار کے رہنے والے تھے جو برج بھاشا کا مرکز ہے اس لئے اردو شاعری میں بھی افعال کی یہ شکلیں رائج ہوگئیں اور ان کی تقلید میں غالب و ذوق نے بھی ان کو صحیح اور مستند سمجھ کر استعمال کیا۔ مثلاً ذوق کہتے ہیں:

کہے ہے خنجر قاتل سے یوں گلو میرا | کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا
لب بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے | اُف رے بے تابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

مومن کے شعر ہیں:-

اس آفت جاں کو دل دیا ہائے | جو عیب گنے ہے دل دہی کو
ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے | یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

غالب کہتے ہیں:- آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب | کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے | میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ان اساتذۂ سخن اور ان کے علاوہ دیگر شعرائے دلی نے اسی طرح اپنے کلام میں برج بھاشا کے افعال استعمال کئے ہیں۔

اور دتی کے پہلے شاعروں میں جنھوں نے اس کو ترک کیا ان کی جگہ ٹھیٹ اردو امثال اختیار کئے۔ اسی طرح بہت سے متروک الفاظ مثلاً کبھو، کسو، کہو، بل بے، آئیو، کیجیو، چولنگا وغیرہ کے استعمال میں داغ نے احتیاط برتی اور اس طرح دلی کی زبان کو الفاظ متروکہ کے ذریعے سے ٹھیٹ اور سیدھی بنادیا۔

فارسی کا اثر۔ داغ سے پہلے کے جو شعرائے دلی فارسی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ہندستانی لفظوں کے ساتھ فارسی اضافتیں عام تھیں۔ واوِ عطف کا غلط استعمال کیا جاتا تھا۔ حرف اضافت اور حرف عطف کو حذف کرتے تھے اور ان تمام نقائص کی کثیر مثالیں غالب، ذوق، مومن اور ظفر غرض جملہ آخری شعرائے دہلی کے کلام میں ملتی ہیں۔ داغ نے ان سب معائب کو دور کیا اور یہ بجائے خود ایک ایسا موضوع ہے کہ ممکن ہے آئندہ تاریخ ادب اُردو کا کوئی طالب علم اس پر ایک مبسوط مقالہ لکھ سکے۔

سید محی الدین قادری زور

بازگشت

خدا جناب باقی اور بھائی خورؔ کا بھلا کرے کہ انھوں نے ایک بھولی ہوئی لے کو پھر چھیڑا۔ کاش یہ "تیری نذر" بھی قطب شاہ کے دربار میں درجۂ قبولیت حاصل کرے۔ نظرؔ

مصیبت میں ہم سے جیا جائے نا
ترا نام بھی تو لیا جائے نا!

اٹھا دو اٹھا دو کوئی مے کا پیالہ
کہ یہ زہر اس بن پیا جائے نا!

زمانہ ہے ڈوبا ہوا مستیوں میں
یہاں اپنا دامن سیا جائے نا!

نہ پوچھو مرا گھر اجاڑا ہے کس نے
یہ الزام اس کو دیا جائے نا!

جو خود اپنی پلکوں پہ اک بوجھ سا ہے
وہ آنسو بھی مجھ سے پیا جائے نا!

بھلا دیں زمانے کی بیدردیوں کو
تجھے یاد اتنا کیا جائے نا!

نظرؔ سے کبھی ہو گئی تھیں جو باتیں
جواب ان کا اُس سے دیا جائے نا!!

نظرؔ

بندے

[illegible] شہر کے دو کوٹھریاں تھیں۔ اُسے نیلم کی [illegible] کیسی تھی۔ نیلم کی محبت اس کا رنگین تبسم اور [illegible] کوٹھریوں کو دو اقلیم بنا دیتی تھی — دونوں کے [illegible] کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے احساسات [illegible]! پھر بھی اس عشرت زار میں رہ رہ کر ایک خیال ابھرتا رہتا ———

نیلم کو بُندے بہت پیارے تھے اور اب اس کے کان بغیر بُندوں کے بہت برے لگ رہے تھے۔ اس نے اکثر ندیم سے اس کا ذکر بھی کیا تھا اور ندیم خود بھی محسوس کرتا ——— ہیرے کے بُندے ڈال دئے جائیں تو وہ کتنے خوبصورت معلوم ہونے لگے! ——— لیکن شہری زندگی میں پچاس روپے جیسی قلیل آمدنی والے شخص کا ہیرے کے بُندوں کا خیال "ہوائی قلعہ" سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا!۔

ندیم ایک اخبار کے دفتر میں پچاس روپے ماہوار پر کام کرتا تھا۔ اتفاق سے اس کی نیلم سے پہچان ہو گئی۔ اس نے یہ جان کر بھی نیلم سے محبت کی کہ اس کی ماں ایک بیسوا ہے۔ کوئی دولتمند ماں یہ گوارا کر سکتی ہے کہ اس کی بیٹی ایک پچاس روپے کے آدمی سے بیاہی جائے؟ پھر نیلم کی ماں ٹھہری کاروباری عورت! اس نے نیلم کو اس "اچھوت" سے بچائے رکھنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن محبت اندھی ہوتی ہے، اپاہج نہیں! ———

آخر ایک دن نیلم امارت و ثروت کی بلند چوٹی سے غربت کی دشوار گزار گھاٹی میں مسکراتی ہوئی اتر آئی! مگر اس کی ماں نے سارا زیور اور بُندے اتار لئے اور آئندہ گھر نہ آنے کی دھمکی بھی دی۔

ایک دن نیلم کو بُندوں کے خیال نے اس قدر ستایا کہ وہ تکیے میں منہ چھپائے رونے لگی۔ اسے تسلی دیتے ہوئے ندیم نے کہا ——— میں نے جلد ہی بُندے خریدنے کا انتظام کر لیا ہے —

ترشح کے وقت قوس قزح جیسی دکھائی دیتی ہے ٹھیک اسی طرح نیلم کے آنسو کے ہر قطرے سے خلوص و محبت کے پورے رنگ اپنی پوری شوخی کے ساتھ چمک اٹھے ———

دوسرے روز ندیم ایک جاننے پہچاننے جوہری کے پاس گیا۔ بُندوں کی قیمتیں دریافت کیں۔ نیلم کے کانوں میں زیب دینے جیسے نقلی ہیرے بھی پچاس سے کم نہ تھے۔ اس کے لئے اتنی بڑی کھپاٹش جرمنی کے مقابلے میں پولینڈ کی فتح تھی! لیکن محبت بہت سارے ناممکنات کو ممکنات بنا دیتی ہے۔ ندیم نے اپنے موازنے پر غور کیا وہ مہینہ بھر میں مشکل سے چار روپے بچا سکتا تھا۔ حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ آٹھ مہینے میں بُندے مل سکیں گے۔

آٹھ مہینے ——— اس کا دل جل گیا۔ وہ دماغی محنت کرنے والوں پر لعنت بھیجنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ دماغی سہارے پر جینے والوں کی زندگی کیکر کا درخت ہے۔ قریب جاؤ تو سایہ نہیں البتہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کب کانٹا لگ جائے گا! ———

نیلم کو آٹھ مہینے انتظار میں رکھنا اسے اچھا معلوم نہ ہوا۔ اس نے گناہ کی ٹھانی۔ کونسا گناہ؟ کیسا گناہ؟ ———

ممکن ہے بہت سارے لوگ اس کے خیال سے اتفاق نہ کریں۔ وہ میرے سے جرم ماننے تیار ہی نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے! لیکن سچ تو یہ ہے کہ اب بھی جب کبھی اس کی یاد آجاتی ہے تو ندیم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں! ——— ادب کی منڈی میں فحش اور عریاں ادب کی کافی مانگ ہے۔ اس کا بازار بہت وسیع ہے۔ ساری دنیا کا یہی حال ہے۔ ندیم نے روپیہ کمانے کی خاطر ایسی ہی چار پانچ کہانیاں لکھیں۔ اس وقت اس کے معیاری اور سنجیدہ افسانوں کی کوئی قدر نہ تھی! معیاری ——— ان معیاری افسانوں کی جن کی تخلیق جذبات، احساسات کی صداقت روشن خیال اور

دست نظری کی مرہون منت ہوتی ہے! لیکن ان "مقبول عام" افسانوں نے بہت جلد لوگوں سے اس کا تعارف کرا دیا! ــــــ

ندیم نے پچاس روپے کے نقلی ہیرے کے بندے خرید لئے۔ نیلم بڑی مسرور ہوئی۔ اس کی خوشی سے ندیم کا کنول بھی کھل گیا! مگر اپنے آپ کو اصلی ہیرے کے بندے خریدنے کے قابل نہ پاکر کچھ ملول ہوگیا، اس نے کہا ــــــ خوش ہونے جیسی کون بات ہے! یہ تو نقلی ہیرے ہیں، آخر آگینے ہی تو! فرق اتنا ہے کہ چمک ہیروں کی سی ہے!! ــــــ

"یہ نقلی سہی لیکن تمہاری محبت تو اصلی ہے نا ــــــ

اس ایک جملہ میں کتنا گہرا مفہوم تھا ــــــ

صبح جب ندیم دفتر پہنچا تو اڈیٹر اس کا منتظر کھڑا تھا۔ کل اس نے چند کتابوں پر تبصرہ کیا تھا۔ وہ پروف اڈیٹر کے ہاتھ میں تھے۔ اسے ایک تنقید دکھاتے ہوئے کہنے لگا ــــــ تم نے اس ناول کو بہت سراہا ہے ــــــ ندیم نے جواب دیا "واقعیٔ ناول بہت اچھا ہے"۔ چشمہ پیشانی پر سرکاتے ہوئے کوری نگاہ سے دیکھ کر اڈیٹر نے کہا ــــــ یہ اخبار میرا ہے، مصنف ہمارا دشمن ہے خوب خیال رہے۔ ہمارے اخبار میں اس کی توہین ہی ہونی چاہئے ایسی غلطی پھر نہ کرنا۔ دوبارہ لکھو! ــــــ

ندیم نے مسلسل دو گھنٹے کاغذ اور روشنائی ضایع کی اور اپنے خیالوں کا خون کرتا رہا۔ پھر بھی وہ کوئی قابل اعتنا تنقیص نہ کرسکا! اس نے اڈیٹر سے کہا ــــــ میں لکھنے والا ہوں گردن مارنے والا نہیں! ــــــ

اڈیٹر نے چپکے سے ایک ماہ کی تنخواہ اس کے حوالے کرکے اسے رخصت کردیا۔ وہ حیران تھا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا! اُسے سوجھتا نہ تھا کہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ ــــــ

وہ چپ چاپ گھر آیا۔ دروازہ پر تار والا کھڑا تھا۔ نیلم کی ماں کا تار تھا ــــــ جلد چلی آؤ، حالت نازک ہے! ــــــ

گو ندیم نیلم کو اس کی ماں کے پاس بھیجنے کے لئے کسی صورت تیار نہ تھا۔ وہ اسے اپنے پاس سے علٰحدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر صبح کے واقعہ سے اس نے محسوس کیا کہ ایسے وقت نیلم کا چلا جانا ہی بہتر ہے۔ رات کی گاڑی سے اس نے نیلم کو بھیج دیا۔ گاڑی چلتے وقت کھڑکی سے باہر سر نکالے وہ کس قدر بے تابی سے دیکھ رہی تھی! اک دم بجلی کے قمقمے کی روشنی سے نیلم کے بائیں کان کا بندا ایک سے چمکا! ندیم کو خیال ہوا کہ اس نے بندے لے دئیے بہت اچھا کیا۔ ورنہ اب تو جینے کے لالے پڑے میں بندے کیونکر خرید ے جاتے؟ ــــــ

دوسرے دن وہ سارے اخباروں کے دفتر میں جوتیاں چٹخاتا پھرا۔ کہیں دال نہ گلی۔ پہلے ہی شہر بھر میں افواہ پھیل چکی تھی کہ ندیم خود رائے، دیانت دار، راستباز اور ہیکڑ آدمی ہے۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ چاروں طرف اسے اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا ــــــ

دن بھر وہ سارے شہر میں بھٹکتا رہتا اور رات کو اپنی ساری ارمانوں اور حسرتوں کا لاشہ لئے بستر پر لیٹ جاتا۔ مگر لیٹنے سے کہیں نیند آتی ہے! رہ رہ کر خیال آتا۔ کاش نیلم ہوتی! اس کے احساسِ قربت سے کچھ سکون میسر آتا! انسانی دل بھی کیسی عجیب شے ہے! مجموعۂ اضداد! نیلم کی موجودگی مناسب نہ سمجھ کر بھیج دیا اور اب اس کی قربت کا خواہاں!! صحرا میں گزرنے والے قافلے کو دور آگ دیکھ کر کتنا اطمینان ہوتا ہے! گو یہ آگ اس کی گزرگاہ کو روشن نہیں کرسکتی پھر بھی قافلے والوں کے مایوس دلوں میں امید کی کرن دوڑ جاتی ہے! صرف اسی لئے ندیم کو نیلم کی ضرورت تھی! لیکن ــــــ

بستر پر کروٹ بدلتے ہی وہ نیلم کے متعلق سوچنے لگتا ــــــ نیلم کے تصور کے ساتھ ساتھ اس کی ماں اور بہن کی تصویریں اس کی سطح دماغ پر تیرنے لگتیں۔ اس کی بہن کے پاس راتوں کو آنے والے

[illegible] ندیم کے [illegible] اس سفر میں پہنچتے ہی وہ [illegible] ایک انمیدوار دو ادیبوں کو پڑھا جاتا اور سوچتا [illegible] کو قتل کر دے ———

[illegible] آمدنی کے گاؤں کی بستی میں تیل ہی ڈال دیا۔ [illegible] جلنے تک ... وہیں ٹھہرنے والی تھی۔ کہاں ؟ [illegible] ندیم نے فوراً نیلم کو کھینچ لانے کا خیال کیا مگر جیب جو خالی تھی! ———

نوکری بھی جلد ہی ملنے کی توقع نہ تھی۔ دو تین سنجیدہ افسانے لے کر اپنے سابق ناشر کے پاس پہنچا۔ اس نے دیکھ کر کہا "ایسی کہانیاں مصنف کی موت کے بعد اس کی شہرت کا باعث ہوتی ہیں۔ [illegible] جی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا" ناشر نے پہلے جیسے چند دلچسپ اور عریاں افسانے لکھنے کی رائے دی اسے بھی ان کا چسکا پڑ گیا تھا۔ مگر فوراً ہی اس نے سوچا ——— جس نے ایک شخص کی چھوٹی برائی نہ کر کے نوکری پر لات مار دی کیا ساری سماج کو زہریلا نشہ پلانا اس کے لئے مناسب ہے؟ نہیں! بھوکوں مرنا بہتر ہے مگر اپنی ذہنیت کو گروی رکھنا، اپنی انفرادیت کھونا انسانیت کی ہتک ہے۔

خیال اور عمل میں بہت بڑا فرق ہے۔ خیالات کی چہار دیواری میں رہنا آسان ہے مگر عمل کا میدان جگر پگھلا دیتا ہے! اور پھر بھوکا رہنے کا خیال!! ——— دو مہینے ندیم نے کیونکر گزارے؟ چاروں طرف اداسی، ناکامی اور یاس چھائے ہوئے تھے۔ بولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ دنیا کو دیکھ کر اس کے جی میں آتا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگا دے۔ زندگی تو جیسے اسے کاٹ رہی تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ نیلم نہ تھی ورنہ عجب نہیں وہ اس کی تکلیفوں کو برداشت نہ کر کے ناشر کا مشورہ مان جاتا ———

ان دو مہینے کے تاثرات سے ندیم جان چکا تھا کہ تہذیب کے بہت سے مجنون کھانے اور تمدن کے عرق پینے پر بھی موجودہ نسل کے خون میں انسانیت، اصلاح و ترقی پوری طرح حلول نہیں کر گئے۔ وہ موجودہ تہذیب و تمدن کو بیل پر کھلنے والے نہیں بلکہ مصنوعی پھول سمجھنے لگا ——— اس کی اپنی دانست میں اچھے ناول کی مذمت نہ کرنا انسانیت ضرور تھی لیکن اس کا یہی فعل اس کے بعض احباب کے نزدیک بے وقوفی پر مبنی تھا! فحش اور عریاں ادب کے ڈھیر میں تھوڑی گندگی اور نہ جمع کرنا اس کے دماغی فتور پر محمول کیا

ع رقصاں ہے تہذیب کے پردے میں عریاں وحشت کی دیوی!

اسے محسوس ہوا کہ تہذیب و تمدن کے جنون نے بنی آدم کی بہیمیت اور بربریت، وحشت و خود غرضی کو اس طرح چھپا دیا ہے جیسے سمندر کے ہیجان سے ساحل کی بے ڈھنگی چٹانوں کو موجوں کا چڑھاؤ وقتی طور پر ڈھک دیتا ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ انسان نے بیسویں صدی تک کی طویل مسافت طے کر لی پھر بھی وہ تہذیب کی اصلی منزل تک نہ پہنچ سکا۔ تہذیب و تمدن کی ہڑبونگ مچا کر بھی زندہ رہنے اور اپنا جیون سکھی بنانے کے لئے ہر جائز و ناجائز فعل کا ارتکاب ہی اس کا مسلک ہے۔ اسی قدیم بہیمانہ حربے سے اب بھی بعض وقت کام لیتا ہے ع پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی!

دو ماہ بعد ——— نیلم واپس آ گئی مگر ندیم کچھ زیادہ خوش نہ ہوا۔ نیلم نے خیال کیا۔ شاید میکے میں زیادہ دن رہنے کا سبب ہو اس کی دلجوئی کے لئے نیلم حسن کے ترکش میں، غمزہ، عشوہ، ناز اور ادا کے تیر لئے نزدیک آئی اور کہنے لگی ——— ماں زیادہ بیمار تھیں اس لئے ٹھہر گئی۔ مگر میں نے پریم کی ڈور تو ڈھیلی نہیں کی! ———

دو مہینے سے مکان کا کرایہ واجب الادا تھا۔ ندیم کو یقین تھا کہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی مہاجن دروازہ پر موجود ہوگا۔ شام تک اس نے خوب سوچا۔ لیکن کسان کے سوکھتی ہوئی کھیتی میں کھڑے ہو کر سر پر منڈلانے والے ابر کی طرف دیکھنے سے کہیں بارش ہوتی ہے! آنے والی رسوائیوں کے انسداد کے لئے خوب سوچا۔

یہ معمہ حل نہ ہو سکا!

پانی بھرے جانے پیتے ہوئے اس نے بندوں کو نیلم کو دیکھا۔ اس کے کانوں میں بُندے کتنے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے ۔۔۔

کانوں میں موتی آویزاں ہر موتی میں بجلی رقصاں

ندیم جیسے چائے "پچھیں" کو چائے پیتے ہوئے بھی افسردہ پاکر نیلم کہنے لگی ــــــ "کیا سوچ ہے؟ صبح سے یہی حال ہے؟ صبح سے یہی حال ہے، دشمنوں کے مزاج ناساز ہیں؟"

نہیں تو! میری صحت بہت اچھی ہے، لیکن ــــــ

وہ قریب آئی، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔ کیا دو چھینے میں اتنی غیر ہو گئی؟ تمہیں میرے سر کی قسم ــــــ! وہ آگے کچھ نہ بول سکی کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ دو آنسو سیکڑوں الفاظ پر بھاری ہوتے ہیں ــــــ

آخرکار ندیم نے کہا ــــــ میرا ایک دوست مالی پریشانیوں کا شکار ہے آج اسے رقم نہ ملی تو ــــــ

نیلم نے درمیان ہی میں پوچھا ــــــ کتنی رقم؟ ــــــ

"پچاس روپے!" کہہ کر وہ نیلم کے بُندوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اور ساتھ ہی اس کے تیور بھی! جیسے جیسے نیلم کی ناراضامندی کا احساس ہونے لگا اس کی ضد بڑھتی گئی ــــــ "اس سے بہتر لا دوں گا" کہنے پر بھی وہ کیوں راضی نہ ہوئی۔ یہ ندیم نہ سمجھ سکا۔ تھوڑی سی بحث و تکرار کے بعد ہزار پس و پیش کے ساتھ نیلم نے بُندے ندیم کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ لیکن صرف بُندے ہی نہیں تھے بلکہ ان پر دو آبدار آنسو بھی!! ــ ندیم نیلم کی اس حرکت پر حیران تھا۔ وہ عجیب باتیں سوچنے لگا۔ اسی ادھیڑبن میں جوہری کے پاس پہنچا۔ جب جوہری نے بُندوں کی قیمت تین سو روپے بتائی اور کہا اصلی ہیرے ہیں تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ جوہری کو گھورتا ہوا چپ چاپ چلا گیا ــــــ

رات کے وحشت بھرے سناٹے میں نہ جانے وہ کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ کسی زخم پر بار بار چوٹ پڑتی ہے تو ایسا ہی درد کرتا ہے خیال اس کے قلب و دماغ پر نیش زنی کرنے لگا ــــــ نیلم نے سچ کیوں نہ کہا تو نہیں کی۔ بُندے دینے میں پس و پیش ہوئی یا ان بُندوں کے پس منظر میں کوئی راز ضرور ہے۔ مگر اس نے تو کہا کہ یہ امی کی ڈور ڈھیلی نہیں کی! اس کی ماں نے تو نہیں دیئے۔ لیکن ایسا ہوتا تو وہ کیوں چھپاتی۔ تو یہ اصلی ہیرے! ــــــ اس کی بہن کے پاس آنے والے رنگیلے ــــــ اس کے گھر کا گندہ ماحول ــــــ ایک ایک کر کے اس کے دماغ پر چڑیلوں کی طرح اُبھرنے لگا ــــــ شک و شبہ سے اس کا دل بیٹھ گیا۔ دس بجے گھر لوٹا۔ چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ کھانے کے لئے نیلم راہ دیکھ رہی تھی۔ پوچھی ــــــ "کھائیں گے نا؟"

وہ فرمایا ــــــ "بھوک نہیں مجھے" ــــــ نیلم اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ آہستہ سے اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ آج تک اس کا لمس نازک پھول سا محسوس ہوتا مگر آج جیسے پیشانی میں کیکر کا موٹا اور پرانا کانٹا لگ گیا۔ ندیم نے غصہ سے نیلم کا ہاتھ جھٹک دیا وہ سسکنے لگی۔ ندیم نے گرج کر کہا ــــــ "ختم کر رونے کا ناٹک! میں سب جان گیا!"۔

ایک معصوم بچے کی طرح نیلم اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ نہ پسیجا! اس کی آنکھوں کے سامنے تو تین سو روپے کے بُندے ناچ رہے تھے اور بُندوں کے ہیروں سے نیلم کی بہن کے پاس آنے والے رنگیلوں کے "بے رحم قہقہے" سنائی دے رہے تھے۔ نیلم کی سسکیاں ہچکیاں بن گئیں، ندیم ایک زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ندیم ایک ایسے مقام پر رہتا تھا جہاں دیواروں کے بھی کان تھے ورنہ ــــــ وہ نیلم کو پیٹنے۔ اس کا گلا گھونٹ دینے میں بھی کمی نہ کرتا ــــــ

سنسان سویرے وہ مہاجن کے خوف سے باہر نکل گیا۔ تین بجنے تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ بھوک کا پیاسا۔ آہستہ آہستہ پاؤں جواب دینے لگے۔ ایک بھی بندہ اس کے پاس تھا۔ نیلم کے باپ کی کمائی اس کے حوالے کر کے بیٹی کے لئے اسے میکے بھیج دینے کے خیال سے اس نے گھر کا رخ کیا۔ دروازے پر اُسے پوسٹ مین ملا۔ خط نیلم کے نام تھا مہر اس کے میکے کی تھی۔ غصے سے کانپتے ہوئے اس نے لفافہ چاک کیا۔ مگر اس کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا ———

بیٹی!

خوش رہو! تم نے یہاں ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تم میری ایک پائی کو بھی ہاتھ نہ لگاؤ گی لیکن ماسٹانی نے مجھے چپ رہنے نہ دیا۔ تمہارے نقلی ہیرے کے بندوں کی وضع کے اصلی ہیرے کے بندے بنوائے! جس کو جب تم نہانے گئیں تو تم نے اپنے بندے میرے پاس دے دیئے تھے۔ میں نے فوراً بدل دیئے۔ میں تمہیں ہرگز یہ راز نہ بتاتی مگر تمہارا شوہر غریب ہے اندیشہ ہے کہ شاید کسی ضرورت کے وقت تم اسے دے دو اور وہ نقلی ہیرے سمجھ کر سستے داموں بیچ ڈالے۔ تمہارے نقلی بندے محفوظ ہیں۔ تمہیں بیٹی ہونے پر بھیج دوں گی"

ندیم دوڑتا ہوا اندر گیا۔ باورچی خانے میں کچھ نادر برتن جوں کے توں دھرے تھے۔ نیلم کمرے میں بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ندیم کی تصویر تھی اور آنکھوں میں ....

ندیم نے پیچھے کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے کہا ؏

تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

وہ جلدی سے اٹھی اور بولی ——— تصویر میں ایک خوبی آدمی سے زیادہ ہوتی ہے کہ وہ بھاگ نہیں جاتی ۔"

دونوں کی نظریں ایک ہوئیں اور چند منٹ تک دونوں ایک دوسرے کی طرف چپ چاپ ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ گویا ان کی آنکھوں نے اپنی رسیلی زبان میں اس دنیا کی خود غرضی، نا سمجھی انسانی بہیمیت اور وحشت کے ساتھ ساتھ اپنی ہمدردی ۔۔۔ کا بھی اظہار کردیا ———

محمد عبدالقادر فاروقی

رات کا بھولا اور دیگر افسانے ۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اُردو، فارسی و عربی۔ مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شایع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شایع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائیٹل ملک کے بلند پایہ آرٹسٹ مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

محبت کی چھاؤں ۔ مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ۱۴ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں ۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحاتِ فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے ۔ ۱۳۲ صفحے قیمت مجلد عہ

مذاق

اس کے معنی (Taste) کے بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً فلاں کا مذاق لباس کی حد تک بہت اچھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہم کو یہاں اس مذاق سے متعلق کچھ کہنا نہیں ہے۔ ہم کو تو اس مذاق سے فی الوقت دلچسپی ہے جو آپ ہم تئے دن اپنی زندگی میں ایک دوسرے سے کرتے رہتے ہیں۔ جس کا شائستگی و تہذیب سے گرجانا بھونڈے پن پر دلالت کرتا ہے۔ مذاق ذائقہ کی چیز ہے۔ اس کے مزہ کو بدلنے نہ دیجئے۔ تہذیب سے گرا ہوا مذاق آپ کی وقعت کو گھٹا دیتا ہے۔ لوگ — ایسے لوگ جو سماج کے علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ مذاق کو سمجھ نہیں سکتے۔ کسی کی صورت شکل، وضع قطع غرض ہر پہلو پر بےتکے فقرے کستے ہیں۔ اس کو ہم جنسوں کے سامنے ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن خدا جس کو عزت دیتا ہے اس کو بندہ کی کیا بساط ہے کہ وہ ذلیل کرے۔ تاہم — ایسے لوگ کتنی غلطی کرتے ہیں جب وہ کسی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے غالباً کہ اس طریقہ سے ان کا اپنا مذاق ہو رہا ہے۔ ایسا شخص واقعی شیطان کا ایک قہقہہ ہے۔

زید تنہائی میں تم سے بڑی تہذیب سے ملتا ہے۔ تمہاری تعریف تمہارے منہ پر کرتا ہے۔ جو خود پرلے سرے کی ایک بدمذاقی ہے۔ غرض وہ بکر وتنہا بذات خود بہت اچھا ہے۔ لیکن جونہی سوسائٹی میں تم سے دوچار ہوتا ہے اس کا مذاق بھی بدل جاتا ہے۔ وہ تمہاری برائیوں کو اچھالتا ہے۔ تمہارے عیوب کا پردہ چاک کرتا ہے۔ غرض ایک بےتکا بےمحل سا انسان بن جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس کے اپنے کردار کی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔ اس کا کیرکٹر پوری طرح بنا نہیں ہے اور اس کی فطرت انتہا درجہ پست ہے۔ لیکن اگر وہ جاہل ہے۔ علم کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی تو ہم اس کو معاف کر سکتے ہیں۔ یہ سمجھ کر کہ بچارا مجبور ہے۔ عقل و علم سے محروم۔ لیکن عالم کا غلط گناہ بدتر از گناہ ہو جاتا ہے۔ علم تم کو بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ علم تم کو گہرائیوں کے نقوش سمجھا دیتا ہے۔ حصول علم کے بعد تم سے ایسی غیر انسانی حرکتیں — ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!!

بر خود غلط سے لوگ اس قسم کے مذاق کو خوش اخلاقی پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن علم کی منزلیں طے کرنے کے بعد تو کم از کم ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خوش اخلاقی دوسروں کے جذبات کا احترام کرنے کا نام ہے اور ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کو سمجھنے سے ہم اس مرتبہ پر پہنچتے ہیں جس کا نام خوش اخلاقی ہے۔ ایک کا دل توڑ کر ہم کسی دوسرے کا دل خوش کر دیں تو یہ ہمارے اخلاق کا کتنا خونیں انجام ہے!

دل کی منزل بڑی نازک ہے۔ اس کا مرحلہ آسانی سے طے نہیں ہوتا۔ دل باتوں باتوں میں دیکھتے دیکھتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور جڑائے نہیں جڑتے اور ٹوٹنے والے دل میں ہی احساس کے جوہر بکھرے ہوتے ہیں۔

ہمارا مسلک ہے کہ ہمارا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ لیکن ہم سوسائٹی کا دورنگی نقش دیکھ دیکھ کر اب یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم کو بھی دورنگی اختیار کرنی چاہئے۔ دل صاف نہ بھی ہو تو ظاہرداری برتو۔ غرض یہ ہے ہماری زندگی! یوں دنیا تمہاری ہنسی اڑائے تو تم کو فکر نہ ہوگی۔ کیونکہ ایسا تو کوئی نہیں ہے جس کو سب ہی متفق ہو کر اچھا کہیں — لیکن یہی ہنسی، تبسم کی شکل میں تمہارے کسی قریبی عزیز یا سچے دوست سے تم کو دوچار کردے تو پھر شاید ہی تمہارا دل مندمل ہو سکے۔ دل کے زخم بھرے رہتے ہیں۔ ان کا اندمال مشکل ہو جاتا ہے۔ دل کی چار دیواری آبگینے سے زیادہ حساس ہوتی ہے۔ اس کو توڑا تو پھر کہاں یہ بن سکتا ہے۔

مذاق مذاق میں بہت فرق ہے۔ ایک خوش مذاق انسان ہی خوش مزاج ہو سکتا ہے۔ لوگ اس کی سنگت کو ڈھونڈتے ہیں۔ بعض دفعہ بغیر سوئی سوئی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی زبان پر اس کو قدرت رہتی ہے۔ وہ سوچ بچار کے مذاق کرنے کا عادی ہے۔ اس کے مذاق میں مٹھاس ہی مٹھاس ہوتی ہے۔ کڑواپن نہیں بے جا قسم کے طعن و طنز سے بھی انسان سبک ہو جاتا ہے۔ اس سے بات چیت کرنے کو مطلق جی نہیں چاہتا۔ اس کی صحبت میں جو بھی وقت گزرتا ہے وہ سولی پر۔

اب دنیا اتنی اونچی ہو گئی ہے۔ اس کے خیالات اتنے بلند ہوتے جاتے ہیں کہ اس کو مثالیں دے کر سمجھانے کی ضرورت نہیں رہی۔ تم خود ایک زندہ مثال' ایک چلتا پھرتا اخلاق کا مجسمہ یا نمونہ بن کر اس کی پستیوں اور اس کی ذلتوں کا مقابلہ کرو۔

غرض کسی کی سلجھی ہوئی زندگی کو الجھا دینے کے اسباب نہ ڈھونڈو۔ بعض جاہل قسم کے لوگ بھونڈے اور بے تکے مذاق کا ترکی بہ ترکی جواب دے کر مذاق کرنے والے کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ لیکن عالم سنجیدہ ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے اتفاق کو قدرت کی بھول سمجھتا ہے۔ اور سنجیدگی و متانت سے سب کچھ جھیل لیتا ہے۔ اس خاموش طوفان سے بچ کر رہنے کی کوشش کرو۔ کوہ آتش فشاں میں آگ دبی رہتی ہے۔ مگر وہ کسی نہ کسی دن اس آگ کو اگل بھی سکتا ہے۔

اقبال کے اس نظریہ کو ذرا حافظہ میں محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے ؎

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا مروت حسن عالمگیر ہے مردان غازی کا

جہاں بانو بیگم

دکن کے مقدس مقامات

مملکت آصفیہ دکن میں ہر قوم و مذہب کے لوگ مثلاً مسلمان، ہندو، سکھ، لنگایت، عیسائی، پارسی اور جین وغیرہ رہتے بستے آئے ہیں جنہیں پوری مذہبی آزادی حاصل رہی ہے۔ میں آج صرف اپنے پیارے ملک کے چند مشہور مقدس مقامات کا تذکرہ کروں گا۔ یوں تو دکن میں مسلمانوں کے مقدس مقامات بے شمار ہیں لیکن جو زیادہ اہم ہیں میں ان ہی کا مختصر ذکر کروں گا۔

پہاڑی بابا شرف الدینؒ ۔ حضرت بابا شرف الدینؒ پہلے بزرگ ہیں جو دکن میں تشریف لائے۔ آپ عراق کے رہنے والے اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد آپ نے موجودہ شہر حیدرآباد کے جنوب و مغرب کی طرف اس پہاڑی پر قیام فرمایا جہاں آپ کا مزار ہے۔ اس وقت یہ پہاڑی خوفناک درندوں کا مسکن تھی اور لوگ اس کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایسے مقام پر آپ کا ٹھیرنا ہی لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا اور اطراف و نزدیک کے چرواہے اور کسان آپ کے معتقد ہوگئے۔ آپ کی کرامتوں کے عجیب و غریب قصے مشہور ہیں مثلاً ایک بار کسی دھوبی کا بیل گم ہوگیا وہ پریشان ہو کر حضرتؒ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ:۔ "بابا میرا بیل کھو گیا۔ ہر جگہ ڈھونڈا کہیں پتہ نہ چلا۔ بیل میری زندگی کا سہارا تھا۔ اس غریب بال بچے والے کی مدد کیجئے۔" حضرت نے ایک ٹھیکری پر کوئلے سے کچھ لکھا اور فرمایا کہ "یہ ٹھیکری اس بت کے پاس لے جا وہ تیرا بیل لادے گا" حضرت کے حکم کے موافق دھوبی مورتی کے پاس پہنچا اور ٹھیکری اس کے سامنے رکھ کر کچھ دیر تک انتظار کیا کہ دیکھوں یہ بت کس طرح بیل لادے گا۔ جب کافی وقت گزر گیا تو وہ مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی نکلنے نہ پایا تھا کہ مورتی کے پیچھے کچھ حرکت محسوس ہوئی اور دھوبی نے دیکھا کہ اس کا بیل چرتا ہوا کھڑا ہے۔ دوڑ کر اس کو پکڑ لیا اور خوش خوش اپنے گھر پہنچا۔ اس واقعہ نے حضرتؒ کو مرجع خلائق بنا دیا یہاں تک کہ گولکنڈہ کا ہندو رئیس بھی آپ کا معتقد ہوگیا۔

اگرچہ کہ بابا شرف الدینؒ کو وصال کئے ہوئے (۷۰۵) سال ہو چکے ہیں لیکن آج بھی آپ کا فیضان برابر جاری ہے۔ ہر جمعرات اور خاص طور پر ہجری مہینے کی پہلی جمعرات کو آپ کی درگاہ پر ہندو اور مسلمان بڑی تعداد میں زیارت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ ہر سال ماہ شعبان کی ۲۰ تاریخ کو سالانہ عرس شاندار پیمانے پر ہوتا ہے۔

دوسرا مقدس مقام **گلبرگہ** ہے۔ یہ سلاطین بہمنیہ کا قدیم پایہ تخت اور موجودہ حالت میں دولت آصفیہ کے صوبۂ گلبرگہ کا صدر مقام اور جی آئی پی ریلوے پر واقع ہے۔

یہاں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی درگاہ ہے۔ سالانہ عرس وسط ذی قعدہ میں بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ اس عظیم الشان عرس میں شمالی ہند اور دکن کے ہر حصے سے لوگ اس کثرت سے آتے ہیں کہ تقریباً پچاس ساٹھ ہزار کا مجمع ہو جاتا ہے۔

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کا اصلی نام سید محمد محمود گیسو درازؒ ہے۔ آپ کا سلسلۂ بیعت پانچویں پشت میں حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ کو پہنچتا ہے۔ آج سے سوا پانچ سو سال پہلے بعہد فیروز شاہ بہمنی دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے۔ آپ کی کرامت کا مشہور واقعہ جس سے عام طور پر سب لوگ واقف ہیں یہ ہے کہ بادشاہ فیروز شاہ بہمنی کے خلاف اس کا بھائی احمد شاہ ولی بہمنی محض حضرت کی توجہ اور دعا سے کامیاب ہو کر تخت و تاج کا مالک ہوا۔ ۱۰۱ برس ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ کو گلبرگہ میں آپ کا وصال ہوا۔ مزار کی دیواروں پر قرآنی آیات طلع شدہ حروف سے لکھی ہوئی ہیں اور حضرت کے اوصاف کا ایک فارسی قصیدہ بھی وہاں درج ہے۔

تیسرا مقدس مقام **مولا علیؑ کا پہاڑ** ہے جو شہر حیدرآباد سے (۸) میل بر جانب شمال واقع ہے اس کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ یعقوب نام قطب شاہی خواجہ سرا نے ماہ رجب کی سترھویں تاریخ کو خواب میں جناب امیر علیہ السلام کو وہاں تشریف فرما اور خود کو آپ کے روبرو کھڑا دیکھا۔ علی الصباح اس پہاڑ پر پہنچا۔ دیکھا کہ جس پتھر کو آپ تکیہ کئے ہوئے تھے اس پر دست مبارک اور پہلوئے شریف کا نقش موجود تھا چنانچہ اس نے اس مقام پر ایک محراب بنوا کر اس پتھر کو محراب کے اندر رکھ دیا جو اب چاندی کی محرابان کے اندر ہے اور جس پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد ابراہیم قطب شاہ نے ۱۳ رجب کو جو حضرت امیر علیہ السلام کی پیدائش کی تاریخ ہے وہاں پہنچ کر پر تکلف جشن حیدری ترتیب دیا اور محراب کے مقابل ایک مسجد بھی بنوا دی۔ اس وقت سے اس پہاڑ کو مولا علیؑ کا پہاڑ کہنے لگے۔ ہر سال رجب کی سترہ تاریخ کو بڑی دھوم دھام سے عرس ہوتا ہے۔ عرس شریف کے موقع پر دکن کے ہر حصے کے لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔

دکن کا ایک اور مقدس مقام **میر مومن صاحب کا دائرہ** ہے۔ حضرت میر محمد مومنؒ اب سے پونے چار سو برس پہلے ایران سے یہاں تشریف لائے۔

آپ کی بزرگی اور نیک نفسی، زہد و تقویٰ اور علم و فضل کو دیکھ کر بادشاہ محمد قلی قطب شاہ آپ کا معتقد ہو گیا اور سیکڑوں حاجت مند آپ کی دعا اور توجہ سے فیض یاب ہوئے ۔ آپ کی کرامتوں کے کئی ایک واقعات مشہور ہیں اور آج بھی جب کہ آپ کو دنیا سے پردہ کئے (۳۲۸) سال گزر چکے ہیں آپ کا فیضان برابر جاری ہے چنانچہ آپ کی تربت کے اطراف پانی کے کوزے اور چھوٹی بڑی صراحیاں روزانہ دھری نظر آتی ہیں ۔ لوگ بڑی عقیدت سے بیماروں کو پانی پلاتے ہیں ۔ غم زدہ کمسن بچوں کو یہاں لاکر قبر کو بوسہ دلواتے اور سنگ مزار کو چٹواتے ہیں ۔ آپ کی قبر اندرون بلدۂ حیدرآباد دائرہ میر مومن واقع ہے ۔ اس وسیع زمین کا وہ حصہ جہاں پہلے سے شاہ چراغ صاحبؒ اور شاہ نورالہدیٰ صاحبؒ کے مزار تھے خود میر صاحبؒ نے اپنی زندگی میں خرید کر ذاتی صرفہ سے کربلائے معلّیٰ کی خاک پاک کو چند جہازوں میں منگوا کر اس میدان میں قد آدم برابر بچھوا دیا تھا ۔ اس کے بعد میر صاحبؒ نے مسلمانوں کے عام تربت الندکے لئے اس کو وقف فرما دیا ۔ گزشتہ تین سو سال کے عرصے میں یہاں لاکھوں سادات اور بزرگان دین دفن ہوئے ہیں ۔ ڈاکٹر زور صاحب نے اپنی قابل قدر کتاب "میر محمد مومن" میں حضرت کی زندگی کے حالات بہت تحقیق سے شائع کئے ہیں ۔

دکن کا ایک اور مشہور و قابل ذکر مقدس مقام **درگاہ حضرت یوسفینؒ** ہے ۔ حضرت شاہ یوسف صاحبؒ اور حضرت شاہ شریف صاحبؒ ۔ دونوں بزرگ ہم وطن اور آپس میں چچیرے بھائی ہیں ۔ معظم شاہ عرف بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی فوج میں ملازم تھے ۔ دونوں بزرگوں میں اس قدر محبت اور یگانگی تھی کہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے ۔ جب بہادر شاہ اب سے (۲۳۰) سال پہلے اپنا بھائی شاہزادہ کام بخش صوبیدار دکن کے مقابلہ کے لئے فوج لے کر دہلی سے نکلا تو یہ دونوں حضرات بھی ساتھ تھے ۔ اتفاق سے رات کو راستے میں اس زور کی بارش اور آندھی آئی کہ فوج کے تمام ڈیرے اور راوٹیاں اکھڑ گئیں جس کی وجہ سے فوج میں پریشانی پھیل گئی لیکن یہ دونوں بزرگ اپنی راوٹی میں اطمینان سے بیٹھے تلاوت قرآن شریف میں مصروف تھے اور چراغ روشن تھا ۔ فوجیوں نے جب یہ حالت دیکھی تو اسی وقت سے آپ حضرات کی بزرگی اور کرامت کے قائل ہو گئے اور حیدرآباد پہنچنے تک خاصی شہرت ہو گئی ۔ یہاں آکر آپ حضرات نے ملازمت چھوڑ دی اور صبر و قناعت کے ساتھ رہنے لگے ۔ پانچویں ماہ ذی الحجہ ۱۱۳۳ھ کو حضرت شاہ یوسف صاحبؒ کا وصال ہوا ۔ کہتے ہیں کہ حضرت شاہ شریف صاحبؒ آپ کی رحلت کے وقت موجود نہ تھے تھوڑی دیر بعد تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ شاہ یوسف صاحبؒ کا وصال ہو چکا ۔ سنتے ہی بہت غمگین ہوئے اور فرمایا کہ "دوستی اس کا نام نہیں کہ زندگی بھر تو مل کر رہیں اور اب بچھڑ جائیں" ۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے غسل کیا باوضو ہو کر حجرہ میں داخل ہوئے اور سفید چادر چہرہ پر ڈال کر لیٹ گئے ۔ اسی وقت آپ کا بھی وصال ہو گیا ۔ خادموں نے دونوں بزرگوں کو ایک ہی جگہ قریب قریب دفن کیا ۔ آپ کا عالی شان گنبد محلہ نام پلی میں واقع ہے ۔ ہر جمعرات کو حاجت مندوں کا خاصہ میلہ لگتا ہے اور سالانہ عرس بڑی دھوم سے ہوتا ہے ۔

ان مقامات کے علاوہ دکن میں اور بیسیوں مقدس مقامات ہیں مثلاً درگاہ حضرت **حسین شاہ ولیؒ** جو گولکنڈہ سے بہت واقع ہے ۔ ابراہیم قطب شاہ نے اپنی لڑکی ان بزرگ کے عقد نکاح میں دی تھی ۔ مشہور تالاب حسین ساگر آپ ہی کے نام سے موسوم ہے ۔ حضرت **شاہ میراں حسینی عرف شاہ ابدالؒ** یہ بزرگ بہ عہد محمد قلی قطب شاہ دسویں صدی ہجری کے اواخر میں تیس معتقدین کے ساتھ تشریف لائے ۔ لنگر حوض قریب قلعہ گولکنڈہ آپ کا مزار ہے ۔ لاعلاج اور آسیب زدہ مریض اکثر یہاں آکر ٹھیرتے اور شفا پاتے ہیں ۔ ماہ ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں سالانہ عرس اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے ۔ حضرت **شاہ راجوؒ** یہ بزرگ حضرت خواجہ بندہ نواز کے پڑپوتے اور ابوالحسن تاناشاہ کے مرشد ہیں ۔ بیرون فتح دروازہ آپ کا عالی شان گنبد ہے آپ کی کرامت کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ تاناشاہ آپ ہی کی توجہ اور دعا سے عبداللہ قطب شاہ کا داماد اور وارث تخت و تاج ہوا ۔ اسی طرح ہنمکنڈہ میں حضرت **معشوق ربانیؒ** اور خلد آباد شریف میں حضرت **خواجہ منتجب الدینؒ** اور آپ کے بھائی **شاہ برہان الدین اولیا** کے مزار ہیں ۔ ہزاروں لوگ زیارت کے لئے آتے اور ان بزرگوں کے فیض جاریہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔

دکن میں مسلمانوں کا ایک اور قابل ذکر مقدس مقام **بابا بڈن کی پہاڑی** ہے ۔ اہل ہنود چندرا درونا کہتے ہیں ۔ یہ مقام ریاست میسور کے ضلع کڈور میں واقع ہے ۔ دو تین سو سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا کہ ایک مسلمان ولی مکہ سے یہاں کافی کا پودا لائے تھے ۔ ان ہی کے نام پر اس پہاڑ کا نام رکھا گیا ہے ۔ مسلمان کثیر تعداد میں دور دور سے زیارت کے لئے آتے ہیں اور اہل ہنود کے نزدیک بھی یہ مقام ویسا ہی متبرک ہے کیونکہ وہ اس کو دتاتریہ کا تخت خیال کرتے ہیں ۔ ان کے خیال کے مطابق اس بزرگ کا اسی غار میں سے جہاں وہ زمانۂ سلف میں غائب ہوئے ہیں دوبارہ ظاہر ہونا وشنو کے آخری اوتار اور دست جگ کا نشان ہوگا ۔ فروری یا مارچ کے مہینے میں بابا بڈن کے مزار پر ہر سال بڑی دھوم دھام سے عرس ہوتا ہے ۔ بابا بڈن

لہ تاریخی لحاظ سے یہ واقعہ غلط ہے ۔ تفصیل کے لئے دیکھو کتاب "میر محمد مومن" مطبوعہ ادارۂ ادبیات اردو ۔ ادارہ

جانے کے لئے مدراس سدرن مرہٹہ ریلوے کی شاخ شنوگا کے ریلوے اسٹیشن بڑدر پر اترنا پڑتا ہے جو اس مقام کا قریب ترین ریلوے اسٹیشن ہے۔

اہل ہنود کے مقدس مقامات دکن اور خاص کر مملکت آصفیہ میں بے شمار ہیں۔ جن میں سے کئی ایک مشہور ہیں مثال کے طور پر میں اس وقت دو تین نام پیش کروں گا۔
ورنگل کی آبادی کا زمانہ گیارھویں صدی عیسوی شمار کیا جاتا ہے۔ بعضوں نے بتلایا ہے کہ کاکتیا خاندان کے پوتراج نے اس کو آباد کیا اور بعض مورخین کا خیال ہے کہ ورنگل کو آندھرا خاندان کے راجاؤں نے آباد کیا۔ بہر حال ورنگل چونکہ ایک عرصے تک راجگان تلنگانہ کی راجدھانی بنا رہا اس لئے ورنگل اور ہنمکنڈہ میں مٹھ اور مندر بہ کثرت ہیں۔ مثلاً شیوجی کا دیول، رامپا کا دیول، دشنو کا دیول وغیرہ۔ ان میں سے ہزار کھم کا قدیم مندر قابل دید ہے جو گجرات سدھپور کے رودر مالا کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ اہل ہنود اس کو بہت مقدس اور متبرک مانتے ہیں۔ ہر سال جاترا خاص اہتمام کے ساتھ ہوتی ہے۔ حکومت سرکار عالی کی جانب سے ان مندروں کو کافی امداد حاصل ہے چنانچہ آج سے بارہ سال پہلے رامپا کے دیول کا کچھ حصہ پرانا اور بوسیدہ ہو کر گر گیا تھا جس کو درست کرنے کے لئے اعلیٰ حضرت شہریار دکن نے چودہ ہزار روپے منظور فرمائے۔

جیگل ضلع نظام آباد اور پیٹھن ضلع اورنگ آباد بھی اہل ہنود کے مقدس مقامات ہیں۔ جیگل میں نارائن سوامی کا دیول اور پیٹھن میں ایکناتھ مہاراج کا دیول ہے۔ ان مقامات کی جاترائیں اعلیٰ پیمانے پر ہوتی ہیں۔ جاترا کے زمانے میں دکن کے ہر حصے سے لوگ بڑی تعداد میں یہاں جمع ہوتے ہیں۔

ناندیڑ سے قریب ہندوؤں کا ایک اور مقدس مقام مالیگاؤں ہے۔ ہر سال مارگیسر کے مہینے کی آخری تاریخوں میں جاترا ہوا کرتی ہے۔ بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ مویشی اور بالخصوص گھوڑوں کی تجارت خوب ہوتی ہے۔ جاترا کے زمانے میں سرکاری انتظامات رہتے ہیں۔

غارہائے ایلورہ اور اجنٹہ جو دنیا بھر میں مشہور ہیں کسی زمانے میں اہل ہنود کے مقدس مقامات سمجھے جاتے تھے لیکن اب آثار قدیمہ میں شامل ہیں۔ دیول چنداوانی گٹہ بلدہ حیدرآباد سے جنوب کی طرف ۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے یہاں کی سالانہ جاترا بھی بہت مشہور ہے۔

سکھوں کا مقدس مقام ناندیڑ میں گردوارۂ سکھاں ہے۔ ناندیڑ دریائے گوداوری کے کنارے واقع ہے۔ قدیم زمانے میں تلنگانہ کا پائے تخت تھا۔ اسٹیشن ناندیڑ سے مشرق کی طرف ایک میل کے فاصلے پر سکھوں کا مشہور گردوارہ ہے۔ اس میں شری گرو گوبند جی مہاراج دفن ہیں۔ ان کا زمانہ آج سے (۲۳۶) سال پہلے کا ہے۔ دسہرہ اور بالخصوص ہولی کے تہوار میں یہاں بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ امراء و رؤسائے ہند و دکن کے کئی نایاب تحفے اور عطیے یہاں محفوظ ہیں۔ گردوارہ کے انتظامات کے لئے حکومت سرکار عالی کے زیر نگرانی باقاعدہ عملہ اور ایک مہتمم مقرر ہے۔ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے سال کے ہر حصے میں جاتری یہاں آتے رہتے ہیں۔ روزانہ شام کے وقت بھجن ہوا کرتا ہے جس میں اکثر شری گرنتھ صاحب کی نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ شرکت کی عام اجازت ہے۔ پوری عمارت سنگ مرمر کی گنبد نما ہے جو بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ ریل سے گزرنے والے مسافروں کو کئی میل کے فاصلے سے نظر آتی ہے۔ عمارت کے اکثر حصوں پر سونا چاندی مڑھا ہوا ہے۔

دکن میں ہندوؤں کا ایک فرقہ **لنگایت** بھی بہت قدیم ہے۔ اس فرقے کے مقدس مقامات اضلاع گلبرگہ اور عثمان آباد میں واقع ہیں۔ بارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں کلیانی کے چالوکیہ راج کا جب خاتمہ ہو گیا تو لنگایتوں نے اس پر قبضہ کر لیا لیکن بہت جلد اس راج کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ دراصل کلیانی کی ایک مقدس ہستی مسمی بسپا نے اس مذہب کی بنا ڈالی۔ فرقہ لنگایت کے مقدس گرو شرن بسپا سادھو کا سمادھ مستقر گلبرگہ میں واقع ہے۔ ہر سال پھالگن کے مہینے میں جاترا بڑے اہتمام کے ساتھ ہوتی ہے۔

اوسہ ضلع عثمان آباد جو لاتور سے ۳۲ میل کے فاصلے پر ہے یہاں بھی اس فرقے کے ایک گرو رہتے ہیں جن کی زیارت کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔

(دکن ریڈیو کی ایک تقریر) — سید مراد علی طالع

تنقید و تبصرہ

مسئلہ غذا اور قیمتوں پر نگرانی - از ایم نرسنگ راؤ ایڈیٹر "رعیت" مجلد ۱۳۲ صفحے قیمت عہ/ - ناشر ماڈرن بک ڈپو سلطان بازار حیدرآباد دکن

اس کتاب میں حیدرآباد کے مسئلہ غذا پر عہد حاضر کی روشنی میں قابلیت کے ساتھ بحث کی گئی ہے - افراط زر اور قلت اشیاء کے مسئلہ کو بھی بخوبی واضح کیا گیا ہے - رسد و طلب اور اس پر نگرانی، راشن بندی کی ضرورت اور اس کے اصول کی نسبت جو تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ارباب متعلقہ ضرور ان پر غور کریں - نگرانی نرخ اشیاء کی پالیسی اور اس کے نتائج، نگرانی نرخ اشیاء سے متعلق حکومت ہند اور حکومت سرکار عالی کی کانفرنسیں اور ان کے اثرات، حکومت ہند کی غذائی پالیسی کے بنیادی اصول اور ان کی حیدرآباد میں تقلید، رقبہ کاشت کے اعداد و شمار اور اس کی پیداوار کی صراحت، حیدرآباد کی غذائی ضرورتیں اور ان کی قلت، گیہوں، چاول، جوار اور باجرے کی درآمد و برآمد کے اعداد، زیادہ غلہ اگاؤ کی مہم کی اہمیت اور اس کو خاطرخواہ کامیاب بنانے کی تجاویز غرض کہ مسئلہ غذا اور نگرانی نرخ اشیاء کی نسبت قابل مولف نے کوئی مسئلہ ایسا نہیں چھوڑا ہے کہ جس کی نسبت مزید وضاحت اور صراحت کی ضرورت ہو - دور حاضر کے اس اہم مسئلہ پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو بڑی محنت سے لکھی گئی ہے اور اس قابل ہے کہ بہت غور سے پڑھی جائے -

"س"

مضامین اقبال - مرتبہ تصدق حسین صاحب تاج

یہ کتاب اقبال کی تصانیف ہی کی تقطیع پر خاص اہتمام سے مجلد شایع ہوئی ہے - اس میں دو سو چار سے زیادہ صفحات ہیں اور علامہ اقبال کی وہ تصویر بھی ابتدا میں شامل ہے جو پہلی بار سب رس کے اقبال نمبر میں چھپی تھی اور علامہ کی سب تصویروں میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی - کتاب کی ابتدا اغلام دستگیر صاحب * رشید استاد فارسی نظام کالج کی ایک تمہید سے ہوتی ہے جو "صبح مراد" کے عنوان سے لکھی گئی ہے - اس کے بعد اقبال کے چند اردو کے مضامین درج ہیں اور چند انگریزی مضمونوں کے اردو ترجمے - اردو مضمونوں میں تین نہایت دلچسپ اور مفید ہیں -

۱ - اردو زبان پنجاب میں ۲ - قومی زندگی ۳ - زبان اردو

موخرالذکر مضمون میں اقبال نے عام خیال کے تحت اردو کو برج بھاشا سے مشتق قرار دیا ہے لیکن یہ غلط ہے اس لئے کہ اردو برج بھاشا سے بالکل جدا اور ایک آزاد زبان ہے جو اسی زمانہ میں سرزمین پنجاب میں بن رہی تھی جب کہ برج بھاشا برج کے علاقہ یعنی آگرہ، گوالیار، متھرا اور دہلی کے نواح میں ایک انفرادی شکل حاصل کر رہی تھی -

بحیثیت مجموعی یہ مضامین شاعر مشرق کے رجحانات اور انشاپردازی کے اچھے نمونے ہیں اور توقع ہے کہ اردو دنیا میں ان کے مجموعہ ہائے نظم کی طرح مقبول و مشہور رہوں گے -

اقبال کے چند جواہر ریزے - مطبوعہ اقبال اکیڈیمی پریس، لاہور - مرتبہ - پروفیسر خواجہ عبدالحمید صاحب - یہ اصل میں حضرت موصوف کا وہ مضمون ہے جو رسالہ معارف میں اسی نام سے دو سال قبل شایع ہو چکا ہے - اس میں اقبال کی ملاقاتوں اور ان کے دلچسپ مکالموں کی پرلطف جھلکیں نظر آتی ہیں -

اقبال کا تصور زمان و مکان - مطبوعہ اقبال اکیڈیمی - ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کے ایک مضمون پر مشتمل ہے جو چند ماہ قبل حیدرآباد سے بھی شایع ہو چکا ہے - ڈاکٹر صاحب موصوف ان علم دوستوں میں سے ہیں جو اقبال کے کلام کے اسرار و غوامض پر خاص نظر رکھتے ہیں -

اقبال سے متعلق اس قسم کی چھوٹی چھوٹی کتابیں دیدہ زیب صورت میں شایع کر کے اقبال اکیڈیمی اردو ادب میں مفید اضافہ کر رہی ہے -

جاپان کی صنعتی ترقی ۔ از محمد ناصر علی صاحب ایم اے ۔ لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ ۔

یہ بہتر صفحات کا ایک رسالہ ہے جس کا آغاز ڈاکٹر انور اقبال قریشی صدر شعبہ معاشیات کے پیش لفظ سے کیا گیا ہے ۔ اصل کتاب میں گیارہ فصلیں ہیں جن کی ترتیب میں مولف نے خاص فنی سلیقہ سے کام لیا ہے اور بڑی تلاش جستجو سے جاپان کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کرکے وہاں کی اہم صنعتوں کے متعلق ضروری مواد کو یکجا جمع کردیا ہے ۔
یہ اگرچہ ایک فنی کتاب ہے لیکن اس کا اسلوب اتنا سلیس اور واضح ہے کہ عام لوگ بھی اس سے استفادہ کرسکتے ہیں ۔

سیر کائنات ۔ مترجمہ حفیظ احمد خاں صاحب ۔ ناشر مکتبۂ جامعہ دہلی ۔

یہ اصل میں مشہور انگریز ماہر سائنس سر جیمس جینس کی کتاب

Through Space and time.

کا اردو ترجمہ ہے اور دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے ۔ اصل کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جو زمین' ہوا' آسمان' ماہتاب' سیارے' سورج اور ستارے جیسے عنوانوں پر لکھے گئے ہیں ۔ جگہ جگہ تصویریں بھی شریک کی گئی ہیں ۔ اس قسم کی کتابیں اہل اردو کی فہم عامہ کے ارتقا میں خاص طور پر معاون ثابت ہوتی ہیں ۔ مکتبۂ جامعہ نے اس کی اشاعت سے اردو کی بڑی خدمت کی ہے توقع ہے کہ تعلیم یافتہ اصحاب اس کو شوق سے پڑھیں گے ۔

زندگی کے نئے زاویے ۔ از رئیس احمد صاحب جعفری ناشر ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد ۔

اس کتاب میں جعفری صاحب کے چھے افسانے شریک ہیں ۔ جن میں زندگی کو نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ان کا انداز بیان خاص طور پر دلچسپ اور دلنشین ہے ۔

گرداب ۔ از احمد ندیم صاحب قاسمی ۔ ناشر ادارۂ اشاعت اردو

قاسمی صاحب کے کلام پر پہلے بھی تبصرہ کیا جاچکا ہے وہ اچھے نظم و نثر لکھتے ہیں اور قلیل عرصہ میں کافی شہرت حاصل کی ہے ۔ اس مجموعہ میں ان کے پندرہ افسانے شریک ہیں جن میں زیادہ تر شہروں کی پر تکلف زندگی پر طنز کیا گیا ہے ۔ افسانوی ادب کے دلدادہ ان افسانوں میں شہری انسانوں کی ریاکاری اور سازشوں کے بہت سے رازوں کو بے نقاب محسوس کریں گے ۔

کنول ۔ از حکیم میر کاظم علی صاحب برق موسوی ۔

برق موسوی حیدرآباد کے ایک نوجوان شاعر ہیں اور شاعروں کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ جس میں شعلہ' شہید اور لمعہ اور رعد کے نام دکن کی شعر و سخن کی دنیا میں اچھی طرح متعارف ہیں ۔
اس مجموعہ میں برق موسوی کی متعدد نظمیں شریک ہیں جن میں زیادہ تر مناظر فطرت کی عکاسی کی گئی ہے ۔ نظموں سے قبل جوش ملیح آبادی کے ایک خط کا عکس پیش لفظ کے طور پر شامل کیا گیا ہے جس میں شاعر انقلاب نے اس نوجوان شاعر کو بالکل صحیح لکھا ہے کہ :

"آپ کے سینے میں ایک ایسی چنگاری رکھی ہے جو ایک نہ ایک دن شعلہ بن کر رونما ہوگی ۔ اپنی قدر کیجئے اور جس قدر بھی بن پڑے شاعرانہ ماحول میں زندگی بسر کیجئے"

(ق)

ادارے کی خبریں

ذیلی مجلس اردو امتحانات

اردو امتحانات کی ذیلی کمیٹی کا اجلاس بروز [illegible] شام کے ساڑھے چار بجے مولوی [illegible] سجاد مرزا صاحب [illegible] پرنسپل ٹریننگ کالج کی صدارت میں دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔

مولوی سید محمد صاحب ایم اے شریک معتمد اردو امتحانات۔

(۱) گزشتہ اجلاس کی روئداد کی توثیق کے بعد ڈسمبر کے امتحان اردو دانی کے نتائج پیش ہوئے اور جن امیدواروں کے نتیجے زیر غور تھے ان کے بابت مناسب تصفیے کئے گئے۔

(۲) اردو امتحانات میں نصابی تبدیلیوں سے متعلق مولوی میر عابد علی خاں صاحب بی اے اور مولوی میر حسن علی صاحب صدر شاخ ادارۂ ادبیات اردو ویجاپور اور مولوی سید شاہ نصیر الدین احمد صاحب نہری منصف و سرپرست شاخ ادارۂ ادبیات اردو ویجاپور نے جو تحریکات روانہ فرمائی تھیں ان کو کمیٹی میں پڑھ کر سنایا گیا اور طے پایا کہ۔

"امتحان اردو زباندانی میں "حساب" بطور اختیاری شریک کیا جائے اور حساب کی علامت یہ اختیاری پرچہ فوجی اور غیر فوجی امیدواروں کے لئے مشترک رہے۔ دیگر امتحانات میں حساب کی شرکت غیر ضروری ہے۔"

(۳) طے پایا کہ شنکرن صاحب آرمی ایجوکیشنل آفیسر کو توجہ دلائی جائے کہ فوجی معلومات کا نصاب جلد روانہ کریں۔

(۴) مہتمم صاحب ادارہ نے رپورٹ کی کہ اردو امتحانات کے قواعد و ضوابط کے نسخے قریب الختم ہیں اس لئے دوبارہ شائع کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس بارے میں طے پایا کہ یہ کتابچہ حسب ضرورت طبع کیا جائے لیکن اس میں حسب ذیل امور کا اضافہ ہے۔

۱۔ نصاب فوجی معلومات۔

۲۔ کتاب معلم بانعام جو مولوی زاہد حسین صاحب ایم اے سے خاص طور پر اردو دانی اور اردو زباندانی کے معلمین کے مطالعہ کے لیے لکھوائی گئی ہے اور جو قریب میں چھپ جائے گی اس کے متعلق ان امتحانات کے نصاب کے سلسلہ میں نوٹ درج ہے کہ معلمین اس کا ضرور مطالعہ کریں۔

(۵) اردو فاضل کے پرچہ نظم کی بعض کتابیں چونکہ دستیاب نہیں ہو رہی ہیں اس لئے طے پایا کہ شعرائے حال کے کلام کا ایک نمایندہ انتخاب ادارے کی طرف سے مرتب اور شائع کیا جائے۔ ترتیب کا کام پروفیسر سروری کے سپرد ہو۔ اور جب یہ مجموعہ شائع ہو تو بانگ درا اور فکر و نشاط کی جگہ اس کے شریک نصاب ہونے کا اعلان کیا جائے۔

(۶) حالی اور پریم چند جو [illegible] کے لئے اختیاری مصنف منتخب کئے گئے ہیں ان کے بارے میں قابل مطالعہ کتب کی فہرست مولوی سید محمد صاحب مرتب فرما دیں تاکہ کتابچہ قواعد و ضوابط میں شریک ہو سکے۔

(۷) مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی نے پریم چند پر جو مقالہ تحریر کیا ہے اس کو ادارے کی طرف سے شائع کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

(۸) امتحان اردو دانی میں اردو دانی کی دوسری کتاب کے ساتھ تبادل حیثیت سے کتاب "آسان اردو" حصہ دوم مولفہ سید شہاب الدین صاحب وسنوی کو شریک نصاب کیا گیا ہے۔

(۹) گم شدہ سنادکی نقل دینے کی نسبت محمد مسعود مرزا خاں صاحب کی درخواست پیش ہوئی اور بعد غور و خوض طے پایا کہ فی الوقت درخواست گزار کو ادارے کی جانب سے ایک تصدیق لکھ دی جائے۔

(۱۰) درخواست ہائے امتحانات میں آئندہ سے عمر کے اندراج کا بھی التزام کیا جائے۔

ادارۂ ادبیات اردو بنگلور

بنگلور میں ادارے کے شعبۂ نسواں کی جو شاخ تین سال سے اردو کا کام کر رہی ہے اس کا دوسرا سالانہ اجلاس ۲۳ جنوری کو منعقد ہوا جس کے لئے اعلیٰ پیمانے پر تیاری کی گئی اور حسب ذیل اطلاع نامے اخباروں اور رقعوں کی شکل میں شائع ہوئے۔

ادارۂ ادبیات اردو (شعبۂ نسواں) شاخ بنگلور کا

سالانہ جلسہ

زیر صدارت ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور، ایم اے، پی ایچ ڈی اردو پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

یکشنبہ ۲۳ جنوری ۱۹۴۴ء شام کے ٹھیک پانچ بجے بمقام مہارانی کالج بنگلور مقرر ہے جس میں تقریریں فرمانے کے لئے

جناب عبدالوہاب صاحب بخاری ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج وانمباڑی اور جناب نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے اردو پروفیسر بمبئی یونیورسٹی و جناب عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی اردو پروفیسر جامعہ میسور سے درخواست کی گئی ہے اس میں آپ کی شمولیت موجب مسرت و حوصلہ افزائی ہے۔ پردہ کا انتظام ہوگا۔ چھوٹے بچوں کو ہال میں لانے کی

اجازت نہ ہوگی۔

صدر	سکرٹری
عقیلہ بیگم ایم، آر، اے	حبیب النساء بیگم ایم اے

سالانہ روئداد شعبۂ نسواں بنگلور

جناب صدر صاحب، معزز مقررین اور عزیز بہنو!

میں اپنی رپورٹ کے پیش کرنے سے پہلے جناب صدر صاحب بدل الرحمن پرنسپل اسمٰعیل کالج اندھیری اور معزز مقررین جناب نجیب اشرف صاحب ندوی، عالی جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کو خوش آمدید کہتی ہوں آپ کو ہمارے درمیان دیکھ کر جو جذبات تشکر اور مسرت کہ اس وقت ہمارے دلوں میں موجزن ہو رہے ہیں اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

آپ میں سے بعض صاحبوں کی شاگردی کا فخر مجھے حاصل ہے اور یہ وہ خوش قسمتی ہے کہ جس پر میں تا دم زیست نازاں رہوں گی اور انتہائی فخر و مسرت کے ساتھ ان خوشگوار لمحوں کو یاد کرتی رہوں گی۔

اس وقت ہندوستان کی ان مایہ ناز ہستیوں کی موجودگی ہمارے لئے بے انتہا حوصلہ افزائی کا باعث ہے، آپ نے ہماری ناچیز درخواست کو شرف قبولیت عنایت فرما کر اپنی پرخلوص خدمت اور قومی ہمدردی کا ثبوت دیا اس کے شکریہ میں یہ اپنے چند ناچیز الفاظ عقیدت و صداقت کا تحفۂ نیاز پیش کرتی ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

بہنو! آج ادارۂ ادبیات اردو کی دوسری سالگرہ ہے شعبۂ نسواں کی

یہ [illegible] دسمبر میں قائم ہوئی تھی اور کتب خانہ [illegible] عزیز دوست محترمہ [illegible] صاحبہ کی ۱۰۰ کتابوں کے عطیہ سے [illegible] دسمبر میں شروع ہوا تھا [illegible] جنوری میں ادارۂ ادبیات اردو سے ملا دیا گیا اور اس کے صرف چھ ماہ بعد ۱۱ جولائی ۱۹۴۲ء کو ادارہ کا پہلا جلسہ عام منایا گیا۔ اس وقت ادارہ کا یہ دوسرا جلسہ ہے۔ ماشاء اللہ اس کی عمر اس وقت دو سال کی ہو گئی اور کتب خانہ میں ۷۰۳ کتابیں موجود ہیں، خواتین بنگلور میں سے متعدد صاحب ذوق اس کی ممبر ہیں اور ہر ہفتہ کتابیں لیکر پڑھتی رہتی ہیں اس عرصہ میں اراکین مجلس عاملہ کی رائے سے عہدہ داروں میں موقع و محل کے مطابق بعض تبدیلیاں ہوتی رہیں، یعنی اسسٹنٹ سکرٹری صاحبہ بعض وجوہ کی بنا پر اس مجلس کے جلسوں میں گزشتہ ایک سال سے شریک نہ ہو سکیں تو طالبات کالج سے ہی مجلس عاملہ کی رائے سے مدد لینی پڑی، پہلے پہل وحیدہ بیگم صاحبہ اور بعد میں [illegible] زیب النساء بیگم صاحبہ اس خدمت کو انجام دیتی رہیں، اراکین مجلس عاملہ ابتدا میں ہر مہینہ اور بعد میں سواری وغیرہ کی تکلیف کی وجہ سے سہ ماہ میں ایک مرتبہ ملتی رہیں۔ اراکین مجلس عاملہ کی کوششوں کے باوجود گزشتہ سال بنگلور میں ادارہ کے اردو امتحانات کا مرکز قائم نہیں ہو سکا، اس مرتبہ اگر کم از کم دس بہنیں اردو عالم میں اور ۲۰ اردو دانی کے امتحان میں شریک ہونے پر آمادہ ہو جائیں تو جولائی کے امتحان کے لئے بنگلور مرکز بن سکتا ہے۔

اردو عالم میں شرکت کے لئے پانچ بہنوں نے اپنے نام دیئے ہیں۔ کولار اور ٹمکور سے بھی ایک دو بہنوں نے گزشتہ سال امتحان اردو عالم میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا اور ان کا نام فیس اور فارم مدت مقررہ تک بھیج دینے کی درخواست ہم نے شائع بھی کر دی تھی لیکن کسی بہن نے بھی اپنی درخواست نہیں بھیجی۔ جس کی وجہ سے صرف دو تین خواتین کے لئے جو امتحان میں شریک ہونا چاہتی تھیں یہاں مرکز قائم نہیں ہو سکا۔ اس مرتبہ جو بہنیں ادارہ کے اردو عالم کے امتحان میں شریک ہونا چاہتی ہیں ازراہ مہربانی ۲۰ فروری سے پہلے اس کی اطلاع سکرٹری ادارہ کو دے دیں۔ نصاب اردو عالم بھی شائع کیا جا چکا ہے یہ سب کتابیں سب رس کتاب گھر، رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہیں۔ امتحان میں شرکت کے لئے فارم سکرٹری ادارۂ ادبیات اردو شاخ بنگلور سے مل سکتے ہیں، ادارۂ ادبیات اردو شاخ کے سالانہ جلسہ کی پچھلی رپورٹ میں ۱۱ جولائی ۱۹۴۲ء تک کی آمد و خرچ کا حساب پیش کیا گیا تھا۔

گزشتہ سال کے جلسے کے بعد سے جو محترمہ حاجی بی بی ملک سلطان بیگم کاذرونی کی صدارت میں ہوا تھا اس وقت تک مجلس عاملہ کے نو اجلاس ہوئے۔ اراکین مجلس کی حاضری حسب ذیل ہے۔

۱۔ محترمہ عقیلہ بیگم صدر۔ ۲۔ محترمہ صابرہ بیگم۔ ۳۔ محترمہ محبوب جان بی اے۔ ۴۔ محترمہ رفعت خلیلہ۔ ۵۔ محترمہ زلیخا بی بی اے۔ ۶۔ محترمہ عالیہ بیگم بی اے۔ ۷۔ محترمہ حبیب النساء بیگم سکرٹری۔

ان اجلاسوں میں مختلف امور پر بحث ہوئی حساب و کتاب مجلس عاملہ کی منظوری کے لئے پیش کیا جاتا رہا۔ کتب خانہ کے لئے کتابیں خریدی گئیں۔ تعلیم بالغان کے لئے بسون گراسی میں ایک مدرسہ کھولا گیا۔ بنگلور میں امتحانات کا مرکز قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ صدر اور سکرٹری ادارہ نے اردو کی تبلیغ اور اشاعت کے سلسلہ میں کری سندرا نامی دیہات کو جا کر تقریریں کیں۔ اس مجلس کے نویں جلسہ میں ادارہ کے قواعد و ضوابط کی ترمیم کی گئی آئندہ کے لئے عہدہ داروں کا انتخاب ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ مجلس عاملہ کے اراکین کی تعداد ۹ ہے اور جلسہ کے
لئے کورم ۳ مقرر کیا جائے۔

۲۔ اگر کوئی مجلس عاملہ کی ممبر بہن چار جلسوں تک
لگاتار غیر حاضر رہے تو ان کی یہ نشست مجلس عاملہ کی رائے
سے کسی اور بہن کو دی جائے۔

۳۔ صرف مجلس عاملہ کی اراکین اور کتب خانہ نسواں
یا ادارہ کی ممبر بہنوں کو جو ایک سال کا چندہ کم از کم سالانہ
تین روپے کے حساب سے ادا کر چکی ہوں حق حاصل ہوگا کہ
عہدہ داروں کے انتخاب میں ووٹ دیں اور ادارہ کے
جلسہ عام میں اپنی رائے کا اظہار کریں یا کوئی رزولیوشن
پیش کریں (رزولیوشن کے پیش کرنے کے لئے جلسہ عام سے
دو ہفتہ پہلے دفتر ادارہ کو بھیج کر مجلس عاملہ سے اس کی منظوری
حاصل کر لینی چاہیے۔) تاہم دوسری تمام بہنیں اپنی رائے سے
صدر یا سکرٹری کو مستفید فرما سکتی ہیں۔

۴۔ مجلس عاملہ کو اختیار ہوگا کہ ان قواعد میں موقع
محل کی مناسبت سے تغیر و تبدل کرے یا نئے قواعد کا اضافہ کرے
جو جلسہ عام کے پاس کردہ قواعد کے خلاف نہ ہوں ایسے نئے قواعد
دوسرے جلسہ عام میں منظوری کے لئے پیش کئے جائیں گے۔

عہدہ داروں کا انتخاب۔

صدر:۔ محترمہ عقیلہ بیگم ایم آر اے۔

سکرٹری:۔ حبیب النساء بیگم (ایم اے اردو و فارسی)

اسسٹنٹ سکرٹری:۔ شمسیہ زیب النساء بیگم صاحبہ۔

اراکین مجلس عاملہ مذکورہ بالا عہدہ داروں کے علاوہ
محترمہ محبوب جان بی اے۔ محترمہ عالیہ بیگم بی اے۔ محترمہ
زلیخا بی بی اے۔ محترمہ صابرہ بیگم صاحبہ۔ محترمہ رفعت جلیلہ

محترمہ ملکہ حفیظہ صاحبہ۔

اپنی رپورٹ کے خاتمہ پر اپنی بہنوں سے اپیل کرتی ہوں
کہ براہ مہربانی اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے ان کو مختلف
میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اپنے قیمتی خیالات سے آگاہ فرماتی رہیں
اور اچھی طرح جان لیں کہ اس وقت ہماری زبان اور تمدن
کی موت و حیات کا سوال ہے رسمی لفظی یا نمائشی کام تو بہت
کر چکے اب ہر کام میں صداقت کی تڑپ کی ضرورت ہے۔ ع

جا تھمہ ہے نمائش داغ جنوں کے دن
اے شہید وفا میں تڑپ نقد جاں کی ہے

خدائے پاک ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے اخلاص
کو خلعت قبولیت بخشے آمین یا رب العالمین۔ اس موقع پر
میں اپنی عزیز طالبات کو مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی ان میں
اردو کی خدمت کا خاص ذوق و شوق پایا جاتا ہے ادارہ کے
سالانہ جلسے انہیں کی مدد سے ہوا کرتے ہیں۔ گزشتہ ماہ میں
انھوں نے یوم اردو نہایت ہی اعلیٰ پیمانہ پر منایا تھا جس میں
کالج کی طرف سے تقریباً ۴۵ روپے کی اور عطیہ جات سے
۱۵ روپے کی جملہ ۶۰ روپے کی کتابیں مختلف تحریری و تقریری
مقابلوں میں بطور انعامات دی گئیں گو کہ ہم میدان عمل میں کسی
طرح اپنے بھائیوں سے پیچھے نہیں ہیں تاہم میں صرف طالبات
سے ہی نہیں بلکہ آپ سب بہنوں سے مدد کی خواہاں ہوں
ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دوسری زبانوں کی ترویج
و اشاعت کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں اس کا عشر عشیر
بھی ہم نہیں کر رہی ہیں۔ میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ
اس ادارہ کی شاخیں ہر محلہ میں کھول دیں اور اس کا کام
نہایت گرم جوشی اور صداقت کے ساتھ کر دکھائیں ادارہ کے

کہ جس کی بہبود کر اس سے متصف ہیں۔
آخر میں محترمہ سلطانہ امین صاحبہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے صد روپیہ کا عطیہ ادارہ کو عنایت فرمانے کا وعدہ فرمایا انتہائی عطیہ سے ادارہ ان کے زیر بار احسان رہا ہے۔ محترمہ مرزا اسمٰعیل صاحبہ کی عنایات کو یہ ادارہ کبھی فراموش نہیں کرسکتا آپ کو ہمیشہ ہماری کوششوں سے دلچسپی رہی ہے اور اپنے بیش بہا مشوروں سے ہمیں مستفید فرماتی رہی ہیں۔ لہذا آپ کی خدمت میں اپنا ناچیز ہدیۂ تشکر پیش کرتی ہوں۔ محترمہ بیگم جسٹس عبدالغنی صاحبہ جو ادارہ کی سرپرست ہیں۔ ان کی مالی امداد کا شکریہ نہ کرنا کفرانِ نعمت ہوگا۔ لہذا یہ چند الفاظ شکریہ پیشکش ہیں۔ عالیجناب یم سید غوث محی الدین ایڈیٹر الکلام کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتی ہوں آپ اپنے اخبار کے ذریعہ اس ادارہ کے اغراض و مقاصد کے پھیلانے میں ہماری مدد کرتے رہے ہیں۔

جناب صدر صاحب معزز مقررین کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے باوجود دور دراز سفر کی زحمت کے ہماری درخواست کو قبول فرما کر ہمیں ممنون فرمایا۔

سکرٹری۔ حبیب النسا بیگم یم اے۔

سالانہ جلسے کی روئداد

ادارۂ ادبیات اردو شعبہ نسواں کا سالانہ جلسۂ عام اگرچہ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کی صدارت میں منعقد ہونے کا اعلان ہوا تھا لیکن خود ڈاکٹر صاحب موصوف سفر۔ عالیجناب ڈاکٹر ہذل الرحمن صاحب یم اے پی ایچ ڈی پرنسپل اسمٰعیل کالج جوگیشوری کی موجودگی کی بنا پر ان کی صدارت کی تحریک فرمائی۔

جلسے سے کچھ دن پیشتر ہی ملک میسور کے نہایت ہی مقبول اخبار "الکلام" میں اس کا اعلان چھپوایا گیا تھا۔

فرمایا علاوہ شہر بنگلور میں جلسے سے دو دن پیشتر ہی تقسیم ہونے شروع ہوئے۔ سٹی میونسپلٹی نے ادارہ خیات کالج کو چھپنے کا انتظام کیا۔ مسز مل پرنسپل مہارانی کالج نے کالج کے خوبصورت ہال کے استعمال کی اجازت دی۔ بہت سی معزز خواتین شریک جلسہ ہوئیں پردہ کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ جناب صدر صاحب اور معزز مقررین اور دوسرے اراکین نے ادارہ کی چائے نوشی میں شرکت کی۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کی تحریک اور سکرٹری ادارہ کی تائید سے جناب ہذل الرحمن صاحب یم اے پرنسپل اسمٰعیل کالج جوگیشوری اس جلسہ کے صدر مقرر ہوئے جلسہ کا آغاز قرأت قرآنی سے ہوا۔ پھر شہزادی بیگم صاحبہ نے حمد خوش الحانی سے پڑھی۔ محترمہ عقیلہ بیگم ایم اے صدر مجلس عاملہ نے معزز و محترم مہمانوں کو خیر مقدم کرتے ہوئے تقریر فرمائی۔ سالانہ رپورٹ محترمہ حبیب النساء بیگم صاحبہ ایم اے (اردو و فارسی) سکرٹری ادارۂ ادبیات اردو نے پیش کی جس کے خاتمہ پر صدر جلسہ نے اس رپورٹ کے پاس کئے جانے کی منظوری لی اور پاس ہونے کے بعد آمد و خرچ کے حساب کی کتاب پر اپنے دستخط کر دیئے۔

عالیجناب نجیب اشرف صاحب ندوی نے اپنی نہایت ہی فصیح و بلیغ تقریر کے دوران میں مادری زبان کی اہمیت اور اس کے نشو و نما میں خواتین کے حصہ کو تفصیلاً بیان کیا۔

نیز آپ نے فرمایا۔ زبان کی اہمیت جو آپ خواتین سے ہے وہ صرف اس ایک نکتہ سے ہی اظہر من الشمس ہے کہ ملکی زبان کو ہمیشہ مادری زبان کہا جاتا ہے "پدری" نہیں۔ لہذا آپ کا تعلق زبان سے بہت گہرا ہے۔ در اصل عورتیں ہی زبان کی صحیح معلم اور رکھوالی ہیں آپ نے سنا ہوگا کہ لکھنو کی عام اردو محاورات اور

بیگمات سے نکلی تھی۔ اب جبکہ انقلاب آرہا ہے۔ جبکہ ہر قسم
کی بندشیں توڑی جارہی ہیں آپ کا فرض ہے کہ اس حسین دختر
(زبان) کو ہر قسم کی آلائش سے محفوظ کریں اور اپنی زبان
کے محاورات، تشبیہات وغیرہ کی حفاظت کریں۔ پھر محترم مقرر
نے میسور میں اردو مصنفہ عبدالخالق سعید کی کتاب کا حوالہ
دیتے ہوئے میسور کی خواتین کے علمی ذوق وخدمات کا ذکر
کیا اور آخر میں کہا کہ خواتین اکثر کسی کام کا ارادہ کرنے اور
نتیجہ پر پہونچنے میں بہت سا وقت لیتی ہیں گر جب وہ کوئی ارادہ
کرلیتی ہیں تو کوئی طاقت ان کو روک نہیں سکتی جس کا ثبوت
خود یہی انجمن ہے۔ آخر میں آپ نے فرمایا۔ اب جبکہ آپ لوگوں
نے ایک منزل مقصود مقرر کرلی ہے تو ضروری ہے کہ آپ اس پر
ثابت قدم رہیں۔ آپ سے ہم لوگوں کی بہت سی امیدیں
وابستہ ہیں۔ مدراس، حیدرآباد اور میسور میں اردو کے لئے
جو جوش وعشق کا اظہار ہورہا ہے یقیناً آنیوالی فتح کل کی
خبر دیتا ہے۔

سروری صاحب نے شہر بنگلور میں معزز مہمانوں کا
خیر مقدم کرتے ہوئے میسور میں اردو کے متعلق نہایت ہی
دلچسپ تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا میسور کے نوجوان آج کل
اردو کی بہت ہی خدمت کر رہے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ
ہمارے لئے ایسے مواقع میسر نہیں جن میں ان کی خدمات کا
اعلان ہوسکے۔ بزم اردو فارسی کا ذکر کیا اور ہفتہ بزم جو
۱۲ دسمبر سے ۲۲ دسمبر تک میسور میں منایا گیا تھا اس کا
ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس بڑے جلسے کے تحت یوم اقبال
ویوم خواتین کے جلسے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خواتین
نے جس جوش سے اس میں حصہ لیا ہے اس سے صاف
پایا جاتا ہے کہ میسور میں بھی خواتین اور طالبات اپنی زبان
تہذیب وشائستگی کی خدمت کر رہی ہیں چنانچہ فرسٹ آنرز
کی ایک خاتون شکسپیر کی زندگی اور کارنامے پر اور دوسری
خاتون انشاءاللہ خاں انشاؔ کی زندگی اور کارناموں پر
بہترین تبصرہ لکھ رہی ہیں۔ نیز ہم نے ادبیات اردو میسور
کے نام سے ایک سلسلہ کی اشاعت شروع کی ہے جس کے تحقیقی
کام کے سلسلے میں شاہ محمد صدرالدین صاحب کے متعدد
رسالے ملے ہیں۔ اور ایک اور ہندو مصنف لالہ مہتاب رائے
سبقت کا پتہ لگا ہے۔ آخرالذکر صاحب کے نام سے اب تک
ہماری علمی دنیا ناواقف تھی ان کے اردو رسالے کی دستیابی
درحقیقت اردو ادب میں اضافہ کا موجب ہوئی ہے۔ پھر عالیجناب
ڈاکٹر زور صاحب نے اپنی پر مغز وفصیح تقریر کے دوران میں
نہایت ہی کارآمد مشورے دیئے اور اس سلسلہ میں گفتگو
جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا ہم کو سب سے پہلے جس بات
پر توجہ کرنی چاہیے وہ اردو نوشت وخواند کو عام کرنا ہے۔
ان خواتین کو جو اس دولت سے محروم ہیں پڑھا کر اس کیف
روحانی سے آگاہ کر دیا جائے۔ خواتین بنگلور کے ذوق علمی
کا ثبوت اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض خواتین نے اردو
امتحانات ادارہ کی کتابیں بھی منگوائی تھیں۔ چونکہ گزشتہ
سال یہاں مرکز قائم نہ ہوسکا تھا۔ لہذا انھوں نے شائد
اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ لیکن اس مرتبہ آپ کوشش کیجئے
کہ مرکز امتحانات یہاں قائم ہوجائے۔ بیجاپور میں سال گزشتہ
مرکز قائم ہوا اور کئی بالغوں نے امتحانات میں شرکت بھی کی۔
وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ علم کو عام کردیا جائے۔
اگر تعلیم یافتہ خواتین بھی امتحانات میں شریک ہوں تو مناسب ہے

[illegible] ہو سکے گا کہ اردو ادب کی باضابطہ تعلیم و تربیت

[illegible] ہے اور اردو کے صحیح ذوق کے کیا معنی ہیں پیدا ہو

[illegible] یافتہ خواتین نے بھی اس میں دلچسپی لیکر امتحانات

[illegible] کی ہے آپ بھی دوسروں کو بھی اور ترغیب

دلانے کے لئے ایسا کر سکتی ہیں۔ اردو کی تعلیم کو عام بنانے

کے لئے یا جیسا کہ ہم گھر کے نوکروں کو اردو نوشت و

خواند سکھلائیں۔ اس کے علاوہ اردو کتب خانوں کی

ممبر بنیں اور کم از کم ایک سال میں ایک ان پڑھ کو اردو

لکھنا پڑھنا سکھلائیں آخر میں اردو کی اشاعت توسیع و

ہر دلعزیزی اور علم کو پھیلانے کے ہر ممکن طریقے کو آپ

ضروری سمجھیں۔ ان طریقوں سے آپ اپنی زبان اپنے

ادب اور اپنی تہذیب کی صحیح خدمت گزار بن سکتی ہیں۔

اس کے بعد جناب صدر صاحب نے نہایت ہی

مفید اور پرمغز تقریر کے ذریعے سے اردو کی توسیع و اشاعت

کے لئے مشورہ دیئے جلسہ کے انعقاد اور میسور میں اردو

کی ترقی کی کوششوں پر خوشنودی کا اظہار کیا۔

آخر میں شمیمہ زیب النساء بیگم نے جناب صدر صاحب

معزز مقررین پرنسپل کالج۔ اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا

کیا اور تقریباً ۱۲ بجے جلسہ کے ختم ہونے کا صدر صاحب نے

اعلان کیا اور معزز مہمانوں کو پھول پہنائے گئے۔ دوسرے

دن ادارہ کی طرف سے طالبات مہارانی کالج کو جنہوں نے

جلسہ کے انتظام میں سکرٹری کی مدد فرمائی تھی عصرانہ دیا گیا۔

حبیب النساء بیگم

منظوم خیر مقدم

صدر شعبہ نسواں بنگلور نے اس سالانہ اجلاس میں اپنی خیر مقدمی تقریر کے بعد جو نظم سنائی وہ درج ذیل ہے۔

شہر بنگلور آج کیوں رشک گلستاں ہے بنا

ہر جہت سرسبز و ہر حصہ ہے اس کا پُر فضا

طنز اور شوخی سے ہیں قائم کنار جوئے آب

نونہالان چمن پہنے ہوئے رنگیں قبا

بس نزاکت سے ہیں بجتے یاں بلائیں [illegible]

آتی ہے شہنائی کی منقار بلبل سے صدا

قمریاں گاتی ہیں ذوق اور چمن کے [illegible]

خیر مقدم، خیر مقدم، خیر مقدم آپ کا

ہو مبارک آپ کو اے خواہران باصفا

اجتماع یہ رہبران و عالمان قوم کا

آئے ہیں تکلیف اٹھا کر یہ نہایت دور سے

غور سے سنئے پیام ان کا ہے بے شک جانفزا

لیجئے اس کا اثر دل پر نہایت شوق سے

ہو مگر اس کا اثر ظاہر عمل سے آپ کے

عقیلہ بیگم کی [illegible]

جگتیال میں شاخ ادارہ کا قیام

حسب تحریک مولوی سید کلیم اللہ حسینی صاحب مولوی فاضل منشی فاضل اردو فاضل تعلقہ ہذا میں ادارہ کی ایک شاخ قایم کی گئی ہے جس کے عہدہ دار صاحبین کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ میر مجلس۔ عالیجناب مولوی ثناء اللہ صاحب دوم تعلقدار جگتیال۔

۲۔ معتمد۔ جناب مولوی محمد عظیم الدین صاحب وکیل درجہ اول۔

۳۔ نائب معتمد۔ جناب مولوی حبیب الرحمن صاحب مدرس۔

۴۔ منتظم۔ مولوی محمد عبدالنبی صاحب معتمد دارالعلوم شرقیہ جگتیال۔

۵۔ رکن۔ مسٹر لکشمی نرسہوا راؤ صاحب وکیل درجہ دوم۔

۶۔ " " " جلپت راؤ صاحب

۸۔ رکن جناب مولوی ذکاءاللہ صاحب مولوی فاضل مدرس۔

۹۔ " " " عزیز الدین صاحب محاسب انجمن امداد باہمی

شاخ ناگر کرنول

معتمد صاحب شاخ ادارہ کے مکان میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت خاکسار کی اہلیہ سعیدالنسا بیگم نے کی اور اولاً رحمت النسا بیگم اردو کی اہمیت پر تقریر کی اس کے بعد منیرالنسا بیگم عرف منیری کامیاب امتحان ادارۂ ادبیات اردو نے بھی اردو کی ترقی کی ترغیب دلاتے ہوئے تقریر کی۔ اس کے بعد خیرالنسا بیگم صاحبہ نے تقریر کی اس کے بعد آخر میں سعیدالنسا بیگم صاحبہ صدر اہلیہ معتمد شاخ ادارہ نے اردو کی ضرورت و اہمیت پر تبصرہ کیا۔ ان تقاریر کے اثر نے محض عورتوں کے دل میں اردو کی رغبت اور اس کی ترقی کی خواہش پیدا کی اور بعض خواتین نے شاخ ادارۂ ادبیات اردو ناگر کرنول کی رکنیت قبول کی اور چندہ دہندگان میں اپنا نام شریک کروایا۔ آئندہ کے لئے ادارہ میں مزید ترقی کا باعث ہوئیں اور یہ معتمد بہر نوع امکانی سعی و قیام دارالمطالعہ کی نسبت کر رہا ہے انشاء اللہ ایک روز یہ کوشش کامیاب رہے گی۔

شیخ منصور علی معتمد

شاخ کپل

ادارے کی شاخ کپل نے اپنی مجلس [illegible] کا نیا انتخاب کیا جو حسب ذیل اصحاب پر مشتمل ہے۔

صدر۔ مولوی سید مصطفےٰ حسین صاحب ایم اے [illegible]

نائب صدر۔ مولوی محمد رحمت اللہ صاحب [illegible] ایل ایل۔ [illegible]

معتمد۔ مولوی سید ضیاءالدین احمد صاحب وکیل۔

شریک معتمد۔ مولوی سید فیض علی صاحب مولوی کامل مددگار [illegible]

خازن۔ خان محمد سیٹھ نورانی صاحب

ارکان مجلس انتظامی۔ پنڈت سی۔ وانکو نید راؤ صاحب چالیسی۔

عالیجناب قادر محی الدین صاحب مہتمم تعلیمات۔

مولوی حمیدالدین صاحب بی ایس سی۔ بی۔ ٹی اول مددگار۔

مولوی محمد حسین صاحب مدرس وظیفہ یاب۔

پنڈت ملیا صاحب وکیل۔

جناب ممتاز علی صاحب وارثی بی اے سررشتہ گرداوری۔

مولوی سید امین الدین صاحب وکیل۔

" سراج الحسن صاحب قادری کنٹراکٹر۔

" حافظ حکیم سید احمد علی صاحب ٹونکی۔

پنڈت نارائن راؤ صاحب جوشی بی ایس سی۔ مددگار مدرسہ فوقانیہ۔

مولوی اختر علی صاحب بی اے مددگار مدرسہ فوقانیہ۔
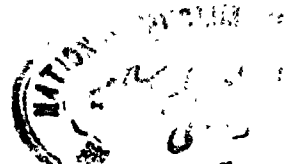
[illegible] تاریخی کتابیں

[illegible] حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ تاریخ پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی ایم اے نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ لکھی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔

بڑی سائز ۳۲۵ سے زیادہ صفحات قیمت ہے

مقدمۂ تاریخ دکن پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں سرزمین دکن کے بیسیوں حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقاء، عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کردی گئی ہیں۔

متوسط تقطیع ۱۴۴ صفحات۔ قیمت ہے

میر محمد مومن عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انہوں نے ہزار ہا روپے کے صرفہ سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلیٰ بچھادی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے اپنے دلچسپ و مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عہ

ریاض مختاریہ حیدرآباد کے بیدار مغز مدار المہام نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول کے حالات زندگی اور کارناموں کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خاندان، تعلیم و تربیت، دیوانی کا ذکر، مشہور واقعات، تعلیمی و سیاسی خدمات، نظم و نسق سلطنت، غرض حیدرآباد کے گزشتہ حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی میر دلاور علی دانش مرحوم ہیں۔ یہ کتاب اب تک قلمی مسودے کی صورت میں تھی لیکن اب ادارہ کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب صفحات (۲۰۴) قیمت عہ

ہندوستانی تمدن از پروفیسر ڈاکٹر ایشورا ٹوپا ڈی فل ریڈر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ۔ یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کیا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ جو لوگ قدیم ہندستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کو ضرور پڑھیں صفحات (۴۴۰) قیمت ہے

مشاہیر قندھار دکن اس تذکرہ میں مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی ایم اے نے دکن کے مشہور و معروف اور مردم خیز خطۂ قندھار شریف کے معزز خاندانوں اور ان کے باکمال و مایۂ ناز افراد کا اجمالی خاکہ کھینچا ہے۔ پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی استاد تاریخ جامعۂ عثمانیہ کا بصیرت افروز مقدمہ اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

قندھار شریف دکن کا بلگرام سمجھا جاتا ہے اور محمد تغلق کے زمانے سے آج تک وہاں کی سرزمین سے بڑے بڑے اولیاء، علماء، شعرا اور

مشائخ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ دکن کے مختلف شہروں اور قصبوں میں قاضیوں، خطیبوں، محتسبوں اور دیگر اہل خدمات شرعیہ کے جو خاندان آباد ہیں ان میں سے اکثروں کا تعلق قندھار شریف ہی کے بزرگوں سے ہے اس لئے یہ کتاب دکن کے شرفا اور بزرگوں کا ایک مستند اور مبسوط تذکرہ بھی جا سکتی ہے اور اس کے مطالعہ سے یہاں کی علمی و ادبی چہل پہل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

صفحات ۱۸۴۔ تعداد تصاویر ۹ قیمت عہ۔

تذکرۂ دکن ادارے کے شعبۂ نسواں کی معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے اس مجموعہ کو مرتب کر کے اپنی خوش مذاقی اور ادبی ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ اس مجموعے میں دکن سے متعلق صنف نازک کے مضامین اور نظمیں شائع کی گئی ہیں۔ اگرچہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے لیکن بہت کامیاب رہی۔ خواتین دکن کا یہ گلدستۂ رنگ و بو تعلیم یافتہ گھرانوں کی زینت بننے کے لائق ہے (۱۰۴) صفحات قیمت ۱۲؍۔

تاریخ ادب و زبان کی کتابیں

تاریخ ادب اُردو اردو زبان اور ادب کی کوئی اچھی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی۔ یہ تاریخ صرف طلبہ اور عوام کے لئے لکھی گئی ہے۔ اردو صحافت اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے جملہ اصحاب کے لئے تاریخی معلومات کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔

چھوٹی تقطیع ۱۷۶ صفحات۔ قیمت ۱۲؍

مدراس میں اُردو مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی نے مدراس میں اُردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پیش کی ہے۔ ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام تفصیل سے درج ہے۔ تاریخ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ صفحات ۲۰۰ قیمت [illegible]

اُردو مثنوی کا ارتقاء بڑی مالادار [illegible] کتاب چھپ گئی [illegible] اور معیار کے اعلیٰ رکھنے [illegible] اس کے مصنف پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا [illegible] اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے نہایت کامیاب کوشش ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن سے اس کی اہمیت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہو سکے گا۔

بڑی سائز (۱۴۳) صفحات قیمت ۱۲؍

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم اس میں مولوی میر حسن صاحب ایم اے نے ان تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جو صدیوں سے اردو زبان کو مالا مال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی جاتی رہی ہیں۔ یہ تذکرہ نہایت ہی محنت اور تحقیق سے لکھا گیا ہے اس لئے مستند بھی ہے اور مفید بھی۔ نقد ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔

چھوٹی تقطیع ۱۸۴ صفحات قیمت مجلد ۱۲؍

آریائی زبانیں یہ کتاب اردو کی ابتدائی تاریخ اور اس کے ماخذوں کا مستند تذکرہ ہے جس کو خاص ادارہ کے لئے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب ایم اے ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت و لسانیات و صدر کل ہند انجمن لسانیات نے خاص طور پر مرتب کیا ہے۔ صفحات ۱۴۰ قیمت عہ۔

بلاغت یہ کتاب فن شعر و انشاء کے محاسن سے متعلق ضروری معلومات پر مشتمل ہے جس کا پہلا حصہ معانی دوسرا بیان اور تیسرا علم بدیع سے بحث کرتا ہے۔ یہ کتاب اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور خاص کر اردو کے طلبہ کے [illegible] لئے

... حسین صاحب منشی فاضل مولوی فاضل، ... مرتب کرائی گئی ہے۔ صفحات (۵۶) قیمت ...

سرگزشت غالب

اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات، کارناموں اور اعزہ و احباب کا ایک مجمل تذکرہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کیا ہے۔ طلبہ اور ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ غالب کی تصویر اور خاندانی شجرے بھی شائع کئے گئے ہیں۔ بڑی سائز۔ صفحات ۹۶ کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ۔ قیمت ۸ ر۔

محمد حسین آزاد

اردو کے اس بڑے شاعر اور انشا پرداز کے مکمل حالاتِ زندگی اب تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ اس کتاب کو محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے لکچرار اردو کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ نے نہایت شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے یہ کتاب سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جن میں آزاد کی زندگی، شاعری اور تصانیف سے متعلق مکمل معلومات شامل ہیں۔ مع تصویر آزاد (۳۰۰) صفحات قیمت عال

یوسف ہندی قید فرنگ میں

اس کتاب میں حسن بن خبیر صاحب بی اے ایل ایل بی نے غالب کی قید کے واقعہ پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانہ کے قیدیوں کی حالت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ آخر میں غالب کا ترکیب بند اسیری بھی نقل کیا گیا ہے صفحات ۸۰ قیمت ۸ ر

اردو نامہ

اس میں اردو ادب سے متعلق ہندوستان کے بہترین انشا پردازوں اور تنقید نگاروں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے درج ہیں جو خاص طور پر لکھوائے گئے۔ اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں بطور خاص حاصل کرکے شائع کی گئیں۔ ان میں قدیم اور جدید شاعری کے جو نمونے ہیں ان سے اردو شاعری کے مختلف رجحانات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی مختلف جامعات کے اردو کے پروفیسروں کے حالات زندگی اور علمی خدمات سے اہلِ زبان کو روشناس کرایا گیا ہے، جن کی دماغی محنت اور ایثار سے نوخیز ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کی صحت بخش تربیت ہوتی ہے۔ مشاہیر اردو کے غیر مطبوعہ خطوط کو پہلی دفعہ منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ یہ خطوط اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اس میں کئی تصویریں بھی ہیں جو یا تو اردو کے شاعروں، ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اردو سے تعلق رکھتی ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ اور ارتقاء پر ایک جامع اور مفید کتاب ہے صفحات (۳۰۰) قیمت عال

روح غالب

اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔

اس کتاب میں سب سے پہلی دفعہ غالب کے خاندان و اعزہ اور ان کے سسرالی اعزہ و اقارب کے دو تفصیلی شجرے بھی شائع کئے گئے ہیں۔

غالب کی فارسی اور اردو تصنیفات کی تفصیل، ان کی نوعیت زمانۂ تصنیف ان کی اشاعت کی تاریخیں غرض تمام ضروری معلومات اس میں شامل ہیں۔ تاریخ ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے

یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

اس میں غالب کے خطوط کے ادبی حصوں کا نہایت نفیس انتخاب کیا گیا ہے تاکہ جو لوگ علمی بحثوں میں الجھنا نہیں چاہتے اور غالب کے شگفتہ اور پاکیزہ اسلوب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں وہ بے تکلف ان ادب پاروں سے محظوظ ہوسکیں۔ صفحات (۲۴۰) تعداد تصاویر (۳) کتابت و طباعت نفیس کاغذ اعلیٰ قیمت عہ

مکتوبات شاد عظیم آبادی پٹنہ کے مشہور شاعر اور ادیب شاد عظیم آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے نہایت سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ شاد کا زمانہ اردو ادب میں اس لحاظ سے معرکتہ الآرا تھا کہ اس وقت حالیؔ اور سرسید کی تحریکیں شروع ہوگئی تھیں۔ ان تحریکوں کا اندازہ تاریخ سے اس قدر واضح نہیں ہوتا جتنا کہ ادب اور خاص طور پر ایسے خطوط سے ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کتاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ایک بیش بہا تحفہ ہے چھوٹی تقطیع (۲۰۰) صفحات قیمت عہ۔

شاد اقبال اقبالؔ اور شادؔ دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے گی کہ علامہ اقبالؔ مرحوم اور مہاراجہ سر یمین السلطنۃ کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے اس کو اہتمام سے مرتب کیا گیا اور یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہوچکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اقبالؔ کی زندگی اور کردار کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق دوسرے ذرائع سے کوئی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر [illegible] صاحب نے اپنے [illegible] مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ شادؔ و اقبالؔ کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ صفحات ۲۰۰ قیمت عہ

نذرِ ولی اس میں دکن کی چار ایم اے کامیاب خواتین انشاپرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولیؔ کی معلومات، ان کے تخیل، ان کے فن شعر اور ذوقِ عرفان کے علاوہ ان کے اسلوب، زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ولیؔ کے متعلق یہ پہلی مستقل اور جامع کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ تشنگانِ ادب کی تسلی کا باعث ہوگا۔

صفحات ۲۴۸ طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر دو جگہ سنہری نام قیمت مجلد عہ

گارساں دتاسی اردو کے پہلے پروفیسر، فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقۂ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ، اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کی یورپ کی درس گاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر زورؔ صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب صفحات (۱۲۸) قیمت عہ

نقدِ سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ نے حضرت فانیؔ بدایونی کے کلام پر فنی نقطۂ نظر سے سخن ورانہ تنقید کی ہے۔

تعداد صفحات (۱۲۶) قیمت عہ۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین بی اے
سکینہ بیگم
عبد الحفیظ صدیقی بی ایس سی

صفحہ ۱۵۳
۲۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
ممالک غیر سے ایک شلنگ آٹھ آنے
فی پرچہ ۶ مر

جلد (۷) — بابت مارچ سنہ ۱۹۴۴ء — شمارہ (۳)

خواجہ حمید الدین شاہد بی اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد سے شائع ہوا۔

نیا گھر

محلے کے پٹھانوں میں ویسے تو سب ہی میں کچھ نہ کچھ اکھڑپن پایا
جاتا ہے لیکن ان میں بھی دلاور خاں سب پر فوقیت لئے ہوئے تھے۔ تھے
گھر کے کھاتے پیتے۔ دکن کنٹینجنٹ سے رسالداری کی پنشن ملی تھی۔
تھوڑی بہت زمینداری بھی تھی جو انھوں نے دکن سے واپسی پر
خریدی تھی۔ ویسے ان کے باپ دادا کی جاگیر بہت تھی جو غدر کے
بعد ضبطی میں آ گئی تھی۔ بچے کچے کچھ کھیت رہ گئے تھے سو وہ بھی مہاجنوں
کے سود در سود کی نذر ہو گئے۔ غدر کے تھوڑے ہی دنوں بعد دلاور خاں
کے والد فوت ہو گئے اور وہ کم عمری میں اپنے ماموں کے پاس دکن
چلے گئے اور فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اگرچہ ان کا سن اس وقت
اٹھارہ سال کا تھا لیکن تھے کڑیل جوان۔ ساری فوج میں ایسا
خوش رو، جری اور رعب دار جوان نہ تھا۔ معمولی سپاہی اور دفعدار
کرنیل کی خوشامد میں رہتے لیکن دلاور خاں کو کبھی کسی نے کسی افسر کی
چاپلوسی کرتے نہیں دیکھا۔ وہ بس اپنے کام سے کام رکھتے۔ جو وقت
فوجی فرصت سے بچتا اس میں فارسی کی کتابیں پڑھتے جنھیں دس
بارہ برس کی عمر میں انھوں نے مئو میں ایک ملاجی سے پڑھا تھا۔
اس زمانے کے انگریز افسر بالعموم اعلیٰ خاندان کے شرفا ہوا کرتے تھے۔
دلاور خاں کا کرنیل اسی قسم کا شخص تھا۔ بڑا ملنسار اور شریفوں کی قدر
کرنے والا۔ باوجود اس کے کہ دلاور خاں سوائے سرکاری کام کے
کبھی اس کے ہاں نہیں جاتے تھے لیکن وہ انھیں بہت پسند کرتا اور
دلاور خاں کی خودداری کی دل سے قدر کرتا تھا۔ چنانچہ اوروں کے
کے مقابلے میں دلاور خاں نے جلد ترقی کی اور بہت جلد رسالدار ہو گئے۔
رسالداری سے پنشن لے کر اطمینان سے مئو میں زندگی بسر کرتے تھے۔

بالعموم سرکاری نوکری کے بعد لوگ پنشن لے کر اپنے گاؤں یا
قصبے میں زندگی کے باقی دن گزارنے آتے ہیں وہ اپنے وطن میں اپنے
آپ کو اجنبی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کی طبیعت اس لئے
اور بھی زیادہ اچاٹ رہا کرتی ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ وقت کس طرح کاٹیں۔
لیکن دلاور خاں نے نچلی طبیعت پائی تھی۔ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے
تھے۔ دکن سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے مکان کے پاس آم کے دو
باغیچے لگائے تاکہ ان ہی سے تھوڑی بہت دلبستگی رہے۔ ان کا دن کا
زیادہ وقت ان باغیچوں کی دیکھ بھال میں گزرتا اور رات محلے کی پاسبانی
اور چوروں کی تاک میں۔ ان دنوں مئو کے آس پاس چوریاں اکثر ہوتی
تھیں اور کبھی کبھی پٹھانوں کے محلوں میں بھی اہیر لوگ راتوں کو چھاپے
مارتے۔ ایک رات کیا ہوا کہ شامت کا مارا ایک چور جو ذات کا کرمی تھا دلاور خاں
کے مکان سے تھوڑی دور پر ایک محلے کی بیوہ کے کٹھل توڑنے آیا۔ رات ایسی
اندھیری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ کچھ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔
اتفاق سے خاں صاحب ادھر سے گزر رہے تھے۔ چونکہ آہٹ پاکر ٹھٹکے
اور سن گن لیتے ہوئے اس کٹھل کے درخت کے نیچے پہونچ گئے جس پر چور چڑھا ہوا تھا۔
خاں صاحب کی آہٹ پاکر چور درخت پر سے کودا اور جو اسی میں بھاگنا چاہتا تھا
کہ خاں صاحب نے پکڑ لیا۔ ڈر کے مارے چور کی گھگھی بندھ گئی۔ پھر کیا تھا لاٹھی
سے اتنا مارا اتنا مارا کہ بیچارہ چور ادھ مرا ہو گیا۔ رات کے دو بجے اسے باندھ کر
گھسیٹتے ہوئے تھانے لے گئے اور تھانہ دار کو سوتے سے اٹھا کر چور کو اس کے
حوالے کیا۔ وہ تو یہ کہئے تھانہ دار خاں صاحب کو جانتا پہچانتا تھا ورنہ
الٹا ان پر مقدمہ قائم ہو جاتا۔ وہ کرمی بیچارہ کئی مہینے ہسپتال میں پڑا رہا
اس کے بعد اس قابل ہوا کہ اس کا چالان کیا جا سکے۔ اس واقعہ کے بعد سے
دلاور خاں کے محلے میں چوروں کے پر جلنے لگے۔ عام طور پر بستی میں مشہور ہو گیا کہ
دلاور خاں رات میں کبھی سوتے نہیں۔ دن میں ایک آدھ گھنٹے میں کبھی
جھپکی لے لی تو لے لی۔

دلاور خاں تھے نہایت غصیلے۔ ایسے کہ ناک پر کبھی مکھی نہ بیٹھنے دیں۔
لوگوں سے عام طور پر ملتے جلتے بھی کم تھے لیکن محلے والے ہمیشہ ان کی تعریف
کے گیت گایا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ صبح بھاجی ترکاری
لینے خود بازار جاتے جانے سے پہلے روزانہ محلے کی بیواؤں کے یہاں ضرور
ہوتے جاتے اور باہر ڈیوڑھی پر سے کسی بچے کو پکار کر پوچھ لیتے کہ کچھ بازار سے

[illegible] دیا جاتا نہیں ہے۔ اگر کسی کو کچھ منگانا ہوتا تو وہ پیسے بھیج دیتی۔
ایک بیوہ جو ان کے محلے میں رہتی تھی اس کا سالانہ وظیفہ اپنے
پاس سے مقرر کیا کرتے تھے، اور اس کے علاوہ چار روپے مہینہ بھی اس کو دیتے
تھے۔ دلاور خاں کا قاعدہ تھا کہ بازار سے واپسی پر پہلے محلے والوں کا
سامان پہنچا دیتے پھر اپنے گھر آتے۔ محلے کے غریب غربا کو ان کی ذات سے
سو قسم کے فائدے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ وہ خود بڑی نیکی سے سلوک کرتے۔
وہ اپنا آموں کا بڑا باغ کبھی فروخت نہیں کرتے تھے۔ اگر فروخت کرتے تو سو
ڈیڑھ سو روپیہ کہیں نہیں گئے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ بنئے اپنے باغ
بیچا کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے باغ تجارت کے لئے تھوڑی لگائے ہیں۔
یہ آم کھانے کھلانے کے لئے ہوتے ہیں۔ آموں کی فصل میں رات بھر
کے گرے ہوئے آم درختوں کے نیچے پڑے رہتے اور کسی راہگیر کی مجال
نہیں کہ ایک پھل بھی زمین سے اٹھائے۔ آموں کے اس باغ کے چاروں
طرف کوئی چار دیواری نہیں تھی۔ بستی کے مختلف محلوں کو اس باغ میں سے
ہو کر راستے جاتے تھے۔ دلاور خاں کے رعب کا یہ عالم تھا کہ رات بھر کے
گرے ہوئے آم صبح اس وقت تک پڑے رہتے جب تک کہ وہ خود آ کر اپنے
ہاتھ سے انھیں نہ اٹھاتے۔ سب آم ایک جگہ اکٹھا کر کے مختلف ٹوکریوں میں
انھیں رکھ دیتے اور اپنے نوکر راجہ سے انھیں محلے والوں اور عزیز و اقارب
کو بھجوا دیتے۔ محلے والوں کو فصل بھر آم خریدنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ پھر
بستی بھر میں کوئی ملاقاتی اور عزیز ایسا نہ تھا جسے متعدد مرتبہ فصل میں
آم نہ بھیجے جاتے ہوں۔

دلاور خاں کو جوانی میں کسرت کا بڑا شوق تھا جس زمانے
میں وہ دکن رجمنٹ میں ملازم تھے ایک مشہور پیشہ ور سکھ پہلوان
اورنگ آباد آیا۔ فوج والوں نے خاں صاحب کو اس سے کشتی کے لئے
آمادہ کیا۔ خاں صاحب ہر چند انکار کرتے رہے کہ میں شوقیہ
کسرت کرتا ہوں۔ پیشہ ور پہلوانوں سے میں نے کبھی کشتی نہیں لڑی
ہاں فوج میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کبھی کبھی زور کر لیتا ہوں۔
اس میں اور اس میں بڑا فرق ہے۔ لیکن لوگ نہیں مانے اور بالآخر کشتی
مقرر ہو گئی۔ فوج کا کرنل اور دوسرے انگریز افسر بھی تماشا دیکھنے آئے۔
خاں صاحب کو کشتی کے داؤں پیچ تو زیادہ نہیں آتے تھے لیکن ان کی
قوت بلا کی تھی۔ اکھاڑہ میں اترتے ہی سکھ پہلوان کا ہاتھ پکڑ کر اس
زور سے جھٹکا دیا کہ اس کا ہاتھ کاندھے سے اکھڑ گیا۔ ایک منٹ کے
اندر خاں صاحب اس کے سینے پر سوار نظر آ رہے تھے۔ پھر کیا تھا فوج
والے خوشی میں اپنی کلاہیں اچھال رہے تھے۔ کرنل اور دوسرے
انگریز افسر بھی خوشی سے بدحواس ہو گئے۔ سکھ پہلوان کو فوراً شفاخانے
میں رجوع کیا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس پہلوان کی یہ آخری کشتی تھی۔
اب چاہے اس کا ہاتھ بالکل اچھا ہو جائے لیکن وہ کبھی کشتی
لڑنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔

دکن سے واپسی پر جب کہ دلاور خاں کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ
تھی وہ روزانہ ہزار ڈیڑھ ہزار ڈنڈ بیٹھک نکال لیتے تھے۔ آموں کے
موسم میں اپنے باغ کے بیچوں بیچ ایک اکھاڑہ قائم کرتے جہاں بستی کے
نوجوان روزانہ شام کے وقت زور کرنے آتے تھے۔ خاں صاحب مونڈھے
پر بیٹھے نوجوانوں سے ہنسی دل لگی کی باتیں کرتے اور اپنی جوانی کے قصے
سنایا کرتے تھے۔ خاں صاحب کے ہاں دو تین بھینسوں کا دودھ ہوتا تھا۔
کسرت اور کشتی کے بعد وہ ہر نوجوان کو آم کھانے اور دودھ پینے پر
مجبور کرتے اور کہتے کہ آموں کے بعد دودھ پینا ضروری ہے ورنہ پیاس
کی ٹونس لگ جاتی ہے۔ خاں صاحب کے اکھاڑہ کا منظر دیکھنے کے
لائق تھا۔ ادھر پانی چھم چھم برس رہا ہے، ادھر آم ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔
نوجوان کسرت کرتے جاتے ہیں، آموں تلے سے آم اٹھا اٹھا کر چوستے جاتے
ہیں۔ خاں صاحب ہیں کہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ دوسرے کو
کھلانے سے انھیں جس قدر خوشی حاصل ہوتی تھی اور ان کا دل جو لذت پاتا تھا
اس کا اندازہ غالباً کھانے والوں کو نہ تھا۔

دلاور خاں دل سے مذہبی آدمی تھے اگرچہ روزہ نماز کے زیادہ پابند نہ تھے۔
ایک طرف تو مزاج میں بلا کی سختی تھی اور دوسری طرف انتہائی نرمی بھی تھی۔ وہ دکھوں
کو مصیبت میں دیکھ کر ان کا دل بھر آتا تھا۔ غریبوں، بے کسوں اور بیواؤں کی

[illegible] بن پڑتا منگاتے پھر ساتھ ہی ان کا سخت اہتمام رہتا کہ کسی کو
ان کی فراخ دلی کا علم نہ ہونے پائے۔ سوائے ان کے نوکر راجہ کے بستی کے دوسرے لوگوں
کو ان کی خیرات کا بہت کم حال معلوم تھا۔ ان کے گھر سے کبھی کوئی مانگنے والا خالی ہاتھ
نہ جاتا۔ ان کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ اپنی ذات پر وہ بہت کم خرچ کرتے تھے۔
ان کی پنشن اتنی تھی کہ مئو جیسی بستی میں وہ کھلے ہاتھ پر میانہ ٹھاٹ کے ساتھ
زندگی بسر کر سکتے تھے۔ پھر ان کے دونوں لڑکے انہیں ماہوار خرچ بھیجتے تھے۔
بڑا لڑکا دکن کینٹونمنٹ میں رسالداری کے عہدہ پر فائز تھا اور چھوٹے لڑکے نے اورنگ آباد
میں وکالت شروع کر دی تھی۔ پچھلے دنوں جب چھوٹا لڑکا مئو آیا تو پانچ ہزار روپیہ
پکی حویلی بنوانے کے لئے چھوڑ گیا۔ یہ روپیہ گھر ہی میں رکھا گیا اس واسطے کہ
دلاور خاں کو بنکوں پر زیادہ اعتبار نہ تھا اور بالخصوص ایسی صورت میں کہ
بنک بستی سے دور فتح گڑھ میں ہو۔ اگر بستی میں ہوتا تو کم از کم اتنا اطمینان رہتا
کہ مار پیٹ کر آدمی اپنا روپیہ نکلوا بھی لے لیکن اجنبی جگہ میں ظاہر ہے ایسا
کرنے میں دشواری ہوتی۔ خاں صاحب نے اپنے آموں کے باغ کے قریب
اینٹوں کی بھٹی لگالی اور اپنی نگرانی میں مکان کی تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔
باوجود اس مشغولیت کے ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی صبح
اٹھنا، محلے والوں کے یہاں جانا اور سودا سلف بازار سے لا کر دینا۔ ان کے
چھوٹے لڑکے نے جب وہ مئو آیا تھا ہر چند دلاور خاں سے کہا کہ اب ابا جان
آپ بوڑھے ہو گئے ہیں خود بازار جانے کی بجائے راجہ سے سودا سلف منگا
لیا کیجئے۔ اس پر خاں صاحب بگڑ کر بولے "لوگ کہیں گے کہ بیٹے کی کمائی پر
دماغ میں ریاست کی بو باس پیدا ہو گئی۔ یہ بات وضعداری کے خلاف ہے
ہماری زندگی کا ڈھنگ وہی رہے گا جو اب تک رہا ہے۔ ہمارے گھر میں
چار پیسے ہو گئے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنا کام اپنے ہاتھ سے نہ کریں
پھر راجہ کم بخت کو اچھے برے گوشت کی پہچان نہیں۔ کبھی اس سے گوشت
منگایا تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لال لال بکٹے لاتا ہے۔ ایسے کہ دو دن بھی چولھے پر
چڑھے رہیں تو نہ گلیں۔ بھلا ایسا گوشت کھانے سے فائدہ؟ محلے میں جو غریب
بڑی بوڑھیاں اور بیوائیں رہتی ہیں ان سے راجہ کو للہی دشمنی ہے۔ اس کا
بس چلے تو ان سبھوں کو زندہ دفن کر دے۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میں
ان کی مدد کیوں کرتا ہوں۔ جب دیکھو وہ ان غریبوں کی میرے سامنے
برائی کیا کرتا تھا۔ جس کسی کا مجھ سے تھوڑا بہت کام نکلتا ہے وہ اس کی آنکھ
میں نہ معلوم کیوں کھٹکتا ہے لیکن اگر راجہ میں یہ کوئی بات نہ ہوتی جب بھی
بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اپنے ہاتھ پیروں کی دیکھ بھال چھوڑ دوں اور سودے
سلف کے لئے نوکروں کا دست نگر ہو جاؤں۔"

دلاور خاں کے چھوٹے لڑکے نے باپ کو ہر چند قائل کرنا چاہا لیکن وہ برابر
اپنی بات پر قائم رہے۔

ایک دن صبح کے وقت دلاور خاں حسب معمول سودا سلف خریدنے
بازار جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص کو دیکھا کہ ایک آم کے درخت تلے
ننگا دھڑنگا بیٹھا ہے اور چلا چلا کر کسی کو گالیاں دے رہا ہے۔ دلاور خاں نے
جب اس شخص کی طرف مڑ کر دیکھا تو وہ بولا "دیکھتا کیا ہے، تجھی کو کہہ رہا ہوں۔
آیا بڑا طرہ باز کہیں کا۔"

دلاور خاں اس قسم کے طرز خطاب کے مطلق عادی نہ تھے۔ پہلے کچھ
چیں بہ جبیں ہوئے لیکن پھر خیال کیا کہ شاید کوئی پاگل شخص ہے اس سے کیا
منہ لگے۔ اتنے میں دو شخص صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے آم کی جڑ کے
پیچھے سے دلاور خاں کی طرف بڑھے اور ان کے پاس آکر کہنے لگے "کرم علی شاہ میاں
یہی ہیں۔ یہ جسے گالی دے دیں یا مخاطب ہو جائیں سمجھو اس کی قسمت جاگ گئی۔
ہم دونوں دو گھنٹے سے یہیں آس پاس پھر رہے ہیں لیکن یہ ہماری طرف دیکھتے
ہی نہیں۔ دنیا کا عجیب حال ہے۔ بن مانگے موتی اور مانگے بھیک نہیں ملتی۔"

دلاور خاں نے چال ڈھال سے پہچان لیا کہ یہ دونوں شخص کہیں باہر کے
ساہوکار ہیں۔ ان کی طرف خطاب کرتے ہوئے کہا "آپ دونوں مجھے یہاں کے
نہیں معلوم ہوتے" ان میں سے ایک نے جواب دیا "ہم پٹیالے کے رہنے والے
ہیں۔ ہم نے ایک گوسائیں کی زبانی سنا ہے کہ سہاور کے ایک بنئے کو جو سٹہ
کرتا ہے کرم علی شاہ نے لکھ پتی بنا دیا۔ ہم دونوں اسی فکر میں آئے ہیں کہ
میاں صاحب کی ہم پر بھی عنایت کی نظر ہو جائے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اس ننگے دھڑنگے شخص نے پھر چلا کر دلاور خاں
کی طرف خطاب کرتے ہوئے کہا "ہم اکیلے ہی اکیلے کھاتے ہیں۔ اکیلے ہی اکیلے
ہم یہاں یوں ہی لے آموں کے رہیں۔"

دلاور خاں کے دل پر ایک ہیبت سی طاری ہو گئی۔ انھوں نے

[illegible] [illegible] دیا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی طاقت انھیں [illegible]
[illegible] [illegible] کو [illegible] دیر تک غور سے دیکھتے رہے
[illegible] آہستہ آہستہ گنگنانے لگے۔

[illegible] گھونٹ۔ وہ کر کے سر پر [illegible] کے آموں کی پوٹلی
[illegible] کی طرف چلے۔ کرم علی شاہ نے دور سے دیکھا تو قہقہہ مار کر ہنسے۔
[illegible] پیش کئے۔ سلام کیا اور بازار کی طرف چل دئے۔ بازار میں
[illegible] اور اسی راستے سے واپس آ رہے تھے کہ دیکھتے کیا ہیں کہ
[illegible] بنیا منھو لال کرم علی شاہ کی جھونپڑی کے پاس ہاتھ جوڑے
کھڑا ہے۔ میاں صاحب ہیں کہ اس کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔ منھو لال کا
[illegible] لاکھوں کا لین دین تھا اور بڑے بڑے پٹھان جو اپنی مونچھوں پر
تاؤ دیا کرتے تھے اس کے مقروض تھے۔ بستی میں عام طور پر مشہور تھا کہ
مونچھوں پر تاؤ دینے والوں کو مونچھیں نذر کرنے کو کڑوا تیل اسی وقت نصیب
ہوتا ہے جب کہ منھو لال ادھار دے۔ پٹھانوں کی بڑی بڑی جائدادیں یا تو
اس کے قبضے میں آ گئی تھیں، یا رہن تھیں جنھیں چھڑانا ممکن نہ تھا۔
خاں صاحب جھونپڑی کی طرف سے گزر رہے تھے کہ کرم علی شاہ نے
آنکھیں اٹھائیں اور کہنے لگے! "یہ مرد بچہ ہے مرد بچہ۔ آج
ایک مرد بچے کو دیکھو۔ دنیا کا کیا ہے نہیں۔ کل بھی آنا ہی تھا۔ اللہ کو کام کا آدمی
ہوتا ہے۔ ٹھنڈی مٹی کس کام کی۔ بیج ڈالو تو کچھ اگے بھی نہیں ٹھنڈی مٹی
کس کام کی"۔

میاں صاحب یہ کہہ کر چپ ہوئے ہی تھے کہ خاں صاحب نے سلام کیا
اور گھر کی طرف چل دیے۔ منھو لال بنیا ان کے پیچھے ہو لیا اور جب میاں صاحب
کی جھونپڑی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو خاں صاحب کو پکارا کہ ذرا ٹھہرنا
اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا دونا تھا جس میں جلیبیاں، امرتیاں اور برفی
کے دانے تھے۔ منھو لال خاں صاحب سے یوں مخاطب ہوا "خان تم بڑے
قسمت کے دھنی ہو۔ تم نے نہ معلوم میاں صاحب پر کیا جادو کر دیا کہ تم پر
اتنے مہربان ہیں۔ میں آج چھ دن سے روز آتا ہوں گھنٹوں مٹھائی کا
دونا لئے جھونپڑی کے چاروں طرف پھرتا ہوں کہ میرے حال پر عنایت کی

خاں صاحب منھو لال کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ سال [illegible]
اسی کی دکان سے گھر بھر کے لئے کپڑا خریدتے تھے۔ خاں صاحب بولے
"لالہ جی میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ آج صبح ادھر سے بازار جا رہا تھا کہ
خود میاں صاحب نے مجھ سے خطاب فرمایا۔ یہ ان کی بڑی مہربانی ہے، ان کا
بڑا کرم ہے"۔
منھو لال ۔ میاں صاحب کو اب یہاں آئے ہوئے پندرہ روز کے قریب ہو گئے
خدا کی مخلوق ہے کہ ٹوٹی پڑتی ہے لیکن ان کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ
کسی سے بولنا تو کجا کسی کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ ان کے کرامات کی قنوج
سے لے کر کیمل پور تک دھوم ہے۔ ایوب پور میں تو انھوں نے ایک کوڑھی کو اچھا
کر دیا اور ایک بنئے پر مہربان ہوئے تو اس کو لاکھوں کا آدمی بنا دیا۔
خاں صاحب ۔ میاں کرم علی شاہ اصل میں کہاں کے ہیں اور کون ہیں؟
منھو لال ۔ میاں صاحب اصل میں رہنے والے تو چھپرا سو کی طرف کے ہیں۔
پہلے ذات کے کالستر تھے۔ عربی، فارسی خوب جانتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں
کہ دیوان حافظ تو انھیں پورا حفظ ہے۔ قنوج میں ایک تحصیلی مدرسہ میں
پڑھاتے تھے۔ کوئی سرحدی فقیر قنوج آئے تھے ان کے ہاتھ پر بیعت
کر لی اور دنیا کو چھوڑ چھاڑ کبھی آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔ پرماتما نے
ان کی زبان میں ایسی تاثیر دی ہے کہ جو کہہ دیں وہ پورا ہو جاتا ہے۔
کوئی چار سال کا عرصہ ہوا میں نے انھیں اسی حالت میں چٹیالے میں
دیکھا تھا۔ کوئی دو برس ہونے کو آئے اسی حالت میں قادر گنج کے میلے
میں دیکھا۔ لوگ گنیوں اور روپیوں کی تھیلیاں لا کر دیتے تھے اور میاں
صاحب میلے میں جا کر بھیک مانگنے والوں اور لنگڑے لولے فقیروں کو سب
بانٹ آتے تھے۔ میں تو اسی وقت سے ان کا معتقد ہو گیا کہ جس شخص کو دھن
دولت کی پروا نہیں اس سے بڑھ کر کوئی مہاتما نہیں ہو سکتا جب کسی پر
بہت مہربان ہوتے ہیں تو اس سے کچھ لانے کی فرمائش کر دیتے ہیں لیکن
وہ جو کچھ منگاتے ہیں اپنے لئے نہیں، دوسروں کے لئے۔ آج صبح نہ معلوم
انھیں آم کون دے گیا تھا۔ جب میں آیا تو وہ سامنے کی بھنگیوں کی
جھونپڑیوں میں بچوں کو آم تقسیم کر رہے تھے جس بچے کو آم دیتے اس کا

خاں صاحب ۔ اچھا آم تقسیم کر دیتے۔ کل پھر میاں صاحب کے لئے آم لاؤنگا۔

مٹھولال ۔ آم کیا تم لائے تھے؟

خاں صاحب ۔ ہاں میں ابھی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ہوا آموں کی پوٹری میاں صاحب کے پاس چھوڑ گیا تھا چن چن کے میٹھی میٹھی چکیاں لایا تھا۔

مٹھولال ۔ پٹھان، تمہیں مبارک ہو۔ تم خوش قسمت ہو کہ میاں صاحب نے تم سے فرمائش کی۔ لوگ تو مہینوں چکر کاٹتے ہیں لیکن میاں صاحب ہیں کہ دیکھتے تک نہیں۔

یہ کہہ کر مٹھولال نے نمسکار کی اور خاں صاحب ان سب باتوں پر جو ابھی مٹھولال سے ہوئیں غور کرتے ہوئے گھر کی طرف لوٹے۔ گھر پہنچ کر منہ ہاتھ دھویا، کھانا کھایا، حقہ پیا اور ذرا آرام کرنے لیٹے۔ رہ رہ کر کرم علی شاہ کی نورانی شکل ان کی نظروں کے سامنے آجاتی تھی۔ سوچتے سوچتے ذرا جھپکی سی آگئی تو خواب کیا دیکھتے ہیں کہ کرم علی شاہ ان کی انگلی پکڑے ایک ندی پار کرا رہے ہیں۔ ندی کا پانی بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ یہ ندی اسی طرح کی تھی جیسی کہ انھوں نے دکن کے پہاڑی علاقوں میں برسات کے زمانے میں ندیاں دیکھی تھیں، جن کے ریلے کے آگے ہاتھی بھی نہ رک سکے۔ کرم علی شاہ آہستہ آہستہ ندی میں قدم بڑھا رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں "ہمت، میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ۔ پٹھان ڈرتے نہیں۔"

اب خاں صاحب کے دل میں کرم علی شاہ کی عقیدت پیدا ہو گئی۔ کوئی دن ناغہ جاتا جب کہ وہ گھنٹہ دو گھنٹے ان کی صحبت میں نہ بیٹھتے ہوں۔ کرم علی شاہ بھی کبھی کبھی خاں صاحب کے یہاں آتے اور گھنٹوں بیٹھتے۔ دیوان حافظ اور عراقی کی غزلوں کے اشعار گا کر پڑھتے۔ آدمی تھے نہایت خوش الحان۔ عراقی کی غزل کا جب یہ شعر پڑھتے ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی   کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

تو ان کی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، گویا کہ رقص مجسم بن گئے ہیں۔

حافظ کی یہ غزل بہت پسند تھی۔ پڑھتے جاتے اور جھومتے جاتے ؎

اے خسرو خوباں نظرے سوئے گدا کن   رحمے بمن سوختۂ بے سر و پا کن

دارد دل درویش تمنائے نگاہے   زاں چشم سیہ مست بیک غمزہ روا کن

با دل شدگاں جور و جفا تا کے آخر   آہنگ وفا ترک جفا بہر خدا کن

نشنو سخن دشمن بدگوئے خدا را   با حافظ مسکیں خود آ دوست وفا کن

ایک دن کرم علی شاہ، خاں صاحب کے مکان کے سامنے آم کے سایہ میں بیٹھے

جس نے مکان کی تعمیر کے لئے چولہے وغیرہ کا ان سے ٹھیکہ لے لیا تھا۔ وہ کچھ ذرا بٹہ باز تھا۔ اس نے بھاؤ تاؤ میں کچھ بدمعاملگی کی۔ خاں صاحب طیش میں آپے سے باہر ہو گئے اور اس کو کچھ برا بھلا کہا۔ خاں صاحب کا خیال تھا کہ کرم علی شاہ جو دور کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے ان کی باتیں نہیں سن رہے ہیں۔ لیکن وہ سب کچھ بیٹھے بیٹھے سن رہے تھے۔ جب بنیا چلا گیا تو خاں صاحب کرم علی شاہ کے پاس آ کر بڑے ادب سے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ کرم علی شاہ خاں صاحب کو دیکھ کر یوں مخاطب ہوئے۔

"پٹھان تم بڑے غصیلے ہو۔ تم نے بنئے کو خواہ مخواہ برا بھلا کہا۔ اگر تمہارا معاملہ اس سے نہیں پٹتا تو کسی دوسرے سے معاملہ کر لو۔ لیکن کسی شخص کو برا بھلا کہنے سے کیا فائدہ۔ تمہارا غصہ میں کم کروں گا۔ اچھا آج ہی فتشنہ لگا کر پیدل متھرا جاؤ۔ وہاں ایک مہینے رہو اور اسی حالت میں واپس آؤ اور مجھ سے ملو۔ تب ہم تم سے بولیں گے"

خاں صاحب نے کرم علی شاہ کا حکم سنا اور ان پر سکتہ کی سی حالت طاری ہو گئی۔ جسم میں خون معلوم ہوتا تھا جیسے خشک ہو گیا ہو۔ مکان کی نیو کھدوا چکے تھے۔ تعمیر کا سامان خریدا جا چکا تھا اور جو سامان باقی تھا اس کے لئے روپیہ پیشگی دیا جا چکا تھا برسات کا موسم سر پر آ رہا تھا گھر پر اور کوئی شخص موجود نہیں جو دیکھ بھال کر سکے۔ ایسی حالت میں سب کچھ چھوڑ کر متھرا جانا۔

خاں صاحب یہ باتیں سوچ ہی رہے تھے کہ کرم علی شاہ یوں بولے :-

"جس مکان کی نیو پر پوری برسات گزر جائے وہ مضبوط رہتا ہے اور بننے کے بعد چاہے برسوں تک اس کی دیکھ بھال نہ ہو تب بھی نہیں گرتا۔ نیو کو خوب پانی کھانے دو، خوب سنسنے دو اس سے پٹھان نقصان میں نہیں رہو گے۔"

اب خاں صاحب نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے کوئی ان کی زندگی کو بالکل بدلے دیتا ہے۔ انھوں نے دل میں ایک طرح کا اطمینان اور خوشی محسوس کی اور کرم علی شاہ کی طرف دیکھ کر کہا "جو حضور کہتے ہیں وہ پورا کروں گا" کرم علی شاہ بازار کی طرف چل دئے، خاں صاحب نے فوراً متھرا روانہ ہونے کی تیاری شروع کر دی اپنے بہنوئی رستم خاں کو گھر بار کا انتظام سپرد کیا اور صبح سویرے متھرا کی راہ لی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ برسات سے کچھ دن پہلے کی گرمی بڑی سخت ہوتی ہے۔ دن کو چلچلاتی دھوپ اور رات کو گرم گرم بھوبل آسمان سے گرتی ہے کہ آدمی کو نہ بیٹھے چین اور نہ لیٹے چین ملے۔ پانی پہ زندگی ہوتی ہے۔ ایسے وقت تھے جب کہ

[illegible] ... میں کہیں کسی سرائے میں آرام کرتے۔ آٹھویں دن
[illegible] ایک سرائے میں ٹھیرے میاں حقا کے حکم کے مطابق وہ تھے پر
[illegible] چند روز بنا لی تھی۔ جس سرائے میں ٹھیرے اس کے سامنے
کے سادھو دھونی رمائے بیٹھا رہتا تھا۔ خاں حقا کا جب جی گھبراتا تو اس کے
پاس [illegible] اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔ چند روز میں سادھو سے دوستی
ہو گئی۔ اسے اپنا سارا اصل حال بتلایا۔ سادھو بہت مہربان ہو گیا۔ وہ
کرم علی شاہ کو جانتا تھا اور ان پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اس نے کہا کہ جب تم
متھرا واپس جاؤ تو شاہ صاحب کو میرا سلام کہنا۔ سادھو کا نام سنیس بہاری تھا۔
کرم علی شاہ کی صحبت میں خاں حقا کی ذہن میں ایسی جلا پیدا ہو گئی تھی
کہ وہ درویشوں کے اشاروں کنایوں کی باتوں کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ سادھو
ان سے اس قسم کی باتیں کیا کرتا اور وہ ان سے خوب لطف اندوز ہوتے۔
ایک رات سنیس بہاری کے پاس بیٹھے تھے کہ بازو والے گھر سے گانے ناچنے
کی آواز سنائی دی۔ سنیس بہاری نے کہا "جانتے ہو یہ کیا ہے!" خاں حقا بولے
کہ شاید کسی جشن کی خوشی منائی جا رہی ہو گی۔ سنیس بہاری نے کہا "یہ موت کی خوشی ہے"۔
خاں حقا یہ جملہ نہیں سمجھے۔ انھیں ہکا بکا دیکھ کر سنیس بہاری بولے "ابھی
چند مہینے گزرے اسی مکان کے مالک کا انتقال ہوا۔ اس کا بیٹا ساری
جائداد کا مالک ہوا۔ یہ لڑکا سادھوؤں سے اپنے باپ کے مرنے کی دعائیں کرایا
کرتا تھا۔ میرے پاس بھی کئی دفعہ آیا، میں نے دھتکار دیا۔ اب یہ پاگل اس
رقاصہ سے جو اس وقت اس کی محفل کی رونق بنی ہوئی ہے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔
آج پھر میرے پاس دعا کرانے آیا تھا کہ یہ عورت اس سے محبت کرنے لگے۔ لیکن اس
عورت کو دھن دولت کی پروا نہیں۔ وہ خود سونے اور موتیوں میں لدی ہوئی ہے
اور اس کا دل اس کے مکھ سے زیادہ روشن ہے۔ اس کی قسمت میں نجات ہے۔
وہ ہرگز اس سے بیاہ نہیں کرے گی۔ بہت جلد وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر نیکی کی
زندگی بسر کرے گی۔ اپنا سارا دھن دولت غریبوں اور بے کسوں پر خرچ کرے گی۔
کئی دفعہ وہ اپنے دل کا دکھڑا میرے سامنے رو چکی ہے۔ مجھ سے کہتی ہے دعا کرو
کہ اس کو گناہ کی زندگی سے چھٹکارا ملے۔ اسے ضرور ایک دن نجات ملے گی اور وہ دن
بہت دور نہیں ہے۔ وہ کسی نیک آدمی سے بیاہ کرے گی، اس کو سکھ دے گی اور
خود بھی سکھی ہو گی۔ اور وہ لڑکا تو آتما کا روگی ہے۔ اگر یہ رقاصہ اس کے
پلے پڑی تو اس کی نجات میں بھی روڑا اٹکائے گا۔ وہ آتما کا روگی ہے آتما کا
روگی۔ اس کی ساری عمر عیاشیوں میں گزر رہی ہے۔ باپ کی ساری جائداد
یوں ہی عیش و عشرت میں تباہ کرے گا اور پھر لنگوٹی لگائے پھرے گا۔ اس کی
قسمت میں یہ ہے۔ جیسے جنگل میں سوتے ہوئے ہرن پر سانپ لپٹ جاتا ہے
اور ہرن کو اس کی خبر نہیں ہوتی، اسی طرح مایا کا سانپ اس کے تن بدن پر
لپٹا ہوا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا زہر اس کے جسم میں سرایت کر رہا ہے۔
دنیا دیکھے گی کہ ایک دن وہ دھڑ سے زمین پر گر پڑے گا جیسے ہرن گرتا ہے۔
ایسوں ہی کی آتما مرنے کے بعد بھٹکتی پھرتی ہے۔ تم میرے ساتھ مرگھٹ چلو
وہاں تمہیں ایسے بہت سوں کی روحوں کا تماشا کراؤں گا۔ جس کو زندگی میں
شانتی نہیں نصیب ہوئی اس کو مرنے کے بعد بھی سکھ نہیں مل سکتا۔ آؤ چلو چلیں۔

خاں حقا۔ سنیس بہاری جی، آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن مجھے بھوت پلید
سے ڈر لگتا ہے۔

سنیس بہاری۔ پٹھان ہو کر اور ڈرا کرم علی شاہ کے چیلے کو سوائے خدا
کے کسی سے نہیں ڈرنا چاہئے آؤ ذرا چلو تو، کیا مزہ کا تماشا تمہیں دکھاؤں۔
مرگھٹ یہاں سے بہت دور نہیں۔ ابھی ابھی ہم پہونچتے ہیں۔

یہ کہہ کر سنیس بہاری نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور چل کھڑے ہوئے۔ خاں حقا
ان کے پیچھے پیچھے ہوئے۔ متھرا کی تنگ و تاریک گلیوں میں ہوتے ہوئے
شہر کے باہر ذرا فاصلہ پر مرگھٹ پہونچے۔ ایک نیم کے پیڑ تلے سنیس بہاری
بیٹھ گئے اور مراقبہ میں چند منٹ تک آنکھیں بند کر لیں اس کے بعد
خاں حقا کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے "وہ دیکھو سامنے ہوا میں ایک آدمی
نظر آ رہا ہے جس کے نیچے کے آدھے دھڑ سے دہکتے ہوئے شعلے نکل رہے ہیں۔
دیکھو اس کی آنکھیں کیسی پھٹی پھٹی ہیں، ایک ہونٹ نیچے کو لٹکتا ہوا،
دانت باہر نکلے ہوئے اور سر پر بالوں کی جگہ کانٹے ہیں۔ دیکھا تم نے...."

خاں حقا۔ ہاں دیکھا، کیسی تکلیف میں ہو گی اس کی جان۔

سنیس بہاری۔ جانتے ہو یہ کون ہے؟ یہ اس بستی کا مشہور وید تھا۔
لاکھوں روپیہ اس نے کمایا۔ اپنے فن کا بڑا ماہر لیکن انتہا درجہ لالچی تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں جنبش نہیں تھی۔ اگر کوئی پیسے والا موٹا اسامی
اس کے پھندے میں پھنس جاتا تو اپنی گوٹ خوب گرم کرتا اور جہاں تک بن پڑتا
بیماری کو بڑھاتا تاکہ جب تک روپیہ سمیٹ سکے سمیٹے۔ غریبوں کی طرف بے توجہی
کرتا تھا۔ جو آدمی دیا ہوا علم ٹھیک طور پر استعمال نہیں کرتا اس کی یہ حالت
ہوتی ہے۔

یہ جملہ ختم کرتے ہی سینس بہاری نے دکن کی طرف ہاتھ اٹھایا اور
کہا۔ "دیکھو، وہ غصیلا زمیندار ہے!" یہ ایک بوڑھا تھا۔ اس کے دونوں
ہاتھوں اور زبان میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی
ہوئی اور گال پچکے ہوئے تھے۔

خاں صاحب نے سینس بہاری سے پوچھا "یہ اس کی زبان میں شعلے کیوں نکل
رہے ہیں؟" سینس بہاری نے کہا "اس کی زبان سے کوئی محفوظ نہ تھا۔ یہ
ہر شخص کو جو اس سے کمزور ہوتا گالی گلوج کیا کرتا تھا!"

خاں صاحب کو یہ منظر دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ اب وہ سمجھے کہ کرم علی شاہ
نے انہیں متھرا کیوں بھیجا تھا۔ کیا اسی منظر کو مجھے دکھانا مطلوب تھا۔
اب آئندہ میری زبان سے کسی کے خلاف ایک لفظ نہیں نکلے گا۔ خاں صاحب
ابھی یہ باتیں دل ہی دل میں کر رہے تھے کہ سینس بہاری نے اتر کی طرف
اشارہ کیا اور کہا "وہ دیکھو، ایک نیک آدمی جا رہا ہے۔ یہ یہاں کی پلید
روحوں سے دور جمنا جی کے کنارہ رہتا ہے۔ اس کی چال میں کس قدر اعتماد ہے
چہرہ پر نور اور شانتی برستی ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھیں کیسی روشن
ہیں۔ یہ ایک اچھوت تھا۔ اپنے کرموں کی بدولت اس کا مرتبہ برہمنوں سے
اونچا ہے۔ آدمی کی ذات پات قوم کچھ کام نہیں آتی۔ اگر کوئی چیز کام آتی ہے تو
اس کی نیکی۔ جو نیکی کرے گا وہ اس کا پھل پائے گا۔"

سینس بہاری نے خاں صاحب سے پوچھا "کہو کچھ اور دیکھو گے یا
گھر چلیں؟" خاں صاحب اب بالکل تھک گئے تھے۔ بولے "اب گھر ہی چلیں"
راستہ بھر سینس بہاری کرم علی شاہ کے گن گاتے اور بتاتے رہے کہ
کس طرح ان کی صحبت میں انسان کو روحانی فیض حاصل ہوتا ہے۔ باتیں
کرتے جاتے اور بیچ بیچ میں کبیر داس کے دوہے گاتے جاتے۔ سرائے کے
پاس پہونچے تو سینس بہاری اپنی دھونی پر چلے گئے اور خاں صاحب
سرائے میں۔ خاں صاحب نے وضو کر کے عشاء کی نماز ادا کی اور سیدھے پلنگ پر
جا کر لیٹ رہے۔ لیٹتے ہی نیند آگئی۔ خواب میں دیکھا ایک مرد بزرگ [illegible]
کے ساتھ مرگھٹ کے اتر جانب دیکھا تھا نظر آئے۔ خاں صاحب کرم علی شاہ
کی باتیں کرتے رہے اور ان کی خوبیاں بیان کرتے رہے۔ جاتے جاتے کہا۔
"دھن، دولت، علم اور قوت سب مایا ہے۔ نیکی اور کرم اصل چیز ہے۔
سب چیزیں مٹنے والی ہیں لیکن آدمی کی نیکی کبھی نہیں مٹتی وہ پہاڑ کی طرح
ہمیشہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔"

خاں صاحب کی آنکھ کھلی تو صبح کی پو پھٹ رہی تھی۔ حاجت
ضروریہ سے فارغ ہو وضو کر فجر کی نماز ادا کی اور نماز کے بعد گڑگڑا
گڑگڑا کر دعا مانگی کہ اے خدا! اے دنیا کے پیدا کرنے والے! مجھے
توفیق دے کہ میں مخلوق کی بھلائی کے لئے اپنے آپ کو تج دوں۔
کبھی کسی کو میرے ہاتھ یا میری زبان سے تکلیف نہ پہونچے۔ میں
جب تک زندہ رہوں تیرے احکام کی بجا آوری کروں اور جب مروں
تو میری روح کو امن و سکون بخش۔"

دلاور خاں کو اب متھرا میں ایک مہینہ گزر چکا تھا وہ مئو روانہ ہونے
سے پہلے سینس بہاری سے جا کر رخصت ہوئے۔ سرائے والوں کا حساب
بے باق کیا اور صبح سویرے پیدل روانہ ہو گئے۔ ایٹہ اور چھپالے
ہوتے ہوئے ساتویں دن مئو واپس پہونچے۔ گھر پر سب لوگ واپسی
کے منتظر تھے۔ سب سے مل ملا کر سیدھے کرم علی شاہ کی جھونپڑی کو چلے
شاہ صاحب نے دور سے خاں صاحب کو آتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے
اور کہا "آؤ خان آؤ، لوہا جتنا تپتا ہے اتنا ہی مضبوط اور کارآمد
بنتا ہے۔" خاں صاحب کرم علی شاہ کے سامنے آنکھیں نیچے کئے بیٹھے
رہے۔ کرم علی شاہ نے پوچھا "کہو متھرا میں کیا دیکھا؟" خاں صاحب نے
سینس بہاری اور مرگھٹ کے مناظر کا ذکر کیا۔ کرم علی شاہ نے سینس بہاری
کا نام سنا تو اچھل پڑے اور بولے "ارے، وہ ہمارا دوست آج کل
متھرا میں ہے، اس سے ملے ہوئے مدتیں ہو گئیں، بڑا [illegible] آدمی ہے۔

یہ ایک پہاڑی خطہ کی کہانی ہے، جہاں اکثر خانہ بدوش قبیلے آکر ٹھہرتے ہیں۔ ایک مرتبہ یہاں شینو اور اس کے قبیلے کے لوگ آکر ٹھہرے۔ یہ لوگ چھوٹی موٹی تجارت کرتے تھے لیکن نوجوان شینو کی شوخ فطرت نے چوری اور لوٹ مار کو اپنا ذریعۂ معاش بنا رکھا تھا۔ وہ اپنے قبیلے میں بہت ہر دل عزیز تھا۔ قدرت نے اُسے شیر کا سا دل دیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے سب ساتھی اس کی برتری تسلیم کرتے تھے۔ شینو کو یہاں آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا لیکن اس عرصے میں اطراف واکناف کے مقامات کی شاید ہی کوئی دکان یا شاید ہی کوئی مکان ہوگا جسے شینو نے نہ لوٹا ہو۔ وہ چالاک اور طاقتور بھی تھا بڑی سے بڑی جگہ بھی ہاتھ ڈالنے میں اسے جھجک نہ ہوتی۔

پہاڑی خطوں کی برساتیں یوں تو عام طور پر بڑی پُرکیف ہوتی ہیں لیکن اس حصہ میں تو بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شراب رس رہی ہو۔ چاروں طرف سبزہ لہلہانے لگا تھا، موسم گرما کی سخت دھوپ سے جھلسی ہوئی پہاڑیاں نظر فریب ہوتی جارہی تھیں متعدد چھوٹے چھوٹے آبشار پیدا ہورہے تھے جس کا مسلسل ترنم فضا میں ایک خاص شعریت پیدا کرتا تھا۔ اسی موسم کا آغاز تھا جب شینو کے قبیلے کے قریب ایک دوسرا خانہ بدوش جرگہ آکر قیام پذیر ہوا جس کے مرد تو اطراف کے گاؤں میں ہاتھ دیکھ کر لوگوں کو ان کی قسمتیں بتا کر روزی کماتے تھے اور عورتیں اپنی پہاڑیوں میں اپنی بکریاں وغیرہ چراتی تھیں۔

ایک روز شام کے وقت شینو ان پہاڑیوں پر یونہی گھوم رہا تھا اس کی عادت تھی کہ جب اسے اپنے محبوب مشغلے سے فرصت ملتی تو وہ اکیلا اطراف کی ان ٹیکریوں پر گھوما کرتا۔ عالم خود فراموشی میں غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں سامنے چرنے والی چند بکریوں پر پڑیں چند لمحوں کے بعد ایک قریبی ٹیلے کی آڑ سے اس مختصر سے گلّہ کی رکھوالن بھی نمودار ہوئی۔ حسن، کم عمری اور سادگی کا اس سے زیادہ دلکش مجموعہ شینو نے کبھی نہ دیکھا تھا اس کی نگاہیں وہیں جم کر رہ گئیں، لڑکی نے شینو کو نہیں دیکھا اور آتے ہی اپنی بکریوں کو بلانا شروع کیا، سورج غروب ہونے کے قریب تھا لڑکی بعجلت تمام اپنی بکریوں کو جمع کرکے اپنے گھر چلی جانا چاہتی تھی لیکن شوخ بکریاں اس کے قابو میں نہیں آرہی تھیں، بے بسی اور غصہ سے اس کا پھول سا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ شینو چونکا جیسے کسی نے اسے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ لڑکی کے پاس گیا اور کہا:۔

میں ہانک دوں؟ لڑکی نے مڑ کر دیکھا پہلے تو جھجکی اور پھر نیچے دیکھتے ہوئے کہا ہانک دو، شینو نے جلدی سے بکریاں جمع کیں اور انھیں راستہ پر لگا کر ہانکنے لگا لڑکی نے احسان مندانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر دونوں راستہ پر ہو لئے۔

شینو نے اس سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟

"مُنی" اس نے ایک خاص لہجہ میں اور ایک خاص ادا کے ساتھ کہا، شینو کو ایک سرور محسوس ہوا اور اسی عالم میں اس نے پھر پوچھا۔

تم کہاں رہتی ہو؟

"وہ سامنے ہمارے لوگ ٹھیرے ہوئے ہیں" اس نے سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا شینو کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہ نووارد قبیلہ کی طرف اشارہ کر رہی تھی، اسے کچھ اطمینان بھی ہوا۔

کیا روزادھر ہی جاتی ہو؟ شینو نے کچھ ٹھیر کر سوال کیا۔

"ہاں" اس نے شینو کو ایک خاص نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا،

شیخو نے پھر ایک اطمینان کا سانس لیا۔ پڑاؤ قریب آرہا تھا باقی راستہ دونوں نے خاموشی سے طے کیا۔ البتہ دونوں ایک دوسرے کو چپکے سے دیکھ لیتے تھے اور جب دونوں کی نگاہیں لڑتی تھیں تو ایسے ڈر جاتے تھے جیسے ایک دوسرے کو کوئی گناہ کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ پہلے منی کا پڑاؤ آیا شیخو ایک جگہ کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہا وہ بھی بار بار مڑ کر اسے دیکھتی اور آخر چھوٹے چھوٹے خیموں میں غائب ہو گئی۔

یہ شیخو اور منی کی پہلی ملاقات تھی۔ رات وہ کھویا کھویا سا نظر آرہا تھا کھانا بھی اس نے برائے نام کھایا وہ اپنی چارپائی پر نہ معلوم کن تصورات میں ڈوبا ہوا دیر سے بیٹھا تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے عبدل اور رحمٰن اس کے پاس آئے۔ عبدل نے کہا۔

کیوں شیخو کس سوچ میں بیٹھے ہو؟ کیا کسی بڑی جگہ چھاپا مارتا ہے؟

نہیں، چپ یوں ہی بیٹھا ہوں' شیخو نے آہستہ سے کہا اُسے اپنے تخیلات میں یہ مداخلت اچھی نہ معلوم ہوئی لیکن رحمٰن نے اس پر غور نہ کیا اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

یہاں سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر ہری پور میں کل جاترا ہے' بڑا میلہ لگے گا' بہت ساری دکانیں آئیں گی تفریح کی تفریح رہے گی اور امید ہے کہ کچھ ہاتھ بھی آجائے گا' کل کب چلو گے؟

میں نہیں چلوں گا' شیخو نے بالکل غیر متوقع طور پر کہا' عبدل اور رحمٰن ششدر تھے اور وجہ پوچھنے ہی والے تھے کہ شیخو نے کہا

میری طبیعت سست ہے' مجھے تنہا چھوڑ دو۔ عبدل، رحمٰن ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اور اندر ہی اندر تعجب کرتے ہوئے چلے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شیخو نے ایسے اچھے موقعہ سے فائدہ اٹھانے سے انکار کیا تھا۔ شیخو بہت دیر تک ویسے ہی بیٹھا رہا۔ نہ معلوم کیوں اسے ایک خوف سا معلوم ہو رہا تھا' بہت رات گئے اس کی آنکھ تو لگی لیکن وہ ڈراؤنے اور بھیانک خواب دیکھتا رہا۔

وہ جب صبح اٹھا تو موسم بڑا اچھا تھا' ہلکی ہلکی پھوار ہو رہی تھی' کبھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھی آجاتے تھے چھوٹی چھوٹی اطراف کی پہاڑیوں میں یہ موسم غضب ڈھا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پھوار ختم ہوئی اور سورج نکل آیا' لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ شیخو نے بھی کھانا کھایا اور کچھ دیر ادھر ادھر گھوم کر سیدھا اُن ٹیکریوں کی طرف چل دیا جہاں کل اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا تھا۔

اس نے منی کو بہت جلد پالیا۔ منی خود اس کی منتظر تھی' اس دن وہ دونوں کچھ بے تکلف سے ہو گئے تھے' پوری نیند نہ ہونے سے شیخو کی آنکھیں اب تک سرخ تھیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد منی نے پوچھا۔

تمہاری آنکھیں لال کیوں ہیں؟

رات نہ معلوم کیوں بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ صبح صبح آنکھ لگی' اس لئے دیر سے اٹھا' شیخو نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

تمہیں نیند کیوں نہ آئی؟ منی نے اشتیاق سے پوچھا۔

شیخو نے اس کی مخمور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ دیر تک دیکھا پھر مسکرا کر کہنے لگا۔

"خیر چھوڑو چلو سامنے چل کر بیٹھیں" دونوں مل کر آبشار کے قریب بیٹھ گئے۔ بارش کی وجہ سے قریب کی پہاڑی میں یہ چھوٹا سا آبشار پیدا ہو گیا تھا موسم بھی بڑا خوش گوار تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھا رہے تھے' ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی' منی شیخو کو بے انتہا حسین نظر آرہی تھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ آبشار جیسے سُروں میں منی ہی کے حسن کی تعریف گا رہا ہے۔

...ایک چھوٹی اور شفاف ندی کی صورت میں
بہہ رہا تھا شیخو کو معلوم ہوا جیسے وہ بھی منی کے حسن سے مدہوش ہے۔
خوش قسمتی سے ... شیخو کے لئے کائنات کی ہر چیز کو مجسم شعر بنا
دیا تھا۔ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے کبھی ایک دوسرے کو
دیکھ لیتے تھے صرف آنکھوں کے ذریعہ ہی جذبات کی ترجمانی ہو رہی
تھی۔ آخر شیخو نے اس طلسم کو توڑتے ہوئے کہا۔

میں کتنا خوش نصیب ہوں منی ——— جواب میں منی نے
نگاہیں نیچی کرلیں۔ لیکن نہ معلوم کیوں شیخو نے ذرا دھیمے لہجہ میں
کہا "مجھے خوف معلوم ہو رہا ہے" "ابھی سے بدگمانیاں شروع کردیں"
منی نے ایک خاص ادا سے کہا اور پھر خود ہی ہنس پڑی، اس پر شیخو
بھی ہنس دیا۔

اسی طرح دونوں کے دن گزرنے لگے۔ وہ ہر روز ایک دوسرے
سے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔ چند ہی دنوں میں منی کو یہ بھی معلوم
ہوگیا کہ شیخو چوریاں کیا کرتا ہے، لیکن اس نے اسے کوئی غیر معمولی
چیز نہ سمجھ کر نظر انداز کردیا۔ شیخو اب بدستور چھاپے مارنے لگ گیا تھا
وہ جب منی کو چوری کی ساڑیاں وغیرہ لاکر دیا کرتا تو وہ مارے خوشی
کے ناچنے لگتی اور یہ دیکھ کر شیخو بے قابو ہو ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ شیخو
کو یہ بھی معلوم ہوا کہ منی کے قبیلے ہی کا ایک شخص رحیم نامی منی کا
پہلے ہی سے دعویدار ہے۔ اپنے رقیب کے نام پر شیخو کی آنکھوں
میں خون اتر آتا تھا اس کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ اس نے منی
کو ممانعت کردی تھی کہ وہ رحیم کا نام اس کے سامنے نہ لیا کرے۔
گو یہ چیز شیخو کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی لیکن اس سے شیخو
اور منی کی خوش فعلیوں میں کچھ فرق نہیں پڑا۔ پہاڑیوں، سبزہ زاروں
اور آبشاروں میں ان کی ملاقاتیں برابر جاری رہیں۔

رفتہ رفتہ یہ خبر دونوں قبیلوں میں بھی مشہور ہوگئی، شیخو
اب پہلے سے کہیں زیادہ مستعدی اور چالاکی سے چوریاں کرنے لگا
اس کے ساتھیوں نے اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش نہ کی، وہ
منی کو کسی روز ساڑی کسی روز رومال اور کبھی سستی قسم کی دوسری
آرائشی چیزیں لاکر دیتا، منی خوش ہوتی تو وہ بھی پھولا نہ سماتا۔
دونوں مل کر جنگل میں منگل منایا کرتے کبھی منی جنگلی پھولوں کے
ہار بنا کر شیخو کو پہناتی اور کبھی شیخو اس کے لانبے اور سیاہ بالوں
میں چند پھول لگا کر دیر تک دید حسن میں محو رہتا۔

شیخو کو منی سے پہلی ملاقات کئے ایک ماہ ہوگیا ایک روز
اس نے کسی بڑی جگہ چھاپا مارا، بہت سا مال اس کے ہاتھ آیا۔
ایک اچھی سی ساڑی، چولی اور قمیص کے لئے ایک دو خوبصورت
کپڑے ایک معمولی سی انگوٹھی اور سرخ چوڑیوں کا ایک جوڑا لے کر
وہ منی کی طرف چلا گیا۔ منی اس روز اتنی بہت سی چیزیں دیکھ کر
بہت خوش ہوئی دونوں اسی آبشار کے قریب بیٹھے ہوئے تھے
جہاں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ سرخ نگینہ کی انگوٹھی پہناتے
ہوئے شیخو نے اسے اپنے قریب کھینچ لیا منی بھی اس کے قریب
کھسک آئی اس کا سر شیخو کے چوڑے سینے پر تھا اور وہ اپنی
خوبصورت انگلیوں سے اس کے لانبے اور گھنے بالوں سے
کھیل رہی تھی، آبشار پہلے ہی کی طرح محو ترنم تھا اور اس کا
پانی بھی اسی مدہوشی سے بہہ رہا تھا۔ شیخو اپنے آپ پر ناز
کررہا تھا لیکن دفعتاً اسے ایک خیال آیا اور اس نے پوچھا

تم ہمیشہ کے لئے میری کب ہوجاؤ گی منی؟ منی نے اپنی
مخمور نگاہوں سے اسے دیکھا، مسکراہٹ اس کے چہرے پر
کھیلنے لگی، شیخو کو خیال ہوا کہ کیا چاند منی سے بھی زیادہ
خوبصورت ہے؟

صرف ایک شرط کے بعد، منی نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا
وہ کیا، شیخو نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔ تھوڑے توقف کے
بعد منی کہنے لگی شاہ پور کی درگاہ میں بہت مال و دولت ہے،

تمہارے لئے وہاں ہاتھ ماروں تاکہ شادی کے موقع پر میں سونے کے بندے، بالیاں، چوڑیاں وغیرہ پہن سکوں" شیخو نے ایک جھرجھری لی اور جلدی سے سنبھل بیٹھا اور کہا۔

یہ تم کیا کہہ رہی ہو منی! درگاہ جیسی مقدس جگہ میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا، اطراف کا کوئی مقام کوئی دکان یا کوئی مکان ایسا نہیں جہاں ہاتھ ڈالنے سے میں گھبراتا ہوں اور نہ مجھے ملک کے قانون ہی کا خوف ہے، ایک اندرونی آواز مجھے مقدس مقامات میں گناہ کرنے سے روکتی رہتی ہے، اسی وجہ سے میں اس درگاہ پر چھاپا نہیں مار سکتا" لیکن منی نے مکر کہا۔

اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو اس درگاہ پر چھاپا مارو، شیخو کو آمادہ کرنے کے لئے اس نے پھر کہنا شروع کیا اس کے بعد یقین کرلو کہ میں تمہاری ہوں، اس کے علاوہ میں پکا وعدہ کرتی ہوں کہ رحیم سے ملنا جلنا بالکل ترک کردوں گی"۔ شیخو نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ اپنے ارادہ سے باز آئے۔ اس نے منی کے سامنے اس کی بھی تشریح کردی کہ وہ اس میں اپنی جان کا خطرہ یقینی محسوس کرتا ہے پھر اس نے التجا کی اور بعد میں گڑگڑایا بھی لیکن عورتوں کی ضد مشہور ہے، منی ٹس سے مس نہ ہوئی اور اپنی رٹ لگائے رکھی کہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو چھاپا مارو، آخر شیخو کو مایوس ہونا پڑا۔ اسے وعدہ کرتے ہی بن پڑی لیکن اس کا دل ڈوبا جارہا تھا ایک مقدس مقام پر چھاپا مارنے کے خیال نے اسے شش و پنج میں ڈال دیا کیونکہ ایسا کرنا وہ اس مقام کی بے حرمتی اور اپنے لئے ایک گناہ کبیرہ تصور کرتا تھا۔ وہ بڑی پژمردہ دلی کے ساتھ اٹھا ایک گہری نگاہ منی کے چہرہ پر ڈالی اور آہستہ آہستہ اپنے پڑاؤ کی طرف روانہ ہوگیا۔

پڑاؤ پہنچتے ہی وہ اپنے خیمہ میں گھسا اور اپنے آپ کو چارپائی پر گرادیا۔ گزشتہ ایک ماہ کے واقعات اس کی نگاہوں میں پھرنے لگے، پہلے تو اسے منی کی اچانک ملاقات کا خیال آیا پھر وہ ملاقاتیں یاد آئیں جن میں اس نے منی کی دلجوئی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی، ہر وہ پہاڑی، ہر وہ ندی، ہر وہ وادی اور ہر وہ آبشار اسے یاد آیا جہاں اس نے منی کے ساتھ اتنی خوش گوار گھڑیاں گزاری تھیں، پھر اسے خیال آیا کہ منی کو اس نے اتنی چیزیں دیں لیکن اس کی طبیعت سیر نہ ہوئی صرف اسی کے خاطر اس نے بعض خطرناک مقامات پر چھاپے مارے جہاں اس کے پکڑے جانے کا بہت امکان تھا، اسے افسوس ہوا کہ منی نے اس کی جانبازی کی نہ صرف یہ کہ قدر نہ کی بلکہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ اس مہم میں کامیاب نہیں ہوگا، موت اس کی آنکھوں میں پھرنے لگی، اسے خیال ہونے لگا کہ وہ دانستہ موت کے منہ میں بھیجا جارہا ہے اس کے ساتھ ہی وہ جوش انتقام میں دیوانہ سا ہوگیا، لیکن اسے پھر منی کا خیال آگیا وہ منی کی خواہش کو ٹال بھی تو نہیں سکتا تھا، وہ گہری سوچ میں پڑگیا، کچھ دیر کے بعد اس کے چہرہ سے ظاہر ہونے لگا کہ وہ کسی نتیجہ پر پہنچ گیا ہے اور اس نے کوئی طریق کار سوچ نکالا ہے۔ وہ چارپائی سے اٹھا خیمہ سے باہر نکلا اور اپنے چھوٹے بھائی مراد کو آواز دی اور اس کے آنے سے پہلے چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔ مراد آیا تو اس نے شیخو کے چہرہ پر فکر اور تشویش کے غیر معمولی آثار دیکھے شیخو بہت کم فکرمند دیکھا گیا تھا مراد نے جو اس کی یہ حالت دیکھی تو متفکر ہوا اور پوچھا

کیوں بھیا کیا بات ہے؟ شیخو نے اپنی نگاہیں مراد کے چہرہ پر گاڑ دیں اور ایک ایسے لہجہ میں جس سے عزم، استقلال اور ساتھ کچھ غم کا اظہار ہوتا تھا کہنا شروع کیا۔

"مراد تم جانتے ہو میں منی کو کتنا چاہتا تھا اسے وہ سب دے دیا کرتا تھا جو میں لاتا تھا آج بھی میں نے اسے دیا اور معمول سے بڑھ کر دیا اور ساتھ ہی شادی کی درخواست بھی کی، اس نے یہ

[illegible] میں شاہ پور کی درگاہ میں چھپا یا مارا جاؤں۔ تم سے یہ امر بھی پوشیدہ نہیں کہ میں مقدس مقامات میں گناہ کرنے سے احتراز کرتا ہوں۔ میں نے اسے بہت کچھ سمجھایا لیکن وہ اپنی ضد پر [illegible] ہی میں نے مجبوراً وعدہ کر لیا ہے، میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ میں اس مرتبہ پکڑا جاؤں گا اور قانون کے مطابق مجھے موت کی سزا دی جائے گی۔ لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں اور آج وہیں جا رہا ہوں، اگر قسمت نے یاوری کی تو اچھا ہی ہے اور اگر پکڑا کر مروا دیا جاؤں تو مراد مجھ سے وعدہ کرو کہ منی بھی میرے بعد زندہ نہ رہے گی۔ یہ نہ میں گوارا کر سکتا ہوں اور نہ تم گوارا کر سکو گے کہ منی میرے بعد جیم کے ساتھ رنگ رلیاں کرے۔ یہ عورت مجھے دانستہ موت کے منہ میں بھیج رہی ہے، اگر میں مارا جاؤں تو اسے بھی میرے بعد زندہ رہنے کا کوئی حق نہ ہونا چاہئے"۔۔۔۔۔

شیخو کچھ دیر کے لئے ٹھیرا اور پھر کہنے لگا "اگر تم نے ایسا نہ کیا مراد تو میری روح قبر میں بھی بے چین رہے گی" یہ کہہ کر اس نے مراد کی طرف پکا وعدہ کرنے کے لئے مضطربانہ ہاتھ بڑھایا۔ مراد کا خون کھولنے لگا اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں، وہ منی سے انتقام لینے بے تاب ہو گیا اور جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں منی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا بھیا اور اپنا ہاتھ شیخو کے ہاتھ میں دے دیا۔ شیخو نے محسوس کیا کہ مراد کا ہاتھ جل رہا تھا

اسی روز شیخو شاہ پور چلا گیا۔ چاندنی راتیں تو تھیں۔ لیکن اس روز ہلکے ہلکے بادلوں کی وجہ سے چاندنی مدھم پڑ رہی تھی۔ اسی مدھم روشنی میں اس نے درگاہ پر پہلی نگاہ ڈالی اسے ایسا معلوم ہوا جیسے درگاہ اسے گھور کر دیکھ رہی ہو، شیخو کانپ گیا لیکن منی کا حکم تھا جس کے ٹالنے کی اس میں تاب نہ تھی اس نے ہمت سے کام لیا اور وہیں قریب ہی بیٹھ کر رات کے زیادہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ شیخو اٹھا اور درگاہ کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ اس کے چہرہ سے حسب معمول کے مطابق عزم و استقلال کے آثار ظاہر ہو رہے تھے اور وہ محتاط بھی معلوم ہو رہا تھا۔ چاندنی ابھی پھیکی ہی تھی۔ درگاہ کے مجاورین محو خواب تھے۔ شیخو درگاہ کے صدر دروازے سے ہوتا ہوا اندر داخل ہوا۔ عود کی دھیمی دھیمی خوشبو درگاہ کی فضا میں بسی ہوئی تھی، لیکن شاید شیخو نے اسے محسوس نہیں کیا اسے اپنی دھن لگی ہوئی تھی وہ تیز قدم بڑھاتا ہوا درگاہ کے اس حجرہ کی طرف گیا جسے ایک بڑا سا قفل لگا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ تمام حجروں میں یہی ایک حجرہ مقفل ہے اسے یقین ہو گیا کہ جو کچھ ہے یہیں ہے۔ اس نے کمال احتیاط سے قفل توڑنے کی کوشش شروع کی، قفل بڑا تھا احتیاط کے باوجود کچھ نہ کچھ آواز پیدا ہو ہی جاتی تھی، آخر اسی آواز سے ایک مجاور جاگ پڑا اس نے اٹھ کر جو یہ ماجرا دیکھا تو دوسرے کو اٹھایا، دوسرے نے تیسرے کو اور اس طرح سب جاگ پڑے اس عرصہ میں شیخو قفل توڑ کر اندر داخل ہو چکا تھا اور اندر کی قیمتی چیزیں جمع کر رہا تھا۔ سب کے سب مجاورین اس پر ٹوٹ پڑے اور عین ارتکاب جرم کی حالت میں اسے پکڑ لیا۔ ملک کے اس حصہ میں اس قسم کی بے حرمتی کی سزا موت مقرر تھی۔

جب شیخو اپنے پڑاؤ سے روانہ ہو رہا تھا ٹھیک اسی گھڑی سے مراد اس کے لئے امید و بیم کی حالت میں چشم براہ تھا۔ کبھی اسے خیال آتا کہ شیخو کا ہاتھ بہت صاف ہے وہ نہیں پکڑا جائے گا اور کبھی نا امید ہو جاتا کہ معاملہ بڑا مشکل ہے۔ اسی طرح ایک دن گزر گیا۔ مراد پہلے تو ڈرا لیکن بعد میں اس نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو ڈھارس دی کہ ممکن ہے شیخو کو موقعہ نہ ملا ہو اور وہ کسی بہتر موقع کی تلاش میں ہو۔ دوسرا دن بھی گزر گیا لیکن شیخو کا پتہ نہیں تھا۔ مراد نے پھر وہی کہہ کر

اپنے آپ کو سمجھایا، تیسرا دن بھی یونہی گزر گیا۔ آخر چوتھا دن طلوع ہوا۔ وہ اسی طرح امید باندھے بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے آکر اس سے کہا کہ شیبو میں ارتکاب جرم کی حالت میں پکڑا گیا اور اسے قانون کے مطابق سزائے موت دی گئی ہے۔ مراد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں لیکن اس نے کچھ نہیں کہا، ایک گھڑی آہ بھر کر آسمان پر نگاہیں جما دیں۔

جس دن شیبو کو پھانسی دی جانے والی تھی اس دن مراد بھی مقررہ جگہ پر گیا اور تماشائیوں میں چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ شیبو پا بزنجیر پھانسی کے تختے پر لایا جا رہا تھا دونوں بھائیوں کی نگاہیں ملیں اور جب شیبو مراد کے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے آہستہ سے کہا

'بھولنا مت'

'اطمینان رکھو' مراد نے فوراً لیکن گھٹتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ شیبو کے چہرہ پر بدستور عزم و استقلال کے آثار تھے۔ لیکن اس وقت اطمینان و سکون کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی بہادری اور پامردی سے جان دی۔ مراد کی آنکھوں سے دو جلتے ہوئے آنسو نکلے اور وہ اپنے پڑاؤ کی طرف پیچ و تاب کھاتا ہوا روانہ ہو گیا۔

اسی روز سے مراد منی کی گھات میں لگ گیا۔ وہ اس نابکار لڑکی پر ہر دم لعنتیں بھیجتا تھا جس نے اس کے بھائی کو موت کی نیند سونے مجبور کیا۔

کئی دن گزر گئے مراد کو اپنا وعدہ پورا کرنے کا موقع نہ ملا، اس کی حالت ٹھیک آگ کے اس ڈھیر کے مانند تھی جو جل کر ختم ہو گئی ہو لیکن چنگاریاں اندر دبی پڑی ہوں، جیسے یہ چنگاریاں ہوا کے کسی تیز جھونکے سے بھڑک اٹھتی ہیں اسی طرح مراد کا جوش انتقام بھی بھڑک اٹھنے کے لئے کسی موزوں موقع کا منتظر تھا۔ اس عرصے میں منی اور رحیم کے تعلقات بڑھنے لگے۔ وہ اُسے اسی طرح چاہنے لگی جیسے وہ شیبو کو چاہتی تھی۔ ویسی ہی ملاقاتیں اور ویسی ہی تفریحیں وہی محبت اور وہی اخلاص، حتیٰ کہ ان دونوں کی شادی کا بھی عقد ہو گئی۔

مراد یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اس کے دل پر سانپ لوٹ رہے تھے اسے تعجب ہوتا تھا کہ کس طرح ایک لڑکی ایک مرد کو چاہنے کے بعد کسی دوسرے کو بھی چاہ سکتی ہے۔ رحیم اور منی میں محبت کی پینگیں بڑھتی دیکھ کر کبھی اسے اس جوڑے پر رحم آتا اور وہ سوچنے لگتا کہ دو محبت بھرے دلوں کو جو ایک دوسرے پر دیوانہ وار فدا نظر آتے ہیں، جدا کر دینا کتنا بڑا ظلم ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی اسے اپنے وعدہ کا خیال آتا اور اس کے کانوں میں شیبو کے الفاظ گونجنے لگتے، اپنے بھائی کی نامراد مظلوم روح مضطرب اور بے چین اس کی آنکھوں میں پھرنے لگتی اس پر وہ منی کی جان لینے کا پھر سے ارادہ کر لیتا۔

رحیم اور منی کی شادی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ رحیم نے اپنے خیمہ کو اپنی حیثیت کے مطابق سجایا، دروازوں پر خوبصورت کپڑوں کے پردے ڈالے اور صاف ستھرے فرش کا بھی بندوبست کیا وہ منی کو ہمیشہ کے لئے اپنی کر لینے کے لئے بہت بے چین تھا اور اس روز کا انتظار وہ ایک ایک گھڑی گن کے کر رہا تھا۔

ایک روز خوب بارش ہوئی اطراف کے تمام ندی نالے زور و شور سے بہنے لگے۔ مراد کو اچانک کچھ خیال آیا، وہ فوراً پریشان صورت بنائے منی کے پاس گیا اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا۔

"یہاں سے کچھ دور جو بڑی ندی ہے نا، جس کے کناروں پر ایک بڑا سا تختہ لوگوں کی آمد و رفت کے لئے رکھا ہوا ہے وہاں میں نے ایک کوٹ اور شمل بری طرح پڑا ہوا دیکھا کہیں وہ رحیم کے تو نہیں؟" منی کا رنگ فق ہو گیا اس کا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا اوپر ہو گیا وہ کچھ نہ بول سکی، کافی دیر کے بعد اس نے حواس مجتمع کئے اور مراد کے ساتھ مذکورہ مقام پر گئی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے تختہ پر قدم رکھے مراد نے موقع پا کر

[illegible] سے الٹ دیا۔ منی ایک جگر خراش چیخ کے ساتھ [illegible] کی دھار میں گری اور چند ہی لمحوں میں جان حق [illegible] کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ اس کی نگاہوں میں اچانک شبو کا چہرہ آیا اور غائب ہوگیا جس سے اطمینان اور سکون ظاہر ہو رہا تھا۔

کسی کو یہ نہ معلوم نہ ہوسکا کہ منی کی موت کیسے واقع ہوئی لیکن مراد اکثر منی کا دل دوز چیخ کے ساتھ گرتا اور ڈوب کر مرنا خواب میں دیکھتا تھا۔

سید اختر الحق

"میرِ کارواں"

قسم خونِ شہیداں کی، قسم ہے جوشِ ایماں کی
قسم ہے آندھیوں کی زلزلوں کی اور طوفاں کی

میں میرِ کارواں ہوں کارواں آگے بڑھاؤں گا
میں اپنی قوم کو پیہم حوادث سے بچاؤں گا
مری ٹوٹی ہوئی کشتی اگرچہ نذرِ طوفاں ہے
مگر میں پھر بھی اس کشتی کو ساحل سے لگاؤں گا
مرے نغماتِ نو ہیں آتشی تیغوں کی جھنکاریں
میں زیر و بم سے ان کے نوجوانوں کو جگاؤں گا
مرے عزم و عمل کو ساکنانِ عرش کیا جانیں
میں آغوشِ فلک سے مہر و ماہ کو کھینچ لاؤں گا
فرشتوں کی جبیں سے بھی مقدس ہے وطن میرا
میں ذراتِ وطن کو آسمانوں پر اٹھاؤں گا!
فلاطوں بھی رہے ششدر وہ دانش پائی ہے میں نے
میں دنیا کو نئے انداز سے جینا سکھاؤں گا
براہیمی لہو آیا ہے کچھ میری رگوں میں بھی!
میں شانِ آذری کی دھجیاں بڑھ کر اڑاؤں گا

قسم خونِ شہیداں کی قسم ہے جوشِ ایماں کی
قسم ہے آندھیوں کی زلزلوں کی اور طوفاں کی

مرتضیٰ مجتہدی

میں......اور صرف میں

(ہندی کا ایک ایکٹ کا ڈراما)

منظر

(ایک بڑے دفتر کا تمام کمرہ سامنے والی دیوار سے
لگی ہوئی دو الماریاں رکھی ہیں جن میں کتابیں ہیں۔
دونوں الماریوں کے بیچ میں ایک کھڑکی کے اوپر ایک
گھڑی لگی ہے جس میں ایک بج رہا ہے۔ دائیں جانب
ایک دروازہ ہے اور اس کے دونوں طرف دو کھڑکیاں
ہیں۔ بائیں جانب دو دروازے ہیں۔ کمرے کے بیچوں
بیچ ایک لمبی میز پڑی ہے جس کے چاروں طرف کرسیاں
رکھی ہوئی ہیں۔ دو ایک تمام کرسیاں اِدھر اُدھر پڑی
ہیں۔ رامیشور بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کا سر جھکا
ہوا ہے گویا کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ کرشن چندر
آتا ہے اور دروازے ہی میں سے کہتا ہے)

کرشن چندر۔ کہو جی رامیشور کیا حال ہے؟

(رامیشور کوئی جواب نہیں دیتا ہے، کرشن چندر اس کے
پاس آتا ہے اور کرسی پر بیٹھ جاتا ہے جیب سے سگریٹ کیس
نکال کر ایک سگریٹ سلگاتا ہے)

کرشن چندر۔ کیوں جی کیا بات ہے، آج بہت سست دکھائی
دے رہے ہو!

رامیشور۔ ہاں۔ بیوی کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ ڈاکٹروں
نے جواب دے دیا ہے اور آج صبح سے میری طبیعت بھی کچھ بھاری ہے۔

کرشن چندر۔ ارے بھائی یہ تو بُری خبر سنائی اور سنا! کشنا
نے ایک نیا گل کھلایا؟

(رامیشور کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔ وہ صرف کرشن چندر
کو غور سے دیکھتا رہتا ہے)

کرشن چندر۔ اس سالے کو نکلوا کر نہ چھوڑا تو میرا نام کرشن چندر
نہیں۔ ماسٹر ٹامسن کو بس میں کیا کر رکھا ہے، اپنے کو لاٹ صاحب
سمجھنے لگا ہے لیکن بیٹا کو ابھی یہ پتہ نہیں کہ کیسے آدمی سے پالا
پڑا ہے۔

رامیشور۔ ہوں (گردن نیچی کر لیتا ہے اور ایک ٹھنڈی سانس
بھرتا ہے)

(بینی شنکر دروازے سے کہتے آتے ہیں)

بینی شنکر۔ کام کرتے کرتے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ دن رات
گدھے کی طرح کام کرتا ہوں لیکن کوئی پرسانِ حال نہیں۔

(بینی شنکر کرشن چندر کے بازو آ کر بیٹھ جاتا ہے۔
رامیشور کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر پوچھتا ہے)

بینی شنکر۔ ارے رامیشور! آج چہرا اترا ہوا ہے۔

رامیشور۔ کیا بتاؤں آج صبح سے طبیعت بھاری ہے۔ کچھ بھی
اچھا نہیں معلوم ہو رہا ہے۔

کرشن چندر۔ ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟

رامیشور۔ ہاں دو ایک دن میں دکھاؤں گا۔ مہینہ بھر سے
کچھ نہ کچھ شکایت رہتی ہی ہے۔

(جس وقت رامیشور اپنی بات کہتا ہے۔ کرشن چندر
بینی شنکر کی طرف دیکھتا ہوا کہتا ہے)

کرشن چندر۔ کہو جی۔ کشنا سے کیسے نپٹی؟

بینی شنکر۔ اے نپٹی کیسی؟ میں کوئی دینے والا تھوڑے
ہی ہوں اور دنیا کی کسے پروا ہے؟

رامیشور۔ پورا ایک مہینہ۔ اور بیوی کو ڈاکٹروں نے
جواب دے دیا اور ایک دودھ پیتا بچہ۔ (رامیشور کی بات کوئی نہیں سنتا)

کرشن چندر۔ لیکن مسئلہ ہے معاش کا۔ میں کہتا ہوں مینی شنکر جب تک یہ نوکری یہاں ہے ہم لوگ کوئی سکھ چین سے نہیں رہ سکتے۔

مینی شنکر (مسکراتا ہوا) بڑی جلدی گھٹ گھٹنے والا ہے۔

رامیشور۔ (کرشن چندر سے) بھائی تمہارے بہنوئی تو بڑے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ ذرا میں انہیں دکھانا چاہتا ہوں۔

کرشن چندر۔ ہاں۔ ہاں چلنا (مینی شنکر کی طرف گھوم جاتا ہے) نہ جانے کب سے سن رہا ہوں۔ لیکن دیکھتا ہوں ویسا ہی ٹوٹا ہوا ہے۔ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ استاد! اگر بیوی بچوں کا خیال نہ ہوتا تو پھر میں دکھاتا!

(دیونارائن آ کر چپ چاپ رامیشور کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ مینی شنکر دیونارائن سے مخاطب ہوتا ہے)

مینی شنکر۔ کہو جی دیونارائن۔ کوئی نئی چیز؟

دیونارائن۔ جناب آج ٹامسن صاحب نے مسٹر کھنا کو بہت ڈانٹ میں بیٹھا ہوا سن رہا تھا۔ کھنا صاحب کی گھگی بندھ گئی، جواب تک نہ دیتے ہیں۔

کرشن چندر۔ کیا کہا، نوبت یہاں تک پہنچ گئی! وہ مارا۔

(رامیشور تینوں کو ایک بار غور سے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد کرشن چندر سے مخاطب ہوتا ہے)

رامیشور۔ بھائی کرشن چندر۔ تو آج شام کو چلو گے نا؟

(کرشن چندر اس سوال کا جواب نہ دے کر رامیشور سے کہتا ہے)

کرشن چندر۔ کیوں جی رامیشور! ٹامسن صاحب تو تم سے بڑے خوش ہیں تم انھیں کیوں نہیں سمجھاتے کہ وہ کھنا کو الگ کریں، ہم لوگ ان کی جگہ تمہارا نام پیش کریں گے۔

(رامیشور صرف تینوں کو دیکھ کر ایک ٹھنڈا سانس لیتا ہے)

دیونارائن۔ ارے! تم اتنے اداس کیوں ہو؟ رامیشور! طبیعت تو ٹھیک ہے؟

مینی شنکر۔ نہیں آج صبح سے ان کی طبیعت کچھ خراب ہے۔

دیونارائن۔ تو چھٹی کیوں نہیں لے لیتے؟ میاں گھر پر آرام کرو جا کر۔

کرشن چندر۔ تو رامیشور سنا۔ اس وقت موقع ہے۔ اگر اب چوکے تو سب ختم ہو جائے گا۔ جانتے ہو کھنا تمہیں نکلوانے پر تلا ہوا ہے۔

رامیشور۔ ہوگا! لیکن میں کیوں کوئی ایسا کام کروں، دوسروں کی تباہی مجھ سے نہ ہوگی۔ ہاں کرشن چندر بتایا نہیں کہ کل صبح لے چلو گے؟ میں تمہارے یہاں آجاؤں گا۔

کرشن چندر۔ ارے یار آجا! (مینی شنکر سے) بیانندی اس موقع کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

مینی شنکر۔ ہاں یار ٹھیک کہا چلو اس کے یہاں چلیں (کرشن چندر اور مینی شنکر جانے لگتے ہیں)

رامیشور۔ (کرشن چندر سے) اچھا تو کرشن چند، کل صبح سات بجے میں .. ..

(کرشن چندر اور مینی شنکر کمرے کے باہر چلے جاتے ہیں)

دیونارائن۔ (مسکراتا ہوا) چلے گئے، تمہاری بات بغیر سنے چلے گئے۔ یہ دنیا خوب ہے نا؟

رامیشور۔ کیا کہا؟

دیونارائن۔ (دروازہ کی طرف دیکھتا ہوا) اندر دنیا ٹھیک ہی کرتی ہے، تمہاری بات سننے والا کون ہے؟ پھر تمہاری بات دنیا میں کوئی سنے ہی کیوں؟

رامیشور۔ دیونارائن دل کی تکلیف کو ظاہر کرنا کیا کوئی گناہ ہے؟

دیونارائن۔ ہاں ہے۔ تم میں اور تمہاری تکلیف میں کسی کو کوئی دلچسپی نہیں، جب تک تم دوسرے سے اس کے مطلب کی باتیں کرتے رہو گے وہ تم سے مل کر خوش رہے گا۔ تمہارے ساتھ ہنسے گا بولے گا اور جہاں تم اس سے اپنے دکھ سکھ کی بات کرنے لگے اس کا جی بیزار ہو گیا۔ تمہارے سکھ سے اسے کوئی مطلب نہیں۔ تمہارے

دکھ کی اسے کوئی پروا نہیں۔

رامیشور ۔ دیونارائن تم کیا کہہ رہے ہو؟ دنیا میں انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے؟

دیونارائن ۔ انسانیت! ہمدردی ..... ہا ہا ..... ہا ..... ہا .....
جسے تم انسانیت اور ہمدردی کہتے ہو وہ ڈھکوسلا ہے، فریب ہے
جو انسانیت ہے وہ بڑی بھیانک چیز ہے رامیشور! انسانیت کے
معنی ہیں ہمیشہ مسرور اور خوش رہنے کے لئے دوسروں کو مغموم اور
دکھی بنانا ..... فتح ..... دوسروں پر فتح ..... دوسروں کی غلامی .....
یہی انسانیت ہے .....

(رامیشور ایک ٹھنڈا سانس بھر کر دیونارائن کی طرف دیکھتا ہے)

رامیشور ۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ دیونارائن تم جانتے ہو گھر میں بیوی بیمار ہے اور بچہ بغیر ماں کے گرد و غبار میں پڑا سسک رہا ہے اور میں مایوس یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ دیونارائن کیا کروں؟

دیونارائن ۔ میں کیا بتاؤں؟ یہ مصیبت تمہاری ہے۔ تم ہی برداشت کرو اور اف مت کرو، آخر اپنی مصیبتوں کے بیان کرنے سے تمہیں کیا مل جائے گا؟ ہمدردی یا امداد؟ نہیں ..... دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے جس پر مصیبت نہ ہو اور جو امداد نہ چاہتا ہو۔ ہمدردی؟ وہ صرف زبانی ایک شئے ہے، بالکل دھوکے کی شئے؟ بجز اس کے کہ تم لوگوں کے دلوں پر ایک بار بنو اور کچھ نہ ہوگا۔ اٹھو ہنسی کی دنیا میں ایک کرخت چیخ کی طرح، اٹھو ..... دوسروں سے اپنی مصیبت بیان کرنا کوئی مطلب نہیں رکھتا ..... سمجھے؟ اب میں چلا۔

(دیونارائن اٹھ کر چل دیتا ہے۔ رامیشور دیونارائن کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں)

رامیشور ۔ ہوں اتنا فراڈ، اتنی نصیحت ..... اور اتنی خود غرضی

بینی شنکر ۔ (رامیشور سے) کیوں جی رامیشور بابو دیونارائن کہاں گئے؟

(رامیشور کوئی جواب نہیں دیتا۔ سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔ پرمانند رامیشور کو غور سے دیکھنے لگتا ہے)

پرمانند ۔ ارے رامیشور کیا معاملہ ہے؟ تمہاری آنکھوں میں آنسو؟

بینی شنکر ۔ دیکھو پرمانند تیار ہے۔ اس کھنا کا وقت آ گیا، اب ٹل نہیں سکتا۔ ہاں پرمانند مسٹر ٹامسن اب لنچ سے لوٹ کر آ گئے ہوں گے۔ یہی وقت ٹھیک ہوگا۔

پرمانند ۔ بھائی رامیشور کو کیوں نہیں راضی کرتے۔ رامیشور اگر تم صرف ایک دفعہ اور مسٹر ٹامسن سے مل لیتے صرف ایک دفعہ تو سب کام بن جاتا۔

رامیشور ۔ کون سا کام؟

پرمانند ۔ یہی کھنا والا۔ آج ہی سب فیصلہ ہو جاتا۔

رامیشور ۔ مجھے معاف کرو پرمانند، میں کھنا کے خلاف کوئی کام نہ کروں گا۔ کھنا کے خلاف ہی کیوں کسی کے خلاف بھی نہیں۔

بینی شنکر ۔ ہاں ..... جناب کھنا صاحب کی نظروں میں آنا چاہتے ہیں۔ میاں یہ ڈھونگ کب تک چلے گا؟

رامیشور ۔ (کڑی آواز میں) کیا کہا؟

کرشن چندر ۔ (بینی شنکر سے) چلو جی! ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم لوگ چلتے ہیں۔ ہاں دیونارائن کو ساتھ لے لینا چاہئے۔ وہ ہے کہاں؟

(سب لوگ جاتے ہیں)

رامیشور ۔ یہ لوگ بھی دوسرے کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ آخر کیوں؟

(جھونگو چپراسی آتا ہے)

جھونگو ۔ سرکار۔ ڈاک میز پر رکھی ہے (رامیشور غور سے دیکھتا ہے) ارے! ..... سرکار آج بہت اداس ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟

[illegible] ۔ سرکار، آنکھیں، چھوٹے ہیں، ہم کیا چل رہا ہے۔ [illegible] کیسی حالت ہے؟

[illegible] ۔ کیا بتاؤں بھونگو۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ دو ایک دن کی مہمان ہیں۔

(بھونگو کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

بھونگو ۔ سرکار! بھگوان پر بھروسہ رکھیں جو کچھ قسمت میں ہے وہی ہوگا۔ موہن بھی ابھی بالکل بچہ ہے۔

(دیوناراین آتا ہے وہ مسکرا رہا ہے۔ آکر رامیشور کے قریب بیٹھ جاتا ہے)

دیوناراین ۔ پرمانند نے جب کھنا کی شکایت کی تو صاحب بجائے اس کے کہ کھنا کے خلاف کوئی کارروائی کریں انھوں نے پرمانند ہی کو ڈس مس کردیا۔

(رامیشور اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

رامیشور ۔ میں ابھی ٹامسن کے پاس جاتا ہوں۔ پرمانند کے چھے بچے ہیں۔ بڑھیا ماں ہے، بیوی ہے۔ یہ سب بھوکے مر جائیں گے (رامیشور دو قدم بڑھتا ہے اسی وقت دیوناراین اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

دیوناراین ۔ بے وقوفی نہ کرو؟ کیوں اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہو۔ کھنا کے خلاف کوئی بات نہیں سنی جائے گی۔ یہ ہم سب جانتے ہیں۔ پرمانند نے وہاں جاکر غلطی کی اور وہ اب اپنی غلطی کا نتیجہ برداشت کرے گا۔ (شیام لال آتا ہے)

رامیشور ۔ (شیام لال کو دیکھ) ارے شیام لال!

شیام لال ۔ آپ کو ڈھونڈ رہا تھا .... آں ....

شیام لال ۔ آں ...... موہن دو منزل سے گر پڑا اور گرتے ہی اس دنیا ...... سے چل .... بسا .... بہو جی نے جب سنا تب وہ زور لگا کر اٹھیں اور ویسے ہی لڑھک پڑیں ...... چلتے

(رامیشور کرسی پر گر پڑتا ہے)

رامیشور ۔ ہوں! تو سب ختم ہوگیا؟ (خاموشی سے چاروں طرف دیکھتا ہے)

(مسٹر کھنا مسٹر ٹامسن کے ساتھ آتا ہے)

کھنا ۔ مسٹر رامیشور میں نے آپ کو جو فائل دی تھی۔ اس پر آپ نے ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی۔ کیوں!

ٹامسن ۔ مسٹر رامیشور مسٹر کھنا نے آپ کی شکایتیں کی ہیں مجھے آپ سے امید نہیں کہ آپ اتنی بے پروائی کریں گے۔ دیکھئے اس فائل پر کارروائی میرے پاس بھیج دیجئے۔

(کھنا اور ٹامسن چلنے لگتے ہیں۔ رامیشور کھڑا ہوجاتا ہے)

رامیشور ۔ مسٹر ٹامسن! میں ایک بات پوچھتا ہوں۔

(ٹامسن اور کھنا رک جاتے ہیں، دونوں تعجب سے رامیشور کو دیکھتے ہیں)

رامیشور ۔ آپ نے پرمانند کو کیوں علحدہ کیا؟

کھنا ۔ تم پوچھنے والے کون ہو؟

رامیشور ۔ (کھنا سے) تم چپ رہو، میں تم سے نہیں پوچھ رہا ہوں (ٹامسن سے) آپ جانتے ہیں کہ اس کا خاندان بڑا ہے، اور وہ تنہا اکیلا کمانے والا ہے، اس کے معزول ہونے کے معنی ہیں دس انسانوں کا بھوکا مرنا۔

ٹامسن ۔ مجھے افسوس ہے رامیشور۔ مجھے کھنا اور پرمانند میں سے صرف ایک کو رکھنا تھا اور ایک کو الگ کرنا تھا

رامیشور ۔ آپ نے ایک شیطان کو اپنے ساتھ رکھا اور ایک انسان کو الگ کردیا۔

کھنا ۔ اور اب مسٹر ٹامسن کو مجھ میں اور تم میں کسی ایک کو علحدہ کرنا پڑے گا۔ اور ایک کو رکھنا پڑے گا۔ جو آدمی ایک افسر کی بے عزتی کرتا ہے وہ دوسرے کی بھی بے عزتی کرسکتا ہے اور یہ مسٹر ٹامسن اچھی طرح جانتے ہیں۔

ٹامسن ۔ مسٹر رامیشور مجھے افسوس ہے کہ آپ اس طرح کی

خیرخواہانہ گفتگو کر رہے ہیں - فرض کا مقام جذبات سے بالاتر ہے -
(رامیشور بڑھ کر کھنا کا گلا پکڑ لیتا ہے اور دبانے لگتا ہے)

رامیشور - فرض کا مقام جذبات سے بالاتر ہے..... نہیں.....
فرض ہے سب سے بلند جذبہ، کھنا تم بچو گے نہیں -

(کھنا آنکھیں پھاڑ دیتا ہے - سب لوگ رامیشور کو چھڑا دیتے ہیں لیکن رامیشور میں ایک غیر معمولی قوت آگئی ہے - آہستہ آہستہ رامیشور کھنا کو چھوڑ دیتا ہے - کھنا بے ہوش زمین پر گر پڑتا ہے)

ٹامسن - یہ کیا؟ یہ کیا؟

رامیشور - مسٹر ٹامسن! ابھی ابھی میرا لڑکا اور میری بہو قتل کر دئیے گئے ہیں۔ (شیام لال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان سے پوچھیے وہ کھنا... آدمی جانتا تھا، آج صبح ہی میں نے ان سے کہا تھا۔ اپنی خود غرضی اور غرور کے نشہ میں پھولا ہوا آدمی (رامیشور کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) دوسروں کو ستانے والا ...... برباد کرنے والا [illegible]
ہاں اب آپ پولیس کو بلا سکتے ہیں ۔

(رامیشور کا سر لڑھک جاتا ہے، سب لوگ دوڑتے ہیں، ڈیونلڈ ٹن رامیشور کی نبض دیکھتا ہے اور سر ہلاتا ہے) (پردہ)

(ہندی سے) امجد یوسف زئی

غزل

بزم میں یا میرے سو اسب پہ نظر رکھتے ہیں
وہ مجھے یاد بہ عنوانِ دگر رکھتے ہیں

ان کے آگے نہ کوئی اشک تمنا نکلے
تجھ سے امید یہ اے دیدۂ تر رکھتے ہیں

ہائے اس انجمنِ ناز میں جائیں کیونکر
ٹھیرا اے جوشِ جنوں ہم ابھی سر رکھتے ہیں

چارہ گر کیا ہوا رونے لگے وہ بھی ہے ہے
کیا خبر تھی مرے نالے بھی اثر رکھتے ہیں

طاقتِ لذتِ بیداد نہیں گو دل میں
حسرتِ لذتِ بیداد مگر رکھتے ہیں

دیکھئے کون اسے دامن کی ہوا دیتا ہے
شمع ہم ایک سرِ راہ گزر رکھتے ہیں

کاش کوئی اسے بھڑکائے کہ شعلہ بن جائے
اپنے سینے میں نہاں ایک شرر رکھتے ہیں

میری آزادہ روی ہنستی ہے اُن پر ہمدم
اپنی آہوں کو جو پابندِ اثر رکھتے ہیں

آج کل لطف و عنایت تو بہت ہے اصغر
دیکھئے ہم پہ وہ کب تک یہ نظر رکھتے ہیں

شمس اصغر صدیقی

بیچارگی

بے طلبِ زندگی میں بہے جا رہے ہیں ہم
بے دست و پا ہیں اور بڑھے جا رہے ہیں ہم

اس میں جو کیفیت ہے، ہمیں جانتے ہیں کچھ
منزل سے بے خبر ہیں، چلے جا رہے ہیں ہم

یہ جانتے ہیں لطفِ فسانہ نہیں رہا
پھر بھی فسانہ اپنا کہے جا رہے ہیں ہم

بے واسطہ خوشی سے نہ غم سے کوئی گلہ
ایسا ہے سہتے جاؤ، سہے جا رہے ہیں ہم

درسِ خودی ہے، یا کہ ہیں یہ بیخودی کے راز؟
کوئی پڑھا رہا ہے، پڑھے جا رہے ہیں ہم

اپنی نظر پہ آپ اگرچہ ہے اعتماد!
پھر بھی قدم قدم پہ رکے جا رہے ہیں ہم

گو تلخیٔ حیات سے ہر گھونٹ زہر ہے
ہے زندگی کا پاس پیے جا رہے ہیں ہم

تہذیبِ نو کے کھیل، عجب کھیل ہیں بشیر
راہِ عمل سے دور ہوئے جا رہے ہیں ہم

(از شہاب)

بشیر النساء بیگم بشیر

تہذیب کا اثر ادب پر

افلاطون کی جمہوریت سے دھتکاری ہوئی حساس اور مترنم صنفِ ادب کے متعلق کسی نے کتنی پیاری بات کہی "زندگی شاعری ہے اور شاعری زندگی" اور کسی دوسرے من چلے نے اسی خیال کو اک ذرا وضاحت کے ساتھ یوں پیش کیا ہے "ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے" لیکن انیسویں صدی کے فرنگی نقاد میتھو آرنلڈ نے کچھ اور ہی انداز میں رائے دی ہے "ادب نہ صرف تفسیرِ حیات ہے بلکہ تنقیدِ حیات بھی"۔ سچ تو یہ ہے کہ تفسیر اور تنقید تو رہگزار ہے، ادب کی منزلِ مقصود تو تخلیقِ حیات ہے۔

دیکھا آپ نے بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ یہ حضرت انسان جن میں "ارتقا کے انبیا" اور "انقلاب کے رسول" مبعوث ہوتے رہے ہیں، نچلا بیٹھنا تو جانتے ہی نہیں۔ بات میں بات اور خیال میں خیال پیدا کرنا ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ خیر! بڑے آدمیوں کے بڑے خیالات ہوتے ہیں کیوں نہ ہم خود ہی اس ادب، زندگی اور تہذیب کے بحرِ ناپیدا کنار میں شوقِ غواصی کریں۔ دُرِ شہوار نہ سہی کوئی گھٹیا قسم کا ہی سہی بہرحال کوئی موتی ہاتھ لگ ہی جائے گا۔

آدم و حوا پر جب تک کیفیت سرشاری طاری رہی ہوگی اس وقت تک تو خیر ایک جنبشِ چشم و ابرو سے دل کی بات دل تک پہونچا دی گئی ہوگی لیکن جوں ہی اس خاکدان کی آب و ہوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا ہوگا تو احتیاج زندگی کے حصول کی خاطر ہاتھ پاؤں ہلانے پڑے اور انھوں نے اپنے "دہن مبارک" کو نیم وا کرکے کچھ عجیب قسم کی آوازیں نکالیں۔ یہی بے معنی آوازیں لفظ بنے اور اطراف و اکناف کی چیزوں کے نام رکھے گئے۔ اسی طرح ایک بولی چل پڑی۔

آدم و حوا تو خیر! انھوں نے اپنا شباب جنت نعیم کی مقدس اور نمناک فضا میں بسر کیا۔ البتہ ان کی اولاد کی اٹھان کا زمانہ آیا تو فطرت کی رعنائیوں اور جنسی کشش کی دلربائیوں نے بڑھ کر دامن تھام لیا۔ سیدھے سادھے گڈریے اور کسان کے دل میں کوئی چپکے چپکے سمانے لگا۔ دھیمے سروں میں بانسری سی بجنے لگی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر کسی الھڑ دخترِ حوا کا دامن تھام لیا۔ اور دل کا ڈر، نہ من کا کھوٹ۔ منہ پر آئی ہوئی بات کے پرائے کا خیال نہ شبِ ہجراں کی بھیانک سیاہیوں کا تصور، بس جو دل میں تھا سو زبان پر آگیا۔ یہ ہے آپ کا پہلا آرٹسٹ۔ پہلا حسن کار، شاعر!!

اسی کی نظر کے سامنے کائنات کی نیرنگیاں، فطرت کا حسین زرتار جال اور خود اپنے من کی ہیجانی دنیا تھی۔ کبھی وہ خارجی حالات کو ترنم کے سانچوں میں ڈھالتا تو کبھی اپنی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسوؤں اور منہ سے گرتے ہوئے قہقہوں کی لڑیاں پروتا۔ اور اس طرح ایک ادب کی داغ بیل پڑی۔

زندگی کا جدلیاتی فلسفہ غیر شعوری طور پر شگوفے کھلانے لگا اور ارتقا کی قوتیں نت نیا راستہ نکالنے لگیں۔ نیلے آکاش تلے لمبی تاننے والے ماں باپ کی اولاد دروں اور وادیوں سے نکل کر گھاس پھوس کے جھونپڑوں اور کچے مکانوں میں زندگی گزارنے لگی۔ دو سے چار اور چار سے آٹھ ہوئے اور یہ سب مل جل کر رہنے سہنے لگے۔ بھوک سبھی کو لگتی، سردی سے سبھی کے جسم سکڑتے، گرمی سے سبھی الاماں کہہ اٹھتے۔ درندوں کا کھٹکا اور آفاتِ آسمانی سبھی کو خوف زدہ کئے رکھتے "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" تو ان کی شریعت ہی ٹھیری۔ اس لئے اس ابتدائی انسانی گروہ نے کسی بڑے بوڑھے کو اپنا نگہبان اور رہبر بنایا۔ تقسیمِ محنت اور تقسیمِ دولت کے ابتدائی اصول بنے اور یوں معاشی تنظیم، ابتدائی معاشرت اور پھر تہذیب وجود میں آئی۔

یہ تھی آپ کی ابتدائی تہذیب اور اس دور کا ادیب! چونکہ حضرت انسان راندۂ درگاہ نہیں اور یوں بھی ہر قوت سے وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے اس لئے خدا اور اس کا نام ہر شعبۂ حیات میں جاری و ساری رہا۔ خوف و رجا سے گھبرا کر انھوں نے مذہب کے دامانِ تنگ میں پناہ لی اور انہیں مذہب کے رکھوالوں نے نہ صرف ادب پر بھی قبضہ جما لیا بلکہ وارثِ اصلی بن بیٹھے۔ تہذیب و معاشرت اور دیگر شعبہ جاتِ حیات تو براہ راست ان کی ملکیت ہی تھی لیکن ادب بھی ان کی

کیونکہ [illegible] آلہ کار بن گیا۔ یہ مخصوص گروہ فقرو فاقہ کا حامی، دنیا اور دنیا والوں سے رشتہ توڑ کر زندگی اور اس کی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر بظاہر ایک کیفیت مجہول کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس گروہ کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اندھیرے کمرہ میں ایک ایسی سیاہ بلی کی تلاش کر رہا ہو جو وہاں موجود نہیں۔ چنانچہ اس دور کے ادب میں اس مخصوص مذہبی تصوریت کی جھلک نمایاں ہے اس دور کا ادب محض جوگی یا راہب بن کر رہ گیا ہے۔ زندگی اور اس کی کشمکش کے خط و خال ڈھونڈنے سے بھی نہیں دکھائی دیتے۔ ہاں موت آسا سکوت اور جمود نواز کیفیت ضرور پائی جاتی ہے۔

مختصراً یوں سمجھئے کہ اس دور کی تہذیب کی رگ رگ میں مذہب کا خون دوڑ رہا تھا چونکہ ادب کا تہذیب یا کلچر سے براہ راست تعلق ہے اس لئے یہ عنصر ادب میں صاف نظر آتا ہے۔

کچھ ہی دنوں میں خانقاہوں کا بازار سرد پڑ گیا اور حویلیوں کی قسمت جاگی۔ تقدس کا چراغ گل ہوا تو امارت کے ہاں چراغاں کئے جانے لگے فقیروں اور سنیاسیوں کی گود میں کھیل کود کر بچپن گزارنے بھی نہ پایا تھا کہ ادب سرمایہ کی خلوت میں داخل ہوا۔ جذبات کی تابش نے اس کو یہاں بہت جلد پکا کر سیلا کر دیا اور دل کھول کر داد عیش حاصل کی۔ اس رنگ میں ادب کچھ ایسا رس بس کر نکھر آیا کہ "بابا صاحب" اسے دیکھیں تو پہچاننا تو رہی ادب بات لاحول نہ پڑھیں تو ہمارا ذمہ۔ آیئے آپ بھی اس اٹھان اور بدمستی کو دیکھئے مگر ذرا دل کو تھام کر۔ اس لئے کہ ع اچھے اچھوں کا وضو جاتا ہے ٹوٹ

صبا کی مجبوری ملاحظہ ہو ؎ یار گل اندام سے پہلو جو خالی ہو گیا — سو کے کر میں شکل تصویر نہالی ہو گیا

اور آخر کی تڑپ دیکھئے ؎ خال رخ کے عشق میں تیرے ہیں عاشق سیکڑوں — تل ڈھانک لو اور ابروئے خمدار دکھاؤ

رضا فرنگی محلی نے تو بے حیائی کی حد کر دی۔ کہتے ہیں ؎

لپٹا یار رضا ہم نے تو جھنجھلا کے وہ بولے — اب آپ کے گھر ہم کبھی آیا نہ کریں گے

جانؔ کی نسائیت بھی قابل توجہ ہے ؎ کرنے جو بیٹھی شام سے پی صبح ہو گئی — دو بار میں ہوئی نہ وہ دو دوپہر جوا

ریاضؔ خیرآبادی کے دو ایک شعر بھی سنئے ؎ آڑی ہیکل کو چوم لے گی — وہ شئے جو کچھ اٹھی اٹھی سی ہے

دیگر ؎ وصل کی شب جب نہ چلی ایک بھی شوخی ان کی — کچھ نہ بن آئی تو چپ کے سے کہاں ان گئے

حتیٰ کہ غالبؔ جیسے بلند پایہ فلسفی شاعر کے کلام میں بھی چند ایسے مقامات آتے ہیں اور اس کے ہاتھ سے سنجیدگی اور متانت کا دامن چھوٹ جاتا ہے ؎ صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو — دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

قدیم قبائلی زندگی اور زرعی تہذیبوں کے عہد میں تو خیر عوام کی جہالت سے من ملنے قائم اٹھا لیا گیا اور توہمات کے پردوں میں حقیقت چھپی رہی لیکن اس صنعتی سرمایہ داری کے تحت پیدائش دولت کے تعلقات کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں نے ادب کے مسئلے کو بھی بے حد پیچیدہ اور گراں بنا دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ادب بہ حیثیت مجموعی سارے سماج کا ورثہ ہوتا ہے ایک مخصوص طبقہ کا استحقاق بن کر رہ گیا ہے جو صاحب نصیب اور صاحب اقتدار ہے۔ جب سے ادب نے سماج سے ناتا توڑ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی ہے اس نے اپنا وہ اصل مقام چھوڑ دیا ہے۔

جہاں پہونچ کر ادب جزو پیغمبری ہو جاتا ہے۔ جب ہم خوش حال طبقہ کے ادب کو پس ماندہ غریب عوام کی ضروریات، احساسات اور خیالات کے پیچ میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو ہمارے ادب کا بیشتر حصہ ایک بے وقت کی راگنی اور ایک بے جوڑ پیوند معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک سوسائٹی اپنے آپ کو تہذیب یافتہ بھی کہتی ہے اور ساتھ ہی ایک بڑی تعداد کو تہذیب سے محروم بھی رکھتی ہے۔ دولت کی فراوانی میں افلاس کا یہ بھیانک نظارہ بڑا عبرت ناک ہے۔ اس تضاد کا نتیجہ ترقی پسند ادب کی تحریک ہے۔

موجودہ تہذیب نے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے برژوا اور پرولتاریہ — نیا ادب پرولتاریہ طبقہ کی نمائندگی کر رہا ہے۔ آپ کو اس ادب میں جمہور کے احساسات، خیالات اور جذبات انگڑائیاں لیتے نظر آئیں گے۔ دم توڑتی ہوئی برژوائی تہذیب کی کراہ بھی سنائی دے گی اور نومولود پرولتاری تہذیب کے خط و خال بھی دکھائی دیں گے۔ کیا یہ سب زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ادب کے آئینہ خانہ میں محفوظ نہیں؟ کیا مستقبل کا نقاد موجودہ کشمکش اور ہیجان کو اس دور کے ادب میں نہ دیکھے گا؟ تو پھر نئے ادب کے نام پر کانوں میں انگلیاں دے لینے کے کیا معنی۔ رجعت اور ترقی کی یہ جنگ کوئی نئی بات نہیں اس لئے کہ ؎ ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی
ارتقائی قوتوں کے منکر ہمیشہ ماضی سے یوں ہی چمٹے رہتے ہیں اور ماضی کی فرسودہ گرتی ہوئی دیوار تلے دب کر جان دیتے ہیں۔ لیکن نیا ادیب حال کے دل میں مستقبل کی دھڑکنیں سمجھ رہا ہے۔ وہ ارتقائی قوتوں اور وقت کے تقاضوں کا راز داں ہے۔ اس لئے کہ اس کی تہذیب اور اس کے ادب کی بنیادیں مساوات، اخوت، امن، طبیعت اور آزادی پر ہیں موجودہ تہذیب کا تضاد صاف کہہ رہا ہے ؎

اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

مستقبل ایک ایسے انسان سے بغل گیر ہونے کے لئے مچل رہا ہے جو قومیت، ملت، وطنیت، سرمایہ داری اور استحصال کی لعنتوں سے گزر کر محض انسان اور انسانیت کے لئے زندہ رہنا عین منشائے زندگی سمجھے اور اس کا نعرہ ہوگا۔ ع انسانیت قوم ہماری انسانیت دھرم ہمارا

نیا ادب نہ صرف اس سسکتی ہوئی تہذیب اور پا بہ جولاں زندگی کی تفسیر کر رہا ہے بلکہ تنقید و تخلیق بھی۔ جہاں ترقی پسند ادب نے ایک نئی دنیا اور ایک نئے نظام کی طرح ڈالی ہے وہیں ترقی پسند مصنفین نے حصول مقصد کے لئے اپنی جانیں تک لڑادیں۔ چنانچہ انگلستان کے ممتاز ترقی پسند ادیب رالف فاکس اور کرسٹافر کارڈول نے ہسپانوی عوام کی آزادی کے لئے فرانکو کی فوج سے لڑتے ہوئے سرزمین ہسپانیہ میں اپنی جانیں قربان کیں۔ خود ہسپانیہ کے ترقی پسند شاعر میکاڈو لورکا کے خون کو دنیا کے عوام نہیں بھلا سکتے" روس کے سیکڑوں ادیب آلات حرب سے لیس محاذ جنگ پر فسطائیت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ خانہ باغوں اور بند کمروں میں بیٹھے تخیل کی پرواز تو ممکن ہے لیکن واقعیت نگاری اور حقیقی زندگی کے درخشاں نقوش صرف چلتی پھرتی زندگی کے مطالعے ہی سے ممکن ہے۔ روسی ادیب دن بھر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں تو راتوں میں خندقوں میں بیٹھے ادبی شاہکار پیش کرتے ہیں۔

کیا ان پیمبران مستقبل کے ادب میں موجودہ تہذیب دم توڑتی نظر نہیں آتی اور کیا آنے والے نظام نو کی نوید اس ادب میں نہیں ہے؟ اگر یہ ٹھیک ہے تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ ادب اور تہذیب لازم و ملزوم ہیں ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تہذیب نے جتنے نت نئے رنگ بدلے ادب کے نگار خانے میں محفوظ ہیں اور اس سے انکار لایعنی۔

حسینی شاہد

ارباب طریقت

— چو حبیب تشنہ ی و بادہ پیمائی ؛ بیاد آر حریفان بادہ پیما را

ایک عرصہ ہوا کہ انھیں دیکھا تھا۔ آپ کو دھوکا دیتی
ہوں کہ بھول گئی۔ لیکن دل سے جواب آتا ہے نہیں کبھی
نہیں۔ تم انھیں کبھی نہیں بھول سکو گی۔ اب بھی وہ آنکھوں
کے سامنے ہیں۔ بس مجھے تو یہی یاد ہے ہنستا ہوا چہرہ۔ رتی
ہوئی آنکھیں۔ شعر و شاعری کے دلدادہ، خاموش دوستی و محبت
کے قائل۔ کبھی کبھی تو ان کی باتوں کی چھیڑ سے سازِ دل کا تار
تار جھنجھلا اٹھتا۔ لیکن خود انھیں خبر نہیں کہ کیا کر دیا۔ شاید
اسی وجہ سے بیحد محبوب ہیں وہ مجھے۔ ان کی آنکھوں کی
ٹھنڈک اور لبوں کی شادابی جانے کیا چیز تھی اب بھی جب
بھی یاد آتے ہیں تو بے چین ہو جاتی ہوں۔ لیکن اتنی
انست کے باوجود انھیں نہ سمجھ سکی۔ ایک دفعہ پوچھا کہ
آپ خود سمجھا دیجئے کہ کیا ہیں۔ تو کیسے مسکرا کر کہا تھا ؎

سمجھ میں خاک نہ آئیں گے معنی و مطلب
مجھے نہ سن کہ بہت دور کی صدا ہوں میں

صاحب قر وہ واقعی دور کی صدا بن گئے۔ قسمت شاذ ہی کا نام ہے۔

(۲) سانپ کو دیکھا تھا۔ اکثر مداریوں کے پاس۔
ان کی چمکتی ہوئی کھال۔ مسحور آنکھوں کو بھی۔ خوبصورت تو ک
لیکن میں نے شوق سے دیکھا تھا کہ کس طرح ان کی خوبصورتی
ان کے پوشیدہ زہر کی مرہون منت ہے۔ لیکن انسانوں میں
بھی ایسے سے واسطہ پڑا تھا۔ مگر جب ان کو دیکھا تو
معلوم ہو گیا کہ زہر بھی میٹھا ہوتا ہے۔ آتے ظاہر و باطن
کس قدر مختلف۔ میں نے انھیں کیا سمجھا اور پھر کیا نکلے۔ اکثر
سوچتی ہوں کہ کیا وہ سب باتیں دھوکا تھیں۔ وہ شفقت وہ
محبت۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود قربت اب بھی چاندنی
راتوں میں جب میرا دل کہانیاں سننے کو چاہتا ہے تو میں
انھیں یاد کرتی ہوں بیساختہ۔ نہ جانے وہ اب مجھے یاد بھی
کرتے ہیں کہ نہیں۔ میں انھیں بھول نہ سکوں گی۔ مجھے بعض
اوقات یقین نہیں آتا کہ وہ دشمن تھے۔ لیکن انھوں نے ہی تو
مجھے ادب اور افسانے سے محبت کرنا سکھایا۔ وہ مجھے کتنی
میٹھی میٹھی نظمیں سنایا کرتے۔ اور جب میں مسلسل کئی مہینوں
بیمار رہی تھی تو انھوں نے کیسی تیمار داری کی تھی میری۔ اور
مجھے رات بھر نیند نہیں آتی تھی تو اکثر پاؤں دباتے ہوئے
وہ مجھے افسانے سنایا کرتے۔ مختلف زبانوں کے افسانے۔
انھیں کیسی قدرت تھی فسانہ گوئی میں۔ ہر رنگ خیال کے افسانے
آتے تھے۔ جب سے وہ گئے ہیں میں سمجھتی ہوں کہ بہت سی
محبوب چیزیں مجھ سے چھین لی گئیں۔ اور کتنا ہی ترستا ہے
میرا دل وہ باتیں ایک دفعہ صرف ایک دفعہ پھر سننے کے لئے لیکن
—— یہ تو ناممکن ہے

مر کے بھی ہم سے ان کو بھلایا نہ جا سکا

(۳) بس یونہی میری زندگی میں دبے پاؤں چپ چاپ
سے یہ داخل ہو گئے۔ پہلے تو مجھے احساس بھی نہ ہوا تھا کہ یہ
دوست بھی بن سکیں گے۔ لیکن طبیعتوں کی یکسانی، مذاق کی
ہم آہنگی خیالات کا اشتراک ہی وہ چیزیں ہیں جو غیر محسوس
طریقہ پر ہم کو ایک دوسرے کے قریب کرتی گئیں۔ لیکن
اب بھی ہم دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اعتراف نہیں
کیا کہ ہم میں دوستی ہے۔ طبیعت کو میں اکثر اب پہچاننے لگی ہوں۔

لیکن ابھی انھوں نے اپنے آپ کو میرے سامنے عیاں نہیں
کیا ہے۔ احساسات کی نہایت عمیق گہرائیوں میں بستی ہیں۔
جیسے شائد وہ بھی نہ جانتی ہوں۔ اپنے آپ پر قابو حاصل ہے۔
مذاق نہایت لطیف۔ بحث ومباحثہ کی عادی۔ ہم دونوں میں
بعض اختلافات بھی ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ہم قریب
ہیں۔ چند برائیاں بھی۔ جس کو ہم طبیعتوں کا عنصر سمجھ کر برداشت
کر لیتے ہیں۔ فلسفی اور شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار اور مقالہ نویس
بھی جو کچھ ہوا اچھے ہیں۔

(۴) ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ۔ سامنے تو ہمیشہ یقین دلاتی ہیں
کہ دوست ہیں۔ لیکن ہیں بس کی گانٹھ جہاں موقع ملا اپنی
چال چلتے ہیں۔ اور ہماری برائی کرتے ہیں۔ لیکن کچھ اس
انداز سے کہ سننے والے کو شبہ بھی نہ ہو کہ یہ ہمارے دشمن ہیں۔
یہ بھی تو ایک کمال ہے۔ دوست نما دشمن۔ آستین کے سانپ
ہوتے ہیں نا۔ ان سے جی بہت گھبراتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے
نبھانا ہی پڑتا ہے۔ وہ بھی اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ اس لئے
میں قابل معافی سمجھتی ہوں۔ علم کا خاص شوق ہے۔ لیکن
علم علم کی خاطر نہیں نام ونمود کی خاطر چاہتے ہیں۔ ظاہرا
بھولے بھالے بنتے ہیں۔ لیکن کیا کہوں وہ کیا ہیں، خدا
ان کی شرارتوں سے بچائے۔ نہ صرف مجھے بلکہ ہر ایک کو۔
غضب تو یہ ہے کہ آہستہ آہستہ ایک اور کو مجھ سے بدگمان
کئے دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو رونا آتا ہے۔ پھر بھی اپنے
آپ کو فرشتہ سمجھتے ہیں۔ بڑے کام بذات خود نہیں کرنا
چاہتے۔ لیکن ویسے شرکت کر لیتے ہیں۔ شائد خود اپنے
آپ سے دھوکا کھا رہے ہیں۔

(۵) ان کی آنکھیں مجھے بہت پسند ہیں۔ آنکھوں سے
زیادہ ان کی ذات۔ ذات سے زیادہ صفات۔ بہرحال یاد رکھے
جانے کے قابل۔ نہ صرف میری محبت بلکہ عقیدت کے بھی مستحق۔
باتیں کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ستار دھیرے
دھیرے اپنی خاموش موسیقیوں کو ابل رہا ہو۔ جب شعر
پڑھتے ہیں تو خود سرتاپا شعر ہو جاتے ہیں۔ احساسات کی
فراوانی سے اکثر قوس قزح کی رنگینیاں چہرے پر کھیلا کرتی
ہیں۔ صلح جو اور نیک خصلت۔ خندۂ زیرلب کے قائل۔ ہمیشہ
خود مسرور رہیں اور دوسروں کو بھی مسرور بنائے رکھیں۔
ان کو دیکھتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی نیلی شفاف
جھیل میں سفید کنول تیر رہا ہو۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھکورے
جھولا جھلا رہے ہوں۔ حسین ہونے کے باوجود احساس حسن
نہیں۔ کام خود بھی دلچسپی سے کریں اور دوسروں سے بھی
کام لینا جانیں۔ بہرحال سرتاپا ایک لطیف شعر ایک پاکیزہ
خیال ہیں۔

(۶) خوبصورت تو نہیں لیکن پھر بھی ایک دلکش چہرے
کے مالک ہیں۔ ادب نواز، شعر وشاعری سے بیحد انس ہے۔
افسانے ان کی جان ہیں۔ مذاق نہایت پاکیزہ اور شستہ۔
خطوط لکھنا تو کوئی ان سے سیکھے۔ جی چاہتا ہے کہ شروع کرنے
کے بعد کبھی ختم نہ ہو۔ بات کرتے ہیں تو گمان ہوتا ہے کہ جھرنا
جھر رہا ہے۔ جھر جھر۔ زندگی کو خوب سمجھتے ہیں۔ زمانہ کو باوجود
اپنی کم عمری کے آزما کر دیکھا ہے۔ پہلے بیحد شریر تھے۔ اب
کچھ سنجیدگی پیدا ہو چلی ہے جس میں پوشیدہ حزن کروٹیں
لیتا ہے۔ آنکھیں غماز ہیں کہ دل میں ایک کسک ضرور ہے
محبت میں کامیابی کے کبھی قائل نہیں۔ ہنس ہنس کر تیر
کھانا کوئی ان سے سیکھے۔ کسی کی برائی نہ چاہتیں۔

خاموشی سے مصروف ہے۔ ماں کا کریا کرم بھی سریندر کے ذریعہ ہوا۔
[illegible] علاج ہوتا رہا ہے۔ شہر سے سول سرجن کو بلوایا۔
[illegible] علاج معقول ہو سکے۔ آخر اس نے
[illegible] کو موت کے منہ سے چھڑا لیا۔ اب پریم اس کے گلے کا ہار ہے۔
ماں کا بھول چکا ہے۔ تلوتما سریندر کے احسان سے دب چکی ہے۔
وہ کسی قیمت سے اندر ہی اندر گھلی جا رہی ہے۔ احسان اتارنا
فی الحال ناممکن ہے۔ تلوتما گھر کا کام اور سریندر کی خدمت بھائی
کی طرح کر کے احسان کا بدلہ دینا چاہتی ہے۔ سریندر کا گھر اب اس کے
لئے جنت ہو گیا ہے۔ سریندر کو اب بھی وہی محبت ہے۔ لیکن دونو
گزری ہوئی باتیں کبھی یاد نہیں کرتے۔ تلوتما کسی قدر سریندر سے
گھبراتی ہے خصوصاً اس وقت جب کبھی وہ بیوہ کی شادی پر مضمون
لکھتا ہے یا بحث کرتا ہے۔ وہ اس گفتگو سے کانپ اٹھتی ہے۔
وہ کمار سے بیوفائی نہ کرے گی۔ وہ اس کی تھی اور اسی کی رہنا
چاہتی ہے۔ ایک دن تلوتما نے سریندر سے کہا "میری ایک آرزو
ہے نہ جانے ایشور کب پورا کرے گا؟" سریندر بچہ کو کھلا رہا تھا۔ اس نے
توجہ ہٹاتے ہوئے پوچھا "کیا؟ تم نے اب تک کیوں نہ کہا۔ پریم
کی طرف سے بے فکر رہو۔ اگر کوئی دوسری بات ہو تو کہو۔ سریندر
تمہاری ہر آرزو پوری کر سکتا ہے اگر وہ امکان میں ہو تو۔" سریندر
نے جوش سے کہا۔ تلوتما نے جواب دیا "مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی
بھیا۔ پر پہلے وچن دو کہ کچھ بھی ہو اس کو پورا کرو گے۔" سریندر
رنجیدہ ہو گیا، کیا تم کو مجھ پر شک ہے تلوتما! تلوتما بولی "میں بھابی
لانا چاہتی ہوں۔ میری آرزو ہے کہ اپنے بھیا کا بیاہ کروں،
اس گھر میں لچھمی دیکھوں، کیا اس کو پورا کرو گے سریندر؟" سریندر
کے جذبات کو ٹھیس لگی وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ "کیوں خاموش کیوں
ہو گئے۔ کہو نا اجازت ہے۔" سریندر نے کہا "تم وچن لے
چکی ہو میری دنیا اجڑ چکی ہے، اگر کسی اور کو دکھ میں ڈالنا ہو تو
تمہاری مرضی" اس سے زیادہ وہ نہ کہہ سکا اور دوسرے کمرہ میں
چلا گیا۔

سریندر کی شادی ہو چکی ہے لیکن دونوں میں ہر وقت
کھٹ پٹ ہوتی ہے۔ سریندر چاہتا ہے سمترا اس کی طرح پریم
اور تلوتما پر جان دے۔ برخلاف اس کے سمترا دونوں کو ایک
نظر نہیں دیکھ سکتی۔ تلوتما سریندر سے لڑتی ہے۔ سمجھاتی ہے۔
منت کرتی ہے لیکن سریندر کہتا ہے میرے دو دل نہیں ہیں
اور نہ ایک میان میں دو تلواریں سما سکتی ہیں۔ میں نے پہلے
ہی کہہ دیا تھا۔ تلوتما سمترا کو سمجھاتی ہے تو وہ اس سے لڑتی
ہے۔ "منحوس کس جگہ سے آئی ہے۔ میری چھاتی پر مونگ دلنے
طرفداری کرتی ہے اپنے بھتیجے کی۔ میرا بس چلے تو زہر دیدوں۔"
ان جملوں نے تلوتما کے دل کو چھلنی کر دیا ہے۔ وہ کڑھ کڑھ کر
آدھی ہو گئی ہے۔ ہر وقت دونوں کو ملانے کا طریقہ سوچتی ہے۔
جو الفاظ نہ سن سکی اور یہاں آئی۔ دکھ برداشت کیا۔ پھر وہی
الفاظ۔ منحوس کو دنیا میں رہنے کا کیا حق ہے۔ وہ سوچتی
ہے، اس نے ایک دن پریم کو اپنے والد کے پاس بھیجنے کا انتظام
کر لیا۔ وہ لوگ پریم کو ہزار دفعہ بلا چکے تھے۔ لیکن سریندر نہیں
جانے دیتا تھا۔ ایک دن سریندر پریم کو لئے ہوئے باہر گیا تھا۔
سمترا دونوں کو کوس رہی تھی۔ تلوتما نے پوچھا "اگر مجھے یقین
دلا دو کہ میں مر جاؤں تو سریندر کو خوش رکھو گی اور پریم سے
اچھا برتاؤ کرو گی تو میں مرنے تیار ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ
میری موت ہی تم کو خوش رکھے گی۔" سمترا بھی بیٹھی تھی۔ سریندر
اس کو لے جانے سے انکار کر دیا۔ پریم کو لیکر گیا تھا۔ منہ میں بولی

"اچھا ہی ہے جتنا جلد مرو۔ اس نگوڑے پریم سے بھی پاپ کٹے اتیشور کرے۔ بڑی پر چھنے آئی ہے جیسا مرہی تو جائے گی۔ غیرت دار ہوتی تو کب کی مرگئی ہوتی جب تمھارا مول کٹے گا تب وہ مجھ سے خوش رہیں گے۔"

آج تلوتما کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا، اگر سریندر اس کی موت کے بعد خوش رہے گا تو وہ خوشی سے مر سکے گی۔ اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ سریندر خوش رہے۔ اس نے آج پریم کو رخصت کر دیا۔ جاتے وقت اس کو گلے لگا کر رونے لگی۔ "پریم! شاید یہ میری آخری خواہش ہو اس کو پورا کرنے کی ہمیشہ کوشش کرنا، ہر وقت تمھارے ماما (سریندر) کو خوش رکھنے کا خیال رکھنا، چاہے تم کو رنج پہونچے پر ماما اور ماما کی خوشی کا خیال رکھنا۔" پریم رونے لگا۔ "دیکھو ماں اگر تم روئیں گی تو میں نہ جاؤں گا۔ تم آج ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو، مجھے خوشی سے رخصت کرو، جب بلاؤ میں آجاؤں گا، تم ہی تو بھیج رہی ہو، تم کیوں نہیں چلتیں۔" اس نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

تلوتما بستر پر پڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر کی رائے ہے کہ اس نے زہر کھا لیا ہے۔ سریندر حیران ہے کہ شام تک وہ اچھی تھی، اب کیا ہوا اس نے زہر کیوں کھایا۔ ڈاکٹر نے طاقت کی دوا دی تاکہ وہ آخری بار کچھ کہہ سکے۔ تلوتما نے اشارے سے سریندر اور سمترا کو بلایا، سمترا کافی متاثر ہو چکی تھی۔ تلوتما بولی۔ "سریندر! دیکھو بھیا! اپنی مرتی ہوئی بہن کی آخری تمنا ہے ضرور پوری کرنا۔ میں نے تمھیں خوش دیکھنے کے لئے خوشی سے زہر کھایا ہے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے مرنے پر تم سمترا کو سکھی رکھو گے اور تم بھی خوش رہو گے، اگر میری آتما کو سکھی رکھنا ہے تو تمھیں ہر حال میں خوش رہنا چاہیے۔"

"تلوتما تم دیوی ہو، مجھے معاف کر دو، مجھ پاپی کے کارن تمھارا یہ حال ہوا۔ میں سمترا...." وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔

"سمترا! میں نے تمھیں ہمیشہ بہن سمجھا اور بڑی خوشی سے تمھارے اور سریندر کے لئے زہر کھایا، تم بہن کے آخری وقت سریندر کو خوش رکھنے کا وچن دو۔" سمترا روتی ہوئی تلوتما کے پاؤں پر گر گئی۔ "مجھے معاف کر دو بہن۔ کاش تمھاری جگہ میں مر سکتی۔ میں نے اپنے ہاتھوں اپنی محسن بہن کو زہر دیا۔ میں بڑی ابھاگن ہوں۔ کہو معاف کر دیا۔" تلوتما نے پریم کی تصویر منگوائی اور اس کو گلے سے لگا کر سو گئی۔ وہ نیند جس میں دکھ سکھ کچھ بھی نہیں۔ جو آنے کے بعد پھر نہیں جاتی۔

سمترا بیوہ کے اس ایثار سے بیحد متاثر ہے، اس نے پریم کو بڑی مشکلوں اور منتوں کے بعد اپنے پاس رکھ لیا۔ پریم ان کی خوشی اس میں دیکھ کر رہنے پر راضی ہوگیا، وہ ہر وقت دونوں کی خوشی کا خیال رکھتا ہے، سمترا اور سریندر ایک دوسرے کو خوش رکھنے کا خیال رکھتے ہیں، سریندر اگر رنج سے کہیں کا نہ رہا۔ لیکن اس کو تلوتما کی آخری آرزو پوری کرنی پڑی وہ صرف اس کی آتما کو سکھی رکھنے خوش رہنا چاہتا ہے۔ اس ایثار نے اس کو خوش رہنے پر مجبور کر دیا ہے اور بدنصیب تلوتما کی آخری آرزو پوری ہوتی نظر آتی ہے۔

مقبول عبدالرحمن

یادگار پریم متی

(ماخوذ از مضمون انگریزی "ٹیلنگ" مجلہ عثمانیہ)

شہر کے ہنگاموں سے دور.... گولکنڈہ قلعہ کی فصیلوں کے پار.... عثمان ساگر کی راہ پر ایک مسجد نظر آتی ہے، خراب و خستہ۔ اس کی تعمیر میں جابجا ہندویت کے نشان ابھرے ہوئے دکھلائی دیتے ہیں۔ راہ گیر کی نظریں جونہی اس پر پڑتی ہیں نوطرح طرح کے خیالات آگھیرتے ہیں۔ اس کا ذہن الجھنے میں پڑ جاتا ہے۔ یہ مسجد خاندان قطب شاہی کے عشق و محبت کی یادگار ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی محبوبہ نظر پریم متی اس کی بانی ہے۔ پریم متی جس کے حسن کی اس زمانے میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ مگر آخر یہ مسجد نامکمل حالت میں کیوں رہی؟ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا ہے محبت کی ناکامی کسی کا کہنا ہے بے وقت کی موت.... کسی کی زبان پر ہے، اس مہر و وفا کی دیوی پر بلائے ناگہانی کا نزول.... بہرحال وجہ کچھ ہو اتنا ضرور ہے کہ صدیاں گزر گئیں لیکن اس خراب و خستہ و ویران مسجد میں ایک نامعلوم سی کشش ہے کہ چند لمحوں کے لئے راہ چلتوں کو آج بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور کوئی راہ گیر یا مسافر اس حسرت و یاس کے مجسمہ پر اپنی بشاشت نذر کئے بغیر آگے قدم نہیں بڑھاتا۔ سنسان مسجد کا سکوت اسے صدیوں پیچھے اس دور میں لے پہنچتا ہے جب کہ شان و شوکت جاہ و حشم کا دور دورہ تھا۔ گھر گھر پریم متی کے حسن کے چرچے تھے، سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دل کی وہ ملکہ بنی ہوئی تھی، اس کی دلفریب اداؤں نے شاہ کے دل میں گھر کر لیا تھا، بادشاہ سو جان سے اس کا متوالا بنا ہوا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے جب کہ طوفان خیز رات کی تاریکی صبح صادق کے نور میں چھپ رہی تھی، فجر و حجر کا نکھار ایک سماں دکھا رہا تھا، طائر چہچہا رہے تھے، جذبات کا ایک طوفان تھا جو میرے سینے میں موجیں مار رہا تھا۔ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا، اٹھ کھڑا ہوا، ماشاءاللہ صبح کا وقت بھی ایک نعمت ہے۔ جدھر نگاہیں پڑتی ہیں قدرت کی صناعی پر دل فدا ہو جاتا ہے۔ نسیم سحر کے جھونکے قدم قدم پر نثار ہوتے ہیں اور دیکھنے والے کو ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ صبح کا سہانا سماں، طائروں کے چہچہے، قدرتی مناظر، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو فطرت کے شیدائی کو آبادی سے میلوں دور کھینچ لے جاتی ہیں، میرے بھی قدم اٹھتے ہی چلے گئے اور میں خیالات میں غرق آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ عثمان ساگر کی راہ لی، اور اتفاق سے رخ اسی مسجد کا جس کی کہنگی میں تاریخ کا عشق و محبت میں ڈوبا ہوا ایک ورق پوشیدہ ہے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بلند مقام پر ایک ٹوٹی پھوٹی سی مسجد ہے جس کی خستہ حالی نے کشاں کشاں مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ مسجد میں پہنچا تو اس کا عالم ہی جداگانہ تھا۔ سامنے دیو کی طرح کھڑا ہوا گولکنڈہ کا قلعہ نظر آیا۔ مسجد کے اطراف نشیب میں ہرے بھرے سرسبز و شاداب لہلہاتے کھیت ایک نیا ہی سماں باندھے نظر آئے جن میں کاشت کاروں، کسانوں کی باہم گفتگو نے ان کی دلفریبی کو دوبالا کر ڈالا۔ مسجد کی دیواروں پر

نظریں پڑیں تو بے خود سا ہوگیا۔ بیخودی کے عالم میں ہی تھا کہ کسی کی السلام علیکم کی صدا نے مجھے یکایک ہوش و خرد کے عالم میں لا کھڑا کیا۔ اپنے اطراف نگاہیں دوڑائیں تو ایک مسن شخص کو اپنے پیچھے کھڑے مسکراتے ہوئے پایا۔ جو مجھ سے کہہ رہا تھا' صاحبزادے! ایسی بھی کیا بیخودی' نوجوانوں کو اتنی بیخودی سے کیا واسطہ؟ میں نے بوڑھے کی باتوں کا خیال نہ کرتے ہوئے وعلیکم السلام کہا جس پر اس نے اپنا سلسلۂ کلام بدلتے ہوئے دعائیں دیں اور بڑے ہی تعجب سے پوچھنے لگا۔ میاں! آپ جیسے نوجوان اور اس ویرانے میں؟ تماشا ہے' حیرت ہے!! میں نے بڑے میاں کی بزرگی کا پاس کرتے ہوئے ادب سے کہا۔ اس مسجد کی مقناطیسی کشش نے مجھے یہاں کھینچ لایا ورنہ کہاں مسجد اور کہاں تہذیب کے فرزند۔ بوڑھے کی باچھیں کھل گئیں، کھل کھلا کر ہنس پڑا، ہنستا جاتا اور میرے کہے ہوئے الفاظ دہراتا جاتا۔ "کہاں مسجد اور کہاں تہذیب کے فرزند" خوب کہا میاں خوب کہا۔ جب ذرا سکون ہوا تو میرے چہرے پر بوڑھے نے استفسار کے آثار پائے، مجھے ساتھ لے مسجد کے اس مقام کی طرف بڑھا جس کو وہ اپنی زندگی کے آخر لمحات کا ملجا و ماویٰ تصور کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ کوئی راز ہے' مسجد کی جس پر بنیاد ہے اور بوڑھے کا سینہ جس کا گھر ہے۔ میری دلچسپی نے بوڑھے کو اپنا راز مجھ پر عیاں کر دینے کے لئے آمادہ کر لیا۔

" دل ربا یہ دل رہبت " کوئی آنسو پونچھنے والا نظر آتا ہے تو نگاہیں اشکبار ہو ہی جاتی ہیں۔ چنانچہ میرا خیال صحیح نکلا۔ تھوڑی ہی دیر میں ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بوڑھے نے اپنی رام کہانی اس طرح پر شروع کی ..... کہنے لگا۔ میرے آباواجداد کی عمریں قطب شاہی سلطنت کی خدمت گزاری میں بسر ہوئیں' میں خود بھی قلعہ گولکنڈہ کا ایک وظیفہ یاب سپاہی ہوں' اس کے اطراف و نواح میرے عہد طفولیت میں کھیل کود کا گہوارہ بنے رہے ہیں۔ عہد شباب میں بارہا یہ مسجد میرا مسکن بنی رہی اور اب آخری ایام بھی اسی کے ماحول میں گزار دینے کا تہیہ کر بیٹھا ہوں۔ وقت کی موزونیت نے بوڑھے کی گفتگو میں مجھے ایسا محو کر دیا کہ جب وہ کہہ رہا تھا "یہی قلعہ جو آج کھنڈر ہے کبھی قطب شاہی خاندان کی شان و شوکت کا نمونہ تھا" ...... بوڑھے کی دھیمی دھیمی آوازیں میرے کانوں پر پڑ رہی تھیں اور محویت کے عالم میں میں دیکھ رہا تھا کہ قلعہ ویسا ہی شان و شوکت کا نمونہ بنا ہوا ہے ہر طرف ایک ہل چل مچی ہوئی ہے' اچانک ایک برات آتی ہوئی نظر آتی ہے' بیچ میں ایک پالکی ہے۔ شاہی بانڈ سامنے بجتا چلا آ رہا ہے' اسی مقام کا رخ ہے جہاں اب مسجد کھڑی نوحہ کر رہی ہے۔ پالکی منزل مقصود پر پہنچ گئی ہے' نگاہیں منتظر ہیں کہ پالکی رکھی گئی' اس کا پردہ کھلا، ایک چہرہ حسن و جمال کا نمونہ نظروں کو خیرہ کرتا ہوا نکلا۔ یہی ہے پریم متی دیوی، سلطان کے قلب کا سرور، آنکھوں کا نور، اپنے محبوب کی بارگاہ محبت "مسجد" سجدہ گاہ خاص و عام' نذر کرنے کی خاطر اور اس مسجد کی تعمیر کے متعلق احکام دینے آئی ہے بوڑھے کی آواز دھیمی ہو گئی اور اس نے چند لمحوں کے وقفہ کے بعد ایک آہ سرد بھری اور اپنی درد بھری داستان شروع کی اور میں پھر ایک بار محویت کے عالم میں غرق ہو گیا

کیا دیکھتا ہوں مسجد مکمل ہونے کے قریب ہے، قلعہ میں ایک شور بپا ہے ہر طرف سے آہ و بکا کی صدائیں آ رہی ہیں۔ لوگوں پر بدحواسی کا عالم طاری ہے، قلعہ کی در و دیوار سے حسرت برس رہی ہے کہ اتنے میں قلعہ کا دروازہ کھلتا ہے چار آدمی اپنے کندھوں پر ایک جنازہ سنبھالے نکلتے ہیں۔ پیچھے ہی ایک شخص نظریں نیچی کئے رنج و الم کی تصویر بنا چلا آ رہا ہے۔ یہ سلطان عبداللہ قطب شاہ ہے۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر لوگوں کا ایک ہجوم ہے جن کے چہروں پر حسرت و یاس، ہراس و پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ آہ نیرنگیٔ عالم! تفو بر تو...... اے چرخ گردان تفو...... اُف کیا حسرت بھرا منظر! یہ وہی پریم متی ہے جس کے حسن و عشق کے کل گھر گھر چرچے تھے۔ شاہ کے دل پر وہ حکمران تھی......

آج قلعہ سے اسی کا جنازہ نکلا ہے۔ خود شاہ بہ نفس نفیس اپنی آرام جاں کو اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک کرنے پر مجبور ہوا ہے...... اسی کا غم ہے جس نے شاہ کو نیم مردہ بنا ڈالا ہے، اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹھیس لگی ہے جس کا کوئی علاج نہیں، رہ رہ کر بادشاہ کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور اسے آمادہ بہ حشر کر دیتی ہے۔ وقت ہے کہ اپنے قرنہا قرن کے معمول کے مطابق، بے نیاز اس سے کہ بستی کسی کے دل کی اجڑ گئی یا بس گئی، کشتیٔ محبت کسی کی آشنا بساحل ہوئی یا درمیان ہی میں نذرِ طوفان ہو گئی، رفتار میں مشغول ہے......

پریم متی کو عالمِ بقا کی طرف سدھارے تیسرا روز ہے کہ بے اختیار بادشاہ کو اس کی یاد آئی اور وہ اپنی محبوبہ کی قبر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ قبر پر نگاہیں پڑیں، آنکھیں اشکبار ہو گئیں، دل پکار اٹھا آہ کل جو قصرِ عالیشان پر حکمران تھی، آج منوں مٹی کے نیچے ہے، مقبرہ تک نہیں۔ فوراً ایک پُرشکوہ عالیشان مقبرہ کی تیاری کا حکم صادر ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مقبرہ تیار ہو جاتا ہے جو زبانِ حال سے انسان کو منزلِ آخرت کا نشان بتاتا ہے۔ شاہ کے حکم کے مطابق اس پر یہ مصرع کندہ کیا جاتا ہے۔ "بعد از زلزلِ گل خفتی، پریم متی" شاہ پھر ایک بار اس یادگار کو دیکھنے نکلتا ہے جس میں اس کے دل کا کنول مرجھایا ہوا پڑا ہے کہ اسے اس مندر کا خیال آتا ہے جو حسن کی بارگاہ سے محبت کے مندر پر چڑھائی جانے والی تھی۔ وہی مسجد...... شاہ حسرت بھری نگاہوں سے اس کی نامکمل حالت کو دیکھتا ہے، دل کی دنیا میں ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے۔ فوراً مسجد کی بقیہ تعمیر بند کر ڈالنے کا فرمان دیتا ہے...... اپنے سے کہتا ہے جب مصلی ہی باقی نہیں تو اس کے حلیہ ہی کا کیا لطف؟

سورج چمک رہا تھا، اس کی تیز تیز چمکیلی کرنیں ہم پر پڑ رہی تھیں، بوڑھے نے اپنی داستان پُرغم ختم کر دی تھی، چند لمحوں تک ہم دونوں پر سکوت کا عالم طاری رہا۔ یکایک میں گویا ایک گہری نیند سے چونک پڑا...... کیا دیکھتا ہوں وہی ماحول ہے، سرسبز شاداب کھیت، اجڑی مسجد، دیو کی طرح سامنے کھڑا ہوا گولکنڈہ کا قلعہ......

حیران تھا سوچ رہا تھا کہ کس دنیا میں جا پہنچا تھا اور اب کہاں آ پہنچا۔ اٹھا، بوڑھے کا شکریہ ادا کیا جس نے مجھے چند ساعتوں کے لئے اس دور میں پہنچایا جب کہ قلعہ گولکنڈہ اور اس کے اطراف و اکناف پر شان برستی تھی...... دماغ میں یہی خیال لئے گھر کا رخ

کیا۔ گھر پہنچا تو بھائی بہنوں کے قہقہوں کی گونج میں تاریخی محبت کا وہ واقعہ دل سے نہ جانے کیسے محو ہو گیا؟ ....

منیزہ بانو کاؤس جی

میکدہ

میکدے میں ایک ہی ہنگام تھا — بے حقیقت فرقِ صبح و شام تھا

"جس کو پاسِ ہوش ہے اندر نہ آئے" — چشمِ ساقی کا کھلا پیغام تھا

نعرۂ آغازِ شغلِ میکشی — بے نیازِ کلفتِ انجام تھا

عام تھی تقسیمِ لطفِ زندگی — وقفِ عشرت ہر دلِ ناکام تھا

غم رُبا تھی ہائے و ہوئے میکشاں — جرعۂ مے دافعِ آلام تھا

قصۂ توبہ رہا بیرونِ در — ہر طرف ذکرِ مے گلفام تھا

راحت افزا قہقہوں کی گونج میں — غمزدوں کو چین تھا آرام تھا

بے محابا چل رہا تھا دورِ مے — کس کو خوفِ گردشِ ایام تھا

حالِ مستی کی عیاں تھی پختگی — فکرِ عقبیٰ اک خیالِ خام تھا

پائے خم پر جھک رہے تھے سب کے سر — ننگِ رندی حفظِ ننگ و نام تھا

اٹھ رہی تھی فرش سے اک موجِ خوں — ساغر و مینا کا قتلِ عام تھا

بزم میں رندوں کے تیور الاماں! — جو تھا اپنے وقت کا خیام تھا

نغمہ پیرا تھی حیاتِ جاوداں
زندگی پر موت اک الزام تھا

(لہو ترنگ کا ایک صفحہ)

سکندر علی وجد

موج کرنا

اگر موج کرنے کے لئے کچھ پیسہ ہو تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غریب زیادہ موج کرتا ہے یا امیر؟ حالات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید غریب ہی زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کو جو کبھی تھوڑا سا پیسہ اڑانے کے لئے مل جاتا ہے تو یہ خود ایک بڑی پُرلطف چیز ہوتی ہے اور ہر وہ لطف جس کے لئے انسان سخت محنت کرتا ہے زیادہ مزہ دار ہو جاتا ہے۔ اچھی چیز کا بہت زیادہ میسر ہونا یا بہت زیادہ دیر تک میسر رہنا، اکثر یکسانیت و یک رنگی کی وجہ سے بیزاری پیدا کرتا ہے۔ جنت کی دوامی مسرت کے تصور سے بھی بعض شعرا شاید اسی لئے گھبرا اٹھے کہ یہاں دوامی مسرت غالباً تھوڑے ہی عرصے میں اجیرن ہو جائے گی بہتر کا بڑا راز یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان تھوڑے سے عرصے کیلئے وہ چیز حاصل کر سکے جس کے ایک عرصے تک حاصل کرنے اور رکھنے کا آرزومند رہا ہو اور حاصل نہ کر سکا ہو۔ کیونکہ اس چیز کے لئے اس کو محنت سے مواقع نکالنے پڑتے ہیں اور ایسے مواقع نکلنے کے بعد ان سے لطف اندوز ہونے کے ذرائع بھی مہیا کرنے پڑتے ہیں۔ ان ہی وجوہ سے ایسا خیال ہوتا ہے کہ جب غریب کو موج کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ امیروں سے زیادہ مکمل طور پر اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ امیر صبح سے شام تک بہت سے ایسے مشغلوں میں مصروف رہتا ہے جن سے دراصل وہ کوئی خاص لطف نہیں اٹھاتا مگر اس لئے مشغول رہتا ہے کہ اس کا طبقہ ان کو پُرلطف مشغلے یا فیشن سمجھتا ہے۔

اور شاید اسے تجربے کے بعد بھی یہ محسوس ہونے نہیں پاتا کہ جس چیز کا نام اس نے "خوش وقتی" رکھا ہے وہ اس چیز کا نام نہیں ہے کہ وہ چند دوستوں کو ساتھ لیکر ایسا تماشا دیکھنے پر مجبور ہو کہ جس میں سب سے زیادہ قہقہے لگانے والے اور ہنسنے والے وہی افراد ہوں جو اسٹیج پر ہوں اور جو محض تنخواہ کی خاطر ایسا کر رہے ہوں۔ غریب کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اپنی بہترین شکل میں بھی بیزاری کا باعث ہو لیکن اس کو جب کوئی تفریح اس کی مرضی کے مطابق مل جاتی ہے تو پھر وہ خود کو اس میں اس شغف اور جوش کے ساتھ منہمک کر لیتا ہے کہ دیکھنے والا بھی اس کا متعدی اثر اس طرح سے لیتا ہے جیسے موسم بہار کی پرمسرت فضا کا۔ غریب کے مزے کرنے کے انداز غالباً زیادہ پُرشور ہوتے ہیں مگر یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لازماً زیادہ ذلیل بھی ہوتے ہیں۔ یہ بہرحال ظاہر ہے کہ غریب کے مشغلے میں نمائش کا پہلو بہت کم ہوتا ہے اور اس کا مشغلہ شاید زیادہ بے فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے امیر کی "خوش وقتی" ایسی معاشرتی سہولتوں کا غالباً ایک طویل سلسلہ ہو کر رہ جاتی ہے جس سے نہ کوئی لطف حاصل ہوتا ہے نہ فائدہ اور نہ کوئی سبق ہی۔

اسی وجہ سے شاید یہ کہا جاتا ہے کہ ہر وہ چیز جو کامل طور پر فطری ہو ذلیل نہیں ہو سکتی بلکہ ذلت کا مفہوم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دکھاوا، نمائش اور شرم اس میں داخل ہو جائیں بہت کم چیزیں گھمنڈ سے زیادہ ذلیل ہو سکتی ہیں خواہ وہ دولت کی وجہ سے ہو یا علم یا قوت کی وجہ سے ہو یا دنیوی مرتبے کی وجہ سے۔

بعض اشخاص اس کو زیادہ پسند کریں گے کہ کسی میلے میں غریب لوگوں کو اپنی معصومانہ چھوٹی چھوٹی سی تفریحات میں

بغیر تصنع کے عصر پیتے ہوئے دیکھنے کا لطف اٹھائیں نسبت
اس کے کہ کسی "ریس کورس" کے پہلے احاطے کے اشخاص
کی پُر تصنع حرکات کا تماشا کریں۔ ایک خاص معیار کے اندر اپنے
کو جکڑے رکھنا ایک ایسا مشغلہ ہے جس کا مطالعہ بھی، اپنے
نئے پن کے رفع ہونے کے بعد، دوبھر ہوجاتا ہے۔ لیکن
آدمیوں کو اپنے فطری انداز میں فطری اور بے تصنع تفریح
میں مشغول دیکھنا ایک فرحت آور اثر رکھتا ہے اسی طرح
جس طرح کہ آپ قدرت کے مختلف مظاہر کی مختلف کیفیات سے
فرحت اندوز ہوتے ہیں۔ اور بالآخر غور کیجیے تو معلوم ہوگا
کہ زندگی کی سیدھی سادھی اور بے تصنع خوشیاں ہی وہ ہیں
جن کو حقیقت میں ہم زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ممکن ہے ہم یہ تصور
کریں کہ زندگی کی زیادہ پیچیدہ اور قیمتی قسم کی مسرتوں کو ہم
زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر یہ قصہ زیادہ تر نفس کا ایک فریب
اور دھوکا ہوتا ہے، گو بہت سے اشخاص اس چیز کو اس وقت
تک سمجھ نہیں سکتے جبکہ سمجھنے کے بعد اس علم سے فائدہ اٹھانے
کا وقت نہیں رہتا۔

بعض کا خیال ہے کہ اگر شعرا عشق کے متعلق اس قدر
بلند اور دلکش تصورات نہ پیش کرتے تو شائد اکثر نوجوان اپنے
دو مسلسل خیالات بھی اس پر صرف نہ کرتے۔ مگر قصہ یہ ہے کہ
وہ محبت اور عشق کے متعلق اس قدر سنتے رہتے ہیں کہ وہ سمجھنے
لگتے ہیں کہ انھیں عشق میں ضرور مبتلا ہونا چاہیے اور اگر
وہ ایسا کرنے سے قاصر رہیں تو بڑی سبکی کی بات ہوگی یا
خود ان کی جسمانی خوبصورتی اور جاذبیت پر حرف آجائے گا۔
شائد "لطف اندوزی" کا فلسفہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔
چند اشخاص نے حالات کے چند خاص خاص مجموعوں کا نام
مسرت رکھ لیا ہے اور اس کو لطف اندوزی سے تعبیر کرتے
ہیں۔ بس ہر شخص اس مخصوص اجتماع حالات کا بھی [illegible]
متلاشی ہوتا ہے اور اس مخصوص نسخے کے حصول کے بعد
فخر کے ساتھ دوسروں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ "دیکھو، تم
اس قدر بے وقوف ہو کہ تم یہ چیزیں حاصل نہ کرسکے"!

غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ کسی نے کہا تھا کہ "اس
قسم کے کھیل تماشے کم ہوتے تو شائد زندگی برداشت کے قابل
ہوجاتی۔" بہرحال اس کے قول کا کچھ اسی قسم کا مطلب تھا
اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نے ایک بڑی بات کہی تھی گو لوگ
اس کو ایک واقعہ ماننے سے کچھ گھبراتے ہیں۔ اپنے بہترین
کپڑے پہن کر پھرتے پھرتے خود بیزار ہوجانا گویا ایک ایسا نمونہ
ہے جو اس معاشی کشمکش والی دنیا کے سامنے ایک اچھے
انعام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر اس کے لئے کافی اور
طویل کوشش کیجائے تو وہ قابل حصول ہے! لیکن دنیا میں
کتنے بہت سے احمق جمع ہیں کہ وہ برابر اسی قسم کی چیزوں کے
پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں اور چونکہ دوڑتے پھرتے ہیں ان پر
اعتقاد بھی رکھتے ہیں۔ اسی لئے تو کسی دل جلے نے کہا تھا کہ
اگر دنیا میں اس قدر بے وقوف نہ بستے تو اس قدر زیادہ عقیدے
کہاں سے پیدا ہوجاتے؟

آج کل جنگ کا زمانہ ہے، چہار طرف جنگ کے قصے ہیں۔
ایک دوست جو جنگ کے حالات کا قریبی مطالعہ کرچکے ہیں اپنے
تجربے کی بنا پر کہتے تھے کہ جہاں تک موج کرنے اور خوشی
منانے کا تعلق ہے اس کی صلاحیت ایک "ٹامی" میں بہ نسبت
اس کے افسر کے زیادہ ہوتی ہے۔ اور اسی لئے اس کی ضیافت
کرنا نسبتاً آسان تر ہوتا ہے۔ بلکہ ایک ساتھی کی حیثیت سے۔

[illegible] اپنا فرض کہ آپ کی ضیافت طبع کا زیادہ [illegible] ہے یا نہیں کہ افسر کچھ زیادہ روحانی [illegible] کے خواہاں ہوتے ہیں۔ نہیں بات [illegible] ہے کہ اگر ان کی ضیافت میں سفید بے داغ [illegible] اس کے دیگر نمائشی لوازمات نہ ہوں تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے وقار کو صدمہ پہنچایا گیا اور فوراً اپنی "مہماں نوازی" پر یہ ظاہر کر دے گا کہ اس نے با وجود نیک نیتی [illegible] اچھے اداروں کے شاہ [illegible] کے [illegible] صرف سمجھے ہوئے آلو بھینٹ کئے! اس کی حد تک تو "ہائی" اور اس کے افسر کی لطف اندوزی میں اختلاف نہیں ہوتا لیکن اس کے طور طریق میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

اور اس لحاظ سے شاید "ہائی" ہی بہتر قسم کا طفلی ہوتا ہے وہ صرف فطری اور بے تصنع طریقے سے اپنا کچھ وقت گزارنا چاہتا ہے اور جو شغل تفریح اس کو میسر ہو جائے اس سے خوش ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اس کا افسر دنیا بھر کی مصنوعی آسائشوں کا طالب ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب اس کو اس کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ غیر معمولی خرچ کا باعث بھی ہوئی ہیں تو وہ اپنے کو ایک مصنوعی لطف اندوزی کے حوالے کر دیتا ہے مسرت متعدی ہوتی ہے اور ایک طرح کا سبق بھی جن اشخاص نے جنگ کے سپاہیوں کے لئے اس قسم کے مشغلے مہیا کرنے کا کام کیا ہے وہ اس کو ایک نہایت برتر شغل بیان کرتے ہیں۔

لطیف احمد فاروقی

بقیہ سلسلۂ مضمون صفحہ (۸) یہ سن کر خاں صاحب کو بڑا تعجب ہوا۔ جب نہ رہا گیا تو کہا "یہ بھی ہماری مسلمان ہے"۔

کرم علی شاہ۔ "ہاں، مسلمان، ایسا مسلمان کہ خود مسلمانوں میں بہت کم ایسے ملیں گے۔ ہم دونوں نے مدتوں ساتھ ریاضت کی اور روحانی منازل ساتھ ساتھ طے کیں۔ وہ اسی طرح کا مسلمان ہے جیسے کبیر داس تھے۔"

خاں صاحب یہ گفتگو سن کر خاموش ہو گئے۔ گھنٹہ بھر کے قریب کرم علی شاہ کی جھونپڑی میں ٹھیرے اور پھر گھر واپس چلے آئے اپنے بہنوئی رستم خاں سے نئے گھر کی تعمیر کا حال پوچھا۔ اس عرصہ میں کام کچھ آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ لیکن خاں صاحب کو اس کا یقین تھا کہ نیو ٹھیک پڑی ہے۔ بارش اور دھوپ نے اسے خوب مضبوط کر دیا ہے۔ اب وہ زلزلہ اور طوفان کبھی ہائے نہ ہلے گی۔

یوسف حسین خاں

اطلاع:۔ جن خریدار اصحاب کے نام رسالہ وی پی سے بھیجا جا رہا ہے ان کی علم دوستی سے توقع ہے کہ وہ ضرور وی پی حاصل فرما کر اپنی اردو نوازی کا ثبوت دیں گے۔ رسالہ ہر ماہ چار تاریخ تک نہ ملے تو براہ کرم ۲۰ تاریخ تک دفتر ہذا کو مطلع فرماویں۔ مہینہ گزر جانے پر اطلاع دینے سے تعمیل ارشاد میں مجبوری ہے۔ کیونکہ مہینے کے ختم پر رسالے کم ختم ہو جاتے ہیں۔

مہتمم

طلبہ کا طبی معائنہ

دنیا کی ہر مہذب قوم اور ملک میں عوام کی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم سمجھا جاتا ہے۔ خاص حالات اور ضروریات کے تحت اس کے حل کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جہاں ۲۵ کروڑ سے زائد بچے یعنی کل آبادی کا بڑا حصہ پبلک اسکولوں میں تعلیم پاتا ہے۔ ان مدارس کے مجموعی مصارف تقریباً چالیس کروڑ ڈالر ہوتے ہیں اس کے علاوہ ہر سال کثیر رقم مدارس کی عمارات پر صرف ہوتی ہے۔ ان مصارف کا زیادہ حصہ عوام سے محصول [illegible] پورا کیا جاتا ہے لیکن وہاں کے لوگ اس بار کو خوشی برداشت کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کو کتنا اہم سمجھتے ہیں۔ نہ صرف رقمی امداد کی جاتی ہے بلکہ کئی لائق افراد نے اپنی مفت خدمات ان اداروں کی بہتری کے لئے وقف کر دی ہیں۔

طب کی روز افزوں ترقی کے ساتھ ساتھ حفظان صحت کے اصول کے متعلق بھی معلومات میں اضافہ ہوا اور ساتھ ساتھ یہ حقیقت عیاں ہونے لگی کہ بچوں کی دماغی اور جسمانی حالت میں بہت ہی قریبی تعلق ہے۔ استاد اور طبیب دونوں نے اس کو محسوس کیا کہ مختلف بچوں کی ذہنی صلاحیتیں ان کی جسمانی حالت کی مناسبت سے مختلف ہوتی ہیں اور پھر یہ دونوں اس کی وجہ معلوم کرنے کی طرف رجوع ہوئے اور اس طرح مدارس میں لڑکوں کا طبی امتحان ایک [illegible] چیز بن گئی۔

تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مدارس میں بعض مخصوص امراض بچوں میں پیدا ہو جاتے ہیں جیسے قریب نظری اور جسمانی یا ذہنی کمزوری ([illegible]) وغیرہ۔ بچوں کی کثیر تعداد کے معائنے سے یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ جسمانی نقائص کی ابتدا بچپن میں ہوتی ہے۔ اس کا تجربہ اس طرح ہوا کہ امریکی فوج میں جو رنگروٹ بھرتی کئے گئے تھے ان میں سے ۵۰ فیصد فوجی ملازمت کے نااہل اور ۴۰ فیصد صرف معمولی خدمت انجام دینے کے قابل تھے۔ باقاعدہ طبی امتحان سے ظاہر ہوا کہ مرض کی ابتدا بچپن میں ہوئی تھی۔ نہ صرف اس ایک مشاہدہ سے بلکہ اکثر ممالک کے امراض کے اعداد و شمار دیکھنے سے بھی اسی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔

تاریخ۔ مدارس کے طبی امتحان کی اہمیت کو اس سے زیادہ اور کوئی دوسری چیز واضح نہیں کر سکتی کہ تمام مہذب ممالک کی مجالس قانون ساز نے اس کو قانون کے ذریعہ لازمی قرار دیا ہے۔ مدارس میں طبی معائنہ کی تاریخ ۱۸۳۰ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس سال یہ تحریک جرمنی میں شروع ہوئی اس کے بعد ڈاکٹروں کا باقاعدہ تقرر مدارس کے لئے ۱۸۶۸ء میں شروع ہوا جو میڈیکل انسپکٹر آف اسکول کہلاتے تھے۔ انگلستان میں اس کے متعلق پارلیمانی قانون ۱۹۰۷ء میں منظور ہوا۔ گزشتہ جنگ عظیم کی وجہ سے یہ کچھ عرصہ التوا میں پڑا رہا لیکن اس جنگ نے اس کی اہمیت خوب واضح کر دی کہ فوج کی طاقت کا دارومدار اور قوم و ملک کی آئندہ فلاح و بہبود کا انحصار بچوں کی صحت پر ہے۔ انگلستان میں ان بچوں کو جن کے متعلق اساتذہ کا خیال تھا کہ کسی متعدی مرض میں مبتلا ہیں میڈیکل انسپکٹر کے پاس روانہ کیا گیا لیکن بعد کو ہر لڑکے کا باضابطہ امتحان کیا جانے لگا اور غیر حاضر لڑکوں کے لئے ان کے گھر پر انسپکٹر کو روانہ کیا جاتا تھا اور جو بچے کسی متعدی مرض میں مبتلا پائے جاتے تھے ان کو دوسرے صحت مند بچوں سے علیحدہ رکھا جاتا تھا۔ اور اس کے بعد اس بات کی پوری احتیاط کی گئی کہ ان متاثرہ بچوں کا باقاعدہ علاج کیا جائے۔

لیکن جب ہم اپنے ملک کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہلے تو طبی امتحان کے لئے کوئی قانون نافذ نہیں ہے اور اگر اس پر توجہ بھی کی گئی تو صرف اس حد تک کہ ایک قلیل رقم موازنہ میں اس کے لئے مختص کر دی گئی۔ مدرسے میں سال میں ایک مرتبہ بچوں کا طبی معائنہ کیا بھی جاتا ہے تو وہ ایک سرسری طور سے لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ لڑکوں کی بیماریوں یا جسمانی خرابیوں کی طرف توجہ کر کے ان کو دور کرنے کے متعلق عملی تدابیر اختیار کی جاتی ہوں۔ دوسری طرف مدرسے سے بچے کی صحت کے متعلق جو رپورٹ آتی ہے تو والدین یا سرپرستوں نے بھی بہت کم اپنے بچوں کی جسمانی صحت کو برقرار رکھنے یا امراض کے دور کرنے کی عملی سعی کی ہے۔ ہمارے ملک میں مشکل سے پانچ فیصد والدین ایسے ہوں گے جو اپنے لڑکے کے متعلق بتائے ہوئے امراض کا خاص توجہ سے علاج کرواتے ہوں۔

[illegible] کی تکمیل کے لئے ہر سال طبی امتحان ہوتا ہے کیونکہ اس سے وہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے ہیں جو اس اسکیم کا اہم مقصد ہے۔

[illegible] سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ کسی قوم کے بچوں کی صحت و نشوونما اور ان کی تعلیم و تربیت میں ہی اس قوم کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔ اگر ان بچوں کی صحت کی طرف سے غفلت برتی گئی تو قوم کو بہت بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان سب خرابیوں کا ازالہ صرف بچوں کی صحت پر ہے لیکن ہمارے [illegible] عام طور پر بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور اگر سب سے کم توجہ دی جاتی ہے تو اپنی حفظان صحت کے اصولوں پر اور اگر اس کے بعد ہم یہ امید کریں کہ قوم میں تندرست جسمانی اور دماغی قابلیت کے افراد پیدا ہوں تو محض ایک خواب ہے۔ مدرسہ میں بچے کا طبی امتحان اس لئے بھی ضروری ہے کہ اسکول کی پڑھائی کے دوران تعداد دیکھی جاتی ہے اس میں نہ صرف ان کی جسمانی بلکہ دماغی صلاحیتوں کو وقتاً فوقتاً جانچا جا سکتا ہے۔ کئی سال تک ایک بچہ کی نگہداشت بہتر طریقہ سے کی جا سکتی ہے مقصد صرف اتنا ہے کہ قوم کے یہ نونہال آئندہ ہر لحاظ سے کارآمد اور قابل اعتنا بنیں اور کسب معاش میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو۔ جو بچے شروع سے جسمانی اور ذہنی اعتبار سے اچھے ہوں گے ان کے لئے کسی خاص توجہ کی ضرورت نہ ہوگی لیکن وہ جن میں کچھ نہ کچھ جسمانی نقائص موجود ہیں جیسے بصارت کی کمزوری یا ثقل سماعت یا پیدائشی کند ذہنی ان کے لئے شروع ہی سے علاج معالجہ کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تاکہ ان نقائص کا سدباب ہو سکے اور وہ آئندہ کامیاب زندگی بسر کر سکیں۔ ہمارے مدرسوں میں بچوں کی ایک کثیر تعداد ایسی ہوتی ہے جن کو اچھی غذا میسر نہیں آتی اور جو عموماً معمولی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ بعض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو درجہ اول میں کامیابی حاصل کرتے ہیں لیکن سخت محنت کی وجہ سے ان کی صحت بالکل گری ہوئی ہوتی ہے ایسے طلبا امتحانات میں امتیاز کے ساتھ کامیاب تو ہو جاتے ہیں لیکن عمر بھر اطبا کے زیر علاج رہتے ہیں۔ بعض والدین کی لاپروائی کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی طرف توجہ نہ کرکے مصر ہیں کہ یہ بغیر آرام لئے یا صحت کی طرف توجہ کئے تعلیم کو جاری رکھیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے بچے والدین کی غلطیوں کی وجہ سے تلف ہو جاتے ہیں۔ اگر تلف نہ ہوں تو یہ معمولی خرابیاں بڑھ کر ناقابل علاج ہو جاتی ہیں۔ ہونہار بچوں کی موت نہ صرف ان کی اپنی جان کا نقصان ہے بلکہ قوم اور ملک کے ارمان ان کے ساتھ دفن ہو جاتے ہیں۔ یہ خرابیاں اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ قبل از قبل امتحان نہ کیا جا کر کوئی باقاعدہ طریقۂ علاج اختیار نہیں کیا گیا۔ نہ صرف مریضوں کا بلکہ صحت مندوں کا طبی امتحان بھی ضروری ہے۔ اس ملک میں حفظ ما تقدم تدبیر کی اہمیت لوگوں کو اچھی طور سے معلوم نہیں ہے جب تک بچہ کسی مرض میں اتنا مبتلا نہ ہو جائے کہ اس سے اس کو خاص تکلیف پہنچنے لگے اس وقت تک خاص علاج کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

پس اس قدر اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے بعد یہ بتلانا ضروری ہے کہ تعلیم کے دوران میں لڑکوں میں دماغی اور جسمانی خرابیاں کس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور کیا احتیاطیں ضروری ہیں۔

بصارت۔ مثال کے طور پر جماعت کے اندر روشنی کی کمی اور نشستوں کی غلط ترتیب سے بصارت متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خود کرسی اور میز کے درمیانی فاصلے اور ان کی اونچائی کی غیر موزونیت کی وجہ سے (Postural defects) پیدا ہوتے ہیں۔ پس ان چیزوں سے قبل از قبل احتیاط ضروری ہے جن بچوں کی بصارت کمزور ہو ان کو ہمیشہ سامنے کی نشستوں پر جگہ دی جانی چاہیے۔

ورزش جسمانی۔ اس مسئلہ سے یہاں زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہر شخص اس کی اہمیت سے واقف ہے تعلیم کا مقصد محض عالم فاضل بنانا ہی نہیں بلکہ کامل نشوونما کی تکمیل ہے جو تندرست جسم اور عقل سلیم کا ممد و معاون ہے۔ یورپی ممالک میں ہر مدرسے میں ورزش جسمانی اور میدانی کھیل تعلیم کا ایک ضروری جزو ہیں اور ان کی حاضری لازمی ہے اور خود ان کھیلوں کو اس قدر دلچسپ بنایا جاتا ہے کہ طالب علم خود اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں پہلے تو ہر مدرسے کے لئے کھیل کے میدان مہیا نہیں ہیں اور کسی کے لئے ہیں تو ان میں سوائے چند مستثنیات کے باقاعدہ انتظام یا حاضری لازمی نہیں ہے۔ اس منزل پر چند

اقتصادی اور مالی مشکلات کا یا تو والدین کی طرف سے مذنشیں ہوتا ہے کہ بچے کے کھیل کے لباس اور دوسری ضروریات کا بار برداشت کر [illegible] تعلیمی بجٹ میں اتنی گنجائش نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ دولت مند شہری جن کے خود بچے انہی مدارس میں تعلیم پاتے ہیں کیوں حکومت کا ہاتھ نہیں بٹاتے کہ اس طریقہ ہمارے ملک میں بھی رائج ہونا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں پبلک مدرسے قائم کرنا چاہیے۔

دوسری طرف کمسن بچوں اور لڑکیوں کے مدارس ہیں جن پر خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ملک کے رسم و رواج کے مطابق لڑکیوں [illegible] کے مدارس علیحدہ ہیں۔ پردہ کے انتظام کے لحاظ سے ہر اصول کو کام میں لانا ضروری ہے۔ عورتوں میں تعلیم کا سخت فقدان ہے جس کی وجہ سے وہ جاہل رہتی ہیں اور ان کی گودیں جو بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا گہوارہ ہوتی ہیں اور اس حالت میں وہ بچوں کی صحت کی [illegible] دیکھ بھال کر سکتی ہیں ظاہر ہے۔ مذکورۂ بالا غفلت آئندہ نسلوں کی تباہی و بربادی کا باعث ہے۔

عبدالحفیظ حقانی

کلامِ رموزی

محلّے میں اب تو رہا جائے نا — پڑوسن کا طعنہ سنا جائے نا

میاں بیوی کی ہر لڑائی کا غوغا — سنا جائے نا اور سہا جائے نا

جو پیتے رہیں دن رات دا داغفورا — وہ حقّہ تو مجھ سے پیا جائے نا

جو دیتے رہیں ہوٹل میں اب بھس ملا کر — وہ بسکٹ تو مجھ سے چکھا جائے نا

جو افسانہ لکھ لیتی ہے آج لڑکی — وہ لڑکے سے بھی اب لکھا جائے نا

کچھ عُریاں نگاروں پہ بولیں چچی بی — کہ ہم سے رسالہ پڑھا جائے نا

پہن کر بہت اونچی ایڑی کی جوتی — مری بیوی سے تو چلا جائے نا

رموزی رہے عمر بھر اس سے دُوری
مگر ڈانس میں تو ملا جائے نا

[illegible]

[illegible]کان محبت

[illegible] کا سیلاب برگ و بار سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہا تھا، آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں چاند کا نقرئی بکھرا ہوئے ہوئے ابر
[illegible] رہا تھا اور بکھری ہوئی منور زمین کے آغوش میں سرائے کو آنے والی سڑک نور کی دیوی کے نقرئی آنچل کی طرح لہرا رہی تھی — اسی
[illegible] قزاق گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا، آخر کار قدیم سرائے کے صدر دروازے پر آ کر وہ رکا — اس نے ایک فرانسیسی ٹوپی پہن رکھی تھی، ایک
[illegible] اس کے گلے کا احاطہ کئے ہوئے تھا، ایک مخملی کوٹ اور ہلکی رنگ کا پتلون اس کے زیب بدن تھا، اس کا لباس شکنوں سے تمام و کمال
پاک تھا، [illegible] بوٹ اس کے مضبوط اور سڈول پنڈلیوں کو چوم رہے تھے — اس کا زنگین لباس چاند کی سیمین کرنوں میں ایسا
[illegible] تھا جیسے دو ستارے پیکر میں سیر جگمگا رہا ہو، اس کا پستول بھی چاند سے کسب نور کر کے جگمگ جگمگ کر رہا تھا، اس کی تیغ آبدار کا دستہ
بھی تاروں کے جھلملاتے آسمان کے نیچے جگمگا رہا تھا، اس کا گھوڑا سرائے کے منقش پتھروں کو روندتا ہوا تیزی سے سرائے کے صدر دروازہ
پر آ کر ٹھیر گیا! اس نے اپنے چابک کے دستہ سے سرائے کے بڑے دروازہ کو کئی بار کھٹکھٹایا، پھر اس نے ہولے ہولے سیٹی بجائی جو سرائے کے
سکوت کو توڑتی ہوئی فضاؤں میں تحلیل ہو گئی، سرائے کی ایک کھڑکی میں سرائے کے مالک کی لڑکی بس (Bess) کھڑی اس کے
انتظار کی کٹھن گھڑیاں گن گن کر کاٹ رہی تھی، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کتنی حسین تھیں جیسے حسن و شباب کی دو گہری جھیلیں —
وہ اس وقت اپنے سیاہ دراز گیسوؤں کو سنوار کر ان پر سنہری ربن باندھ رہی تھی! سرائے کی ظلمتوں میں دھیمی سی چرچراہٹ کے ساتھ
ایک خفیہ دروازہ کھلا، جہاں سرائے کے اصطبل کا ملازم ٹم (Tim) کھڑا چپکے چپکے اس حسن و شباب کے مجسمہ کی پوجا کر رہا تھا،
کسی کے صدر دروازے کو کھٹکھٹانے اور سیٹی بجانے کی آواز جب ٹم کے کانوں کو چیرتی ہوئی گزری تو حسد و آز سے اس کا چہرہ زرد
پڑ گیا — اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے عمق میں پاگل پن رقص کرنے لگا۔ اس کے دراز بال بھیگی ہوئی گھاس سے مشابہ معلوم ہو رہے
تھے، ٹم سرائے کے مالک کی لڑکی بس سے محبت کرتا تھا جس کے لب ارغوانی سے لعل و یاقوت نے کسب رنگ و نور کیا تھا —!
وہ مجسم سکوت بنا قزاق کے یہ الفاظ سن رہا تھا —

> "میری دل و جان سے عزیز محبوبہ مجھے اجازت دے کہ میں تیرے لب لعلین کا ایک بوسہ لوں، کیونکہ اے میری محبوبہ ارم
> آج رات میں ڈاکہ زنی کی ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہا ہوں اور اس سے بیشتر کہ غازۂ صبح ظلمت شب کو پاش پاش کر دے
> میں سونے کی ایک بڑی مقدار اپنے پہلو میں لئے تیرے پاس لوٹ آؤں گا۔ لیکن اگر پولیس یا شاہی فوج دن بھر میرا
> تعاقب کرتی رہے اور مجھے پریشان کرتی رہے تو شب کو میرا انتظار کرنا جب کہ چاند اپنے احمریں ساغر سے سیمیں کرنوں کی شراب
> دنیا کی وسعتوں پر انڈیل رہا ہو — میں ضرور چاند کی ضیا باریوں میں تجھ سے ملنے آؤں گا۔ خواہ مجھے کتنے ہی سخت ترین
> خطرات کا سامنا کرنا پڑے!"

وہ رکاب پر کھڑا ہو گیا لیکن اس کے لب صرف بس کے صبیح ہاتھوں کو چوم سکے، لیکن بس نے جس کا حسین چہرہ مسرت و انبساط سے چمک رہا تھا۔
اپنے سیاہ و دراز گیسوؤں کو کھڑکی سے نیچے چھوڑ دیا — جوں ہی یہ سیاہ عنبر بیز گیسوؤں کا آبشار لہراتا ہوا اس کے سینے سے آ ٹکرایا۔
...... اس نے گیسوؤں کی ان لہروں کو دیوانہ وار کئی بوسے دئے جن میں چاند کی سیمیں کرنیں ڈوب جانا چاہتی تھیں — اس کے

سیاہ گیسوؤں کی لہریں چاند کی سیمیں کرنوں میں نہا کر کتنی حسین ہو شربا معلوم ہو رہی تھیں' اپنی مہم پر جانے سے پیشتر اس نے الوداعی نظریں اپنی محبوبہ پر ڈالتے ہوئے گھوڑے کی باگ سنبھالی اور جلد ہی مغرب میں کہیں روپوش ہو گیا ـــــ تم نے چپکے سے جا کر پیشے "فاصب محبت" اور حسین لبس کی تمام وکمال گفتگو کی خبر حکومت کو کر دی ـــ

ـــــــــ (۳) ـــــــــ

وہ ظلمت شب کے پاش پاش ہونے پر بھی نہ آیا ـــ وہ اس وقت بھی نہ آیا جب شاہ غادر اپنی منزل کا آدھا راستہ طے کر چکا تھا لیکن جب سورج مغرب کی وادیوں میں کہیں اپنا منہ چھپانے دوڑا جا رہا تھا اور شام کے سائے دراز ہوتے جا رہے تھے' سرائے کو آنے والی سڑک منجو وکیج قطعات زمین کے درمیان شفق کی رنگارنگیوں کی عکاسی کر رہی تھی۔ اس وقت شاہ جارج کی فوج کا ایک دستہ قدیم سرائے کے صدر دروازہ پر آ کر رکا ـــــ اس دستہ کے سپاہیوں نے سرائے کے مالک کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہ اپنے آنے ہی کی کوئی وجہ بتائی' بلکہ انھوں نے زبردستی اس کی شراب پی ـــ اور سرائے کے مالک کی لڑکی لبس کو انھوں نے بستر پر کس کر باندھ دیا' اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا تاکہ وہ چیخ وپکار نہ کر سکے اور اس کو کھڑکی کے قریب کھڑا کر دیا گیا ـــــ دو سپاہی اس کے دونوں بازوؤں پر اپنی بندوقوں کو کھڑکی پر رکھے چھپ کر بیٹھ گئے' اور دیگر شاہی سپاہی سرائے کی دوسری کھڑکیوں میں اپنے شکار کی تاک میں چھپ کر بیٹھ گئے وہاں پر کھڑکی سے موت کھڑی جھانک رہی تھی اور وہ کھڑکی جہاں حسین لبس کو بے دست وپا کر کے کھڑا کر دیا گیا تھا' دوزخ سے دہانہ معلوم ہو رہی تھی' کیونکہ لبس کی آنکھوں کے آگے سرائے کو آنے والی سڑک دور تک نظر آ رہی تھی جس پر اب اس کا محبوب اس سے ملنے آنے والا تھا' اور وہ اس وقت کے تصور سے سہمی جا رہی تھی جب کہ اس کی نظروں کے آگے وہ خاک وخون میں لتھڑا پڑا ہوگا' اس خیال سے اس کے جسم کی نس نس سے شعلہائے محبت نکل رہے تھے جو اس کی روح کی جانب دیوانہ وار لپک رہے تھے' ان بے درد سپاہیوں نے لبس کی غیر فانی محبت کا بے جا مذاق اڑاتے ہوئے اس کے شعریت سے پُر بدن کو رسیوں سے باندھ کر کھڑا کر دیا' کہ اگر اس کا محبوب آئے تو اُسے یہ معلوم ہو کہ کھڑکی میں کھڑی وہ اس کا انتظار کر رہی ہے' سپاہیوں نے ایک بندوق بھی لبس کے جسم کے پیچھے باندھ رکھی تھی جس کی نالی اس کے مرمریں جسم کو چوم رہی تھی' جب وہ یہ سب کچھ ظلم کر چکے تو انھوں نے اس کی حالت زار کو دیکھ کر فلک شگاف قہقہے لگائے اور کہا "اب کر حفاظت اپنے محبوب کی" ـــــ لبس کی آنکھوں بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے' اُسے اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ بہت جلد شاہی سپاہیوں کی بندوقوں کا نشانہ بن کر اس کا محبوب اس کی نظروں کے آگے آخری سانسیں لے رہا ہوگا ـــ یکایک اس کے کانوں میں اس کے محبوب کے وہ الفاظ گونجے!

"ظلمت شب کے پاش پاش ہونے سے پیشتر میں تمہارے پاس آؤں گا تم میری راہ دیکھنا ـــ نہیں تو شب کو اس وقت میرا انتظار کرنا جب کہ چاند اپنے احمریں ساغر سے سیمیں کرنوں کی شراب دنیا کی وسعتوں پر انڈیل رہا ہو ـــــ میں ضرور چاند کی ضیا باریوں میں تجھ سے ملنے آؤں گا خواہ مجھے کتنے ہی سخت ترین خطرات کا سامنا کرنا پڑے"!

اس نے اپنے نگاریں ہاتھوں کو آزاد کرنے کی سعی کی لیکن سپاہیوں کے بے درد ہاتھوں نے انہیں مضبوط باندھ رکھا تھا' پھر بھی اس نے اپنے ہاتھوں کو آزاد کرنے کی مسلسل سعی کی' جسم کی تمام تر توانائی کو ہاتھوں میں سمیٹ لیا نتیجتہً اس کی مخروطی انگلیوں سے پسینہ اور خون بہنے لگا ـــ طائر وقت کی پرواز میں کوئی فرق نہ آیا لیکن حسین لبس کو اس وقت ایک ایک گھنٹہ ایک ایک سال کے مماثل معلوم ہو رہا تھا۔

۳

آخر کار بانو کا غم انگیز گیت فضاؤں میں گونجا، جیسے رفتارِ زمانہ نے کسی آنے والے بھیانک و غم انگیز واقعہ کی پیشین گوئی کر دی۔ انتہائی کشمکش کے بعد بس اپنی ایک انگلی آزاد کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کی انگلی بندوق کی لبلبی کو بہ آسانی دبا سکتی ہے، اس کے بعد وہ بالکل ساکت و صامت کھڑی ہو گئی۔ کیونکہ اب وہ اپنے ہاتھوں کو آزاد کرنے کا خطرہ مول لینا نہ چاہتی تھی مبادا کسی سپاہی کو اس کی حرکات و سکنات کی خبر ہو جائے! اس نے سرائے کو آنے والی سڑک پر ایک نظر دوڑائی جو چاند کی سیمیں کرنوں سے ہم آغوش تھی اور جس پر کسی راہرو کے قدموں کی چاپ سنائی نہ دے رہی تھی ——— اس کے رگوں میں دوڑنے والے خون کی دھڑکنیں جس میں اس کے محبوب کی محبت حلول کر گئی تھی یکایک جیسے رک گئی، کیونکہ وہ اس نے گھوڑے کے ٹاپوں کی مدھم سی آواز سنی، ٹپ .... ٹپ ..... ٹپ، اس کے دل میں اس وقت یہ خواہش کروٹ لینے لگی کہ کاش یہ تمام سپاہی بہرے ہو جائیں اور میرے محبوب کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نہ سن سکیں، اس کا محبوب ناہموار زمینوں سے گزر کر دور پہاڑ کی پیشانی پر نمودار ہوا اور اب وہ اس سڑک پر چلا آ رہا تھا جو سرائے کو آتی تھی، سپاہیوں نے اپنی بندوقوں کو ٹھیک کر لیا ——— اب ٹاپوں کی آواز صاف سنائی دینے لگی، ٹپ ٹپ ..... ٹپ ٹپ .. ٹپ ٹپ وہ سرائے سے ابھی کچھ ہی فاصلہ پر تھا، اس وقت بس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھیل گئیں جیسے کہ وہ اپنے محبوب کو ان میں سمیٹ لینا چاہتی ہیں، اس نے ایک گہرا سانس لیا، اس سانس کے زیر و بم میں اس کی المناک مایوسیاں اور تمنائیں ڈوب کر رہ گئیں، اس کی خون آلودہ نقرئی انگلی کو حرکت ہوئی ——— وہ لبلبی سے جا ٹکرائی، بندوق کی ہولناک آواز فضاؤں کو چیرتی ہوئی نکل گئی، وہ اپنے ساتھ بس کی روح کو بھی لیتی گئی ——— بس کے محبوب کو خطرہ کا علم ہو گیا، اس نے گھوڑے کی باگ موڑی اور تیزی سے مغربی کہساروں کے دامن میں کہیں روپوش ہو گیا ——— اسے کیا معلوم کہ اس کی بے جان محبوبہ نے جس کا سر اس کے بلوریں سینہ پر ڈھلک آیا تھا اور جس کے خون سے بندوق رنگین ہو گئی تھی ——— اس کو بچانے کی خاطر محبت کی راہوں میں اپنی جان دے دی اور یوں اس کو آنے والے بھیانک خطرہ سے آگاہ کیا، صبح صادق تک اسے اس سانحہ کی کوئی خبر نہ ملی، لیکن جب سورج کی اولین کرنیں گیتی کو چومنے لگیں تو اس نے لوگوں کی زبانی یہ الم انگیز خبر سنی کہ کس طرح سرائے کے مالک کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی لڑکی بس نے چاند کی سیمیں کرنوں تلے اس کا انتظار کیا، اور اس کو جان لیوا خطرہ سے بچانے کی خاطر اپنی جان محبت کے دیوتا کے قدموں کی بھینٹ چڑھا دی ——— فلک کج رفتار کی ستم ظریفی کو برا بھلا کہتے ہوئے اس نے پاگلوں کی طرح سرائے کی جانب اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑانا شروع کیا۔ گرد و غبار کے بادل اس کے ہم رکاب تھے، اس کے ہاتھ میں اس کی آبدار تلوار سورج کی تیز شعاعوں سے ٹکرا کر جگمگا رہی تھی، جوں جوں وہ سرائے سے قریب ہوتا جا رہا تھا موت سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا، گھوڑے کو اس نے اس طوفان خیز رفتار سے دوڑایا کہ سرائے کو پہنچتے پہنچتے مہمیز سے خون کی دھاریاں ٹپکنے لگیں، اس کا مخملی کوٹ پسینہ میں نہا کر سرخ ہو گیا تھا ——— بالآخر جب وہ ان شاہی سپاہیوں کے نشانہ کی زد میں آ گیا تو انہوں نے بندوق کے کئی فائر کئے، یکلخت وہ اپنے گھوڑے پر سے گر پڑا ——— ان وحشی سپاہیوں نے اسے کتے کی طرح مار ڈالا، سرائے کی سڑک پر وہ بے جان پڑا تھا ——— اس نے اپنا وعدہ وفا کیا ——— اس نے بس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ظلمت شب کے پاش پاش ہونے سے پہلے ...

ملنے آئے گا۔ یا نہیں تو چاند کی سیمین کرنوں تلے اس نے بس سے اپنا انتظار کرنے کو کہا تھا ——— اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ ضرور اس سے ملنے آئے گا خواہ اُسے کتنے ہی مہیب خطرات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے ——— وہ اب بس سے مل چکا تھا۔ بس اور اس کے محبوب کی روحیں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر شراب محبت کے پیالوں میں ڈوب چکیں تھیں!!

——— (۴) ———

" اگرچہ بس اور اس کے محبوب کو مرے ہوئے عرصہ دراز ہو گیا، لیکن اب بھی اس ماحول میں رہنے والوں کا بیان ہے کہ ہر سال سردی کے شبنمی موسم میں ایک رات کو جب کہ ہواؤں کا سیلاب برگ وبار سے ٹکرا کر شور پیدا کرتا ہے، آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں چاند کا نقرئی بجرہ ہلتے ہوئے ابرپاروں پر تیرتا رہتا ہے، دور تک پھیلی ہوئی بنجر زمین کے آغوش میں سرائے کو آنے والی سڑک نور کی دیوی کے نقرئی آنچل کی طرح لہراتی رہتی ہے، اسی سڑک پر وہ قزاق گھوڑے پر سوار چلا آتا ہے، اس کا گھوڑا سرائے کے منقش پتھروں کو روندتا ہوا سرائے کے صدر دروازہ کے پاس آکر رکتا ہے، وہ اپنے چابک کے دستہ سے سرائے کے بڑے دروازہ کو کئی بار کھٹکھٹاتا ہے، پھر ہولے ہولے سیٹی بجاتا ہے جو سرائے کے سکوت کو توڑتی ہوئی فضاؤں میں تحلیل ہو جاتی ہے ——— سرائے کی ایک کھڑکی میں سرائے کے مالک کی لڑکی بس کھڑی اس کے انتظار کی کٹھن گھڑیاں گن گن کر کاٹتی رہتی ہے، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کتنی حسین نظر آتی ہیں جیسے حسن و شباب کی دو گہری جھیلیں، اس وقت وہ اپنے سیاہ دراز گیسوؤں کو سنوار کر ان پر سنہری ربن باندھتی رہتی ہے۔"

(آزاد ترجمہ) انجم صہبائی

سر سالار جنگ اعظم

(دوسرا ایڈیشن)

یہ کتاب ادارہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ اس کے مولف مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ ہیں۔ جن کو سوانح نگاری کا خاص ملکہ ہے اور مفید معلومات کو بڑے دلچسپ اور سادہ پیرایہ میں قلمبند کر دیا ہے۔ یہ کتاب مدرسوں کے طلبہ اور عوام کے مطالعہ کے لئے بہت ضروری ہے چھوٹی تقطیع ۴۸ صفحات۔ قیمت ۶ر

ہندوستانی تمدن

از پروفیسر ڈاکٹر اینٹورا ٹوپاڈی فل ریڈر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ۔ یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندوستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کجا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ جو لوگ قدیم ہندوستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کو ضرور پڑھیں۔ صفحات (۴۴۰) قیمت سے؎

تنقید و تبصرہ

کاروان علم ۔ مرتبۂ بادشاہ حسین و فیض محمد صدیقی صاحبان ناشر ادارۂ اشاعت اردو۔

یہ ۱۰۴ صفحات کی ایک باتصویر کتاب ہے جس میں مشہور انگریزی کتاب بک آف نالیج کی طرح طلبہ اور عوام کے لئے عام فہم انداز میں مختلف موضوعوں کی ضروری معلومات درج کی گئی ہیں۔ مضامین کی ترتیب اور تصویروں کی تیاری اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ معلومات جدید اردو مطبوعات میں ایک خاص اہمیت کا مالک ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مرتب صاحبان نے ابتدا میں مندرجات کی کوئی فہرست نہیں دی۔ جس کی وجہ سے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ اس مجموعہ میں کن کن موضوعوں پر معلومات درج ہیں۔ سب سے پہلے مرتبین نے خوش سلیقگی کے ساتھ کتاب کی اہمیت اور اردو میں اس کی ضرورت سے متعلق ایک پُر از معلومات دیباچہ تحریر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو چھے جلدوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر جلد میں ایک ایک حصہ ہر عنوان کے لئے وقف ہے لیکن یہاں بھی عنوانوں کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ بہرحال یہ ایک قابلِ قدر کوشش ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ حسین اور فیض محمد صدیقی صاحبان کو ترتیب و تالیف کا ایک خاص ذوق ہے اور وہ علم و فضل کی ہمہ گیر شناسائی رکھتے ہیں۔ یہی اصحاب ادارۂ ادبیات اُردو کے اُردو انسائیکلوپیڈیا کے بھی معتمد ہیں اور توقع ہے کہ ان کی کوششوں کی وجہ سے اردو زبان میں اعلیٰ پائے کی حوالہ جاتی کتابوں کی جو کمی ہے وہ بہ آئین شائستہ پوری ہو جائے گی۔

جو اصحاب اپنے پڑھے لکھے بچوں کے لئے دلچسپ معلوماتی کتب کے متلاشی رہتے ہیں ان کے لئے یہ کاروان علم ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

جنگ کی کہانی ۔ از افضل عابدی صاحب۔ ناشر اشاعت گھر حیدرآباد۔

یہ ۴۲ صفحات کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں افضل عابدی صاحب نے بچوں کے لئے جنگ کے حالات نہایت سلیس اور شگفتہ اسلوب میں بیان کئے ہیں۔ یہ موضوع بہت مشکل تھا خاص کر عہدِ حاضر کی جنگوں کی پیچیدہ سیاست بڑوں کے لئے بھی اکثر ناقابل فہم ثابت ہوتی ہے لیکن افضل عابدی صاحب نے کہانی کے پیرائے میں بہت سی پیچیدگیوں کو اس طرح سے حل کر دیا ہے کہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے بھی ان کی اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش کی ایک تمہید ہے جس میں بچوں سے مخاطب ہو کر صاحبزادۂ موصوف نے کتاب کے موضوع کو خوبی سے واضح کیا ہے۔ اس کتاب کے اکثر حصے نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکے ہیں۔

آفتاب ۔ مرتبہ ملک حامد حسین صاحب صدر آفتاب مجلس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ کتاب علی گڑھ کے لائق طلبہ کے ان مضامین کا ایک ضخیم مجموعہ ہے جو بیسویں صدی کے اردو ادب پر لکھے گئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ میں اب بھی ایسے ادیب اور انشا پرداز پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی فکر و نظر اور جذبۂ عمل سے نوخیز نسلوں کی قیادت کر سکیں گے۔ اس مجموعے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ایک مبسوط مضمون ترقی پسند ادب کے عنوان سے شریک ہے جو بجائے خود ایک چھوٹی سی کتاب ہے چونکہ یہ موضوع کچھ عرصے سے اردو ادب میں معرکۃ الآرا بن گیا ہے اس لئے مناسب ہوگا اگر آفتاب مجلس کی جانب سے اس کو کتابی صورت میں علحدہ بھی شائع

کیا جائے ۔ اس مجموعہ کے مرتب ملک حامد حسین صاحب نے جو مقدمہ
لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اردو ادب
کا ذوق وسیع کرنے کے لئے مفید مصروفیتیں زیر بجاری ہیں اور وہاں
کے طلبہ دقت نظر کے ساتھ علمی و تنقیدی مضامین و مقالے قلمبند
کرتے رہتے ہیں ۔

آفتاب مجلس قابل مبارک باد ہے کہ اس نے بیسویں
صدی کے اردو ادب پر اتنے اچھے مضامین لکھوا کر شایع کئے جن کی
وجہ سے ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کی معلومات میں
کافی اضافہ ہوسکتا ہے ۔

ہوس ۔ از عزیز احمد صاحب ناشر مکتبۂ جدید لاہور ۔

عزیز احمد صاحب جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے لکچرار ہیں
لیکن اُردو کا بھی بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں ۔ چنانچہ ان کی
چند اردو نظموں کا ایک مجموعہ "ماہ لقا" اور دیگر نظمیں ادارۂ ادبیاتِ اردو
کی طرف سے گزشتہ سال شایع ہوچکی ہیں اور اس پر اس سے قبل
تبصرہ بھی ہوچکا ہے ۔ زیر نظر کتاب ایک ناول ہے جس میں مصنف
نے آرٹ کی آڑ میں عقل و جذبات ، محبت و ہوس اور مرد و عورت
کے تعلقات کی کشاکش کو بڑی خوش اسلوبی سے دکھایا ہے ۔ اردو
میں اچھے ناولوں کی کمی ہے اور یوں بھی جب سے افسانہ نگاری
مقبول ہوئی ہے ناول نگاری کی طرف سے ہمارے ادیب بے پروا
ہوگئے ہیں ۔ یہ ناول اپنی اعلیٰ خصوصیات کے لحاظ سے توقع ہے
کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور ہمارے ادب کی ایک معیوب کمی
اس قسم کے ناولوں سے بھی دور ہوسکے گی ۔

عربوں کی قومی تحریک ۔ از مسعود عالم ندوی حجم ۴۶ صفحے
قیمت ۸ر پتہ مکتبۂ اُردو ۔ لاہور ۔

زیر نظر کتاب میں تاریخ کی روشنی میں عربوں کا ادب ، ان کی
تعلیم ، تہذیب ، سیاست ، تنظیم ، ترکی کی سنہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے
عربوں پر اثرات ، گزشتہ جنگ عظیم کے زمانے میں ان کی بغاوت
موجودہ جنگ میں ان کے علاقوں کی حیثیت ، عراق میں ان کے
اتحاد کی تحریک کے نتائج غرض یہ کہ اس فاضلانہ مقالہ میں عربوں
کی سیاسی ، قومی اور علمی تحریک کی نسبت دلچسپ پیرائے میں
بحث کی گئی ہے ۔

سیاست جاپان ۔ از علی امام بلگرامی ایم اے ۔ حجم ۶۰ صفحے
قیمت ۱ر پتہ ادارۂ اشاعت اردو ۔ عابد روڈ ۔ حیدرآباد دکن ۔

جاپان کے تاریک دور کی اس مختصر تاریخ میں چین کے جاپان
پر اثرات ، شوگنوں اور ڈائمو کا دور حکومت ، شہنشاہیت کی تجدید
دارالامرا اور دارالعوام کی تنظیم ، سیاسی جماعتوں کا قیام ، سرمایہ داری
کا آغاز ، فسطائی تحریک ، نئے آئین کا نفاذ ، جنگ عظیم کے بعد کا
انقلاب ، جاپان کی سیاسی حیثیت ، فسطائیوں کی بغاوت ، جاپانی
فوج کی خصوصیت وغیرہ پر مصنف نے عام فہم زبان میں تبصرہ
کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ جاپان کے حالات اور اس کی فسطائیت
سے عوام کو روشناس کرایا جائے ۔ اس وقت ضرورت ہے کہ اس
کتاب کا عام طور پر مطالعہ کیا جائے ۔

تانیا ۔ از پی لیڈوف ۔ مترجمہ ساحر لدھیانوی حجم ۵۰ صفحے
قیمت ۸ر پتہ مکتبۂ اُردو لاہور ۔

یہ ایک بہادر روسی لڑکی کی سرگزشت ہے جس نے نہایت
دلیری سے تختہ دار پر چڑھنا پسند کیا مگر آخر وقت تک اپنے راز کو
افشا نہیں کیا ۔ یہ لڑکی موجودہ جنگ روس و جرمنی میں جرمنوں
کے اصطبل کو آگ لگانے کی کوشش کرتے وقت پکڑی جاتی ہے
اور اقسام کے مظالم برداشت کرکے تختہ دار پر چڑھ جاتی ہے ۔

معیشت زر ۔ از ابن الحسن بی اے حجم ۶۸ صفحے قیمت ۸ر
پتہ مکتبہ اردو ۔ لاہور ۔

اس مختصر کتاب میں روپیہ یا زر کی ارتقائی تاریخ بیان کی گئی ہے ۔

زندگی نسبت اس کی اہمیت اس کے فوائد اور نقصانات، اس کا استقلال، اس کا معیار، کاغذی زر وغیرہ کی نسبت دلچسپ پیرایہ میں بحث کی گئی ہے۔ دورِ حاضر میں اس کتاب کے مطالعہ کی سخت ضرورت ہے۔

شانتی ۔ از بشور ناتھ مدرس دہرم ونت اسکول۔ حجم ۴۰ صفحے قیمت ۳/۶ - پتہ بزمِ ادب۔ کوٹلہ عالی جاہ۔ حیدرآباد دکن۔

بچوں کے ماہوار رسالہ "بزمِ ادب" کا یہ خاص نمبر ہے۔ "شانتی" ایک سبق آموز اور نصیحت خیز کہانی ہے۔ مہارانی شانتی اپنے حسنِ عمل سے یہ ثابت کرتی ہے کہ عورت چاہے تو مرد کو راج راجیشور بنا سکتی ہے اور چاہے تو بھکاری اور سنیاسی! نوخیز لڑکیوں کو یہ کہانی ضرور پڑھنا چاہیئے۔

ایاز قدرِ خود بشناس ۔ از محمد شمس الدین صدیقی۔ وظیفہ یابِ منصف حجم ۶۴ صفحے غالباً مصنف سے یہ کتاب مفت مل سکتی ہے۔

محمود غزنوی کے "ایاز" سے اس کتاب کا آغاز ہوتا ہے اسی سلسلہ میں دکن کے قدیم امرا اور عہدہ داروں کے آدابِ شاہی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چند رشوت خوار عہدہ داروں کے عبرت انگیز حالات بھی اس میں درج ہیں اور آخر میں جناب مصنف کے رسالہ "اعانتِ اخلاق" پر چند تبصرے درج ہوئے ہیں۔

پنکھڑیاں ۔ از مسٹر رحیم چمن دہلوی۔ حجم ۱۶۸ صفحے۔ قیمت عالہ ملنے کا پتہ۔ نیا کتاب گھر اُردو بازار۔ جامع مسجد دہلی۔

یہ مصنف کے گیارہ منتشر افسانوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ سماج کی اصلاح کے لئے ان پنکھڑیوں میں نوکِ خار بھی پوشیدہ ہیں۔ یوں تو ہر افسانہ دلچسپ ہی ہے لیکن سب سے زیادہ "سائنس کے کھیل"، "عجیب کھیل ہیں"، "گناہ غربت" بھی برا نہیں۔ "ملعون" بھی سماج کی دکھتی رگ کیلئے نشتر سے کم نہیں۔ یہ کچھ زیادہ بلند پایہ افسانے تو نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن بین بین ضرور ہیں۔ تاہم ذرا کچھ اور بھی گہری نظر جاتی تو اچھا تھا۔

تاریخی رومان ۔ مرتبہ جناب عبدالرحیم شبلی۔ بی۔ کام۔ ایڈیٹر "عالمگیر" و "خیام" لاہور۔ مطبوعہ عالمگیر پریس سید مٹھا بازار۔ لاہور۔

مجموعہ ہے اُردو کے پندرہ نامور ادیبوں کے لکھے ہوئے رومان کا۔ قابل مولف نے اپنی اس تالیف کو "مرزا ادیب" کے نام نامی سے معنون کیا ہے۔ جن کا ایک سنسنی خیز افسانہ "فرعون کی محبوبہ" اس مجموعہ کی روحِ رواں ہے۔ افسانوں کا انتخاب بہت خوب ہے۔ یہ معاشقہ و رومان کی درد انگیز داستانیں کتنی غیر یقینی سی ہو جاتیں اگر تاریخی نہ ہوتیں! جب کہ "ہمدردی سرد مہری کا لفظ ہے۔ اس سنسار میں انتہائی مسرت اور خوشی کی ساعتیں بہت ہی محدود اور سریع الزوال ہوتی ہیں۔ رومان محض ایک اضطراری کیفیت کا نام ہے۔ فلکِ پیر کے ترکش میں زہریلے تیر چھپے ہوئے ہیں" —— تو یہ خواب اور افسانہ بنی ہوئی وارداتیں آخر پھر سے دہرائی کیوں جاتی ہیں؟

اس مجموعے کا ہر افسانہ ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ زبان، پلاٹ، محاکات نگاری، ادیبانہ شان غرض ہر لحاظ سے کتاب دلچسپ اور دلنشین ہے۔

علامہ اقبال ۔ از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ ایک ۱۰ ورقی ترانہ ہے جو علامہ اقبال کی شان میں ان کے فلسفہ و عرفان سے متاثر و محظوظ ہو کر خلیفہ صاحب نے لکھا ہے۔ اس کو پڑھنے سے اقبال کے صاحب موصوف کی عقیدت و خلوص کا پتہ چلتا ہے۔

قیمت ندارد۔ اتحاد پریس بل روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

ادارہ

نئی کتابیں

۱۔ دروازہ (ڈرامے) از کرشن چندر۔ قیمت عا؍۔ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔
۲۔ سمن پوش (افسانے) از مجنوں گورکھپوری قیمت عہ؍ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔
۳۔ شوہر کا روگ (ناول) از نسیم انہونوی۔ قیمت عہ؍ " " " " " "
۴۔ زنجیریں (افسانے) از محمد امین خضر قیوری قیمت عا؍ " " " " "
۵۔ طوفان حوادث (ناول) از سغبیر حسین قیمت ۱۰؍ " " " " "
۶۔ کنول (نظمیں) از برق موسوی۔ قیمت ۱۰؍ " " " " "
۷۔ زندگی کے موڑ پر (افسانے) از کرشن چندر۔ قیمت عا؍ " " " " "
۸۔ صد سلام (سو سلاموں کا مجموعہ) از نواب شہید یار جنگ بہادر شہید ۱۰۲ صفحے قیمت عا؍ مشیر عالم پریس حیدرآباد۔
۹۔ مشاہیر کے رومان (افسانے) از شبلی بی۔کام قیمت عا؍ ادارہ ادب جدید شاہراہ عثمانی۔ حیدرآباد
۱۰۔ شرارے (نظمیں) از خورشید احمد جامی ۱۰۰ صفحے۔ ادارہ اشاعت ادب سلطان پورہ۔ "
۱۱۔ تذکرہ حبیبی (سوانح) از حافظ شاہ علی حیدر ۳۵۰ صفحے۔ قیمت لے۔ کتب خانہ انواریہ۔ کاکوری۔ لکھنو۔
۱۲۔ مولانا عبید اللہ سندھی (سوانح) از پروفیسر محمد سرور ۴۰۰ صفحے قیمت للعہ۔ سندھ ساگر اکیڈمی۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور۔
۱۳۔ مسئلۂ غذا اور قیمتوں پر نگرانی۔ از ایم نرسنگ راؤ۔ قیمت عا۔ ماڈرن بک ڈپو۔ سلطان بازار۔ حیدرآباد۔
۱۴۔ جنگ اور اغذیہ۔ از ڈاکٹر انور اقبال قریشی۔ قیمت عہ؍۔ ادارۂ ادب جدید۔ شاہراہ عثمانی۔ "
۱۵۔ ریاض مختاریہ (نواب مختار الملک مرحوم کے حالات) از ولادت علی دانش ۴۰۲ صفحے۔ قیمت للعہ۔ سب رس کتاب گھر حیدرآباد۔
۱۶۔ جاپان کی صنعتی ترقی۔ از ناصر علی لکچرار شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ ۴۷ صفحے۔ قیمت عہ؍۔ از مصنف۔
۱۷۔ مضامین اقبال (مقالات اور تقریروں کا مجموعہ) ۲۱۶ صفحے قیمت عہ؍۔ احمد حسین جعفر علی تاجر کتب چار مینار۔ حیدرآباد
۱۸۔ سیاہ کاران اعظم۔ از منشی تیرتھ رام فیروزپوری قیمت عہ؍۔ دائرہ ادبیہ۔ رام گلی لاہور
۱۹۔ کاروان (ٹیگور کے افسانے) مترجمہ گیارہ ادیب۔ قیمت عہ؍۔ دائرہ ادبیہ لاہور
۲۰۔ عشق اور موت (افسانے) از منشی تیرتھ رام فیروزپوری۔ قیمت عہ؍ " "
۲۱۔ مداوا (نظمیں و مضامین) مرتبہ غلام احمد فرقت۔ ۲۵۴ صفحے۔ قیمت للعہ۔ یوسفی پریس۔ لکھنو۔
۲۲۔ لطیف النجوم۔ از حسین بخش منجم۔ قیمت ؁ از مولف۔ پتھر گٹی۔ حیدرآباد دکن۔
۲۳۔ معیشت زر۔ از ابن الحسن ۴۶ صفحے۔ قیمت ۸؍ مکتبۂ اردو۔ لاہور۔
۲۴۔ تانیا۔ مترجمہ ساحر لدھیانوی۔ قیمت ۸؍ " " " "

مرزا سیف علی خاں

ادارے کی خبریں

شعبۂ تاریخ دکن

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ تاریخ دکن کا ایک جلسہ ۹ فروردی ۱۳۵۲ ف مطابق ۱۴ فروری ۱۹۴۳ء بروز پنجشنبہ شام کے ساڑھے پانچ بجے دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

مولوی خواجہ محمد احمد صاحب ایم اے مددگار ناظم آثار قدیمہ

مولوی میر محمود علی صاحب ایم اے لکچرار تاریخ سٹی کالج

مولوی محمد غوث صاحب ایم اے۔

مولوی سید سراج الدین صاحب ایم اے لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی ریڈر تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

۱۔ مجلس معتمدین شعبہ جات کی یہ تجویز پیش اور منظور ہوئی کہ شعبۂ تاریخ دکن کی اس طرح توسیع کی جائے کہ مجموعی طور پر یہ شعبۂ تاریخ دکن سمجھا جائے اور تین ذیلی شعبوں میں اس کی تقسیم ہو۔

(۱) تاریخ دکن (۲) جغرافیہ (۳) عام تاریخ۔

مضمون کے اعتبار سے ہر کمیٹی کے مختلف ارکان مقرر کئے جائیں لیکن معتمد یا داعی ایک ہی ہو جو تمام کمیٹیوں کے انتظام اور انصرام کے فرائض انجام دے۔

۲۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور مولوی خواجہ محمد احمد صاحب کی تحریک و تائید سے یہ طے پایا کہ ہر ماہ کم از کم ایک مرتبہ تاریخ دکن کا ایک جلسۂ عام منعقد کیا جائے۔

اس جلسہ میں پہلے شعبۂ تاریخ کی روئداد سنائی جائے جو معتمد کے فرائض میں داخل ہے نیز حسب ذیل اصحاب سے مقالے پڑھنے کی درخواست کی جائے۔

نواب عنایت جنگ بہادر

نواب سر نظامت جنگ بہادر

مولوی غلام احمد خاں صاحب

مولوی خواجہ محمد احمد صاحب

مولوی مرزا نجف علی خاں صاحب

مولوی محمد غوث صاحب

مولوی علی اصغر صاحب بلگرامی

مولوی میر محمود علی صاحب

یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ سب اصحاب پہلے ہی جلسہ میں اپنے مقالے پڑھیں بلکہ حسب فرصت بعض اصحاب آئندہ جلسوں کے لئے اپنے مقالے تیار کر سکتے ہیں۔

یہ بھی طے ہوا کہ پہلا جلسہ مارچ میں کسی مناسب تاریخ میں منعقد کیا جائے۔

طے پایا کہ شعبۂ تاریخ دکن کے ارکان میں حسب ذیل اصحاب کا شریک کئے جائیں۔

نواب عنایت جنگ بہادر

مولوی غلام احمد خاں صاحب

مولوی مرزا محبت علی خاں صاحب۔

مولوی قاسم علی صاحب سجن لال

کتاب مل والے مولفہ مولوی سید مراد علی صاحب طالع جلسہ میں پیش ہوئی۔ اس کے متعلق طے ہوا کہ مولوی میر محمود علی صاحب اس کتاب کو پڑھ کر اس کی اشاعت کے متعلق رائے دیں۔

تاریخ سیاسیات مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی اور ہندستانی قومیت کا مسئلہ مولفہ ڈاکٹر ایشورا ٹوپا صاحب کے متعلق طے پایا کہ اول الذکر شائع کی جائے اور موخرالذکر پر مولوی خواجہ محمد احمد صاحب کی رائے حاصل کی جائے۔

مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نے تحریک کی کہ شعبہ کی طرف سے تاریخی سیاحت اور دوروں کا انتظام کیا جائے۔ اور اس سفر میں ارکان شعبہ کے علاوہ عام لوگ بھی شریک کئے جائیں تاکہ تاریخ کی دلچسپی عام ہو۔ یہ تحریک منظور ہوئی اور اس سال کے لئے حسب ذیل پیش نامہ طے ہوا۔

۱۔ پہلا دورہ مقابر قطب شاہی اور اس کے نواح۔
۲۔ دوسرا " قلعہ گولکنڈہ اور اس کے محلات۔
۳۔ تیسرا " چار مینار۔ مکہ مسجد۔ جامع مسجد اور اس کے نواح۔
۴۔ چوتھا " سرور نگر۔ سلطان نگر۔ منصور آباد۔ حیات نگر اور موسیو ریمو۔
۵۔ پانچواں دورہ قلعہ قدیم تا قلعہ گولکنڈہ۔ مسجد میاں مشک۔ حمام۔ اور دیگر آثار۔

اس اجلاس نے اس بات پر بھی غور کیا کہ مملکت آصفیہ کے آثار قدیمہ۔ مقابر۔ مینار اور قبور وغیرہ کی حفاظت سے متعلق اقدام ہونا چاہیے۔ بعض آثار فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ مثال کے طور پر فی الحال گلبرگہ میں اسمٰعیل مخ اور سیف الدین غوری کے قبور کی حفاظت اور حیدرآباد میں خیریت خاں، منصور خاں۔ اور بہادر دل خاں کی قبور کی نشان دہی اور حفاظت ہونی چاہیے اور صاحب کتبے ان سب پر لگنے ضروری ہیں۔ اس کے متعلق یہ طے ہوا کہ محکمۂ آثار قدیمہ کو توجہ دلائی جائے۔ اگر محکمۂ مذکور اس کے لئے آمادہ نہیں ہے تو محکمہ کی اجازت سے ادارے کا شعبۂ تاریخ اس کا انتظام کرے۔

اردو امتحانات کا جلسۂ عطائے اسناد و انعامات ۱۹۴۳ء

جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات ۱۹۴۳ء ٹاؤن ہال باغ عامہ میں بصدارت جنرل والاشان شہزادہ ڈاکٹر معظم جاہ بہادر بتاریخ ۲۴ مارچ ۱۹۴۳ء مطابق ۲۰ اردی بہشت ۱۳۵۲ف بروز جمعہ شام کے ۵½ بجے منعقد ہوگا۔ جس میں جلسہ کامیاب امیدواروں کو شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ اپنے دست مبارک سے اسناد و انعامات تقسیم فرمائیں گی۔

اردو امتحانات کے مرکزوں کے معتمدین سے توقع ہے کہ ان کے مرکز سے جو امیدواران ذکور اس جلسہ میں شریک ہوکر خود سند حاصل کرنا چاہتے ہوں ان کی فہرست بہ تفصیل امتحان وغیرہ ۱۲ مارچ مطابق ۸ اردی بہشت سے پہلے ارسال کی جائے گی۔ اگر کوئی امیدوار اس جلسہ کی شرکت کے لئے حاضر نہ ہوسکتا ہو تو معتمد صاحب خود تشریف لائیں یا کسی معتبر نمائندہ کو منتخب کرکے جلسہ میں شرکت کے لئے روانہ کریں تاکہ مرکز کی جملہ اسناد شہزادی صاحبہ موصوفہ کے دست مبارک سے جلسے ہی میں دی جائیں۔

اگر کسی مرکز سے جلسے میں کوئی بھی امیدوار شریک نہ ہو تو اسناد اور انعامات کی روانگی میں تعویق عمل میں آئے گی۔ کوشش کی جائے کہ ہر مرکز کے زیادہ سے زیادہ امیدوار شریک ہوکر سند حاصل کریں۔ ان کے نہ آنے کی صورت میں معتمد صاحب ضرور تشریف لائیں۔

معتمد صاحب یا مرکز کے کسی ایک نمائندہ کے قیام و طعام کا انتظام منجانب ادارہ کیا جائے گا۔

اس جلسے میں حسب ذیل تمغے عطا کئے جائیں گے۔

امتحان	تمغہ	نام معطی	نام حاصل کنندہ	نام مرکز
اردو فاضل	طلائی	آنریبل نواب سر عقیل جنگ بہادر	سید عباس علی جعفری (دوم)	(سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے) بلدہ
اردو عالم	نقرئی	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی	میر کاظم علی (تاریخ ادبیات میں اول)	ہمنا آباد
"	"	"	امۃ الرؤف (علم شاداری میں اول) (ریاضی کا علمی ممتاز)	بلدہ ۶۱ ش
"	"	آتما رام گپت صاحب	ستید نبی	پرلی میں اول
"	"	مولوی محمد عیسی خاں صاحب وکیل	حبیب احمد	ویجاپور میں اول
"	"	ادارہ ادبیات اردو	بی وی گوپال راؤ (اول)	بلدہ
اردو زباندانی	"	حاجی سلیمان احمد صاحب	سید غلام مرتضی	پرلی میں اول
"	"	جناب ضیاء سوئنگ فیکٹری	عبد الکریم	پرلی میں اول
"	"	ڈاکٹر سید راج محمد علی افسر غائب صدر شعبہ طلبہ پرلی	خورشید بیگم	پرلی میں اول
"	"	مولوی عنایت اللہ حسنی صاحب بی اے ڈپٹی ایڈیٹر	اقبال النساء بیگم	پرلی ۶ نشانات میں اول
"	"	محترمہ بیگم صاحبہ مولوی سید نصیر الدین صاحب نہری جاگیردار	معین الدین	ویجاپور میں اول
"	"	مولوی محمد سعد اللہ خاں صاحب وکیل ویجاپور	بی نصرت النساء حاجی بیگم	ویجاپور ۶ نشانات میں اول
اردو دانی	"	جناب مولوی احمد عبد الجبار صاحب بی سی ایس دوم تعلقدار مومن آباد	تانو بائی۔ کملا بائی۔ کسوم بائی۔	پرلی ۶ نشانات کی ہندو طالبات جنھوں نے علی الترتیب سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے۔
"	"	مسٹر دیوی داس راؤ صاحب مہتمم آبکاری و صدر شعبہ طلبہ پرلی	شیخ اسمعیل	پرلی میں اول
"	"	مولوی میر حسن علی صاحب وظیفہ یاب امین کروڑگیری و صدر شاخ ویجاپور	غلام دستگیر خاں	مرکز میں اول
"	"	محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ (محل مولوی سید رحمت اللہ صاحب ناظم رجسٹریشن) معتمد شعبہ نسواں و رکن مجلس ادارت سب رس	کریم النساء بیگم	(ممالک محروسہ میں اول) (چیتاپور)

اردو امتحانات کی تاریخیں

ادارے کے اردو امتحانات ۱۹۴۳ء (اردو فاضل۔ اردو عالم۔ اردو زباندانی۔ اردو دانی۔ خوش نویسی وغیرہ) ۱۲ ارتا ۱۴ ار شہریور ۱۳۵۲ف م ۱۸ ار تا ۲۰ ار جولائی ۱۹۴۳ء بلدہ اضلاع اور بیرون حیدر آباد میں مختلف مقامات پر ایک ساتھ لئے جائیں گے۔ وصولی درخواست و فیس کی آخری تاریخ ۱۰ ار تیر ۱۳۵۲ف مقرر کی گئی ہے۔ وہی مقام مرکز مقرر ہو سکے گا جہاں سے کم از کم پچیس امیدوار امتحانات میں شریک ہوں گے

مجلس انتظامی ادارۂ ادبیات اردو

اجلاس ادارۂ ادبیات اردو کی

مجلس انتظامی کا اجلاس یکشنبہ ۱۱ر فروری سنہ ۱۳۵۲ف مطابق ۲۱ر فروری سنہ ۱۹۴۳ء شام کو پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

نواب لیاقت جنگ بہادر معتمد فینانس و نائب صدر ادارہ ادبیات اردو۔

نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات و باب حکومت سرکار عالی و رکن ادارہ۔

مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کینٹب) پرنسپل نظام کالج و رکن ادارہ۔

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی پروفیسر جامعہ عثمانیہ و رکن ادارہ۔

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی مددگار ناظم محکمہ رجسٹریشن و اسٹامپ و رکن ادارہ۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور معتمد اعزازی ادارہ۔

نواب زین یار جنگ بہادر نے بذریعہ تحریر بوجہ سفر بمبئی اور مولوی سید محمد اعظم صاحب نے بوجہ کار سرکاری شرکت سے معذرت چاہی۔

۱۔ گزشتہ اجلاس کی روداد پڑھ کر سنائی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی۔

۲۔ نواب سر مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارہ کی خدمت میں اعزاز نائٹ ہڈ پر منجانب ادارہ حسب ذیل تحریک تہنیت پیش کرنے کی تجویز باتفاق آرا طے پائی۔

"ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی اپنے صدر عالی قدر عالی جناب نواب ڈاکٹر سر مہدی یار جنگ بہادر کی خدمت میں ادارہ کی طرف سے دلی مبارکباد پیش کرتی ہے کہ جناب کی اعلیٰ علمی و انتظامی و سیاسی خدمات کے اعتراف میں برطانوی حکومت نے جناب کو نائٹ ہڈ کا اعزاز عطا کیا جس کی وجہ سے ادارۂ ہذا کے اعزاز میں بھی جناب کے دیرینہ تعلق کی وجہ سے اضافہ ہوا۔

مجلس ہذا کو یقین ہے کہ اپنے اعلیٰ کردار اور خدمات کی بنا پر جناب اس سے زیادہ اعزازات و مناصب حاصل فرمائیں گے اور ادارے کو اپنے صدر کی ذات پر اس سے زیادہ فخر و ناز کا موقع ملے گا۔"

۳۔ مولوی سید علی اکبر صاحب رکن مجلس انتظامی کے عہدۂ پرنسپلی نظام کالج پر فائز ہونے پر جناب صدر صاحب مجلس کی تحریک و جملہ ارکان کی تائید سے حسب ذیل تحریک تہنیت منظور کی گئی۔

"ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا یہ اجلاس اپنے ایک رکن مولوی سید علی اکبر صاحب کے پرنسپل نظام کالج منتخب ہونے پر ادارے کی جانب سے دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ صاحب موصوف اسی کالج کے ایک قدیم طالب علم اور ملک کے مشہور اور تجربہ کار ماہر تعلیم ہیں۔ حکومت نے ان کی اعلیٰ خدمات کا اس طرح اعتراف کر کے دوسرے خدمت گزاران ملک کی بھی حوصلہ افزائی

فرمائی ہے۔
توقع ہے کہ جناب پرنسپل صاحبہ کی
سرپرستی میں ہم اسی طرح نیک نامی اور عزت
حاصل کریں گے جس طرح تحریک تعلیمات میں حاصل
فرمائی تھی۔

معتمد صاحب نے ۱۹۴۳ء کے لئے ادارہ کا موازنہ پیش
کیا جو بعض رد و بدل و ترمیم منظور ہوا۔

۴۔ شعبہ جات ادارہ میں تبدیلی سے متعلق مجلس معتمدین
شعبہ جات کی سفارشات شریک ایجنڈا تھیں لیکن ان کو آئندہ اجلاس
کے لئے ملتوی کیا گیا۔

۵۔ اماضی تلنگہ گولکنڈہ پر تاریخی نمائش گھر کی تعمیر کے کام کے
آغاز اور حصول رقم کے لئے نواب زین یار جنگ بہادر کے مشورہ
سے ایک فنڈ کھولنے کی منظوری دی گئی۔

۶۔ ۱۹۴۳ء کے لئے کسی رفیق ادارہ کا انتخاب عمل میں
نہیں آیا۔

۷۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب نے مجلس انتظامی کی شرکت
کے سلسلے میں جس معذرت اور استعفاء کا اپنے خط میں ذکر
کیا تھا اس کے متعلق طے پایا کہ کسی موقع مناسب پر غور کیا جائے گا۔

۸۔ ادارے کے جلسہ تقسیم اسناد و انعامات ۱۹۴۳ء
کے انعقاد کے لئے ۲۴ مارچ کی تاریخ مقرر کی گئی اور طے پایا کہ
شہزادۂ والاشان ڈاکٹر نواب معظم جاہ بہادر سے صدارت کی
اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ سے تقسیم اسناد کی استدعا
کی جائے۔

۹۔ ادارے کے شعبۂ تاریخ و امتحانات کی جانب سے
حسب ذیل کتابیں اشاعت کی سفارش کے ساتھ پیش ہوئیں۔

۱۔ تاریخ سیاسیات از عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔
۲۔ حیات پریم چند از مولوی اکبرالدین صاحب صدیقی ایم اے۔
۳۔ مال والوں کی تاریخ از مولوی مراد علی صاحب طالع معتمد کل۔
۴۔ ہندوستانی قومیت کا مسئلہ از ڈاکٹر اشیما لویا۔ پی ایچ۔ ڈی۔

اول الذکر تین کتابوں کی اشاعت کی منظوری دی گئی
اور آخری کتاب کی نسبت طے پایا کہ مولوی سید علی اکبر صاحب کی
رائے کے بعد شائع کی جائے۔

۱۰۔ ادارہ کی حسب ذیل نئی شاخوں کے قیام کی توثیق
عمل میں آئی۔

۱۔ نگر کرنول۔ ۲۔ کریم نگر۔ ۳۔ جلہ نظام الدین۔ ۴۔ الیت محل (برار)
۵۔ کھام گاؤں (برار)۔

۱۱۔ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو علیگڑھ
کی یہ تحریک معتمد ادارہ نے پیش کی کہ حیدرآباد میں ادارہ کی جانب
سے اساتذہ و ارباب اردو کا ایک ایسا اجتماع منعقد کیا جائے
جس میں قدیم و جدید دکن کی اردو خدمات کا جائزہ لیا جائے۔

اس سلسلہ میں مولوی آل احمد صاحب سرور ایم اے استاد اردو
علی گڑھ کا مراسلہ خاکہ و نظام العمل پڑھ کر سنایا گیا۔ کافی غور و خوض
کے بعد طے پایا کہ یہ اجتماع ادارے کی جانب سے ماہ ڈسمبر میں
کیا جائے اور اس سلسلہ میں ایک وفد صدر اعظم بہادر سے ملاقات
کرے تاکہ وہ اس اجتماع کی سرپرستی فرمائیں۔ اس کے انتظامات
کے لئے حسب ذیل اصحاب کی ایک کمیٹی منتخب کی گئی تاکہ صدر اعظم بہادر
کی سرپرستی حاصل کرنے کے بعد انتظامات کا آغاز کرے۔

۱۔ نواب لیاقت جنگ بہادر۔ ۲۔ نواب زین یار جنگ بہادر
۳۔ مولوی سید علی اکبر صاحب۔ ۴۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب
قادری زور۔

۱۲. شعبۂ تاریخ کی مجلس انتظامی نے نواب علی یاور جنگ بہادر کی صدارت میں اپنا سالانہ جلسہ منعقد کرنے کی جو تجویز کی تھی اس کے انعقاد کی منظوری دی گئی۔

دیوان زادہ | شاہ ظہور الدین حاتم دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الاساتذہ تھے۔ چنانچہ مرزا رفیع سودا اور عبدالحی تاباں جیسے متعدد شعرا انہی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے تقریباً سو سال کی عمر پائی اور دہلی میں اردو شاعری کے آغاز وارتقاء و اصلاح میں بڑا حصہ لیا۔ اپنے ستر سالہ عہد شاعری میں انھوں نے اردو زبان اور شعر و سخن کے کئی ارتقائی مدارج دیکھے اور ان کی تعمیر میں آخر وقت تک مصروف رہے۔ انھوں نے کئی دیوان مرتب کئے تھے لیکن آخر عمر میں ان سب دواوین کا انتخاب خود بنفس نفیس کیا تھا اور اس اپنی پوری عمر کی کمائی کا نچوڑ "دیوان زادہ" کی شکل میں چھوڑ گئے۔

دیوان زادہ کا اصل نسخہ جو خود شاہ حاتم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے اپنے قیام یورپ کے زمانہ میں نقل کر لیا تھا۔ اور یورپ سے واپسی کے بعد دہلی کے اس مشہور شاعر پر ان کا ۴۰ صفحات کا ایک طویل مضمون ہندستانی اکیڈیمی کے ترجمان "ہندستانی" میں شائع ہو چکا ہے۔ اور اس زمانے سے ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے دیوان زادہ کی طباعت کا کام بھی شروع ہو چکا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف کی گوناگوں مصروفیات کے باعث رکا رہا۔ اب یہ کتاب چھپ چکی ہے اور غالباً آئندہ ماہ میں شائع ہو جائے گی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ڈیڑھ سو صفحات کا ایک بسیط مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں شاہ حاتم کے حالات اور کلام اور ان کے زمانہ کی ادبی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

تاریخ سیاسیات | یہ کتاب دکن کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے استاد تاریخ و سیاسیات مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی کی تالیف ہے جو ادارے کی جانب سے زیر طبع ہے۔ توقع ہے کہ یہ بھی آئندہ ماہ تک شائع ہو جائے۔ صدیقی صاحب کی اور کتابیں "تاریخ گولکنڈہ" مقدمۂ تاریخ دکن اور اعظم الامرا ارسطو جاہ بھی اس سے قبل ادارے کی طرف سے شائع ہو کر تاریخ دکن کی معلومات میں مفید اضافے کا باعث بن چکی ہیں۔

یہ تاریخ سیاسیات بھی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ عہد حاضر تک سیاسیات نے کیا کیا مدارج طے کئے اور مختلف ممالک اور قوموں نے اس کے ارتقاء میں کیا کیا حصہ لیا۔ اس کا مطالعہ ہر تعلیم یافتہ کے افادہ کا باعث ہوگا۔

یورپ جنگ سے پہلے | پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی ایم اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا کی پُر از معلومات کتاب ہے جو کئی ماہ سے زیر طبع ہے۔ چند ہفتوں میں یہ بھی شائع ہو جائے گی۔ اس میں بعض نہایت مفید اور معلومات آفریں نقشے بھی شریک ہیں۔

پروفیسر ہارون خاں صاحب نہ صرف تاریخ بلکہ سیاسیات اور بین قومی قانون کے بڑے ماہر ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے جنگ سے قبل کے یورپ کے چشم دید حالات اور معاملات نہایت دلاویز پیرائے میں بیان کئے ہیں۔

آبگینۂ شعر

اردو شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والوں تک یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ دکن کی مشہور شاعر خاتون محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر کا پہلا مجموعۂ کلام مرتب ہو چکا ہے۔

محترمہ موصوفہ سے ادارے کے شعبۂ نسواں نے اوائل ۱۹۴۲ء میں خواہش کی تھی کہ وہ اپنے کلام کا مجموعہ مرتب فرمائیں۔ خوشی کی بات ہے کہ کئی بار کے تقاضے کے بعد اب محترمہ نے انتخاب و ترتیب کا کام مکمل کر لیا ہے۔ اب یہ مجموعہ اس قابل ہو گیا ہے کہ ادارے کی طرف سے شائع کیا جائے۔ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ عہد حاضر میں حیدرآباد کی واحد خاتون ہیں جن کا کلام ہندستان کے مختلف علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس آبگینۂ شعر کی اشاعت سے توقع ہے کہ جدید اردو شاعری میں ایک شائستہ اور حلاوت آمیز کلام کا اضافہ ہوگا۔

سب رس کا خاص نمبر

اپریل کا شمارہ خاص ہوگا جس کے لئے ان اصحاب کے مضامین حاصل کئے گئے ہیں جو ادبی بصیرت رکھتے ہیں۔ اس شمارے کا ایک حصہ اردو ادب سے متعلق ہے۔ اردو زبان اپنے پیچھے ایک ارتقائی پس منظر رکھتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی رجحانات ارتقائی منازل طے کر رہے ہیں۔ ایک ایسے موقع پر جب کہ اردو ادب 'آرٹ' کی حیثیت سے دو مختلف نقاط نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور نہ صرف ہمارے ادیبوں کے احساس اور شعور میں ایک ہمہ گیر تغیر پیدا ہو گیا ہے بلکہ ادب کے مختلف پہلوؤں پر تنقید بھی زیادہ شدت کے ساتھ ہو رہی ہے، سب رس کی یہ کوشش امید ہے کہ پسند کی جائے گی۔

اپریل کے شمارے کا ایک حصہ شاعر مشرق اقبال کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے اپریل میں اقبال نے وفات پائی تھی۔ اس طرح ہم ان کی پائندہ یاد اور ان کے ساتھ اپنی ذہنی وابستگی کی تجدید کریں گے۔ سب رس کے اس شمارے کو اس کے معاون مدیر صاحبزادہ بیکس نے مرتب کیا ہے۔

بمبئی میں اردو امتحانات

تعلیم بالغاں سے دلچسپی رکھنے والے اس خبر سے خوش ہوں گے کہ بمبئی کی مشہور انجمن اسلام نے ادارے کے اردو امتحانات کا کام پورے جوش اور انہماک سے شروع کر دیا ہے۔ بمبئی اور اس کے نواح کے اصحاب اس بارے میں معتمد صاحب انجمن اسلام سے معلومات حاصل فرما سکتے ہیں اور ان پڑھوں کو پڑھا لکھا بنانے کے کام میں ان کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۴۳ء میں

مرتبہ خواجہ حمید الدین بی اے مہتمم

ادارۂ ادبیات اردو۔ ادارے کی مختلف مجلسوں، شعبوں اور شاخوں کی خدمات اردو زبان و ادب کا مکمل تذکرہ ہے جو (۱۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سرگزشت کے مطالعہ سے ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیوں اور اس کی خدمات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ تذکرہ ادارے کی شاخوں اور جملہ ارکان کی خدمت میں تحفۃً پیش کیا جائے گا۔ عوام کے لئے اس کی قیمت بہت ہی قلیل یعنی (۸ر) رکھی گئی ہے۔

ادب زندگی کی تنقید ہے
شاعر
حضرت علی اختر
سید محمد اکبر وفا قانی بی اے ایل ایل بی
ظہیر الدین بابر ایم اے
جمیل احمد فاروقی بی ایس سی
نظر حیدر آبادی
رفعت لئیق
وغیرہ
بعض لکھنے والے
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم
پروفیسر عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی
ابو ظفر عبد الواحد ایم اے
میر حسن ایم اے
مخدوم محی الدین ایم اے
سید اشفاق حسین ایم اے
بلبیر پرشاد بھٹناگر ایم اے
محمد عمر مہاجر ایم اے
خواجہ حمید الدین بی اے
وغیرہ
کہانیاں
رشید قریشی ایم اے۔ افضل عابدی۔ محبوب حسین جگر
(بعض مضامین)
ادب کا مقصد
ترقی پسند ادب
اردو ادب کے جدید رجحانات
اردو ادب اور ہندو سماج
اردو افسانے
اردو ترجمے
اردو ڈراما
اردو اور ظرافت
اقبال
اقبال کی شاعری کے بنیادی خیالات
اقبال شاعر یا مفکر؟
اقبال اور سماج
اقبال کا فلسفۂ خودی
مرتبہ۔ صاحبزادہ میکش
قیمت ایک روپیہ
نوٹ:۔ یہ خاص نمبر سالانہ خریداروں کو بلا قیمت دیا جائے گا۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
چندہ بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
ایک پرچے کی قیمت (۸؍)

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی
خواجہ حمید الدین بی اے

جلد (۷) بابت اپریل ۱۹۴۴ء شمارہ (۴)

شعرستان

شاعرِ مشرق اقبال

خواجہ حمید الدین بی اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

(اس بات کا اظہار میرے لئے باعثِ مسرت ہے کہ یہ شمارہ سب رس کے سابق ایڈیٹر صاحبزادہ میکش نے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اپریل کا شمارہ ان کو مرتب کرنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ ان کی خواہش عملی جامہ پہن کر آپ کے پیش نظر ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ کاغذ کی گرانی اور قلت کی وجہ سے اس شمارہ کا ایک حصہ "آئینہ" شامل نہ ہو سکا۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں اس کو جگہ دی جا سکے گی۔)

شاہد

سب رس کا یہ شمارہ پیش کرتے ہوئے مرتب کی حیثیت سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس شمارے کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ ادب سے متعلق ہے۔ دوسرا علامہ اقبال سے اور تیسرا "آئینہ" ہے جس میں بعض عصری مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ اردو ادب اب ایک ایسی منزل پر ہے جہاں اس پر سے زندگی گریز گندہ نقاب اٹھ گئے ہیں۔ اب ہمارا ادب زندگی سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ اس شمارے میں آپ کو بعض ایسے مضامین ملیں گے جن کے ذریعے ہمارے ادب کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ دوسرا حصہ علامہ اقبال سے متعلق ہے۔ علامہ اقبال کا انتقال آج سے چھ سال پہلے اسی مہینے میں ہوا تھا۔ اور ان کے انتقال کے بعد سب سے پہلے "سب رس" ہی نے ایک خاص نمبر کے ذریعے سے ان کا خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ آج چھ سال بعد بھی "سب رس" اقبال کے ساتھ ایک مستحکم تر ذہنی وابستگی رکھتا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج سے چھ سال پہلے سب رس کا "اقبال نمبر" میں نے ہی مرتب کیا تھا۔ آج بھی یہ خوش قسمتی مجھے ہی حاصل ہوئی ہے۔

اگر آپ نے اس نمبر کو پسند کیا تو میں آپ کی اس پسندیدگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور محترمی ڈاکٹر زور اور ادارۂ ادبیات اردو کی عنایت سے جولائی میں ایک خاص شمارہ پھر پیش کروں گا جو تمام تر حیدرآباد سے متعلق ہوگا۔ جولائی میں ہم سالگرہ ہمایونی کی قومی عید منا چکے ہوں گے۔ اور یہ نمبر گویا اس انبساط آفریں تقریب کا ایک خوش گوار تحفہ ہوگا جسے ادارۂ ادبیات اردو آپ کی خدمت میں پیش کرے گا۔

آخر میں مجھے محترمی ڈاکٹر زور اور عزیزی شاہد کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے ایک بچھڑے ہوئے کو پھر ایک دفعہ آپ کے سامنے لا کھڑا کیا ـــــ وہ اصحاب جنھوں نے بعض غلط فہمیوں کی بنا پر یہ سمجھ لیا تھا کہ میں سب رس یا ادارۂ ادبیات اردو سے اس قدر دور ہو گیا ہوں کہ میرا لوٹنا ممکن نہیں، اب سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا انفرادی اختلاف جو کاروباری نوعیت کا ہو کسی عظیم تر مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ "سب رس" اور ادارۂ ادبیات اردو مجھے اب بھی اسی طرح عزیز ہے جس طرح کہ پہلے کبھی تھا۔

میکش

اُردو کی کہانی

(شمالی ہند کا دور)

شمالی ہند میں اُردو ادب و شعر کی ابتدا اور فارسی کے ترک کرنے کا سبب میرؔ نے شاعرانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

زوال گولکنڈہ کے بعد دکن کے جو اُردو شاعر شمال گئے ان کی تعداد میں (جیسے جیسے اُردو کے تذکرے دستیاب ہوتے جا رہے ہیں) اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایک مصحفی ہی کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کے چودہ پندرہ اُردو شاعر دہلی گئے تھے جہاں انہوں نے قدر و مقبولیت حاصل کی۔ تذکرۂ اعظم الدولہ سرورؔ سے بھی اس بارے میں اچھا مواد حاصل ہوتا ہے۔

مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں شمال کے تیس کے قریب ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جنہوں نے دکن کا سفر کیا تھا۔

یہ تو شاعروں کا ذکر تھا۔ اس زمانے میں دکن کی بہت سی اُردو کتابیں بھی شمال پہنچیں۔ چنانچہ شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں دکن کی معتدبہ اُردو قلمی کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔ "اسپرنگر" کا کیٹلاگ ان کے تذکروں سے معمور ہے۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ دکن کے اردو ادب نے شمال میں کس درجہ مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس کی شہادت اس طرح سے بھی ملتی ہے کہ یورپ کے مختلف کتب خانوں میں جو قدیم دکھنی مخطوطے محفوظ کر لئے گئے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے کاتب شمالی ہند کے باشندے تھے اور جنہوں نے محمد شاہ کے اوائل عہد میں دکن کی ان اردو کتابوں کو نقل کیا تھا۔

قدیم تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی مجلسوں میں دکن کے اُردو اشعار دلچسپی سے سنے جاتے تھے اور دکنی شاعروں کی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ ولیؔ نے تین دفعہ سے زیادہ دہلی کا سفر کیا اور پھر بھی جی نہیں بھرا۔

دہلی کے شاعر ولیؔ کی غزلوں کی تقلید میں غزلیں کہتے اور انہی کے شعروں سے اپنے مشاعروں کے لئے مصرع طرح کا انتخاب کرتے تھے۔ اگرچہ اب تک شمال کے اس زمانہ کے اردو شاعروں کے کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوئے ہیں تاہم دیوان زادہؔ حاتمؔ سے اس کے ثبوت ملتے ہیں۔ دیوان زادہ اس عہد کی تنہا محفوظ یادگار ہے۔ اس کا نفیس اصلی نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے۔ اور اس کو نقل اور مرتب کر کے ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔

دیوان زادہ کے دیباچہ میں حاتمؔ نے ولیؔ کی استادی کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں انہی کی طرز میں لکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی غزلوں میں ولیؔ کی استادی کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے اس انتخاب کلام میں بھی تیرہ غزلیں ایسی ہیں جن پر انہوں نے صراحت کر دی ہے کہ یہ ولیؔ کی زمین اور تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ بعض شعروں میں وہ ولیؔ سے مخاطب بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ولیؔ کی موجودگی ہی میں لکھے گئے ہیں۔

"تذکرۂ قاسم" میں ولیؔ کی تعریف کرنے کے بعد اس زمانہ کے ایک شاعر کا مصرعہ اپنے خیالات کی شہادت کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ "پیر خاں کمترین کہ خدا لیش بیامرزد بسیار بہ موقع و بجا گفتہ کہ —

ولیؔ پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں"

اس زمانہ کی ایک اور تصنیف "تذکرۂ بے جگر" میں جس کا خود مصنف کا لکھا ہوا مخطوطہ انڈیا آفس میں موجود ہے، ولیؔ کی نسبت لکھا ہے۔

"در حقیقت کسے کہ اسپ در میدان ہندی دوانید آں بود فی الواقع شخصے کہ آب رفتہ باز در جوئے این زبان ہندی رسانید، ہمان بود۔ چون در سنہ اثنا جلوس محمد شاہی دیوان او بہ دہلی رسید موزوں طبعان بلند فکر و عالی

کاشاعران ہم عصرش مثل حاتم و آبرو و فغاں وغیرہ بہ

تتبع زبانش پیرو ہم زبان شدند"

یک اور تذکرۂ طبقات سخن میں آبرو کے ذکر میں لکھا ہے

" چوں دیوان ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی بہ عصر

محمد شاہ بہ دہلی رسید تتبع آن شدند"

مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی میں حاتم کا قول نقل کیا ہے جس سے دہلی میں اُردو ادب کے آغاز پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

" روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دوم فردوس آرام گاہ

دیوان ولی در شاہجہاں آباد آمدہ واشعارش بر زبان خرد

و بزرگ جاری گشتہ۔ با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون

آبرو باشد بنائے شعر ہندی را با ایہام گوئی نہادہ داد معنی

یابی و تلاش مضامین تازہ می دادیم"

ولی کے علاوہ دکن کے جن اُردو شاعروں کے کلام نے دہلی میں شہرت حاصل کی ان میں فقیر اللہ آزاد اور فراقی بھی شامل ہیں۔ میر حسن اپنے تذکرہ کے آغاز میں یہ لکھنے کے بعد کہ "باید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکنی است" فقیر اللہ آزاد کا حال لکھتے ہیں اور پھر اس کی شاعری کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

" ہمراہ فراقی دکنی در شاہجہاں آباد آمدہ بود طبع موزونے

داشت و بسیار بہ صفا حرف می زند خدا لیش بیامرزد"

غرض ان اسباب اور حالات کے نتیجہ کے طور پر شمالی ہند اور خاص کر دہلی میں اردو ادب کا آغاز ہوا۔ اور فارسی کا اثر کم ہونے لگا۔ چونکہ دکن کے اردو کلام کے اثر سے ابتدا ہوئی تھی اس لئے اول اول دکنی طرز کی پیروی کی گئی۔ اس کے خلاف لکھنے والے کی شاعری غلط سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اس آغازی دور کے ایک مشہور شاعر شاہ مبارک آبرو نے اس کے متعلق جو نصیحت کی تھی اس کو حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں نقل کیا ہے ؎

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے

ان سے کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے

جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف

لغو ہیں گے فعل اس کے ریختہ میں حرف ہے

لیکن شعرائے دہلی کا یہ اسلوب عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا۔ دکنی طرز کی پیروی ان کے لئے غیر فطری تھی اس میں بھی اظہار خیال کے لئے انہیں تکلف اور تصنع سے کام لینا پڑتا تھا۔ اب انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنے روزمرہ میں فارسی اجزا کی آمیزش کر کے شعر کہیں۔ اگرچہ پہلے پہل بعض شعرا نے اس کی مخالفت بھی کی مگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی اور بہت جلد اردوئے معلیٰ کی زبان میں شعر و شاعری ہونے لگی۔ اس رجحان کا آغاز مرزا مظہر جان جاناں نے کیا اور اس کی ترقی عہد ناسخ تک جاری رہی۔ حاتم نے اس تبدیلی کا ذکر اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں کیا ہے اور چونکہ وہ دہلی میں اردو شاعری کے آغازی اور اصلاحی دونوں رجحانوں کی ترویج و ارتقاء کے وقت زندہ تھے اس لئے ان کا بیان اس بارے میں زیادہ دلچسپ اور مستند ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

" دریں ولا ایں تربیت طلب از دہ دوازدہ سال

اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و فارسی

کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روزمرۂ

دہلی کہ میرزایان ہند و فصیح گویان رند در

محاورہ دارند منظور داشتہ سوائے آں زبان

ہر دیار تا بہ ہندوی کہ آں را بھاکا گویند

موقوف نمودہ فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص

پسند بودہ اختیار کردہ"

پھر قدیم و جدید لفظوں کی فہرست لکھنے کے بعد کہتے ہیں "دیوان زادہ میں قدیم یعنی دکنی طرز کے اشعار میں نے نہیں درج کئے ہیں۔ اگر کوئی مل جائیں تو مجھے معاف کیجئے" لیکن اب تذکروں سے حاتم کی قدیم طرز کی نظمیں بھی دستیاب ہوگئی ہیں۔ حمد و نعت پیران کی ایک نظم تذکرۂ گلشن گفتار میں منقول ہے۔ اس کے چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ دہلی کی ابتدائی اردو شاعری کس رنگ کی تھی اور اس کے ساتھ ہی دیوان زادہ کی ایک نظم کے چند شعر بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ جو ثابت کریں گے کہ لسانی تبدیلی کے رجحان نے دہلی کے ابتدائی ادب کے اسلوب کو کس قدر بدل دیا حاتم کی ابتدائی شاعری کا نمونہ یہ ہے:-

الہٰی داغ سیں دل کوں جلادے
برہ کی آگ مجھ تن میں لگادے

جلا جیوں پھلجھڑی اس ناتواں کوں
شرر لبریز کر ہر استخواں کوں

فنا کر عشق میں یہ جان بے تاب
کہ جیوں آتش میں گھٹ جاتا ہے سیماب

کہ ہوش آپ سیں یکبار جاؤں
پیمبر کی صفت کرنے کو دھاؤں

رکھے ہیں جس کے دروازے پہ منتہا
سعادت جان دربانی کا عاصا

مسیحا ناک گھس تج آستان پر
دماغ اپنا چڑھایا آسمان پر

اگر سدرہ ستے ہر پیر جبریل
کیا علم حقیقت خوب تحصیل

نبیؐ کی آل پر سے وار جانا
اسی بارہ پلے میں پار جانا

دلی کی یہ وہ طرز شاعری تھی جو حاتم کے آخری زمانہ میں متروک ہوگئی تھی اور جس طرز کے کلام کا انتخاب انھوں نے دیوان زادہ میں نہیں کیا۔ یہاں ہم دیوان زادہ کی ایک نظم سے چند شعر پیش کرتے ہیں :-

کیا بیاں کیجئے نیرنگئ اوضاع جہاں
کہ بیک چشم زدن ہوگیا عالم ویراں

جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو ابنگے پاؤں
پھرتے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں

نعمتیں جن کو میسر تھیں ہمیشہ ہر وقت
روز پھرتے ہیں پیا قوت کو اپنے حیراں

جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اس لسانی تبدیلی کو ابتدا میں بعض حضرات نے پسند نہیں کیا۔ تذکرۂ مخزن نکات میں قائم نے اس کے متعلق اپنے خیالات اس طرح ظاہر کئے ہیں۔

"بر شناسائے سلوک سخن مخفی و محتجب نیست کہ
از عہد عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانۂ بہادر شاہ
اول کسانے کہ شعر ریختہ گفتہ اند نسق کلام
ایں ہا بسیار مربوط و معقول است۔ ہر چند
اکثر الفاظ غیر مانوس گوش مامردم مستعمل ایشاں
است لیکن چونکہ موافق زبان دکن راست و
درست است پیش ہمہ کس راہ بدو دارد"

قائم کے اس بیان کے سلسلے میں ان کا یہ اُردو شعر غالباً دلچسپی سے سنا جائے گا کہ:-

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

شمالی ہند کے شعرا کے طبقۂ سوم یعنی میرؔ، سوداؔ اور سوزؔ وغیرہ کے ذکر سے پہلے قائم لکھتے ہیں۔

"مخفی و محتجب نماند کہ آنچہ الحال اشعار و احوال
شعرائے متاخرین نوشتہ می آید۔ طرز کلام ایشاں
مانند بروبہ شعر فارسی است۔ چنانچہ جمیع صنائع
شعری قرار دادہ اساتذۂ اسلاف است بکار
می برند و اکثرے از ترکیبات فرس کہ موافق
محاورۂ اردوئے معلیٰ مانوس گوش می نمایند
جواز البیان می دانند۔ الا ترجمۂ زبان مغل
بریختہ کردن مقبوح است۔ چہ دریں
صورت صحت زبان یکے از ہر دو نمی ماند"

مگر قائم اور ان کے ہم خیالوں کے اعتراض کے باوجود شمالی ہند کا اردو ادب فارسی سے متاثر ہوتا گیا۔ یہ رجحان اس لئے

بھی کامیاب ہوگیا کہ اس کے علمبردار مظہر جانِ جاناں، میر درد
سودا اور درد و سوز جیسے بلند مرتبہ شاعر تھے۔

شمالی ہند کا اُردو دور تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے
پہلا حصہ اس ابتدائی عہد پر مشتمل ہے جس میں حاتم، مظہر،
مضمون، آبرو اور تاجی وغیرہ نے فارسی چھوڑ کر اُردو میں
لکھنا شروع کیا۔ ان میں سوائے حاتم، مظہر اور آبرو کے دوسروں
کو زیادہ شہرت نصیب نہ ہوئی اور اس عہد کے شاعروں کے
کلام کے مجموعے بھی بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔

شمالی ہند کے اردو ادب کا دوسرا دور اُن اکابر
پر مشتمل ہے جنہوں نے اُردو شعر و سخن کو معراجِ کمال پر
پہنچا دیا اور آخر کار دلی کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے اور وہاں
اردو کی فضا پھیلائی۔ ان شعرا میں میر تقی میر، مرزا رفیع سودا
اشرف علی خاں فغاں، محمد میر سوز، قیام الدین قائم اور میر درد
خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ ان سبھوں نے مختلف اصنافِ سخن
میں کلام لکھا اور اردو کو بہت وسیع اور مقبول بنا دیا۔

شمالی ہند میں اُردو کا تیسرا دور میر حسن، مصحفی، انشا،
حسرت، جرأت، رنگین اور ناسخ جیسے اساتذۂ سخن پر
مشتمل ہے ان میں سے اکثروں نے میر اور سودا کی قائم کی ہوئی
روایتوں میں اپنی اپنی بساط کے مطابق وسعت دی اور بعضوں
نے ایسا کلام بھی لکھا جو ادب کے سبک اور ظریفانہ پہلو کو اجاگر
کرنے کا باعث ہوا۔ ان میں انشا، رنگین، اور جرأت کا نام
سب سے نمایاں ہے۔

یہ ایک مختصر کہانی تھی شمالی ہند کے اردو ادب کی۔ اس
موضوع پر بڑی بڑی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اس لئے کہ اس
دور کے شعرا میں متعدد ایسے گزرے ہیں جن میں سے ہر ایک
مستقل اور جداگانہ کتاب کا موضوع بن سکتا ہے۔

سید محی الدین قادری زور

میر محمد مومن :۔ عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزارہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلی بچھا دی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرۂ میر محمد مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالاتِ زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے دلچسپ اور مقبولِ عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عہ

اُردو کی کہانی

(اورنگ آبادی دَور)

سرزمین اورنگ آباد تقریباً ڈیڑھ دو صدی تک علم و ادب کا گہوارہ رہ چکی ہے ۔ اس مردم خیز خطے نے ایسے بلند پایہ شاعر پیدا کئے جن کی شہرت دکن سے باہر سارے ہندوستان میں پھیل گئی ۔ جب دکن پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا تو اورنگ زیب کو دکن کا صوبہ دار بناکر بھیجا گیا اور اس نے اورنگ آباد ہی کو اپنا مرکز حکومت قرار دیا ۔ شاہجہاں کی وفات کے بعد جب اورنگ زیب عالمگیر نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو دہلی کی بجائے اورنگ آباد سلطنت مغلیہ کا دارالحکومت قرار پایا ۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اورنگ آباد کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی اور سارے ہندوستان کی نظریں اس طرف اٹھنے لگیں ۔ ہندوستان کے امراء، علما، شعرا اور مشائخین جن کو سلطنت مغلیہ سے تعلق تھا اورنگ آباد چلے آئے اور یہیں مستقل بود و باش اختیار کی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ آباد علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا ۔ علم و ادب کی محفلیں گرم ہونے لگیں ۔ فارسی اور اردو کے شعرا کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور گھر گھر شعر و سخن کے چرچے ہونے لگے ۔ چنانچہ اس خاک پاک سے بڑے بڑے نامور شعرا پیدا ہوئے اور انھوں نے وہ لازوال شہرت حاصل کی کہ آسمان شاعری پر آفتاب بن کر چمکے ۔ یہی زمانہ دراصل اورنگ آباد کے شباب کا زمانہ تھا ۔

اس دور میں اورنگ آباد نے اردو علم و ادب کے نشو و نما میں جو حصہ لیا ہے وہ تاریخ ادب اردو کا ایک درخشاں باب ہے ۔ بابائے ریختہ ولی اورنگ آبادی اور استاد تغزل حضرت شاہ سراج اورنگ آبادی اس دور کی پیداوار ہیں ۔ ان کے علاوہ کئی ایسے شاعر ہیں جو اردو شاعری میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے لیکن حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ اورنگ آباد کے عالموں اور شاعروں کا اب تک کوئی مبسوط تذکرہ نہیں لکھا گیا ۔ البتہ شعرائے اردو کے تذکروں میں ان کے چیدہ چیدہ حالات ملتے ہیں ۔ اب تک تاریخ ادب اردو کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن کسی میں بھی اس دور کے متعلق کافی معلومات یکجا نہیں کی گئیں ۔ آج سے کوئی پندرہ سولہ سال قبل حیدرآباد کے ایک خاموش اردو خدمت گزار مولوی سردار علی صاحب نے اس کمی کو محسوس کرکے "تذکرۂ شعرائے اورنگ آباد" کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں اورنگ آباد کے قدیم اور مشہور شاعروں کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام درج ہے ۔ یہ تذکرہ اگرچہ مختصر ہے لیکن کافی محنت اور تحقیق کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی جواں ہمت اس کام کو اپنے ذمے لے اور اورنگ آباد نے اردو زبان اور شعر و سخن کی جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں ان سب کو یکجا کرکے ایک مبسوط تذکرہ ترتیب دے ۔ یہ کام بہت اہم ہے اور تاریخ ادب اُردو میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا ۔

اب ہم یہاں اورنگ آباد کے چند شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کرتے ہیں ۔

ولی | ولی اُردو شاعری کے دور متوسط کا سب سے بڑا شاعر ہے ۔ تاریخ ادب اُردو میں ولی کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہی وہ پہلا شاعر ہے جس نے شمالی ہند میں اُردو شاعری کو روشناس کرایا اور اپنے کلام کے اثر سے وہاں کے شاعروں کو فارسی کی طرف سے ہٹا کر ریختہ گوئی کی طرف مائل کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم اور بابائے ریختہ کہا جاتا ہے ۔ شاہ مبارک آبرو نے جو اپنے زمانے میں ریختہ کے مسلم الثبوت شاعر تھے ولی کی کرامت کا اس طرح اعتراف کیا ہے ۔

آبرو شعر ہے ترا اعجاز پر ولی کا سخن کرامت ہے

ولی کی شاعری کی عظمت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج تک اُردو شاعروں کے جتنے بھی تذکرے لکھے گئے ان سب میں ولی کا ذکر صفِ اولین میں کیا گیا ہے ۔ اور جملہ تذکرہ نگاروں نے ولی کی بے انتہا تعریفیں کی ہیں اور قدرت اللہ خاں قاسم نے تو مجموعۂ نغز میں میر خاں کمترین کا

بقیہ مضمون صفحہ ۳۸ ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

ادب کا مقصد اور ترقی پسند ادب

ادب آرٹ کی وہ قسم ہے جس میں ادبی صناع زبان کے ذریعے سے انسانی خواہشات، جذبات، تاثرات اور تجربات کو کیفیتی رنگ میں پیش کرتا ہے۔ آرٹ زندگی کے ان عناصر کے تصور کی از سر نو تخلیق کو کہتے ہیں جن سے انسان کو سابقہ پڑتا ہے اور جن سے اسے دلچسپی ہے۔ کسی ادیب کی تحریروں کا خارجی حقیقتوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ ادب کسی ایک شخص کی ذاتی خواہش کے عکس کا نام نہیں ہے۔

آرٹ بھی سائنس کی طرح ایک سماجی پیداوار ہے، ذہن انسانی کا ایک فعل ہے۔ سائنس میں ہم تجربہ کرنے میں غیر ہمواریوں کو فراہم کرتے ہیں واقعات کو کانٹتے چھانٹتے ہیں پھر انہیں ترتیب دیتے ہیں۔ انسانی حالات کے اندرونی تضادات کو دور کرتے ہیں گویا سائنس بکھری ہوئی معلومات کو ایک جا جمع کرکے باقاعدہ طور پر نظریہ کی شکل دیتی ہے۔ مگر سماجی انسان صرف سوچنے والا جانور ہی نہیں ہے بلکہ وہ محسوس بھی کرتا ہے وہ ہنستا ہے، روتا ہے، افسردہ ہوتا ہے، مسرور ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، تکلیفیں اٹھاتا، غصہ کرتا، مایوس ہوتا اور بعض وقت جان پر سے اٹھ جاتا ہے۔ انسان کے خیالات لاکھ پیچیدہ نازک اور لطیف سہی مگر اس کے نفسی تجربات کا سرکسی نہ کسی طرح آرٹ سے مل جاتا ہے۔ آرٹ انہیں غیر مربوط منتشر تاثرات کو مرتب کرتا اور انہیں حسین پیکر بخشتا ہے۔ آرٹ انسانی تاثرات کو عام یا سماجی بناتا ہے۔ یا جیسا کہ ٹالسٹائے نے کہا آرٹ جذبات کو متعدی بنانے کا نام ہے۔ مثلاً کوئی گانے والا راگنی گا رہا ہو تو سننے والوں میں بھی غم حلول کر جاتا ہے۔ ایک گانے کا ذاتی جذبہ آرٹ کی وساطت سے کئی لوگوں میں منتقل ہوتا اور انہیں متاثر کرتا ہے دوسرے لفظوں میں ایک فرد کی نفسی حالت عام دنیا کی نفسی حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سائنس کی طرح آرٹ بھی چند خاص مادی حالات میں پیدا ہوتا ہے۔ ان خاص مادی حالات سے مراد انسان کی وہ اولین اور بنیادی ضرورتیں ہیں جن سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رہتا ہے جیسے کھانا، کپڑا، رہنا سہنا، فرصت اور فراغت وغیرہ۔ جب انسانوں کی یہ بنیادی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں تو ان میں آرٹ پیدا ہونے کے سازگار حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ شاعر، مصور، رقاص، مغنی جنم لیتے ہیں۔ جب جڑوں کو پانی ملتا ہے تو کونپلیں بھی پھوٹتی ہیں اور پھول بھی کھلتے ہیں۔ آرٹ فرصت اور فراغت کا بچہ ہے یوں کہئے کہ آرٹ کی پیدائش سے پہلے چند معاشی اور مادی ضرورتوں کا پیدا ہو جانا ضروری ہے ورنہ سعدی کا وہ شعر مجھے بھی یاد ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاران فراموش کردند عشق

پھر جہاں روٹی ہی کا نہیں کپڑے کا، علم کا، عقل و فراست کا اور فرصت و فراغت کا قحط ہو وہاں آرٹ تلاش کرنا بنجر زمین سے فصل کی امید رکھنا ہے۔ سماجی زندگی اگر بنجر ہو تو وہاں آرٹ نہیں اگ سکتا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ محنت کش طبقے جو زندگی کی بنیادی اور اولین ضرورتوں کی تکمیل سے محروم ہیں جن کی زندگی ایک ایسے لق و دق صحرا کی سی ہے جس میں شادابی اور شگفتگی کا نام و نشان تک نہیں تو وہاں آرٹ کا بھی پتہ نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ ہمیشہ خوش حال اور تونگروں کا ہی حق اور میراث اور اس طبقے کے جذبات اور خواہشات کا آئینہ دار، عام مخلوق سے بے تعلق اور انسانیت کے حقیقی خیالات اور جذبات سے بیگانہ رہا۔

حیات انسانی کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خوش حال طبقے بھی ہمیشہ بدلتے رہے۔ انسان بعض بنیادی ضرورتوں کے تعلق کی بنا پر اپنی زندگی میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کرتا نئے سماجی تعلقات اور نئے ماحول پیدا کرتا رہتا ہے۔ ان تبدیلیوں کا اثر

اس کے دل و دماغ پر، اس کی قوت فکر اور قوت عمل، اس کے ذہنی رجحانات اور جمالیاتی ذوق پر بھی پڑتا ہے اور ادب اور اس کے موضوعات اور میلانات، انداز بیان اور لغت بھی جو بہرحال انسان ہی کے ذہن کی تخلیق ہوتے ہیں بدلنے لگتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اختر پیا کے دربار سے اندر سبھا ہی نکلی مسدس حالی کیوں نہیں نکلی یا اکبر جیسا طنز نگار بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں کیوں نہ پیدا ہوا۔ زمانہ جامد نہیں ہے وہ بدلتا رہتا ہے اور آرٹ، سماج کے پودے کی ایک ڈالی ہے۔ آج ہمارے ملک میں بھی تغیرات ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ زندگی میں جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں ان کے ساتھ ادب کی نئی قدریں قائم کی جا رہی ہیں۔ ادب کا مفہوم بدل رہا ہے۔ اس کے فرائض اور حقوق کی از سر نو جانچ ہو رہی ہے اور اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ادب کو سوسائٹی اور اس کے کلچر میں وہی جگہ دی جائے جس کا وہ مستحق ہے۔ جب آرٹ یا ادب پر گفتگو ہوتی ہے تو بعض لوگ اس ربط اور تعلق کو بھول جاتے ہیں جو آرٹ اور سماج میں ہے۔ سماجی تقاضوں کو نظر انداز کر کے جو ادیب اپنی ایسی ذاتی خواہشوں کا نغمۂ بے ہنگام الاپتے ہیں جو سماجی خواہشوں سے ہم آہنگ نہیں ہے تو وہ نہیں جانتے کہ کتنے بڑے سماجی جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

بعض ادیب اپنے طبقاتی تعصب کی بنا پر دانستہ یا نادانستہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ ادیب آزاد ہے وہ جو چاہے لکھ سکتا ہے جیسا چاہے لکھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے۔ وہ انسانوں سے بلند و بالا ہے وہ آدمی نہیں دیوتا ہے سماجی ذمہ داریوں اور فرائض کا بار اس کے مقدس اور نازک کندھوں پر ڈالنا ادب کی ہتک کرنا اور ادیب کی انفرادی آزادی کا خون کرنا ہے۔ ایسے لوگ نہ جانے کیا ہوتے ہیں جو زندگی سے بے تعلق ہو کر خود ساختہ چار دیواری میں بیٹھے خود ہی ہنس لیتے ہیں رو لیتے ہیں اچھلتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا کو ان پر انگلی اٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو شاعر ہیں ادیب ہیں جو چاہے کر سکتے ہیں۔ ان بزرگوں کی نظر میں آرٹ اور زندگی ایک بے مقصد چٹان ہے جس میں نہ نمو ہے اور نہ بالیدگی۔ کاش تاریخ اور انسانی تجربہ ان کے اس ادعا کی تائید کر سکتا ہے۔

کبھی انسان نے طلسماتی حکایتوں، دیو، پریوں کے افسانوں اور ایسے فرضی قصوں سے اپنے جذبۂ حیرت کی تسکین کی جن کا وقوع اس دنیائے آب و گل میں ناممکن ہے۔ کبھی اس نے رزمیہ اور بزمیہ واقعات سے تو کبھی گل و بلبل کے پردے میں حسن و عشق کے تذکروں سے بھوک اور جنسی میلانات کی تشنگی کی پستی اور ادبار کے زمانے میں اس نے جان صاحب اور جعفر زٹلی کے کلام سے بھی حظ حاصل کیا۔ مفید ہو یا مضر ہر دور میں کسی نہ کسی مقصد ہی کے تحت ادب پیدا ہوتا گیا۔ مقاصد کا معین کرنے والا انسان ہوتا ہے اور انسان اپنی سماجی ضرورتوں کے دباؤ سے مقاصد کا تعین کرتا ہے آج کل ہمارا ادبی ذوق بڑی تیزی سے بدلتا جا رہا ہے۔ ادب محض دل بہلاوے کی چیز نہیں رہا دل بہلاوے کے علاوہ اس کا کچھ اور مقصد بھی ہے وہ اب محض حسن و عشق کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ان کا محاکمہ کرتا اور ان کو حل کرتا ہے بہتر بننے کی خواہش ہر انسان میں موجود ہوتی ہے ہم میں جو کمزوریاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح چمٹی ہوئی ہیں جیسے تندرستی ایک فطرتی امر ہے اور بیماری غیر فطری۔ اس طرح ذہنی اور سماجی صحت بھی فطری بات ہے۔ ہم ذہنی اور اخلاقی پستی سے اس طرح مطمئن نہیں ہو سکتے جیسے کوئی مریض اپنے مرض سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اخلاقیات اور ادبیات کا مشن جدا جدا نہیں۔ ہاں طرز بیان جدا ہے۔ اخلاقیات نے استدلال کا راستہ اختیار کیا ہے تو [illegible] انسانیت بیماریوں کو ختم کر کے صحت یاب ہونے کے لئے بے چین ہے۔ اب یہ ادیب کا کام ہے کہ وہ انسانیت

کا علمبردار ہو حسن کا پرچم اور حسن کا چارہ ساز بنے۔ ادب اور انسانیت جب باہم ایک دوسرے کے رفیق ہوجائیں گے تو رہنمایان خلق کو مستقبل کی جھلک دکھائی دے گی اور وہ سمجھیں گے کہ بیداری کا ظہور ہو گیا ہے اور زمانہ کس نغمہ کو سننے کے لئے بے چین ہے۔ اسی وقت ہمیں عوام کے جذبات کا علم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانۂ محض ہی رہیں گے۔ ٹیگور سا شاعر عزلت پسندی جس کی طبیعت ثانیہ بنی ہوئی تھی دیکھئے اب کیا کہتا ہے

"ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انہیں پہچاننا چاہئے۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ زمانۂ دراز تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں میں نے جو بہت بڑی غلطی کی ہے اب میں اسے سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ یہ نصیحت کر رہا ہوں۔"

منشی پریم چند مرحوم ایک مقام پر فرماتے ہیں "آسمان پر چھائی ہوئی شفق بے شک نہایت خوش نما نظارہ ہے لیکن اساڑھ کے مہینے میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لئے خوشی کا باعث نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔" آرٹسٹ اپنے آرٹ سے حسن کی تخلیق کرکے اسباب اور حالات کو بالیدگی کے لئے سازگار بناتا ہے۔

وہ یوں بھی کہتے ہیں کہ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں ہے بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔

ادیبوں کے دماغ اور ادب کا نظریہ صرف اس ملک میں نہیں بدلا ہے بلکہ ساری دنیا کے ادیب انسانیت کی بقا اور حسن سچائی اور انصاف کی فرمانروائی کے لئے مورچہ بنائے جھوٹ اور اندھیرے سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

چین کی ایک مشہور مصنفہ تنگ کنگ کے خیالات بھی ادب کے بارے میں سن لیجئے جس سے معلوم ہوگا کہ آج زمانہ ادیبوں اور ادب پر کتنی بڑی ذمہ داریاں عاید کر رہا ہے۔ کسی نے تنگ کنگ سے پوچھا کہ چینی ادب کے نئے رجحانات کیا ہیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ میں ادبی رجحانات کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ میں چھ مہینے سے محاذ جنگ پر ہوں لیکن ادیب کے فرض اور ادب کے مقصد کے متعلق اپنی رائے قائم کر چکی ہوں اس کا آج صرف ایک کام ہے۔ ملک کی مدد کرنا اور اس کی حفاظت ہمیں ادب کے نظریات میں اپنا وقت خراب نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں صرف عوام کو بیدار کرنے کے لئے لکھنا چاہئے۔

ہماری زبان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو شروع ہوئے کچھ زیادہ دن نہیں گزرے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک نے توقع سے زیادہ اہمیت حاصل کرلی ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی محفلوں میں ادبی کانفرنسوں، مشاعروں، رسالوں اور اخباروں میں کوئی دن نہیں جاتا کہ اس پر گفتگو نہ ہوتی ہو۔ پچھلے پانچ، سات برس میں لکھی ہوئی نظموں، کہانیوں اور تنقیدوں کو کوئی پڑھے تو وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہماری زبان اور ادب میں ایک نیا رنگ داخل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب ہمیں ادب میں زندگی کے ایسے موقعے ملتے ہیں جو اس سے پہلے اس زاویے اور اس اسلوب سے پیش ہی نہیں کئے گئے تھے۔

اب تک اگر مصنفین کی محض ذاتی خواہشیں اور ان کے خود ساختہ عقیدوں کی مسخ شدہ شکلیں ادب میں دکھائی دیتی تھیں تو اب ادب میں ہمیں جمہور کے احساسات ان کی تمناؤں کی جھلک ان کے مصائب اور ان کے ارادوں کی دھمک سے ایک حیات نو کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گل و بلبل، ہجر و وصال، رقیب اور محبوب کے مضامین کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان، تونگری اور مفلسی، غلامی اور آزادی کا بار بار ذکر آتا ہے۔ کچھ ایسے ادیب اب بھی باقی ہیں جو اپنی ذات ہی کو زندگی سمجھتے ہیں اور

سماج کی ترقی کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا اور ذاتی اغراض پر جمہوری اغراض کی بھینٹ چڑھاتا ہی مین آرٹ اور خالص ادب تصور کرتے ہیں۔ ایسے ادیبوں کی مثال ان مکڑیوں کی سی ہے جو اپنے ہی پیٹ کے لعاب سے اپنے اطراف ایک جال بناتی ہیں اور لعاب ختم ہونے پر اس خود پسندی کے جال میں پھنس کر بے بسی کے عالم میں جان دیتی ہیں۔ حالانکہ ادب ایک ایسا شہد خالص ہے جس میں زندگی کے چمن کے ہر پھول کا رس موجود ہو اور یہی ترقی پسند ادب ہے۔ اغراض و مقاصد کے دائروں کی تنگی اور وسعت کے تصادم نے ہماری زبان اور ادب کو دلچسپ تحریکوں سے روشناس کرایا ہے۔ ادب ایک ایسے دوراہے سے گزر رہا ہے جہاں ماضی اور مستقبل کی تاریخی قوتیں برسر پیکار ہیں۔ ایک طرف خود پرستی، خود نمائی اور خود غرضی مستقبل کی طرف پیٹھ کئے ترقی کا راستہ روکنے کی بے سود کوشش کر رہی ہیں تو دوسری طرف زندگی تاریخ کی بے پناہ ارتقائی قوتوں کے ساتھ رکاوٹوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ ایک طرف ماضی ہے تو دوسری طرف مستقبل آپ جانتے ہیں کہ فتح ہمیشہ مستقبل کی رہی ہے۔

رجعت اور ترقی کی جنگ کوئی نئی جنگ نہیں ہے۔ سماج کا ارتقاء انہیں انسداد کی باہمی آویزش کا رہین منت رہا ہے۔ انسانوں کے ابتدائی شعور سے لے کر آج تک ان کے خیالات ان کی خواہشات، ان کے احساسات ان کے جمالیاتی ذوق اور ان کے وجدان میں جو بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اسی جدوجہد کی نشانیاں ہیں جو انسانوں نے اپنے ماحول پر فتح پانے کے لئے کی ہیں۔ قدیم اور جدید کے پیہم تصادم سے پیدا ہونے والے شعلۂ حیات کو اپنے سینے میں دبائے ہوئے زندگی کا جلوس ابد کے راستوں پر ازل سے رواں دواں ہے اس ہر آن بدلتی رہنے والی دنیا میں ثبات و قرار اور کسی شئے مطلق کی تلاش کرنا اندھیرے کمرے میں ایک ایسی کالی بلی کی تلاش کرنا ہے جو وہاں موجود نہیں ہے۔ اس لئے وہی ادب ترقی پسند ادب کہلایا جاسکتا ہے جو تاریخی ارتقائی قوتوں کا ہم نوا، سماجی ترقی کا دلدادہ ہوتے ہوئے فنی محاسن سے آراستہ ہو۔

ہماری سماجی زندگی کئی شعبوں میں بٹی ہوئی ہے مگر ادب کا جس شعبے سے تعلق ہے وہ تہذیب یا کلچر ہے جب ہم ادب کے ذریعہ سماج کی مدد کرنا کہتے ہیں تو اس سے مراد تہذیب یا کلچر کی ترقی میں مدد ہوتی ہے۔

خود تہذیب یا کلچر آسمان سے ٹپکی ہوئی چیز نہیں ہے بلکہ وہ ہمیشہ انسانوں ہی کے بنائے ہوئے سماجی نظام کا نچوڑ یا حاصل ہوا کرتا ہے۔ کسی شخص کے خیالات اور احساسات اس کی طرز زندگی کے ہمیشہ تابع ہوا کرتے ہیں اور طرز زندگی وسائل معاش کی تابع ہوتی ہے۔ ایسے ہی مجموعی حیثیت سے کسی سماج کے ان احساسات اور خیالات کا اظہار جو اس کے ادب، مذہب، فلسفہ میں ہوا کرتا ہے اس طریقے پر منحصر ہے جو سماج نے اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لئے ضروری اشیاء کی پیدائش تقسیم اور ان کے مبادلے کے لئے جاری کی ہے۔ یہ بات اس زمانے میں تو بہت آسانی سے ہماری سمجھ میں آجاتی ہے مگر قدیم قبائلی زندگی اور زرعی تہذیبوں کے عہد میں اس حقیقت پر توہمات کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ صنعتی سرمایہ داری کے تحت پیدائش دولت کے تعلقات کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں نے ادب اور آرٹ کے مسئلے کو بھی بے حد پیچیدہ اور گراں بنا دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ادب بہ حیثیت مجموعی سارے سماج کا ورثہ ہوتا، ایک مخصوص طبقہ کا استحقاق بن کر رہ گیا ہے جو فراغت نصیب اور صاحب اقتدار ہے جب سے ادب نے سماج سے ناتا توڑ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی ہے اس نے اپنا وہ اصلی مقام چھوڑ دیا جہاں پہنچ کر

ادب [illegible] ہو جاتا ہے جب ہم خوش حال طبقے کے ادب کو پس ماندہ غریب عوام کی ضروریات، احساسات اور خیالات کے [illegible] دیکھتے ہیں تو ہمارے ادب کا بیشتر حصہ ایک بے وقت کی راگنی اور ایک بے جوڑ پیوند معلوم ہونے لگتا ہے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک سوسائٹی خود کو تہذیب یافتہ بھی کہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑی تعداد کو تہذیب سے محروم بھی رکھتی ہے۔ دولت کی [illegible] میں افلاس کا یہ بھیانک نظارہ کراہیت ناک ہے۔ اسی تضاد کا نتیجہ ترقی پسند ادب کی تحریک ہے جو یورپ، امریکہ کے اور ملکوں کی طرح ہندوستانی ادب میں بھی جاری ہے۔ یورپ کے ترقی پسند ادیب نے ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کی داغ بیل ڈالی جس کا مقصد فاشزم کی بڑھتی ہوئی سامراجی قوتوں کا روکنا اور انسانوں کے حقوق کی حفاظت کرنا تھا۔ مگر چونکہ سماجی حق تلفیاں اور بے انصافیاں اس عالمگیر سرمایہ دارعہد میں کسی خاص ملک اور قوم کا عارضہ نہیں رہیں، اس لئے ترقی پسندی کا ادبی جہاد دنیا کے ہر ترقی یافتہ زمانے میں شروع ہوا۔ چنانچہ اب دنیا کے سارے ترقی پسند ادیب دشمن ترقی اور دشمن عوام خبیث قوتوں کے مقابلہ میں صف آرا اور سینہ سپر ہیں۔ انگلستان کے ممتاز ترقی پسند ادیب رالف فاکس اور کرسٹا فر کاڈول نے ہسپانوی عوام کی آزادی کے لئے فرانکو کی فوج سے لڑتے ہوئے سرزمین ہسپانیہ میں اپنی جانیں دیں۔ خود ہسپانیہ کے ترقی پسند شاعر میلگاڈو اور لورکا کے خون کو دنیا کے عوام نہیں بھول سکتے ہیں۔

ترقی پسند ادب اپنا تاریخی فرض ادا کر رہا ہے۔ اس جہانِ گزراں میں کوئی ادب بھی جاودانی ہونے کی توقع نہیں کرسکتا۔ آج کا ادب بھی کل پرانا اور فرسودہ ہو جائے گا۔ مگر مستقبل کا نقاد اقبالؔ، جوشؔ، ٹیگورؔ، نذرالسلام اور منشی پریم چند کو پڑھ کر بیسویں صدی کے ہندوستان اس کے تمدن اس کی بے چینیوں اور رجحانات کا پتہ لگائے گا اور دیکھے گا کہ ان شاعروں اور ادیبوں نے انسانی مفاد کو پیش نظر رکھنے میں کہاں تک اپنے فرائض انجام دئے ہیں۔

ہمارے ادب کی پیدائش اور ترقی کا زمانہ صوفیوں اور فقیروں کے عروج اور جاگیرداری نظام کے زوال کا زمانہ تھا۔ اس لئے اس کے اندر وہ سب باتیں آگئیں جن میں زندگی سے مقابلہ اور کسی نصب العین کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی جدوجہد کی روح مفقود ہوتی ہے۔ آج البتہ اردو ادب بڑی بڑی تبدیلیوں سے ہم آغوش ہے شبلیؔ، حالیؔ، سرسیدؔ، آزادؔ، نذیر احمد سب نے پرانے ادب کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا تھا اور اس کے خالص جمالیاتی اور ادب برائے ادب کے نظریے کے مہمل اور بے معنی ہونے پر بڑی دلیری اور جوش سے اظہار خیال کیا تھا۔ مگر اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے اور بڑی تیزی سے بدلتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے نوجوان ترقی پسند ادیب بھی ان حالات سے غیر متاثر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ سارے مصنفین زندگی کے جدلیاتی فلسفے سے واقف ہیں اور اس مستقبل سے بھی بے خبر نہیں ہیں جو سماج کے موروثی تضاد سے جنم لینے والا ہے۔ میں نے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان نے پچھلے بیس برس میں بڑے تغیرات اور انقلابات دیکھے ہیں۔ آزادی کے لئے عمومی تحریکوں نے ادب کو بھی کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے اس کا اندازہ آج کل کے ترقی پسند ادب سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ نئے ادب میں ہماری سماج کے صدیوں کے وہ ناسور بے نقاب نظر آئیں گے، جنھیں ہمارے اجداد نے کچھ تو بے علمی سے اور شرم و حیا کے مارے چھپائے رکھا تھا۔ اب تو یہی نہیں ہے کہ مرض کی تشخیص بھی ہو چکی ہے بلکہ اس کا نسخہ بھی تجویز کر دیا گیا ہے۔ وہ بچہ جو ایک زمانے سے زندگی کے بطن میں گردش کر رہا تھا تاریخی دائیہ جنگ کے ہاتھوں معرض وجود میں آنے کے لئے بے چین ہے جو لوگ

اب بھی ماضی ہی کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتے ہیں وہ ماضی ہی کے ساتھ ختم بھی ہو جائیں گے۔ انسانیت کی بقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ دنیا نئے سماجی طریقوں کے ساتھ اپنی تجدید کردے ورنہ اس کا ختم ہو جانا یقینی ہے۔ اس لئے تمام مصنفین کا یہ فرض ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ ماضی کے نظامِ زندگی سامراج فاشزم یا اسی طرح کے پرانے عطائی نسخوں کی تائید کریں، وہ بیمار اور مصیبت زدہ نوعِ انسانی کے لئے معقول اور صحت بخش طریقوں کے اختیار کرنے میں مدد کریں۔ کیونکہ انسان کی تخلیقی قوتوں کا اظہار کرنے والے ہمیشہ مصنفین ہی رہا کئے ہیں۔ ایک نئی دنیا بنانے کے لئے پرانی دنیا کا ختم ہو جانا ضروری ہے۔ اس سے پہلے کہ فرسودہ سماج کی گرتی ہوئی دیوار گر کر ہمیں بھی دبوچ لے اور کام تمام کردے، یہ اچھا ہے کہ اس گرتی ہوئی دیوار کو پہلے ہی منہدم کردیا جائے اور اسی وقت ادب برائے ادب کا فلسفہ بھی منہدم ہو جائے گا اور ادب کسی مخصوص فراغت نصیب طبقے کی جاگیر نہیں رہے گا بلکہ نوعِ انسانی کا ورثہ بن جائے گا۔ ادب پھر ایک بار دنیا کے ادبِ عالیہ کی طرح انسان کی اپنے ماحول پر فتح پانے کے لئے جد وجہد کا مظہر بن جائے گا۔

خوش قسمتی سے ہمارا ترقی پسند ادب بھی اس تعمیری خدمت کے انجام دینے میں معروف ہے۔

مخدوم محی الدین

ہمارا ادب

(ایک طائرانہ نظر)

ادب زندگی کی طرح ایک متحرک حقیقت ہے اور اس میں حیاتِ انسانی کی طرح محسوس کرنے اور اثر قبول کرنے کی قوتیں ہیں۔ اس لئے ماحول کی تبدیلی اور زندگی کی حقیقی ضرورتوں اور عصری تقاضوں کے ساتھ، اس کے محرکات اور اس کے اقدار کا بدلنا بھی ناگزیر ہے۔ جس طرح نظامِ زندگی کے مختلف شعبے بےشمار عوامل سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح ادب کو بھی مختلف عوامل کے اثرات شعوری طور پر قبول کرنے پڑتے ہیں۔ ہر وہ تحریک جو ہمارے دل و دماغ میں جگہ پا سکتی ہے، براہِ راست یا بالواسطہ ادب میں داخل ہو جاتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہر دور میں اپنے ماحول کا ساتھ دیا ہے۔ اس کی توہم پرستی، مذہبی جنون اور طلسماتی تحیر کا دور، اس کی ادبی تفریح اور دماغی تعیش کا دور، اس کے بازاری اور ہوس کارانہ عشق کا دور، ان سب کے پیچھے، ایک تہذیبی اور معاشرتی پس منظر کام کرتا رہا ہے۔ انسانی تہذیب اور سماجی تقاضوں سے ادب کو علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے ہماری تاریخیں، زیادہ تر نصابی ضرورتوں کی تکمیل، تحقیقی شوق کی تسکین یا ایک غرض کی پابجائی کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ مورخ یا تو اپنے عہد کو جانبدارانہ رنگ میں پیش کرتا ہے یا پھر ماضی سے غلط نتائج اخذ کرتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تاریخوں کی تقریباً تمام کتابیں بادشاہوں اور راجاؤں کی داستانیں ہیں۔ ان کے صفحوں پر ہمیں عوام کی زندگی کے تہذیبی اور معاشرتی نقوش بہت کم ملتے ہیں۔ خوش حالی یا بدحالی کا تصور قصر و ایوان سے پیدا کیا جاتا ہے حالانکہ تاریخ کے بنانے والے وہ عوام ہوتے ہیں جن کے گہواروں میں تہذیب پلتی اور نشوونما پاتی ہے۔ تاریخ ادب اردو کا ماضی بھی ہم تک زیادہ تر اسی رنگ میں آیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو ادب کے اولین کارنامے درباروں کی سرپرستی میں انجام پائے ہیں اور ان میں جگہ جگہ درباداری کے مصنوعی احساسات نظر آتے ہیں لیکن حقیقی ادیب، اپنے حقیقی ماحول کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ داخلی زندگی کی نمائش میں وہ کوئی بہروپ بھرے لیکن خارجی زندگی سے اس کے ذہنی ربط کی عریانی کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتی ہے۔ سودا جیسا خودپسند شاعر بھی نام نہاد صوفیہ کے تسلط کو گوارا نہیں کرتا اور اس کے خلاف ایک طنزِ لطیف کے طور پر کہتا ہے ؎

پوچھے ہے مریدوں سے وہ ہر صبح کو اٹھ کر — ہے آج کدھر اس کی شب روز کہاں ہے
تحقیق ہوا جس، .... تو کر داڑھی کو کنگھی — لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب کو ہوا وجد — کودے ہے کوئی اور کوئی نعرہ زناں ہے

یہ اپنی بددماغی کے باوجود جب اپنے بوسیدہ گھر کی لفظی تصویر اتارتا ہے تو اس میں ہمیں اس زمانے کے عوام کی بے حالی ایک عریاں حقیقت کے طور پر دکھائی دینے لگتی ہے۔ یا پھر مرغ بازوں کے متعلق اس کی ہجو، اس زمانے کی معاشرت کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔ غالب کی زبان جب قصیدہ خوانی سے تھک جاتی ہے تو وہ "گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو" جیسے اشعار میں اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے۔ بہرحال ہوائی قلابازیوں سے ٹھوس حقائق پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔ بہرحال جو ادب اپنے آپ میں اب بھی زندگی کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ وہی ہے جس کا ماحول پر تطابق ہو سکے۔ ان تبرکات کو چھوڑیئے، جن کو "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو" کہہ کر ہم بوسہ دیتے ہیں۔ عقیدت مندی یا ماضی پرستی بہت سے معائب کو چھپا دیتی ہے۔ غالب اگر اپنے عہد سے زیادہ، موجودہ زمانے میں اپنے لئے بلند مقام رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے مستقبل کی پیش رس میں مصنوعی شاعرانہ ماحول سے روگردانی کی۔ یقیناً نظیر اکبرآبادی کا کلام نصاب کی کتابوں سے ہٹ کر بھی اس لئے پڑھا جاتا ہے کہ اس نے شعری زمین کے لئے آسمان سے تارے نہیں توڑے بلکہ اپنے لئے اپنے پیش و پس سے موضوع چنے۔ غرض ادب، عوامی تہذیب اور اس کے ارتقاء کا مظہر ہوتا ہے۔

اردو ادب پر جو مصنوعی رنگ چڑھ گیا تھا اس کو دور کرنے کی کوشش بہت پہلے سے شروع ہو گئی تھیں میر حسن، انیس، نظیر نے قدیم ڈگر سے ہٹ کر
[illegible] زندگی کے عامل کے طور پر

استعمال کیا اس نے شاعری کے رخ کو خارجی حقیقتوں کی طرف پھیرا اور اس طرح اس نے جن کیفیات اور احساسات کی ترجمانی کی وہ اس کے [illegible]
انکا سی نا خوش لیکن جوش، انیس، نظیر کے اس بدلے ہوئے اسلوب نگارش اور خیال آفرینی کے نئے سانچے، حالات کی نا مساعدت میں غرق ہوگئے
ان کے ہاتھوں نے ادبی تحریک کی صورت اختیار نہیں کی بلکہ ان کا شعر و فکر کا سرمایہ، اُردو ادب کے مستقبل کی اولین بنیاد کے طور پر دب گیا۔ انہوں نے
دور کے آنے والوں کے لئے مشعل روشن کی لیکن ان کے ساتھ والے اس روشنی میں صحیح منزل کی جستجو نہ کرسکے۔

اس کے بعد زندگی کے تعطل کی وجہ سے ایک عام ذہنی انحطاط کا دور رہا اور یہ دور اس وقت ختم ہوا جب ۱۸۵۷ء کے نشتر نے غفلت اور واماندگی کے بوجھ
کے مواد فاسد کو نکال دیا۔ ہندوستانیوں کے شعور اور احساس میں ایک تازہ روح کروٹیں لینے لگی۔ جدید اور قدیم تہذیبوں میں ایک عہد آفریں تصادم ہوا جس سے
مبہم ماحول میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ سیاسی بیداری نے ادب کے پیش پا افتادہ گھسے ہوئے پر تجدید زندگی کا پرچم کھولا، معاشرتی زندگی کا انقلاب ایک دھارے
کی صورت میں نمودار ہوا۔ ایک طرف مغربی اثرات اور دوسری طرف مشرقی تہذیب کے تحفظ کے جذبے نے انتہا پسند نقاط نظر پیدا کردئے۔ بعضوں کو جدید روشنی میں آگرہ کی ہر چیز
بھیانک معلوم ہونے لگی اور بعضوں نے یہ خیال کیا کہ اس روشنی سے آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔ غرض یہ کہ یہ کشمکش، مستقبل کو بنانے میں بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ اسی زمانے
یہ احساس حقیقت پسند ادیبوں نے حقیقی ماحول میں زندگی کے تقاضوں کی طرف نظر ڈالی اور کمزوریوں کی اصلاح اور صحیح منزل کی تلاش میں آگے بڑھے۔ ان مصلحین میں
سرسید احمد خاں کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے اپنی ہمہ گیر توجہ سے اصلاحی اقدام اور اصلاح کے لئے ایک ماحول تیار کیا۔ ادبی اصلاح کی تحریک حالی اور آزاد نے شروع کی۔
حالی نے ادب کی حقیقت کو بدلتے ہوئے ماحول کی روشنی میں سوچا اور اس سے اہل ملک کو بھی واقف کرانے کی کوشش کی۔ "مقدمہ شعر و شاعری" میں ادب کے
محرکات، اس کے اثرات اور اس کے مقاصد پر انہوں نے جو تنقیدی بحث کی ہے، ... . اسی کے سہارے اُردو ادب کے جدید رجحان نے پہلی انگڑائی لی۔ حالی خود
شاعر و ادیب کی حیثیت سے اُردو ادب کے عبوری دور کے طرح انداز ہیں۔ انہوں نے شاعری کو صناعی کی بجائے اظہار حقیقت کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ غرض یہ کہ
حالی نے اصول اور عمل کے ذریعے اُردو ادب کو حقائق نگاری کی طرف پھیر دیا۔ خوش قسمتی سے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، نذیر احمد، محسن الملک
اور ذکاء اللہ جیسے مخلص رفیق کار مل گئے۔ ان کے اشتراک عمل اور خلوص نے اس تحریک کو سارے ہندوستان میں پھیلا دیا اور فکر و نظر میں ایک تبدیلی پیدا کردی اور اُردو ادب میں
سب سے پہلے غایت اور مقصد کے تحت واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری کا رجحان پیدا ہوا۔ لیکن اُردو ادب کا یہ عبوری دور جسے اصلاحی دور کہنا چاہئے جس تیزی سے
شروع ہوا تھا، اسی تیزی سے اس کے خلاف ایک ردعمل بھی شروع ہوا ایک طرف جدید رجحانات کا یہ دھارا بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف رجعت پسندی کا اندھیرا بھی
گہرا ہوتا جارہا تھا۔ اس زمانے میں بھی داغ، امیر مینائی، جلال لکھنوی وغیرہ شاعروں کی رونق بڑھا رہے تھے ان کے ساتھ بہت سے لوگ لکیر پیٹنے میں مصروف تھے۔
حالی کے متوازی خط پر اکبر الہ آبادی کے جراحت پاش قہقہے بھی، اس تہذیب پر طنز کی کمندیں پھینک رہے تھے جس کو زندگی قبول کررہی تھی۔ غرض یہ کہ تعمیرات کے
اس ہجوم میں تبدیلی اور تغیر کے یہ نقوش صرف اپنی جگہ ابھر کے رہ گئے اور عام رجحان ان کے دائرے میں نہ آسکا۔ سرسید، حالی اور شبلی کی تحریریں، نذیر احمد کے افسانے، آزاد اور
اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں، آنے والے دور کی نقیب ضرور ہیں لیکن حال کی فرسودگی پر ان کا کوئی دیرپا اثر نہیں پڑا۔ اُردو ادب کا یہ دور اصل میں ادبی ارتقاء کی دوسری
کڑی تھی جس کو ماضی اور مستقبل کی درمیانی کڑی کہنا چاہئے۔ رجعت پسندی کے ردعمل کے باوجود تغیر کا یہ رجحان فنا نہیں ہوگیا بلکہ وہ اپنی تیزگامی کے لئے خاموشی سے زندگی
حاصل کرتا رہا۔ چنانچہ بہت جلد اس ترقی کے آثار پھر رونما ہونے لگے۔ سرشار، شرر، مرزا محمد ہادی رسوا، منشی سجاد حسین وغیرہ کی وجہ سے اُردو ادب کے جدید رجحانات نے
پھر ایک انگڑائی لی اور یہ انگڑائی ایک مسلسل بیداری اپنے ساتھ لائی۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ہمارا ادب ایک بڑے دائرے کے اندر چھوٹے چھوٹے دائروں میں گھومتا رہا ہے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلوب اور انداز فکر کا بدلتا ہوا رجحان ضرور پیدا ہوگیا تھا لیکن یہ سب کچھ قدیم طرز اور قدیم تخیل کی بدلی ہوئی شکلیں تھیں۔ ایک ایسا انقلابی دور
ابھی نہیں آیا تھا جو ماضی کے خیال کو حال کے تقاضوں سے نکال دے۔ اقبال سب سے پہلا شاعر ہے جس نے ظاہر کے حصار سے اپنے ذہنی اور فکری پیکر کو نکال لیا

سرمایہ کی مقصد پر مقدم کیا۔ اقبال نے بیداری تو ضرور دی لیکن اس کی بہاؤ نظر پہاڑ بن کر کے حائل بنا۔ یہ مجاہد ہمالیہ کو چیر کر آگے نکل گیا۔ اس نے جغرافیائی حدبندیوں سے ماورا کی بیداری کو بیدار کیا۔ اچھا ہے کہ بلند مقصد بنایا اور اس طرح اس نے کوشش کی کہ ماضی کی مدد سے ایک ہیئت حیات پیدا ہو جو بلند تر مستقبل کی تزئین کرے۔ مستقبل کی تعمیر کے لئے اسلام کی قوت حیات کے احیاء پر زور دیا۔ اسلام کا وہ مبلغ نہیں تھا بلکہ اس نے فرقہ پرستی کے ادنیٰ جذبات سے ہٹ کر انسانیت کے پیکر میں وہ روح پھونکی جو جمہور کو مطمئن کر سکتی ہے۔ اسلام کا فلسفۂ حیات محبت، عمل اور یقین ہے۔ وہ نسل اور رنگ کے قلعوں کو ڈھاتا ہے۔ امتیازات اور عزت کو خود غرضی اور محرومی کے تصادم سے بچاتا ہے۔ اقبال نے اسی پیام کو دہرایا۔ اس نے کہا "اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" اقبال کے اس نعرے کی گونج میں ہمیں وہی آواز ملتی ہے جو آج "مفادات کی ٹکر" میں دبے اور کھلے انداز سے بلند ہو رہی ہے۔ حالی اور اس کے ہم عصروں نے اردو ادب کے کھنڈروں کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا لیکن اقبال نے ایک زلزلے کی کیفیت پیدا کر دی اور ان ہی کھنڈروں پر نئی تعمیر کا پرچم کھول دیا۔ اقبال کے بے پناہ نعروں اور اس کی قلندرانہ خود اعتمادی اور اس کی شاہین پرواز نے ہمارے نوجوانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے غالب کی اس آرزو کو جو اس نے "کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے" کی صورت میں ظاہر کی تھی اقبال کے کلام میں صورت پذیر ہوتے دیکھا۔ ہمارے ادیبوں نے غیر شعوری طور پر اس بیدار حوصلۂ احساس اور زندہ سلیقۂ اظہار کو قبول کیا جو اقبال کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح اقبال کی آفریدہ بجلیوں میں نوجوانوں کا خون حیات دھل گیا۔ رجعت پسندی کے ایڑیاں رگڑتے ہوئے ڈھانچے میں جو چند سانس سسک رہی تھیں اب ان سے زندگی کی کوئی توقع نہیں رہی۔ ان کے مقصد اور ان کی تخلیقی صلاحیت نے جمالیاتی تسکین کے توسط سے موجودہ سماجی کش مکش کا حل دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ان کے دلوں کی یہی دھڑکنیں تھیں جن کے ہاتھوں ہمارے موجودہ دور کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ سائنس نے سرمایہ داری کے سہارے عمرانی نشوونما کی اجارہ داری حاصل کر لی اور طبقاتی کش مکش کا چھپا ہوا احساس نمایاں ہونے لگا۔

آرٹ کی طرح سائنس بھی سماج کی پیداوار ہوتا ہے وہ صرف تجربہ خانے کی مشغولیت نہیں بلکہ فطرت کے موانعات پر قابو پانے کی ایک مسلسل کوشش کا نام ہے۔ اس کی ابتدا انسانی بقا اور ترقی کے آلۂ کار کی حیثیت سے ہوئی۔ اس طرح انسانی احتیاج نے انسانوں کو ہر قدم پر سائنس کا غلام بنا دیا۔ لیکن جب سرمایہ دار نظام نے صنعتی مستقبل کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے خود غرضانہ خواہشوں کی تکمیل کے لئے استعمال کرنا شروع کیا تو اس کے خلاف ایک عام ردِ عمل شروع ہوا۔ عوام نے دیکھا کہ سائنس کا مقصد انسانی بہبودی سے زیادہ منافع کی وہ مقدار ہے جو سرمایہ دار طبقہ کو ملتی ہے۔ غرض یہ کہ تخریبی طاقتوں نے سائنس کے بنیادی مقصد کو مسخ کر دیا اور اس طرح وہ خلیج وسیع ہو گئی جو جاگیرداری نظام کے درشت ہاتھوں سے کھودی گئی تھی۔ خوش حالی کے اجارہ داروں اور محرومی کے شکوہ سنجوں کے درمیان جو ناخوش گوار تصادم ہوا اس میں سائنس کی اس بے راہ روی کا بڑا حصہ ہے۔ ہمارے ادیبوں نے دیکھا کہ دنیا کو سکون اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ رنگ، نسل اور امارت کے ان گراں بار پتھروں کو راستے سے ہٹا دیا جائے جو سرمایہ داری نے ایک نمائشی تمدن کی پرداخت میں سنگ میل کے طور پر گاڑھ دئے ہیں۔ اسی احساس سے ہمارے عوامی ادب کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس آخری دور میں پریم چند کی ادبی قیادت نے سادہ پُرکار انداز میں نئے رجحانات کو مستقل طور پر آگے بڑھانے کے لئے اقبال کا ساتھ دیا۔ اقبال نے اگر اپنے شعروں سے دلوں کو گرمایا تو منشی پریم چند نے اپنے ناولوں اور قصوں سے ایک حرارت پیدا کی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ یورپ مختلف سیاسی، معاشی اور معاشرتی تحریکوں کا جولاں گاہ بن گیا تھا۔ اور صنعتی ملکوں میں مزدوروں اور سرمایہ والوں میں

کش کش شروع ہوگئی تھی ۔ روس سے اس کش کش کی پہلی آواز بلند ہوئی اور یہاں سے مسائلی ادب کا ایک سیلاب شروع ہوا ۔ ٹالسٹائے ان ادیبوں میں سرفہرست نظر آتا ہے جنہوں نے ادنیٰ طبقوں کے دبے ہوئے جذبات کو اپنے ادب کے ذریعے ابھارنا چاہا ۔ میکسم گورکی کی کتابیں عام طور پر پڑھی جانے لگیں ۔ چنانچہ آج سے دس سال پہلے ان ہی خارجی اثرات نے اُردو ادب میں عصری دور پیدا کیا اور دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی ۔

آج ہمارا ادب جس دور سے گزر رہا ہے وہ ایک نیا دور ہے ۔ اس دور کی ابتدا میں جس طبقاتی کش کش کی ادب غمازی کر رہا تھا وہ اب ایک بڑی جنگ کی صورت میں نمودار ہوگئی ہے ۔ انسانیت نازشی درندگی کے خلاف برسرپیکار ہے ۔ جمہوریت اور اشتراکیت کا متحدہ محاذ ہے ۔ انسان دشمن تخریبی عناصر کا مقابلہ کر رہا ہے ۔ مابعد جنگ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کے خاکے ڈالے جا رہے ہیں جو طبقاتی تصادم کو ختم کردے ہمارے ادیب بھی استبداد کے اُس چنگیزی تسلط کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں جو جرمنی اور جاپان کے کمیں گاہوں میں پرورش پا رہا تھا اور جس کے جنون نے امن اور انسانیت کو اپنی مدافعت کے لئے بیدار کر دیا ۔ یہی ترقی پسند ادب ہے جس کو جمہور کی آواز کہنا چاہئے ۔ اس ادب کی بنیاد زندگی کے وہ حقیقی تقاضے ہیں جو سیاسی بحران اور اقتصادی محرومی نے پیدا کئے ہیں ۔

اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کر دینا چاہئے کہ ترقی پسند ادب کوئی "لیبل" نہیں ہے جیسے کسی کی پیشانی پر چپکا دیا جائے اور سمجھا جائے کہ یہی ترقی پسند ادیب ہے ۔ ہر حقیقی ادیب زندگی سے گریز اور فرار کی کتنی ہی کوشش کرے، اپنے ماحول سے رُوگردانی نہیں کر سکتا ۔ ترقی پسند ادب کے خلاف جو آوازیں اٹھ رہی ہیں وہ اسی غلط نگاہی کا نتیجہ ہیں ۔ ترقی پسند ادب کے مخالفوں نے چند ایسے ادیبوں کو جو ترقی پسندی کی آڑ میں ذہنی سرمایہ داری کا کھیل کھیل رہے ہیں، ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی انفرادی کمزوریوں کو وہ ترقی پسند ادب کی اجتماعی کمزوری تصور کر رہے ہیں ۔ یہ ایک غلط فیصلہ اور جذباتی فریب ہے ۔ ادب کسی فرد کے توسط سے عوام تک پہنچتا ہے ۔ اس کی یہ ادبی تخلیق عوام کے سامنے آتی ہے ۔ ایک فرد یا چند افراد کے بر خود غلط پن سے ادب کا اجتماعی تصور قائم کرنا غلط ہوگا ۔ ترقی پسند ادب سے جہاں تک ایک عظیم تر مقصد سے اس کا یہ تعلق ہے، کوئی اختلاف نہیں کر سکتا ۔ جو لوگ اس مقصد سے کھیلنا چاہتے ہیں، ان کو ہم ترقی پسند ادیب کہہ کر کیوں کڑھیں ۔ رجعت پسندوں کے قلعے میں اگر خبر بچے کی ضد نہ ہو تو وہ محسوس کریں گے کہ پیچھے ہٹ کر تیر چلانے سے بہتر یہ ہے کہ آگے بڑھ کر زندگی کا دامن تھام لیا جائے ۔

نام نہاد ترقی پسند ادیب اگر گندگی اُچھال رہے ہیں تو آپ ادب کے دامن سے دھبے کیوں نہیں دھوتے ۔ وہ گندگی اچھال رہے ہیں اور ان سے چڑنے والے ان پر گندگی پھینک رہے ہیں ۔ "گناہ" کی سزا تجویز کرنے والا خود گناہ گار بن جائے یہ تعمیر نہیں تخریب ہے !

کاغذ کی ناؤ ـ میکش

صاحبزادہ میکش کے مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے جن میں غریبوں کی زندگی کے عکس ہیں ۔ ان کے ذریعے سے "انسان دوستی" کے احساسات کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے جو ہر انسان کے دل میں ہیں ۔ ہر ڈراما تمثیلی کرداروں کو پیش کرتا ہے اور تقریباً تمام تمثیلی کردار غریبوں کے مسائلِ حیات کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ ان ڈراموں میں تمثیل نگار کی روح کی تڑپ اور دل کی دھڑکن نے اپنے حقیقی جذبات کو لفظی پیکر پہنانے میں کامیابی حاصل کی ہے ۔ طرز بیان انتہائی سادہ اور شگفتہ ہے ۔ صفحات (۱۲۰) قیمت عہ

اُردو میں افسانے

کسی زمانے میں افسانہ نگاری کا مقصد تخیل کے لئے عشرت بہم پہنچانا تھا۔ زندگی کے اقدار کے بدلنے کے لئے ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی بدل گیا ہے۔ اب ہمارے کھانے پینے کے طریقے اور سوچنے اور محسوس کرنے کے سانچے سب کچھ بدل گئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا جن باتوں میں جی لگتا تھا اب وہ باتیں زیادہ دیر تک ہم کو متوجہ نہیں رکھ سکتیں۔ جن مشغلوں میں وہ دن رات ڈوبے رہتے تھے۔ وہ ہمارے لئے بےکیف ہیں۔ اگلا زمانہ تخلیق محض کا معصوم زمانہ تھا۔ آج ہر چیز کی علت ہر بات کی منطق اور ہر فعل کی ایک نفسیات ہوتی ہے۔ یہ تجزیہ اور تنقید کا دور ہے۔ اب کوئی ایسی بات ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہوتی جس کا تجزیہ نہ کیا جاسکے۔ اور جس پر کوئی تنقید نہ کی جا سکے۔ افسانے کو بھی کسی نہ کسی طرح اسی میزان منطق پر اترنا ہے۔ نفسیاتی افسانہ بھی اسی جدید رجحان کی پیداوار ہے۔ اس میں واقعات سے زیادہ اہم وہ نفسیاتی محرکات ہوتی ہیں جن سے کوئی ماجرا ترتیب پاتا ہے۔ ہماری زبان میں افسانوں کی اس صنف پر ابھی ابھی توجہ کی جانے لگی ہے۔

قاضی عبدالغفار صاحب کی تصنیف لیلیٰ کے خطوط اُردو کے نفسیاتی افسانوں کے لئے نشانِ راہ ہے۔ اس کی ترتیب ان نفسیاتی عناصر سے ہوتی ہے جو لیلیٰ کے کردار کو بناتے ہیں۔ لیلیٰ ایک بازاری عورت ہے۔ معاشرت کے ہر پہلو پر اور خصوصاً مرد کی ہوس رانی پر اس کی نفسیات میں ایک عجیب تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ لیلیٰ ایک دانشمند لڑکی کے روپ میں پیش کی گئی ہے جو زندگی کی ٹھوکروں پر قہقہے لگا کر اپنے آنسو چھپاتی ہے۔ اپنے ہیجان نفس پر وہ بےحسی کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ کہیں اس کی یہ کوشش کامیاب ہوتی ہے اور کہیں جذبات ابل پڑتے ہیں۔ مجنوں کی ڈائری اس مصنف کا دوسرا نفسیاتی افسانہ ہے۔ مجنوں عہد حاضر کا ایک کم زور دل نوجوان ہے جو جذبات کے تیز دھارے پر بہتا ہے۔ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہے اور سنبھلنے نہیں پاتا۔ اس کے کردار میں بھی وہی ہیجان اور ذہنی انتشار پایا جاتا ہے جس پر لیلیٰ تو قابو پالیتی تھی لیکن جو خود اس کو بے قابو کر دیتا ہے۔

پروفیسر مجیب کا افسانہ "باغی" صرف تین افراد کی نفسی کیفیتوں سے بنتا ہے۔ بڑے بابو اس قصے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کی طبیعت میں عجیب صبر آزما سکون ہے۔ جو انسان کو تنہائی میں ملا کرتا ہے اور اس کی ہستی کو باعظمت بنا دیتا ہے۔ دوسرا کردار ٹکٹ بابو کا ہے۔ یہ ایک پراگندہ دل نوجوان ہے۔ جس کے نزدیک ہر معمولی واقعہ غیر معمولی ہوتا ہے۔ قصے کا ماحول آبادی سے بہت دور ایک ویران ریلوے اسٹیشن کا ہے۔ جہاں ہفتوں میں ایک آدھ بار اکادکا مسافر گاڑی سے اترتا ہے۔ اسٹیشن سے قریب ایک آم کا کنج ہے۔ آم کا کنج اس قصے کی روح و رواں ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ آموں کے کنج کے آہنگ خاموش ہیں اور بڑے بابو کی روح میں کوئی ربط پنہاں ہے۔

مجیب کے آموں کے کنج میں اور ہارڈی کے The return of the Native کے Egdem Heath کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں بڑی مشابہت ہے۔ نقادوں کا خیال ہے کہ ہارڈی کی یہ جھاڑیاں مشیت کی طاقت اور انسان کی تقدیر نظر آنے لگتی ہیں۔ آموں کے کنج سے بھی مصنف نے یہی تاثر پیدا کیا ہے۔ افسانہ ماحول کی اس خاموشی پر ختم ہو جاتا ہے، جس کو بڑے بابو کے سکون اور آموں کے کنج نے ایک حقیقت محکم کی حیثیت بخش دی ہے۔

نفسیاتی افسانے لکھنے والوں میں مجنوں گورکھپوری کا نام بھلایا نہیں جا سکتا۔ افسانے کے متعلق ان کا اپنا خیال ہے کہ اس [illegible] دیکھنے والوں کو اپنی ہی بنی یا بگڑی صورتیں نظر آتی ہیں۔ فنون لطیفہ کی اصل غایت اس کے نزدیک یہ ہے کہ حقیقت کو بلا کسی پردے کے اس طرح پیش کر دیا جائے کہ دنیا اس حقیقت کو سمجھ سکے۔ اور اس کی متحمل ہو سکے۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ اپنے افسانوں کو وہ قصداً اور اختیاراً غایتی بتاتے ہیں۔ محبت ان کے افسانے کا خاص موضوع ہے۔ اس موضوع کے انتخاب کے محرکات خود ان کی زبان سے یہ ہیں کہ "میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نظر کے سامنے رکھتا ہوں اور مشاہدہ اور مطالعے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ زندگی کی تلخ ترین حقیقت محبت ہے جو اور حقیقتوں پر محیط ہے"۔ مجنوں گورکھپوری کے افسانوں میں قنوطیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ شوپنہار کا فلسفہ کہ انسان مجبور محض ہے جو ایک اندھی مشیت کے جبر سہتا ہے اور اسی جبر سے جیتا ہے، ان کے افسانوں میں بھی جاری و ساری نظر آتا ہے مجنوں کے افسانوں کے کردار قنوطیت اور الم پسندی کے باوجود زندہ کردار معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں زندگی کا احساس بہت شدید ہوتا ہے۔ زندگی کے مصائب کو بھی وہ اتنی ہی شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن ان کی قنوطیت اور غم پسندی غم حیات کو ناگزیر سمجھ کر گوارا کر لیتی ہے۔ اسی فنی کیفیت سے مجنوں کے افسانے بنتے ہیں اور ان کو اردو افسانے میں ایک مستقل مقام دیتے ہیں۔

نوجوان ادیبوں میں کرشن چندر کے نفسیاتی افسانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں "دو فرلانگ لانبی سڑک" کرشن چندر کا ایک مختصر افسانہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار نچلے متوسط طبقے کا ایک دفتری نوجوان ہے۔ یہ اسی ذہنی کش مکش کا شکار ہے جو اس طبقے کی تقدیر ہے۔ "دو فرلانگ لانبی سڑک" دراصل تہذیب کے مسلسل چکر کے لئے ایک استعارہ ہے۔ اس سڑک کے دیکھتے رہنے سے نوجوان کے دل میں عجیب غریب تلاطم پیدا ہوتا ہے اور اس پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ افسانے کا پہلا تاثر جن الفاظ سے شروع ہوتا ہے اس کو مصنف کی زبان سے سنئے۔

"کچہریوں سے لے کر لا کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لانبی سڑک ہوگی ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی پیدل کبھی سیکل پر۔ سڑک کے دو رویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اداس سے تناور درخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ۔ سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے اسی پر چل رہا ہوں نہ اس میں کوئی گڑھا دیکھا ہے نہ شگاف۔ سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر بنائی گئی ہے۔ اب اس پر تار کول بچھی ہے جس کی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔"

نو سال کی طویل مدت میں اس سڑک پر اس نے جو مناظر اور کرشمے دیکھے ہیں ان سے اس کی روح اکتا چلی ہے۔ اس سڑک پر چلتے رہنا اس کو اپنی تقدیر کا ایک جبر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی روح اس جبر کو توڑ دینا چاہتی ہے غصے کے اختتام پر یہ تاثر شدید ہو جاتا ہے مصنف نے اس تاثر کو نوجوان کے الفاظ میں یوں ظاہر کیا ہے۔

"انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر اس سڑک کو ڈائنا میٹ لگا کر اڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو۔ ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے۔ مجھے اس وقت کتنی مسرت حاصل ہوگی اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں۔ کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلا چلا کر کہوں میں انسان نہیں ہوں میں پاگل ہوں مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔"

کرشن چندر کا ایک اور طویل نفسیاتی افسانہ "زندگی کے موڑ پر" ہے۔ مصنف نے افسانہ شروع کرنے سے پہلے اقبال کا مصرع "منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی" لکھا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار شہر کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان پرکاش ہے جس پر انتشار اور سراسیمگی سی طاری رہتی ہے۔ تہذیب کا ستایا ہوا انسان صدیوں سے سکون کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔ "زندگی کے موڑ پر" میں کچھ ایسی ہی جستجو اور سرگردانی کے نقوش ملتے ہیں۔ پورے افسانے میں ایک عجیب اور لطیف مزاح کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن اس مزاح اور طنز کی مسکراہٹوں میں بہت سے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔ پرکاش ایک لالۂ صحرائی ہے جس کو تہذیب کے مظالم نے کملا دیا ہے اور اس کو منزل سے دور کر دیا ہے۔ پورا افسانہ پرکاش کی اس نفسیاتی کیفیت سے مرتب ہوتا ہے اسی سلسلے میں مصنف نے متوسط طبقے کی شادی پر بھی طنز کیا ہے پرکاش کی نفسیات میں ایک طرح کا طنز شامل ہے اور زندگی کے تلخ تجربوں نے اس کو یہ طنزیاتی زاویۂ نگاہ عطا کیا ہے۔ طنز کی عادت اس کی طبیعت میں اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ وہ اپنے رشتے کی بہن پرکاش وتی کی شادی پر جو اس کی یعنی (پرکاش وتی کی مرضی کے خلاف ہو رہی ہے) اس کے منھ پر طنز کرنے نہیں چوکتا۔ اس منظر کو مصنف کی زبان سے سنئے۔

"پرکاش وتی دوسری منزل میں ایک کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ پرکاش کا خیال تھا کہ وہ بہت سی لڑکیوں میں گھری ہوگی اور اس سے دو چار میٹھی میٹھی گالیاں سننے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ لیکن حسن اتفاق سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پرکاش بہت خوش ہوا۔ اس نے پرکاش وتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی حنائی انگلیوں کو زور زور سے ملنے لگا۔ لیکن پرکاش وتی بولی نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے پرکاش وتی کی تھوڑی کو اونچا کیا اور کہنے لگا۔ سنتی ہو بہن جان تمہارا بھائی تمہیں بدھائی دینے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی ہو۔ اور پرکاش وتی اپنی آنکھوں میں سچ مچ آنسو روکے بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ پرکاش بولا تو تو کہتی تھی میں بی اے پاس کر کے نوکری کروں گی یا کہانیاں لکھوں گی اور شاعری کروں گی اب بتا یہاں تو تجھے کسی نے گیارھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھایا اور تو تو شاید فلم ایکٹریس بننا چاہتی تھی اب وہ اداکاری کے ولولے کہاں گئے۔ تیرے وہ سونے کے تمغے جو تو نے بہلدویالہ میں ناچ ناچ کر حاصل کئے تھے اب کہاں ہیں؟ پرکاش وتی نے رو کر کہا۔ اس لئے تم مجھے جلانے آئے ہو۔ کیا میں اب تم سے بھی ہمدردی کی امید نہ رکھوں۔ پرکاش چپ رہا اور چند لمحوں تک آنسوؤں کی ان ندیوں کی طرف تکتا رہا جو اپنی روانی میں زندگی کے پورے نہ ہونے والے سپنوں کو بہلائے جا رہی تھیں۔

اس افسانے میں پرکاش کے جذبات اور اس کی نفسی کیفیات کہیں بلند آہنگ ہیں تو کہیں اس میں کچھ سرگوشیاں بھی چھپی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد آخر شب میں سونے والوں کی رنگا رنگ کیفیتیں اپنے معنی کے اظہار کے لئے شرمندۂ الفاظ نہیں ہیں۔ ایک طرف پرکاش کے اپنے جذبات کا طوفان تھا جس نے اس کو رات بھر بے چین رکھا اور دوسری طرف سونے والوں کی وہ بے حسی جو تقدیر کے شاکر انسانوں پر مسلط ہو جاتی ہے۔ اس طویل افسانے میں کرشن چندر نے پرکاش کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ یہ قصہ پرکاش کی نفسیاتی کیفیتوں سے بنتا ہے اور اس کی نفسیاتی کیفیت ہی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ہماری زبان کے

جدید افسانوں کا ایک مختصر خاکہ ہے۔ نفسیاتی افسانہ اور معاشرتی یا تخیلی افسانوں میں صرف یہ فرق ہے کہ جہاں معاشرتی افسانوں میں ذہنی میلانات اور کیفیات پس منظر میں رہتی ہیں اور قصے سے نفسیات کے بہت سے پہلو اخذ ہوتے ہیں۔ نفسیاتی افسانے میں واقعات کسی نہ کسی نفسیات کے زیر اثر بنتے ہیں۔ یہ نفسیات پورے قصے پر حاوی ہوتی ہے۔ افسانہ نگار اپنے کرداروں کی کسی نہ کسی مخصوص ذہنی کیفیت اور احساس سے قصہ تیار کرتا ہے اور اسی کو قصے کے ارتقاء اور انجام کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اسی ترتیب اور تجزیے کو آپ چاہیں تو افسانے کی داخلیت بھی کہہ سکتے ہیں۔

محمد عمر مہاجر

رات کا بھولا اور دیگر افسانے ۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شایع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائٹل ملک کے بلند پایہ آرٹسٹ عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔
صفحات ۱۶۸، قیمت عہ

محبت کی چھاؤں ۔ مرزا ظفر الحسن بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہر

من کی دنیا ۔ حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی ایم اے کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔
ہر فسانہ رعنائی خیال اور رنگینیٔ بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستاران افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہوں گے۔ جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پُرکیف افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد عہ

ہوش کے ناخن ۔ اس ڈرامے کو جامعۂ عثمانیہ کے دو بہترین انشا پرداز میر حسن صاحب ایم اے اور مخدوم محی الدین صاحب ایم اے نے نہایت ہی محنت اور توجہ سے لکھا ہے۔ اس میں حیدرآباد کی سماجی زندگی کو دل آویز و دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے یوں تو یہ ایک انگریزی ڈرامے سے ماخوذ ہے لیکن اس طرح اپنا کر پیش کیا گیا ہے یوں تو یہ ایک انگریزی ڈرامے سے ماخوذ ہے لیکن اس طرح اپنا کر پیش کیا گیا ہے کہ بجائے خود تصنیف ہو گیا ہے۔ زبان سلیس مذاق لطیف اور اندازِ بیان نہایت ہی شگفتہ ہے۔ تعداد صفحات (۹۴) قیمت عہ۔

اُردو ڈراما

ڈراما ادبیات کا ایک نہایت اہم اور دلچسپ جزو ہے اور زندگی کی ترجمانی کے اعتبار سے ادب کا کوئی دوسرا شعبہ اس کو نہیں پہنچتا۔
اس کے دو اہم پہلو ہیں ایک تمثیلی دوسرا ادبی، تمثیلی پہلو نہایت قدیم ہے کسی واقعہ کی ہو بہو نقل اتارنا یا سوانگ بھرنا ہمیشہ دلچسپی اور توجہ
کا باعث رہا ہے چنانچہ کم سن بچوں کا اپنے کھیلوں میں مختلف کرداروں کی نقالی کرنا اسی مشابہت پسندی کا نتیجہ ہے اسی وجہ سے غالب نے
دنیا کو "بازیچۂ اطفال" اور شکسپیر نے " اسٹیج " قرار دیا ہے۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ تمثیل کا آغاز مذہبی رسم و رواج کے زیر سایہ ہوا ہے کیونکہ
عوام کی مذہبی عقیدت نے اپنے اکابروں اور دیوی دیوتاؤں کی مقدس زندگی اور ان کے نیک عمل کو تمثیلی انداز میں پیش ہوتا ہوا دیکھنا
ضروری گردانا۔ "رام لیلا" اس کی بڑی اچھی اور اچھوتی مثال ہے۔ اس قسم کے کھیل، تماشوں کی مقبولیت کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ہر چھوٹی
بڑی تعریف کے ساتھ ان کی نمائش لازمی تھی۔ رفتہ رفتہ یہی کھیل تماشے ادبی صورت اختیار کرنے لگے اور ان میں خصوصیات بھی پیدا ہونے لگیں۔
ابتداً ان ڈراموں کا موضوع مذہبی معتقدات اور ان میں خاص طور پر دیوتاؤں کی معرکہ آرائیاں ان کے معجزات اور ان کے عشق و محبت کی
داستانوں کو پیش کیا جاتا تھا اور ان میں رقص و سرود کو کوئی جگہ حاصل نہیں تھی۔ بعد کو فطرت انسانی تنوع پسندی اور جدت طرازی نے
اس میں ناچ اور گانے کو بھی داخل کرلیا۔ بدھ مت کے پیشواؤں نے سب سے پہلے ڈرامے کی افادیت کو پہچانا اور اس کو اپنے عقائد کے
پرچار کا ذریعہ بنایا چنانچہ راجاؤں کی سرپرستی سے تھوڑے ہی دنوں میں سارے ہندوستان میں بدھ مت کی دھوم مچ گئی اور بدھ مت کی
عقائد اس طرح پھیل گئے جیسے بن میں آگ پھیلتی ہے۔ ڈرامے کی اس کامرانی نے عوام کا دل موہ لیا لیکن جب ہندو مت کے فی زمانہ
ردعمل سے بدھ مت کو زوال ہوا تو ڈرامے کو بھی پس پشت ڈال دیا گیا۔ اس کے علاوہ بیرونی حملہ آوروں کی یلغاروں نے بھی اہل ہند
کو ڈرامے کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ دیا اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈراما بالکلیہ فنا ہوگیا کیونکہ عوام نے اس کو اپنے روزگار کا ذریعہ بنالیا تھا۔
"ناٹک منڈلیاں" اسی پیشہ ورانہ مقصد کے تحت قائم ہوئیں جو گاؤں گاؤں پھرتی تھیں۔ ان "منڈلیوں" کے کارندوں نے روپیہ
کمانے کی فکر میں عوام کے مذاق کی آسودگی کے لئے مبتذل اور گندہ خیالات کی نمائش کی جس کی وجہ سے مذہبی پیشواؤں نے ان ڈراموں
کو اخلاق سوز اور خلاف مذہب قرار دیا مگر یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں اس صنف کے
اچھوتے اور نادر نمونے نہ پائے جاتے ہوں خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان نے بھی کالیداس کا سا عہد آفریں ڈراما نگار پیدا کیا جس کی
ٹکر کے ڈراما نگار دنیا میں بہت کم پیدا ہوئے ہیں لیکن اُردو میں ڈرامے کی طرف بہت دیر میں توجہ کی گئی اس لئے اُردو ڈراما ابھی طفولیت
ہی کے دور میں ہے۔ اسلامی بادشاہوں کے زوال کے موقع پر جب عیش و عشرت کی محفلیں اور لطف و تفریح کے مختلف اسباب پیدا
ہوگئے تو ڈرامے کو بھی عیش رانوں نے تفریحی غایت کی تکمیل کے لئے چنا۔ کہا جاتا ہے کہ فرخ سیر خاندان مغلیہ کے "شاہ شطرنج" کے
حکم سے نواز نامی ایک شخص نے ایک ڈراما تیار کیا جس کا سلیس اردو میں فورٹ ولیم کالج کے مشہور مترجم مرزا کاظم علی جوان نے ۱۸۱۲ء
میں ترجمہ کیا ہے۔ واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ ڈراموں اور جلسوں کے بڑے دلدادہ تھے چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے کئی ایک
ڈرامے اور جلسے تیار کئے مگر ادب میں ان کا کوئی مستقل درجہ نہیں ہے لیکن اس دور کی نہایت اہم اور اَن مٹ یادگار۔ امانت کی "اندر سبھا"
ہے۔ اندر سبھا کا پلاٹ یا بیرنگ ہندی دیو مالا اور اسلامی روایات کے خوش گوار سنجوگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اُردو زبان کا سب سے
زیادہ مقبول اور مشہور ڈراما ہے جس کا ترجمہ مشرق و مغرب کی متعدد زبانوں میں ہوچکا ہے اور انڈیا آفس میں اس کے کم و بیش ۱۸ نسخے ہیں۔

اور غالباً امانت ہی اُردو ڈرامے کے باوا آدم ہیں۔

اندر سبھا کے کردار دیو، پری اور اسی قسم کی مافوق فطرت ہستیاں تھیں جب پہلے پہل ان آسمانی کرداروں کو اسٹیج پر پیش کیا گیا تو عوام نے بے حد پسند کیا اس کی مقبولیت سے دوسرے ڈرامانگاروں کو بھی اس نہج پر ڈرامانگاری کا شوق ہوا لیکن جس طرح جھوٹے سکے ٹکسال میں نہیں چل سکتے اسی طرح ان حضرات کی "مصنوعی مخلوق" بھی فنا ہوگئی یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ یہ سارے ڈرامے نظم میں لکھے جاتے تھے یعنی مکالمے میں قافیہ پیمائی کی جاتی تھی یہ قدیم طرز کے ڈراموں کی نہایت اہم خصوصیت ہے اس کے علاوہ اس دور کے ڈرامانگاروں نے اپنے ڈراموں میں عوام کے مذاق کو بطور خاص ملحوظ رکھا جس کی وجہ سے ان میں سوقیانہ مذاق، فحش خیالات اور بھونڈی زبان داخل ہوگئی۔ مرزا ہادی رسوا لکھنوی نے اپنی کتاب "مرقعِ لیلیٰ مجنوں" میں ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھ کر ذیل کے تاثرات سپردِ قلم کئے ہیں۔

"حیران تھا کہ یہ کس شہر کی بولی ہے جو ان لوگوں کی زبان سے سنتا ہوں۔ سمجھ میں تو آتی ہے مگر اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ ایک شفیق سے معلوم ہوا کہ یہ نظم و نثر دہلی اور لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ بمبئی کے بھنڈی بازار کی بول چال ہے۔ میں نے دل میں کہا شکرِ خدا کا ان جہلات کو ہماری زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

رسوا کی رائے کی تصدیق اس دور کے تمام ڈراموں سے ہوتی ہے اس کے علاوہ قدیم ڈراموں کا ایک اور نقص یہ ہے کہ ان کے پلاٹ بیشتر غیر ملکی قصوں اور روایتوں سے گھڑے جاتے تھے اور لطف یہ کہ ڈرامانگار ان ملکوں کی معاشرت اور تہذیب تو ایک طرف ان کے محل وقوع سے بھی قطعاً ناواقف ہوتے تھے اور ملکی آداب و معاشرت کی بے محل ٹھونس ٹھانس سے ڈرامے کو مضحکہ خیز بنا دیتے تھے۔ اس کے ساتھ عشق و محبت کے فرسودہ واقعات بڑے بھونڈے طریقے سے شریک کردئے جاتے تھے جس کی وجہ سے ڈراما اثر آفریں ہونے کی بجائے تکلفات اور تصنعات کا گھروندہ بن کر رہ جاتا تھا۔ گویا بظاہر ڈراما سب کچھ تو ہوتا تھا مگر روح مفقود ہوتی تھی۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، نل دمن، ہیر رانجھا، اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس کے بعد بعض ڈرامانگاروں نے حسن و عشق سے ہٹ کر مسائلی یا موضوعی ڈرامے لکھنے کی کوشش کی جن میں دنیا کی دورنگی، آسمان کی کج روی یا کسی اصلاحی اور اخلاقی خیال کو ڈرامائی روپ میں پیش کیا گیا اس ذیل میں قابلِ ذکر ڈرامے "چلتی دنیا" "کایا پلٹ" "دورنگی دنیا" "حسن کا بازار" "پاپ کا گناہ" وغیرہ ہیں لیکن یہ سب قدیم لکیر کے پیٹنے والے تھے اور قدیم طرز کی جکڑ بندیوں سے سرِمو انحراف کرنے کو مہا پاپ اور مکروہ جانتے تھے۔ اس دور میں اردو ڈراما بندھے ٹکے اصولوں میں ہی جکڑا رہا۔ تاہم بعض ڈرامانگاروں نے زبان اور ادب کی بھی خاصی خدمت کی ہے ان میں قابلِ ذکر رونق بنارسی، حافظ محمد، عبداللہ مرزا، نظیر بیگ، احسن لکھنوی، یا درعلی اعظم اور حشر کاشمیری وغیرہ ہیں۔ حشر کاشمیری نے تو اردو ڈرامے کی اتنی خدمت کی ہے کہ وہ عوام میں ہندوستان کے شکسپیر کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن ایک بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ڈرامانگار کاروباری نقطۂ نظر سے ڈرامے لکھنے پر مجبور تھے کیونکہ ناٹک کمپنیاں انہی ڈراموں کو پیش کرتی تھیں جو عوام پسند ہوں ان سے ہٹ کر اگر بالفرض کوشش کی بھی جاتی تو ان کا چلنا غیر یقینی تھا۔ تاہم حشر نے بعض ڈراموں میں مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی کی جگہ سیدھی سادی زبان میں معاشی اور معاشرتی مسائل داخل کئے ہیں اس کے علاوہ انھوں نے شکسپیر کے کئی ڈراموں کو اُردو کے قالب میں منتقل کیا ہے

جس کی وجہ سے زندگی میں دولت کی دیوی نے ان کو گلے لگایا بلکہ شہرت کے دربار میں بھی پہنچا دیا۔

طرز جدید کے احیاء سے پہلے قدیم دور کی ناٹک کمپنیوں کا سرسری خاکہ اور ان کی خدمات کا اجمالی تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں متعدد ناٹک کمپنیاں قائم ہوئیں اور انھوں نے مختلف ڈراما نگاروں کی ذہنی فتوحات کی نمائش کی۔ ان کمپنیوں میں ایکسلسیئر، اوریجنل تھیٹریکل کمپنی، لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی، الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے علاوہ حیدرآباد دکن کے ڈرامیٹک کلب بالعموم، وال منڈی وغیرہ بھی ہیں مگر ان ناٹک کمپنیوں کے اداکار غیر تعلیم یافتہ تھے اور ان میں عورتوں کا پارٹ بازاری اور پیشہ ور عورتیں کرتی تھیں جس کی وجہ سے بہت سی سماجی برائیاں تھیٹر میں داخل ہوگئیں اور مہذب طبقے نے اس کو "برائیوں کا گھر" اور اداکاری کو ادنیٰ پیشہ قرار دیا۔ اس کے علاوہ ایک اور نقص یہ بھی تھا کہ خود مالک کمپنی ادا آموز اور بیشتر ڈراما نگار اداکاری سے قطعاً ناواقف تھے۔

ان خرابیوں اور مصائب کی وجہ سے اُردو ڈراما بالکل ابتدائی حالت ہی میں تھا۔ لیکن جب انگریزی زبان ملک میں پھیلنے لگی، اور انگریزی دانوں نے مغربی ڈراموں کا اردو ڈراموں سے موازنہ کیا تو ان کو اپنی زبان کی تہی دامنی نے ڈرامے کی اصلاح پر آمادہ کیا اور طرز جدید کے پیش رو ہوئے جن میں ذکر کے قابل مولانا ظفر علی خاں، مرزا رسوا، محمد عمر نور الٰہی وغیرہ ہیں۔ اس کی طرف توجہ کی مگر ان حضرات نے صرف زبان و بیان کی نزاکتوں کا خیال رکھا اور ڈرامے کے فنی پہلو کو نظر انداز کر دیا لیکن طرز جدید کے پیروؤں نے اس کمی کو محسوس کر کے اس کو دور کرنے کی قابل قدر کوشش کی اس دور میں بعض چوٹی کے ڈراما نگار پیدا ہوئے ان میں اشتیاق حسین قریشی، عبدالماجد دریا بادی، دتاتریہ کیفی، فضل حق قریشی، مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، امتیاز علی تاج، شاہد احمد، فضل الرحمٰن، یلدرم وغیرہ خاص طور پر ممتاز ہیں۔

ان حضرات کے بیشتر ڈرامے انگریزی اور دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں لیکن ایک خصوصیت ان میں قابل ذکر یہ ہے کہ انہوں نے غیر ملکی کردار اور معاشرت کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ اُردو کے قالب میں ان کو اجنبی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ویسے موجودہ دور ترجمے ہی کا دور ہے۔ دنیا کی زبانیں یونہی دوسری زبانوں کے سہارے سے اپنی زبانوں کو مالا مال کرتی ہیں۔ "اردو ڈراما" اب روز بروز تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

حیدرآباد میں مختلف انجمنیں ڈراموں کی خدمت کر رہی ہیں اور ان کو تعلیم یافتہ طبقے میں ڈرامے کا مذاق پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ ان میں بزم تمثیل، انجمن ترقی ڈراما اور سٹی کالج، نظام کالج، عثمانیہ کالج، اورنگ آباد کالج کی انجمنیں کافی مشہور ہیں ان انجمنوں نے کئی ایک ڈراما نگار اور اچھے اداکار پیدا کئے ہیں جن میں میر حسن، مخدوم محی الدین، اکبر وفاقانی، شرافت اللہ بیگ، ظفر الحسن اور غلام محمد خاں وغیرہ کے نام یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

علاوہ ازیں اب اُردو رسائل میں ڈرامے بہ کثرت شائع ہو رہے ہیں جو بلاشبہ ایک نیک فال ہے۔ نیز عوام کے مذاق کو بدلنے میں بولتے فلموں کا بڑا حصہ ہے اور خاص طور پر نیو تھیٹر، بمبئی ٹاکیز اور منروا مووی ٹون نے ہماری زبان اور ڈرامے کی قابل قدر کوشش کی ہے اور لاسلکی ایجاد سے اُردو ڈراما نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اب آئے دن دلچسپ ڈرامے نشرگاہوں سے نشر کئے جا رہے ہیں۔ یہ ڈرامے سامعین کی دلچسپی کے نقطۂ نظر سے لکھے جاتے ہیں اور خوشی کی بات ہے اُردو کے ادیب اس نئے میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ صاحبزادہ میکش کے نشریاتی ڈرامے ادارۂ ادبیات اُردو کی جانب سے شائع ہو چکے ہیں اور فضل حق قریشی نے بھی اپنے نشری ڈراموں کا مجموعہ پیش کیا ہے۔ بہرحال اُردو ڈرامے کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ ہم کسی دوسری صحبت میں ڈرامے کے اقسام اور اس کے افادی پہلو پر روشنی ڈالیں گے۔

میر عزیز الحق

اُردو ترجمے

جب کسی زبان کو جلد جلد ترقی کرنے اصناف کی رفتار کا ساتھ دینے کے لئے قدیم اور وسیع زبانوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُردو لکھنے اور بولنے والوں کی وسعت نظر اور بے تعصبی کی بدولت یہ راستے ہماری زبان کے لئے ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔ چنانچہ سنسکرت اور پراکرت کا دودھ اُردو نے ایک عرصہ تک پیا اور جب مغلیہ وغیرہ فارسی کو عروج ہوا تو اس کے اثرات بھی اُردو نے جی کھول کر قبول کئے۔

عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اُردو زبان میں ترجمے کے دو دور گزرے ہیں۔ ایک دور ابتدائی ہے جب کہ اولاً فارسی اور عربی کے اور بعد کو سنسکرت کے ترجمے ہوئے۔ قدیم دکنی ادب کا بیشتر حصہ اُس زمانہ کی مقبول اور مروجہ فارسی تصانیف کے ترجموں پر مشتمل ہے۔ اُردو لکھنے اور بولنے والوں کی فارسی دانی اور ترجموں کی وجہ سے جو فائدے اس زبان کو ہوئے اُن سے سب واقف ہیں۔ بے شمار الفاظ، ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کا اضافہ ہوا۔ شعر اور نثر کے نئے نئے سانچے اور اسالیب اُردو ادب کی رونق کا باعث ہوئے۔

مغربی تصانیف کے اُردو ترجموں کی ابتدا اُس وقت سے ہوئی جب کہ مختلف مغربی قوموں نے ہندوستان میں تھوڑی بہت قوت حاصل کرلی۔ اس سلسلے میں اولین قابل ذکر کوششیں عیسائی پادریوں کی ہیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً انجیل کے مختلف حصوں کے ترجمے کرائے اب تک جو مواد مل سکا ہے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ انجیل کا ترجمہ پہلی دفعہ ہندوستانی زبان میں بنجمن شولز نے ۱۷۴۵ء میں کیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار پر آنے تک اُردو یعنی ہندوستانی کو ہندوستان کی عام زبان کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں حکومت نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جہاں نوعمر انگریزوں کو ہندوستانی اور مشرقی علوم سکھانا منظور تھا۔ تعلیمی ضروریات کے تحت اُردو ادبیات کی تلاش ہوئی۔ اس کا سارا ذخیرہ شعر و شاعری پر مشتمل تھا۔ اس لئے ادبی کتابوں کی تالیف اور ترجمہ کے لئے ایک محکمہ قائم کیا گیا۔ اس سررشتہ میں اخلاقی قصوں اور بعض تاریخی کتابوں کا ترجمہ قدیم مشرقی زبانوں یعنی عربی اور سنسکرت سے کیا گیا۔ دوسرے علوم یا سائنس پر کوئی کتاب اِس عہد میں تیار نہیں ہوئی۔

شمالی ہند میں اُردو نثر کی باضابطہ ابتدا انگریزی اثر کی بنا پر ہوئی لیکن ابتداءً اس پر انگریزی زبان و ادب کا اثر کم پڑا اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے فورٹ ولیم میں کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ اُردو میں نہیں ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ دیسی لکھنے والے انگریزی نہیں جانتے تھے۔ فورٹ ولیم کے کسی اہم کام کا ذکر مغربی زبانوں سے ترجموں کے سلسلے میں کیا جاسکتا ہے تو وہ اُس انگریزی لغت کا جس کا ایک حصہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے [illegible] میں چھاپا۔ فورٹ ولیم کالج اس لغت کی اشاعت کے چار سال بعد قائم ہوا لیکن چونکہ گلکرسٹ اس کالج کی روح رواں تھے اس لئے ہم نے ان کے کام کا ذکر اس سلسلے میں کردیا۔

مرزا فطرت نے ول ہنٹر کی مدد سے ۱۸۰۵ء میں انجیل کے عہد جدید کا ترجمہ شایع کیا۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ یونانی زبان سے کیا گیا۔ ۱۸۰۹ء میں کنٹر نے اپنی لغت شایع کی اس کے بعد ۱۸۱۱ء میں کپتان ٹامس رو بک ROCK نے لغتِ جہازرانی چھپوائی جس میں جہازرانی کی اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا اُردو ترجمہ بھی درج ہے جو کمانداروں کو جنگ کے میدان اور بارکس میں کام آسکتے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ایک عرصے بعد یعنی ۱۸۴۵ء کی لکھی ہوئی ایک کتاب دستیاب ہوئی ہے جس کا نام "مجموعۂ گنج" ہے اور جو کلکتہ اسکول بک سوسائٹی پریس میں چھپی ہے (تفصیل کے لئے اکتوبر ۱۹۳۲ء کا معارف ملاحظہ فرمائیے) یہ کتاب چونکہ اولین ترجموں میں سے ہے اور کم یاب ہے اس لئے اس کی خصوصیات کے بارے میں کچھ عرض کردینا ضروری ہے۔

"مجموعۂ گنج" کی عبارت میں قدامت پائی جاتی ہے۔ جملوں کی ترکیب پر انگریزی اثر نمایاں ہے۔ بعض ایسے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جو عرصہ ہوا متروک ہو چکے ہیں۔ "نے" کے غلط استعمال اور جملہ کی ترکیب کی اجنبیت کی ایک مثال یہ جملہ ہے "کمپنی کے سوا کوئی آدمی پوست کا کھیت کرنے اور افیون مول لینے نہیں سکتا مگر کمپنی کے حکم سے!"

اُس زمانے میں اُردو ترجمے کا دوسرا اہم مرکز شہر حیدرآباد دکن تھا

حیدرآباد کے امیر کبیر نواب فخرالدین خاں شمس الامرائے ثانی
بڑے علم دوست تھے۔ نواب صاحب موصوف نے اپنے اطراف علما کا
ایک گروہ جمع کر لیا تھا جن میں سے اکثر تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا
کام کرتے تھے۔

نواب فخرالدین خاں کو ریاضیات اور علم ہیئت سے خاص
شغف تھا۔ اپنی علم دوستی اور علمی دلچسپی کی وجہ سے انہوں نے اپنے زمانے
میں بہت سے مستند اور اعلیٰ پایہ کے ترجمے اپنے سنگی چھاپہ خانے میں چھپوائے۔
نواب شمس الامرا کی کتابوں کی زبان سادہ سلیس اور
عام فہم ہے۔ اُن کے مترجموں کو اپنے موضوعوں پر پورا پورا عبور
حاصل تھا۔ ستۂ شمسیہ اس مرکز کی بہترین یادگار ہے۔

اس دور میں اُردو ترجموں کا تیسرا اور آخری مرکز لکھنؤ تھا۔
شاہان اودھ نے لکھنؤ میں جدید مغربی علوم و فنون کی بعض کتابوں
کے ترجمے کرائے جو مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئے۔
سید کمال الدین حیدر لکھنوی نے جدید علوم پر انتیس (۲۹) رسالوں کا ترجمہ
انگریزی سے اردو میں کیا جو کیمیا، برق، مقناطیس، طبیعیات،
ہیئت، علم المناظر، علم آب، علم ہوا، علم حرارت وغیرہ سے متعلق ہیں۔
کن کے مقابلے میں شمالی ہند کے ترجموں کی زبان پر
عربیت حاوی نظر آتی ہے۔

ترجموں کے ابتدائی دور میں یعنی ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۲ء
تک جو اجتماعی کوششیں ہوئیں ان کا ذکر ہو چکا۔ انفرادی کوششوں
میں یہ کتابیں قابلِ ذکر ہیں:—

ایلیمنٹس آف جنرل ہسٹری کا ترجمہ ۱۸۲۹ء
تاریخ انگلینڈ " " ۱۸۳۰ء
تاریخ روم " " ۱۸۳۱ء
تاریخ ملک چین " " ۱۸۳۱ء
بنیان کی پلگرمس پروگرس " " ۱۸۳۸ء
جانسن کا رسیلس مترجمہ سید محمد میر ۱۸۲۵ء

اس کے علاوہ "داؤد کی زبور" "گے کے فیبلز"
اور "خلاصۂ علم الارض" ان تین کتابوں کا تعلق بھی
اسی دور سے ہے۔

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم کا دوسرا دور ۱۸۴۲ء
میں شروع ہوا۔ اس دور کا پہلا اہم مرکز دہلی کالج تھا۔ پچھلے دور میں
جن مرکزوں کا ذکر کیا گیا ان کی کوششیں اس قدر وسیع پیمانے پر
اور اس درجہ منظم نہیں تھیں جتنی کہ دہلی کالج کی تھیں۔ اس کلیہ
کے ارباب نے ترجمہ کی مشکلات کو حل کرنے کی غرض سے بعض مفید
اصول پہلی دفعہ مرتب کئے۔ اور نصابی ضرورتوں کے پورا
کرنے کے لئے مختلف علوم اور سائنس کی اعلیٰ قسم کی کتابیں اُردو
میں منتقل کیں۔ اس سے پہلے صرف ابتدائی کتابوں کے
ترجمے شائع ہوئے تھے۔ ترجمہ کے بارے میں جو اصول
بنائے گئے تھے ان میں سے بعض یہ ہیں۔

مترادف لفظ اُردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے۔
اُردو لفظ ملے تو وہی استعمال کیا جائے۔

سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی ہی سے کیا جائے گا
اس لئے انگریزی لفظ کا اُردو میں استعمال ناگزیر ہے۔

انگریزی جملے میں اگر کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہو
جس سے اہلِ ہند ناواقف ہوں تو مترجم کو چاہئے کہ
حاشیہ یا متن میں مختصر طور پر اس کی تشریح کر دے۔

ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اُردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش
کی جائے۔ دہلی کالج سے خدا جانے کُل کتنی کتابیں شائع
ہوئیں۔ اس وقت تک ان میں سے صرف (۳۰) کا پتہ چلا ہے۔
اس کے علاوہ چھ ایسی کتابوں کے نام معلوم ہوئے ہیں جو
زیرِ ترجمہ تھیں۔

دہلی کالج کے ترجمے ان علوم سے متعلق ہیں۔ تاریخ انگلستان، الجبرا، علم ہیئت، کیمیا، قانون مال، مخروطیات، میکانیات طبعی جغرافیہ، مساحت، طبیعیات، صرف و نحو انگریزی، مقناطیس جراحی، حرکیات اور سکونیات، سکون سیالات، علم المناظر، حرارت، علم آب، برق، ریاضی، طب، فلسفہ، نباتیات، حفظان صحت، عضویات، معدنیات۔

انیسویں صدی میں اُردو ترجمہ کا آخری ادارہ سائنٹیفک سوسائٹی تھی۔ جب سرسید کو یقین ہوگیا کہ جس وقت تک ملک میں جدید علوم کی اشاعت نہ ہو اُس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں فضول ہیں تو انہوں نے اُردو میں مغربی تصانیف اور علوم کا ترجمہ کرانے کی غرض سے ایک انجمن قائم کی۔ سرسید نے ترجمہ کے کام کو انگریزی زبان کی اشاعت سے زیادہ ضروری سمجھا اس لئے کہ ہندوستان کی آبادی کے ایک حصے کو اس سے نفرت تھی تو دوسرا حصہ اس کو صرف ملازمت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ ان دونوں کے دلوں پر انگریزی تعلیم کا نقش بٹھانے کے لئے کچھ کتابوں کو اُردو میں منتقل کرنا ضروری تھا۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ اس سوسائٹی کا اصلی مقصد انگریزوں اور ہندوستانیوں میں میل جول پیدا کرنا تھا۔

سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام کا اعلان سرسید نے ۱۸۶۴ء میں کیا۔ کچھ ہی عرصے میں ارکان کی تعداد کثیر ہوگئی۔ غازی پور میں ترجمہ کا کام باضابطہ طور پر شروع کردیا گیا۔ بعد میں سوسائٹی علی گڑھ میں منتقل ہوگئی تو وہاں سرسید نے اس کے لئے تیس ہزار روپے کے صرفہ سے ایک عمارت تیار کروائی۔ تقریباً پانسو روپے کے تنخواہ دار مترجمین اور دوسرے ملازمین سوسائٹی کے کام پر متعین کئے گئے تھے۔ اس زمانہ کے انگریزی جراید میں جو اعلیٰ پایہ کے مضامین چھپتے تھے ان کے ترجمے سوسائٹی کے رسالے "انسٹیٹیوٹ گزٹ" میں شائع کئے جاتے تھے۔ اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں اُردو میں ترجمہ کرائیں۔ اس کی توجہ زیادہ تر تاریخ، سوانح، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات تک محدود رہی۔

یوں تو سوسائٹی کے تمام ترجمے کامیاب کہے جاسکتے ہیں لیکن خاص طور پر معاشی اصطلاحات کے ترجموں میں بڑے سلیقے سے کام لیا گیا۔ اسی وجہ سے ان میں بعضوں نے یا تو اپنی اصلی حالت میں یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اُردو زبان میں مستقل جگہ حاصل کرلی۔

سائنٹیفک سوسائٹی کی مطبوعات بالعموم عام فہم ہیں اور ان میں ترجمہ پن کم پایا جاتا ہے۔ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۷۰ء تک انفرادی کوششیں بھی زیادہ تر تاریخ اور سوانح تک محدود رہیں۔ علمی کتابوں کے ترجمے بہت کم شائع ہوئے۔

(DEFOE) ڈفو کی رابنسن کروسو کا ترجمہ "بزرگ رابنسن کروسو" کے نام سے اور پادری ویکفیلڈ" کے نام سے ویکار آف ویکفیلڈ کا ترجمہ بھی اسی دور میں چھپا۔

یہ تھا ۱۸۰۰ء سے ۱۸۷۰ء تک کے اُردو ترجموں کا نہایت اجمالی ذکر۔

اس کے بعد کی تاریخ ترجموں کی نوعیت اور وسعت دونوں کے لحاظ سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔

میر حسن

اطلاع:۔ رسالہ نہ ملنے کی اطلاع ہر انگریزی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک دفتر کو کردی جائے۔ مہینہ ختم ہونے پر رسالے بھی ختم ہوجاتے ہیں نئے سال کا چندہ تقسیم کنندہ سے باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل کرکے عنایت فرمائیے۔

اُردو ادب اور ہندو سماج

علم لسان کے ایک پروفیسر مسٹر فیڈش کا قول ہے کہ غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنی پڑتی ہے محفوظ نہیں رہتی بلکہ اس کی اپنی زبان کے اثر سے متاثر ہو جاتی ہے بالکل یہی صورت مسلمانوں کی آمد کے بعد اس ملک میں پیش آئی۔ ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملے دھواں دھار بادل یکلخت اُٹھ آندھیوں کی طرح تھے اور اگرچہ پنجاب پر آل غزنوی تقریباً پونے دو سو سال تک حکومت کرتے رہے لیکن باوجود اس امر کے کہ اس طویل عرصے میں اجنبیوں اور ملکیوں کے باہمی تبادلۂ خیالات کی بدولت ایک نئی زبان کا تشکیل پا جانا ممکن تھا چونکہ یہ زمانہ امن چین کا نہ تھا کوئی نئی زبان وجود میں نہ آسکی اور اسی لئے جب تک حضرت مسعود سعد سلمان کا ہندی دیوان دستیاب نہ ہو جائے اس نظریے کی مقبولیت میں فرق نہیں آسکتا کہ شہاب الدین محمد غوری کے ہندوستان میں قدم جمانے کے بعد ہندی نوواردوں کی فارسی سے مخلوط ہو کر ایک نئی زبان بن گئی یعنی ترکوں اور مغلوں نے عربی، ترکی اور عجمی الفاظ کے جو دانے گنگا جمنا کی زرخیز وادی میں بکھیرے انہیں اس خطہ کی زبان کھڑی بولی نے اپنے وسیع اور کشادہ دامن میں جگہ دی اور یہ ہندی میں فارسی مخلوط کرنے والے خود اہلِ ہند تھے چنانچہ حصول علم، ضروریات زندگی اور مہذب اور شائستہ سمجھے جانے کے خیال سے ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی اور جب متواتر مطالعہ کی بدولت خود استاد ہو گئے تو انہوں نے ایسے فارسی الفاظ سے جن کے ہم معنی یہاں موجود تھے ملکی زبان کو مالامال کرنا شروع کر دیا اور یہ بالکل صحیح طریقۂ عمل تھا لیکن احساس کمتری سے یا اظہار فضیلت و مشیخت کی خاطر جب غیر زبان کے الفاظ کا استعمال فیشن میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اس کی روک تھام مشکل ہو جاتی ہے اور ایسے متعدد الفاظ جن کے ہم معنی اپنی زبان میں دستیاب ہو سکتے ہیں یا جن کا مفہوم ذرا سے الٹ پھیر کے بعد بآسانی ادا کیا جا سکتا ہے، زبان میں جگہ پا لیتے ہیں جو نامناسب ہے مگر فارسی اور ہندی کے اسی نامناسب اختلاط کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نہ صرف کھڑی بولی میں مترادفات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا بلکہ ہندی الفاظ کی دل نشینی، دراثر اور فارسی اور عربی الفاظ کی شان و شوکت نے حکمران قوم کو بھی اس کی طرف بیش از بیش متوجہ کرنا شروع کر دیا اب اس نے سینوں سے نکل کر سفینوں میں جگہ پائی اور اس نیک کام میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے یعنی جس طرح ہندوؤں نے فارسی میں دستگاہ کامل حاصل کی تھی اسی طرح اردو میں بھی خاص ملکہ بہم پہنچایا اور اسی لئے سر سپرو کے ان الفاظ کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "اردو زبان ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو ناقابلِ تقسیم ہے۔"

غرض کہ یہ خیال کہ ہندوؤں کو اُردو سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے، جیسا کہ احاطۂ مدراس اور بمبئی کے بعض مقامات میں عوام کے اسے مسلمانی کے نام موسوم کرنے سے ظاہر ہوتا ہے غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اُردو زبان اسی ملک میں بنی اور اسی ملک والوں نے جن میں ہندو شریک غالب تھے اس کے بنانے کا کام انجام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو علم و ادب کے ہر شعبے میں اس کے روز ابتدا سے ہندو اور مسلمان دونوں دوش بدوش کام کرتے نظر آتے ہیں چنانچہ اسی وقت سے جب دکھنی نے شمال میں پہنچ کر دلی والوں کو اپنی زبان کی طرف متوجہ کیا اور وہ خان آرزو، شاہ حاتم اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے ہاتھوں پروان چڑھنے لگی۔ چند ہندو شعرا مثلاً ٹیک چند بہار جو خان آرزو سے مشورۂ سخن کرتے تھے رام نرائن موزوں آبادی جو حضرت شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے اور سیتارام عمدہ اور شیو سنگھ ظہور نے جنہیں انعام اللہ یقین سے شرف تلمذ حاصل تھا اُردو کے چمنستان سخن کی آبیاری کی طرف توجہ مبذول کی اور جب مرکز شاعری دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا تو گلشن چند محروح

شاگرد مرزا مظہر، رام جس مغموم اور موتی لال جیت اور صاحب رائے فریاد شاگردان میر سوز نے آتش سخن سے لوگوں کے دلوں کو گرما شروع کر دیا۔ اس زمانے میں سرب سکھ دیوانہ ایک نہایت پرگو اور بڑا شاعر گزرا ہے چنانچہ علی ابراہیم خان خلیل اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ فارسی میں بھی اس کے دو دیوان تھے اور لکھنؤ کے مرزا جعفر علی حسرت اور میر حیدر علی حیدر اس کے شاگردوں میں سے ہیں اس کے بعد بھی لال طرب اور موجی رام موجی شاگردان مصحفی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ پھر نسیم لکھنوی کا زمانہ آتا ہے جنھوں نے گلستان نظم کو بڑی تر و تازگی بخشی۔ ان کی مثنوی گلزار نسیم کا شہرہ آج ہندوستان بھر میں ہے چنانچہ پنڈت چکبست لکھنوی دیباچۂ گلزار نسیم میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے چرچے تھے لہٰذا خود بھی اس کوچے میں قدم رکھا اور چونکہ یہ مثنوی گلہائے مضامین سے پُر تھی اس لئے نام گلزار نسیم تجویز کیا۔ واقعی اس گلزار کا کیا کہنا ع سینچا تھا جس کو خون جگر سے وہ باغ تھا۔ ابھی تک مثنوی کے رنگ میں یکتائی کا سہرا میر حسن کے سر تھا، اب گلزار نسیم کے پھولوں کی مہک عوام کے دماغوں میں بس گئی جواہر سخن کے پرکھنے والے جان گئے کہ مثنوی کیا کہی ہے موتی پرو دئے ہیں۔ نسیم کو بھی شہرت علم کا خلعت نصیب ہوا اور بقائے دوام کے دربار میں میر حسن کے برابر کرسی ملی۔ اس کے بعد بشمبھر ناتھ صابر اور دیا شنکر نگار وغیرہ ہم نے سخن دانی کا مذاق قائم رکھا اور جب انگریزی ادب کے اثر کے تحت اردو نے کروٹ بدلی اور جدید رنگ کی شاعری کا آغاز ہوا تو بھی ہندو اپنے حصے کی خدمت کی طرف سے غافل نہیں رہے بلکہ جوالا پرشاد برق، نوبت رائے نظر، درگا سہائے سرور، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی، سورج نرائن مہر اور برج نرائن چکبست نے اس میدان میں بھی اشہب قلم کو اس طرح جولاں کیا ہے کہ ہر شخص کو ان کے کمال فن کی داد دینی پڑتی ہے چنانچہ برق کی مثنوی صبح بہار کے سر سید مرحوم بے حد دلدادہ تھے۔ نظر کے متعلق مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں کہ لکھنؤ کا گلشن شاعری اس بلبل خوش الحان کے اٹھ جانے سے سونا ہو گیا اور سرور کی نسبت تو یہ کہنا بجا ہے کہ انہیں فنا فی الشعر کا درجہ حاصل تھا ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت وطنیت، جذبات نگاری اور درد و اثر کا امتزاج ہے۔ کیفی، حضرت آزاد اور مولانا حالی کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں اور نیچرل شاعری میں آپ نے ایک جدت یہ داخل کی ہے کہ خشک موضوع میں رنگین بیانی کی چاشنی ملا دیتے ہیں۔ بہر حال آپ کے رشحات قلم آپ کے ایک پختہ مغز اور کہنہ مشق شاعر ہونے کا کافی ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ مہر گیتا اور رامائن کا منظوم ترجمہ کرنے کی وجہ سے مشہور ہیں اور پنڈت چکبست ایک قومی شاعر تھے ان کے کلام میں ہمیں حب الوطنی، درس عمل اور آزادی کے نغمے سنائی دیتے ہیں اور قدم قدم پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر غلامی کا داغ مٹانے کے لئے بے تاب ہے۔

مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ موجودہ زمانے کے اور متعدد شاعر مثلاً تلوک چند محروم، جگت موہن لال رواں، گم نام سکندر آبادی اور برق دہلوی وغیرہ کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن بخوف طوالت ان کا ذکر حذف کیا جاتا ہے اور اب ہم ہندو نثر نگاروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کیونکہ اس میدان میں بھی ہندوؤں کی خدمات کچھ کم قابل قدر نہیں ہیں چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جس نے اردو نثر نگاری کی بڑی ہمت افزائی کی۔ امن، افسوس، طپش اور حیدری وغیرہ نے جب اپنی تصانیف سے اردو کو مالا مال کیا تو بینی نرائن جہاں اور ہنال چند لاہوری نے بھی چار گلشن اور مذہب عشق لکھ کر اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اس کے بعد اردو کی ترقی کی دوسری تحریک دلّی میں نمودار ہوئی جہاں دہلی کالج سے متعلق ایک مجلس ترجمہ قائم تھی۔ یہ مجلس کالج کے طلبہ کے لئے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی اور اس مجلس کے لئے پروفیسر رام چندر نے جو بعد میں عیسائی ہو گئے تھے تذکرۃ الکاملین، اصول علم

ہیئت اور مکاتیب ہند گار نامی چند کتابیں لکھیں۔ اس کے بعد آزاد، حالی، نذیر احمد اور ذکاء اللہ کا زمانہ آتا ہے اور ماسٹر پیارے لال آشوب اس عہد میں ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن اس زمانے سے کچھ عرصہ پیشتر افق نثر اردو پر ایک ایسا روشن ستارہ طلوع ہو چکا تھا جس کی ضیاء قیامت تک دلدادگان اردو کے دلوں کو گرمی پہنچاتی رہے گی۔ یہ ستارہ پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کی ذات بابرکات تھی جنہوں نے ادبیات نثر اردو میں نئی روشنی نکالیں۔ سرشار کی تصانیف میں فسانۂ آزاد، سیر کہسار، جام سرشار، کامنی اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں۔ لیکن اول الذکر کتاب ان کا شاہکار ہے۔ انہوں نے کچھ عرصے تک دبدبۂ آصفیہ کی ادارت کا کام بھی کیا تھا نیز تین انگریزی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا جن میں سے ایک کا نام "شمس الضحیٰ" ہے۔ سرشار حقیقی معنوں میں آزاد مزاج اور ایک خوش فکر شاعر تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک زبردست جرنلسٹ ایک مشہور مصنف، اردو کے تمام محاورات والی ظریف اور بذلہ سنج اور ایک خاص طرز کے موجد بھی تھے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اردو ناول کو انگریزی طرز پر لکھنے کا فخر انہیں کو حاصل ہے اور ان ہی کے طرز نگارش کی ان کے بعد منشی جوالا پرشاد برق نے ایک حد تک تقلید کرتے ہوئے نہ صرف اکثر بنگالی ناولوں کے ترجمے اسی طرز میں کر ڈالے بلکہ شکسپیر کے بعض ڈراموں کا بھی ترجمہ کیا کیونکہ ہندوستان میں اس زمانے میں ڈراموں کی مانگ بڑھ رہی تھی اور ہندوؤں میں صرف طالب بنارسی اور بیتاب دہلوی اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے رہے تھے۔ لیکن بیتاب ڈراما نویسی میں برق سے آگے ہی رہے اور اگرچہ ان کی زبان میں ہندی اور سنسکرت الفاظ فارسی اور عربی الفاظ کے پہلو بہ پہلو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں اور کانوں پر بھی گراں گزرتے ہیں لیکن انہیں ڈراما نویسی کے فن میں مہارت حاصل ہے۔ بیتاب کے بعد اردو کا تنازعہ بڑھتا جا رہا ہے۔ بعض سنجیدہ پڑھے لکھے ہندو اردو علم و ادب کی خدمت میں منہمک نظر آتے ہیں چنانچہ پریم چند، کیفی، منوہر لال زتشی اور دیا نرائن نگم اور سدرشن کے نام بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے ہے یہ میدان قصہ گوئی کے مشہور شہسوار ہیں اور ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی دیہاتوں کے ہو بہو نقشے اور یہاں کے کسانوں کے من و عن واقعات نہایت عمدہ طریقے سے اپنے ناولوں میں بیان کئے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ انسانی جذبات اور نفسیات کے پورے ماہر ہیں اور چونکہ عبارت میں آمد اور زور ہوتا ہے اور مبالغہ کو یہ پاس نہیں آنے دیتے اس لئے تحریر تاثیر کا طلسم بن جاتی ہے۔ پریم چند کو افسانہ نگاری کے فن میں بھی کمال حاصل ہے چنانچہ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو کر قبولیت عام کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔ کیفی فارسی اور انگریزی کے فاضل اجل، ہندی کے پورے ماہر اور قدرے عربی اور سنسکرت سے بھی واقف ہیں۔ اردوئے معلی آپ کی مادری زبان ہے اور آپ کی ذات میں اسلامی تہذیب اور قدیم ہندو مسلم مودت کے نمایاں آثار نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ ایک اچھے نقاد اور پہلے شخص ہیں جس نے اردو میں ڈرامے کے موضوع پر مضمون لکھا۔ آج کل آپ کے مضامین کا مجموعہ طبع ہو گیا ہے اور نثر میں عورت اور اس کی تعلیم، چراغ ہدایت، ابتداء اور پریم دیوی اور ڈراموں میں راج دلاری اور مرادی داد آپ کی تصانیف سے ہیں۔ پنڈت منوہر لال زتشی ایک اچھے ادیب اور بلند پایہ نقاد ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم اپنے موقر رسالے "زمانہ" کی وجہ سے مشہور ہیں جس کا اجرا ۱۹۰۳ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس رسالے میں جو مضامین خود ان کے قلم سے نکلتے ہیں وہ نہایت بچے تلے اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں۔ مہاشے سدرشن پنجاب کے ایک مشہور افسانہ نگار ہیں لیکن آپ میں وہ استادی اور فنی کمال موجود نہیں جو خاص پریم چند کا حصہ ہے البتہ ان کی چند خصوصیات کم تر درجے میں ضرور موجود ہیں۔

اب تک میں نے ان چند ہندو بزرگوں کے نام لئے ہیں جنہوں نے اپنی دماغی کاوشوں سے اردو علم و ادب کے دامن کو وسیع کرنے کی امکانی کوششیں کی ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ ان چند باثروت ہندو اصحاب کا ذکر بھی ضروری ہے جنھوں نے شعرا اور ادیبوں کی سرپرستی فرما کر اردو کی بالواسطہ خدمت انجام دی تھی چنانچہ مہاراجہ شتاب رائے عظیم آبادی اس سلسلے کی پہلی کڑی ہیں انھوں نے حضرت اشرف علی فغاں کے پٹنہ آنے پر ان کی بڑی خاطر مدارات کی اور ان کے بیٹے نے جو راجہ تخلص کرتے تھے میر ضیاء الدین ضیا کی سرپرستی فرمائی۔ اقلیم سخن کے بادشاہ میر تقی میر کی مہاراجہ ناگرمل اور

راجہ سورج مل نے بھی دل دستگیری کی۔ اودھ کے مہاراجہ شیو دھان سنگھ نے تصویر اور تشنہ شاگردان ذوق اور مجروح اور سالک شاگردان غالب کی جو قدر کی اور مملکت حیدرآباد کے مشہور وزیر مہاراجہ چندو لال شاداں اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد نے مختلف ادیبوں اور شاعروں کی اعانت میں جو دلچسپی دکھائی وہ ہمیشہ قیامت تک ان کی اردو دوستی کی شاہد رہے گی۔

غرض کہ ان تمام باتوں سے ہندوؤں کی اردو دوستی مسلم ہے لیکن افسوس ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل وعقد نے اپنے ہندو منشیوں کو اردو کو ہندی رسم الخط میں لکھنے کا حکم دے کر ایک بڑا زہریلا بیج بویا اور غدر کے بعد راجہ شیو پرشاد اور بھارتیندو ہریش چندر ہندی کے فروغ کی تحریک سے اپنے دامن کو وابستہ کرکے اردو کے درپئے آزار ہوگئے اگرچہ لطف کی بات یہ ہے کہ اول الذکر ایک اردو کتاب کے مصنف اور ثانی الذکر اردو کے اچھے شاعر تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ غدر کے بعد ہندوؤں میں انگریزی کے انصاف پسندی کے اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبے کی تخلیق کی اور میکس مولر اور اینی بسنٹ کی تحریروں نے جن میں انہیں ان کے شاندار ماضی کی یاد دلائی جاتی تھی اس جذبے کو اور ابھار دیا۔ دیانند سرسوتی وہ شخص تھا جس نے مقدس قدامت کا واسطہ دے کر اسے بالکل مستحکم کردیا۔ اب ہندو سماج کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو کو جسے وہ غلطی سے مسلمانوں کی زبان سمجھ بیٹھے تھے بالکل مٹا دیا جائے چنانچہ سب سے پہلے اس تحریک کا بیج بہار میں بویا گیا مگر اس کے پھل یو۔ پی میں پھوٹے اور اگرچہ سرسید نے اس کی مخالفت کی لیکن لفٹنٹ گورنر سر میکڈانلڈ کی کوششوں سے آخر ہندی سرکاری زبان قرار دے دی گئی اور اس کے بعد ہندوؤں کی مذہبی تحریکات شدھی اور سنگھٹن نے جن کا مقصد ہندوؤں کی تنظیم اور تقویت اور ہندو مذہب کی تبلیغ تھا ہندی کی تحریک کو اور آگے بڑھایا۔ ایک زمانہ تھا کہ نظیر اکبرآبادی نے ہولی، بسنت اور دیوالی پر نظمیں لکھی تھیں اور ہندو شعراء اپنے رسم و رواج اور تہوارات اور معتقدات کو تو خیر نظم کرتے ہی جیسا کہ ان کی سماجی نظموں اور طالب اور بیتاب کے ڈراموں سے ظاہر ہے لیکن انہوں نے نعتیہ نظمیں بھی لکھ کر باہمی رواداری کی مثال قائم کی تھی۔ مگر اب یہ حالت ہوگئی کہ ہندی ادیب عربی فارسی الفاظ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر خارج کرنے اور ان کی جگہ سنسکرت کے تت سم یعنی اصلی الفاظ کو دینے لگے اور جب اس جھگڑے نے زور پکڑا تو آخرکار انڈین نیشنل کانگریس نے یہ قرارداد منظور کی کہ ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہوگی جس سے شمالی ہند کے عوام کی بول چال کی زبان مراد تھی لیکن بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے ناگپور کے اجلاس کے موقع پر گاندھی جی نے اسے ہندی ہندوستانی بنا دیا اور ان کے بعد یہ ہندی یا ہندوستانی کی شکل بدل کر آخرکار خالی ہندی رہ گئی ہے جیسا کہ رسالۂ ہنس کی تحریروں سے جو ہندی ساہتیہ سمیلن کا پرچہ ہے اور مختلف کانگریسی لیڈروں کی تقریروں سے ظاہر ہے لیکن یہاں ایک یہ امر قابل غور ہے کہ فی زمانہ ہندی میں بھی ادب کافی مقدار میں موجود ہے اور اب ہندی اور اردو بالکل مختلف زبانیں بن چکی ہیں جس کی وجہ سے رستم اور بھیم جیسے پہلوان بھی اب انھیں ایک دوسرے کے قریب لانے میں ناکامیاب رہیں گے البتہ ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ باہمت اشخاص کا جن کے دلوں میں کچھ قومی درد موجود ہے، یہ کام ہونا چاہئے کہ وہ دونوں زبانوں کے الفاظ کا جائزہ لے کر ایسے الفاظ معلوم کریں جنھیں ان دونوں کا مشترک سرمایہ قرار دیا جاسکے تاکہ اس بنیاد پر ایک نئی قومی زبان تعمیر کی جائے۔

بلبیر پرشاد بھٹناگر

اُردو اور ظرافت

ظرافت صحت مند زندگی کی علامت ہے اس لئے کوئی ادب ظرافت نگاری سے خالی نہیں ہوتا ۔ مغرب کی متمدن زندگی میں سنجیدہ ظرافت کا ایک خاص مقام ہے اس لئے ان کے ادب میں نہ صرف ظرافت نگاری کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے بلکہ اصولوں اور ضابطوں کے ذریعے مذاق سلیم کے پیمانے بھی قائم کر دئے گئے ہیں ۔ اردو ادب میں بحیثیت مجموعی مزاحیہ ادب بہت کم ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظرافت کا قدیم اسلوب ہمارے جدید معیار پر پورا نہیں اترتا ۔ اس کے علاوہ ایک زمانے تک ناسازگار ماحول نے ہمارے ادیبوں پر قنوطیت کا رنگ غالب کر دیا تھا ۔ یاس انگیزی اور غمگینی ان کے آرٹ کے بنیادی عناصر بن گئے تھے ۔ اُردو کے بعض قدیم قصوں میں قدیم انداز کی ظرافت ملتی ہے ۔ داستان امیر حمزہ، قصۂ حاتم طائی فسانۂ عجائب، قصہ چہار درویش وغیرہ میں ۔ کہیں کہیں ہنسانے کی کوشش کی گئی ہے ۔

ادب اُردو کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ظرافت کے ایک مخصوص طرز کو ریختی کے ذریعے سب سے پہلے پیش کیا گیا ۔ یہ کہنا مشکل ہے ریختی کو ظرافت کہا جا سکتا ہے یا نہیں بہرحال یہ شاعری ایک غیر فطری آواز ہوتی تھی ۔ شاعر اپنے آپ کو عورت سمجھ کر الٹی گنگا بہاتا تھا ۔ ممکن ہے اس دیوانے پن پر اس وقت کا معیار پسند ہنس دیتا ہو ۔ ظرافت کی ایک قسم ہمیں قدیم زمانے میں زٹل کے نام سے ملتی ہے جس کے لئے جعفر زٹلی کا نام اب تک مشہور ہے ۔ جعفر زٹلی ایک پیشہ ور شاعر تھا جس نے اپنی اس قسم کی شاعری کو ذریعۂ روزگار بنا لیا تھا ۔ ظرافت کی ایک اور شکل اس زمانے میں ایہام گوئی تھی ۔ یہ ایک لفظی صنعت تھی جس میں ذومعنی الفاظ استعمال کئے جاتے تھے ؎ اب دین ہوا زمانہ سازی آفاق تمام دھر با ہے

شاہ حاتم سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں ظرافت کی حقیقی روح کو پیش کرنے کی کوشش کی' ریختی' زٹل اور ایہام گوئی سے ہٹ کر انھوں نے ظریفانہ رنگ میں شعر کہے لیکن ظرافت کے حقیقی مقام کے تعاقب میں وہ بہت پیچھے رہ گئے اور ؎ حق میں عاشق کے تجھ سیاں کا بچن قند ہے' خشکر ہے' شکر ہے جیسے اشعار ان کی بیاض میں ملتے ہیں ۔

سوداؔ کا نام قدیم ظرافت نگاروں میں سرفہرست لکھا جا سکتا ہے لیکن سوداؔ کی ظرافت کی بنیاد "ہجو" تھی ۔ ہجو سے ہٹ کر ظرافت میں ان کا کوئی مقام نہیں ۔ ان کے ہجویہ کلام کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی ہر نظم کو قبولیت عامہ کی سند مل جاتی تھی ۔ سوداؔ کے اس رنگ نے مُدّو پر اپنا دیرپا اثر ڈالا اور ہجو اردو شاعری میں ایک مستقل ظریفانہ صنف کے طور پر داخل ہو گئی ۔ لیکن جہاں تک ان کی ہجویہ نظموں کا تعلق ہے، ان کو شخصیات کی تلخی نے بے مزا بنا دیا ہے ۔ وہ فتح کے غرور میں اس قدر پست ہو جاتے ہیں کہ ان کو اپنا شاعرانہ مقام بھی یاد نہیں رہتا ۔ بہرحال شخصیات کے داخلی اور تنگ دائرے میں بھی جب ان کی نگاہیں خارجی ماحول پر پڑتی ہیں تو ان کی شوخی اپنے لئے فطری ماحول پا کر خوب چمکتی ہے ۔ اپنے مشہور گھوڑے کی رفتار کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگائیے ؎

پیچھے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں   یا بادبان باندھ، پون کے دو اختیار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا' تجھ سے کیا گناہ   کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

میرؔ قنوطیت کا امام ہے ۔ اس کے ہر شعر میں حزن ملال کروٹیں لیتا دکھائی دیتا ہے لیکن آنسوؤں کی اس برسات میں کبھی کبھی وہ قہقہے کی بجلی بھی چمکا دیتا تھا ۔ مرغ بازوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں ؎ آدمی جو بڑے کہاتے ہیں مرغ مارے بغل میں آتے ہیں
ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے   ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے   مرغ کی ایک پرفشانی ہے   ان کی صدر رنگ بد زبانی ہے

ظرافت کی یہ بنیادیں اگرچہ بہتر مستقبل کی ضمانت نہیں تاہم ان سے اصلاح اور نشوونما کی ایک توقع ضرور تھی لیکن لکھنؤ کے ماحول نے اسے اس کے برعکس کردیا۔ ابتذال اور پھوہڑپن کی گرم بازاری ہوگئی۔ ممکن ہے یہ اس معاشرت کا نتیجہ ہو جس سے اُردو ادب گزر رہا تھا۔ شاعرانہ نوک جھونک، شخصی مخالفت، خودبینی، ان سب عیبوں نے دماغی توازن کو بگاڑ دیا اور ظرافت سے سنجیدگی کا عنصر بالکل غائب ہوگیا، جرأت، مصحفی، انشا اور رنگین یہ سب باہمی نقلی پیکار میں الجھ گئے، اور زندگی اور ادب کی بجائے ان پر ذاتیات کا رنگ چڑھ گیا۔ جرأت ظریف بھی تھے اور ستم ظریف بھی۔ اندھے بن کر انہوں نے جو کچھ کیا وہ سب کو معلوم ہے لیکن ان کی ظرافت اور ستم ظریفی، دونوں کا تعلق محض ان کی داخلی زندگی سے ہے۔ ادب میں انہوں نے اس کے کوئی دیرپا نقوش نہیں چھوڑے۔ انشا کی ظرافت اور ان کی زندگی کا انجام ایک افسانے کے رنگ میں اُردو ادب کے ہر متعلم کو معلوم ہے۔ لیکن ان کی ظرافت بھی ان کی ادبی تخلیق سے زیادہ ان کی زندگی کے واقعات اور لطیفوں میں ہے۔ جہاں انہوں نے ظرافت کے رنگ میں شعر کی طرف رخ کیا ہے وہاں وہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔

اُردو ادب کی ابتداء سے لے کر اس دور تک ظرافت سے منہ چڑانے کا کام لیا گیا یا پھر اس کے ذریعے دل کی بھڑاس نکالی گئی، زندہ دلی کا اجتماعی تصور، اس انفرادی تسکین کے مقابلے میں نشوونما نہ پاسکا۔ لیکن بہت جلد ہمیں نظیر اکبرآبادی کا نام ملتا ہے جس نے ادب سے ذاتی تسکین کے مقصد کو خارج کرنے کی کوشش کی اور سماجی ضمیر کے بیدار کرنے کے لئے اردو میں عوامی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ ایک حقیقی ماحول سے جہاں زندگی اپنے اصلی روپ میں بے نقاب ہوتی ہے زندہ دلی کو خارج نہیں کیا جاسکتا ؎

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیہہ سے ۔۔۔۔ یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کا ہے کے

وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے ۔۔۔۔ ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے

بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

ظرافت کی یہی سنجیدگی ہے جو دلوں کو گدگداتی ہے۔ اس کے بعد غالب کو آپ حالی کے لفظوں میں "حیوان ظریف" کہیئے تو کہہ لیجئے لیکن ان کی ظرافت بھی، ایک سنجیدگی سے کم نہیں معلوم ہوتی اس لئے اس کو ظرافت نگاروں کی صف میں کھڑا کرنا ستم ظریفی ہوگا۔

اس کے بعد تک ہمیں کوئی ایسا مزاحیہ نقش نہیں ملتا جس پر نگاہیں رک سکیں تاآنکہ [illegible] کے ہنگامے نے زندگی کی طرح ادب میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ ادب کی دوسری صنفوں کی طرح ظرافت اور مزاح کا رنگ بھی نئے سانچوں میں ڈھلنے لگا۔ قدیم انداز ظرافت کے برخلاف اب یہ سمجھا جانے لگا کہ ظرافت، زندگی کی ایک طنزیہ تنقید ہوتی ہے۔ ظرافت نگار یا مزاحیہ نگار کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ سرکس کے مسخرے کی طرح قلابازی لگائے یا کمزور عورت کی طرح دشمن کے سامنے ناچنے لگے بلکہ وہ منہ بگاڑے بغیر ایک ایسا منتر پڑھتا ہے جس کے اثر کو غیر شعوری طور پر انسانی ذوق قبول کرلے۔ ادبی ظرافت کا مقصد ذاتی طمانیت یا تماشاگری نہیں بلکہ وہ زندگی اور سماج کی کمزوری تک رسائی اور اس پر ایک خوش گوار تنقید کا نام ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ اب مزاح اور ظرافت کا مفہوم طنز لطیف ہے۔ غرض خودبینی، حسد اور شخصی مخالفت کی بجائے ایک وسیع النظری اور نیک نیتی ہی ظرافت کو اس کے صحیح مقام پر پیش کرسکتی ہے۔ میرے ایک دوست نے صحیح کہا ہے کہ :۔

"ظریف وہی ہے جو ہنستا ہنساتا ہو تو یہ نہ محسوس ہو کہ وہ جان بوجھ کر ہمارے شعور اور احساس پر کوئی وار کر رہا ہے اس کا ہنسنا ہنسانا خندۂ بے محل نہ معلوم ہو، اس کی ظرافت دلوں میں یہ احساس پیدا کردے کہ زندگی ایک خندۂ مسلسل نہ سہی لیکن زندگی کے بے شمار آنسوؤں کو

مسکراہٹوں میں جذب تو کیا جا سکتا ہے۔

شعر و ادب کے دورِ جدید میں محمد حسین آزاد کی تحریروں سے جدید طرزِ ظرافت کی ابتدائی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ تذکرۂ آبِ حیات میں ان کے مخصوص ڈھنگ نے جہاں شاعروں کی زندگی کے ظریفانہ رخ کو پیش کیا ہے وہاں ایک سنجیدہ ظرافت انگڑائی لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ حالی میں ایک سنجیدہ معنی کی ہلکی مسکراہٹ بن کر کہیں کہیں نمودار ہوئے ہیں لیکن ان کی یہ لہر ایک تیز رفتار بجلی سے زیادہ نہیں جو بہت جلد غائب ہو جاتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کو البتہ ہم جدید مزاحیہ ادب کے نقیب کی حیثیت سے پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے کلام میں لطیف طنز کا ایک سیلاب ہے، جو اپنی شوخیوں اور رنگینیوں کو لئے آگے بڑھ رہا ہے اور جیسا کہ میں ایک دفعہ کہہ چکا ہوں "انہوں نے سماج کو اس طرح ہنسایا کہ دل رونے لگا۔"

اس ڈنر میں کھا گیا اتنا کہ نکلی تن سے جاں — خدمتِ قومی میں بارے جاں نثاری ہو گئی

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں — یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ — علمی مباحثے ہوں ذرا آ کے پاس لیٹ

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ایسے ہزاروں شعر ہیں جن کو دو دھاری تلوار کہنا چاہئے۔ یہ تبسم کے ساتھ ہونٹوں پر لہراتے ہیں اور دل کی دھڑکن بن کر آنکھ سے آنسو ٹپکاتے ہیں۔ اکبر کی ظرافت کا یہ اعجاز ہے۔

نثری مزاحیہ ادب کا حقیقی دور نذیر احمد سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں کے اسلوب میں ایک سنجیدہ بے تکلفی ہے۔ وہ تلخ حقائق پر سے مسکراتے ہوئے نقاب اٹھاتے ہیں اور اس طرح اٹھاتے ہیں کہ دیکھنے والے مسکراتے مسکراتے اپنی صورت اپنے آئینے میں دیکھ لیں۔ ان کی تحریر کونین کی گولی ہوتی ہے۔

"باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے، آدھ گھنٹے کھڑے کھڑے داڑھی مونچھ سنوار، آہستہ سے عمامے کو ذرا اور جما لیا، چغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچے نظریں کئے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف بڑھے۔ خدمت گار اور اردلی، چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر ہی تاڑ لیا تھا۔ کوٹھی کے پاس آتے دیکھ اِدھر اُدھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی، باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ چلی آتی ہیں۔ مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار، ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے۔ کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں۔ لوٹ چلیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں، شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کا اور اردلی کے لوگوں کا حال معلوم ہوگا۔ وہ لپک کر دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا اور ادھر کو رخ بھی نہ کیا۔ غرض کوئی آدھے گھنٹے اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لئے نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض کے لئے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور عزت کو بالائے طاق رکھ کر آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا، کیوں جمعدار کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے۔ بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر۔ مگر میں جانتا ہوں ادب اور ڈر تو خاک نہیں۔ صرف اسی بات کا لحاظ کہ تمہاری

فوجداری پر ہے"۔ خدا جانے کب موقع آپڑے۔ چاروناچار اچٹتا ہوا اسلام کر کے جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہے اس کو کہنا چاہئے کہ آج [illegible] ہے۔"

نذیر احمد کے بعد اُردو ادب میں سنجیدہ ظرافت اور مزاح نگاری کے کوئی ایسے نقوش نظر نہیں آتے جن کو نمایاں کہا جاسکے۔ البتہ جب اودھ پنچ اخبار نکلنے لگا تو اردو ادب میں مزاح نگاری نے ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کرلی۔ اکبر الٰہ آبادی کی نظمیں اور منشی سجاد حسین کے مزاحیہ مضمون اسی اخبار کے توسط سے مقبول ہوئے۔

اُردو مزاحیہ ادب کے جدید دور میں رشید احمد صدیقی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ان کو مزاحیہ نگار سے زیادہ طنز نگار کہنا درست ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں طنزیہ تنقیدی مزاح کے معیار کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ رشید احمد اپنے مطالعہ مشاہدے اور ذوق نظر کے باعث موجودہ مسائل پر اس طرح طنز کرتے ہیں کہ شوخی اور سنجیدگی کا ایک خوش گوار امتزاج ہو جاتا ہے۔ واقعاتی تسلسل یا اپنے مرکزی تخیل کے گرد گھومنے کی بجائے وہ اپنے خیالات کے مختلف مسائل اور زندگی کی تصویر کے مختلف پہلوؤں کو مربوط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ تنوع کے ذریعے غایت کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ کو پھیر لیتے ہیں۔ ان کی تحریر کے پیچھے واقعاتی پس منظر کام کرتے ہیں۔ وہ صرف ہنساتے نہیں بلکہ اپنے پختہ اسلوب کے ذریعے دعوتِ فکر و نظر بھی دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں پر آرنلڈ کا وہ مشہور قول صادق آتا ہے کہ ادب زندگی کی تنقید ہے۔

رشید احمد کے بعد ہم پطرس کا نام لے سکتے ہیں۔ یہ آواز کی دنیا میں اب کچھ اس طرح گم ہیں کہ ان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ان کی خاموشی سے اُردو ادب ایک ممتاز ظریف ادیب سے محروم ہوگیا۔ ان کے بعض مزاحیہ مضمون ظرافت کے بہترین نمونے کہے جاسکتے ہیں۔ پطرس کو میں ایک لحاظ سے رشید احمد پر ترجیح دوں گا۔ پطرس، پیچیدہ راہوں پر نہیں لے جاتے اور نہ پیشانی پر شکنیں لاتے وہ اپنی بے ساختگی سے ہنسی کو متعدی بنا دیتے ہیں۔ لیکن مسائل تک پہنچنے میں وہ رشید احمد کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اور ایک ادیب کا نام میں بغیر جھجکے لوں گا۔ یہ ادیب خاموشی سے کام کر رہا ہے۔ محمد فضل الرحمٰن کے ڈرامے آپ پڑھئے ان میں جگہ جگہ طنز لطیف اور شستہ ظرافت کے ایسے نمونے ملیں گے جن کو اُردو کے مزاحیہ ادب میں بلند مقام دیا جاسکتا ہے۔ وہ سماجی کمزوریوں پر ہنستے ہوئے اور ہنساتے ہوئے وار کرتے ہیں۔ مکالموں میں بعض وقت وہ لفظوں کے الٹ پھیر سے بلند طنز کا اس طرح کام لیتے ہیں، سنجیدگی ظرافت اور ظرافت سنجیدگی معلوم ہونے لگتی ہے اور پڑھنے والا سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ ہنسے یا غور کرے۔

ان ادیبوں کے علاوہ برگشتہ (سید محمد اکبر وفا قانی) ناکارہ حیدرآبادی، شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کا شمار بھی مزاحیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ بھی مزاح نگار کہے جاسکتے ہیں۔ برگشتہ اور ناکارہ۔۔۔۔۔۔ ظرافت کے بعض اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ شوکت تھانوی تو مزاح نگار کی حیثیت ہی سے مشہور ہیں ان کی "سودیشی ریل" ہمیشہ چلتی رہے گی۔ عظیم بیگ چغتائی کو ان کی بلانوسی نے مشہور تو کردیا لیکن دوڑ کے شوق میں وہ اپنی چال کو نباہ نہ سکے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کو میں ماضی کی آواز کہوں گا۔ وہ ماضی کے سہارے جیتے ہیں اور ان پر ان کی زبان اور اسلوب اس قدر چھایا ہوا ہے کہ جدید ادب کے تنقیدی اصول کی طرف وہ توجہ نہیں کرتے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ واقعاتی کشش اور اسلوب کے بے ساختہ پن سے ہنسا ضرور دیتے ہیں۔ ان سب ادیبوں سے الگ ملا رموزی نے "گلابی اُردو" کے نام سے مزاح نگاری کا ایک طرز اختیار کیا۔ یہ "ایجاد بندہ" اپنے نئے پن کے باعث کچھ دنوں تک تمسخر کا سامان فراہم کرتی رہی لیکن ذوق کی پاکیزگی نے اس کی پذیرائی نہیں کی۔ اب کچھ دنوں سے ہم نوجوان بیدی کو بھی ایک اچھے طنز نگار کی

حیثیت سے مشہور ہو چکے ہیں۔ یہ اُن کی ابتدا ہے اس لئے ان کے متعلق فی الوقت کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی لیکن ان کی یہ اٹھان بتاتی ہے کہ وہ ایک بلند مستقبل کے مالک ہوں گے۔ ظرافت چونکہ ایک فطری چیز ہے اس لئے سنجیدگی کے پُرسکون سمندر میں بھی بعض وقت ظرافت کی لہریں اٹھتی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کے وہ شعر جن میں اکبر الہ آبادی کے قہقہوں کی آواز بازگشت سنائی دیتی۔ معصوم عظیم راشد الخیری کی "نانی عشو"، خواجہ حسن نظامی کی بعض تحریریں امتیاز علی تاج کا "چچا چھکن"۔ ان سب میں ظرافت اور طنز کے بعض اچھے نمونے ہیں۔

اُردو مزاحیہ ادب کا یہ ذخیرہ حوصلہ افزا نہیں۔ لیکن جب ہم ہندوستان کی قنوطیت پسندی اور یاس انگیزی پر غور کرتے ہیں تو ایک مضبوط محاذ کے خلاف یہ چند حملے بھی ہمیں غنیمت معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے تو اس حزن اور یاس کے دبیز پردہ دل کو چاک کرنا ہے جس کے پیچھے ہماری افسردہ زندگی پل رہی ہے جب آنسو سوکھ جائیں گے تو ہونٹوں پر تبسم کی لہریں خود اٹھیں گی اور ہمارے ادیب یہ محسوس کریں گے کہ زندگی صرف آنسو نہیں ہے۔

میکش

گریہ و تبسم ۔ صاحبزادہ میکش کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدر آباد کے نوجوان شعرا میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالی جناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔
صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام قیمت دو روپے

انوار ۔ حضرت علی اختر حیدر آبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پُرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر اُن کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر اُن کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اُردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔
صفحات (۱۷۸) قیمت عہ

نمود زندگی ۔ جناب سید علی منظور صاحب حیدر آبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں ۱۰۱ نظمیں ۱۷ غزلیں اور ۵ رباعیات ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدر آباد کے پختہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدردان دور دور پھیلے ہوئے ہیں اُردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ علی منظور صاحب عہد حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔
صفحات ۲۱۲ قیمت عہ

(بقیہ سلسلہ صفحہ)

یہ مصرع کہ ع " ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں " پیش کرکے ولی کی ولایت پر مہر لگادی ہے۔ خود ولی کو بھی اپنے شاعرانہ کمال کا پورا پورا یقین تھا اور بالآخر ان کو یہ لکھنا پڑا کہ ؎　ولی ایران و توران میں ہے مشہور　　اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

زمانہ کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ان کے نام، وطن اور تاریخ پیدائش اور وفات کے متعلق ہمیشہ چہ میگوئیاں ہوتی رہیں لیکن جدید تحقیقات نے اب یہ ثابت کردیا ہے کہ ان کا نام ولی محمد تھا۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ عنفوان شباب میں تعلیم و تربیت کی غرض سے احمد آباد گئے تھے۔ ۱۱۱۲ھ میں دلی کا سفر کیا اور ۱۱۱۹ھ میں احمد آباد، گجرات میں وفات پائی۔

ولی اُردو کے ایک قادر الکلام، کہنہ مشق اور پُرگو شاعر تھے۔ ان کے کلام کا ایک ضخیم کلیات انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

اب ولی کی شاعری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں ؎

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا　　بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا
سجن نے یک نظر دیکھا نگاہ مست سوں جس کوں　　خرابات دو عالم میں سدا ہے وہ خراب اس کا
مرا دل پاک ہے از بس ولی زنگ کدورت سوں　　ہوا جیوں جوہر آئینہ مخفی پیچ و تاب اس کا

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا　　ٹک مہر کے پانی سوں یو آگ بجھاتی جا
تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دایم　　مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

مجھ کو تجھ بن کسی سے کام نہیں　　فکر ناموس و ننگ و نام نہیں
زندگی نام عشق ہے لیکن　　فائدہ کیا اگر مدام نہیں
عشق اس کا ہے ناتمام جسے　　پی کی خاطر کا اہتمام نہیں

اگرچہ ولی کے دیوان میں غزلیات کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن انھوں نے قصیدہ، قطعہ، رباعی، مخمس اور مثنوی وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی دو طویل مثنویاں "در فراق گجرات" اور "در تعریف سورت" بہت مشہور ہیں۔

اس دور کی دوسری نامور ہستی حضرت شاہ سراج اورنگ آبادی کی ہے جو ۱۱۲۷ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق سادات حسینی کے ایک محترم گھرانے سے تھا۔ ان کے والد سید درویش نے سراج کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا۔ ابھی بارہ سال کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ جذب کا عالم طاری ہوا۔ اور حضرت شاہ برہان الدین غریب کے مزار پر بیٹھے رہنے لگے۔ سات سال تک یہی حالت رہی جب حالت جذب میں کچھ افاقہ ہوا تو شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ۱۱۶۱ھ میں ان کے مرشد نے وفات پائی تو اس کے کچھ عرصہ بعد ہی سراج نے ترک لباس کرکے فقیرانہ زندگی بسر کرنی شروع کی۔ شاہ سراج کو بچپن ہی سے شعر و سخن کا فطری ذوق تھا اور ۱۱۵۸ھ تک پانچ ہزار اشعار کا ایک دیوان مرتب ہو گیا۔

اردو شاعری اور خصوصاً صنف غزل کو مقبول بنانے میں ولی کے بعد سراج کا درجہ ہے چنانچہ سراج خود کو ولی کا جانشین سمجھتے تھے اور اپنے ایک شعر میں اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ ؎　تجھ مثل اے سراج بعد ولی　　کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

سراج نے ایک مثنوی "بوستانِ خیال" میں اپنی آپ بیتی کو بیان کیا ہے۔ انھیں ایک لالہ جی کے لڑکے سے گہری دوستی ہو گئی تھی۔ اس مثنوی میں اپنی داستان محبت کو نہایت درد انگیز انداز میں پیش کیا ہے ۱۱۷۷ھ میں بتاریخ ۴ شوال یوم جمعہ اورنگ آباد میں انتقال کیا اور شاہ چراغ کے تکیہ میں مدفون ہوئے ان کے چہیتے شاگرد اور مدفاص ضیاء الدین پروانہ [illegible] سراج کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی !   نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی   نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

میرے جگر کے درد کا چارہ کب آئے گا   یک بار ہو گیا ہے دوبارہ کب آئے گا   تیلی ہماری نین جھروکے میں بیٹھ کر   بے کل ہو جھانکتی ہے پیارا کب آئے گا

اس مشتری جبیں کا مجھے غم ہے از حل   طالع مرے کا نیک ستارہ کب آئے گا

ولی اور سراج کے تذکرہ کے بعد چند اور مشہور شاعروں کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس دور کی خصوصیات پر روشنی پڑ سکے۔

محرم | محمد شاہ نام محرم تخلص، نواب شجاعت خاں صوبہ دار کے فرزند تھے۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ خوش فکر اور خوش مذاق تھے اس لئے تھوڑی مدت میں شعر گوئی میں نام پیدا کیا۔ فارسی شعر بھی کہتے تھے۔ ۱۱۶۶ھ میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام ؎

نزاکت بس کہ رکھتا ہے وہ دلدار جہاں آرا   صفائی آئینہ ہے یار اس کے عکس عالی کا

بہار آوے تو بلبل کو قفس میں قید مت کرنا   تو ایسا ظلم اس بیکس پہ اے صیاد مت کرنا

ایما | میر بخشی عاشق علی خاں ایما خوش حال خاں قاقشال کے نواسے تھے۔ نانا کے انتقال کے بعد منصب و خطاب خانی سے سرفراز ہوئے۔ طبیعت شوخ پائی تھی۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بہت اچھی مہارت تھی۔ ۱۱۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ ان کا ایک شعر بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے ؎

طبیب عشق سیں پوچھا زلیخا نے علاج اپنا   کہا تجھ پر بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم کرنا

داؤد | مرزا داؤد نام تھا اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ولی کے شاگرد تھے اس لئے ان کے کلام میں ولی کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ چنانچہ داؤد نے بعض اشعار میں ولی اورنگ آبادی کا ذکر کیا ہے مثلاً ؎ کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کو سن کر   تجھ طبع میں داؤد ولی کا اثر آیا

بعد از ولی ہوئے ہیں کئی شاعر و لیکن   داؤد شعر تیرا مشہور ہے دکن میں

داؤد اپنے کو ولی کا جانشین سمجھتے تھے اور اس کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎ حق نے بعد از ولی تجھے داؤد   صوبۂ شاعری بحال کیا

لچھمی نارائن شفیق نے اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں ان کے حالات اور وفات کا قطعۂ تاریخ لکھا ہے۔ جس سے ۱۱۶۵ھ نکلتی ہے۔ قطعہ یہ ہے ؎

بلبل گلزار معنی طوطی رنگین بیان   از غم آباد جہاں بگذشت چوں تیر از کماں   مصرع تاریخ فوتش گفت با من ہاتفے   گو برفتہ میرزا داؤد از فانی جہاں

ایک چھوٹا سا قلمی دیوان یادگار چھوڑا ہے جس میں تقریباً پانچ سو اشعار ہیں یہ نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ؎ احوال چشم یار سے پوچھ   حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ   اس صنم کے خیال ابرو نے   ناتواں مجھ کو جوں ہلال کیا

قانون شفا نطق میں ہے یار کے موجود   اے دل نہ ہو محتاج طبیباں کے دوا کا

عاجز | عارف الدین خاں عاجز اورنگ آباد کے مشاہیر شعرا سے ہیں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی ایک مثنوی "لعل و گہر" بہت مشہور ہے ان کا اردو دیوان سنگلاخ زمینوں اور مشکل مضامین کی وجہ سے مشہور ہے۔ آخری عمر میں نا ندیڑ میں مقیم تھے کہ ۱۱۷۸ھ میں وفات پائی۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔ انھوں نے خود ہی اپنے نام عارف الدین خاں عاجز سے اپنی تاریخ وفات نکالی تھی۔ وہ نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎ چمن میں جا کے وہ رنگیں ادا جب مسکراتا ہے   گلوں سے رنگ اڑ کر لالہ سا جنگل کو جاتا ہے

ہمارا اشک خونیں یاد میں گلرو کے بہہ بہہ کر   نگہ کو رشتۂ تسبیح یاقوتی بناتا ہے !

عاشق وحشی کی گر تصویر کھینچا چاہئے   اول اس کے پاؤں میں زنجیر کھینچا چاہئے

کستر | مرزا مغل کستر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں تربیت پائی۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ سراج اورنگ آبادی سے تلمذ تھا۔ سنہ ۱۱۸۰ھ میں انتقال کیا۔
نمونۂ کلام کے لئے صرف دو شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎ ذرا تو لگ گلے ساقی ہے موسم بے حجابی کا کہ جاری فیض بارش سیں ہوا چشمہ گلابی کا
مجھے اس بات پر کستر تعجب سخت آتا ہے مرے رونے پہ ہنسنا قہقہہ کر کر گلابی کا

عشرت | خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شعر و سخن کی طرف توجہ کی۔ طبیعت موزوں اور فکر رسا پائی تھی
تھوڑے دن میں چمک گئے اور مشہور شعرا میں شمار ہونے لگا۔ سراج اورنگ آبادی کے شاگرد تھے سنہ ۱۱۸۰ھ میں بمقام اورنگ آباد انتقال کیا۔ ان کے چند شعر یہ ہیں ؎
گلشن دل میں اگر سرو خراماں گزرے رشک خوبی سے گلستاں میں طوفان گزرے کیا ہوا حاصل تمہیں توڑے سے اس مفلس کا دل باندھ آتا زور اگر تم توڑتے نرگس کا دل

ساحی | سید غلام قادر ساحی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل اور شعر و سخن کا ذوق پیدا کیا اور قادر الکلام شاعر بن گئے۔ تمام شہر میں ان کے کلام کی دھوم تھی۔ شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ درویش صفت اور با اخلاق بزرگ تھے۔ متعدد امرا ان کے معتقد اور شاگرد تھے۔ سنہ ۱۱۹۶ھ میں انتقال کیا اور اورنگ آباد میں دفن ہوئے۔ ان کے
دیوان کے متعلق تذکرۂ محبوب الزمن جلد اول میں عبدالجبار ملکاپوری نے لکھا ہے۔ "آپ کا دیوان و قصۂ سرو شمشاد میرے کتب خانۂ نوادر میں موجود تھا۔ ۱۳۲۶ھ کی
طغیانی میں کتب خانہ کے ساتھ تہ آب تلف ہوگیا۔ کتب خانۂ آصفیہ و کتب خانۂ سالار جنگ میں دیوان و قصہ کو تلاش کیا نہیں پایا۔"

حسن اتفاق سے ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں سرو شمشاد کا قصہ محفوظ ہوگیا ہے۔ اس کے آغاز کے دو شعر یہ ہیں ؎
کیا یک تازہ جشن بادشاہی درخشاں شب کو نور صبح گاہی ہزاروں شمع اور قندیل روشن زمین و آسمان گلزار و گلشن

اب ایسے شاعروں کو پیش کیا جاتا ہے جو سنہ ۱۲۰۰ھ کے بعد بھی زندہ تھے۔ ان میں سے چند مشہور یہ ہیں۔

جناب۔ موہن لال اورنگ آباد میں پیدا ہوئے کھتری قوم سے تعلق تھا۔ بہت اچھے خوش نویس اور انشا پرداز تھے۔ فارسی اردو میں شعر کہتے تھے۔ سنہ ۱۲۰۰ھ میں وفات پائی نمونۂ کلام یہ ہے ؎
آب آنکھوں سے کم ہوا رو رو چشمۂ آفتاب کی سوگند دل سے وسواس دور کر آ مل مجھ کو تیرے جناب کی سوگند

نثار | مرزا محمد خان نام وزارت خاں خطاب۔ نثار تخلص تھا۔ ابتدائے سن شعور سے شعر کہنا شروع کیا اردو، فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ سراج اورنگ آبادی سے
اصلاح لیتے تھے سنہ ۱۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎ نہ ہوتے شور رونے سے مرے آنسو اگر جاری نہ صحرا سبز ہو جاتا نہ دریا جوش میں آتا
کیا آستیں چڑھا کر آتا ہے شوخ ہم پر یہ بانکپن کی طرزیں کس نے سکھائیاں ہیں بس کہ روتا ہوں تری یاد میں آگہ جن مردم چشم مرا مردم دریائی ہے

شفیق | لچھمی نارائن شفیق لالہ منسارام کے فرزند تھے۔ ۱۷ صفر سنہ ۱۱۵۸ھ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی طرح تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کا بڑا اچھا
ذوق پیدا کیا تھا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں صاحب اور فارسی میں شفیق تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں مثلاً چمنستان شعرا، شام غریباں،
گل رعنا، ماثر آصفی اور لباط الغنائم لکھیں۔ پہلی تین کتابوں میں شاعروں کے تذکرے ہیں۔ سنہ ۱۲۱۴ھ میں وفات پائی۔

تمنا | اسد علی خاں تمنا اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ آصف جاہ ثانی کے ساتھ حیدرآباد چلے آئے۔ کلیات کے علاوہ دو کتابیں تذکرۂ گل عجائب اور مقالات الغرائب
مرتب کیں۔ گل عجائب اردو شاعروں کا تذکرہ ہے جو انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ سنہ ۱۲۰۰ھ میں وفات پائی۔

یہ تھی اورنگ آبادی دور کے شاعروں کی مختصر کہانی۔ اگر اس دور کے شاعروں پر کوئی قلم اٹھائے تو ایک مبسوط تذکرہ مرتب ہو سکتا ہے۔

خواجہ حمید الدین

لڑکپن اور بچپن کے کھلنڈرے دن گزار کر نجمہ جب کچھ ہوش سنبھالنے لگی تب اسے اپنی ہمجولیوں کو سمجھنے اور اپنے اردگرد کے حالات کو ان کے اصل روپ میں دیکھنے کی سدھ بدھ ہوئی۔ تو وہ تو جیسے کھو ہی گئی۔ جو نجمہ دن بھر کھیل کود میں مگن رہتی تھی، اب کسی تنہا مقام میں سب سے الگ تھلگ بیٹھی کچھ سوچتی رہتی۔ اس کی ماں تاڑ گئی تھی کہ نجمہ کے دل پر یہ کیسی خود فراموشیاں اپنا اثر ڈال رہی ہیں۔ لیکن نجمہ جیسی لاڈلی بیٹی کو وہ کس طرح سمجھا سکتی تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے نجمہ کو کام کاج میں لگے رہنے اور کھیلنے کودنے کے لئے کہتی۔ لیکن نجمہ جیسے بہری ہو، سب کچھ سنتی اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوتی۔ آپ جانئے لڑکیوں کے دل کنول کی طرح پاک اور کومل ہوتے ہیں اور سوچنا۔ اف ... یہ سوچنا تو جیسے تند و تیز آندھی کی طرح دل و دماغ کی ساری فضا کو متزلزل کر دیتا ہے۔ مگر کوئی نجمہ کے دل سے پوچھتا کہ وہ آخر کس سوچ میں گم ہے۔ اس نے ابھی دنیا کو دیکھا ہی کیا ہے!! ۔ آپ شاید اسے نہ جانتے ہوں لیکن مجھے اس کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ وہ میرے پڑوس میں رہتی تھی اور جب وہ ننھی سی بچی تھی اس وقت سے ہمارے گھر میں اس کا آنا جانا تھا۔ وہ گھنٹوں ہمارے پاس کھیلتی، باتیں کرتی رہتی۔ توفیق میرا ایک بھانجا تھا۔ وہ بھی اس کا ہم سن تھا نجمہ اور توفیق ایک دوسرے کے بڑے گہرے دوست بن گئے اور ہر کھیل میں دونوں کا ساتھ ہونا ضروری ہو گیا۔ بچپن کا یہ معصوم دلی تعلق۔ کسی کے لئے بھی قابلِ اعتراض نہ تھا ۔ ہوتا بھی کیوں ؟ ۔ توفیق کو اس کے ماں باپ نے بلا لیا تو وہ با دل ناخواستہ ہمارے ہاں سے چلا گیا۔ نجمہ کو اس کے چلے جانے کا بڑا دکھ تھا۔ لیکن توفیق کو روکے رکھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ مجبوری کے اس احساس نے اس کے دل پر ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ وہ الہڑ اور کھلنڈری لڑکی سے ایک بے جان مورت میں بدل گئی اور اپنے آپ ہی سوچتے رہنے کو زندگی کی اصل غایت سمجھنے لگی۔ میں بھی اس کی اس تبدیلی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ماں سے میں نے ایک دن کہا "دیکھئے نجمہ گہرے پانی کی طرف بڑھتی جا رہی ہے آپ اسے سنبھالئے"۔ اس کی ماں نے مایوس لہجہ میں کہا۔ "بھائی میں تو اپنی سی کر کے ہار گئی۔ وہ تو مانتی ہی نہیں۔ بس جب دیکھو سوچتی رہتی ہے۔ ٹہلتی رہتی ہے ... نہ اسے کھانے پینے کا ہوش ہے اور نہ کپڑوں کی سدھ۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری نجمہ کا کیا ہو گا۔" اتنا کہہ کر وہ رو پڑیں مجھے بھی بڑا دکھ ہوا۔ میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں نجمہ سمجھدار بچی ہے۔ آج نہیں تو کل ضرور اپنے بھلے برے کو جان لے گی۔ بہتر ہے کہ آپ اسے اپنے حال پر چھوڑ دیں"۔ نجمہ کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ ایک شاعر تھے۔ نجمہ کو اس کی حساس طبیعت اپنے باپ ہی سے ورثے میں ملی تھی۔ شاعر باپ نے اپنی بیوی اور بیٹی کے لئے مال و دولت نہیں چھوڑا صرف انہیں چھوڑ گیا۔ نجمہ کی ماں محنت مزدوری سے اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پالتی تھی۔ نجمہ اپنی سہیلیوں کو زرق برق کپڑے پہنے ہوئے دیکھتی۔ ان کے قیمتی کھلونے دیکھتی اور اس کا دل اندر ہی اندر اپنی کم مائیگی پر آنسو بہاتا۔ وہ اپنی ماں سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن ماں کی مجبور بے کسی اس کی زبان بند کر دیتی۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ کر رونے لگتی ۔ مجھے چند دن بعد کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ان دونوں ماں بیٹیوں سے مجھے ایک گونہ دلچسپی پیدا ہو چلی ہے اور کچھ نہیں تو میں اس المیہ کا تماشائی بننا چاہتا تھا، جو قسمت ان کی زندگی کے واقعات سے تیار کر رہی تھی۔ میں حتی المقدور ان کی مشکلوں کو دور کرتا اور نجمہ کی تعلیم کے اخراجات بھی میں نے اپنے ذمہ لے لئے تھے۔ نجمہ اس عرصہ میں پھر اپنی دنیا میں واپس چلی آئی۔ وہ ہنسنے بولنے لگی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ سیر و تفریح بھی کرتی۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ غریبی کے احساس سے بعض وقت اس کی روح کے ہر تار میں جھنکار اٹھتی ۔ اور اس کی آنکھوں میں درد و غم کے آنسو چھلکنے لگتے۔ میں نے اسے کئی دفعہ سمجھایا کہ وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھے۔ اپنا عزیز سمجھے۔ اپنی جو ضرورت ہو مجھ سے بیان کرے لیکن اس نے کبھی اپنی طرف سے پہل نہیں کی۔ وقت گزرتا گیا۔ ہماری زندگیوں میں کوئی خاص انقلاب یا کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہوئی کہ نجمہ اب بچی نہ رہی حسن و شباب کی بہاروں میں وہ ایک نورس کلی کی طرح جھوم رہی تھی ۔ کہ اسی زمانے میں توفیق آیا۔

وہ بھی اب اونچا پورا جوان تھا.... توفیق نے نجمہ سے ملنے کی کوشش کی۔ لیکن نجمہ ہمیشہ اس سے کتراتی رہی۔ توفیق نجمہ کی اس بے التفاتی پر اور سودھری پر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ وہی نجمہ جس نے بچپن کی سہانی گھڑیوں کو اس کے ساتھ کھیل کود میں گزارا اب ایسی بدل گئی کہ بات کرنے کی بھی روادار نہیں ہوتی۔ وہ اس تبدیلی کے اسباب سوچنے لگتا۔ لیکن وہ سوائے اس کے کچھ اور نہ سمجھ سکتا کہ نجمہ اب بہت حسین ہوگئی ہے۔ بہت بڑی ہوگئی ہے۔ بس اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ نجمہ کی ماں نے ایک دن ادھر ادھر کی باتوں کے بعد نجمہ کی شادی کا ذکر چھیڑا۔ کہنے لگیں "کوئی اچھا لڑکا نظر میں ہو تو نجمہ کا خیال رکھو۔" تھوڑی دیر بعد اس نے رکتے رکتے کہا "توفیق اچھا لڑکا ہے۔ نجمہ کو شاید وہ پسند بھی کرتا ہے۔" نجمہ کی ماں سے یہ جملہ سن کر میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ان کے کہنے سے پہلے ہی میں نے یہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔ اور توفیق کے ماں باپ نے سرے سے انکاری جواب دیا تھا۔ ان کا توفیق لائق اور دولتمند ماں باپ کا بیٹا تھا۔ وہ کسی غریب خاندان سے کس طرح ناتا جوڑ سکتے تھے۔ میں بات کو اس طرح ٹال گیا۔" آپ توفیق کے بارے میں اتنا اچھا خیال رکھتی ہیں۔ اور وہ ہے بھی اچھا لڑکا۔ لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں کہ شادی اس کے ماں باپ کی مرضی کے بغیر نہ ہوگی اور اس کے ماں باپ نے تو شاید کوئی لڑکی ڈھونڈ رکھی ہوگی۔ نجمہ کی ماں جیسے ایک دم بجھ سی گئیں۔ مایوس نظروں سے مجھے دیکھا اور چلی گئیں۔ دوسرے ہی دن توفیق کو کسی ضروری کام کے لئے اس کے ماں باپ نے بلا بھیجا اور اس کے بعد توفیق کے خط سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ضروری کام اس کی شادی ہے، جو ایک متمول گھرانے میں طے پائی ہے۔ توفیق نے صرف اپنی شادی کی اطلاع دی تھی۔ میں چاہتا تھا وہ اس شادی سے اپنی ناراضامندی ظاہر کرتا۔ وہ مجھے کچھ کرنے کے لئے کہتا۔ میں نے اس کے لئے کیسے کیسے منصوبے سوچ رکھے تھے۔ میں نے نجمہ کے دل میں اس کے لئے کتنی جگہ پیدا کر دی تھی۔ اس کی کیسی کیسی تعریفیں کی میں نے۔ کیسا طلسم میں نے باندھا تھا، اور یہ توفیق تو بڑا ہی سنگدل نکلا۔ میں نے حتی الامکان اس خبر کو نجمہ سے چھپانے کی کوشش کی۔ لیکن گھر والوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو نجمہ کے کان پر بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ ایک دن نجمہ کی ماں میرے پاس آئیں۔ کہنے لگیں "کچھ نجمہ کی بھی خبر ہے آپ کو۔" اور انھوں نے جو نجمہ کا حال سنانا شروع کیا ہے تو میں تو سر تھام کر بیٹھ گیا۔ کہہ رہی تھیں "چند دن سے پھر وہی پرانی سوچتے رہنے کی عادت شروع ہوگئی ہے اور اب تو اس کا اثر ایسا گہرا نظر آرہا ہے کہ اس کی صحت کے لالے پڑ گئے ہیں کونے میں بیٹھی آنکھیں بند کئے رہتی ہے۔ کبھی کچھ کھا لیا تو کھا لیا نہیں تو ویسی ہی پڑ کر سو رہی۔ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ کبھی ہنسنے لگتی ہے تو کبھی رو پڑتی ہے۔" "تو پھر اب آپ نے کیا سوچا ہے؟" میں نے دھیمے لہجہ میں پوچھا۔ کہنے لگیں "سوچا کیا ہے۔ یہی کہ اب میں خود زہر کھا کر سو رہوں۔ نجمہ کی ایسی حالت اب مجھ سے تو نہیں دیکھی جاتی۔" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ذرا ایک بار توفیق کے ماں باپ سے مل آتا ہوں۔ پھر اس کے بعد کوئی نہ کوئی ترکیب سوچ نکالیں گے۔" میں توفیق کے ماں باپ سے مل کر کیا کرتا؟ وہ تو دولت کے پجاری تھے انھیں دلوں کی نزاکتوں کا کیوں کر خیال ہوتا اور وہ میری بات کیوں ماننے چلے۔ پھر میں نے سوچا نجمہ کے علاج کا بہانہ خوب رہے گا۔ اس طرح وہ نجمہ کو دیکھ بھی لیں گے اور ممکن ہے نجمہ کی صورت اس کی قسمت بنا دے۔ توفیق کے ماں باپ کا دل پسیج جائے۔ میں نے نجمہ کی ماں سے بڑی مشکل سے نجمہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت لی اور ہم دونوں شہر روانہ ہوگئے۔ راستے میں میں نے نجمہ کو زندگی کی تلخیوں اور زمانے کے نشیب و فراز سے واقف کرانے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ اس مسئلے کو مجھ سے بہتر سمجھ چکی ہے اور اب وہ میری باتوں کو اس طرح سن رہی ہے جیسے کوئی استاد بچہ کا آموختہ سنتا ہے۔ میں نے یہ رنگ دیکھا تو دوسرا ہی ذکر چھیڑ دیا۔ نجمہ نے تھوڑی دیر بعد اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سو گئی۔ جب ہم شہر پہنچے تو میں نے اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھیرنا مناسب سمجھا اور دوسرے دن توفیق کے ماں باپ سے ملنے کے لئے گیا۔ توفیق کے گھر میں خاصی چہل پہل تھی۔ شادی کی ابتدائی

بڑے تپاک سے ملاقات کی۔ ایک علیحدہ کمرے میں مجھے بٹھایا اور تھوڑی دیر بعد وہ خود بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ میں بڑی مشکل میں تھا کہ جس مقصد کی تکمیل کے لئے میں آیا تھا اسے کس پہلو سے چھیڑوں کہ خود انھوں نے اس مسئلہ سے متعلق بات چیت شروع کی۔ کہنے لگے "توفیق کی قسمت بڑی اچھی ہے جو اسے ایسا اچھا سسرال مل رہا ہے"۔ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا "لیکن کیا توفیق بھی اس شادی کو پسند کرتا ہے"۔ توفیق کے والد نے ایک زوردار قہقہہ لگایا "آپ پسند کی پوچھ رہے ہیں۔ ارے وہ تو پھولا نہیں سما رہا ہے۔ اسی کے اصرار سے تو شادی اتنی جلد قرار پاگئی"۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے نجمہ کے ساتھ میں بھی کسی گہرے سمندر میں غرق ہوا جا رہا ہوں۔ میں نے اب زیادہ گفتگو مناسب نہ سمجھی اور باہر نکل کر توفیق کو ڈھونڈھنے لگا۔ توفیق اپنے چند دوستوں کے ساتھ ہنسی دل لگی میں لگا ہوا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ گھر والوں کی خیریت پوچھی۔ امید کئے رکھتے نجمہ کے بارے میں بھی پوچھا۔ "وہ کیسی ہے شادی میں آئے گی یا نہیں؟" میں نے جواب دیا "ابھی سے تمہیں مبارکباد دینے کو کہا ہے"۔ "ماموں جان" توفیق کہنے لگا "آپ اسے اپنے ساتھ لے آئے ہوتے۔ یہاں شادی کی دلچسپیاں دیکھ لیتی"۔ "ہاں" میں نے اس طرح غصہ سے دانت پیستے ہوئے کہا کہ توفیق ہکا بکا رہ گیا۔ اپنے گھر آکر میں نے نوجوانوں کے بارے میں ایسی خراب رائے قائم کر لی کہ مجھے توفیق جیسے بھانجے کا ماموں ہونے پر شرمندگی سی تھی۔ نجمہ سے جب میں نے کہا کہ وہ خود کیوں نہ توفیق سے مل لے۔ وہ اس زور سے ہنس پڑی کہ میں سہم کر رہ گیا۔ وہ مسلسل ہنستی رہی اور آخر میرے سامنے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سنا جیسے کوئی سسکیاں بھر رہا ہے۔ تڑپا دینے والی، دل میں چبھنے والی سسکیاں! میرا بھی دل بھر آیا اور میں صحن میں ٹہلنے لگا۔

دوسرے ہی دن ہم گاؤں کو چلے آئے۔ توفیق کی شادی ہوگئی لیکن ہم میں سے کوئی بھی شریک نہ ہوا جس دن توفیق کی شادی ہوئی اس دن نجمہ کی حالت بڑی خراب رہی مجھے تو ڈر ہو رہا تھا کہیں وہ بالکل ہی پاگل نہ ہو جائے۔ میں نے وہ دن بڑی پریشانی کی حالت میں کاٹا۔ نجمہ کو جس مشکل سے میں نے سنبھالا ہے اس سے میرا دل ہی اچھی طرح واقف ہے۔ دو تین دن بعد نجمہ کی طبیعت کچھ سنبھلنے لگی لیکن اس کے خیالات کی دنیا میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو گیا تھا وہ دولت کو اتنی اہمیت دینے لگی کہ ہر قربانی پر اسے حاصل کرنے پر تیار ہو گئی۔ اس نے مجھ سے کئی دفعہ بڑی بڑی رقمیں مانگ لیں۔ وہ محلہ کی بچیوں کو پڑھانے لگی وہ امیر گھرانوں کی عورتوں سے سلوائی کے لئے کپڑے مانگ لاتی۔ غرض جب بھی میں نے اسے دیکھا روپیہ کمانے ہی کی دھن میں سرگرداں دیکھا۔ ایک دن تو نجمہ کی ماں نے یہ خبر بھی سنائی کہ "شہر کے ایک بوڑھے کروڑپتی سیٹھ گاؤں میں آئے ہوئے ہیں کسی جوان لڑکی سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں اور نجمہ مُصر ہے کہ اس بوڑھے سیٹھ سے شادی کرے گی"۔ نجمہ کو میں نے سمجھایا۔ جان پہچان کے سارے لوگوں نے سمجھایا لیکن نجمہ اپنی ہٹ سے باز نہ آئی اور جن لوگوں نے یہ نسبت ٹھہرائی تھی انھوں نے نجمہ کی مرضی پا کر بات چیت طے کروادی۔ ہم سب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بوڑھے سیٹھ صاحب دولہا بن کر آئے اور نجمہ کو پچاس ہزار روپے مہر پر اپنی دلہن بنالیا۔ شادی میں ہم سب شریک تھے۔ لیکن اس طرح جیسے کسی کی میت میں شریک ہوں۔ مجھے تو صاف نظر آرہا تھا کہ اس عروسی لباس میں نجمہ نہیں اس کی لاش چھپی ہوئی ہے۔ دوسرے دن میں نے نجمہ کو دیکھا تو سونے اور جواہرات میں لدی ہوئی بیٹھی تھی۔ سیٹھ صاحب نے دل کھول کر زیورات دئے تھے۔ اور نجمہ سچ مچ دیوی بن گئی تھی۔ "کیسی ہو" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ خلاف توقع نجمہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اسے دلاسا دیتا کھڑا رہا کہ اتنے میں دروازے پر ڈاکیے نے آواز دی۔ میں نے اپنے نام کا خط وصول کیا۔ خط پڑھ چکا تو میرے ہاتھ لرزنے لگے اور میرے دل پر جیسے کسی نے ایک زور کا گھونسہ لگایا۔ توفیق کا خط تھا۔ اور اس نے لکھا تھا کہ اس کے خسر ہمارے گاؤں میں ٹھیرے ہوئے ہیں اور وہ ان کے ساتھ چند دن گزارنے کے لئے اپنی بیوی کے ساتھ آرہا ہے۔ توفیق کے خسر! نجمہ کے دولہا! خط میرے ہاتھ میں تھا اور میں جیسے ساری فضا میں گھوم رہا تھا۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ نجمہ میرے قریب آئی اور اس نے میرے ہاتھ سے خط لے لیا۔ نجمہ کے دیوانہ وار قہقہوں کی گونج نے مجھے چونکا دیا "نجمہ! نجمہ!!" میں پکارنے لگا لیکن نجمہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ البتہ اس کے قہقہوں کی آواز برابر کی طرف سنائی دیتی رہی اور یہ آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی۔ میں دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں کس حال میں ہوں۔ اور قسمت ایک مجبور اور بے سہارا اکیلی لڑکی کے ساتھ کس بے دردی سے پیش آرہی ہے۔

رشید قریشی

پتنی

اس نے کبھی مجھے اپنے نام سے نہیں پکارا۔ گجری رنگ محل ہو کر آئی تو ایکنا تھ بھائی کو مسٹر سے مخاطب کرنے لگی۔ پتا شعبہ بھر پڑھ لکھ کر بھی اپنے پتی گوبند سے مکر لینے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر اس ریکھا کو کیا ہو گیا۔ وہ ہمیشہ خاموش ہی رہتی ہے! بہت دیر تک نہ جانے کیا سوچتی رہتی وہ ——————

ایکادسی کے روز سدھیر بھیا آئے تو ان کی پتنی کوسلیا کو دیکھ کر مجھے رشک ہونے لگا۔ سچ پوچھئے تو زندگی یہ ہے۔ زندہ دلی اسی کا نام ہے۔ کوسلیا ٹینس کھیلتی ہے سیکل چڑھ جاتی ہے اور ہنسی مذاق میں تو سارے مدن پورہ میں اس کا جواب نہیں۔ چلتی پون ہے جیسے جگہ جگہ سے پلک گئی ہو۔ اسی لئے تو سدھیر بھیا کی زندگی اتنی مسرت بخش اور پُرسکون ہے۔

اور ایک یہ ہے کہ میرے پیر دھو دھو کر حیران ہے۔ ہنش۔ مجھے یہ نہیں چاہئے۔ پتنی شریک حیات ہوتی ہے۔ اس کا بھی کوئی مقام ہے۔ آزادی، خودداری اور اعتماد نفس۔ یہ سب کچھ چاہئے اس میں۔ کم از کم میں تو یہی چاہتا ہوں۔ یہ بھگوان سمجھ کر پتی کی پوجا کرنا اور اس کے پیر دھونا مجھے پسند نہیں۔ اس سے صنف نازک کی توہین ہوتی ہے۔ اس کی خودداری مجروح ہو جاتی ہے اور پھر وہ شریک حیات باقی نہیں رہتی۔ ایک کنیز بن جاتی ہے۔ کنیز — کون ہے وہ جو تعلیم پا کر بھی اپنی پتنی کے ساتھ کنیز کا سا برتاؤ کرنا پسند کرے گا۔ کوئی نہیں۔ اگر نطشے کے فلسفے نے کسی کے دماغ سے لطافت اور حسن کی صلاحیت سلب کر لی ہے تو کیا ہوا۔ ایسے کتنے ہوں گے۔ عورت کو نطشے کی آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ نطشے قاتل آرٹ تھا۔ اپنی جنم بھومی ہی کا دشمن تھا وہ۔ ان سلونی صورتوں کو تو ٹیگور کی سی حسن شناس نظروں سے دیکھنا چاہئے۔ شاعر اور مصور بن کر صنف نازک کے حسن میں لطافت کی رنگینیاں بھر دینی چاہئے۔ مگر یہ کیا۔ اس ریکھا کا تو کوئی مقام ہی نہیں۔ سمجھتی ہے میں ہی اس کا بھگوان ہوں۔ دیوانی عورت ایسا نہیں ہے۔ وہ زمانہ گیا۔ اب مساوات کا دور دورہ ہے۔ اب تو ایسا نہ کر۔ تو اور میں — دونوں میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں۔ برابر برابر کے ہیں۔ نہیں مانتی ریکھا۔ وہی پرانی بات — یہ تو احمق پن ہے۔ بیہودگی۔

وہ میری باتوں پر فلسفی کی طرح غور کرتی شاعر کی طرح سوچتی اور یہ سب کچھ کر کے ایک جاہل اور غبی لڑکی کی طرح بھلا دیتی۔ میں تنگ آ چکا — سدھیر بھائی تو ٹھٹھا ہوئے سمجھا گئے۔ ان کی کوسلیا نے تو اپنی سہیلیوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ "ریحون نے سونے کے پنجرے میں چڑیا پال رکھی ہے"۔ میں یہ کیسے سن سکتا ہوں — کوسلیا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ریکھا اپنے آپ سے اس سنہری پنجرے میں قید ہے۔ میں نے پنجرے کے کواڑ ہمیشہ کے لئے کھلے رکھے۔ میں نے پنجرا ابھی نہیں بنوایا اس کے لئے۔ یہ اپنے آپ قید ہے۔ عورت محدود ہو جاتی ہے تو اس کا دل اور اس کا دماغ دونوں غلام ہو جاتے ہیں — ریکھا اڑ تو سہی۔ دیکھ تو آزاد فضاؤں میں زندگی کا سمندر کس طرح ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اری پگلی زندگی افسانہ ہے، اپنے کردار کو آگے بڑھا۔ اوج پر لا اُسے، تاکہ اس افسانوی زندگی کا کوئی ایک پہلو ہی نظروں کو لبھا سکے۔

وہ ان باتوں کو نہیں سمجھتی اور نہ ایسی باتیں سننا چاہتی ہے — بھارت دیس کی ایک گرہستی پتنی ہونے پر ہی اُسے ناز ہے۔ اب بھلا اسے سمجھائے تو کون؟ میں نے ہزار بار کہا، لاکھ لاکھ کوشش کی کہ ریکھا یہ زندگی نہیں ہے،

یہ سچ ہے کہ وہ مجھ سے مس نہ ہوئی ۔ اسے بس میرے پیر دھونا آتا ہے اور وہ مجھے بھگوان کا اوتار ہی سمجھتی ہے ۔

ایک دن مجھے یوں محسوس ہوا کہ مسلسل بارش کی وجہ سے پتھر کی سل گھس گئی ہے ۔ میں برآمدے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا ۔ "مسز سدھیر نے آل انڈیا اوپن ٹینس کا چیمپین شپ جیت لیا" میرے دل میں خیال ہو رہا تھا کہ ایک ہماری پتنی بھی ہے ۔ میں ریکھا کی قدامت پسندی پر دل ہی دل میں کوفت کھا رہا تھا ۔ وہ دبے پاؤں میرے پاس آئی ۔ مجھے کیا معلوم کہ آج سے نئی زندگی کا سنگ بنیاد پڑنے والا ہے میں اسی طرح اخبار پڑھتا رہا ۔ وہ نرم نرم ہاتھ کانوں کے پیچھے سے گزر کر میری آنکھوں پر ڈھک گئے ۔ میں خوشی سے اچھل پڑا ۔ ریکھا ۔ اس نے للچائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا ——— گھورتی رہی ——— میں نے کہا چلو ریکھا بغیچے میں گھوم آئیں ۔ بڑی پر لطف تھی آزادی کی پہلی شام ——— پھر تو ہمارا پتنگ اڑنے لگا ۔ اونچا اور اونچا ——— بعض اوقات وہ اس قدر اونچا اڑتا کہ مجھ میں سنبھالنے کی طاقت نہ رہتی ۔

وہ سینما گئی ۔ اکیلی ہی ۔ مگر میرے دل میں ایسا خیال کیوں آتا ہے؟ اسے من مانی کرنے کا حق ہے ۔ آزاد ہے وہ بھی میری طرح ——— میرا دل مان گیا ۔ شام وہ دیر سے آئی لیکن میں نے اپنی جدید اشتراکیت نہیں چھوڑی ۔ ریکھا بہت خوش ہے ۔ اب وہ میرے پیر دھونے اور مجھے بھگوان سمجھنے والی ریکھا نہیں ۔ وہ اب مسز جیون ہے ۔ ایک آزاد خیال خوددار اور باعزت خاتون ۔

ایک روز ریکھا اور میں اپنے بغیچے میں گھوم رہے تھے کہ سدھیر بھائی آتے ہوئے دکھائی دئے ۔ انتہائی پریشان ۔ جیسے کسی کو قتل کرکے آئے ہوں ۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا "سدھیر بھائی ۔ بھائی صاحب ———" انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ بیری کی کانٹے والی کھدیان کے بیچوں بیچ وہ چپ چاپ کھڑے تھے ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی مجسمہ اپنی ناکام محبت کے جذبے میں ڈوبا ہوا ہے ۔ آنکھوں میں سرخی لہرا رہی تھی چہرہ تمتما رہا تھا اور سر کے بال رونگٹوں کی طرح کھڑے تھے ۔ "کیوں بھائی سدھیر ——— کیا ہوا بھائی؟" سدھیر کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے ۔ اس نے کہا "جیون میرا گھر لٹ گیا" ——— "گھر لٹ گیا؟" "ہاں کوسلیا کا پتہ نہیں ہے" "تو گئی کہاں" ——— "جاتی کدھر ۔ معلوم تو کیا ہوتا ———" سدھیر نے روتے ہوئے کہا "کرن کو جانتے ہو تم" میں سمجھ گیا ۔ "تو یہ ہوا کیسے" ریکھا ہنس پڑی ——— اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا چلو ڈیر جیون آج سدھیر کو سینما کی سیر کرائیں ———

میرے پیر زمین سے اکھڑ گئے ——— قریب کی کانٹی نے مجھے چاروں طرف سے جکڑ لیا ——— میں نے کہا ریکھا دیوی تم میرے پیر دھو ۔ مجھے بھگوان کا اوتار سمجھو ——— اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی ۔ میری پتنی !

افضل عابدی

من کی بپتا ۔ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے نے اس کتاب میں متوسط طبقہ کی خواتین کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کرکے زندگی کی تلخیوں سے کامیاب مقابلہ کرنے کے طریقے پیش کئے ہیں ۔ یہ کتاب بہت ہی دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہے خواتین اور خصوصاً موجودہ تعلیم یافتہ خواتین کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے ۔ اس کا ہر گھر میں ہر وقت موجود رہنا ضروری ہے ۔ صفحات (۸۰) قیمت مجلد ۸/

عشرت کو سینے ٹوریم میں آئے ہوئے چھ مہینے گزر چکے تھے، اس طویل مدت میں اس کے مرض نے بھی دوسرے درجے سے تیسرے درجے میں ترقی پالی تھی جب سے وہ یہاں آیا تھا اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی، حسرت نصیب اور تھکی ہوئی دنیا جس کا مستقبل ایک اتھاہ اندھیرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ۔ مگر کبھی کبھی جب وہ مس آرلی کو دیکھ پاتا تو اس کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہوتی جیسے اس کی جوت سے ساری دنیا تاباں ہو جائے گی اور اس کی اندھیری زندگی میں نور کی ایک کرن جگمگا اٹھے گی ۔ مگر وہ پھر یوں خاموش ہو جاتا جیسے دو عالم کا سکوت ہی اس کی تقدیر ہو ۔

اس کے سینے ٹوریم آنے کی داستان بھی کتنی دلچسپ ہے اور کتنی دکھ بھری ۔ وہ پوست دانشوان ہی تھا مگر اس کی شخصیت میں جیسے ارسطو و افلاطون چھپے ہوں ۔ جامعہ میں اس کی قابلیت اور ساتھ ہی خرابی صحت سے متاثر ہو کر ڈاکٹر فرینشی کہتے تھے کہ عشرت (KEATS) کیٹس کی طرح جواں مرگی کا داغ دے گا ۔ فلسفہ کے پروفیسر نے عشرت سے متاثر یہ کہا کہ روسیو کی طرح علمی نہ ہو ۔ ہاں اگر چاہتے ہو تو اس کا ال اور کیا اور کا علم اختیار کرو تاکہ تمہاری مخفی طاقتیں اجاگر ہو کر علم و ادب کا بیش بہا خزانہ ہو جائیں ۔ مگر عشرت کتابوں میں دفن گھلتا ہی گیا ۔ اس کی گرتی ہوئی زندگی کو سہارا دینے کے لئے طبیبوں نے بھی علاج تجویز کیا کہ وہ بیاہا جائے وہ صحت پائے گا، اس کی تقدیر بدلے گی اور دنیا بدلے گی ۔ توقع بھی یہی تھی کہ وہ رفیقہ کے ساتھ نباہ کرے گا ۔ رفیقہ میں یہ اعجاز تھا کہ اس کی شہابی آنکھیں اور وہ رخسار جیسے دو گلاب کھلے ہوں، یہ سب اس کی درماندگی اور بجھے ہوئے پن کو ختم کر دیں گے مگر اس کی زندگی میں بہار نہ آ سکی اور وہ خاندان والوں کے مشورے سے سینے ٹوریم بھجوا دیا گیا ۔

سینے ٹوریم میں وہ تنہا کہاں تھا؟ اس کے کئی ہم نصیب ایک بڑے ہال میں پناہ گزیں موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے ۔ اس کے آتے ہی تیسرے روز کشور نے اس ناتوانی میں اپنی آخری سانس لی کہ اس کے ختم ہو جانے پر بھی ڈاکٹر نے نبض ڈھونڈی کہ کہیں وہ آہستہ آہستہ ہی حرکت نہ کر رہی ہو ۔ اس کے ختم ہو جانے پر اس کی بہن سوشیلا نے منع کرنے کے باوجود کتنا کہرام نہ مچایا جب کہ کشور ہی اس کے مستقبل کا نگران تھا ۔ کشور کے ختم ہونے پر اب کون باقی رہا تھا جو اسے راستہ بتلاتا اور منزل دکھاتا ۔

اپنے وارڈ میں کئی ساتھیوں کو دیکھ کر اس کا جی یوں بیٹھ جاتا کہ وہ کل کی بجائے آج ہی مرجانا چاہتا ہے ۔ اس کو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ سینے ٹوریم صحت کے لئے نہیں بلکہ آنے والی موت سے مقابلے کی تیاری کے لئے بنایا گیا ہو ۔ اس کی کھانسی کے دورے اور بڑھ جاتے، اتنے بڑھ جاتے جیسے اس کے گلے میں کھانسی کا پھندا پڑ گیا ہو ۔ ایسے میں مس آرلی کی تیمارداری کچھ سکون بخشتی ــــ وہ مس آرلی سے مخاطب ہو کر کہتا کہ "نرس بہتر یہی ہے کہ تم اس مریض کی جانب زیادہ توجہ کرو جس کی کچھ امید ہے ۔ میں تو مہمان ہوں نہ جانے کونسا لمحہ ــ" وہ مسکرا کر یوں جواب دیتی کہ "وہ مریض تم ہی ہو"۔ آرلی کی توجہ اور خدمت گزاری میں وہ ایک معمہ پا رہا تھا ۔ جس کو وہ کوشش کے باوجود بھی حل نہیں کر سکتا تھا ۔ سارے وارڈ میں یہی مشہور تھا کہ اس سسٹر کا دماغ ساتویں آسمان پر ہے اور وہ ہواؤں میں اڑتی ہے ۔ اتنی بدمزاج نرس جس نے کل رشید کو اس قدر سخت ڈانٹ پلوائی کہ اگر وہ بار بار اپنی شکایت نرس سے کہتا رہے تو سینے ٹوریم سے نکال دیا جائے گا ۔ حالانکہ رشید زندگی کی آخری منزل میں تھا ۔ سخت تکلیف کے باعث کہہ اٹھتا تھا کہ پسلیاں ترخ رہی ہیں، ٹوٹی جا رہی ہیں ۔ شش میں یوں تڑک اٹھ رہی ہے جیسے بچھو ڈنک پیر ڈنگ لگاتے جا رہے ہیں ۔ مگر وہ بے پرواہ ہی ناول پڑھتی یا

کرتیں یا مصروف رہتی۔

عشرت سینے ٹوریم میں کیا آیا وہ کہیں سے کہیں پہونچ گئی۔ جب کبھی عشرت کو کھانسی کے پھندے پڑ رہے ہوتے ہڈیاں چٹ چٹا رہی ہوتیں وہ مضطربانہ دوڑتی ہوئی آکر دوا کا ایک خوراک دیتی یا آرام سے سلانے کی کوشش کرتی۔ سارے وارڈ کو چھوڑ کر عشرت کے پیچھے وہ یوں ہوتی کہ خود اپنا پتہ بھول گئی تھی۔ عشرت کے ایک بازو ولیم پڑا ہوا تھا جو ایک سال سے سینے ٹوریم میں تھا وہ جب کبھی اپنا ٹمپریچر مانگتا تو آرلی بائے سے کہہ کر آگے بڑھ جاتی۔ مگر عشرت کی حرارت وہ کئی بار لینے سے بھی اکتاتی نہ تھی۔ ولیم نے ایک روز عشرت سے کہہ بھی دیا کہ آرلی کے سیب و انار سے تمہارے چہرے پر خون دوڑ رہا ہے۔ مگر آرلی میں بھی ہر لمحہ ایک نئی بہار آرہی ہے۔ وہ جب تمہارے قریب آتی ہے تو مجسم بہار بن کر آتی ہے یہ اس کارواں رواں مست ہوا جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں چاندی جوت در آتی ہے اور تم بھی اس کے انار و سیب سے ــــ"

عشرت بے معنی ہنسی ہنس کر ولیم کو جواب دینا چاہتا تھا مگر ولیم پر سانپ سا لوٹ جاتا کہ اس کا وجود کئی مریضوں کو بد سے بدتر بنائے جا رہا ہے ــــ آرلی یہ چاہتی تھی کہ عشرت بھلا چنگا ہو جائے ــــ وہ آرلی کی دنیا کا محور بنا ہوا یوں گھوم رہا تھا جیسے اس کی زندگی کے دن پھر جانے والے ہیں۔ آرلی عشرت کے قریب محض اس لئے ہوئی جا رہی تھی کہ وہ ایک غیر معمولی مریض تھا۔ ایسا مریض اس سے پیشتر سینے ٹوریم میں کبھی نہ آیا۔ جو درد اور کرب کے انتہائی عالم میں بھی چیختا چلاتا نہ تھا بلکہ اپنی مٹھیاں بھینچتا ہوا پیر اکڑاتا ہوا ہونٹ سکیڑ کر درد و غم کو شکست دینا چاہتا تھا۔ کھانسی کے سخت حملوں میں بھی اپنی آپ مدد کر لیتا مگر نرس کو نہیں پکارتا۔ جب کبھی لے میں آتا ہے تو اقبال کا کلام گنگنا لیتا یا دریچے میں سے ان میدانوں کو دیکھتا جہاں صبح و شام دِق کے مریض کھلی ہوا لینے کے لئے قدم قدم لنگڑاتے لنگڑاتے یا پہیے دار کرسیوں پر گھوم رہے ہوں۔ اس کی آنکھوں میں اس کی شخصیت میں ایک طلسم تھا جس میں وہ گرفتار ہوئی جا رہی تھی۔ اس سینے ٹوریم کی دنیا میں اس کے لئے خواں کے سوا اور دھرا ہی کیا تھا ــــ تمام ڈاکٹر یہی ڈاکٹر یا مریض ہی مریض ــــ ڈاکٹر تو تمام نرسوں کے دوست تھے ــــ آرلی، آلمیڈا، مائیکل، روزالی اور تمام ــــ اس لئے آرلی ان ڈاکٹروں سے ناامید تھی۔ ایک مرتبہ اس کی زندگی میں صبح طلوع ہوئی تھی جب کہ شمالی ہند کے طبی کالج کے لڑکے عملی تعلیم حاصل کرنے سینے ٹوریم آئے تھے۔ ان میں کلیم نے آرلی کو مسحور کر رکھا تھا۔ جب تک کلیم سینے ٹوریم میں رہا آرلی کو دو جہاں حاصل تھے اور جب وہ چلا گیا یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ اب اس کی دنیا میں مرتے ہوئے جسموں کی کراہ، کھانسی کا وہ شور جیسے رہٹ چل رہے ہوں۔ خرر کھرڑ ــ آق ــ آہ، اوہ ــــ سسکیاں، آہیں، ٹوٹتی ہوئی سانسیں، چھوٹتی ہوئی نبضیں ــــ پتھرائی ہوئی آنکھیں۔ ٹھنڈے جسم اور بسورتے ہوئے چہرے۔ ان کے سوا اور دھرا ہی کیا تھا ــــ" وہ ان کو دیکھتے دیکھتے اس قدر برہم ہو چکی تھی کہ اس کو قرار نہ تھا۔ جب عشرت سینے ٹوریم آیا تو وہ اپنے میں آپ آتی گئی اور اس کے قریب سے قریب تر ہونے لگی ادھر آرلی میں یہ تبدیلیاں ہوئیں اور ادھر عشرت میں ایک انقلاب آیا۔ آرلی کے دلنشین خطوط میں اس کو رفیعہ جھلکتی دکھائی دی۔ آرلی کی مرمریں بانہیں ان پر نیلی رگیں ابھرے ہوئے بازو، یاقوت جیسے لب، چہرہ کے دلنشیں نقوش یہ سب رفیعہ میں رچے نظر آئے جس نے اپنا گہنا یا تا بیچ کر عشرت کو سینے ٹوریم بھیجا تھا ــ وہ آرلی کے حسن و جمال کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔ گو کبھی کبھی وہ یہ سوچنے لگتا کہ آرلی کی گفتگو اور اس کا عمل اپنے اندر ایک معنی لئے ہوئے ہیں

یہاں آکر وہ رک جاتا اور انھیں تلاش کرنا شروع کرتا۔ اس لمحہ اس پر بحرانی عالم طاری ہو جاتا۔ کھانسی، سسکیاں، کراہ یہ سب اسے علامتِ حقیقت گرداننا کر نجات دلاتی۔ آرلی کی اس نجات دہندگی سے وہ یہ سمجھ بیٹھتا کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ جب کبھی رات میں آرلی کی ڈیوٹی رہتی اس کا سائنسی ڈاکٹر اس کو یوں دیکھتا جیسے وہ آرلی کو کائنات کے رموز و نکات سمجھانا چاہتا ہے۔ ایک مرتبہ آرلی نے بھی اس سے کہا تھا کہ سینے ٹوریم میں اکثر جواں عمر جواں سال مریض ہی آتے ہیں نہ جانے گھل گھل کر مرنے والے یہ نوجوان ہی کیوں ہوتے ہیں۔ اس مرض سے اس کو سخت نفرت ہے۔ وہ اس کو ہندوستان کی خوش قسمتی سمجھتی ہے کہ لیڈی لنلتھگو ہندوستان کو ایک بڑے دشمن سے نجات دلا رہی ہیں۔ ہزاروں دلہنوں کا سہاگ، ہزاروں معصوموں کے باپ یہ سب برقرار و زندہ رہیں گے"۔ جب وہ ان معنوں کو سمجھ جاتا تو آرلی اس کے لئے کوئی دشوار معمہ نہ رہتی۔

وہ آرلی کے سہارے ہی بڑھتا رہا ــــ بڑھتا رہا!

ایک صبح وہ بہت مسرور تھا ــ غالب اور داغ کی غزلیں گنگناتا ہوا مسکرا پڑتا تھا۔ اس کی رقصاں مسرت اور سرور دیکھ کر آرلی شاداں شاداں چلی آئی ــ اور یہ یقین لے کر آئی کہ آج اپنے دل کی تمام کیفیتیں اور سارے راز عشرت کو سنا دیگی۔ آرلی کو دیکھتے ہی قہقہہ اور خندہ میں بے خود عشرت پکار اٹھا "سسٹر آرلی آج میری رفیعہ آرہی ہے ــ تم جیسی ہی شکیل، خوبصورت، دلفریب اور مہ پارا ــــ پیاری گڑیا"ــ

آرلی کی آنکھوں میں دھندسا چھا گیا۔ رخساروں پر کھلے ہوئے گلاب چند لمحوں کا روپ دھار گئے ــــ چاند سے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور دو جہاں لرز کر منہدم ہوتے دکھائی دئے۔ وہ ایک مجسمہ بنی عشرت کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی ــ آنکھوں میں آنسو بھر آئے ــ لیکن نہ جانے اس کے کیا سمائی کہ دوسرے ہی لمحہ وہ تھرما میٹر اور چارٹ لئے تمام مریضوں کی حرارت لینے لگی۔ عشرت پر سکتہ سا ہو گیا ــ وہ رفیعہ آنے کے بعد بھلا چنگا سینے ٹوریم سے چلا گیا۔

سینے ٹوریم کی فضا میں دوائیاں، انجکشن، اسٹریچر، پہیے دار کرسیاں، بیڈ پان، مریض، ان کی کراہیں، سسکیاں، یہ سب آرلی کو ایک افسانہ سناتے ہیں۔ ولیم نے ایک روز آرلی سے پوچھا ــــ "وارڈ بائے کہتا تھا کہ دق کے مریضوں کی روحیں شیطان بن کر ستاتی ہیں" آرلی نے گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا ــــ "صرف مردوں کی نہیں بلکہ زندوں کی روحیں بھی" وہ یوں سہم کر آگے بڑھی کہ ولیم بھی خوفزدہ ہو گیا ــ اس نے اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ بنیان ہٹا کر اپنی پسلیاں گنیں، پوست و استخواں کو باہم دگر دیکھا ــــ اور خود کو زندہ بھوت سمجھا ــــ اور یہ سمجھا کہ اسی کو دیکھ کر آرلی خوفزدہ ہو گئی ــــ حالانکہ وہ عشرت کا بھوت تھا ــــــ بیچارہ ولیم کیا خوب سمجھا ــــــ آرلی کو عشرت کا زندہ بھوت ڈرا رہا تھا، وہ سراسیمہ بنی، خیالوں میں الجھی نہ جانے آگے کدھر بڑھ رہی تھی ــــــ سینے ٹوریم میں رہ کر وہ سینے ٹوریم کے باہر ایک زندہ بھوت سے کھیل رہی تھی۔

محبوب حسین جگر

اطلاع: ــ نئے سال کا چندہ روانہ کر کے شکریہ کا موقعہ عطا کیجئے۔ مطبوعہ رسید کے بغیر چندہ نہ دیجئے۔ اضلاع کے خریداروں کے نام رسالہ بذریعہ وی پی بھیجا جا رہا ہے۔ وقت پر وی پی حاصل فرمالیں

مہتمم

دورِ اوّل

[illegible] خاک کے [illegible] قسمت [illegible] چھائی ہیں
تاریک کرے جو دنیا کے حیرت کی گھٹائیں چھائی ہیں

[illegible] جہالت کی تحصیل سے وہم و دراہ نہیں
اب تشنۂ بینش ہیں آنکھیں سینوں میں دلِ آگاہ نہیں

[illegible] ہنگامۂ جہل و نادانی
خود اپنے لہو سے کھیل رہا ہے صاحب [illegible]

ہر دل کی مسرت پنہاں ہے اک مہرِ کہن خودبینی میں
ہر روح کو تسکیں ملتی ہے اک محشرِ بے آئینی میں

دہقاں کے لہو کی جنسِ گراں خاشاک سے بڑھ کر سستی ہے
سرمائے کی لعنت ہر جانب سرحلقۂ بزمِ ہستی ہے

یہ وقت ہے اب انساں کو سبق نیکی کا سکھایا جائے گا
پندارِ غلط کے سر بہ فلک مینار کو ڈھایا جائے گا

آیا ہے پیامِ موسمِ گل ترتیبِ چمن کی جائے گی
آراستہ پیراں پھولوں سے ہستی کی دلہن کی جائے گی

عرفانِ حقیقت کی شمعیں ہر گھر میں جلائی جائیں گی
بھٹکی ہوئی بھیڑیں دنیا کی اب راہ پہ لائی جائیں گی

قرونِ وسطیٰ

(۲)

ذروں کو تجلی دی میں نے، پھولوں کو تبسم میں نے دیا
موجوں کو سبک سیری بخشی، پھر ذوقِ ترنم میں نے دیا

اسرارِ حقیقت ملتے تھے، دنیا کو مرے افسانوں میں
اجزائے سکوں سرمد تھے بیدار مرے طوفانوں میں

اک عمر کی پیاسی دنیا کو صہبا نے مری سرشار کیا
مدت کی سسکتی روحوں کو نغموں نے مرے بیدار کیا

دانش کی حقیقت سمجھائی انسان کو انساں میں نے کیا
فطرت کے نہفتہ رازوں کو بے پردہ نمایاں میں نے کیا

عہدِ حاضر

(۳)

پھر لے کے وہی بے آئینی ہنگامۂ باطل اٹھا ہے
ہلتی ہیں جڑیں پھر دنیا کی اک حشر کا عالم چھایا ہے

ہستی کا فریبِ آسایش ایوانِ عمل ڈھا کر ہی رہا
وہ طائرِ ناداں ہے انساں اس دام میں جو پھر آکر ہی رہا

اک لہر سی ظلمت کی پنہاں آئینۂ جانِ پاک میں ہے
پیمانۂ گل ہے دور میں لیکن انجمن خاشاک میں ہے

انساں کو خبر دو زلزلہ آگیں بادل چھانے والا ہے
ہے گونج ابھی باقی جس کی طوفاں وہ پھر آنے والا ہے

حسرت کے یہ اجزا بکھریں گے یہ موجِ طرب رک جائے گی
لہرائیں گے پرچم عرفاں کے دانش کی جبیں جھک جائے گی

کانپے گی زمیں لرزے گا فلک ایوانِ سکوں ویراں ہوگا
اقرارِ غلط اندیشی پر مجبور یہی انساں ہوگا

سارا یہ ہجومِ خار و خذف اب صرف ہوا ہو جائے گا
اس سیلِ رواں میں باطل کا ہر نقش فنا ہو جائے گا

علی اختر

آگہی

(جمیل نے اس نظم میں جدلیاتی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے یہ انداز نظر اردو کے شعری ادب کے لئے نئی چیز ہے)

وجودِ خارجی مجھ سے جدا ہو اک حقیقت ہے
سوائے مجھ سے ہر شے ہو خیال جس کی علت ہے
مرے احساس خارج سے ہی تخلیق تخیل ہے
اسی احساس پر قائم تمیز سنبل و گل ہے
زمین و آسماں میرا تو ہم ہو نہیں سکتے
محض وہم و گماں یہ ماہ و انجم ہو نہیں سکتے
یہ دھوکا ہے کہ خارج کو خیالِ خام سمجھا ہے
اس عالم کو کسی کی جلوہ گاہِ عام سمجھا ہے
مرے ہست و عدم پر گر جہاں معدوم ہو جاتا
میں کیا معدوم ہوتا کل جہاں معدوم ہو جاتا
وجودِ مادیت سے ہے سوزاں شمع عقلیت
اسی کے نور سے روشن ہے راہِ اصلیت
شعورِ داخلی گر خالقِ کون و مکاں ہوتا
مرے منشا پہ ہی مبنی وجودِ دو جہاں ہوتا
خرد کے نشتروں سے فاش کر دے راز ہستی کے
جنوں کی موت کو رنگیں بنا تقدیر کے خوں سے
یہ ذوقِ شغلِ تعبیر زمین و آسماں کب تک
غلط تفسیر کے گھائل رہیں یہ جسم و جاں کب تک
مرے فکر و عمل سے یوں مری تقدیر بنتی ہے
مصور کے ہنر سے جس طرح تصویر بنتی ہے
جنوں کا آسرا لے کر یہ دنیا چل نہیں سکتی
توہم کی فضاء میں شمع ہستی جل نہیں سکتی

جمیل احمد فاروقی

کنول

گاؤں کا تالاب بڑا تھا پانی سے بھرپور
چھوٹا لڑکا ڈوب رہا تھا اپنے گھر سے دور
پانی پانی چار طرف اس پانی میں مجبور

پانی پانی چار طرف وہ لڑکا گھبرا جائے
ڈوبے تو کچھ پانی پی لے ابھرے تو چلّائے
پاؤں پٹکے گردن جھٹکے پھر بھی ڈوبا جائے

ہاتھ اٹھائے لاکھ مدد کو ہاتھ بڑھائے کون!
چیخ پکارا کون سنے اور سن کر آئے کون؟
جس کو اجل نے تاک لیا ہو اس کو بچائے کون!

دوسرے دن جب صبح سویرے لوگ گئے تالاب
سب نے دیکھا ایک کنول کا پھول بروئے آب
ایک کنول کا پھول نہایت لال حسین شاداب

سید ظہیر الدین احمد بابر

میری آواز

یہ ساون کا موسم یہ ہنستی بہار — یہ کیف و تبسم، یہ پھولوں کے ہار
شبِ ماہ کا یہ مہکتا سہاگ — یہ جھرنے کے سازوں پہ تاروں کا راگ
یہ لہروں کی لرزش میں رقصِ نجوم — یہ ہر سمت رنگینیوں کا ہجوم

پلا ساقیا! آج ایسی شراب
عطا جو کرے مستقل اضطراب

ملے جس سے مجھ کو نشاطِ جنوں — نشہ جو کرے زندگی کا سکوں
مری زندگی ہے مسلسل جمود — میں ہوں ایک ہنگامۂ ہست و بود
مری زندگی اک تمنائے خام — مری زندگی نغمۂ ناتمام
مری زندگی اک ادھورا خیال — مری زندگی جلوۂ بے جمال

پلا ساقیا! اپنے ہاتھوں سے جام
عطا کر مجھے مستیوں کا مقام

ترا نقشِ تعمیر یہ کائنات — ترا حسنِ معصوم جانِ حیات
رخِ ماہ میں تیرا عکسِ جمال — رخِ مہر میں یہ ترا نقشِ جلال
گل و لالہ تیرے یہ تیری بہار — ترے کوہ و دریا ترے آبشار
ترے ہاتھ میں زندگی کا نظام — زمیں سے فلک تک ترا اہتمام
کبھی تو تمنا کبھی آرزو — مرے قلب میں تو، نگاہوں میں تو
ترے عرش و کرسی ترا کوہِ طور — بحدِ نظر تیرا دامانِ نور

کوئی لے نہیں ایک جھنکار ہے
بتا کیا یہی تیرا شہکار ہے

نہ سینے میں دل کا وہ سوز و گداز — نہ ذوقِ تمنا نہ ذوقِ نیاز
نہ روحوں میں گرمی نہ سینوں میں آگ — نفس کے بڑھاپے میں بے جان راگ
نظر بہکی بہکی نفس سرد سرد — مرے ولولے دفن ہیں زیرِ گرد

مرے خوابِ ہستی کی تعبیر دے
مرے ہاتھ میں میری تصویر دے

مرے شوق کو اپنے قابل بنا — مرے دل کو دے حوصلے دل بنا
مرے درد کو زندگی بخش دے — مجھے گرمیٔ بندگی بخش دے
درِ میکدہ رات دن کھول دے — مرے خون میں بجلیاں گھول دے

۔ لوٗمہ

اُداس لمحے

ہستی نے غموں میں آنکھیں کھولیں درد بھرا دل ڈھونڈھ لیا
موجوں کی کشاکش میں کشتی نے اپنا ساحل ڈھونڈھ لیا
دامانِ تبسم میں غم کے اشکوں کی جوانی سوتی ہے
ہر نغمے کی گہرائی میں اک دل کی دھڑکن ہوتی ہے
ہر موسمِ گل انجامِ طرب میں فصلِ خزاں دے جاتا ہے
خورشید چمکتا ہے دن بھر اور خوابِ گراں دے جاتا ہے
گم ہو جاتی ہیں تدبیریں آگے بڑھ کر تقدیروں میں
یہ وہم و حقیقت کی دنیا بے تاب سی ہے تعبیروں میں
اک فکر و نظر کا زعمِ غلط ہستی کو ڈستا رہتا ہے
ہر لمحہ نیا غم دل کی تمناؤں میں بستا رہتا ہے
اک جبرِ مسلسل کے ہاتھوں دم توڑ رہی ہے مختاری
اک خوابِ پریشاں لوٹ رہا ہے ہر کروٹ میں بیداری
ہر سانس ہے اک آوازۂ اجل ہستی کا سفینہ کھیتی ہے
ہر ساعتِ فطرتِ گیتی کو اک حوصلۂ غم دیتی ہے

میکش

شاعرِ مشرق کی یاد

اقبال کو گزرے ہوئے چھ سال ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں اس کے بلند افکار سے بقدرِ فہم استفادہ کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اس کا عہدِ حیات ایک متحرک اسلامی زندگی کی تخلیق تھا اس لیے اگر اس کے پیام نے اپنی کشش سے انسانیت کو اپنی طرف کھینچا ہو تو تعجب کی بات نہیں۔ وہ ادب کا نقیب نہ رہ سکا جس میں حیات آفرین تازگی ہو۔ اقبال کی ادبی تخلیق حال کو سنوارتے ہوئے ایک بلند تر مستقبل کی تعمیر کے لیے تھی۔ نقطۂ رسی اور تصور سازی کے اس تغیر پذیر دور میں جب کہ زندگی اپنے لیے ایک صحت بخش راستہ ڈھونڈ رہی ہے، اقبال کا آرٹ ہمیں ایک روشن شمع کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

اقبال ایک ارتقائی شاعر تھا۔ اس کی مسلسل فکری تبدیلیاں بتاتی ہیں کہ وہ اپنے فنِ کمالِ تخیل کے لیے ہر لحظہ وسیع تر ماحول ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ تقلیدی اثر اس کے کلام میں بہت دن تک نہیں رہ سکا جو دراصل ماحول کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد اس کی منظر پرستی اور اس کا احساسِ وطنیت بھی زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا اور رفتہ رفتہ اس کی فکر و نظر نے اس کی ذہنی پختگی اور اس کی ذہنی وسعت کو اسلام کے توسط سے ساری انسانیت پر پھیلا کر دیا اور یہاں ہمیں اس کی شخصیت اور اس کا آرٹ اپنے اصلی روپ میں دکھائی دیتا ہے۔

اقبال نے اس آرٹ سے بیزارگی کا اظہار کیا ہے جس میں بھیڑیوں کے حسن کا جادو شیروں کو سلا دیتا ہے۔ آرٹ افیونی کا خواب بیداری نہیں اور نہ ایسی نامعلوم منزل ہے جہاں سے کسی رہرو کا پلٹ آنا ممکن نہ ہو۔ اس کے نزدیک آرٹ منزل نہیں بلکہ منزل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آرٹ بجائے خود حسن ہے جس کی حرارت دلوں میں ایک ولولہ ایک جستجو اور ایک خواہش پیدا کرے۔ اس کے نزدیک آرٹ کا مقصد ایک مسلسل حرکت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسن کار ایک بلند پرواز شہباز کی طرح فلک پیمائی کر سکتا ہے لیکن اسے اتنا اختیار ہونا چاہیے کہ وہ اپنے شکار کے پیچھا تر سکے۔ آرٹ مزاج کا تابع نہیں بلکہ اس کا ناقد اور حسن کار کے حقیقی جذبات کا مظہر ہے۔ اس نے ایک مقام پر بتایا ہے کہ آرٹ آزادی کا حصہ ہے۔ غلامانہ ذہنیت اس سے گریز اور فرار کا کام لیتی ہے۔ غلاموں کے الفاظ تماشائیوں کے لیے جاذبِ نظر ہوتے ہیں لیکن آزاد قوموں کے حسن کارانہ نقوش اربابِ نظر کو معنی کی گہرائیوں میں لیجاتے ہیں۔ حسن خود ہم میں موجود ہے لیکن غلام فکر حسن کو فطرت سے مستعار لے کر اس کی نقل اتارتی ہے۔ غرض یہ کہ اقبال کے نزدیک آرٹ ایک اظہار ہے جو ایک خواہش کی تخلیق اور حقیقت کو تشکیل کرتا ہے۔

اقبال کا آرٹ، شہنائی کا دردناک نغمہ نہیں بلکہ ایک بانگِ درا ہے۔ وہ لوری نہیں بلکہ ایک پیامِ بیداری ہے۔ وہ مفلوں کا کفن نہیں بلکہ حرکت و حیات کا ایک پرچم ہے۔ اس کی علوِ خیالی، اس کی وسعتِ نظر، اس کی حسن کارانہ صداقت اور اس کا خلوصِ اظہار ان سب کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ انسانیت کو اس کے صحیح مقام پر دیکھے۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ دنیا نظر فریب تصورات کے ہجوم میں انسانیت کے لیے ایسے مقام کو ڈھونڈ رہی ہے جہاں تاجدار قبروں کی تقسیم میں لاشوں کو روندتے ہوئے نہ گزریں۔ اقبال کا کلام اور اس کا پیام ہماری صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ آج چھ سال کے بعد بھی ہماری عقیدت مندی اس کا خراجِ تحسین ادا کرنے میں اسی طرح فخر محسوس کر رہی ہے اور ہمارا مستقبل "تعمیرِ نو" میں مدد لینے کے لیے اس کے پیام سے بنیادیں مانگ رہا ہے۔

میکش

اقبال

شاعری اور شاعروں کی نسبت ہمیشہ سے مختلف قسم کے خیالات دنیا میں مروج رہے ہیں۔ کبھی کوئی قوم قدیم عربوں کی طرح شعر کو ایک اعجاز اور شاعر کو قوم کے لئے ایک سرمایۂ قوت تصور کرتی تھی۔ اور قبیلے میں شاعر کا ظہور ایک نعمت عظمیٰ خیال کیا جاتا تھا۔ کبھی یہ ہوا کہ شعر اور اس کے ساتھ شاعر ایسا ذلیل ہوا کہ سقراط اور افلاطون جیسے مصلحین نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنی مجوزہ تصوری مملکت میں سے یا تو شعرا کو بالکل خارج کر دیا جائے یا ان پر بڑے زور کا احتساب قائم کیا جائے کہ وہ قوم کو اخلاقی ضرر نہ پہنچا سکیں۔ مسلمانوں کی نسبت عام طور پر یہ رائے صحیح ہے کہ یہ قوم ہمیشہ ایک شعر پسند قوم رہی ہے۔ لیکن جہاں شعر سے اکثر ناجائز کام لینے کا رواج عام ہوا وہاں مسلمانوں میں بھی شعرا اور شاعر پاکبازوں اور مصلحین کی نظروں سے گر گئے۔ خود مولانا روم جن کی تمام تر تصنیف منظوم ہے فرماتے ہیں کہ میرے وطن میں شاعری کو بہت ذلیل خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے میں عام اور خاص کی تلقین کے لئے اس امر پر مجبور ہو گیا کہ اپنے جذبات اور افکار کو نظم میں ادا کروں۔ شاعری اگر اپنی غلط روی سے ذلیل بھی ہو جائے تو بھی اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اس میں سحر اور قوت باقی رہتی ہے۔ افلاطون نے شاعروں کو بہت برا بھلا کہا لیکن وہ خود اپنی نثر میں بھی کسی بلند پایہ شاعر سے کم نہیں۔ مولانا حالی نے جب قوم کے اخلاقی انحطاط کے وجوہ پر نظر دوڑائی تو وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس تخریب میں ایک زبردست عامل وہ شاعری بھی ہے جو صدیوں سے غلط راہ پر پڑ کر قوم کے تخیلات اور جذبات کو خراب کر رہی ہے۔ شعر و قصائد کے ناپاک دفتر کے خلاف انھوں نے احتجاج کیا۔ ان کے یہ شعر مشہور ہیں۔ لیکن اس میں لطیفہ یہ ہے کہ شاعروں کی مذمت کے لئے بھی وہ شعر کہنے پر ہی مجبور ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعر کس قدر فطری اور ناگزیر قوت ہے۔ اس قوت کا صحیح استعمال وہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے جو کسی اور ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے برعکس اس کا غلط استعمال احساسات اور فطریات حیات میں وہ خرابی پیدا کر سکتا ہے جو قوم کی رگوں میں سم قاتل کی طرح دوڑتی رہے۔ شاعر اگر اپنی قوت کا صحیح استعمال کرے تو تلمیذ الرحمٰن ہو جاتا ہے۔ اگر غلط استعمال کرے تو تلمیذ الشیطان بھی بن سکتا ہے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ اگر میرے ترانے کسی قوم میں رائج ہو سکیں تو میں قطعاً اس کی پرواہ نہیں کروں گا کہ اس قوم کے لئے قوانین کون بناتا ہے۔ شعر کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے۔ اور دلوں کی کیفیات پر باقی تمام زندگی کا مدار ہے۔ حضرت اکبر فرماتے ہیں کہ

"دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے"

اور تعلیم میں سب سے زیادہ موثر چیز وہ ہے جو شعر کے ذریعے سے اثر پیدا کرے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو بہت سے اچھے اشعار یاد تھے اور وہ اکثر لوگوں سے فرماتے تھے کہ اپنے بچوں کو اچھے اشعار یاد کرایا کرو۔

ایک بلند خیال شاعر کا وجود نوع انسان کے لئے بڑے روحانی فیض کا باعث ہوتا ہے۔ اچھی شاعری نبوت کا

یک جز ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی نبی کو لوگوں نے شاعر سمجھ لیا۔ اور بعض شاعر اگر نبی نہیں تو کم از کم متبنی ہو گئے۔ حضرت اقبال کو فطرت نے یہ ملکہ غیر معمولی مقدار میں ودیعت کیا۔ شروع میں انھوں نے کسی قدر تقلیدی اور رواتی شاعری بھی کی اور ایک زمانہ ان پر ایسا بھی آیا کہ ان کو خیال پیدا ہوا کہ ان کی قوم شاعری سے سست عمل ہو گئی ہے لہذا بہتر ہو اگر شاعری کی شراب کی کشید اس قوم کے لئے بند کر دیجائے اور کوئی علمی اور عملی کام کیا جائے۔ اپنے دوست سر عبدالقادر کے سامنے انھوں نے اس ارادے کا اظہار کیا۔ یہ اسی زمانہ کا مصرع ہے:-

کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں، انھیں مذاق سخن نہیں ہے

سر عبدالقادر اور سر آرنلڈ نے ان کو یقین دلایا کہ تمہاری شاعری وہ شاعری نہیں ہے جو عمل کی منافی ہو۔ بلکہ اس کے ذریعے سے تم قوم کے اندر زبردست قوت عمل پیدا کر سکتے ہو۔

اس کے بعد حضرت اقبال نے ترک شاعری کا خیال چھوڑ کر شاعری سے وہ کام لینا شروع کیا جو اردو اور فارسی شاعری کی تاریخ میں کسی دوسرے شاعر نے نہیں لیا۔ شاعری کی جو عام کیفیت اقبال سے پہلے تھی۔ اس کا نقشہ کھینچنا یہاں مقصود نہیں ہوس پرستی قافیہ پیمائی زبان کا چٹخارہ عام شاعری کا سرمایہ تھا۔ حالی نے دوسری روش اختیار کی تو شاعروں نے کہنا شروع کیا کہ یہ شاعر نہیں واعظ ہے۔ اسی طرح مدت دراز تک شاعروں نے اقبال کو بھی شاعر نہیں سمجھا جس زمانہ میں میں طالب علم تھا اقبال کی مشہور نظمیں شمع و شاعر شکوہ اور جواب شکوہ شائع ہوئیں۔ میرے سامنے انھوں نے اس امر کا نہایت افسوس ظاہر کیا کہ ہماری قوم کے نقاد کسی نظم کی نفسیات پر تنقید کرنا نہیں جانتے۔ اپنی نظموں پر جب کبھی کوئی تنقید دیکھتا ہوں تو اس میں یہی ہوتا ہے کہ فلاں لفظ کو دہلی یا لکھنؤ والے مذکر باندھتے ہیں، اقبال نے مونث باندھا۔ فلاں محاورہ ٹکسالی نہیں ہے۔ فلاں مصرع میں پہلوئے ذم بھی نکلتا ہے۔ کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں کہتا کہ یہ نظم تاثیر کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس کا نظریۂ حیات کیا ہے۔ فقط حضرت اکبر الہ آبادی نے ان کو لکھا کہ میں آپ کی نظم شمع و شاعر کو پڑھتا نہیں بلکہ اس کی تلاوت کرتا ہوں۔ اور سوتا ہوں تو اس کو اپنے تکیہ کے نیچے رکھتا ہوں جب اقبال کی شاعری رفتہ رفتہ مقبول خاص و عام ہو گئی۔ اس وقت بھی بعض مشہور شاعر اقبال کو شاعر نہیں سمجھتے تھے اور بعض ایسے شعرا اب بھی موجود ہیں اگر کبھی داد دینے میں فراخدلی برتتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ بھائی اس کو حکیم کہو فلسفی کہو مصلح کہو لیکن شاعر نہ کہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی شاعری کو اور متقدمین اور متاخرین میں اپنے جیسوں کی شاعری کو معیار قرار دے لیا ہے۔ اور اقبال ان کو اس معیار پر کم عیار معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت اقبال کی بلند نظری کا تقاضا کہ انھوں نے ایسے لوگوں سے کبھی الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے لبوں پر بھی غالباً وہی مصرعہ آتا ہوگا جو حضرت مسیح کی بابت انجیل میں مرقوم ہے کہ انھوں نے اپنے ایذا رسانوں کی نسبت فرمایا کہ اے خدا انھیں معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ حضرت اقبال کے ہاں شاعری کا مقصد اور اس کا معیار اس قدر مختلف ہو گیا تھا کہ یہ لوگ اقبال کو شاعر نہیں سمجھتے تھے اور اقبال ان کو شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ایک شاعر نے اپنا دیوان میرے پاس بھیجا ہے۔

یہ مشہور آدمی ہیں میں نے شروع سے آخر تک مختلف نظموں پر نظر دوڑائی۔ کہ خدا کا بندہ کہیں بھول کر کوئی شعر کہہ جائے لیکن مجھ کو کس
کر تمام دیوان میں ایک شعر بھی نہیں نکلا حضرت اقبال نے شاعری کا معیار اتنا بلند کر دیا کہ ان کے سامنے اور ان کے بعد بھی
اب روایتی غزل گوئی اور قافیہ پیمائی لوگوں کی نظروں میں نہیں جچتی۔ اگرچہ حضرت اقبال کے اثر اور ان کی ہر دلعزیزی سے
اردو شاعری میں ان کی نقالی کا ایک طوفانِ بے تمیزی بھی پیدا ہو گیا ہے۔ جس اخبار یا رسالے کو اٹھاؤ ایک یا دو نظمیں ایسی ضرور
مل جائیں گی جن میں کسی نہ کسی صاحب نے اقبال بننے کی کوشش فرمائی ہے۔ ان نظموں کا معیار اکثر بہت پست ہوتا ہے۔ لیکن بے اصل
ہوس پرستی کے تغزل کے مقابلہ میں یہ بھی غنیمت معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت اقبال کی شعر گوئی میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ کبھی فرمائشی
نظم نہیں لکھ سکتے تھے۔ ابتدا میں وہ ایک مشاعروں میں شریک ہوئے اس کے بعد تمام عمر کبھی کسی مشاعرے میں شریک ہونے کی خواہش ان کے دل پیدا
نہیں ہوئی۔ لوگ ان کی طبیعت کے اس انداز سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ لاہور میں بڑے بڑے معرکے کے شاعرے ہوتے
تھے۔ لیکن کبھی کوئی شخص حضرت اقبال کو مدعو کرنے کی بھی جرأت نہیں کرتا تھا۔ مشاعروں میں شعر پڑھنا تو درکنار احباب کی
صحبتوں میں بھی وہ کبھی کبھار اپنی مرضی سے کوئی شعر یا نظم سنا دیں تو سنا دیں ورنہ نہ وہ عام طور پر شعر سناتے تھے۔ اور نہ ان
کی طبیعت کو جاننے والے ان سے شعر سنانے کی درخواست کرتے تھے۔ جب وہ حیدرآباد تشریف لائے تو ایک مشہور شاعر نے ان کو
اپنے ہاں مدعو کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اپنا کلام سناؤں گا اور ان کا کلام سنوں گا۔ اس بے چارے نے اپنا سر پیٹ لیا۔ لیکن حضرت
اقبال نے ایک شعر سے بھی ان کی دعوت کی قیمت ادا نہ کی۔ اور اس سے زیادہ صدمہ اس شاعر کو اس بات کا ہوا کہ حضرت اقبال
نے بھی اس سے فرمائش کی کہ حضرت کچھ اپنا کلام سنائیے۔ یہی حال ایک بڑے امیر و کبیر کی محفل میں ہوا جس نے بہت سے امیروں
اور قافیہ پیماؤں کو ان سے ملنے کے لئے جمع کیا تھا۔ حضرت اقبال نے اس شرط پر دعوت قبول فرمائی کہ میں شعر نہیں پڑھوں گا۔
ایک دفعہ مجھ سے فرماتے تھے کہ میں نے کبھی شعر کی خاطر شعر نہیں کہا۔ جب تک خاص کیفیت خود بخود پیدا نہ ہو میں شعر نہیں کہتا میں
آورد سے شعر کہنے کا قائل نہیں ہوں۔ ایک مرتبہ دنیاوی حیثیت سے ایک بہت بلند ہستی کا نزول اجلال علی گڑھ میں ہوا۔
یونیورسٹی کی طرف سے ایک مقتدر بزرگ لاہور تشریف لائے اور علی گڑھ کے ارباب حل و عقد کی طرف سے گزارش کی کہ یہ
ایک بڑا اہم موقع ہے۔ آپ علی گڑھ تشریف لائیے اور ایک نظم پڑھ دیجئے۔ دن بھر وہ صاحب ان کی منت سماجت کرتے
رہے کوئی بھی اور شاعر ہوتا تو اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا لیکن اقبال تھے کہ بالکل ٹس سے مس نہ ہوئے بالآخر
جب تنگ آ گئے تو خالی ٹالنے کے لئے یہ فرمایا کہ اچھا بھئی آج رات میں حسب موقع اور حسب حال اگر کچھ اشعار موزوں ہو گئے
تو کل تمہارے ساتھ علی گڑھ چلوں گا۔ دوسرے روز وہ صاحب ان کے حکمت کدہ پر پھر کچھ امید لے کر حاضر ہوئے ہم بھی
ان کے ہمراہ تھا پوچھا۔ فرمائیے کہ کچھ الہام ہوا یا نہیں۔ جواب ملا کہ کل رات میں جلد ہی بستر پر اس خیال سے لیٹ گیا اور
حقہ پاس رکھوا لیا کہ کچھ شعر اس موقع کے مناسب نازل ہوں لیکن شعر بھی عجیب چیز ہے۔ بلانے سے نہیں آتا۔ بن بلائے
آ جاتا ہے۔ آپ کی مطلوبہ نظم کا ایک شعر بھی نازل نہیں ہوا۔ مگر ایک موضوع کی نظم خود بہ خود موزوں ہونے لگی اور بن بلائے

بیگ کی طبیعت بحال ہو گئے۔ تبسم سے فرمانے لگے کہ اب تم ہی کرو۔ چلے جاؤ اور میری طرف سے ایک نظم پڑھ دو۔ میں نے عرض کیا کہ کہاں آپ کی نظم کہاں میری نظم۔ وہاں ہیں اگر اعتراض کیا گیا کہ یہ کیا ہے تو انجام میں اختراع بھی اس سے کم نہیں اور دوسرے یہ بات ہے کہ جیسا آپ ہی کا اندازِ سخن ہے ایسا کوئی نظم نہیں۔ فرمانے لگے دل میں کچھ لینا۔ دل کی حرکت شعر گوئی کے لیے بہت موزوں ہوتی ہے۔ شعر بھی ایک حرکت ہے۔ یہ دونوں حرکتیں اکثر اوقات ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ غرض یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ پہلے اور نظم بھی کے شعر کہنے کے متعلق مجھے ایک بات یاد آگئی۔ شعر گوئی سے بے بہرہ لوگ اکثر شاعروں سے پوچھا کرتے ہیں کہ آپ شعر کیسے کہتے ہیں خیالات کہاں سے آجاتے ہیں۔ شعر کی زمین اور ردیف و قافیہ کا انتخاب آپ کس طرح کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت اقبال سے بھی ایک صاحب نے دریافت فرمایا انھوں نے اس سوال کا ایک نہایت لطیف جواب دیا۔ کہ فطرت کے اندر ہر تخلیق ل میں ہیں، انسان کچھ پیدا کر سکتا ہے ایک خاص نوعیت کے جذبہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ مجھ کو جذبۂ شعر بھی ایک جنسی جذبہ معلوم ہوتا ہے اس کی تحریک بھی اسی طرح سے یک بیک پیدا ہو کر ناقابل اور لذت آفرین معلوم ہوتی ہے اور یہ محض تشبیہ نہیں ہے کہ شاعر اپنے اشعار کو مصنف اپنی تصنیف کو اور فن کار اپنی پیداوار کو اپنی اولاد سمجھتا ہے۔ شاعر جس احساس آمد کہتے ہیں حضرت اقبال نے اس کی ایسی دلکش تشریح کی کہ اس کی تمام نفسیات کو دو فقروں میں ادا کر دیا۔

جب حضرتِ اقبال نے بار بار یہ سنا کہ اکثر نقادانِ فن کہتے ہیں کہ جو شاعر شعر کو علم و حکمت یا پیغامِ عمل کے لیے ایک واسطہ بناتا ہے وہ اصل شاعر نہیں اور اصل شاعر وہ ہے جو کوئی خاص مقصد نہ رکھتا ہو اور کسی خاص نظریۂ حیات کی تلقین کرے۔ بلکہ زندگی کی تمام وادیوں میں گھومتا پھرے اور اپنے تاثرات کو موزوں کلام میں تبدیل کرتا رہے۔ ہر فن لطیف بے غرض اور بے مقصود ہونا چاہیے اور حسنِ بیان آپ ہی اپنا مقصد ہے۔ جب دیکھا کہ اکثر لوگ یوں ہی سمجھتے ہیں تو انھوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ:-

شعر کجا و من کجا فکرِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ خدا اس شخص کو نہ بخشے جو مجھ پر شاعری کی تہمت لگائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی شاعری سا یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ فقط شاعری نہیں اور شعر ایک ایسی شراب کا پیمانہ ہے جو شاعری نہیں۔

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

لیکن کیا ضروری ہے کہ ہم شاعری کے متعلق یہ اندازِ بیان اختیار کریں کہ وہ حقیقی شعر جو روح کی گہرائیوں میں ڈوب کر اور زندگی کی حقیقتوں میں غوطہ لگائے اس کی نسبت ہم یہ کہہ دیں کہ یہ فقط شاعری نہیں۔ یہ کیوں نہ کہیں کہ اصل شاعری یہی ہے اور جو اس معیار پر صحیح نہ اترے وہ شاعری نہیں مشقِ سخن ہے، قافیہ پیمائی ہے، ہوس ہے

ہے ابد غریبی ہے تفنن اوقات ہے۔ اقبال نے نوعِ انسان کی عام طور پر اور اپنی قوم کی خاص طور پر یہ خدمت کی ہے کہ مشرق اور مغرب اور ماضی و حال کے اعلیٰ ترین افکار کو سوز و گداز کے خم میں ڈبو کر شرابِ طہور بنا دیا ہے۔ حکمت، تصوف، روحانیت اور اخلاق کے ابدی حقائق کا ایک خزانہ اس شاعری میں موجود ہے۔ اس سے پہلے بھی اردو اور فارسی میں ایسے شعرا گزرے ہیں جن کے کلام میں اسی قسم کے جواہر پارے ملتے ہیں لیکن اقبال کی شاعری کا کمال اس کی جامعیت میں ہے۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ سنائی، عطار اور مولانا روم کا تصوف۔ عرفی اور غالب کی حکمت پسندی، پیغامِ احیا، پیغامِ عمل زندگی کا کوئی اہم پہلو نہیں جو اقبال نے نظر انداز کیا ہو۔ فشٹے اور نطشے کا فلسفۂ خودی روحانیت کی بے خودی کے ساتھ ہم آغوش ملتا ہے۔ اردو اور فارسی پر کیا منحصر ہے کسی دوسری زبان میں بھی شاید کوئی ایسا شاعر ملے جس کے کلام میں افکار کی ایسی ندرت اور ایسی ثروت پائی جائے۔ یہ اسی ثروتِ افکار کا باعث ہے کہ گزشتہ دس سال میں ہزارہا مضامین اقبال پر لکھے گئے ہیں لیکن افکارِ اقبال کی تشریح ابھی باقی ہے۔ افکارِ اقبال بھی فطرت کی طرح بے پایاں ہیں۔ ایک ایک شعر کی شرح میں ایک ایک کتاب تصنیف ہو سکتی ہے۔ اقبال کے افکار کے متعلق یہ خدشہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ جلدی سے دنیا آگے نکل جائے گی اور یہ دفترِ تقویمِ پارینہ ہو جائے گا۔ ابدی حقائق کسی ایک زمانہ کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں۔ جب تک اردو اور فارسی زبانیں دنیا میں موجود رہیں گی کلامِ اقبال کو ان کے اندر وہی مرتبہ حاصل رہے گا جو اطالوی زبان میں ڈانٹے کو، انگریزی زبان میں شکسپیر کو اور جرمن میں گوئٹے کو حاصل ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم

شاد اقبال ۔ اقبال اور شاد دونوں کی ہستیاں محتاجِ تعارف نہیں۔ البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے گی کہ علامہ اقبال مرحوم اور مہاراجہ سر یمین السلطنۃ کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے اور اس سے بڑھ کر مسرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ شاد اور اقبال کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت عہ۔ صفحات (۱۷۶)

سب رس کتاب گھر، رفعت منزل خیرت آباد سے حاصل فرمائیے۔

اقبال شاعر یا مفکر؟

اقبال کو رخصت ہوئے تقریباً چھبیس سال ہوتے ہیں۔ اس قلیل عرصہ میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا جا چکا ہے۔ عقیدت کی یہ داستان بے پایاں ہے اور کیوں نہ ہو ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے   بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اقبال نے یہ شعر کمال کے بارے میں کہا تھا۔ کمال یہ ہے کہ جو کچھ اس نے کسی اور کے بارے میں کہا وہ خود اس پر صادق آتا ہے۔

آج کل ہر ایک دوسرے کو یہ منوانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اقبال فلسفی شاعر تھا۔ کوئی اڑتا ہے کہ نہیں اقبال پہلے شاعر تھا اور پھر فلسفی۔ کوئی جتلاتا ہے کہ وہ فلسفی پہلے تھا اور شاعر پیچھے۔ القصہ جتنے منہ ویسی بات۔ آئیے اسی زاویۂ نگاہ سے اقبال کا ذکر خیر ہے۔ (مجھے جو کچھ کہنا ہے بے دھڑک کہوں گا۔ آنکھیں چار نہ ہوں تو مروت کا ہے کی۔ آپ کو ناگوار معلوم ہوگا تو زیادہ سے زیادہ آپ اپنے ریڈیو سیٹ کی سوئی کسی اور طرف گھما دیں گے۔ اس سے میرا ہی نقصان ہوگا نہ اقبال کا)

میرے اور غالباً بہتوں کے نزدیک اقبال بہت بڑا شاعر ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں۔ ساری بحث اس پر ہے کہ وہ فلسفی تھا یا نہ تھا۔ میں عرض کروں گا کہ وہ فلسفی نہیں تھا۔ فلسفی نہ شاعر ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ فلسفہ اور شعر طاؤس و مار ہیں جن میں دوستی کبھی تھی اور نہ رہے گی۔ خود اقبال نے بار ہا مختلف طریقوں سے جتایا ہے کہ وہ فلسفی نہیں ہے۔ اس لئے کہ فلسفی ہنگامۂ حیات سے دور رہنے کے باعث زندگی کی قدروں سے اسی طرح ناآشنا رہتا ہے جس طرح ایک ریاضی داں ہندسی شکلوں سے کاغذ سیاہ کر کے پھولا نہیں سماتا اور سمجھتا ہے کہ زندگی کی ساری لذت اسے حاصل ہے۔ فلسفہ زندگی سے علیحدگی اور بے تعلقی کا نام ہے ؎

انجام خرد ہے بے حضوری   ہے فلسفہ زندگی سے دوری

اس قسم کی صاف گوئی کے نمونے اقبال کے کلام میں آپ کو جا بجا ملیں گے۔ ان کھلے بیانات کے ہوتے کیا یہ زبردستی نہیں کہ اسے جبراً فلسفی بنانے کے لئے دھوم دھام کے مقالے لکھے جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ فلسفے سے اسے سدا دلچسپی رہی۔ فلسفہ کا اس نے گہرا مطالعہ کیا۔ لیکن کیا فلسفہ پڑھنے یا پڑھانے سے کوئی فلسفی ہوتا ہے۔ فلسفہ شاعر کی نظر میں گہرائی پیدا کر سکتا ہے لیکن شاعر نہیں بنا سکتا۔ جس طرح فن عروض جاننے سے کوئی ناشاعر کبھی شاعر نہیں بنا۔ بقول اقبال فلسفہ جس طرح زندگی سے دوری کی علامت ہے۔ ریزی عروض والی شاعری سے دوری کی علامت ہے۔

عروض کا یہ حوالہ میں نے بے سبب نہیں دیا۔ فلسفے کی خشک عقلیت اور استادانہ قسم کی شاعری سے جو عروض کے کانٹوں پر تلتی ہے، اقبال کو سدا نفرت رہی۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ اقبال کی مثنوی بے خودی چھپ رہی تھی یا چھپ کر نکل چکی تھی۔ اس زمانہ میں مجھے سنک سوار ہوئی کہ اقبال کا اسی طرح مراسلتی شاگرد بنوں جس طرح وہ خود استاد داغ کے شاگرد رہے۔ کاش برائے نام ہی مجھے یہ شرف حاصل ہوتا لیکن اقبال نے جواباً جو کچھ مجھے لکھا اس سے کم از کم یہ شرف تو مجھے حاصل ہوا کہ میں نے اقبال کو پہچانا چند

الفاظ اس خط کے یہاں اس لئے دہرا آتا ہوں کہ ان سے شعر و شاعری کے بارے میں اقبال کے تصور کا آپ کو صحیح اندازہ ہوسکے گا سکتا۔

"عزیز من۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے جو حسن ظن آپ نے میرے بارے میں فرمایا ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کو اگر فن سیکھنا مقصود ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا انتخاب ٹھیک نہیں۔ شاعری کے دو لوازم ہیں۔ زبان اور مضمون۔ زبان مجھ سے بہتر جاننے والے دکن میں موجود ہیں اور مضمون آفرینی ایسی شئے نہیں کہ سکھائی جاسکے۔ یہ ایک قدرتی عطیہ ہے۔ استاد شاگرد کی کوئی مدد اس امر خاص میں نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ فن شاعری میں مجھے خود کوئی درک نہیں اور اگر میں نے اشعار کو خیالات کا ذریعہ بنایا ہے تو اس سے نمائش فن نہیں۔ میں مسلمانوں اور ان کے نبی کی محبت دل میں رکھتا ہوں اور اسی کو سرمایۂ نجات جانتا ہوں۔ یہی محبت کبھی کبھی اشعار کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور بیدرد لوگ ان اشعار کو عروض و قافیے کے معیار پر پرکھتے ہیں۔ یہ ہیچمدان آپ کے سامنے حاضر ہے لیکن اس سے متاثر ہونے کے لئے صحبت کی ضرورت ہے تاہم خطوط کے ذریعے سے جو کچھ میں آپ کے لئے کرسکتا ہوں اس کے لئے حاضر ہوں۔ آپ کبھی کبھی خط لکھا کریں۔ جواب میں انشاء اللہ کبھی دریغ نہ ہوگا۔"

آپ کا مخلص۔ محمد اقبال۔ لاہور ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۷ء

افسوس کہ یہ سلسلہ کچھ ہی دنوں جاری رہا اور بڑی بدقسمتی یہ کہ سوائے اس خط کے اور چند ایک خطوط جو اقبال نے مجھے لکھے تھے میں نے گنوا دیئے۔

بہرحال اس عبارت سے آپ نے اتنا ضرور محسوس کیا ہوگا کہ اقبال عروض کی ترازو میں تلنے والے شاعروں کی صف میں نہیں آتا۔ تاہم وہ بہت بڑا شاعر تھا۔ ایسا شاعر جس نے شاعری کے زاویے اور زندگی کے نظریئے بدل دیئے۔ وہ ایک ایسی شاعری کا علمبردار ہے جو زندگی کی طرح بیکراں اور ہر آن نئے روپ بدلتی ہے۔ اقبال نے ایک جگہ زندگی کی بیکرانی کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کی شاعری پر بھی وہ کہا پورا اترتا ہے میں کسی قدر تصرف کے ساتھ اقبال کا ایک شعر پیش کرتا ہوں ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے شاعری　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے شاعری

اس قسم کی شاعری اور ایسی شاعری کرنے والا عام شاعروں سے الگ تہ رکھتا ہے۔ اوروں کی طرح ذی روح وہ بھی ہے لیکن اس کی روح اپنے لئے نت نئے میدان اور نئے نئے آسمان تلاش کرتی رہتی ہے۔ جس کے آگے ستاروں کی دنیا پھیکی پڑجاتی ہے جس کے کمالات کے آگے چرخ نیلی فام کی فضا دھندلی پڑجاتی ہے جس کی جبین نیاز میں سجدے تڑپتے ہیں تو بتیرے بے نیاز و بے نیاز قسم کے علامہ آنکھیں مل مل کر دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی خاک دکھائی نہیں دیتا کہ اقبال کی جبین نیاز میں سجدے کیسے تڑپتے ہیں۔ جو شاعر جبریل کو صید زبوں سمجھا ہے فلسفے اور عروض کی کمند میں کوئی کیوں کر پھانسے

پس اقبال فلسفیوں اور فن دانوں کی چلا گمت سے بلند و بالا انسان تھا۔ کیا کسی کا ایک بہت بڑا شاعر ہونا کافی نہیں کہ زبردستی اسے فلسفی بنانے کی کوشش کی جائے اس معنی میں وہ فلسفی ضرور تھا کہ حیات اور حقائق حیات کے بارے میں وہ اپنا ایک خاص مسلک اور نقطۂ نگاہ رکھتا تھا۔ اس کے زاویۂ نگاہ سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی تیز نگاہی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ہر بڑا شاعر اس معنی میں اپنا زاویۂ نگاہ۔ یا پیام۔ یا فلسفۂ حیات رکھتا ہے۔ آنریبل غلام محمد نے ابھی حال میں حیدرآباد کی "بزم اقبال" کے یوم اقبال کے موقع پر ایک بات کہی تھی جس سے میرے خیال کو تقویت ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اقبال اور براؤننگ کا فلسفۂ حیات اصلاً ایک ہے۔ دونوں دعوت عمل دیتے ہیں۔ لیکن انگریزی ادب کے کسی متوازن دماغ طالب علم سے پوچھئے کہ براؤننگ اس اعتبار سے فلسفی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ ہندوستان والے اقبال کو بنا رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ہر فلسفی اپنا ایک الگ دور افکار کا نظام فکر رکھتا ہے آئیے اس نگاہ سے دیکھیں کہ وہ چیز جس نے بہتوں کو مغالطے میں ڈال دیا ہے کیا سچ مچ وہی ہے جسے اصطلاحی معنی میں فلسفہ کہتے ہیں۔ کیا اقبال کا فلسفۂ حیات اپنے اندر وہ جامعیت رکھتا ہے کہ اسے برگساں ہیگل اور نطشے کے قبیل کا انسان کہہ سکیں۔ یہ تھا تو پھر ان فلاسفہ کی طرح اس نے نثر کو اپنے خیالات کے اظہار اور اشاعت کا واحد ذریعہ کیوں نہیں بنایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں نظم کی بجائے نثر ہی اس کے خیالات کے پرچار کا بہتر ذریعہ ثابت ہوتی۔ اس نے رومی کے ہاتھ پر کیوں غائبانہ بیعت کی اور رومی کی طرح شعر و شاعری کی دنیا میں کیوں پناہ لی۔ ظاہر ہے کہ وہ خود برگزیدہ شاعر تھا۔ دنیائے آب و گل کے کمیڑوں اور فلسفے کے الجھیڑوں میں خود کو الجھانا نہیں چاہتا تھا جہاں کہیں اس نے الجھنے کی کوشش کی وہ نہ فلسفی ہی رہا نہ شاعر۔

آئیے اس کے پیام کا جسے فلسفہ یا پیام کہنے کی بجائے اس کی تعلیمات کہنا زیادہ مناسب ہے ایک سرسری تجزیہ کریں۔ اس کی تعلیم کا لب لباب ہے۔ خودی یہ خودی اس کا اپنا تراشا ہوا لفظ ہے۔ جس کی معنویت کے آگے اس لفظ کا لغوی تصور ایک سرے سے غائب ہو گیا۔ اقبال جس خودی کی تلقین کرتا ہے وہ پندار اور رعونت کے منافی ہے۔ اس سے مراد وہ خود اعتمادی وہ عزت اور تعمیر نفس ہے جس سے فرد کی قیمت اور ساکھ بڑھتی ہے۔ ہر فرد جب باعزت اور جری ہے تو یہی چیز پوری قوم کی رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے۔ خود لکھتا ہے ؎

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

گوہر شبنم آنسو یہ سب کیا ہیں وہی فرد یا قطرے کی خودی کے مختلف مظاہر جن سے دل کائنات و متحرک رہا ہے۔ زندگی کا انتہائی سمندر اسی ایک بوند پانی میں بند ہے۔ یہی چیز رائی کو پربت بناتی ہے اور اسی کی کمی سے پربت رائی کا دانہ بن جاتا ہے۔

اپنی تعلیمات کے اس بنیادی تصور کو واضح اور خاطر نشین بنانے کے لئے اقبال نے رسول عربی کی تعلیم اور فلسفۂ اسلام کا سہارا لیا ہے اور پیروی کے تو وہ اتنے معتقد ہیں کہ ان کے آگے فلاسفۂ مغرب کو وہ خاطر میں نہیں لاتے۔ حالانکہ مغرب کے

علمی ملاقاتوں سے بھی انھیں کچھ کم فیض نہیں ملا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہوئی کہ اقبال کے شاعرانہ تصورات میں جسے بعض فلسفہ سمجھتے ہیں کہیں بھی وہ ایچ اور افکار نہیں جسے ایک الگ نظامِ فکر کے تحت مربوط کیا جا سکے اور جس کے متعلق یہ کہہ سکیں کہ یہ اقبال کا فلسفہ ہے۔ فلسفۂ اسلام کے بنیادی اصولوں کو جو قرآن کے اپنے انداز میں بیان کر دینے سے یہ فلسفہ اقبال کا اپنا فلسفہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا قرآن کے زبان پہلوی میں اترنے کے بعد قرآن کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیا مولوی معنوی کے قرآن کا فلسفہ کلام پاک کا محتاج نہیں؟ پھر وہ فلسفہ جسے لوگ اقبال کا فلسفہ کہتے ہیں کیا سچ مچ اقبال کا فلسفہ ہے؟ اقبال زیادہ سے زیادہ فلسفۂ اسلام کا مفسر ہے کیا ایک مفسر کو فلسفی کہا جا سکتا ہے۔ اسلام سے اقبال کو عشق تھا۔ کیا عاشق فلسفی ہوتا ہے؟ اسلام کا فلسفہ اس کا فلسفہ ہے۔ اس کا اپنا فلسفہ کیا ہے وہی عشق ؎

عشق مری لے میں ہے عشق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میری رگ و پے میں ہے

اقبال کا نقشِ آخر

ابوظفر عبدالواحد

فسردہ سا جہانِ آب و گل ہے — یہ منظر شام کا عاشق کا دل ہے
شفق کی آخری کرنیں درخشاں — مہر کی گل فشانی ہے نمایاں
حسیں پرچھائیاں گم ہو رہی ہیں — اندھیرے میں وہ خود کو کھو رہی ہیں
اندھیرا ڈرتے ڈرتے چھا رہا ہے — کوئی پر درد لے میں گا رہا ہے
ستارے ہچکچاتے آ رہے ہیں — ابھی آتے ہوئے شرما رہے ہیں
پرندے شور برپا کر رہے ہیں — فضا کو زیر و بالا کر رہے ہیں
موذن کی صدا بھی آ رہی ہے — دلوں پر بے خودی سی چھا رہی ہے
سرِ مغرب درِ مسجد پہ ہم ہیں — فضا مغموم ہم صرفِ الم ہیں
نشانِ شاعرِ مشرق یہاں ہے — کہ جس کا نطق خالق کی زباں ہے
کہ جس کا ہر نفس گویا عبادت — کہ جس کا ہر سخن گویا شریعت
خدا سے جس نے کی تھی ہم کلامی — وہ رازِ خود شناسی کا پیامی
وہ جس کی زندگی علم و ادب تھی — وہ جس کی بندگی تسلیمِ رب تھی
جہاں میں واقفِ اسرارِ فطرت — زمیں پر رازدانِ ربِ عزت
زمانے کے جو تیور جانتا تھا — جو صبح و شام کو پہچانتا تھا
سکھایا جس نے رازِ زندگانی — خودی ہے آدمیت کی نشانی
برہمن زادۂ فرزندِ توحید — تقاضائے لم یزل ہے جس کی امید
[illegible] تو دے کے تیشے کھوتا ہے — یہیں اقبال تھک کر سو گیا ہے

[illegible]

اقبال اور سماج

سماج یا معاشرہ زندگی کا اتنا وسیع ادارہ ہے کہ فرد کی ساری ذہنی اور عملی کارکردگی اس کے اندر سما جاتی ہے۔ مذہب سیاست تعلیم و تربیت ادب اور فنونِ لطیفہ حتیٰ کہ طرزِ فکر بھی اسی کے مختلف شعبے ہیں۔ شاعر بھی یوں تو اور افراد کی طرح اپنے زمانے کے سماج کی پیداوار ہوتا ہے لیکن ہر بڑا شاعر اس پر کچھ نہ کچھ اثرات بھی چھوڑ جاتا ہے۔

ہندوستانی شاعری کوئی سو سال پہلے تک زندگی سے اگر پوری طرح بے تعلق نہیں تھی تو کم سے کم اس کی توجہ تمام تر زندگی کے چند خاص پہلوؤں کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل تھی۔ مغربی اثرات نے ہندوستانی زندگی میں جہاں نئے نئے تاثرات کو نمایاں کیا وہیں ادب اور شاعری کو بھی حیات کے مسائل سے دوچار کر دیا اس کے سب سے پہلے اثرات ہم جانتے ہیں کہ حالی کے کلام میں نمایاں ہوئے۔ حالی کے بعد اکبر سب سے بڑا شاعر پیدا ہوا جس کی شاعری تمام تر حیات سے پیدا ہوئی اور حیات ہی کو مرکز بناتے رہی۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ہماری شاعری زندگی اور موت کی کشمکش کے اہم مسائل سے جیسی گتھ گئی ہے ویسی کبھی نہیں گتھی تھی۔ اور یہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس کا باعث بڑی حد تک اقبال تھے۔

اقبال کی شاعری اپنے اطراف کی ساری تحریکات اور اس سے آگے اکثر عالمی تحریکات کا مخزن بن گئی ہے۔ یہ دورِ تخریب اور تعمیر کی کشمکش کا عبوری دور ہے۔ اور اسی نے اقبال کو بھی پیدا کیا۔ اقبال کے مجتہد ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اس کا ثبوت ان کے صفحات میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

اقبال نے موجودہ سماجی نظام کے گہرے مطالعے کے بعد جن کوتاہیوں کا مشاہدہ کیا ان کو ظاہر کرنے اور ان کا حل بتلانے میں انھوں نے پیغمبرانہ شان دکھا دی جیسا کہ کہتے ہیں ؎

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال — پیغمبری کرد و پیمبر نہ تواں گفت

ان کی فکر نے زندگی کے کسی اہم پہلو کو نہیں چھوڑا۔ اسی لئے ان کی تعلیمات ہماری زندگی کا نصب العین بن گئی ہیں۔ وہ حقیقت میں انسانیت کے شاعر تھے۔ اور یہ جذبہ ان کو قومیت کے ابتدائی احساس کے زمانہ میں بھی برابر بے چین کر رہا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں انھوں نے یہ شعر بھی کہے تھے ؎

آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو — امتیازِ ملت و آئیں سے دل آزاد ہو

بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں — نوعِ انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں

اس میں شک نہیں کہ اسلامی فلسفہ اور زندگی کا انھوں نے وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا جس کا رنگ ان کے کلام میں جابجا نمایاں ہے۔ لیکن اس سے ان کے رتبہ میں کوئی فرق اسی طرح نہیں آسکتا جس طرح ملٹن کے رتبہ میں عیسائیت کی وجہ سے یا کالی داس کے رتبہ میں ہندویت کی وجہ سے نہیں آسکا۔

یہ وسیع تر انسانی ہمدردی کا شدید جذبہ ہی تھا جو ان کو ایسے زمانہ میں بھی جب دنیا قومیت رنگ نسل جیسی مصنوعی تقسیموں میں جکڑی ہوئی خوش خوش تھی اور یہ نظام عصبیت کا مذہب بن گیا تھا انھوں نے اجتہادی شان دکھادی۔ اور اس سماج اور اس کے سلسلے سے نظام کی بنیاد ڈال دی۔

لیکن جتنی تخریبی تنقیدیں انھوں نے کیں ان سے زیادہ تعمیری راہیں بھی بتلادیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا جلد یا دیر میں ان کے پیش کردہ سماجی نظام کو آزمانے تیار ہوجائے گا۔

اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا خودی کا فلسفہ ہے جس کو انھوں نے نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا یہ اٹل عقیدہ تھا کہ انسان اپنے ذاتی وجود کو سمجھے بغیر کسی چیز کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ وہ آسمانوں سے تارے توڑ لائے۔ زمین کے ساتوں طبق کھنگال ڈالے لیکن جب تک وہ ذات سے بے خبر ہے اس کا ہر فعل غلط پڑے گا۔ کیونکہ یہ وجود کائنات کی بنیاد ہے۔ اسی لئے خودی کی تربیت پر وہ سب سے زیادہ زور دیتے ہیں یہ گویا جوہر ہے اور دنیا کی ساری چیزیں عرض۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف　　کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب　　خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر
نہنگ زندہ ہے موج محیط میں آزاد　　نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر

خودی کو انسانی کمال کا نقطۂ آخر تصور کرکے زندگی کی ساری چہل پہل میں انھیں اسی کی نمود و نمائش نظر آتی ہے۔ اور جس چیز میں خودی کی نمائش نہ ہو اسے وہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ کہتے ہیں ؎

حیات و موت نہیں التفات کے لائق　　فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود
گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر　　وائے صورت گری و شاعری و نقاشی

خودی کے بعد قوموں کی زندگی میں یقین کا درجہ ہے۔ یہ وہ شمع ہدایت ہے جس کے سامنے ساری تاریکیاں کافور ہوجاتی ہیں اور منزل مقصود صاف نظر آنے لگتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے　　یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

قوموں کی زندگی میں عمل کی جو اہمیت ہے وہ بھی اقبال کی نظر سے کبھی اوجھل نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ عمل کے بغیر وجود بے حس ہے اور "بے عمل" وجود سے جیسی شدید نفرت اقبال کو تھی کسی اور کو کم ہوگی۔ ان کا یہ مشہور شعر ہے ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم　　جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ایک اور مقام پر کہتے ہیں ؎

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا　　روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

اسی لئے اقبال فطرتاً صوفی ہونے کے باوجود پابند خانقاہ تصوف کو بہانۂ راحت سمجھتے تھے۔ ایک نظم میں صوفی کو مخاطب کرکے کہتے ہیں ؎

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا — مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن — غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا

ایک اور مقام پر "ترکِ جہاں" کے خیال کا خاکہ اس طرح اڑایا ہے۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

آزادی اپنی تمام صورتوں میں خواہ وہ سیاسی ہو کہ معاشرتی ذہنی ہو کہ جسمانی اقبال کا مقصد نظر تھی۔ وہ اس راز سے اچھی طرح واقف تھے کہ آزادی کے بغیر کسی قوم کا بہتر سے بہتر فعل بھی درست نتائج نہیں پیدا کر سکتا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال — کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت — محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور — محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

آزادی ان کی نظر میں مکمل زندگی ہے اسی لئے غلاموں کی زندگی کو وہ ادھوری سمجھتے ہیں اور غلاموں کی فکر مذہب عبادت فلسفہ ادب غرض ہر چیز میں انھیں ایک پژمردگی ایک کمی اور ایک پستی نظر آتی ہے۔ نفسیات غلامی ان کی ایک نظم ہے اس کے چند شعر ہیں۔

شاعر بھی ہیں پیدا علما و حکما بھی — خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک — ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند — تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

اقبال "قوت" کے پرستار تھے۔ لیکن اس کو وہ ہمیشہ اور لازمی طور پر ساز و سامان کا نتیجہ نہیں تصور کرتے تھے۔ بلکہ وہ اس قوت کے قائل تھے جو افراد اور اقوام میں اندر سے پیدا ہو۔ ایسی قوت ساز و سامان کی رہینِ منت نہیں ہوتی بلکہ یہ چیزیں خود اس کا قدم چومتی ہیں۔ اس فرق کو انھوں نے اپنی نظم "فقر و ملوکیت" میں عمدگی سے بیان کیا ہے۔

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے — ضرب کاری ہے اگر سینہ میں ہے قلبِ سلیم

ایک اور نظم میں بھی اس کو وضاحت سے سمجھایا ہے کہتے ہیں۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے — وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی — یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار — اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے — کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہاں بانی

ان بنیادی لوازم کے علاوہ جو ایک ترقی پذیر سماجی زندگی کے لیۓ ناگزیر ہیں۔ اقبال نے اس کے جزئیات پر بھی اظہار خیال کیا ہے یہ مسائل بے شمار ہیں جیسے تعلیم سیاست اور حکومت عورت ادب اور فنونِ لطیفہ معاشرت وغیرہ۔ موجودہ تعلیم اور خاص طور پر مغربی تعلیمی نظام پر انھوں نے بہت سی تعریضیں کی ہیں۔ تعلیم کو جن مادی اور ظاہری اصولوں پر ڈھالا گیا ہے اس کی وجہ علم کی غایت مفقود ہو جاتی ہے۔ اور طالب علم کی حالت بسا اوقات "چارپایہ بروکتابے چند" سے زیادہ بہتر نہیں رہتی۔ اقبال علم کا اصلی مقصد خود کو جگانا سمجھتے ہیں اور جس علم سے یہ نہ ہو سکے اس کے لئے ان کے سماجی نظام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

موجودہ تعلیم سے آزادئ فکر کی جو تحریک پیدا ہو رہی ہے اس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں۔

آزادئ افکار سے ہے ان کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادئ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ
اس قوم میں ہے شوخئ اندیشہ خطرناک — جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ — آزادئ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

ان اشعار میں وہ ہمارے طالب علموں سے مخاطب ہیں۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

ہر سماجی نظام کسی نہ کسی شکل کی سیاست اور حکومت کے تابع ہوتا ہے۔ اس کے بغیر سماج کی پرامن ترقی ظاہر ہے کہ ناممکن ہے۔ اقبال ایسی سیاست اور حکومت کو جو محض ابلہ فریبی پر قائم ہو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ موجودہ سیاست کی چالوں کو وہ ایک مختصر نظم میں یوں ظاہر کرتے ہیں۔

اس کھیل میں تعیین مراتب ہے ضروری — شاطر کی عنایت سے تو فرزیں میں پیادہ
بے چارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز — فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

سیاست جو مذہب سے بے گانہ ہو اسے وہ دیو بے زنجیر سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد — فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

سماج کا ایک اہم رکن عورت ہے، جو مغربی سماج اور مشرقی ذہنیت پر عجیب عجیب صورتوں سے چھائی ہوئی ہے۔ اقبال نے سماج میں عورت کی اصل حیثیت آزادی اور تعلیم ہر مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں انھوں نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے۔ پھر بھی ان کا نقطۂ نظر پوشیدہ نہیں ہے۔ عورت کی آزادی کا جو مفہوم یورپ نے سمجھا ہے اسے وہ سماج کے حق میں مہلک تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور ‏ ‏ ‏ کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

ایک شعر میں وہ مغرب کے حکماء سے سوال کرتے ہیں۔

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال ‏ ‏ ‏ مرد بے کار و زن تہی آغوش

سماج کی تعمیر میں عورت کا حصہ مرد سے کسی طرح کم نہیں ہے لیکن وہ بہرحال عورت کو مرد پر منحصر سمجھتے ہیں جہاں اس بنیادی تصور میں خلل آئے سماج کی پوری عمارت لڑکھڑا جاتی ہے۔ ان کے اشعار ہیں۔

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی ‏ ‏ ‏ نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا ‏ ‏ ‏ اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

عورتوں کی تعلیم و تربیت کے وہ دل سے حامی ہیں لیکن ایسی تعلیم جو یورپ کی طرح عورت کو مرد بنا دے اسے وہ سماج کے حق میں موت تصور کرتے ہیں۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن ‏ ‏ ‏ کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

ادب شاعری اور سارے فنون لطیفہ کو اقبال اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس میں خودی کا جذبہ کس حد تک نمایاں ہے۔ اور وہ خودی کے نشو و نما میں کتنی مدد دے سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر............

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات ‏ ‏ ‏ نہ کر سکیں تو سراسر فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی ‏ ‏ ‏ خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

"جواب شکوہ" اقبال کی ابتدائی اہم نظموں میں سے ہے۔ لیکن سماجی اصلاح سے متعلق اس میں ان کے خیالات کا نچوڑ موجود ہے۔ اس نظم میں اقبال نے وہ تمام برائیاں تفصیل سے گنائی ہیں جو ہماری معاشرت میں گھر کر چکی ہیں اور ہمارے ذہنوں اور اخلاقی حالت کو بگاڑنے میں بڑا دخل رکھتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز جو کسی قوم کی غلامی اور پستی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے وہ اس کی باطل پرستی ہے۔ فرقہ بندیاں اور مناقشات اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ تن آسانی ایک اور منحوس خصلت ہے۔ جو ہم میں پیدا ہو گئی ہے۔ خودداری خلوص اور ایثار کی اچھی صفتیں ہم سے زمانہ ہوا رخصت ہو چکی ہیں۔ مذہب سے بیگانگی

بلکہ بیزاری عام ہے۔ حالانکہ اقبال کے خیال کے مطابق علم عمل زندگی غرض ہر چیز کا سرچشمہ مذہب ہی ہے۔ ان تمام برائیوں کے ہوتے ہوئے کسی جدوجہد سے ابھرنے کی توقع رکھنا فضول ہے۔ شاعر کی شکایت کے جواب میں حضرت باری تعالیٰ کا جواب ہے۔

هم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں — ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہ اس معاشرتی نظام کا ایک سرسری خاکہ ہے جس پر اقبال قوم کو ڈھالنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک آدمی تھے۔ جو ان اصلاحوں کو سماج کے سر بہ جبر مڑھ سکتے۔ تاہم ان کے کلام کی دل سوزی اس کو جس قدر زیادہ مقبول بناتی جاتی ہے ان کے خیالات کا اثر پھیلتا اور چپکے چپکے دلوں میں گھر کرتا جا رہا ہے۔ ابھی سے ہماری اجتماعی زندگی کے تصور، ادب شاعری اور طرز فکر میں کسی بنیادی تغیر کا سراغ ملنے لگا ہے۔ اس اثر میں آئندہ جس قدر اضافہ ہوتا جائے گا۔ سماج کی نئی تعمیر خود بخود ہوتی جائے گی۔

عبد القادر سروری

روحِ اقبال سے

تیری فکر دور رس جس راز سے آگاہ تھی
آج عریانی سے اس کی کانپتی ہے زندگی

دیکھ تہذیب نوی کی تیغ خوں آشام دیکھ
رازدارِ صبح ہستی زندگی کی شام دیکھ

سچ کہا تھا ٹوٹ جائے گا طلسمِ رنگ و نور
آنسوؤں میں بہہ رہا ہے عصرِ حاضر کا غرور

خون کی ہولی سے چرخ غرب ہے یوں لالہ زار
سمتِ مشرق بھی نظر آتی ہے اس کی ایک دھار

لیکن اے جنت کی دولت لے کلیم خوش کلام
ان دھندلکوں میں شعاعِ نور ہے تیرا پیام

تیری بتلائی ہوئی راہوں پہ چلنے کے لئے
کارواں بیتاب ہے کروٹ بدلنے کے لئے

زندگی کے راگ کو بیداریوں کا ساز دے
مطربِ آتش نوا آواز دے آواز دے

نظر حیدرآبادی

اقبال اور اُن کا فلسفۂ خودی

اقبال بہ حیثیت شاعر کے نہ صرف ادبی دنیا میں بلکہ ساری اسلامی دنیا میں مشہور ہیں مگر وہ صرف شاعر نہ تھے۔ وہ ایک ایسے بڑے آدمی تھے کہ جیسا صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جس کا دل اور دماغ بڑا ہو۔ ان کا دل ایسے جذبات اور کیفیات کا حامل تھا جن کی بے انتہا وسعتوں میں رسمی شعر و شاعری استعارات اور تشبیہات مثل ان تنکوں کے ہیں جو کسی سمندر کے لب ساحل پائے جاتے ہیں۔ ان کا دماغ ویسا ہی تھا جو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے مفکر کا ہو سکتا ہے۔ فکر و عمل کا تعلق دماغ سے اور جذبات اور احساسات کا تعلق دل سے ہے۔ اقبال نے اپنے دل و دماغ کی محنت و کاوش کو ایک خاص اسلوب اور دلکش پیرایہ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ صرف اسلامی تعلیمات کے پیامبر ہی نہیں تھے۔ بلکہ ایک ایسے شاعر تھے جن کا پیام عمل ساری دنیا کے لئے اور انسانیت کے لئے مایۂ ناز ہو سکتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اقبال کی ابتدائی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا آغاز غزل گوئی اور رسمی شاعری سے ہوا مگر چونکہ وہ شاعرانہ بصارت کے ساتھ حکیمانہ بصیرت بھی رکھتے تھے، جدید فلسفہ اور اس کے عمل پیہم کی تعلیم اور تاثرات نے ان کے قلب اور دماغ میں ایک غیر معمولی ہیجان پیدا کر دیا اسلامی تعلیمات اور قرآنی حکمت سے ان کو ایک خاص شغف تھا۔ نفس انسانی کی عزت اور عظمت جو انھیں قرآنی تعلیم اور پیغمبر اسلام کی پیروی میں نظر آئی اس کی مثال اسلام کے کسی مبلغ اور شاعر کسی حکیم اور مفکر کے خیالات میں نہیں پائی جا سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری کا ماحصل وہ پیام عمل اور حسن عمل ہے جس کا ماخذ اسلام ہے اسلام کی ترجمانی ان کا مقصد حیات بن گیا تھا۔ تاہم یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ ایک فرقہ پرست شاعر تھے۔ ان کا پیام عمل ان کے اعلیٰ مطمح نظر کا تابع تھا۔ ان کا مقصد نوع انسانی کو ایک اعلیٰ اور بلند مقام تک پہنچانا تھا۔ اور اس کے حصول کا ان کی نظر میں ایک ہی راستہ تھا۔ وہ اسلام کی شاہراہ عام ہے۔ اس لئے ان کا پیام عمل مسلمانوں کے لئے مخصوص نظر آتا ہے وہ ملت اسلامیہ کو ایک تازہ ولولہ بخشتے ہوئے اور انسانیت کو ایک نئی حیات کا راستہ دکھلاتے اور غلاموں کو درس خودی دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ کشمکش حیات میں مردانہ وار مقابلہ کرنے کو زندگی سمجھتے ہیں۔ عمل پیہم اور انقلاب ان کی زبان میں زندگی کا دوسرا نام ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روح امم کی حیات کشمکش زندگی

جو بات انسان کے دل سے نکلتی ہے وہ دوسرے پر اثر کرتی ہے۔ اقبال غیر معمولی طور پر متاثر دل رکھتے تھے اس لئے ان کے کلام میں بھی غیر معمولی اثر آفرینی اور ایمانی قوت نظر آتی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا پیام انسانیت کو یہ ہے کہ وہ اپنی "خودی" کی تربیت کرے اور اپنی خودی کو سمجھے۔ ذات اور ملت کی عزت اور وقار کا دارومدار خودی کی صحیح تربیت اور پرورش پر ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف — کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش پر سوز

خودی کی تربیت کی بدولت انسان تمام دنیا ہی کو نہیں بلکہ ساری کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔

خودی ہے زندہ تو ہے فقر میں بھی شہنشاہی — نہیں ہے طغرل و سنجر سے کم شکوہ فقیر
جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار — شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق
اس کی نگہ شوق پہ ہوتی ہے نمودار — ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوت اشراق

اس فلسفۂ خودی کا سرچشمہ استغنا ہے یہ وہ استغنا نہیں ہے جو فقر اور تصوف کی اصطلاح میں ترک دنیا کہلاتا ہے۔ ترک دنیا کی تعلیم اور اس کے تصور سے اقبال کو سخت نفرت ہے ان کے نزدیک انسانیت کے اعلیٰ ترین زینہ تک پہنچنا " خودی " کو پانا اور خوددار بننا ہے انسان کائنات کا خلاصہ ہے۔ وہ ایک ایسی جامع ہستی ہے جس میں جمادی نباتی حیوانی اور ملکوتی عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ سب خودی میں پوشیدہ بھی ہیں اور ظاہر بھی خودی انسان کا ازلی اور ابدی عنصر ہے۔ چونکہ ازلی اور ابدی حقیقت فانی نہیں ہے اس لئے خودی بھی مثل نباتات اور حیوانات کے فانی نہیں ہے۔ خودی کا غیر فانی عنصر یا پہلو روحانی اور ملکوتی ہے اور وہی اصل حقیقت انسان ہے اس کی تربیت پر اسلامی تعلیمات کا دارو مدار ہے۔ جب انسان خودی کی تربیت سے غافل اور اپنے اصلی مرکز سے دور ہو جاتا ہے تو حیوانیت کے قعر مذلت میں گر جاتا ہے۔

" خودی " کے ارفع و اعلیٰ منزل تک پہنچنے کا راستہ اقبال کے نزدیک وہ نہیں ہے جو ترک دنیا اور روحانی سرتوں کے جمود و سکون کے عالم میں پایا جاتا ہے۔ تسخیر عالم اور عمل پیہم اور کشمکش حیات کے منازل طے کرنے کے بعد خودی کی آخری منزل تک انسان پہنچ سکتا ہے) خداشناسی اور خدا پرستی کی یہی منزل ہے۔ اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ آسمان و زمین عالم و مافی العالم سب کچھ انسان کے لئے ہے کیونکہ وہ خلاصۂ کائنات ہے انسان خلیفۃ اللہ ہے خودی کی منزل پر پہونچنے کے بعد انسان نیابت الٰہی کے منصب و مقام کا اہل ہو سکتا ہے۔

تسخیر عالم سے مراد اقبال کے نزدیک وہ علمی اور عملی فتوحات نہیں ہیں جن کی بدولت مغربی دنیا قدرتی طاقتوں پر قابو پاکر اپنی آسائش دولت و ثروت کے بڑھانے کی فکر میں پیہم کوششیں کر رہی ہے اور انھیں کوششوں کی بدولت بجائے حقیقی ترقی کے حیوانیت کے قعر مذلت میں گر رہی ہے۔ دنیا کی یہ تباہی دراصل عقل انسانی کی اس کارکردگی کا نتیجہ ہے جو محبت اخوت ہمدردی اور عشق الٰہی سے بری ہے۔ اقبال اس عقل سے جو عشق سے مبرا ہو نفرت کرتے ہیں۔

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر — سود خود بیند نہ بیند سود غیر

پیغمبر یا شارع جو حامل وحی الٰہی اور اسرار خودی اور رموز توحید کا معلم ہے ایسی خودی کو مٹانے کا حکم دیتا ہے جو خود غرضی پر مبنی ہو۔ شارع کی تعلیم کی رو سے اسرار خودی کا عالم وہی ہے جس کی ہمدردی تمام موجودات کو گھیرے جو دوسرے کے سود و بہبود کو اپنا سود و بہبود جانے ایسا ہی شخص نائب اللہ ہو سکتا ہے اس لئے عقل بغیر عشق کی رہنمائی کے انسان کے راستے کو روشن نہیں کر سکتی۔ انسان کو نائب اللہ کے درجہ تک پہنچنے کے لئے توانائی حاصل کرنا چاہیے ایسی توانائی عمل پیہم

اور مسلسل کوشش کے بغیر حاصل کرنا ممکن نہیں جو محض محدث کی طاقتوں کو دریافت کرنے میں مشغول اور ان طاقتوں سے کام لینے میں مصروف ہو اور خودی سے غافل ہو وہ کافر ہے۔ مومن وہ ہے جو ایک طرف تو کائنات اور اس کی طاقتوں پر حاوی ہو اور دوسری طرف اپنے نفس پر بھی اتنی ہی قدرت رکھتا ہو۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے　　مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبال نے خودی پر یہ سارا زور اس لئے دیا ہے کہ انسان اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ خودی کے ذریعہ خدا تک پہنچنا ممکن ہے۔ خدا کی ذات اپنی صفات سے ظاہر ہے وہ رحمٰن و رحیم بھی ہے اور قہار و جبار بھی ہے اسی طرح انسان جو صفات الہیہ کا مظہر ہے متضاد صفات کا جامع ہو سکتا ہے۔ وہ کریم و رحیم کا مظہر بھی ہے اور جباریت اور قہاریت کا اظہار بھی کر سکتا ہے صفات الہیہ کے صحیح امتزاج اور اعتدال کے ساتھ ظاہر کرنے میں ہی حقیقی انسانیت یا خودی کے اسرار مضمر ہیں۔

قہاری و جباری قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

انسان اس بحر بیکراں کا ایک قطرہ ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں اگر قطرہ اپنی ذات کے تمام اسرار و رموز کو نہ پاجائے اور خود اپنی ہستی کی عظمت کو نہ جانے تو وہ ذات خدا کے ناپیدا کنار سمندر کی حقیقت کو سمجھنے سے بھی قاصر رہے گا۔ انسان خدا کی ذات کا پرتو ہے۔ دوسرے الفاظ میں خدا اپنے شیون و صفات کے ساتھ انسان میں جلوہ گر ہے۔ پس اگر انسان اپنی حقیقت کو جان لے یا "خودی" کے راز کو پالے تو وہ خدا کو بھی پا سکتا ہے۔ جس کے جمال و جلال کے ظہور کا ذریعہ خود اس کی ہستی ہے۔ دریا اور قطرے کی تمثیل دوسرے مذاہب کی روحانی تعلیمات میں بھی پائی جاتی ہے مگر ان مذاہب نے انسانی شخصیت کو اتنا حقیر و ذلیل کر دیا ہے کہ گویا وہ کائنات میں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ اقبال انسانیت کے اس نظرئے کے سخت مخالف ہیں تو وہ مانتے ہیں کہ انسان بندگی کے مقام پر ایک حد تک مجبور ضرور ہے لیکن وہ عملی قوت سے یکسر محروم نہیں۔

اقبال انفرادیت کے علم بردار ہیں اور انسان کو یہ پیام دیتے ہیں کہ وہ اپنی ہستی کی قدر و قیمت کو پہچانے اور اپنے وجود پر غور کرے اپنے امکانات کو معلوم کرے اور اپنی شخصیت کے وقار کو کم نہ کرے اگر اس راہ میں فطرت حائل ہو تو اسے بھی مسخر کرے۔ اقبال کے نزدیک خودی کی موت انسان کی موت ہے اگر وہ اپنی ذات کو فراموش کر دیتا ہے تو ساری کائنات سے غافل ہو جاتا ہے۔

صوفیوں اور دوسرے روحانی مسلکوں پر چلنے والوں کے نزدیک خدا جوئی کا راستہ خودی سے پیدا ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ترک دنیا اور ما سوا اللہ سے غفلت لازمی ہے برخلاف ان کے اقبال کہتے ہیں کہ خودی سے خدا تک پہونچنے کی قدرت پر تصرف اور کائنات کی تسخیر ضروری ہے (سخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض جمیعا) چنانچہ اقبال کہتے ہیں۔

ہر چیز ہے محو خود نمائی　　ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت　　تعمیر خودی میں ہے خدائی

قرآن پاک کی تعلیم کی رو سے معرفت کے دو سرچشمے ہیں: "آفاق اور نفوس" آفاق کے علم سے آسمان و زمین کی تمام موجودات کا علم مراد ہے۔ نفوس کا علم وہ ہے جو عبد و معبود کے رشتۂ باطنی کو روشن کرتا ہے۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "العلم علمان – علم الابدان وعلم الادیان" کلام الہٰی کی بہترین تفسیر ہے۔ علم الابدان میں وہ سارے علوم آجاتے ہیں جن کا تعلق طبعیات اور خارجی موجودات سے ہے۔ علم الادیان سے مراد وہ علوم ہیں جو معرفت حق اور معرفت عبد، خداشناسی اور خودشناسی، تربیت خودی اور تہذیب نفس کے منازل طے کرنے کے لئے درکار ہیں۔ اگر اکمل غیر جانبدارانہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ یوں تو دوسرے مذاہب خصوصاً آبائی مذاہب میں عرفانی معلومات کے دفتر ہیں مگر دنیا کی سب سے بڑی اور آخری تبلیغ ہی ایسی جامع ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ ماسوا اللہ کی معرفت کی تاکید کرتی ہے جس میں معرفت الہٰی کے خزائن ہیں اور ساتھ ہی تربیت خودی کی تفصیلات۔ طہارت و تقویٰ، حقوق العباد اور حقوق اللہ تصرف اور تسخیر عالم سب کی جیسی جامع تعلیم درکار ہے۔ ارسطو اور افلاطون، سینا اور فارابی کے جامد اور ساکن فلسفہ میں معاشرات نہیں جو خودی کو ابھار سکیں اور نہ دور حاضر کی مغربی تعلیم اور فلسفہ کے متحرک اثرات اور نتائج انسانی کو انسانیت کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔

اقبال کا پیام عمل ان کا فلسفۂ حیات اور شاعرانہ اثر آفرینی اور گرم گفتاری جدید پیرائے میں ایسی تحریک حیات کی حکیمانہ تاویل ہے جس کی تبلیغ کی ابتدا تیرہ سو برس پہلے ہوئی تھی۔

ولایت، بادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری　　یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا　　نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

لطیف النسا بیگم

نذر اقبال۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کے شایان شان ایک کتاب "نذر اقبال" ادارۂ ادبیات اردو کی طرف شائع ہوئی ہے جس میں بہترین مضمونوں اور نظموں کے علاوہ متعدد نئے مضامین، تصاویر اور نظمیں ہیں۔ اور ان کے سوا اب تک اردو رسائل وغیرہ میں حضرت اقبال پر جو بہترین ادب شائع ہوا ہے ان کے منتخبات بھی اسی نذر اقبال میں شریک ہیں۔
قیمت ۸۔ سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

ادارے کی خبریں

ادارے کا نیا ہال | ادارے کے دفتر اور اس کے شعبوں کے قیام کے لئے اس کی موجودہ عمارت (جو دراصل اس کے معتمد اعزازی ڈاکٹر زور صاحب کا رہائشی مکان ہے) عرصے سے ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ ابتداء میں دفتر ڈاکٹر صاحب موصوف کے مکان کے ایک کمرے سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ پورے مکان پر قابض ہو گیا اور ڈاکٹر صاحب کو نیچے کی منزل ادارے کے لئے چھوڑ کر اوپر کے حصے میں منتقل ہونا پڑا۔

بعد کو یہ پورا مکان بھی ناکافی ثابت ہوا اور کتب خانہ اور دوسرے تاریخی و ادبی آثار ایک گودام کی طرح بھر گئے۔ اور دیمک سے متاثر ہونے لگے۔ ادارے نے اپنے لئے ایک خاص عمارت حاصل کرنے یا تعمیر کرنے کی کارروائی کئی سال قبل سے شروع کر رکھی ہے اور نواب ڈاکٹر سر مہدی یار جنگ بہادر اور نواب زین یار جنگ بہادر کی صدارت و نائب صدارت میں ادارے کی مجلس عمارت نے فراہمی عمارت کی مہم شروع بھی کر دی ہے لیکن اب تک اس سلسلہ میں جو منزلیں طے ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوا کہ ابھی چار پانچ سال تک ادارے کو ایک شایان شان ذاتی عمارت سے محروم رہنا پڑے گا۔ اس لئے جناب ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی نے سات ہزار روپے کے اپنے ذاتی صرفہ سے موجودہ عمارت ادارہ کے محاذی ایک ہال تعمیر کرا دیا جس کا نقشہ ملک کے ایک مشہور و باکمال ماہر تعمیر مولوی فیاض الدین صاحب ارکٹکٹ نے تیار کیا اور جس کی تعمیر ادارے کے ایک مخلص رفیق مولوی مرزا ضامن علی صاحب غازی صفوی کی ذاتی دلچسپی اور شبانہ روز انہماک کی وجہ سے بہت جلد اور بڑی آسانی کے ساتھ تکمیل کو پہنچ گئی۔

اس ہال میں فی الحال شعبۂ مخزن علوم و فنون (یعنی اردو انسائیکلوپیڈیا) اور دارالمطالعہ اور دفتر سب رس منتقل کیا گیا ہے۔

ادارے کے کتب خانے میں جو رسائل و اخبار وصول ہوتے ہیں ان سے اب تک صرف ارباب ادارہ ہی استفادہ کر سکتے تھے۔ ضرورت تھی کہ اس کی افادیت کو عام کیا جائے اور دوسرے علم دوستوں کے لئے بھی استفادہ کا موقع فراہم کیا جائے۔ ادارہ کا دفتر جس مقام پر واقع ہے اس کے اطراف و اکناف تین چار میل کے حلقے میں کوئی دارالمطالعہ یا کتب خانۂ عام موجود نہیں اور اس حصے (خیریت آباد، سوماجی گوڑہ، جوبلی ہل، پنجہ گٹہ، بیگم پیٹھ، امیر پیٹھ) میں شہر حیدرآباد کے اکثر و بیشتر علم دوست اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب قیام پذیر ہیں نیز خود شہر میں جو دارالمطالعے یا کتب خانے موجود ہیں ان میں سے کسی میں اتنے رسائل و اخبار نہیں آتے جتنے ادارۂ ادبیات اردو میں آتے ہیں اس لئے دور دراز کے شائقین مطالعہ کے استفادہ کے لئے بھی لحاظ کہ ایک دارالمطالعہ عامہ کی ضرورت تھی۔ مسرت کا مقام ہے کہ اس ہال کی تعمیر سے ادارے کی یہ دیرینہ تمنا پوری ہو گئی۔

دارالمطالعہ کا افتتاح | بتاریخ ۲۲ / مارچ ۱۹۴۳ء بروز جمعہ صبح گیارہ بجے ادارے کے فاضل صدر عالی جناب آنریبل ڈاکٹر نواب سر مہدی یار جنگ بہادر نے اپنے دست مبارک سے ادارے کے دارالمطالعہ عام کا افتتاح فرمایا۔ اس تقریب میں ادارے کے معتمدین شعبہ جات اور شاخہائے اضلاع کے نمائندے اور دیگر علم دوست اصحاب نے بھی شرکت فرمائی جن میں بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات وباب حکومت، پروفیسر حسین علی خاں صاحب پرووسٹ جامعہ عثمانیہ، نواب زین یار جنگ بہادر چیف ارکٹکٹ، نواب ہوش یار جنگ بہادر معتمد تعمیرات سرکار عالی، میر باسط علی خاں صاحب ایم اے بیرسٹرایٹ لا ناظم عدالت خفیفہ، ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے ڈی فل مہتمم کتب خانۂ آصفیہ،

نواب مرزا اسیف علی خان صاحب جاگیردار، پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی، مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اردو، مولوی شفیق محمد صاحب صدیقی ایم اے، مولوی بادشاہ حسین صاحب، مولوی کاظم حسین صاحب بی اے، مولوی عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی ایس سی، ایل ایل بی، مولوی مراد علی صاحب طالع، مولوی میر حسن علی صاحب دیجاپور، محمد حسین خان صاحب نظام آباد، غلام حسن صدیقی صاحب پرلی، اشرف الدین صاحب قیضی پربھنی، معین الدین صاحب صدیقی جولہ نظام الدین، محمد علی خان قلی بھوم جاگیر۔

افتتاح کے بعد معتمد صاحب ادارہ نے نواب سر مہدی یار جنگ بہادر کو پھول پہنائے اور عکس کشی پر یہ تقریب سعید اختتام کو پہونچی۔ اور یہ نیا ہال آباد ہوگیا۔ مولوی فیاض الدین صاحب نے اس کا نقشہ بنانے میں ایسی خوش ذوقی اور ماہرانہ پرکاری سے کام لیا ہے کہ جو شخص اسکو دیکھتا ہے تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مولوی ضامن علی صاحب غازی نے اس کی تعمیر و تکمیل میں جو دلچسپی لی وہ ایک سچے علمدوست اور رفیق ادارہ ہی سے ظہور پذیر ہوسکتی تھی۔ ادارۂ ادبیات اردو ان دونوں اصحاب کا ہمیشہ شکرگزار رہے گا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر زور صاحب نے جنگ کے اس ہولناک زمانہ میں اشیائے تعمیر کی گرانی کے باوجود ادارے کے لئے جس ایثار اور فراخدلی کا ثبوت دیا ہے وہ دوسرے ارباب علم و ادب کیلئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔

دارالمطالعہ کے قواعد

۱۔ فی الحال دارالمطالعہ کے اوقات سہ پہر میں ۳ تا ۸ قرار دیے گئے ہیں۔

۲۔ دارالمطالعہ میں بیڑی سگریٹ وغیرہ پینے کی ممانعت ہے۔

۳۔ دارالمطالعہ میں کسی قسم کا شور و غل اور بحث مباحثہ کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ اس سے دوسرے ناظرین کے مطالعے میں خلل واقع ہوتا ہے۔

۴۔ ہر ناظر کے لئے ضرورت ہے کہ دارالمطالعہ میں داخل ہوتے وقت رجسٹر ناظرین میں اپنا نام لکھکر دستخط کرے۔

۵۔ دارالمطالعہ میں کسی ناظر کو اپنی کتابیں وغیرہ لانے کی اجازت نہیں ہے البتہ نوٹ لینے کے لئے بہ اجازت نگران کار صرف کاغذ ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔

۶۔ کتابیں اور مجلدات سلپ پر ان کا نام اور نشان لکھ کر مطالعے کے لیے طلب کی جانی چاہئیں۔

نوٹ۔ الماریوں وغیرہ کا انتظام ہونے تک کتابوں کے مطالعے کے طریقے کو ملتوی رکھا گیا ہے۔

دارالمطالعہ میں جو رسائل اور اخبارات بغرض مطالعہ رکھے گئے ہیں ان کی فہرست آویزاں ہے۔

اردو رسائل

ادارے کے اس دارالمطالعے میں حسب ذیل رسائل موجود رہتے ہیں۔

رسالہ	مقام	رسالہ	مقام
آج کل	دہلی	جدید اردو	کلکتہ
ادب لطیف	لاہور	جیت	حیدرآباد
ادبی دنیا	لاہور	حسن خیال	ـ
ارشاد	حیدرآباد	حکیم دکن	ـ
البیان	امرتسر	حور	لاہور
آواز	سکندرآباد	حیدرآباد ٹیچر	حیدرآباد
ایشیا	بمبئی	خیابان	ـ
برہان	دہلی	زمانہ	کانپور
بچوں کا باغ	دہلی	ساقی	دہلی
بچوں کا سب رس	حیدرآباد	سائنس	حیدرآباد
پیام ادب	ـ	سب رس	ـ
پیغام حق	لاہور	سہاگ	لاہور
تصویر	رامپور	سیاست	حیدرآباد

شاعر	آگرہ	نصرت	علیگڑھ
شاہکار	لاہور	معارف	اعظم گڑھ
طلوع اسعد	کراچی	منزل	لکھنؤ
شہاب	حیدرآباد	نرالا	لاہور
عالمگیر	لاہور	نقاش	کلکتہ
فانوس	بنگلور	نگار	لکھنؤ
[illegible] سردار	حیدرآباد	نورس	اورنگ آباد
گرلز کالج میگزین	علیگڑھ	نئی زندگی	الہ آباد
مجلۂ تحقیقات علمیہ	حیدرآباد	ہندستانی	"
مجلۂ عثمانیہ	"	ہندستانی ادب	حیدرآباد
مجلۂ طیلسانین	"	ہماری کتابیں	"
مجلۂ نظامیہ	"	ہمایوں	لاہور
مست قلندر	لاہور	پل	الہ آباد

ہفتہ وار جرائد ذیل کے ہفتہ وار جرائد بھی پابندی سے آتے ہیں۔

الفاروق	ناگپور	صحت عامہ	حیدرآباد
ایشیاء	آگرہ	صدق	لکھنؤ
سلطنت	حیدرآباد	مملکت	حیدرآباد
شان اسلام	بمبئی	منادی	دہلی
شان ہند	"	نوائے وقت	لاہور

نیّر اعظم مرادآباد

اخبارات ذیل کے روزنامے بھی پابندی سے آتے ہیں۔

پیام	حیدرآباد	صبح دکن	حیدرآباد
رعیت	"	مسلمان	دہلی
رہبر دکن	"	میزان	حیدرآباد

وقت حیدرآباد

جلسۂ عطائے اسناد و انعامات ۱۹۴۳ء

ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات کا جلسۂ عطائے اسناد و انعامات سنہ ۱۳۵۲ف بتاریخ ۲۸ بہمن ۱۳۵۲ف م اردی بہشت سنہ ۱۹۴۳ء بروز جمعہ شام کے پانچ بجے ٹاؤن ہال باغ عامہ میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت جنرل والا شان شہزادہ اعظم جاہ بہادر نے فرمائی اور علیا حضرت شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ نے اسناد و انعامات اپنے دست مبارک سے تقسیم فرمائے۔

جلسہ کے امیدواروں کے علاوہ اضلاع کے مراکز امتحانات سے حسب ذیل اصحاب نے بطور نمائندہ شرکت کی اور اپنے اپنے مرکز کی اسناد حاصل کیں۔

(۱) شاخ پٹن — مولوی سید ظفر مہدی صاحب صدر
(۲) شاخ بیجاپور — مولوی میر حسن علی صاحب "
(۳) " نظام آباد — " محمد حسین خاں صاحب معتمد
(۴) " ہمنا آباد — " سید اسمٰعیل صاحب وکیل صدر
(۵) " پربھنی — " حمید اللہ صاحب شیدا معتمد
(۶) " کلیانی — " تاج الدین صاحب معتمد شعبہ طلبہ
(۷) " بھوم — " محمد علی خاں صاحب معتمد
(۸) " جولہ نظام الدین — " معین الدین صاحب صدیقی معتمد
(۹) " پرینڈہ — " زین الدین صاحب
(۱۰) " گلبرگہ — " مختار احمد صاحب بی ایس سی معتمد۔ مسٹر گنڈیا (نمائندہ گنوار ضلع گلبرگہ)
(۱۱) " پرلی — مولوی ابو ظفر محی الدین صاحب سابق معتمد شعبہ طلبہ

ان سب اصحاب کے قیام و طعام کا انتظام منجانب ادارہ حیدری قیام گاہ میں کیا گیا تھا ان میں سے بعض اصحاب نے اپنی سہولت کے لحاظ سے اپنے عزیز و اقربا کے پاس قیام کیا۔

ٹاؤن ہال سند لینے والوں اور علم دوست اصحاب سے معمور تھا۔ ادارے کی مجلس انتظامی کے ارکان اور معتمدین شعبہ جات

نے معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔

حاضرین میں افواج باقاعدہ سرکار عالی کے اکثر جنرل اعلیٰ عہدہ داروں کے علاوہ حسب ذیل اصحاب خاص کر قابل ذکر ہیں۔

نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات و باب حکومت، نواب مہدی نواز جنگ بہادر معتمد صنعت و حرفت، نواب بہادر یار جنگ بہادر، مولوی سید محمد اعظم صاحب ناظم تعلیمات، مولوی سید علی اکبر صاحب پرنسپل نظام کالج، مولوی غلام یزدانی صاحب او، بی، ای، پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی، ڈاکٹر سید حسین صاحب مسجل جامعہ عثمانیہ، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب، مولوی ظہیر الدین احمد صاحب صدر محاسب سرکار عالی، مولوی رکن الدین احمد صاحب، ڈاکٹر راحت اللہ خاں مہتمم کتب خانۂ آصفیہ، مولوی غلام قادر صاحب پرنسپل دار العلوم، پروفیسر محمد علی خاں صاحب، مولوی محمد عالم صاحب، پروفیسر لطیف احمد صاحب فاروقی، مولوی حبیب احمد صاحب فاروقی، مولوی محمد اعظم صاحب لکچرار، مولوی سید محمد صاحب لکچرار، مولوی ابوظفر صاحب لکچرار، مولوی مرزا احسن علی صاحب غازی، نواب مرزا سیف علی خاں صاحب، نواب میر سعادت علی صاحب رضوی، مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی، مولوی فیض محمد صاحب، مولوی بادشاہ حسین صاحب، مولوی کاظم حسین صاحب وغیرہ

نشر کا انتظام

جلسے کی کارروائی نشرگاہ سرکار عالی حیدرآباد کی جانب سے راست ٹاؤن ہال باغ عامہ سے نشر کی گئی اور ممالک محروسہ کے علاوہ دوسرے مقامات کے علم دوستوں نے بھی گھر بیٹھے ٹاؤن ہال کی تقریریں اور خطبے سنے۔ ساتھ ہی ادارے کی تاریخ اور شعبوں کی تفصیلات بھی نشر کی گئیں۔ جس کے لئے نشرگاہ سرکار عالی کا منجانب ادارہ شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

عصرانہ

تقسیم اسناد کے بعد شہزادۂ والاشان اور شہزادی صاحبہ اور دیگر مہمانان بلدہ و اضلاع کی ایک پر تکلف عصرانے سے ضیافت کی گئی جو ٹاؤن ہال کے بالاخانے پر مرتب کی گئی تھی۔ تقریباً شام کے سات بجے یہ دلچسپ علمی صحبت اختتام کو پہنچی۔

خیر مقدم و رُوداد اُردو امتحانات ۱۹۴۳ء

(یہ روداد اس جلسۂ عطائے اسناد میں سنائی گئی جو ۲۴ مارچ ۱۹۴۳ء کو بصدارت جنرل والاشان شہزادہ ڈاکٹر معظم جاہ بہادر بمقام ٹاؤن ہال باغ عامہ حیدرآباد منعقد ہوا۔)

حضرت شہزادۂ والاشان۔ جنابہ شہزادی صاحبہ اور معزز حاضرین جلسہ۔

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ اردو امتحانات کے صدر کی حیثیت سے آج اس چوتھے جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات میں آپ سب خواتین و حضرات کا میں بڑی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔ گزشتہ جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت حضرت شہزادہ جنرل والاشان ڈاکٹر اعظم جاہ بہادر ہِز ہائی نس پرنس آف برار نے فرمائی تھی اور اسناد و انعامات علیا حضرت ہر ہائی نس شہزادی دُرِّ شہوار نے اپنے دست مبارک سے تقسیم فرمائے تھے۔

آج ہمیں اپنی اس خوش بختی پر ناز ہے کہ دودمانِ آصفی کے ایک اور چشم و چراغ شہزادۂ جنرل والاشان ڈاکٹر نواب معظم جاہ بہادر اس جلسہ کی صدارت فرما رہے ہیں اور علیا حضرت شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ اپنے دست مبارک سے کامیاب امیدواروں کو اسناد اور انعامات تقسیم فرمائیں گی۔

حضرت شہزادۂ والاشان ڈاکٹر معظم جاہ بہادر کو علم و ادب خصوصاً اردو ادب سے جو دلچسپی ہے اس کا تعارف میرے لئے غیر ضروری ہے۔ ہندوستان کی ادبی دنیا اور حیدرآباد کا ہر تعلیم یافتہ شخص حضرت شجیعؔ کے کلام سے محظوظ ہوتا ہے اور بلند پایہ رسائل و جرائد ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں کہ اپنے صفحات کو شہزادۂ والاشان کے کلام سے زینت بنائیں۔ عہد حاضر میں حضرت شجیعؔ نے اردو کے باکمال شعرا کی جو سرپرستی فرمائی ہے اس کو تاریخ ادب اردو بھول نہ سکے گی اور خود شہزادۂ والاشان کا اسم مبارک اردو کے باکمال شعرا کی فہرست میں کبھی محو نہ ہو سکے گا۔ یہ سرزمین حیدرآباد کی خوش قسمتی ہے کہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع سلطان الشعراء خلد اللہ ملکہٗ کے اس چشم و چراغ نے اردو شاعری کی محفلوں کو جگمگا دیا ہے۔

حضرت شہزادۂ والاشان کے ساتھ ہم حضرت شہزادی صاحبہ کی خدمت میں بھی ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں کہ آج کے جلسہ میں رونق افروز ہو کر ہماری عزت افزائی فرمائی جہاں شہزادۂ والاشان اپنے شعر و سخن کے ذوق اور آرائش بلدہ اور غریبوں کے آرام و آسائش کے کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل فرما چکے ہیں شہزادی ممدوحہ مختلف اصلاحی اور معاشرتی رفاہ کے کاموں میں رہنمائی فرماتی رہتی ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں خواتین و اطفال کی طبی امداد کے لئے جو انجمن قائم ہوئی ہے وہ شہزادی صاحبہ ہی کی رہبری میں بڑی کامیابی کے ساتھ طبقۂ نسواں کے فلاح و بہبود کا کام انجام دے رہی ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی زندگی کا یہ چودھواں سال ہے اور یہ ادارہ اپنے قابل صدر آنریبل ڈاکٹر نواب سر مہدی یار جنگ بہادر کی عالمانہ رہنمائی میں اردو ادب، تاریخ دکن اور تعلیم بالغاں کی جو خدمات انجام دے رہا ہے ان کے روشناس کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس امر کا اظہار میرے لئے موجب مسرت ہے کہ اس ادارے کا ایک شعبہ جو تعلیم بالغاں کے کام کو اپنے طور پر آگے بڑھا رہا ہے اور

اردو کی ترقی اور قبولیت عامہ کے لئے اردو امتحانات کا جو سلسلہ قائم کیا ہے وہ گزشتہ چار سالوں میں برابر سرگرم عمل رہا اور اس کی افادیت میں روز افزوں ترقی ہوتی جا رہی ہے چنانچہ گزشتہ سال خواندگی کی مہم میں اس ادارہ کو ایسی کامیابی حاصل ہوئی کہ اردو دانی کا امتحان سال میں دو بار منعقد کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ اس ایک سال میں جتنے امیدواروں نے اردو امتحانات میں شرکت کی ان کی تعداد ابتدائی تین سالوں کے شرکا کی مجموعی تعداد کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو امتحانات کا آغاز کرکے ادارے نے ایک صحیح اقدام کیا ہے۔ یہ ادارہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو نہ صرف بلکہ مختلف اضلاع و دیہات میں مخلص کارکن فراہم ہوتے جا رہے ہیں یہ حضرات ملک میں اردو کی اشاعت کرنے اور خواندگی کی مہم کو آگے بڑھانے میں جو کام انجام دے رہے ہیں وہ نہایت قابل قدر ہے۔ ادارہ کے اردو امتحانات صرف ملکت حیدرآباد ہی میں مقبول نہیں ہیں بلکہ اس کے باہر بھی ان سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر میں بڑی مسرت کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار کروں گا کہ اس سال اردو امتحانات کا ایک مرکز شہر بمبئی بھی تھا اور وہاں ان امتحانات کی خاطر گزشتہ سال تقریباً پچیس ان پڑھوں کو پڑھا لکھا بنا دیا گیا۔ اسی طرح ہمارے دوسرے ہمسایہ برطانوی علاقوں یعنی صوبۂ متوسط و برار اور صوبۂ مدراس میں بھی کام شروع ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی ریاست میسور بھی اس خوش گوار فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اگرچہ وہاں گزشتہ دو تین سال ہی سے ادارے کے اردو امتحانات کے لئے امیدوار تیار ہو رہے تھے لیکن جب سے پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب جامعۂ میسور میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے تشریف لے گئے ہیں اس وقت سے ادارے کا یہ فیض وہاں بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف اس شعبۂ اردو امتحانات کے معتمد تھے اور ان کی وجہ سے ہم کو اس شعبے کے کاروبار کی انجام دہی میں بڑی مدد ملتی تھی۔ افسوس ہے کہ ادارہ اب ان کے راست تعاون سے محروم ہو گیا اور شعبۂ اردو امتحانات کو بھی صدمہ پہنچا۔ لیکن یہ امر موجب اطمینان ہے کہ میسور میں اب اردو کا کام زیادہ مستحکم بنیادوں پر شروع ہو چکا ہے۔ میسور کی طرح ریاست جوناگڑھ میں بھی طبقۂ اناث میں اردو امتحانات مقبول ہوتے جا رہے ہیں اور وہاں کی خواتین ان پڑھوں کی تعلیم اور اردو دانی کے امتحان کے لئے مفید کام انجام دے رہی ہیں۔

اس موقع پر میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ اردو امتحانات محض اس مقصد سے قائم کئے گئے ہیں کہ جہالت کو دور کرکے علم کی روشنی کو پھیلایا جائے اور ادب سے عوام میں دلچسپی پیدا کی جائے۔ قوم کے نونہالوں کے لئے تو مدارس اور کالج قائم ہیں لیکن بڑی عمر کے ایسے اشخاص کے لئے جن کو کسی جامعہ یا سلسلہ تعلیمی ادارے میں اردو کی تعلیم اور ذوق سے بہرہ مند ہونے کا اب موقع حاصل نہیں ہے یا ایسے اصحاب کے لئے جو دوسرے مضامین کے تعلیم یافتہ یا سند یافتہ تو ہوتے ہیں لیکن اردو زبان اور ادب سے بخوبی واقف نہیں ہیں اردو کی تعلیم کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ اسی طرح ایسی عورتوں کے لئے بھی سہولتیں پیدا کرنے کی ضرورت تھی جو سرکاری مدارس سے استفادہ کرنے کے قابل نہ رہی ہوں۔ بہت سے افراد خصوصاً عورتیں ایسی بھی ہیں جنھوں نے خانگی طور پر اردو میں لکھنے پڑھنے کی خاصی مہارت حاصل کی ہے لیکن اپنے ٹھیک علمی و ادبی معیار سے لاعلم ہیں اور اس طرح اس خود اعتمادی سے محروم ہیں جو امتحان دینے اور سند حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے ادارۂ ادبیات اردو نے ۱۹۳۹ء میں ان امتحانات کا آغاز کیا تھا۔ اس کے کاروبار ایک مجلس انتظامی کے سپرد ہیں جس کی صدارت کا شروع ہی سے مجھے فخر حاصل ہے۔ مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج بحیثیت نائب صدر اس شعبے کے روح رواں ہیں۔ چنانچہ ان کی نگرانی میں اس شعبہ نے اردو دانی کی نصابی کتابیں تیار کرا کے چھپوائیں جو بہت مقبول ہوئیں اور اب دوا اور کتابیں

کتابیں مرتب اور شائع کرائی گئی ہیں جن میں سے ایک "معلم بالغان" ہے جس کو راہ حسن صاحب ایم اے پرنسپل صاحب موصوف ہائی اسکول نے ان لوگوں کے لئے قلمبند کیا ہے جو خواندہ پڑھے لکھے کو پڑھا لکھا بنانے کی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں. یہ اردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور توقع ہے کہ جہاں جہاں اردو کی تعلیم بالغان کا کام ہو رہا ہے یہ کتاب ایک مفید رہنما ثابت ہوگی.

مولوی سجاد مرزا صاحب نے شعبہ اردو امتحانات کے لئے اپنی نگرانی میں ایک اور ضروری کتاب "رفیق اردو داں" مولوی مرزا حسیب اللہ بیگ صاحب سے مرتب کرائی ہے جو نہایت ہی دیدہ زیب اور باتصویر شائع ہو رہی ہے. اس کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اردو لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں وہ اپنی فرصت کے اوقات میں مطالعہ جاری رکھ کر پڑھنے لکھنے کی دولت میں اضافہ کر سکیں. ایسی کتاب کی بھی بے حد ضرورت تھی ورنہ اندیشہ تھا کہ جو لوگ امتحان اردو دانی میں کامیاب ہوئے ہیں وہ مدد ایام کے ساتھ جہاں سے چلے تھے وہیں واپس پہنچ جائیں. اس کتاب میں صرف دلچسپ قصے اور کہانیاں شریک کی گئی ہیں بلکہ ایک معمولی انسان کے لئے جو معلومات ضروری ہیں ان کو بھی دلچسپ پیرایہ میں درج کیا گیا ہے. ادارہ کوشش کرے گا کہ آئندہ اس قسم کی مزید کتابیں شائع کرے.

۱۹۴۳ء میں ادارے نے اردو دانی کا دو بار امتحان لیا. پہلا امتحان ماہ اگست میں لیا گیا جس میں ۹۰۵ امیدواروں نے شرکت کی لیکن ۸۴۰ حاضر رہے جن میں سے ۶۲۲ کامیاب ہوئے.

دوسرا امتحان ماہ ڈسمبر میں لیا گیا جس میں ۱۰۰۹ امیدواروں نے شرکت کی لیکن بوقت امتحان ۶۹۰ حاضر رہے اور اس کا نتیجہ بہت اچھا نکلا یعنی ۶۲۳ امیدوار کامیاب ہوئے. اس طرح ۱۹۴۳ء میں گویا (۱۲۴۵) ان پڑھ آدمی پڑھے لکھے بنائے گئے اور یہ تعداد تو ان لوگوں کی ہے جنہوں نے امتحان میں شرکت کی درخواست دی ان کے علاوہ سیکڑوں آدمی ایسے بھی ہیں جنہوں نے پڑھنا لکھنا سیکھا، نصاب کی تکمیل کی، لیکن شرکت کی فیس داخل نہ کر سکنے یا علالت یا ملازمت کی مجبوریوں کی وجہ سے شرکت کا ارادہ نہ کر سکے. جن لوگوں نے اردو دانی کا امتحان کامیاب کر لیا تھا ان میں سے اکثروں کی یہ خواہش تھی کہ اپنی فرصت کے اوقات میں پڑھنا لکھنا جاری رکھیں اور اس کی خاطر کوئی امتحان مقرر کیا جائے چنانچہ ۱۹۴۲ء میں اردو زبان دانی کا ایک امتحان پہلی بار لیا گیا تھا اور گزشتہ سال اس کا دوسرا امتحان منعقد ہوا. اور اس میں چار سو امیدواروں نے شرکت کی درخواست دی جن میں سے تین سو پینتیس شریک اور ۲۰۱ کامیاب ہوئے.

ان دو امتحانوں کے علاوہ بقیہ امتحانوں کے شرکا، اور کامیاب امیدواروں کی تفصیل یہ ہے.

نام امتحان	شریک	حاضر	کامیاب
۱. اردو عالم	۲۵۶	۲۱۳	۱۰۰
۲. اردو فاضل	۳۱	۲۷	۱۷
۳. خوش نویسی	۱۷	۱۴	۷

ساتھ ہی یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نتیجۂ کامیابی کا فی صد بھی واضح کر دیا جائے جو نقشۂ ذیل سے ظاہر ہوگا.

نام امتحان	حاضر	کامیاب	نتیجہ فیصد
۱. اردو دانی	۱۴۳۸	۱۲۵۵	۸۷
۲. اردو زبان دانی	۳۳۵	۲۰۱	۹۰
۳. اردو عالم	۲۱۳	۱۰۰	۴۷
۴. اردو فاضل	۲۷	۱۷	۶۳
۵. خوش نویسی	۱۴	۷	۵۰

یہاں اس امر کی وضاحت غیر ضروری ہے کہ ان اردو امتحانات میں ہر مذہب و ملت اور طبقے کے امیدوار شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ امسال امتحان اردو عالم میں ایک ہندو امیدوار بی۔ وی گوپال راؤ بہ حیثیت مجموعی اول آئے ہیں۔ اسی طرح متعدد غیر مسلم امیدواروں نے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی ہے جن کو آج انعامات بھی عطا کئے جائیں گے۔

اردو امتحانوں کے چار سالہ نصاب اور دیگر تفصیلات ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے ایک کتاب "اوراق [illegible]" میں شائع ہو چکی ہیں اس لئے اس بارے میں مزید وضاحت میرے لئے غیر ضروری ہے۔ البتہ میں اپنے اس مختصر مقدمہ کو ختم کرنے سے قبل اس واقعہ کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ شعبۂ امتحانات نے ان امتحانوں کی فیس بہت ہی کم یعنی اردو دانی کے لئے ایک روپیہ۔ اردو زبان دانی کے لئے دو روپے اور اسی طرح آخری بڑے امتحانات یعنی اردو فاضل کے لئے سات روپے مقرر کی ہے اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ سب امتحانوں ہی کے انتظامات پر صرف ہو جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مفید تحریک کو زیادہ قوی بنانے کے لئے علم دوست اصحاب اس شعبے کا ہاتھ بٹائیں اور غریب اور پڑھنے والوں کے لئے مفت کتابیں فراہم کرنے اور امتیاز سے کامیاب ہونے والوں کے لئے انعامات اور تمغوں کی رقمیں عطا فرمائیں۔ اس مد میں سال حال تین اصحاب نے پچاس پچاس روپے عطا فرمائے ہیں جن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی علیگڑھ۔
مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ۔
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔

جو اصحاب بلدہ اور اضلاع میں امتحانوں کو مقبول بنانے اور تعلیم بالغاں کو وسعت دینے میں خاموشی کے ساتھ ادارے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں ان سب کا نام بنام شکریہ میں خوشی سے ادا کرتا اگر بے جا طوالت اور آپ کی سمع خراشی کا خوف نہ ہوتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ مخلص خدمت گزار نام و نمود اور اظہار تشکر کی پروا کئے بغیر کام کر رہے ہیں۔ البتہ صرف دو اصحاب کا نام لینا ضروری سمجھتا ہوں جن کے نام اور کام ادارۂ ادبیات اردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان میں سے ایک کرنل نذیر الاسلام خاں صاحب ہیں جنھوں نے افواج سرکار عالی میں اردو امتحانات کو رائج کرنے میں ادارے کی مدد کی اور ہماری افواج کے علم دوست اور صاحب کمال کمانڈر جنرل سید احمد العیدروس کے بہبودی فوج کے کاموں میں اضافہ کا باعث ہوئے۔

دوسرے صاحب جن کا مجھے خاص طور پر ذکر کرنا ہے مولوی عارف الدین حسن صاحب ڈویژن افسر اورنگ آباد ہیں جو کئی سال تعلیم بالغاں کے کام میں ادارے کا ہاتھ بٹانے میں شبانہ روز مصروف ہیں۔

سالہائے ماسبق کی طرح سال زیر رپورٹ میں بھی شعبۂ امتحانات کے ہر کام میں ادارۂ ادبیات اردو کے بانی اور مقبول اور جوشیلے معتمد ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے بیش قیمت امداد فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شعبے نے جو کچھ کامیابی حاصل کی ہے اس کا سہرا زور صاحب کے سر ہے۔

اب میں آپ سب صاحبوں اور خاص کر شہزادۂ والا شان اور شہزادی صاحبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی شرکت سے اس جلسہ کو افتخار کا موقع بخشا اور اردو کی خدمت کرنے والوں کی ہمت افزائی کی۔

سید علی اکبر

تقریر یوبلی ڈاکٹر نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارہ

شہزادۂ والا شان جنرل ڈاکٹر نواب معظم جاہ بہادر۔ شہزادی صاحبہ، خواتین و حضرات!

ادارۂ ادبیات اردو کی زندگی کے تیرہ سال ختم ہو چکے۔ اب اس نے چودھویں سال میں قدم رکھا ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ اس کی ترقی کی رفتار بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اس ادارے کے یوں تو بارہ شعبے ہیں لیکن ان میں سے پانچ کے کام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۱) سب سے پہلا کام جس میں ادارے نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے تاریخ دکن کی خدمت ہے۔ ملک میں تاریخ کا ذوق عام کرنے کے لئے ادارے نے اب تک یوں تو کئی کتابیں شائع کی ہیں لیکن ان میں سلاطین آصفی کے سوانح حیات کا سلسلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اب تک چھ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اور حضرت آصف جاہ اول سے لے کر غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس تک جملہ آصفجاہی سلاطین کے حالات باتصویر چھوٹی چھوٹی کتابوں میں منظر عام پر آچکے ہیں۔

قطب شاہی عہد کے سلاطین اور امراء پر بھی ادارے نے اب تک کئی کتابیں شائع کیں اور تاریخ دکن کی تحقیقات کے لئے بڑا اچھا ذخیرہ فراہم کر لیا ہے جس سے استفادہ کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ قلعۂ گولکنڈہ میں کٹورہ حوض کے کنارے ادارے کو تقریباً سات ایکڑ زمین پٹہ پر حاصل ہوگئی ہے جس پر تاریخی مخزن اور طلبہ و محققین تاریخ کی رہائش گاہ کی عمارتوں کا نقشہ نواب زین یار جنگ بہادر تیار کر رہے ہیں اور توقع ہے کہ سال حال ان کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔

(۲) دوسرا کام ادارے کا کتب خانہ ہے۔ جس میں پندرہ سو سے زیادہ قلمی اور بارہ ہزار مطبوعہ کتب جمع ہو چکی ہیں اور قلمی نوادر کے تذکرے کی پہلی جلد اسی سال چھپ بھی چکی ہے جس میں ۵۰۲ مخطوطات کی تفصیلات درج ہیں۔ کتابوں کے علاوہ تقریباً سو رسائل و جرائد بھی ادارے میں پابندی کے ساتھ آتے ہیں۔

ادارے کے کتب خانہ سے کتابیں مطالعہ کے لئے باہر نہیں دی جاتیں البتہ اس کے اراکین وہیں بیٹھ کر ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اب تک عمارت ناکافی ہونے کے باعث زیادہ اصحاب ان سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ اب ادارے کے معتمد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے ذاتی صرفہ سے دارالمطالعہ کے لئے ایک ہال بنایا ہے جو ابھی تکمیل کو پہنچا ہے اور جس کا میں نے آج ہی بڑی مسرت کے ساتھ افتتاح کیا ہے اس ہال کی وجہ سے محققین اور مطالعہ کرنے والوں کو بڑی سہولت حاصل ہوگئی ہے اور توقع ہے کہ اب زیادہ سے زیادہ اصحاب ادارے کے علمی ذخیرے سے استفادہ کر سکیں گے۔

(۳) ادارے کا تیسرا اہم کام مخزن علوم و فنون یعنی اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و اشاعت ہے۔ یہ کام بڑا صبر آزما اور محنت طلب تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ پہلی جلد مرتب ہو کر دارالطبع سرکار عالی میں بغرض طباعت روانہ ہو چکی ہے۔

(۴) ادارے کا چوتھا کام مختلف موضوعوں پر مفید کتب اور رسالۂ سب رس کی اشاعت سے متعلق ہے۔ گزشتہ سال باوجود مختلف ہنگامی مشکلات کے ادارے نے بارہ کتابیں شائع کیں جن میں سے بعض مثلاً ہندوستانی تمدن از ڈاکٹر ٹوپا، طبیعیاتی کائنات

از پروفیسر محمد علی خاں۔ پھولوں کی کہانی از پروفیسر سعید الدین اور تعلیم کا مسئلہ از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اپنے مطالب اور افادیت کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں۔ ادارے کا ترجمان رسالہ سب رس بھی برابر پابندی کے ساتھ جاری ہے اور اردو کا ذوق عام کرنے میں ادارے کی بڑی مدد کر رہا ہے۔

ش۔ آخری کام جس کی رپورٹ مولوی سید علی اکبر صاحب نے ابھی آپ کو سنائی۔ تعلیم بالغان سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ادارے نے بڑی محنت اور توجہ سے کام کیا ہے۔ گزشتہ سال اس نے ۲۲ مختلف اضلاع اور دیہات میں اپنا ایک وفد بھی روانہ کیا جس نے وہاں کے باشندوں کو اردو کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا چنانچہ ۱۹۴۳ء میں اردو امتحانات میں شریک ہونے والوں میں جو معتدبہ اضافہ ہوا ہے وہ اس وفد کے کام کا بھی نتیجہ ہے۔ توقع ہے کہ یہ امتحانات اسی طرح مقبول ہوتے جائیں گے اور ملک میں ناخواندہ لوگوں کی تعداد رفتہ رفتہ صفر تک پہنچ جائے گی۔

اب میں حضرت شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ سے استدعا کرتا ہوں کہ ۱۹۴۳ء کے کامیاب امیدواروں کو اسناد اور انعامات عطا فرمائیں اور شہزادۂ والاشان جنرل ڈاکٹر نواب معظم جاہ بہادر کا منجانب ادارہ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ہمارے ادارے کے اس جلسے کی صدارت قبول فرما کر اپنی شہرۂ آفاق علم دوستی اور ادب پروری کا مزید ثبوت دیا۔

مہدی یار جنگ

خطبۂ صدارت

شہزادہ والاشان جنرل ڈاکٹر معظم جاہ بہادر

اردو زبان و ادب اور خاص کر شعر و سخن سے مجھے جو دلچسپی ہے اس کی بنا پر مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ حیدرآباد میں جہاں حضرت اقدس و اعلیٰ کی سرپرستی میں جامعہ عثمانیہ سرکاری طور پر علمی خدمات انجام دے رہی ہے وہیں ادارۂ ادبیات اردو کے نام سے یہ خانگی ادارہ بھی ملک کی زبان، تاریخ اور تمدن کی حفاظت و ترقی کے لئے گزشتہ تیرہ سال سے کوشش کر رہا ہے۔

اس ادارہ نے نہ صرف جدید و قدیم شاعروں کے کلام اور مکتوبات کے اچھے مجموعے اور انتخابات شائع کئے بلکہ ملکی مشاہیر ادب کے آثار کی حفاظت کا کام بھی کیا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بھی بہت مسرت ہوئی کہ اس ادارہ نے ملک میں تاریخ کا ایک اچھا ذوق پیدا کر دیا ہے۔ خصوصاً سلاطین آصفیہ کے سبق آموز حالاتِ زندگی شائع کر کے ملکی تاریخ کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ ادارہ مختلف علوم و فنون مثلاً تاریخ، سائنس، تنقید اور تعلیم سے متعلق بھی متعدد مفید کتابیں شائع کر چکا ہے۔ اس ادارہ کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک مخزن علوم و فنون مرتب کی جس کی پہلی جلد زیر طبع ہے۔

یہ سب کام ایسے اہم اور مفید ہیں جن کے لئے ادارہ کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ لیکن میرے نزدیک اس ادارے کی سب سے زیادہ قابلِ تعریف کوشش تعلیم بالغاں کی مہم ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں تعلیم کا اوسط افسوسناک حد تک کم ہے۔ غریب اور ان پڑھ لوگوں کو پڑھا لکھا بنانا نہایت ضروری ہے۔ پرنسس اور میرے لئے یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ ادارہ کے اردو امتحانات میں مردوں کے علاوہ ہر مذہب و ملت کی خواتین بھی شریک ہوتی ہیں۔ اور اس طرح تعلیمی ذوق روز بروز پھیلتا جا رہا ہے۔

توقع ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو اپنے پرجوش کارکنوں کی بدولت روز افزوں ترقی کرے گا۔ اور ملک کے علمی و تمدنی ارتقاء میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے گا۔

سرپرستی

یہ خبر علمی حلقوں میں بڑی مسرت سے سنی جائے گی کہ شہزادۂ والاشان نے ازراہ علم دوستی ادارے کی سرپرستی قبول فرما کر ایک ہزار روپیہ بھی عطا فرمائے ہیں۔ (ادارہ)

ادارئیہ روزنامۂ رہبر دکن

(ادارۂ ادبیات اردو کا جلسۂ تقسیم اسناد)

ادارۂ ادبیات اردو کا جلسۂ تقسیم اسناد اس مرتبہ شہزادۂ والا شان حضرت معظم جاہ بہادر کی صدارت میں باغ عامہ ٹاؤن ہال میں بڑی شان سے منعقد ہوا اور اسناد و انعامات کی تقسیم شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ اس کی علمی سرگرمیاں ماشاء اللہ اب اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ملک کے ہر گوشہ میں انکا اعتراف کیا جا رہا ہے انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر عزم راسخ و سعیٔ پیہم موجود ہو تو غیر سرکاری کوششیں بھی علمی و فنی میدان میں بہت ہی نمایاں نتائج حاصل کر سکتی ہیں۔ اس ادارہ نے جس کی ابتدا کچھ زیادہ شاندار نہ تھی، اردو کی خدمت کو اپنی فکر و کاوش کا مرکز ٹھیرایا اور ابتداءً چند پرانی اور غیر مطبوعہ تاریخی و ادبی کتابیں نئے طریق پر مرتب کر کے شائع کرنی شروع کیں۔ مگر ذوقِ خدمت زبان نے خدمت کا موقع دیا اور خدمت نے ذوقِ خدمت کو بڑھانا شروع کیا اور اس طرح میدان عمل وسیع سے وسیع تر ہونے لگا۔ اب یکے بعد دیگرے قابل قدر کتابیں بھی نکلنے لگیں اور ایک ادبی رسالہ بھی شائع ہونے لگا اور اس کے باوجود اس نے ایک طرف تو اردو زبان میں "مخزنِ علوم و فنون" کی تدوین و ترتیب شروع کر دی اور دوسری طرف ناخواندگی کے خلاف مختلف امتحانی نصاب مرتب کر کے ایک جہاد شروع کر دیا اور سارے ممالک محروسہ میں امتحانی مراکز قائم کر دیے۔ اس طرح ملک میں ہر سمت اردو زبان میں اسناد حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا اور مرد اور عورتیں کثیر تعداد میں بلا لحاظ مذہب و ملت ان امتحانوں میں شریک ہونے اور اسناد حاصل کرنے لگیں۔ حتیٰ کہ اس جلسۂ تقسیم اسناد میں ۱۲۰۲۷ اسناد اور ۴۰۰ انعامات تقسیم ہوئے۔

شہزادۂ والا شان حضرت معظم جاہ بہادر نے جو اردو زبان و ادب کا ایک پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور اردو شعر و سخن کا بہت اچھا ملکہ اپنے فاضلانہ خطبۂ صدارت میں اس ادارہ کی سرگرمیوں کو نہایت ہی جامع طور پر ظاہر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا کہ۔

"اس ادارہ نے نہ صرف جدید و قدیم شاعروں کے کلام اور مکتوبات کے اچھے مجموعے اور انتخابات شائع کئے بلکہ ملکی مشاہیر ادب کے آثار کی حفاظت کا کام بھی کیا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بھی بہت مسرت ہوئی کہ اس ادارے نے ملک میں تاریخ کا ایک اچھا ذوق پیدا کر دیا ہے۔ خصوصاً سلاطین آصفیہ کے سبق آموز حالاتِ زندگی شائع کر کے ملکی تاریخ کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ ادارہ مختلف علوم و فنون مثلاً تاریخ، سائنس، تنقید اور تعلیم سے متعلق بھی متعدد مفید کتابیں شائع کر چکا ہے۔ اس ادارہ کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک مخزن علوم و فنون مرتب کی جس کی پہلی جلد زیر طبع ہے۔

یہ سب کام بڑے اہم اور مفید ہیں جن کے لئے ادارہ کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مبارکباد کے مستحق ہیں لیکن میرے نزدیک اس ادارہ کی سب سے زیادہ قابل تعریف کوشش تعلیم بالغان کی مہم ہے"

ادارۂ ادبیات اردو اپنی ان ساری کوششوں کے لئے یقیناً مستحق مبارکباد ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کا دائرۂ افادیت ان شاء اللہ روز بروز وسیع تر ہوتا جائے گا۔

(از رہبر دکن بابت ۲۹ مارچ ۱۹۴۴ء)

اداریہ روزنامہ صبح دکن

ادارۂ ادبیاتِ اردو

ادارۂ ادبیات حیدرآباد میں ایک عرصے سے علم اور ادب کی خاموش خدمت انجام دے رہا ہے۔ دکنی مخطوطات اور حیدرآباد کی بعض شخصیتوں کی سوانح حیات کو شائع کرکے اس نے حیدرآباد کے کلچر، تہذیب اور تمدن کو محفوظ کرنے میں بہت بڑی مدد دی۔

اس ادارے کے ۲۲ مارچ سنہ [illegible] کے جلسہ تقسیم اسناد میں ڈاکٹر شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر نے جو تقریر فرمائی اس میں آپ نے ادارے کی علمی خدمات کو بہت سراہا اور خصوصاً اس ادارے نے تعلیم بالغاں کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے اس کے متعلق شہزادہ والا شان نے فرمایا کہ:-

"میرے نزدیک اس ادارے کی سب سے زیادہ قابلِ تعریف کوشش تعلیم بالغاں کی مہم ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں تعلیم کا اوسط افسوسناک حد تک کم ہے غریب اور ان پڑھ لوگوں کو پڑھا لکھا بنانا نہایت ضروری ہے"

ادارے کے یہ امتحانات چار سال سے برابر منعقد کئے جارہے ہیں اور ادارے کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے امتحانات کو دیگر صوبوں مثلاً میسور اور بمبئی وغیرہ میں بھی پسند کیا جارہا ہے۔

اس ادارے کی سرگرمی صرف اردو امتحانات کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس نے بعض بڑی عمدہ کتابیں بھی تعلیم بالغاں اور اردو امتحانات کے نصاب کے لئے شائع کی ہیں۔ عوام کو تعلیم دلانے کی ساری ذمہ داری حکومت ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ملک کے بعض بااثر لوگوں کو بھی اس مہم میں کافی دلچسپی لینی چاہیے۔ دوسرے ممالک میں محض خانگی ادارے ہی کئی مفید اور کارآمد اسکیمیں چلاتے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو ایک بالکل خانگی ادارہ ہے جو ابتدا میں صرف اپنے ہی بل بوتے پر کھڑا ہوا تھا لیکن آج اس کی وسیع سرگرمیاں اہلِ ملک سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہیں۔ اس خصوص میں پرنس معظم جاہ بہادر نے فرمایا کہ:-

"جہاں حضرت اقدس و اعلیٰ کی سرپرستی میں جامعہ عثمانیہ سرکاری طور پر علمی خدمات انجام دے رہی ہے وہیں ادارۂ ادبیات اردو کے نام سے یہ خانگی ادارہ بھی ملک کی زبان، تاریخ اور تمدن کی حفاظت و ترقی کے لئے گزشتہ تین سال سے کوشش کر رہا ہے"

حیدرآباد میں جہاں کی تعلیم کا اوسط بہت ہی پست ہے وہاں ایسے اداروں کی سرگرمی یقیناً اس ملک کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اردو کی اشاعت و ترویج کا بھی یہ امتحانات ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ اردو کو اگر قومی زبان بننا ہے تو اسے پہلے عوام کی زبان ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔ کیونکہ اگر محض تعلیم یافتہ حضرات ہی اردو لکھ پڑھ سکیں تو وہ زبان کبھی قبولِ عام کا درجہ حاصل نہیں کرے گی۔ اس کے لئے بہترین ذریعہ یہی تھا کہ بجائے حکومت پر بوجھ ڈالنے کے خود خانگی طور پر اردو امتحانات مقرر کئے جائیں۔ بہت کم ادارے ایسے ہیں جو خالص علمی کام انجام

دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ادارۂ ادبیات اردو ملک کا وہ تنہا ادارہ ہے جو ٹھوس علمی اور اردو پرچار کا کام کر رہا ہے۔

اردو زبان میں ہر قسم کا ادبی سرمایہ تو موجود ہے لیکن تاہم اس کا دامن علوم و فنون سے تہی ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے باضابطہ کی بنیاد رکھی گئی۔ جامعہ عثمانیہ میں علوم و فنون کی بیسوں کتابیں ترجمہ کر دی گئیں۔ پھر بھی ایک انسائیکلوپیڈیا کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ کہ اس سے قبل بھی مختلف حضرات نے ہندوستان میں انسائیکلوپیڈیا کر شائع کرنے کی کوشش کی لیکن بعض ناگزیر وجوہات کے تحت ان کی تمنائیں بار آور نہ ہو سکیں۔ اس اہم اور صبر آزما کام کا ادارۂ ادبیات اردو نے باوجود اپنی کم عمری کے ارادہ کیا ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پرنس معظم جاہ بہادر نے فرمایا کہ:-

"اس ادارے کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک مخزنِ علوم و فنون مرتب کی جس کی پہلی جلد زیر طبع ہے"۔

اس عظیم کام کو ڈاکٹر زور صاحب نے شروع کیا جو پہلے ہی اپنے علمی مشاغل اور اردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں کافی مشہور ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر زور صاحب نے جس وقت اس ادارے کو قائم کیا تھا تو اس وقت اس کا دائرۂ عمل بہت ہی محدود تھا لیکن آج یہ ادارہ ہندوستان کے چوٹی کے اداروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شہزادۂ والا شان نے ڈاکٹر زور کی خدمات کی ان الفاظ میں تعریف کی کہ

"یہ سب کام ایسے اہم اور مفید ہیں جس کے لئے ادارہ کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مبارکباد کے مستحق ہیں"۔

اس ادارہ کو نواب مہدی یار جنگ بہادر جیسی اعلیٰ پایہ ہستی کی صدارت کا شرف بھی حاصل ہے جن کی گراں مایہ ہدایتوں پر عمل کرتے ہوئے ہم امید کرتے ہیں کہ ادارۂ ادبیات اردو، اردو زبان کی اصلاح، اشاعت اور ترویج کی سچی خدمت انجام دے گا۔

(از صبح دکن بابت ۱۱ اپریل [illegible])

اداریہ روزنامہ پیام

(ادارۂ ادبیات اردو)

گزشتہ ہفتہ ادارۂ ادبیات اردو کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس میں شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ نے اسناد و انعامات تقسیم فرمائے۔ تقریباً ہر سال ہم اس ادارہ کی جد و جہد کے نتائج اس کی سالانہ رپورٹوں سے اخذ کر کے پیش کرتے رہے ہیں۔ کم و بیش ۱۲ سال کی جد و جہد نے اس ادارہ کو ملک میں اردو ادبیات کا ایک اہم مرکز بنا دیا ہے۔

چند سال کی ابتدائی کوششوں کے بعد ڈاکٹر زور کی رہنمائی میں ادارہ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں دکن کی تاریخ اور دیگر قدیم علوم کے متعلق اپنی قابل قدر اشاعتوں کے ذریعہ سے ایک ایسی نمایاں حیثیت حاصل کر لی ہے جس کی بنا پر وہ اب اپنی عملی صلاحیتوں سے قومی زبان کی ترویج و اشاعت کے وسیع تر میدان میں بہت موثر اور مفید کام کر رہا ہے۔ چنانچہ تعلیم بالغاں کے سلسلہ میں ادارہ نے اردو امتحانات کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا ہے جو اس وقت تمام ملک پر حاوی ہے، ان امتحانات کے ذریعہ اردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ کیا جا رہا ہے، لیکن ان امتحانات کا ایک قابل ذکر اور نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ بغیر کسی پروپگنڈے کے ملک کی غیر مسلم آبادی کے افراد بھی شوق کے ساتھ ان امتحانات میں شریک ہو کر اور کامیابی کی اسناد حاصل کر کے اس حقیقت کو ثابت کر رہے ہیں کہ سیاسی تفریق اور تنگ نظری کی بنا پر اردو زبان کی کتنی ہی مخالفت کی جائے لیکن وہ درحقیقت ملک کی عام زبان ہے۔

ادارہ کی روداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم، اردو فاضل اور خوش نویسی کے امتحانات کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ ان کے مراکز اب ممالک محروسہ کے باہر بمبئی، مدراس، صوبہ متوسط اور میسور میں بھی قائم ہو گئے ہیں۔ امتحانات کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۴۳ء میں ادارہ کے ان امتحانات میں ۱۲۵۷ امیدوار شریک ہوئے جن میں سے ۱۲۰۵ کامیاب ہوئے یعنی سال بھر میں تقریباً ۱۲ سو ناخواندہ اشخاص نے اردو زبان میں تعلیم حاصل کی۔ اس تعداد میں مسلم و غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ ادارہ کی رپورٹ میں خاص طور پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ

"ان اردو امتحانات میں ہر مذہب و ملت اور طبقے کے امیدوار شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سال امتحان اردو عالم میں ایک ہندو امیدوار بی، وی، گوپال راؤ بحیثیت مجموعی اول آئے۔ اسی طرح متعدد غیر مسلم امیدواروں نے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی ہے۔"

گویا یہ رد ہے ان لوگوں کے دعویٰ کا جو اپنی تنگ نظری یا فرقہ واری تعصب کی بنا پر اردو زبان کو محض مسلمانوں کی زبان قرار دیتے ہیں، اور جن کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ ملک کی قومی وحدت کے لئے کسی ایک زبان کو جو عام طور پر مقبول ہو قومی زبان قرار دینا ضروری ہے۔ حکومت سرکار عالی نے جب فارسی کے بجائے اردو کو اپنی دفتری زبان قرار دیا اور اس کو جامعہ عثمانیہ میں واسطہ تعلیم بنایا تو اس نے اس فیصلہ میں یقیناً کسی قسم کی فرقہ واری عصبیت کارفرما نہ تھی بلکہ صرف یہ مدبرانہ تصور اثر انداز تھا کہ وحدت ملی، وحدت لسانی

کیونکہ ممکن ہے اردو کی ترقی کے ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ ملک کی متعدد دوسری زبانوں کی مخالفت کی جائے یا ان کی حق تلفی کی جائے لیکن ان سب کے درمیان ایک مشترک واسطہ ضروری ہے۔ اور اس لحاظ سے ادارہ ادبیات اردو کا مقصد اپنی تعلیمی مہم کے ذریعہ سے بلا لحاظ مذہب و ملت تمام اہل ملک کی خدمت کرنا ہے۔ اگر ادارہ نے مختلف فرقوں کے درمیان اس لسانی رشتہ کو مستحکم کر دیا تو یہ بہت بڑی قومی خدمت ہوگی جو وہ ممالک محروسہ کے تمام باشندوں کی انجام دے گا۔

ادارہ کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت اردو امتحانات کے ذریعہ سے خواندگی کی مہم پر زیادہ زور دے رہا ہے۔ اس کا یہ عمل بالکل صحیح اور ضروری ہے۔ ہماری قومی زندگی میں پہلی ضرورت یہی ہے کہ ناخواندہ آبادی کو خواندہ بنایا جائے اور اگر ادارہ اپنی تمام تر قوت اسی سمت میں صرف کرے تو وہ ملک کے ایک بہت بڑے مسئلہ کو حل کر سکے گا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر قومی ارتقاء کے ہر شعبہ کی ترقی کا انحصار ہے۔

ہم ڈاکٹر زور کو ان کی جدوجہد کے ان خوشگوار نتائج پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ ادارہ زیادہ سے زیادہ اثر و قوت حاصل کرے اور ایک مرکزی حیثیت سے ناخواندگی مٹانے کی قومی ضرورت کو پورا کر سکے۔ ہمیں یقین ہے کہ تمام محبان ملک کی مخلصانہ اور پرجوش تائید ادارہ کو حاصل ہوگی۔ (روزنامہ پیام بابت [illegible] اپریل [illegible])

(ماہ نامہ)

سب رس

طلبہ اور بچوں کے لئے

۱۹۴۴ء

(۵)

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

زیر ادارت
معین الدین احمد انصاری

سب رس

[illegible] پتہ صفحہ ۱۵۳
[illegible] ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
[illegible] سب رس ایک روپیہ [illegible] آنے
فی پرچہ دو آنے

جلد (۷) | بابت ماہ اگسٹ ۱۹۴۴ء | شمارہ (۸)

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں طبع ہوکر خیریت آباد سے شایع ہوا

ہمیں افسوس ہے کہ یہ شمارہ وقت پر شائع نہ ہو سکا۔ وجہ یہ ہے کہ جولائی کا مہینہ جشن مسرت کا گزرا ہے۔ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ اس مہینے ادارۂ ادبیات اُردو کی زیر سرپرستی کل ہند اردو کانگریس منعقد ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے اکثر مشاہیر نے شرکت کی۔ اس کے اجلاس ٹاؤن ہال باغ عامہ میں منعقد ہوئے انتظامات شاندار پیمانے پر کئے گئے تھے۔ مندوبین اور مہمانوں کے قیام و طعام کا قصر بشیر باغ میں انتظام تھا۔ مہمانوں کے لئے جس عمدگی اور سلیقہ سے انتظام کیا گیا تھا۔ اس کی تعریف بیان سے باہر ہے۔ بہرحال باہر والے حیدرآباد سے اچھے تاثرات لئے ہوئے واپس ہوئے۔ کانگریس کو شاندار پیمانہ پر منعقد کرنے اور کامیاب بنانے میں نواب زین یار جنگ بہادر اور ڈاکٹر زور صاحب کی کوشش لائق صد مبارک باد ہیں۔

اس کانگریس کے کل نو اجلاس منعقد ہوئے جن میں اردو کے مختلف مسائل زیر بحث رہے حیدرآباد میں یہ کانگریس اپنی نوعیت کی پہلی تھی۔ مشاہیر اُردو کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں یکجا جمع ہونے کا بہت کم موقع ملتا ہے لیکن اس کانگریس کی ایک بڑی خصوصیت یہ رہی کہ ہر زاویۂ خیال کے لوگ اس میں شریک تھے۔ جن مقاصد کے تحت اس کانگریس کا انعقاد ہوا ہے خدا کرے کہ اس میں کامیابی ہو۔ حیدرآباد نے اُردو کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اردو کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ہم کو چاہئے کہ ان کی قدر کریں اور اردو کے پھلنے پھولنے اور ترقی کے لئے خود بھی کوشش کریں اور ان لوگوں کی بھی ہمت افزائی کریں جو اس کام میں مصروف ہیں۔

آپ ستمبر کے پرچے کا انتظار نہ کیجئے۔ اکتوبر میں ہم ایک خاص نمبر شائع کر رہے ہیں جس کے لئے اچھے اچھے مضامین اور نظمیں درکار ہیں۔ اس میں نہ صرف مضامین اور نظمیں شامل رہیں گی بلکہ اور بھی دلچسپیاں ہوں گی۔ مضامین وغیرہ جلد بھیجنے کی کوشش کیجئے۔

معین الدین احمد انصاری

کہانی
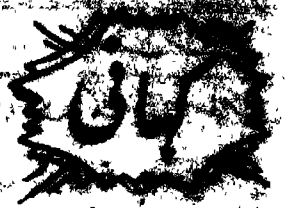
ہمارے موٹے کے اصل نام سے تو ہم بھی واقف
نہیں لیکن عام طور پر یہ اسی نام سے مشہور تھے اس لئے
کہ یہ بے حد موٹے تھے۔ ان کے والد کا تعلق اچھے
کماتے پیتے گھرانے سے تھا لیکن زمانہ ہمیشہ ایک
حالت پر نہیں رہتا۔ ان کے والد بہت ضعیف ہو چلے تھے۔ آمدنی بھی پہلے کی سی نہ تھی۔ اب موٹے میاں
ہی ان کی زندگی کا سہارا تھے۔ موٹے میاں جیسا نام سے ظاہر ہے بے حد موٹے تھے۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔
بس یہی چودہ پندرہ کے لگ بھگ ہوگی۔ بے چارے موٹے ہونے کی وجہ سے بڑے شرمندہ ہوتے۔ جس
گلی کوچے سے گزرتے دو چار شریر لڑکے ان کے ساتھ ہو جاتے اور طرح طرح سے ستاتے اور فقرے کستے
سچ پوچھئے تو میاں موٹو تھے ہی ایسے مگر کیا کیا جائے قدرت میں کس کو دخل ہے! ان کی شکل وصورت
بڑی دلچسپ تھی، سیاہ رنگ، گال ربر کی گیند، چھوٹی چھوٹی آنکھیں موٹے موٹے ہونٹ، موٹی سی بدوضع
ناک، اگر یہ دور سے آتے ہوئے نظر آتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مست ہاتھی جھومتا چلا آرہا ہے۔
پڑھنے کے لئے انھیں مکتب بھیجا گیا لیکن لڑکوں کی شرارت نے بہت جلد انھیں مکتب چھوڑنے پر مجبور
کردیا۔ کوئی صحبت ایسی نہ ہوتی جس میں بے چارے ستائے نہ جاتے۔ ایک دن کا دلچسپ قصہ یہ ہے کہ
ان کے کپڑوں پر سیاہ روشنائی گر گئی اور وہ دن تھے گرمیوں کے۔ کسی شریر کو خوب مذاق ہاتھ آیا
ایک دوست نے دریافت کیا "موٹے میاں تمہارے کپڑے سیاہ کیسے ہوگئے؟" دوسرے ساتھی نے کہا
"گرمی کے دن ہیں، موٹے میاں کو پسینہ نکلا ہوگا" موٹے میاں مجبور تھے کیا کرتے اپنا سا منہ لے کر
وہاں سے چل دیئے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے انھیں ملازمت کی سوجھی دوسرے دن علی الصبح اٹھے سفید صاف انگرکھا پہنا
اور چل کھڑے ہوئے۔ جس دفتر اور جس کچہری سے گزرتے دریافت کر لیتے لیکن ہر جگہ انھیں ایک قہقہے

کے ساتھ صاف جواب مل جاتا۔ دن بھر مارے مارے پھرا کئے لیکن ناکامی ہی رہی ایک دن معلوم نہیں کیا خیال آیا تیر و کمان لے کر جنگل کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ وہاں جا کر نشانے کی خوب مشق کرنے لگے۔ اب ہر روز ان کا یہی کام ہوتا۔ باوجود موٹے ہونے کے محنت سے کبھی جی نہ چراتے تھے اور ہر چیز کو سیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی وجہ سے چند ہی دنوں میں بڑا اچھا نشانہ ہو گیا۔ موٹے میاں طبیعت کے بڑے شریف اور رحم دل تھے۔ ایک دفعہ جنگل میں ایک بڈھے شخص کو ایک سانپ نے بُری طرح لپیٹ لیا۔ بڈھا بے چارا مجبور تھا۔ موٹے میاں سے یہ نہ دیکھا گیا۔ سانپ پر ایسے کمال سے تیر چلائی کہ وہ وہیں تڑپتا رہ گیا اور بوڑھے کی جان بچ گئی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور دعا دی کہ تیرا نشانہ آگے چل کر اور اچھا ہو اور تو دنیا کا بڑا آدمی بن جائے۔ اس واقعہ کے بعد موٹے میاں بے حد مشہور ہو گئے۔ ہر ایک ان کے نشانے کی تعریف کرنے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن بادشاہ نے انھیں طلب کیا۔ بادشاہ ان کے نشانے سے بے حد خوش ہوا اور انھیں تنخواہ مقرر کر دی اور ان کا نام "زبردست خاں" رکھ دیا۔ اب یہ ہنسی خوشی رہنے لگے لیکن یہ خاموش بیٹھنے والے آدمی نہ تھے اور ترقی کرنے والا آدمی کبھی خاموش نہیں بیٹھتا۔ زبردست خاں چاہتے تھے کہ ان کا نام ساری دنیا میں مشہور ہو جائے چند ہی دن بعد یہ ہوا کہ ایک دوسرے ملک کے بادشاہ نے یہ اعلان کیا کہ جو سب سے اچھا تیر چلائے گا اسے شاہزادی بیاہی جائے گی۔ اس مقابلہ میں بڑے بڑے شاہزادے بہترین تیر انداز اور خوبصورت نوجوان شریک ہوئے۔ زبردست خاں سے نہ رہا گیا وہ بھی اس مقابلہ میں شریک ہو گئے۔ شہزادی سے بیاہنے کے لئے تین شرطیں مقرر تھیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ ایک خوبصورت لڑکے کے ہاتھ پر ایک سیب رکھ دیا گیا تھا اسے تیر کا نشانہ بنانا تھا۔ دوسری یہ تھی کہ ایک اور سیب کو دوسرے ہاتھ پر رکھا گیا تھا۔ تیسری اور سب سے مشکل شرط یہ تھی کہ اسی کے سر پر ایک اور سیب رکھ دیا گیا تھا اور اس سیب پر تیر چلانا تھا لیکن ان سب کے لئے شرط تھی کہ

اس ہو کہ کسی کو کوئی نقصان نہ ہو۔ پہلی دو شرطوں کو تو اکثروں نے پورا کر لیا لیکن آخری مقابلہ کے لئے کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ جب زبردست خاں کی باری آئی تو انھوں نے ایسے کمال سے سر پر رکھے ہوئے سیب کو نشانہ بنایا کہ ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔ بادشاہ اور شاہزادی زبردست خاں کی شکل و صورت دیکھ کر خوش نہ ہوئے لیکن بادشاہ اپنے وعدہ سے مجبور تھا۔ بہت جلد شہزادی کی شادی زبردست خاں سے ہو گئی۔ لیکن چند ہی دنوں میں زبردست خاں نے یہ

ثابت کر دکھایا کہ اچھی سیرت اور اچھے اخلاق اچھی صورت سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں بادشاہ اور شاہزادی دونوں اس سے بے حد خوش تھے۔ بادشاہ اب ضعیف ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت زبردست خاں کے حوالے کر دی اور اسے "زبردست جنگ" "زبردست الدولہ" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ بڑی دھوم دھام سے زبردست جنگ تخت نشین ہوئے اس وقت انھوں نے اپنی رعایا کو مخاطب کرکے اپنی کہانی سنائی اور کہا کہ جو کام محنت، کوشش اور جد و جہد سے کیا جائے اس کا نتیجہ ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے۔
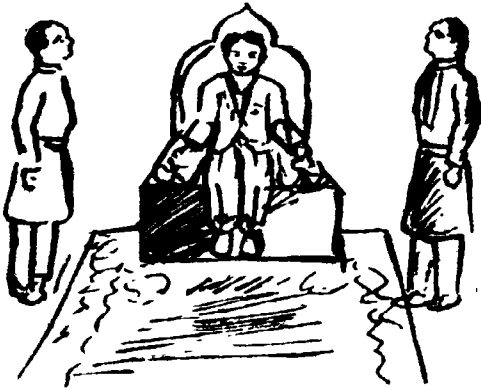
بلقیس (علی گڑھ)

عرب اور عربستان ۔ شعبۂ ادبیات اطفال کی طرف سے یہ نئی با تصویر کتاب شائع کی گئی ہے۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے نے نہایت دلچسپ، سلیس انداز میں مرتب کیا ہے۔ تقریباً ہر صفحہ پر تصویر دی گئی ہے۔ صفحات ۵۶ قیمت صرف ۱۰ / ر

غرور اور عاجزی

سسلی کا ایک بادشاہ رابرٹ گزرا ہے۔ یہ بہت مشہور اور جوانمرد بادشاہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بے حد مغرور اور جلد باز تھا۔ اس کے غرور کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے کبھی خدا کے سامنے سر تک نہ جھکایا۔ ایک دفعہ وہ محل میں تھا کہ گرجا سے شام کی عبادت کی آوازیں آنے لگیں اس میں سے کچھ لفظ اس کی سمجھ میں نہ آئے جو لاطینی زبان کے تھے کیونکہ اس کو اپنی جنگجوئی اور لہو و لعب سے اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ غیر زبانیں سیکھتا۔ قریب ہی ایک پادری کھڑا تھا بادشاہ نے اس سے ان الفاظ کا مطلب پوچھا پادری نے کہا اس کے معنی یہ ہیں کہ "خدا نے طاقتور کو اپنی جگہ سے گرادیا اور فرماں برداروں کو عروج پر پہنچایا" اس پر رابرٹ نے کہا کہ "مجھے اس عہدے سے گرانا آسان کام نہیں" پادری نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش ہو گیا۔

موسم کسی قدر گرم تھا۔ بادشاہ اپنے کام سے تھک گیا تھا اس لئے وہ سو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ نیند سے بیدار ہوا۔ گرمی کی تاب نہ لاکر اس نے کمرے کی کھڑکیاں کھولیں تاکہ ہوا آسکے۔ اسے یہ دیکھ کر سخت پریشانی ہوئی کہ قریبی گرجا بالکل سنسان تھا اور صرف ایک ضعیف عورت جو بہری بھی تھی فرش اٹھانے میں مشغول تھی۔ بادشاہ نے دریافت حال کے لئے اس کو پکارا۔ بہری نے کچھ جواب نہ دیا۔ یہ زور زور سے پکارتا رہا مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی آخر کو وہ خود اس کی طرف کو چلا۔ جونہی اس عورت نے بادشاہ کو اپنی طرف آتے دیکھا چور چور کہہ کر بھاگنے لگی باہر ہی روپوش ہو گئی اور جیسے ہی بادشاہ گرجا میں داخل ہوا اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ اب رابرٹ گرجا میں محصور تھا۔ رابرٹ نے چاروں طرف نظر دوڑائی ہر طرف سناٹا اور ہو کا عالم تھا۔ اتنے میں بادشاہ کی نظر اپنے آپ پر پڑی۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس کا لباس فاخرہ تاج شاہی ہیروں کی جگمگاتی انگوٹھیاں سب کی سب غائب تھیں اور وہ سادہ لباس میں ملبوس تھا۔ غصہ، شرمندگی اور حیرت سے رابرٹ کا چہرہ سفید ہو گیا۔ وہ چلایا "بغاوت! بغاوت!! میری فوج باغیوں کی بوٹیاں بوٹیاں کر دے گی۔ یہ کیا ہے؟ دروازہ کھولو۔ اپنے بادشاہ کے لئے دروازہ کھولو" آخر آئی

[illegible] ۔تم بدمعاش ہو"۔ رابرٹ خاموش رہا۔" تم چاہتے ہو کہ بادشاہ کا واسطہ دے کر دروازہ [illegible] سکتے لوگ جاہیں سامان لوٹنے کے لئے چھپے رہے اور اب بادشاہ کا واسطہ دے کر دروازہ کھلواتے [illegible] اب بھی خاموش رہا آخر مجبور ہو کر بادشاہ نے دروازہ پر ٹھوکر لگائی اور دو تین ٹھوکریں کے بعد دروازہ کھل گیا۔ رابرٹ نے اپنے محل کا رخ کیا۔ جب اس نے محل میں داخل ہونا چاہا تو دربان نے روکا اور پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے غصے سے دربان کو بازو ہٹایا اور اندر داخل ہونا چاہا۔ دربان نے ساتھیوں کو پکارا اور ان کی امداد سے بادشاہ کو گرفتار کرلیا۔ بادشاہ نے کہا" تم لوگوں کی جان کی خیر نہیں جانتے ہو

میں کون ہوں" دربان نے طنزاً کہا" جی کیوں نہیں آپ پاگلوں کے بادشاہ اور احمقوں کے سردار ہیں۔ شہنشاہیت رگ رگ سے ٹپک کر اس کا اعلان کررہی ہے"۔ اتنے میں محافظ دستے کا سردار بھی آگیا جو یہ گڑبڑ سنتے ہی وردی پہنتا ہوا آگیا۔ اس کے ہاتھ میں آئینہ تھا جس میں دیکھ کر وہ اپنی ٹوپی درست کرر ہا تھا بادشاہ نے سردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" کیپٹن فرانک ویلا کیا تم سب پاگل ہوگئے ہو۔ یہ کیا ہورہا ہے۔ باغی مجھ کو پہچانتے بھی نہیں۔ سامنے سے ہٹ جاؤ اور مجھے اپنے کمرے میں جانے دو" یہ کہتے ہوئے بادشاہ اندر داخل ہونا چاہا۔ کیپٹن فرانک ویلا نے آگے بڑھ کر روکا اور اس کو پکڑلیا۔ اس جد وجہد میں بادشاہ کی نظر آئینے میں پڑی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ لباس کے ساتھ ساتھ اس کی صورت بھی بدل گئی ہے۔ بادشاہ چلایا کہ" مجھ پر جادو کردیا گیا ہے۔ میں بدل گیا ہوں" یہ خبر کسی طرح بادشاہ تک پہنچی۔ بادشاہ نے رابرٹ کو طلب کیا بادشاہ کے حضور میں پہنچایا گیا بادشاہ اور درباری رابرٹ کی مضحکہ خیز حالت دیکھ کر ہنسنے لگے۔ تخت پر رابرٹ کے ویسا ہی ایک دوسرا شخص بیٹھا تھا جو چہرے سے رحمدل معلوم ہوتا تھا۔ رابرٹ نے بادشاہ پر حملہ کیا اور کہا کہ وہ دغاباز اور جادوگر ہے۔ رابرٹ کے اس جملے پر تمام درباری ہنس پڑے۔ یہ نیا بادشاہ ایک فرشتہ تھا جو نہیں چاہتا تھا کہ اس کا فرشتہ پن کسی کو معلوم ہو۔

اس لئے وہ خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد رابرٹ سے کہا کہ چونکہ تم پاگل ہو اور خود کو بادشاہ سمجھتے ہو
اور حقیقت میں تم بیوقوفوں کے بادشاہ ہو اس لئے تم کو ایک عصا اور تاج دیا جاتا ہے تم درباری مسخروں
کے ساتھ رہنا (اگلے زمانے میں دستور تھا کہ ہر بادشاہ کے دربار میں مسخرے رہتے جو طرح طرح کی بذلہ سنجیاں
سے بادشاہوں کو خوش کیا کرتے) اس کے بعد تاج اور عصا منگوا کر رابرٹ کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی
اس طرح رابرٹ کو رہتے ہوئے دو سال کا عرصہ گزر گیا اور رابرٹ برابر بادشاہ کا ساتھ دیتا رہا مگر
ہر وقت غم و غصہ کی مورت اور درباریوں کے مذاق کا سامان بن کر۔

کچھ عرصہ تک بادشاہ رابرٹ سے پوچھتا رہا کہ کیا وہ بادشاہ ہے اور رابرٹ جواب دیتا کہ وہ بادشاہ
ہے۔ اس جواب پر دربار میں قہقہہ بلند ہوتا جس کو رابرٹ برداشت نہ کر سکتا تھا اس لئے کچھ دن بعد وہ اس
سوال پر خاموش رہنے لگا۔

اس عرصے میں ہر شخص بادشاہ سے خوش تھا۔ محاصل کم کر دئے گئے تھے۔ محنت زیادہ نہ لی جاتی تھی۔
آدھا دن صنعت اور محنت مزدوری اور آدھا دن صحت کی حفاظت میں صرف کیا جاتا ۔ بادشاہ جہاں کہیں
جاتا اس کو دعائیں دی جاتیں جن کو سن کر رابرٹ ہکا بکا رہ جاتا ۔

اس واقعہ کے دو سال بعد بادشاہ نے اعلان کیا کہ وہ اپنے بھائیوں سے ملنے کے لئے روم کو جائے گا۔
اس کے ساتھ تمام درباری زرق برق پوشاک پہنے ہوئے تھے اور رابرٹ ایک مضحکہ خیز لباس میں ملبوس تھا۔
اور اس کے ساتھ ایک بندر تھا۔ جب بادشاہ جانے لگا تو تمام لوگ کاروبار چھوڑ کر باہر نکل آئے تاکہ بادشاہ
کو ایک نظر دیکھ لیں ۔

جب رابرٹ اپنے بندر کو لئے ہوئے گزرنے لگا تو تمام لوگوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اکثر لوگ
متعجب تھے کہ ایسا رحم دل بادشاہ اس شخص (رابرٹ) پر کیوں خفا ہے؟

جب بادشاہ کے بھائیوں سے بادشاہ کی ملاقات ہوئی تو وہ اسی محبت سے ملے جو بھائیوں میں ہوتی
ہے۔ رابرٹ کا خیال تھا کہ جب بادشاہ اس کے بھائیوں سے ملے گا تو یہ سحر ٹوٹ جائے گا اور اصل حقیقت
واضح ہو جائے گی کیونکہ اس کا ایک بھائی بڑا پادری تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی بھی بادشاہ

ہوں بائیوں کی ویسے ہی [illegible]

...ہی سکتے ہیں تو پہلی دفعہ اس کے غرور کا زور ٹوٹا اور اس کے دل میں عجز و انکسار کا جذبہ پیدا ہوا۔
ٹھیک اسی وقت جب کہ دو سال قبل رابرٹ نے شام کی عبادت کے وقت پادری سے چند الفاظ کا مطلب پوچھا تھا اور یہ سن کر کہ ان کا مطلب "خدا طاقتور کو زوال اور عاجز کو عروج دیتا ہے"
اس نے کہا تھا کہ اس کو کوئی قوت گرا نہیں سکتی۔ پھر وہی الفاظ سنائی دئے۔ اب رابرٹ سے برداشت نہ ہوسکا اور فوراً آبدیدہ ہوکر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر دعا کرنے لگا۔ اہل دربار اس کی اس حرکت سے متعجب تھے۔
جب دعا ختم ہوگئی تو بادشاہ نے رابرٹ کو آزاد کرنے کا قصد کیا۔ دربار برخاست کرکے بادشاہ نے رابرٹ کو طلب کیا۔ رابرٹ آیا۔ وہ مسخرے کے لباس میں ملبوس تھا۔ وہ بادشاہ سے دور کھڑا ہوگیا۔ اس کے ساتھ اس کا بندر بھی تھا جو اس سے ذرا دور بیٹھا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کیا وہ ابھی بادشاہ ہے۔ رابرٹ نے جواب دیا کہ اب وہ صرف ایک مسخرہ ہے۔ اب بادشاہ نے رابرٹ کا نام لے کر اس سے دریافت کیا کہ کیا وہ واقعی بیوقوف تھا۔ اپنا نام سن کر رابرٹ ہکا بکا ہوگیا بادشاہ نے اپنا ہاتھ رابرٹ کے سر پر پھیرا رابرٹ نے ایک بجلی کی لہر اپنے سارے بدن میں دوڑتی ہوئی محسوس کی اور اس کی صورت اپنی اصلی حالت پر آگئی تھی۔ رابرٹ نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ بادشاہ نے کہا کہ وہ کسی شکریہ کا مستحق نہیں ہے اور شکریہ کی مستحق تو "خداوند قدوس" کی ذات عالی صفات ہے یہ کہہ کر وہ بھی رابرٹ کے بازو دوزانو ہوکر بیٹھ گیا اور اس سے دعا کرنے کے لئے کہا۔

تھوڑی دیر تک دونوں دعا میں مصروف رہے۔
کچھ دیر بعد جب رابرٹ نے سر اٹھایا تو وہ تنہا تھا اور بادشاہ غائب۔ اب رابرٹ کو علم ہوا کہ بادشاہ جادوگر نہیں بلکہ فرشتہ تھا اور وہ بھی رحمت کا۔
اب رابرٹ پھر بادشاہ تھا۔ لیکن وہ اگلا سا بادشاہ نہیں۔ اس کا غرور کافور ہوچکا تھا۔ جلد بازی مٹ چکی تھی۔ بے رحمی رحم سے بدل چکی تھی اور

وہ ہر وقت اور ہر کام میں خداوند قدوس کی مدد کا ملتجی رہتا۔

عرصے تک حکومت کرنے کے بعد رابرٹ انتقال کر گیا۔ لیکن اپنی موت سے قبل اس نے اپنی یہ کہانی امرا اور درباریوں کو سنائی تاکہ اس کی یہ سرگزشت تاریخ میں محفوظ رہے اور آئندہ آنے والی نسلیں اس سے سبق حاصل کریں۔

شریف النسا بیگم

حکیم لقمان

حضرت لقمان داؤد علیہ السلام کے زمانے میں بڑے مشہور حکیم تھے۔ قدرتِ کاملہ نے انھیں انتہائی عقل و حکمت عطا کی تھی۔ وہ ہمیشہ عقل مندی کی باتیں لوگوں کو سکھاتے تھے۔ حضرت لقمان کی عمدہ نصیحتیں دنیا میں مشہور و معروف ہیں۔ مگر یہاں صرف وہی نصیحتیں لکھی جاتی ہیں جو انھوں نے اپنے فرزند کو کی ہیں۔

۱۔ لقمان نے ایک دفعہ اپنے فرزند کو یہ نصیحت کی کہ اے میرے پیارے لڑکے! خدا کا شریک ہرگز کسی کو نہ بنانا۔ شرک بڑی بے انصافی ہے اور یقین کر کہ تمام پوشیدہ چیزوں کو وہ جانتا ہے۔ اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر بھی کہیں پتھر یا آسمان یا زمین میں چھپی ہوئی ہو خدا اس کو حاضر کر سکتا ہے۔

۲۔ اے فرزند! ہمیشہ لوگوں کو نیک باتیں سکھا اور برائی سے منع کیا کر اور مصیبت کے وقت صبر اختیار کر۔ بس یہی کام ہمت کے ہیں۔

۳۔ اے فرزند! دنیا غرور اور گھمنڈ کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ چلتے وقت ہمیشہ متوسط چال چلا کر اور بات آہستہ کیا کر۔ کیونکہ بڑی سے بڑی آواز گدھوں کی ہے۔

۴۔ اے فرزند! توبہ کرنا چاہتا ہے تو گناہ اور ظلم سے توبہ کر اور سننا چاہتا ہے تو خدا کی تعریف اور مظلوموں کی پکار کو سن۔

۵۔ اے فرزند! علم ایک ایسا ہتھیار ہے کہ جدھر جاؤ فتح ہو سکتی ہے اور اس کے ذریعے وہ زندگی حاصل کر جس کو فنا نہیں اور وہ زندگی تلاش کر جس میں تغیر نہیں۔

پیارے بچو! عقلمند آدمی دنیا سے جاتا ہے مگر اس کی عمدہ باتیں یادگار رہ جاتی ہیں۔ سچ ہے کہ والدین کو فرزند کے لائق ہونے سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔ خوش قسمت ہیں وہ والدین جنھوں نے اپنی اولاد کی اچھی تربیت کی اور مبارک ہے وہ اولاد جنھوں نے اپنے والدین کی زندگی میں کمال حاصل کیا۔ سید مراد علی طالع

سعدیؒ کی نصیحت

حضرت سعدیؒ یہ نصیحت فرماتے ہیں کہ غرور کبھی نہ کرنا چاہئے۔ عقلمند لوگ کبھی تکبر نہیں کرتے کیونکہ یہ بہت بری چیز ہے اور جاہلوں کا شیوہ ہے۔ خدا کی نیک مخلوق کبھی تکبر کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ یہ ایک ایسا فعل ہے جس سے انسان ذلیل اور بدنام ہو جاتا ہے۔ تکبر اور گھمنڈ کرنے والا انسان کبھی ترقی کے زینے طے نہیں کرسکتا بلکہ اس کو ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔

ہمیں تکبر کی کئی مثالیں ملیں گی جس کے باعث کئی لوگ ذلیل و خوار ثابت ہوئے۔ شیطان ہی کی مثال پیش نظر رکھئے کہ اس نے تکبر ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف گیا اور اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے سے دور کردیا۔ وہ ہمیشہ کے لئے خدا کی رحمت اور مہربانی سے محروم کردیا گیا۔ ہمیشہ لوگ اس پر لعنت بھیجتے رہیں گے۔

انسان کو بہکانے والا اور اس میں برے خیالات، اور عادتیں شیطان ہی پیدا کرتا ہے اسی وجہ سے انسان ہر جگہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ان ہی بری خصلتوں میں ایک خصلت ''تکبر'' بھی ہے۔ تکبر سے انسان اپنے آپ کو بڑا اور اعلیٰ مرتبہ والا سمجھتا ہے اور اپنے جیسے دوسرے بندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ جو اس کی بدقسمتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک امیر، غریب، بادشاہ اور فقیر میں کوئی فرق و امتیاز نہیں اور اگر کوئی امیر کوئی غریب سے اپنے آپ کو ممتاز سمجھے تو وہ متکبر سمجھا جائے گا۔ البتہ اگر ان میں امتیاز ہوسکتا ہے تو صرف علم سے ہوسکتا ہے اور یہی شیخ سعدیؒ بھی فرماتے ہیں۔

چونکہ علم تکبر کو دور کرنے کا ایک ذریعہ ہے اس لئے حضرت سعدیؒ نے علم کی اہمیت اور ضرورت کے متعلق بھی یہ نصیحت فرمائی ہے کہ تحصیل علم کے لئے ہر وقت جدوجہد کیا کرو حتیٰ کہ اس قدر محنت اٹھاؤ کہ جسم پر گوشت پوست کا نام و نشان تک باقی نہ رہے کیونکہ علم ہی کو ہر شئے پر خدا اور رسولؐ نے ترجیح دی اور یہ خدا تک پہونچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ علم کا حاصل کرنا ہمارے مذہب میں ضروری قرار دیا گیا ہے اور اگر

کوئی استعداد رکھتا ہے تو اس کو دن رات تحصیل علم کی دھن ہونی چاہئے۔ ایک حدیث سے بھی اس مسئلہ پر اور زور دیا گیا ہے کہ علم اگر تمہارے شہر میں نہ بھی ہو تو تم کو سمندر پار جانے میں بھی تامل نہ کرنا چاہیے گو کہ علم کا بازار ہمیشہ اور ہر جگہ گرم رہتا ہے اور آخرت تک رہے گا۔ علم کوئی ایسی شئے نہیں کہ جس کی آگ بجھا دی جائے کیونکہ ایسا کوئی وقت نہیں آئے گا جس میں علم کی کوئی نہ کوئی قدر نہ کرے۔ علم کی کوئی آخری منزل نہیں۔ جتنا علم حاصل کیا جائے گا اس کا نتیجہ بہشت ہوگا۔ اس لئے عقلمند ہر وقت ان برائیوں سے دور رہنے کے لئے جہاں تک ممکن ہو علم کی تحصیل میں سرگرم رہتا ہے۔ ہر عقلمند کو یہی چاہئے کہ وہ علم کے زیر سایہ پرورش پائے اور صحیح علم حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھے۔ علم کے حاصل کرنے میں غفلت نہ برتے۔ بغیر حصول علم کے انسان اپنی دنیا اور عاقبت درست نہیں کر سکتا۔ بے علمی سے ملک وملت کا تو کجا اپنے گھر کا بھی انتظام درست نہ رہ سکے گا۔

علم کی فضیلت کا ثبوت ہمیں اس سے بہ آسانی مل سکتا ہے کہ اگر آپ ایک جاہل کو جاہل کہیں تو وہ خفا ہو جائے گا۔ حالانکہ اس کی اصلیت کہی جا رہی ہے اور اگر اس کو عالم کہا جائے تو وہ خوش ہو جائے گا۔ غرض کہ انسان علم ہی کی بدولت عقلمند اور عالم کہلا سکتا ہے اور ایک عالم ہی جاہل کی نسبت برائیوں سے زیادہ پرہیز کر سکتا ہے۔

میر مظفر علی خاں

حیدرآباد۔ اس کتاب میں عوام اور بچوں کے لئے شہر اور ریاست حیدرآباد کے ضروری حالات سادہ اور سلیس زبان میں درج کئے گئے ہیں۔ اس کے کئی ابواب ہیں جن میں آب وہوا، پہاڑ، دریا پیداوار، تاریخ، طرز معاشرت، صنعتیں، زبانیں، طرز حکومت، آثار قدیمہ اور ذرائع حمل ونقل کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مرتبہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ بی اے جامعہ عثمانیہ ہیں جن کو انشاپردازی کا خاص ذوق ہے قیمت ۱۰ / ر

دنیا روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو آج سے دو ہزار برس قبل نہ تھیں۔ دنیا میں آئے دن ایک نہ ایک ایجاد ہوتی رہتی ہے۔ آج کل ہم لوگ جو زندگی بسر کر رہے ہیں اور جس کو سمجھتے ہیں کہ نہایت متمدن اور تہذیب یافتہ ہے۔ لیکن وہ زمانہ کچھ دور نہیں جب کہ آئندہ تہذیب اور تمدن ہمارے زمانے کو وحشت اور جہالت کا زمانہ خیال کرے گی۔

سکہ جو ہماری زندگی کا لازمی جز ہے اور ہماری تاریخ میں اپنے رواج کی خاص اہمیت رکھتا ہے آج سے ۵ ہزار برس قبل جب کہ تہذیب اور تمدن کے علم بردار چینی تھے سکہ کا وجود تھا۔ اس وقت تک دنیا کی تمام تہذیب یافتہ اقوام ایک چیز کے بدلے میں دوسری چیز لیتی اور دیتی تھیں مثلاً ہمارے پاس غلہ ہے اور آپ کے پاس کپڑا، ہم کو کپڑے کی ضرورت ہے اور آپ کو غلہ کی اس وقت کے تمدن کے لحاظ سے میں آپ کو غلہ دوں گا اور آپ مجھے کپڑا۔ جب اس سے زیادہ ترقی ہوئی تو چند چیزیں مخصوص کر لی گئیں۔ مثلاً سونا، چاندی، تانبا اور یہ بھی قرار دیا گیا تھا کہ تانبے کا اتنا ٹکڑا دو سیر گیہوں اور چار سیر جو کے برابر ہے۔
سکہ کی ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے چین میں ٹکسال قائم ہوئی کہا جاتا ہے کہ چینیوں نے چمڑا بھی بطور سکہ استعمال کیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ چک اور بنک اہلِ چین کی اختراع ہے۔ چین میں سب سے پہلے بنک قائم ہوا اور نوٹ کا بھی رواج ہوا۔ چین کے بعد جاپان میں سکوں اور نوٹوں کا رواج ہوا۔

مصر میں باوجود اس قدر تہذیب اور تمدن کے سکوں کا رواج بہت دنوں بعد ہوا۔ غالباً مصر میں ۵۵۰ھ ق م میں سکوں کا رواج ہوا اور [illegible] ق م کے سکے اہلِ بابل کے پائے گئے۔

۳۵۰ھ ق م میں یونان میں سکوں اور بنکوں کا رواج جاری تھا۔ ۲۷۰ھ ق م روم کے باشندوں نے سب سے پہلے چاندی کا سکہ جاری کیا۔ اور اس کے کوئی نصف صدی بعد سونے کا سکہ نافذ ہوا عرب میں

زمانہ جاہلیت اور اسلام میں کوئی خاص سکہ نہ تھا - رومی اور ایرانی سکوں سے یہاں لین دین ہوتا تھا۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے ۷۵ھ میں عبدالملک بن مروان نے حجاج ابن یوسف کو سکہ کی جاری کرنے کا حکم دیا۔ ۷۶ھ میں چاندی کا سکہ (درہم) عراق میں جاری ہوا۔ ۷۸ھ میں مختلف مقامات پر سکے تیار ہونے لگے اس زمانے کا درہم خالص چاندی کا تھا - ایک طرف اللہ احد اللہ الصمد اور دوسری طرف سنہ ضرب اور ٹکسال کا نام ہوتا تھا۔ ۷۷ھ میں عبدالملک نے دینار یعنی سونے کا سکہ جاری کیا۔

بنی اُمیہ کے عہد خلافت میں کوفہ، بصرہ، دمشق، کرمان آرمینیہ، آفریقہ، اندلس اور بخارا میں ٹکسالیں تھیں ان ٹکسالوں میں جو سکے بنتے تھے ان میں سنہ ضرب اور دارالضرب ہوتا تھا۔ بعض میں قرآن کی مختصر آیتیں ہوتی تھیں اور بعض میں صرف بسم اللہ لکھا ہوتا تھا۔ سب سے پہلے مسلمان حکمرانوں میں سے مہدی نے اپنا نام کندہ کروایا۔ یہ سکہ ۱۴۶ھ ہجری کا تھا۔

دنیا میں زیادہ تر چاندی اور تانبے کے سکے رائج ہوئے لیکن انگلستان اور جاپان میں قدیم زمانے میں لوہے کے سکے استعمال ہوتے تھے۔ نکل کے سکے سب سے پہلے بلجیم میں تیار ہوئے۔ پھر جرمنی اور امریکہ میں ڈھلے۔ شاہ جہاں کے زمانے کی اشرفی بہت مشہور ہے جس کا وزن ½ ۲ سیر اور موٹائی ½ انچ ہوتی تھی۔ اس میں خالص سونا استعمال ہوتا تھا۔ جب کبھی بادشاہ لڑائی سے واپس ہوتا اور سالگرہ کے دن یا جب کبھی بادشاہ خوش ہوتا تو سپہ سالاروں اور امراء کو عنایت کرتا تھا۔ یہ اشرفی میں نے نمائش ثقافتِ اسلامیہ میں جو سالار جنگ بہادر کی دیوڑھی میں ہوئی تھی دیکھی ہے۔

سید شاہ مصباح الدین حسین

کشمش نانی - یہ کتاب بھی ادارہ کے شعبۂ اطفال کی طرف سے بچوں کے لئے بطور خاص شائع کرائی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی شجاع احمد صاحب قائد نے اس کتاب میں پرانی طرز کی کہانیوں کو نئے انداز میں لکھا ہے جو دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی - اس میں کئی دیدہ زیب تصویریں بھی ہیں جن سے کتاب کی زینت بڑھ گئی ہے صفحات ۴۸ قیمت ۱۰/

بے گناہ جمیلہ

گذشتہ زمانے میں ایک بادشاہ قطب شمالی کے کسی حصہ پر حکمران تھا۔ جہاں کی زمین ہمیشہ برف کی سفید چادر اوڑھی ہوئی رہتی ہے۔ اس بادشاہ کو ایک بیٹی تھی جس کا نام "جمیلہ" تھا یہ بہت خوبصورت تھی اور ماں باپ کی بڑی لاڈلی بیٹی تھی۔ لیکن چند ہی روز بعد اس کی ماں مرگئی۔ بادشاہ اپنی بیوی کے انتقال پر بہت دنوں تک رنجیدہ رہا۔ آخرکار اس سے لڑکی کی حالت دیکھی نہ گئی اس لئے اس کو دوسری شادی مجبوراً کرنا پڑا۔

دوسری رانی بھی خوبصورت تھی اپنے حسنِ وجمال کا ثانی نہ رکھتی تھی اس کے پاس ایک آئینہ تھا جس کے ذریعہ دنیا کے تمام حالات معلوم کرسکتی تھی۔ اس آئینہ کو اس نے ایک جادوگر سے حاصل کیا تھا۔ چند سال بعد جب جمیلہ سمجھ دار ہوگئی اور اس کا حسن ہر دیکھنے والے کو خوش کرنے لگا تو ایک روز رانی صبح خواب راحت سے بیدار ہوئی اور آئینہ سے دریافت کیا کہ دنیا میں سب سے زیادہ کون خوبصورت ہے۔ تو معلوم ہوا کہ دنیا میں جمیلہ اپنے حسن وجمال کا ثانی نہیں رکھتی ہے۔ بس یہ معلوم ہوتے ہی اس کے سینے میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور جمیلہ کے قتل کے درپے ہوئی۔

بادشاہ اس کیفیت سے آگاہ نہ تھا۔ ایک روز جب کہ بادشاہ شکار کو گیا تھا رانی نے جمیلہ کو چند ملازمین کے ذریعے ایک خوفناک جنگل میں بھجوا دیا۔ شام کے وقت جنگل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی اور جمیلہ کا قدم خوف سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ اتفاق سے اس کو ایک جھونپڑی نظر آئی۔ جھونپڑی کے قریب جاکر اس نے آواز دی۔ لیکن جب جواب نہ ملا تو اندر داخل ہوئی۔ اس جھونپڑی کے اندر سات چھوٹے پلنگ تھے اور ایک چھوٹی میز پر سات روٹیاں اور سات پانی سے بھرے ہوئے کوزے رکھے تھے۔ جمیلہ کچھ کھانے کے بعد تھکان کی وجہ ایک پلنگ پر سوگئی۔ یہ جھونپڑی سات چھوٹے آدمیوں کی تھی، جن کی صورت کچھ عجیب وغریب تھی یعنی ان کا قد تقریباً چار فٹ اور ڈاڑھی تین فٹ تھی۔ جب ان ساتوں نے اپنی جھونپڑی میں جمیلہ کو سوتے دیکھا تو بہت پریشان ہوئے۔ آخرکار وہ اس کے قریب آئے دیکھتے ہی حسن وجمال کی تاب نہ لاسکے۔ بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا "کس قدر حسین ہے" اس آواز سے جمیلہ بیدار ہوئی اور ان لوگوں کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئی۔ لیکن ان لوگوں نے اس کی زبانی

اس کے حالات سننے تو بہت تسلی دی اور اس کو یہیں رہنے کے لئے مجبور کیا۔

اب جمیلہ وہاں بے خوف و خطر اپنی زندگی بسر کر رہی تھی اور ادہر حاسد رانی کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کیونکہ وہ آئینہ کے ذریعہ سب کچھ معلوم کر سکتی تھی۔ ایک دن رانی مالن کے بھیس میں اس جھونپڑی تک پہنچی جب کہ وہ ساتوں آدمی نہ تھے ایک سیب جمیلہ کو کھانے کے لئے دیا جس میں کچھ زہر بھر دیا گیا تھا۔ جمیلہ اس کو کھاتے ہی زمین پر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ رانی یہ دیکھ کر چلتی بنی جب وہ ساتوں آدمی آئے جمیلہ کو اس حالت میں دیکھ کر بہت پریشان ہوگئے اور سمجھے کہ وہ مرگئی۔ اس لئے اس کو ایک کانچ کے صندوق میں رکھ کر ایک پہاڑی پر رکھ آئے جہاں سے ایک راستہ جاتا تھا۔

اتفاق سے ادہر ایک شہزادہ شکار کھیلتے کھیلتے آ نکلا۔ اس لڑکی کو صندوق میں مردہ سمجھ کر بہت افسوس کیا۔ اپنے دل میں کہا "کاش یہ زندہ ہوتی تو میں اس کے ساتھ شادی کرتا۔ اب اس نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ اس لاش کو ساتھ لے چلیں کیونکہ وہ اس لاش کو باغ میں دفن کروانا چاہتا تھا۔

جب ملازمین نے اس صندوق کو اٹھا لیا تو ان میں سے ایک کا پیر برف کی وجہ سے پھسل گیا اور صندوق زمین پر گر پڑا۔ جوں ہی صندوق گرا جمیلہ کے منہ میں سے وہ زہریلا ٹکڑا گر پڑا جو اس کے بدن میں اثر کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جمیلہ کو ہوش آیا۔ اب شہزادے کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی فوراً اپنے مکان لایا اور اس کی تیمارداری کی اور کامل شفا ہونے کے بعد اس سے شادی کرلی۔

ادہر اس حاسد رانی نے جب یہ دیکھا کہ جمیلہ ایک رانی ہوگئی ہے تو چونکہ اب وہ اس کا کچھ بگاڑ نہ سکتی تھی، اس کے سینے میں حسد کی آگ اتنی بھڑکی کہ وہ تاب نہ لاسکی اور یکایک مرگئی۔

محمد عبد الحمید شاد

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
من کی بپتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ...	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا ابھالی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
" " دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی ...	۸۰	۰	۱۰	۰
مہ لقا ...	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
سحر کا جادو ..	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
طبیعیاتی کائنات ...	۹۸	[illegible]	[illegible]	[illegible]
مقام سخن ...	۱۲۳	[illegible]	[illegible]	[illegible]
کیف سخن ...	۱۴۴	[illegible]	[illegible]	[illegible]
بادۂ سخن ...	۲۲۷	۰	۱۲	۰
جمال سخن ...	۱۸۲	۰	۱۲	۰
ایوان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
نقش سخن ...	۳۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" " دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
دزد ادب ...	۳۳۲	۲	۸	۰
گل و نغمہ ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر و دربار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
معروف نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
اردو دکن ...	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان ...	۳۲	۰	۴	۰
خطابت ...	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۹۸	۱	۸	۰
کشمش نامی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارستان دکنی ...	۱۴۸	۱	۴	۰
زاکٹ کا بھولا ...	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ ...	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۹	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۳۲ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۲	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
ہندراج سکسینہ ایم ایس سی

سب رس

۲۳۰۹

جلد ۷ بابت ماہ نومبر ۱۹۴۴ء شمارہ ۱۱

زینبؔ[1] کے نام

اے نازشِ خاندانِ [illegible] — اے نور و سرور و شادمانی
اے پیکرِ نور و حسن و دل آویز — جو تیری بہار جاودانی
جھلکے ترے رُخ و جبیں پر — ایمان و یقیں کی ضو فشانی
ہو تیرے لئے بہ بام و دراں — فردوسِ نشاط و کامرانی

دے تجھ کو نظر امینِ اسرار
صورت گرِ جلوۂ معانی

جو تجھ کو سنا رہی ہے دنیا — میں نے بھی سنا ہے یہ فسانہ
طفلی کے وہ پُر سکون دن رات — وہ نور و نشاط کا زمانہ
آتا تھا مجھے بھی شکلِ انجم — دنیا کے دھوئیں میں جگمگانا
فطرت نے مجھے عطا کیا تھا — پھولوں کی طرح سے مسکرانا
ہر سانس لٹا رہا تھا میں بھی — اک نور و سرور کا خزانا
ہنستی ہوئی عطر بیز راتیں — وہ چاند کا لوریاں سنانا
گاتی ہوئی دل نواز صبحیں — خورشید کا آ کے وہ جگانا

اب میں ہوں اور اک بجھا ہوا دل
اللہ رے گردشِ زمانہ

جیتی یہ تجلیاں رہیں، ہو گا — کچھ اور ہی رسم و راہِ دوراں
عشرت کے یہ دلپذیر اجزا — ہو جائیں گے خود بخود پریشاں
ہستی کا نہیں مقام کوئی — اک موج ہے مضطرب و گریزاں
اک اور زمانہ آ رہا ہے — ہیں جس میں کشاکشیں نمایاں

تجھ کو بھی اسی سے ہے گزرنا — طفلی [illegible]
گہوارۂ مغرب ہے عصرِ حاضر — ہے اس کی [illegible]
عورت سے ہے زندگی کا پہلو — بیگانۂ سوز و سازِ پنہاں
مردوں کا ضمیر تنگ و تاریک — بے نور و ضیا [illegible]
اک خوابِ طویل علم و دانش — اک جہلِ بسیط عقل و عرفاں
وہ گھر ہے اگر حقیقت آگاہ — تو ہے جس گھر کی شمعِ رخشاں

فطرت میں ہو گر یقینِ محکم
ہوتی ہے رہِ حیات آساں

تو راہ سے آشنا نہیں گر — کام آ نہ سکے گی تیز گامی
طوفان کا راز اور کیا ہے — موجوں کی یہی سبک خرامی
انکار ہے موت زندگی کی — ایماں کا صلہ بلند نامی
ہے مادرِ کائنات عورت — اک ہستیٔ سرمد و گرامی
یہ راز کہیں نہ بھول جانا — رہ جائے گی زندگی میں خامی
آزادیٔ سیر اس چمن میں — ہے قلب و نگاہ کی غلامی
عرفانِ حیات اور کچھ ہے — کہتی ہے خرد کی نا تمامی
دل چاہیے بیش و کم سے آزاد — ہے رازِ سرودِ تشنہ کامی
اس بزم میں ہیچ ہے کلاہِ [illegible] — اندیشۂ خوب و خوش کلامی

ہو جنس کو تیری رشک جس پر
تو پائے وہ ہستیٔ گرامی

علی اختر

---

[1] میر حسن صاحب کی چہار سالہ دختر کا نام

ضروری اطلاع ۔ جو مضامین نظم و نثر سب رس میں اشاعت کے لئے وصول ہوتے ہیں۔ انھیں مجلس ادارت میں پیش کر دیا جاتا ہے اتفاق [illegible] مضامین کو سلسلہ وار شایع کیا جاتا ہے۔ ناقابلِ اشاعت مضامین واپس نہیں کئے جاتے۔ مضمون نگار اصحاب ان کی اپنے پاس نقلیں رکھیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ریپلائی ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے۔

(۱۱) حالات و اعمال کرنے کے بیان میں مطبوعہ [illegible]

(۱۲) منتخب البصر (قطب نما) ,, [illegible]

(۱۳) کمسٹری کا مختصر رسالہ ,, [illegible]

(۱۴) رسالہ مفتاح الافلاک ,, سنہ ۱۲۶۰ھ

(۱۵) رسالہ کیمسٹری ,, سنہ ۱۲۶۱ھ

(۱۶) خلاصۃ الادویہ ,, سنہ ۱۲۶۲ھ

(۱۷) "نافع الامراض ,, سنہ ۱۲۶۲ھ

(۱۸) ترکیب ادویہ ,, سنہ ۱۲۶۲ھ

(۱۹) رسالہ حیوانات مطلق ,, سنہ ۱۲۶۴ھ

(۲۰) مرقع تصویرات حیوانات ,, سنہ ۱۲۶۶ھ

نواب فخر الدین خاں نے خود بھی کئی کتابیں لکھیں مگر ان کی اردو کتابوں کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ان ہی کی ہیں۔ اس لئے کہ دیباچہ میں بجائے اپنے نام کے صرف یہ لکھدیا ہے کہ "مصنف اس کتاب کا یہ کہتا ہے"۔ البتہ فارسی کتابوں میں اپنے نام کی صراحت کر دی ہے۔ مثلاً کتاب "شمس الہندسہ" مطبوعہ سنہ ۱۲۳۱ھ کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"می گوید مؤلف ایں رسالہ محمد فخر الدین خان المخاطب
شمس الامراء .... "کہ کتاب اقلیدس" اگرچہ
حاوی جمیع اصول ہندسیہ است از دقت براہین
و تطویل دلائلش مبتدی را بہرہ وافی ....
نمی داد .... نسخۂ عجب از تالیفات موسی کلارک
کہ در زبان فرانسیسی .... بود ...... دیدم کہ
در آں کتاب اعمال اصول اشکال ...... قریب الفہم
کہ از آں کارہائے اعمال بہ آسانی می برآید مرقوم
نمودہ لہذا .... آں کتاب را از زبان فرانسیسی
بہ زبان فارسی مرقوم نمودہ شد تا در ہندگان موجب

[illegible]

...... لکھ کر ان عبارات سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب صاحب بھی مصنف تھے اور فرانسیسی زبان پر کافی عبور تھا۔ فارسی میں ایک سے زیادہ کتابیں لکھیں اور ممکن ہے کہ یہ اردو کتابیں بھی ان ہی کی تصنیفات ہوں۔

ان کے فرزند محمد رفیع الدین خاں عمدۃ الملک شمس الامراء ثالث سنہ ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۹۴ھ میں انتقال کیا۔ ذوقِ علم و فضل اور شوقِ تصنیف و تالیف اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ چنانچہ مطبع شمس الامراء میں جو کتابیں چھپیں وہ زیادہ تر ان ہی کی فرمائش اور دلچسپی کی وجہ سے لکھی گئی تھیں۔ بعض کتابوں میں صراحت کر دی گئی ہے کہ صاحبزادہ نواب محمد رفیع الدین خاں عمدۃ الملک بہادر کی فرمائش پر لکھی گئیں۔

شمس الامراء ثانی نے اپنی فارسی کتاب "شمس الہندسہ" میں اپنے فرزند کی نکالی ہوئی شکلوں کو بھی جگہ دی اور اس کے دیباچہ میں اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"چند اشکال مستخرجہ برخوردار محمد رفیع الدین خاں
در آخر مقالہائے متعلقہ آنہا بہ تفصیل مرقوم ساختہ"

انھوں نے زیادہ تر علم ہندسہ اور علم حساب پر اردو میں کتابیں لکھیں جن کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئے۔ اردو زبان میں اول اول سائنسی موضوعوں پر تصنیف و تالیف کرنے اور دوسروں سے لکھوانے کی وجہ سے عہدِ حاضر میں نواب رفیع الدین خاں کی شخصیت کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے انھوں نے علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان کی چند کتابوں کے نام جو معلوم ہو سکے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) رسالہ علم ہندسہ مطبوعہ سنہ ۱۲۵۱ھ (۲) رفیع الحساب مطبوعہ سنہ ۱۲۵۲ھ
(۳) تکملہ رفیع الحساب مطبوعہ سنہ ۱۲۵۳ھ (۴) رفیع الجبر مطبوعہ سنہ ۱۲۵۴ھ

[illegible] مطبوعہ [illegible] ۱۹۰۲ء، فتح الترکیب مطبوعہ [illegible]
[illegible] مطبوعہ [illegible]۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ان کی کئی قلمی کتابیں بھی [illegible] کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں جو اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں۔

شمس الامراء کے تیسرے فرزند نواب محمد بدر الدین خاں بہادر معظم الملک تمیز تھے جو عنفوان شباب ہی میں انتقال کر گئے۔ ان کے متعلق گلزار آصفیہ کا مصنف لکھتا ہے

"اگر فضائل علمی از حکمت و ریاضی وغیرہ بہ ارقام آرد
دفتر بے پایاں بائید"

انھیں شعر و شاعری کا بھی بہت اچھا ذوق تھا۔ اپنی یادگار میں ایک دیوان چھوڑا ہے۔ باوجود تلاش کے آپ کی کسی علمیاتی کتاب کا پتہ نہ چل سکا۔ البتہ ایک قلمی اردو نسخہ انوار بدریہ دستیاب ہوا جو نواب بدر الدین خاں کی فرمائش پر کسی کتاب سے ترجمہ کیا گیا تھا۔ شاید ان کی جواں مرگی کی وجہ سے یہ رسالہ چھپ نہ سکا۔ اس میں اقلیدس کی نسبتوں کے متعلق کافی معلومات درج ہیں۔

یہ رسالہ شاہ علی ساکن قلعہ ادھونی کا تصنیف کردہ ہے جو ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے ختم پر سنہ کتابت درج ہے۔

"اختتام تحریر فی التاریخ بست و چہارم رمضان المبارک
سنہ ۱۲۵۸ ہجریہ"

کتاب کا آغاز مصنف کے حسب ذیل دیباچے سے ہوتا ہے۔

"حسب فرمائش بدر الدین خاں بہادر
جاننا چاہیئے کہ وے نسبتیں جو اقلیدس میں مذکور
ہیں اگرچہ کثرت فوائد میں بہبود شکل عروس ہیں لیکن
معانی ہیں باوجود ترکت ایسے قلیل الاستفادہ کہ کل
کم مبتدیوں کو بجہت دشوار بلکہ منتہیوں کو
بھی ہیں اس لئے ان کو اس فدوی بے مقدار شاہ علی
ساکن قلعہ ادھونی نے زبان ہندی میں بعبارت
سلیس معہ امثلہ عددی ترجمہ کیا تا فوائد سے ان کے
خاص و عام متمتع ہوں اور موسوم بانوار بدریہ کرکے
بطریق تحفہ خدمت بابرکت میں نواب معلی القاب
ثریا رفعت و گردوں قباب معظم الملک معظم الدولہ
محمد بدر الدین خاں بہادر ابن مستطاب امیر کبیر
شمس الامراء محمد فخر الدین خاں بہادر کی گزرانا
باللہ التوفیق و بہ نستعین۔"

چالیس سرخیوں کے تحت نسبتوں کی تعریفات معہ امثلہ درج ہیں چند سرخیاں یہ ہیں۔

"تعریف مقادیر متجانسہ، تعریف نسبت عظمیٰ، تعریف اعداد متناسبہ وغیرہ وغیرہ بعنوان "تعریف مقادیر متناسبہ" جو بحث صفحہ (۴ تا ۶) کی گئی ہے اس کا اختتام حسب ذیل عبارت پر ہوتا ہے۔

"اگر اول و ثالث کو چار مرتبہ مضاعف کریں اور ثانی و رابع کو دو تو حاصل آٹھ اور بارہ اور آٹھ اور بارہ ہوں گے پس جیسا اول ثانی سے ایک ربع کم ہوگا ویسا ہی ثالث رابع سے۔ وقس علیٰ ہذا الترتیب"

$$\frac{2}{1} \quad \frac{3}{8} \quad \frac{3}{15} \quad \frac{9}{12}$$

$$\frac{2}{8} \quad \frac{3}{8} \quad \frac{3}{12} \quad \frac{9}{12}$$

$$\frac{2}{9} \quad \frac{3}{8} \quad \frac{3}{9} \quad \frac{6}{12}$$

اس کتاب میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ قدیم اردو ہے عربی الفاظ اور ترکیبیں جگہ جگہ ملتی ہیں۔

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ ۱۹۱ [illegible] یہ نسخہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہے

غرض شمس الامراء کے عہد میں علم و فن کو جو فروغ پایا تھا
انجام پائیں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ میں یہ دور
بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے پہلے سائنس، ریاضی،
ہیئت اور دیگر جدید علوم و فنون سے متعلق ایسی منظم کوشش کبھی
نہیں کی گئی۔ باوجود تحقیق اور تلاش کے اس سے قبل کی کسی تصنیف
یا ترجمہ کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ شمس الامراء کے تراجم اردو میں
سائنسی ادب کے اولین کارنامے ہیں۔ ان کی اہمیت اس وجہ
سے بھی بہت زیادہ ہے کہ سب کے سب مستند اور اعلیٰ پایہ کے
ہیں۔ تعجب ہے کہ یہ ترجمے حال حال تک گوشۂ گمنامی میں پڑے
ہوئے تھے۔ ان کی شہرت حیدرآباد سے باہر بہت کم ہوئی، اور
خود حیدرآباد میں موجودہ زمانہ کے علماء اور بالخصوص ریاضی
دانوں اور سائنس دانوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جو ان
کتابوں سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔

نواب فخرالدین خان شمس الامراء کا علمی شغف اس
درجہ تھا کہ وہ حیدرآباد سے باہر کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے بھی
واقف تھے اور اس زمانہ میں جتنے اردو، فارسی یا انگریزی
اخبار چھپتے تھے وہ ان سب کو منگواتے اور ان کے سالانہ فائل مجلد
کرا کر رکھتے تھے۔ چنانچہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں
ان کی اکثر جلدیں محفوظ ہیں۔

ان کے مذاق کی اگر کوئی کتاب ہندوستان کے کسی گوشے
میں بھی چھپتی تو وہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرتے اور اپنی
کتابوں کی ترتیب کے وقت ایسی جملہ کتابیں ان کے پیش نظر تھیں۔
ان کو جدید ترین علوم و فنون سے گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ انہوں نے
"ستۂ شمسیہ" کے رسالوں کو انگریزی رسالوں سے جو لندن میں
چھپتے تھے منگوا کر اردو میں ترجمہ کرایا۔ اس زمانے میں شمالی ہند
میں بھی اس قسم کی کوششیں کی گئیں لیکن تعجب ہے کہ وہاں
کے علماء دکن کے ترجموں سے لاعلم ہے۔

شمس الامراء نے انگریزی اصطلاحات کے ترجمے کئے
تھے لیکن شمالی ہند کے ترجموں میں زیادہ تر انگریزی اصطلاحات
ہی مستعمل تھیں مثلاً اسپیڈ کا ترجمہ یہاں "کشا" کیا گیا اور وہاں
انگریزی اصطلاح ہی مستعمل رہی۔ اسی طرح کئی اصطلاحیں ہیں
جن کا یہاں ترجمہ ہوا اور وہاں اصل اصطلاح ہی استعمال
کی جاتی تھی۔

نواب شمس الامراء نے جو کتابیں شائع کیں ان کی زبان
سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ برخلاف اس کے شمالی ہند کے ترجموں
کی زبان اور انداز بیان اس قدر آسان اور عام فہم نہیں۔ شمال
کی زبان پر عربی کا اثر زیادہ تھا اس لئے وہاں کے مترجمین نے
ہیڈروسٹاٹکس اور اوپٹکس کا ترجمہ علی الترتیب علم الماء اور
علم الانظار کیا اور دکن میں علم آب اور علم انعکاس کیا گیا تھا۔

اب ہم اس دور کی ان کتابوں پر جو ہمیں مختلف کتب خانوں
سے دستیاب ہوئیں تفصیلی روشنی ڈالیں گے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ
اردو زبان میں علمی اور حکمیاتی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام آج
سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے شروع ہو چکا تھا۔

ترجمہ شرح چغمینی | اوراق ۱۸۹ سطور ۱۰۔ تقطیع [illegible]۔
خط نستعلیق ــــ عنوانات سرخی میں۔
متعدد رنگین نقشے بھی شامل ہیں۔ مترجم شاہ علی متوطن ادھونی
ــــ سنہ تصنیف قریب سنہ [illegible]ھ۔

علم ہیئت کی مشہور فارسی کتاب شرح چغمینی کا یہ ایک آزاد
اردو ترجمہ ہے جس کو شاہ علی متوطن ادھونی نے نواب شمس الامراء
کی سرپرستی میں سنہ [illegible]ھ کے قریبی زمانہ میں مرتب کیا۔ مترجم نے
اپنا اور کتاب کا نام دیباچہ میں اس طرح لکھا ہے۔

"اس ذرہ بے مقدار شاہ علی متوطن ادھونی نے

[illegible] کی کتابیں کم ملتی ہیں [illegible]
[illegible] ایک بیت ... کا خیال
ظاہر ہوا ہے۔ زبان ہندی میں جو عبارت
[illegible] ہے اس پر شمس الامرا
کی [illegible] مسائل اصل میں تقسیم تا میر
کی [illegible] کی توضیح سے تبدیل ہے
اس سے قبل مصنف نے مادری زبان میں تعلیم و تدریس
کے فوائد بیان کئے ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں لکھتا ہے۔
"دانایان صنعت کار اور عاقلان تجربہ کار پر پوشیدہ
نہیں کہ جس قوم میں زبان مروج ہے جو فن کہ
وہ تعلیم پاتا ہے۔ صاحب زبان نہایت آسانی کے
ساتھ اس فن کا فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ بہ نسبت دوسری
زبان کے مدت قلیل میں حاصل اور کامل ہوتا ہے
کیونکہ جو مدت وہاں معرفت الفاظ میں جاتی ہے۔
یہاں وہ تحصیل معانی میں کام آتی ہے۔"
اس کے بعد نواب شمس الامراء کے مساعی کا تذکرہ کیا ہے کہ
انھوں نے کس طرح ذاتی توجہ سے فنون ریاضی اور علوم طبیعی کو یورپین
زبانوں سے اردو و فارسی میں منتقل کیا۔ اور اس سلسلہ میں رغبت
دلائی ہے کہ ہمیں بھی ان کے اس فیض کو عام کرنے کی کوشش کرنی
چاہیے۔

یہ نسخہ غالباً خود مصنف کا مکتوبہ ہے کیونکہ اس میں جگہ جگہ حاشیہ
پر اصلاحیں تشریحیں اور اضافے درج ہیں۔ تعجب ہے کہ آخر میں
کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ قلمی نسخہ زیور طبع سے
آراستہ ہوا تھا یا نہیں۔

یہ کتاب بالکل اسی تدریسی طرز پر لکھی گئی ہے جو شمس الامراؔ
کی دوسری مطبوعات کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی شاگرد کے سوالات
اور استاد کے جوابات کے درمیان میں نہایت اچھے رنگین نقشے بھی مسئلوں
کی وضاحت کے لئے اتارے گئے ہیں۔ عبارت کے نمونے ذیل میں
درج کئے جاتے ہیں۔

آغاز:-

"سبحان اللہ کہ جس کی قدرت کاملہ سا نمونہ یہ ہے کہ
اجرام علویہ و اجسام سفلیہ کو عدم سے وجود میں لایا
اور ان کے فعل و انفعال سے انواع و اقسام کے
مصنوع ایک سے ایک بہتر سطح زمین پر بنایا۔"

اختتام:-

"ان کے نزدیک سال قمریہ اصطلاحیہ اور شمسیہ حقیقیہ
میں تفاوت دس یوم گیارہ ساعت بارہ دقیقے ہے
اور موافق ثابت دس یوم گیارہ ساعت کسر کم یعنی
ایک دقیقہ تین خمس دقائق ساعت سے اور موافق
بطلیموس دس یوم گیارہ ساعت تین خمس خمس ساعت ہے۔"
اس کے بعد حسب ذیل سرخیاں قائم کر کے فارسی عبارتیں لکھی
گئی ہیں۔
(۱) ترکیب برآوردن روز ماہ نو۔ (۲) حساب دانستن قمر کہ در کدام
برج است۔ (۳) حساب قمر در عقرب۔
یہ نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اصول علم حساب | علم حساب کا ایک ابتدائی رسالہ ہے جو
$\frac{1}{4}$ ۸/۶ کی تقطیع پر (۸۰) صفحات
میں شایع کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کے آخر میں اعداد لوگارتم کا ایک
جدول ہے جو (۱۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ کے سرورق پر حسب
ذیل عبارت مندرج ہے۔

"**اصول علم حساب ہندی زبان میں**"
اہل فرنگ کے دستور پر نوشنمرں کے لئے بیچ عہد نواب ملک

بجناب جدکان عالی حضرت آصف جاہ نظام الملک نظام الدولہ فتح جنگ
میر فرخندہ علی خان بہادر دام اقبالہ العالی کے عہد میں بحکم عالی سرکار نواب
امیر کبیر شمس الامراء بہادر کے شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں بیچ
سنہ ۱۲۵۲ھ کے چھپا۔

ابتداء میں ایک فہرست درج کی گئی ہے جس کا عنوان "حساب کے اعمال کی فہرست ہندی زبان میں" رکھا گیا ہے۔ اس کے تحت (۴۷) سرخیاں درج ہیں جن سے اس رسالہ میں بحث کی گئی ہے۔

اس رسالہ کا ایک دوسرا ایڈیشن کتب خانہ جامعہ عثمانیہ سے دستیاب ہوا۔ جس کا نمبر ($\frac{511}{\text{الف}}$) ہے۔ یہ رسالہ نمبر ۲ کی تدوین پر (۲۱) سال بعد یعنی ۱۸۵۸ء میں "کلکتہ اسکول بک سوسائٹی پریس" میں چھپا۔ صفحات کی تعداد (۸۰) ہے۔ اس کے سرورق پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"اصول علم حساب اردو زبان میں اہل فرنگ کے
دستور پر نو سکھوں کے لئے"

اس کے نیچے عبارت بالا کا انگریزی ترجمہ ہے۔ پہلے ایڈیشن کے سرورق پر "ہندی زبان میں" اور اس ایڈیشن کے سرورق پر "اردو زبان میں" درج ہے۔ نیز پہلے ایڈیشن میں فہرست سے پہلے "تنبیہ" کی سرخی کے تحت حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے۔

تنبیہ

"اس کتاب میں اختصار کے لئے کئی علامتیں مقرر کی گئیں تاکہ سیکھنے والوں کو مفید ہو۔

+ جمع کی علامت − تفریق کی علامت × ضرب کی علامت
÷ تقسیم کی علامت : تناسب کی علامت = مساوات کی علامت"

اس دوسرے ایڈیشن میں یہ عبارت فہرست سے پہلے کے صفحہ پر درج کی گئی ہے اور "حساب کے اعمال کی فہرست" کے نیچے بھی "ہندی زبان میں" کی بجائے "اردو زبان میں" لکھا ہوا ہے۔ ہر صفحہ کی پیشانی پر کتاب کی سرخیوں کے نام اردو اور انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً جمع مرکب (Compound Addition) قانون ثلاثہ (Rule of Three) وغیرہ۔

یہ رسالہ فورٹ ولیم کالج کے اردو ٹائپ میں چھپا ہے۔ کتاب کے آغاز میں علم حساب کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے:

"حساب وہ علم ہے کہ جس سے مجہول عددوں کے
نکالنے اور حاصل کرنے کا حال عدد معلوم خاص
بآسانی جانا جائے۔"

ابتدائی دو صفحات میں اعداد کی اشکال ان کے لکھنے کا طریقہ اور مراتب کے تعین کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ۱،۱۰،۱۰۰ ہندسے لکھ کر یہ بتایا ہے کہ ان کو ارقام کہتے ہیں۔ فہرست کے مطابق ایک ایک موضوع کو لیکر اس کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک عنوان ہے "جمع کا عمل" جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے جمع کی تعریف اور جمع کرنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے بعض عمل کے دو دو تین تین طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ جمع کا عمل صحیح ہے یا غلط جمع کے امتحان کا طریقہ سمجھایا گیا ہے۔ اور بطریق سوال جواب ہر عمل کی تین تین چار چار مثالیں دی گئی ہیں۔ یہی طریقہ تمام عنوانات مثلاً تفریق، ضرب اور قسمت (تقسیم کے معنی میں استعمال ہوا ہے) وغیرہ میں اختیار کیا گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

[illegible] کا انتخاب اور نفسیات

[illegible] ان [illegible] ضروری ہے کہ ہر معاش [illegible] کے لئے پیشے کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ [illegible] میں زندگی کی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے اور ہر روز نیا [illegible] پیدا ہو رہا ہے، ان معاشی تبدیلیوں نے پیشے کی اقتصادی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ پیشے کی اہمیت صرف اقتصادی ہی نہیں بلکہ تمدنی اور اخلاقی بھی ہے۔ ہم اپنے پیشے کے فرائض ادا کرنے میں جو وقت صرف کرتے ہیں اس کا اثر ہماری ذہنی اور عملی دلچسپیوں پر پڑتا ہے۔ ہماری سیرت کا عام رنگ اور ہمارا نظریۂ حیات بڑی حد تک اسی کام کی بدولت معین ہو جاتا ہے۔ ہم پیشہ افراد کی گفتگو، خیالات اور عادتیں ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ پیشے کے ان دور رس اثرات اور اس کی اہمیت کو پروفیسر اشپرانگر نے یوں ظاہر کیا ہے "پیشہ انسان کے لئے نوشتۂ تقدیر بن جاتا ہے۔ چند سال کے عرصے میں وہ انسان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کی سیرت کی تشکیل کرتا ہے۔ پیشہ ہی ہمارا نہیں ہوتا بلکہ ہم بھی پیشے کے ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ گوشہ ہے جہاں سے انسان دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے"

پیشے کے انتخاب کی ضرورت تمدن کے ابتدائی مدارج میں سماج کی ساخت بالکل سادہ تھی بچے اپنے والدین اور بزرگوں کے ساتھ روزمرہ کے کام اور سماجی مشاغل میں حصہ لے کر ضروری معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔ سادہ قوانین، ضابطۂ معاشرت، مذہبی معلومات [illegible] سے متعلق تمام امور اسی طرح "تعلیم پاتی" کے ذریعے سیکھے جاتے تھے۔ تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرہ زیادہ پیچیدہ ہوتا گیا اور سماجی زندگی میں اگلی سی سادگی باقی نہ رہی غیر رسمی تعلیم و تربیت، جو والدین اور بزرگوں کے ساتھ کاروبار میں شرکت کی وجہ سے حاصل ہوتی تھی وہ نئی ضروریات زندگی کے لئے اکتفا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے باضابطہ اور رسمی تعلیم و تربیت کی ضرورت داعی ہوئی۔ طبعی علوم اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ ایجادات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا، جس نے زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا۔ کارکردگی کی اہمیت بڑھ گئی اور تقسیم کار کو مفید اور ضروری تسلیم کیا گیا۔ ان حالات میں پیشے کے انتخاب کا مسئلہ نہایت اہم اور ناگزیر ہو گیا۔

غلط طریقۂ انتخاب یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہم اپنی زندگی کے بعض نہایت اہم مسائل پر بہت کم غور و فکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ پیشے کے انتخاب کا ہے۔ ہم اس اہم مرحلے کو بالکل سرسری توجہ سے طے کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ وہ عام بے اطمینانی ہے جو اکثر افراد اپنی پیشہ ورانہ زندگی سے ظاہر کرتے ہیں۔ عمر رسیدہ افراد سے پوچھئے تو انہیں بھی یقین نہیں کہ جو پیشہ انھوں نے اختیار کیا تھا وہ ان کے لئے موزوں تھا۔ وکیل صاحب اپنی ناکامی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں "کاش میں ڈاکٹر ہوتا" ڈاکٹر صاحب اپنے پیشے کی پریشانیوں سے اکتا کر کہتے ہیں "ملازمت کے زمرے میں داخل ہوتا تو مقررہ اوقات میں مقررہ کام انجام دے کر اپنی زندگی آرام و اطمینان سے گزارتا"۔ ملازمین سے پوچھئے تو وہ پابندیوں اور ترقی کے حدود کا ذکر کر کے آزاد

چیزوں کے پہلوؤں کو سرعت سے بیان کریں گے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہر شخص چاہتا ہے کہ کاش وہ کچھ اور ہوتا گروہ ہوتا جو ہے۔ اس پریشانی پر ہمیں متعجب نہ ہونا چاہئیے کیونکہ پیشے میں داخل ہونے سے پہلے یہ غور ہی نہیں کیا جاتا کہ فرد کو پیشے سے کوئی مناسبت ہے بھی یا نہیں۔

عام غلط فہمیاں بعض غلط فہمیاں اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ ان کی وجہ سے پیشے کے انتخاب کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ تمام افراد مساوی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مساوات کا یہ دل خوش کن تخیل صحیح نہیں۔ نفسیات کے جدید ترین شعبے "انفرادی اختلافات" نے ثابت کر دیا ہے کہ افراد کی صلاحیتوں میں بہت سے کیفی اور کمی اختلافات ہوتے ہیں یہ خیال ہرگز درست نہیں کہ ہر انسان میں اتنی عام استعداد ہوتی ہے کہ خواہ کوئی پیشہ اختیار کرے وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ محض لگاتار کوشش اور محنت ہر پیشے میں کامیابی کے لئے کافی ہے بعض بڑی ہستیوں کے سوانح بھی بظاہر اس خیال کی تائید کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر غور اور عام مشاہدے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر صرف محنت ہی کامیابی کا راز ہوتی تو ہم اکثر سخت محنت کرنے والوں کو معمولی حالت میں نہ پاتے۔

اس سلسلے کی ایک اور غلط فہمی یہ ہے کہ پُرجوش ارادہ ہی بڑے درجے تک پہنچا دینے کے لئے کافی ہے۔ مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ کسی پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کی قابلیت کو محض دلی خواہش سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض نوجوانوں کی خواہش کو بھی پیشے کے انتخاب میں بہت زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ بعض صورتوں میں ایسی خواہش کی نفسی بنیاد غلط پائی گئی ہے۔

نوجوانوں کی غلطیاں پیشے کا اہم [illegible] نوجوان بالعموم جن غلطیوں کا شکار ہوتے ہیں ان کا [illegible] ذکر بیجا نہ ہوگا۔ بعض پیشوں کے متعلق یہ حسن ظن ہوتا ہے کہ وہ منفعت بخش، آرام اور سکون و اطمینان کی زندگی کے ضامن ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر پیشے میں متعدد معین کام کے خشک مراحل اور تکلیف دہ پہلو ہوتے ہیں جو ایک بیرونی ناظر کو پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتے پھر کسی کام کو دلچسپ پانا کام کی نوعیت پر ہی منحصر نہیں ہوتا بلکہ شخصی دلچسپی اور رجحانات کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے۔ ایک ہی کام زید کو دلچسپ معلوم ہو سکتا ہے جو ممکن ہے بکر کو خشک اور عمر کو بیزار کن محسوس ہو۔

کبھی نوجوانوں کی نگاہیں غیر معمولی واقعات پر پڑتی ہیں تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ کسی بڑے ڈاکٹر کے کامیاب عمل جراحی کی شہرت سن کر یہ خیال کر لینا صحیح نہیں کہ ہر فرد کے لئے ڈاکٹری کا پیشہ اتنی ہی دولت اور شہرت کا باعث ہوگا۔ ہر شخص انجینیر بن کر نظام ساگر جیسا عظیم الشان کارنامہ پیش نہیں کر سکتا۔ صدہا انجینیر اپنی زندگی سڑکوں کی مرمت اور معمولی مکانات کی تعمیر میں صرف کرتے ہیں۔

مروجہ معیار وقعت اور سماجی روایات کے تحت مہذب اور غیر مہذب پیشوں کی تفریق کے باعث بھی اکثر نوجوان ایسے پیشے اختیار کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں کہ ان کا شمار "سفید پوشوں" میں رہے اس طرح اپنے میدان عمل کو تنگ کر لینا نقصان دہ ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص غلہ فروشی میں ایک ڈاکٹر سے زیادہ کمائے اور زیادہ خوش گوار زندگی بسر کر سکے۔

نوجوانوں کی پریشانیاں نوجوان پڑھ لکھ لئے [illegible]

[illegible] کی پریشانی کا سبب چند سوالات [illegible] ہو سکتے ہیں۔

[illegible] ذاتی خوبیوں اور کمزوریوں کے مطابق مناسب حال ہے؟

(۲) [illegible] خاندانی اور سماجی حالات کے لحاظ سے موزوں ہو گا؟

(۳) ہر پیشے میں مشکلات، پریشانیاں اور مقررہ کام کے علاوہ مراحل ہوتے ہیں۔ اپنی طبیعت کی افتاد کے لحاظ سے ان چیزوں کو کس پیشے میں برداشت کرسکوں گا؟

ان پریشان کن سوالات کا جواب نہ وہ خود دے سکتا ہے، نہ والدین اور نہ اساتذہ۔ بعض بزرگ ذمہ داری کو محسوس کرکے گریبانی کو چھپاتے ہوئے یوں ٹال دیتے ہیں کہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے تمہیں خود اپنے لئے اپنا پیشہ منتخب کرلینا چاہئے۔ خود اعتمادی کی تلقین تو اچھی چیز ہے، اگر آپ سے ایک ڈوبتا ہوا شخص مدد مانگے اور آپ اس سے کہیں کہ "اپنی جان کی حفاظت آپ ہی کرنی چاہئے، ہمت کرکے دریا میں ہاتھ مارو اور کنارے کے کسی موزوں حصے تک پہنچ جاؤ" تو یہ رہبری یا ہمدردی نہ ہوگی۔ پھر اپنی نفسی کیفیات کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ بعض عمر رسیدہ افراد بھی تو اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ پھر ایک خام کار نوجوان سے معرفت نفس کی ایسی توقع کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

بہرحال بے چارہ پریشان حال نوجوان کسی رہبر کے نہ ملنے سے صحیح مشورے سے مایوس ہو کر اپنے مستقبل کو اتفاقات کے حوالے کر دیتا ہے یا مروجہ روایتی طریقوں کو [illegible] کرکے قبول کر لیتا ہے۔

مروجہ طریقے

ہمارے ملک کا ایک مروجہ طریقہ تو یہ ہے کہ آبائی پیشہ اختیار کر لیا جائے، اس طرح بچوں کا پیشہ تو گہوارے ہی میں متعین ہو جاتا ہے۔ درزی کا بیٹا درزی، سنار کا بیٹا سنار اور بڑھئی کا بیٹا بڑھئی۔ حالانکہ مغربی ممالک پر نظر ڈالئے تو بعض درزیوں، بڑھئیوں اور لوہاروں کے بیٹوں نے بڑے بڑے درجوں تک رسائی حاصل کی اور ملک کی بڑی سے بڑی خدمت انجام دی۔ ہمارے ملک میں آبائی تعلیم ہونا بھی ذاتی صلاحیت کے فقدان کے باوجود صداقت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نوجوانوں کے لئے ان کے والدین اور بزرگ پیشے کا انتخاب کر دیتے ہیں۔ بہت سے نوجوان جو پولیس اور فوج میں داخل ہو کر کامیاب ہو سکتے تھے، اس لئے ایسا نہ کر سکے کہ ان کے والدین کو یہ گوارہ نہ تھا کہ ان کے لڑکے وردی پہنیں۔ اس طرح والدین کا مشورہ بعض وقت ان کی رغبت یا نفرت پر منحصر ہوتا ہے۔ یا پھر متذکرۂ بالا غلط خیالات پر۔

نوجوانوں کی زندگی کے اس اہم مرحلے کی گتھی کو سلجھانا ایک بڑی انسانی خدمت ہے۔ اس خصوص میں اہل مغرب نے جو طریقے اختیار کئے ہیں وہ ہمارے لئے مشعل ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔

مغربی ممالک میں پیشہ نمائی

مغربی ممالک میں پیشے کے انتخاب میں نفسیات پیشہ نمائی سے مدد لی جاتی ہے۔ نفسیات کا یہ جدید شعبہ صنعتی نفسیات اور تعلیمی نفسیات کے امتزاج سے ایک مشترک شعبے کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ پیشہ نما ماہرین نوجوانوں کی ذہنی آزمائش، مخصوص صلاحیتوں کی آزمائش، سماجی اخلاقی اور جذباتی آزمائشوں

کے بعد اس کے تعلیمی اور معاشی حالات پر غور کرکے ماہرانہ مشورہ دیتے ہیں۔

ذہنی آزمائش اس مشورے میں ذہانت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ذہنی آزمائش کے ذریعے نوجوان کا ذہنی خارج قسمت معلوم کیا جاتا ہے۔ یہ آزمائش کئی سوالات پر مشتمل ہوتی ہے جو مختلف عمروں کے لحاظ سے مرتب کئے گئے ہیں۔ صحیح جوابات کی نشان دہی سے ذہنی عمر معلوم کی جاتی ہے۔ کسی فرد کی ذہنی عمر کو اس کی تاریخی عمر پر تقسیم کرنے سے ذہنی عمر کو اس کی تاریخی عمر پر تقسیم کرنے سے ذہنی خارج قسمت حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ایک دس سالہ لڑکا سوالات کے ایسے صحیح جواب دے کہ اس کی ذہنی عمر بارہ سال حاصل ہو تو اس کا ذہنی خارج قسمت $\frac{۱۲}{۱۰}$ یا ۱۲۰ (جب کہ ۱۰۰ اوسط قرار دیا جائے) ہوگا۔

مختلف پیشوں کی تحلیل کی گئی ہے اور یہ معلوم کیا گیا ہے کہ ہر پیشے میں کامیاب ہونے کے لئے کم از کم کس قدر ذہنی خارج قسمت (ذ۔خ۔ق) ضروری ہے۔ مثلاً میکانیکل انجینیرنگ کے لئے ذ۔خ۔ق ۱۱۰ ہونا چاہئے اور اہلکاری کے لئے ۹۰ کافی ہے۔ ان اعداد سے یوں رہبری کی جاتی ہے کہ جس نوجوان کا ذ۔خ۔ق ۱۱۰ سے کم ہو اس کو میکانیکل انجینیرنگ کا پیشہ اختیار کرنے سے منع کیا جاتا ہے کیونکہ اس پیشے کے فرائض ادا کرنے میں زیادہ ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جس کا ذ۔خ۔ق ۹۰ سے زیادہ ہو اس کو اہلکار بننے کا مشورہ نہیں دیا جاتا کیونکہ اس کی ذہانت کے لحاظ سے وہ اعلیٰ تر سطح کا کام کرسکتا ہے .... جس طرح کمتر ذہانت کا

آدمی اعلیٰ تر پیشے کے فرائض اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح بہتر ذہانت کا آدمی کمتر سطح کے پیشے کے فرائض سے اکتا جاتا ہے اور بڑی بے دلی سے کام کو انجام دیتا ہے۔

اس کے علاوہ ذہنی خارج قسمت معلوم کرنے سے وہ سطح معلوم ہو جاتی ہے جس پر کوئی فرد پہنچ سکتا ہے۔ ذیل کے جدول سے اس کا اندازہ ہوگا۔

ذہنی خارج قسمت	پیشہ وارانہ سطح
۵۰ تا ۶۰	ادنیٰ مزدوری یا سادہ کام
۶۰ تا ۷۰	بازگشتی کام جس میں مہارت درکار ہو
۷۰ " ۸۰	ادنیٰ مہارتی بازگشتی کام
۸۰ " ۹۰	نیم مہارتی۔ اہلکارانہ (معمولی)
۹۰ " ۱۱۰	مہارتی۔ اہلکارانہ (خصوصی) ٹیکنیکل
۱۱۰ " ۱۲۵	اعلیٰ ٹیکنیکل۔ اعلیٰ اہلکارانہ۔ انتظامی
۱۲۵ " ۱۴۰	پروفیشنل اور اعلیٰ انتظامی
۱۴۰ سے زیادہ	اعلیٰ پروفیشنل اور نظم و نسق

اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوائے ان افراد کے جن کا ذ۔خ۔ق ۵۰ سے بھی کم ہو یعنی جن کی عقل ایک ۵ سالہ لڑکے سے بھی کم ہو کسی کو بھی روزگار کے مواقع سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔

مخصوص صلاحیتیں ذہنی خارج قسمت سے تو وہ بلند سطح معلوم ہوتی ہے جہاں تک فرد پہنچ سکتا ہے۔ مگر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ فرد کس میدان عمل کے لئے موزوں ہے مخصوص صلاحیتوں کی آزمائش کی جاتی ہے۔ ایسی متعدد معیاری آزمائشیں مرتب ہو چکی ہیں مثلاً میکانی صلاحیت کی آزمائش۔ اشکال کے تعلقات سمجھنے کی آزمائش۔ موسیقی کی صلاحیت کی آزمائش۔ [illegible]

[illegible] غیرہ وغیرہ۔
[illegible] فرد کی اخلاقی، سماجی اور جذباتی [illegible] کے لئے جو آزمائشیں مرتب [illegible] کہ ہر کلاس میں استعمال کی جا سکیں۔ [illegible] کی خصوصیات شامل ہیں۔ علاوہ ازیں وہ [illegible] نہیں اس لئے پیشہ نما ماہر سوال بند کے ذریعہ والدین، اساتذہ اور ساتھیوں سے کچھ معلومات حاصل کرتا ہے۔ بالآخر بالمشافہ گفتگو سے بھی اپنی رائے قائم کرتا ہے۔

اس سارے مواد کو یک جا جمع کیا جاتا ہے تعلیمی کیفیت اور طبی معائنے کی رپورٹ بھی پیش نظر رہتی ہے۔ اس طرح نوجوانوں کا ایک مکمل نفسی مرقع حاصل کرنے کے بعد پیشہ نما ماہر ایک ماہرانہ مشورہ دیتا ہے۔

حبیب احمد

تعلیم کا مسئلہ:- از ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی بہ نیسواسہ عثمانیہ - قیمت عہ -

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کی ایک جدید کتاب "تعلیم کا مسئلہ" شائع ہوئی ہے جس میں حسب ذیل عنوانات پر مفید اور ضروری معلومات درج ہیں:-

(۱) تعلیم و تربیت کا مقصد (۲) تعلیم کی مدت (۳) موجودہ نظام تعلیم کے مدت (۴) موجودہ نظام تعلیم کے نتائج و نقائص (۴) اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین (۵) علم کی وحدت (۶) انسانی وحدت کی تعلیم (۷) ایمان اور علم (۸) ابتدائی اور ثانوی تعلیم (۹) اعلیٰ تعلیم (۱۰) تعلیمی مدارس اور نصاب (۱۱) جامعہ کے شعبہ جات (۱۲) طالب علم اور عملی سیاسیات -

ملنے کا پتہ - سب رس کتاب گھر خیریت آباد -

نغمہ

نغمہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ماضی کی دلچسپ اور رنگین ساعتیں فنا کی وادی میں گم ہو جائیں ——— وقت خواہ کتنی ہی تیزی سے کیوں نہ گزر جائے مگر ان رنگین ساعتوں کی یاد ہمیشہ قلب پر مترنم گیت بجاتی رہتی ہے۔

نغمہ کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب محبت کے طوفانی سمندر میں سکون کی سی کیفیت پیدا ہو جائے ——— خواہ وہ سکون نتیجہ ہو کامیابی کا یا انتہائی افسردگی اور مایوسی کا ——— اس وقت جب روح کے لطیف جام میں سکون کی شراب ختم ہو جائے۔ نغمے کے دھیمے دھیمے شیریں راگ سنائی دیتے ہیں۔

نغمہ ان نازک ساعتوں میں پیدا ہوتا ہے جب دوشیزۂ بہار مضامینِ محبت سے گنگنانے لگے ——— وہ نوجوان قلب میں اس وقت پرورش پاتا ہے جب ماہِ حسن وفا شعار اپنے آپ کو محبت کے سپرد کر دے۔

....

نغمہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ وہ محبت کرنے والے کی مایوس آنکھوں سے اشکوں میں تحلیل ہو کر بہنے لگے۔!

انسانی زندگی گو بالآخر غموں کی پُر پیچ اور کٹھن راہوں کو طے کرتی ہوئی اپنی منزل کو پہنچ جاتی ہے مگر کبھی بھی وہ نغمہ اور ترنم سے محروم نہیں رہتی۔

نغمہ.... ترنم.... روح.... انسانی زندگی.... مصائب آلام.... نغمہ.... ترنم........

افضل صدیقی

صاحبانِ انقلاب

صبحدم جب نور و تاریکی تھے گرمِ اختلاط
رات کے دوشیزہ ملے صبح کا منہ چوم کر!
ایک عالم پر تھا طاری نیم بیداری کا خواب
زندگی احساسِ نو کے موڑ پر گاتی ہوئی !
جیسے جیسے چلتے جاتے تھے سہانے پت کے تیر
جا رہا تھا میں بھی اس عالم میں بستی سے ادھر
یادِ ماضی، فکرِ مستقبل میں، چہرہ زرد سا

اٹھ رہی تھی آسماں سے ماہ و انجم کی بساط
اک نئی دنیا کو جاتے تھے خوشی میں جھوم کر!
تھا ابھی اوڑھے ہوئے کُہرے کی چادر آفتاب
آسمانوں سے نسیم خوش گوار آتی ہوئی !
کھنچتی جاتی تھی گل و غنچہ پہ سونے کی لکیر!
رات کی مانند، صبح نو سے نظریں پھیر کر!!
نیند سے آنکھیں تھیں بوجھل، سر میں ہلکا درد سا

زندگی جب موت ہو، یہ جام لے کر کیا کروں
فطرتِ فیاض کا انعام لے کر کیا کروں
اب مئے منظر سے کیا، جب مٹ چکا آنکھوں کا جوش
اب نہ سرشاری کی طاقت ہے نہ بیداری کا ہوش

ہاں تو میں بھی جا رہا تھا دور بستی سے ادھر
وہ خداوندانِ گیتی، وہ معزز سود خوار !
عشرت و راحت کے خوگر، لعنتوں کے رازداں
دیدۂ احساس خوابیدہ، وہ دن ہو یا کہ رات

اس طرف! یعنی جہاں ہیں کچھ "خداوندانِ" گھر
صاحبانِ دولت و زر، حاکمانِ ذی وقار!
رحمتِ یزداں کے مرکز، شیطنت کے پاسباں
پتھروں کی مورتیں، اک چلتا پھرتا سومنات!

ہاں تو اے ہمدم، انھیں کے پاس جاتا تھا مجھے
اپنی خودداری کے ہاتھوں آج خود بسمل تھا میں
جم گئی تھیں پیڑیاں ہونٹوں پہ، چہرہ تھا اداس
دیکھتا کیا ہوں کہ کچھ خدام ہیں سرگرمِ کار
میرا گھبرایا ہوا چہرہ نظر کیوں دیکھنے !
بیٹیاں باندھے کمر میں، ناز فرماتے رہے

چند معصوموں کی تقدیریں بتاتا تھا مجھے!
اپنا خنجر، اپنی گردن، آپ ہی قاتل تھا میں!
رفتہ رفتہ آ گیا اک قصر کی پھاٹک کے پاس
اپنے آقا کے نمونے، بدکلام و بدشعار!
موٹروں کو پوچھنے والے، ادھر کیوں دیکھتے
مسکراتے جھومتے، آتے رہے جاتے رہے!

سچ بتانا! کیا یہی ہیں "صاحبانِ انقلاب"؟
اس طرف آئیں! کدھر ہیں طالبانِ انقلاب!!

نظر (حیدرآبادی)

غزل

محبت دل میں رہ سکتی نہیں ہرگز نہاں ہوکر
نکل آتی ہے خاموشی کے منہ میں بھی زباں ہوکر

نہیں [illegible] میں تمہاری مہربانی کو
گر تم اور دلکش ہوگئے نامہرباں ہوکر

یہ [illegible] یہ مہ وخورشید یہ گل اور یہ شمعیں
نشاں یہ دے رہا ہے کون بے نام ونشاں ہوکر

محبت میں ہزاروں بار یہ موقعہ بھی آیا ہے
کہ میں نے ان سے باتیں کی ہیں سرتاپا زباں ہوکر

خضر کے آسرے سے گمرہی بہتر ہے الفت میں
یہاں رہرو بھٹکتا ہے شریکِ کارواں ہوکر

میں اک معیار رکھتا ہوں مرا سجدہ وہ سجدہ ہے
جبینِ شوق رہ جائے گی جزوِ آستاں ہوکر

منیر ان سے بہت ممکن تھا پھر سے صلح ہوجاتی
مجھے کھویا ہے میرے رازِ دل نے رازداں ہوکر

منیر چغتائی (لاہور)

غزل

دل کو نگہ لطف و کرم راس کہاں ہے
ہر شخص گر صاحب احساس کہاں ہے

گتھی یہ سلجھ جائے۔ کوئی آس کہاں ہے
وہ پاس ہے میرے۔ تو مرے پاس کہاں ہے؟

مفروضۂ اربابِ خرد۔ حدِّ خرد تک !
دیوانۂ منزل کے لئے یاس کہاں ہے

ہنستے ہوئے ہونٹوں کو تحمّل تو سکھاؤ
ہاں میری وفاؤں کا تمہیں پاس کہاں ہے

بیتابیٔ پیہم کی دعا مانگ رہا ہوں !!
کہہ دیجئے یہ "چیز" مرے پاس کہاں ہے

جاتا ہوں کہاں وحدتِ معنیٰ سے گزر کر
ہر پھول میں ہر طرح کی بُو باس کہاں ہے

سطحیتِ حسنِ بتِ رنگیں پہ نہ جانا
آئینہ حریفِ رخِ الماس کہاں ہے

ہر سانس تری یاد کو دیتا ہے ہوائیں
آہوں کے لئے مہلتِ انفاس کہاں ہے

اے شاد جو ہو قوتِ بازو کا نتیجہ !
وہ نانِ جویں داخلِ افلاس کہاں ہے

شاد عارفی

بھول جا

"احمد عظیم کا شمار ہندی زبان کے اچھے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ خود اس مختصر سے افسانے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کی نظر کتنی گہری ہے"

میں چاہتا تھا کہ تمہارے والد کی موت کا دکھ بھلانے کے لئے تمہارا دل بہلاؤں۔ بہت سوچا، پر سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں، تمہیں کیونکر بہلاؤں، کیسے شانتی دوں؟

کیا تمہیں کچھ یاد ہے کہ میں نے دیر تک چپ رہنے اور کچھ سوچتے رہنے کے بعد تمہیں کیا کہا تھا؟ نہ بھلائی جانے والی تمہیں اچھی طرح یاد ہوگا۔ لیکن تم نہیں جانتیں کہ اس کا انجام کیا ہوا؟

لو میں بتائے دیتا ہوں، پر خدا کے لئے اس پوتر بندھن پر نہ پچھتاؤ جو ہمیں باندھے ہوئے تھا اور جس کا نام میں اپنی زبان پر نہیں لا سکتا۔

میری غربت نے دنیا میں میرے لئے کوئی ٹھکانہ نہ چھوڑا۔ میں جانتا تھا کہ اپنے اور تمہارے تعلقات پر کبھی بھی پردہ نہ رہ سکے گا لیکن میں نے اپنی دانست میں اسے نبھا لیا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم میرے لئے اپنا جیون، اپنا سکھ، اپنی امنگیں، اپنی تمنائیں یہاں تک کہ اپنا کہلا سکنے والا سبھی کچھ مجھ پر نچھاور کرنے کو تیار ہو۔ لیکن میرے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ میں اپنی خوشی کے لئے تمہارا جیون ناش کر دوں، تمہاری امنگوں پر پانی پھیر دوں اور تمہیں گرہستی کے قابل بھی نہ رکھوں۔

آہ میں نے اس دن کتنا جھوٹ بولا تھا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور میں تم سے کہہ رہا تھا۔

"میں ایک خوش حال اور امیر زمیندار کی لڑکی سے محبت کرتا ہوں"۔ وہی میٹھی باتیں آج میری زندگی کو اندر ہی اندر خاتمہ کئے دے رہی ہیں۔ یہ کچھ آج ہی کی بات نہیں، اس وقت بھی جب میں تم سے جھوٹ اور سفید جھوٹ کہہ رہا تھا، اس کے خیال ہی سے میری سانس باہر نکل رہی تھی۔

مجھے تمہاری وہ نظریں بھی یاد ہیں جن سے تم نے مجھے اس وقت دیکھا تھا۔ اس کی چوٹ کے گھاؤ میں آج بھی کسک اٹھتی ہے۔ من میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس وقت انجان بن کر آنکھیں نیچی کر لی تھیں۔

چلتے ہوئے میں نے یہ بھی کہا تھا —

"کل انگورہ جا رہا ہوں، فصل پکنے تک لوٹ نہیں سکوں گا"

"تمہیں کچھ پتا بھی ہے مجھ پر کیا بیتی؟"

شاید تم نے کبھی سوچا ہی نہ ہو!

میں بھی بتانا نہیں چاہتا!

آنسو اور آہیں..... تمہاری یاد! لیکن — یہ سن کر تو مجھے بہت ہی مسرت ہوئی کہ تم اب ایک سکھی اور مالدار زمیندار کی جیون ساتھی ہو اور سکھی بھی ہو۔

میری آنکھیں جو آج ڈبڈبائی ہوئی ہیں تمہیں ہنستا دیکھ کر ہنس سکتی ہیں۔ تم مجھے بھول گئی ہوں گی! "ضرور ہی!" پیاری زہرہ! تمہیں اپنے شوہر کو اپنانا ہوگا کیونکہ تمہارا پیارا تمہارا سب کچھ وہی ہے۔ اس کی خوشی میں تمہاری خوشی ہے۔

(ہندی سے ترجمہ) **وحید یوسف زئی**

[illegible] (مغلیہ دربار کی ایک جھلک)

[illegible] کھڑی تھی۔ اس نے اپنے کندھوں پر ایک تاروں بھرا دوشالہ بھی ڈال لیا تھا۔ اس کے [illegible] آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ دنیا والے دن بھر کے تھکے ماندے پیر پھیلائے سو رہے تھے [illegible] تھا۔ مگر کبھی کبھی رات کی خاموشی میں کسی کی ایک درد ناک آہ سنائی دیتی۔ زمانے کی نیرنگیوں پر [illegible] تھا جو :—

وہ قلعہ جو اپنے کاندھوں پر سیکڑوں صدیوں کا بار

[illegible] سا کھڑا تھا۔ چاند کی کرنیں جھک جھک کر اسے چھیڑتیں۔ ننھے ننھے تارے اسے دیکھ کر مسکراتے۔ [illegible] ہوائیں لوریاں دے دیکر اُسے سلانا چاہتیں۔ مگر وہ عہدِ رفتہ کی یاد میں غمگین کھڑا رہا۔ اس کی بھی قسمت کا ستارا کسی وقت اوجِ امارت پر درخشاں، تیرہ بختوں پر چشمک زنی کیا کرتا تھا۔ وہ بڑے بڑے شہنشاہوں کی [illegible] گاہ رہ چکا تھا۔ وہ رنگیلے شہزادوں کی عشرت گاہ رہ چکا تھا۔ مگر اب؟ اب وہ ایک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ تھا۔ اب وہ اکبرِ اعظم کہاں تھے؟ ان کے وہ نو رتن کیا ہوئے جو ہر وقت ان کے شاندار دربار میں جھلملاتے رہتے؟ اکبر کے وہ عشرت پسند فرزند سلیم کیا ہوئے، جنھوں نے اپنے عدل و انصاف سے ہندوستان بھر میں ایک ہل چل مچا دی تھی؟ جس نے جہانگیرِ عادل کا خطاب پایا تھا؟ ان کی وہ ملکہ کیا ہوئیں جو حقیقت میں نورِ جہاں معلوم ہوتی تھیں؟ قلعہ کے لبوں تک ایک سرد آہ آ کر رک گئی۔ اب تو سوائے چند انگریز سپاہیوں کے اور کوئی پرسانِ حال نہ تھا!

ایک سپاہی نیند میں سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور بندوق سنبھالتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ اُسے دور سے کسی کے تھکے ہوئے قدموں کی آہٹ آ رہی تھی۔

کون ہے؟ اس نے کڑکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ایک تھکا ماندہ مسافر، منزلِ مقصود سے بہت دور کندھے پر ایک گٹھڑی اٹھائے ہوئے آ رہا تھا۔ اس کے تھکے ہوئے پاؤں ہر ہر گام پر رک جاتے تھے۔ مسافر سپاہی کے [illegible] سپاہی کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا اور رات بھر کی پناہ مانگی۔ سپاہی نے ایک نظر اس کے مایوس اور افسردہ چہرہ پر ڈالی اور ایک طرف کو اشارہ کر دیا۔ بیچارہ مسافر دعائیں دیتا ہوا اس جگہ پہنچا جس طرف کہ سپاہی نے اشارہ کیا تھا۔ اُسنے اپنے دکھتے ہوئے کندھے پر سے گٹھڑی اتاری اور قلعہ کے فرش میں سو گیا۔

کچھ ہی دیر بعد مسافر کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا کہ قلعہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے جس پر ایک شاندار شاہی پرچم لہرا رہا ہے۔ مسافر جلدی سے اس میں داخل ہو گیا۔ اسے ہر طرف مرمریں حوض نظر پڑے جن میں گلاب کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ جن میں سفید کنول کے پھول کوئی با وقار راج ہنس کی طرح تیر رہے تھے۔

[illegible] رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے اور ان پر خوش الحان چڑیاں میٹھے سُر الاپ رہی تھیں۔ [illegible]
ہوا قلعہ کے اندر داخل ہوا۔ قلعہ اس قدر روشن تھا کہ مسافر کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ وہ [illegible]
بڑھ گیا۔ وہاں جا کر اس نے اپنے آپ کو ایک بڑے سے دالان میں پایا جس میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ [illegible]
بیچ میں شہنشاہ جہانگیر جلوہ افروز تھے۔ وہ بار بار مُڑتے ادھر اُدھر اپنی پُرجلال نگاہ۔ ایک [illegible]
پیچھے ایک [illegible] دیوار پر آویزاں تھی۔ شہنشاہ کے جاہ و جلال کو دیکھ کر مسافر کانپ گیا اور آہستہ سے دربار عام [illegible]
ہوا باہر نکلا۔ سامنے اُسے ایک دوسرا محل نظر پڑا۔ مسافر ایک اور چمن میں سے گزرتا ہوا اس محل میں داخل ہوا۔ محل کے [illegible]
میں سے ایک نہر بہہ رہی تھی۔ جس میں ایک طرف بہت سی لڑکیاں نہا رہی تھیں۔ نہانے کے بعد کوئی گلاب کے فوارے [illegible]
کھڑی ہو جاتی تو کوئی عطر کے۔ غرض کہ ان کے میٹھے قہقہوں سے سارا محل گونج رہا تھا۔ مسافر اور آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ سامنے
ایک زرق برق پردہ پڑا ہے۔ جس میں لعل و زمرد جھلملا رہے ہیں۔ مسافر نے آہستہ سے اُسے اٹھا لیا اس کے آگے ایک بڑا سا کمرہ تھا
جس کی مرمریں دیواروں پر چھوٹے چھوٹے آئینے جڑے تھے اور اس کے بیچ میں ایک بڑا سا شیشہ کا چراغ آویزاں تھا جس کا عکس
دیواروں پر پڑنے سے معلوم ہوتا کہ ہر طرف ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔

کمرے کے درمیان ایک تخت پر نور جہاں بیٹھی تھی - یہ اس کا سنگھار خانہ تھا۔ بہت سی سہیلیاں اس کے سنگھار
میں مصروف تھیں۔ کوئی اس کے لانبے لانبے سیاہ بالوں میں موتی پرو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے تاروں بھرا دوشالہ
نور جہاں کو اوڑھا دیا ہے۔ اس کی لاجواب پوشاک پر ہیرے اور یاقوت ٹکے تھے - کوئی سہیلی اس کی پوشاک پر عطر اور
گلاب پاشی کر رہی تھی، جس کی بھینی بھینی خوش بو سے سارا محل معطر ہو رہا تھا۔ کوئی سہیلی چنور ہلا رہی تھی تو کوئی سونے کا
پنکھا جھل رہی تھی۔ بعض سہیلیاں ملکہ کے آگے بیٹھی اس کی دلجوئی کا سامان کر رہی تھیں۔ کوئی ستار [illegible] پر سُریلے نغمے
گا رہی تھی تو کوئی پچیسی اور چوسر میں شہزادی کا دل بہلا رہی تھی۔ ہر لمحہ شہزادی کا شیریں قہقہہ سنائی دیتا اور وہ [illegible] سے
کوئی خوبصورت ہار یا پاس سے کوئی بیش بہا خلعت ان کی طرف پھینک دیتی۔

"با ادب با ملاحظہ ہوشیار" کی شاندار صدا نے سب کو چونکا دیا۔ سہیلیاں ادب سے ہاتھ باندھے کھڑی ہو گئیں۔
ملکہ نور جہاں بھی مسکراتی ہوئی آہستہ سے شہنشاہ کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے [illegible] مسکراہٹ
کو دیکھ کر شہنشاہ جہانگیر کچھ دیر کے لئے سلطنت کے پریشان کن مسئلہ کو بھول گیا۔

شہنشاہ اور ملکہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے ایک مرمریں تخت پر بیٹھ گئے۔ ان کے آگے زمین
پر سفید اور سیاہ مرمر کی شطرنج بنی تھی۔ بہت ساری لڑکیاں مہروں کے بجائے اس بساط پر کھڑی تھیں۔ شہنشاہ اور ملکہ
دونوں کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے۔ کبھی شہنشاہ اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کوئی چال سوچنے لگتا اور کبھی ملکہ کی بھی
جبینِ ناز پر شکنیں پڑ جاتیں۔ لڑکیوں کو ادھر اُدھر ہٹایا جاتا۔ کچھ دیر بعد ملکہ کے شیریں قہقہے سے جہاں پناہ کو شکست [illegible]
شہنشاہ مسکراتا ہوا اگر بادل ناخواستہ اٹھ کر اپنے تختِ طاؤس پر دربار خاص [illegible]

[illegible] سہیلیوں کے ساتھ باغ میں چلی گئی۔

[illegible] عالم پہنچ گیا تھا۔ ملکہ جہاں پناہ کے تیر نے کسی راہگیر کو ہلاک کر دیا تھا! جب شاہ جہانگیر کو [illegible] شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے ایک عام دربار کا حکم دیا۔

[illegible] ایک مجرم سے پردہ کے پیچھے دربارِ عام میں کھڑی تھی اور شہنشاہ جہانگیر اپنے اسی تخت پر جلوہ افروز تھا جس کے [illegible] ایک بیوفا آویزاں تھی!

جہانگیر کے لئے عجیب وقت آن پڑا تھا۔ اس کا پُرجلال چہرا انصاف اور محبت کی زبردست کشمکش کا آئینہ دار تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ انصاف نے فتح پائی کیونکہ معاً جہانگیر کا چہرہ رنج و الم کی ایک تصویر بن گیا۔ جہانگیر ایک شوہر کی حیثیت سے نہیں بلکہ جہانگیر عادل کی حیثیت سے تخت پر بیٹھا تھا اور اس کے آگے اس کی عزیز از جاں ملکہ نورجہاں ایک مجرم کی حیثیت سے کھڑی تھی۔ سارے دربار میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی جس میں شہنشاہ کی زبردست آواز گونج گئی۔ "خون کے بدلے خون یہی جہانگیری عدل ہے"! لوگ دربار میں اس حکم سے تھرّا اٹھے۔ مگر جہانگیر کی ابرو پر نہ بل تھا نہ شکن حالانکہ یہ وہی نورجہاں تھی جس کی پیشانیٔ نازک پر ذرا سی گرہ پڑ جاتی تو جہانگیر بے چین ہو جاتا۔ واہ! کیا انصاف کیا تھا جہانگیر عادل نے! ملکہ نورجہاں کے قتل کا حکم دے دیا تھا! مگر سب درباریوں نے ہاتھ جوڑ کر شہنشاہ سے عرض کی کہ:-

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص　　قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ملکہ نورجہاں رہا کر دی گئی۔ شہنشاہ نے دربار کو برخاست کیا اور آہستہ آہستہ سر جھکائے حرم کی طرف گیا جہاں نورجہاں اپنے تخت پر کسی سوچ میں غرق بیٹھی تھی۔

شہنشاہ جہانگیر نے آہستہ سے جھک کر ملکہ کے خوبصورت نازک پیروں کو چوم لیا اور کہا:-

'تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من!'

ملکہ مسکرائی۔ اس نے شہنشاہ کو اپنے پیروں پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے سرتاج ایک مغل بادشاہ کا بلند سر کسی کے آگے بھی خم نہیں ہوتا۔ میری ملکہ جہانگیر نے مسکرا کر جواب دیا۔ "محبت اور حسن کے دربار میں شہنشاہوں کے سر بھی جھک جاتے ہیں!"

مسافر دور ہی کھڑا دونوں کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا۔ اتنے میں شہنشاہ کی نگاہِ پُرجلال اس پر پڑی۔ مسافر بھاگنے کے لئے راہ ڈھونڈنے لگا۔ اس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر جہاں پناہ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ کھیل گئی۔ انھوں نے جیب سے کچھ جواہرات نکالے اور مسافر کی طرف پھینک دئے۔ مسافر اپنی گھبراہٹ اور پریشانی سب کچھ بھول گیا۔ وہ جلدی سے دوزانو ہو کر جواہرات بٹورنے لگا۔ اسے کسی نے زور سے ایک لات ماری۔ مسافر بلبلا اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے آگے ایک سپاہی کھڑا ہے۔ مسافر نے اس کی کوئی پروا نہ کی جواہرات بٹورنے لگا۔ سپاہی کی ایک اور لات نے بے چارے مسافر کو جنت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے دکھے ہوئے کندھے پر گٹھڑی اٹھائی اور چپکے سے چل کھڑا ہوا۔

پھر آگے چل کر مسافر رک گیا۔ اس نے غم نصیب قلعہ کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے قلعہ نے بھی اس کے ساتھ ایک آہ بھری ہے۔ مسافر یہ شعر پڑھتا ہوا منزلِ مقصود کی طرف چل دیا ۔

ہے تو گورستان مگر تو خاک گردوں پایہ ہے — آہ ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

خدیجہ بلگرامی

گزارش

یہ عنایت چاہتا ہوں ایک لمحے کے لئے
پاس تیرے بیٹھ جاؤں ——— !
ختم ہو ہی جائیں گے جو کام ہیں دیگر مرے
تیرے جلووں سے جو ہو جاتا ہے دلِ اوجھل مرا
راحتوں سے ہوتا ہے نا آشنا ——— !!
ایک بحرِ بیکراں میں میری محنت، میرے کام
بن کے رہ جاتے ہیں اک بارِ گراں ———

آگیا ہے موسمِ گرما دریچے کے قریب
اپنی آہوں اور سرگوشی کے ساتھ ———
گلستاں کے اک شگفتہ کنج میں
شہد کی ننھی، فراواں مکھیاں
گا رہی ہیں بے خودی کے ساز پر
وقت ہے اب بیٹھ جاؤں تیرے چہرے کے قریب
یہ عنایت چاہتا ہوں ایک لمحے کے لئے ———!!

تحسین سروری

حیدرآباد کی نئی آبادی

(ڈاکٹر [illegible] صاحب اعظم نے آج سے چالیس سال قبل یہ تقریر حیدرآباد ریڈیو سے نشر فرمائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے
حیدرآباد کی معاشی زندگی کے ایک اہم پہلو پر عالمانہ نظر ڈالی ہے اور اپنے بعض بہا خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ چونکہ یہ
تقریر اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے اس لئے ہم اسے سب رس میں شائع کر رہے ہیں)

بیسویں صدی کے ان پچھلے چالیس سال میں شہر حیدرآباد کیا سے کیا ہو گیا۔ سرکاری اور خانگی عمارتیں کتنی تیار ہوئیں، شہر کی وسعت میں کس قدر اضافہ ہوا اور نئی نئی کتنی آبادیاں بسائی گئیں۔ یہ سب ایسے امور ہیں جن سے عام طور پر حیدرآباد کا ہر باشندہ واقف ہے۔ اس مختصر تقریر میں مجھے ان نئی آبادیوں کا محض ذکر کرنا مقصود نہیں۔ میں کوشش یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اقتصادی نقطۂ نظر سے ان کی طرف توجہ دلاؤں اور اگر ممکن ہو تو اس کا اندازہ کرنے کی کوشش کروں کہ یہ آبادیاں کن اثرات کے تحت وجود میں آئیں اور ان کے وجود سے ہماری سماج پر کیا اثرات پڑ رہے ہیں اور آئندہ پڑیں گے۔

حیدرآباد کی نئی آبادیوں کے وجود میں آنے کے خاص اسباب کا ذکر کرنے سے قبل تین چار ایسی عام سماجی قوتوں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جن کی ہر سماج تابع رہتی ہے۔

سب سے پہلے یہ امر قابل لحاظ ہے کہ بنی نوع انسان کی سماجی دنیا کے آغاز ہی سے بستیاں ہر وقت آباد اور برباد ہوتی رہیں۔ ہر نئی آبادی کے ساتھ کوئی نہ کوئی پرانی آبادی اجڑتی رہی۔ دنیا کے چند خطے ایسے بھی ہیں جہاں تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایک بار نہیں سات سات مرتبہ یہاں نئی آبادیاں قائم ہوئیں۔ اپنے عروج کو پہنچیں اور برباد ہو گئیں۔ بقول شاعر کے ع
سیکڑوں شہر بسائے کئی ویران کئے۔

حیدرآباد کی آبادی کا یکایک پھیلنا اس پرانی دنیا کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دنیا کے تقریباً ہر ملک کی تاریخ میں ایسے بہت سے دور پائے جائیں گے جن میں شوق تعمیر و وسعت آبادی نے چند ہی سال میں نئے نئے شہر آباد کر دئے۔ چنانچہ دکن میں بھی ابتداً ہندو راجاؤں نے اور بعد کو مسلمان بادشاہوں اور امرا نے کئی خوبصورت عمارتیں بنائیں جو اب تک ان کے عہد کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ اس حقیقت کو سبھی جانتے ہیں کہ اسلامی سماج میں شوق تعمیر خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ اسپین سے چین تک اور بخارا سے جاوا تک جہاں کہیں مسلمان رہے بسے وہاں انھوں نے نہ صرف مساجد اور خانقاہیں بنائیں بلکہ سرائیں اور محلات بھی کھڑا کئے۔ دوسرے ممالک کی طرح مغل بہمنی اور قطب شاہی اور آصفی عہد میں حیدرآباد کے مسلمانوں نے سیکڑوں عمارتیں تعمیر کیں جن میں سے کئی ایسی ہیں جو اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔

دوسرا قابل لحاظ امر یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی نئی نئی ایجادات نے دنیا کے ہر طبقہ کی زندگی میں اس قدر سرعت کے ساتھ انقلابات پیدا کر دئے ہیں کہ گزشتہ تیس چالیس سال کی طرز زندگی پر بھی پوری طرح عمل پیرا رہنا ہمارے لئے غیر ضروری بلکہ ایک حد تک ناممکن ہو گیا ہے۔ مثلاً گنجان بستیوں میں رہنا اس لئے لازمی تھا کہ حمل و نقل میں آسانی ہو، وقت پر ایک دوسرے

کا مدد کر سکیں اور آپس میں رابطہ قائم رہے۔ ٹیلیفون، موٹر، ٹیلیویژن کی بدولت دور دور بھی مدد کے لئے [illegible]
ہیں۔ ریڈیو کی بدولت جنگل میں بھی رہ کر دنیا بھر کی روزانہ خبریں اور موسیقی پروگرام اور تقریریں سنے جا سکتے ہیں۔
سمنٹ کی سڑکوں نے موٹروں کی سواری کو اور بھی آسان کر دیا۔ یہ سب اور ایسی متعدد ایجادات جو نوع انسان کی [illegible]
پر اس قدر موثر ہیں کہ دنیا بھر میں لوگ گنجان بستیوں کو چھوڑ کر دور دور کشادہ مقامات پر سکونت اختیار کر رہے ہیں۔

شہر نیویارک میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو دریائے ہڈسن کے اس پار رہتے بستے ہیں اور ہر روز موٹر کو جہاز پر سوار
کر کے شہر نیویارک میں اپنے کاروبار کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ لندن میں لاکھوں آدمی ریل کے ذریعہ اپنے مکانات سے کارخانوں
اور دفاتر کو آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان عظیم الشان شہروں کے علاوہ بھی شاید کوئی ایسا شہر ہو جس کی گنجان آبادی گزشتہ
پچاس سال میں کشادہ میدانوں میں منتقل نہ ہوئی ہو۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ حیدرآباد کی آبادی کے پھیلنے میں یہ
عالمگیر اثرات بھی شامل تھے۔

یہاں تک تو میں نے ان اقتصادی قوتوں کا ذکر کیا جو حیدرآباد کے باشندوں کو عام طور پر نئے نئے مکانات
بنانے کے لئے اور نئی نئی بستیاں آباد کرنے کی طرف مائل کرتے آئے ہیں۔ بے شک یہ قوتیں ایسی ہیں جن کے خلاف عمل کرنا
یا ان سے متاثر نہ ہونا انسان کے لئے غیر ممکن ہے۔ باوجود اس کے یہ بھی ضرور ہے کہ صرف ان عام اثر قوتوں کی بنا پر حیدرآباد
کی آبادی اس قلیل مدت میں اس قدر نہ پھیل سکتی اگر یہاں کوئی خاص وجوہ بھی آبادی کو پھیلنے کی ترغیب دینے کے لئے
نہ ہوتے۔

ان خاص وجوہ میں پہلا نمبر ۱۹۰۸ء کی طغیانی کو دینا چاہئے جس میں ہزاروں گھر مسمار ہو گئے اور ہزاروں غریب اور
متوسط درجہ کے لوگ خانہ برباد ہو گئے۔ اس حادثہ نے شاید پہلی مرتبہ حیدرآباد کے باشندوں کو مستقلانہ طور پر شہر کے باہر بسنے
کی ترغیب دی۔ خود حکومت نے بھی کئی انسدادی تدابیر کیں اور جدید تعمیر کے کام کے لئے ایک محکمہ آرائش بلدہ قائم کیا۔ مدارالمہام
وقت نواب سالار جنگ بہادر ثالث کی تحریک پر حضرت **اقدس و اعلیٰ** نے آرائش بلدہ کی اسکیم کو شرف منظوری بخشا جس کی
وجہ سے غلیظ مکانوں کی جگہ اچھے مکانات بنائے گئے۔ سڑکیں کشادہ کی گئیں اور شہریوں کے لئے پارک اور چمن بھی لگائے گئے۔

آبادی کے منتقل ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ حیدرآباد میں چند سال تک متواتر طاعون اس شدت سے آیا کہ
شہر چھوڑ کر باہر بسنا ہر امیر غریب کے لئے لازم ہو گیا۔ جنگ عظیم کی وجہ سے اس زمانہ میں تعمیر پرانی ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے
اور کچھ پریشانی کے باعث اس ابتدائی زمانہ میں سلیقہ سے مکان بنانا دشوار تھا، یہ بھی نہ خیال کیا گیا کہ مکان کی
ساخت مضبوط اور دیرپا بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے آرام و آسائش و دیرپائی و حسن کاری اس زمانہ کے بنے ہوئے
مکانات میں عموماً بہت کم پائی جاتی ہے۔ اس صدی کے تیسرے دور میں یعنی جنگ عظیم کے چند سال بعد حالات کسی قدر بدلے
طاعون اور انفلوئنزا جیسے آفات سماوی اس دہے میں مثل سابق شدت سے درپیش نہ آئے۔ اختتام جنگ کی وجہ ہر
چیز ارزاں ہو گئی۔ اس لئے تعمیر امکنہ کی طرف از سر نو توجہ ہونے لگی۔ سکون کی زندگی اور سیر کرنے والوں کو [illegible]

[illegible] کی [illegible] کے تحت جو مکانات بنائے گئے ان میں سے اکثر میں کسی وکسی قسم [illegible] - جوبلی ہال کا پیا [illegible] "منجارہ بیون" اپنے تجو کا بہترین نمونہ ہے - ہمارے [illegible] [illegible] بنا کے نکلے بہت سی جدتیں پیدا کیں - سب سے پہلے انھوں نے مقام ہی ایسا [illegible] پسند [illegible] مکان تھا ہی نہیں - دوسرے انھوں نے مکان کی چھت اور دیواریں ایسی بنائیں کہ پورا [illegible] کی [illegible] اختیار کرلیا - "منجارہ بھون" کی تعمیر کے بعد جوبلی ہلس پر جیسے طرازی کا ایک بے پناہ سیلاب [illegible] سے کان ڈھونڈ لایا کسی نے جرمنی میں مزدوروں کے لئے جو نئے مکانات بنائے جارہے تھے ان کو نمونہ بنا کر تعمیر شروع کی - کسی نے ستارے نما ہشت پہلو مکان بنا کر قسمت کی حسن کاری کا مقابلہ کیا -

[illegible] کر اس دور نے نئے نئے گل کھلائے - محکمۂ آرائش بلدہ نے لال ٹیکری اور ماں صاحب کے تالاب کے تحت [illegible] کی ترقی میں جو تیاریاں کی ہیں ان کی طرف کسی نے توجہ نہ کی اور ان دس سال میں کم از کم دو ایسے محلے [illegible] جن کا آباد ہونا دس سال قبل ناممکن سمجھا جاتا تھا - ایک تو بنجارہ پہاڑیوں پر اور دوسرے حیدر گوڑہ کے نشیب میں - اول الذکر اونچے مقام پر متمول لوگوں نے یکے بعد دیگر مکانات بنانا شروع کئے اور جن کی ہمت یا رسائی وہاں تک نہ ہوسکی ان متوسط درجہ کے لوگوں نے حیدر گوڑہ کے مرطوب نشیب میں اس کثرت سے مکانات بناڈالے کہ چند ہی سال میں محکمۂ آرائش بلدہ کا کام یہاں بھی از سر نو آغاز کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی -

اب اس کثرت تعمیر کے معاشی پہلو پر غور کیجئے - اراضیات خریدنا' ان پر مکانات بنانا اور مکانات کو کرایہ پر دینا، یہ بھی سرمایہ کا ایک بڑا مصرف ہے - کوئی اپنے پس انداز کو تجارت میں لگا کر منافع کماتا ہے - کوئی صنعت میں کوئی بنک میں رکھوا کر، کوئی مکان بنا کر اگر معاشی اصول پر مکانات بنانے میں رقم صرف کی جائے تو بے شک فائدہ ہوتا ہے - فرض کیجئے کسی نے بارہ ہزار کا مکان بنایا اور اس کا کرایہ پچاس روپے آتا ہے - تو معنی یہ ہوئے کہ مالک مکان کو پانچ فی صد منافع ملتا رہا - اگر یہ شخص بنک میں یہ رقم دو سال کے وعدہ پر رکھ دیتا تو بھی اس سے بہت زیادہ فائدہ نہ ہوتا - اسی طرح مکان کی مالیت پچیس ہزار ہو اور اس سے ایک سو روپے کرایہ ملے یا پچاس ہزار کے مکان سے دو سو روپے کرایہ ملے تو دونوں صورتوں میں تخمیناً اسی پانچ فی صد حساب سے منافع ملتا ہے - لیکن بہت کم ایسے مکان ہیں جن کی مالیت کے مطابق انھیں متواتر کرایہ دار میسر ہوتے ہیں - خانگی مکانات کی کثرت کا ایک اور سبب بھی تھا -

گزشتہ پچاس سال میں بلکہ سالار جنگ اولی کے زمانہ سے آج تک سرکاری دفاتر اور ادارہ جات کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے - لیکن ان ادارہ جات کے لئے شہر حیدرآباد میں عمارتیں بہت کم تیار ہوئیں اور ہر نئے دفتر کے لئے ایک خانگی مکان کرایہ پر لیا جانے لگا - سیکڑوں مکانات کی مالیت مشخص کی جاکر پانچ فی صد کے حساب سے سرکار کرایہ ادا کرنے لگی اور سرکاری ضرورت کے مدنظر خانگی مکانات کے بھی کرائے بڑھ گئے - نتیجہ یہ ہوا کہ [illegible] سے اب چند [illegible]

لیکن بعد میں یہ ہدایت کی گئی کہ سرکاری ضروریات کے لئے کرایہ پر دیئے جائیں گے اور اگر ضرورت باقی نہ رہی تو عام طور پر کرایہ پر دیئے جائیں گے۔

عام تجربہ ہے کہ کوئی مکان ابتدائی تخمینہ کے اندر تیار نہیں ہوتا۔ جس کسی نے خود مکان بنایا ہے وہ جانتا ہے کہ مکان بنانے میں اس کی گواہی دے گا کہ دس ہزار کا تخمینہ بنایا گیا تھا۔ مکان تیار ہوتے ہوتے بیس ہزار خرچ ہو گئے۔ تعمیرات میں بھی اکثر کا یہی تجربہ رہا۔ اور وہ لوگ جن کی پونجی دس ہزار ہی تھی وہ بیس ہزار خرچ کر کے مقروض ہو گئے۔ باپ دادا کی متروکہ جائداد اور خاندانی زیورات رہن ہو گئے۔ اصل اور سود کی ادائیگی میں دن کا چین اور رات کی نیند جاتی رہی۔

ابتدائی تخمینہ سے تجاوز کیا جا کر جس قدر بڑا مکان بنایا گیا اسی قدر کرایہ دار فراہم کرنے میں دقت ہونا فطری تھا۔ بارہ ہزار کے مکان کے لئے پچاس روپیہ ماہانہ کرایہ ٹھیرا لیکن ایسا مکان سرکار کے علاوہ وہی شخص کرایہ پر لے سکتا ہے جس کی آمدنی پچاس سے دس گنی یعنی پانچ سو روپے ہو۔ یہ اور بات ہے کہ جوار کی روٹی کھا کر یا ایک چاول کا دانہ مونچھ میں لگا کر باہر نکلنے والوں کے متعدد دیکھتے تو ایسے آج بھی دو سو روپے ماہانہ کما کر پچاس روپے ماہانہ کے مکان میں رہتے ہیں۔ لیکن سرکار کے مقررہ اصول کے مطابق آمدنی کا دسواں حصہ کرایہ مکان کے لئے موزوں ہے۔ اس اصول کے مدنظر ملاحظہ فرمائیے ہمارے ملک میں پانچ سو روپے ماہانہ کی آمدنی والے کتنے لوگ ہیں۔ اور اگر ان سب کو نکال دیجئے جن کے ذاتی مکانات ہیں تو پانچ لاکھ کی آبادی میں شاید ہی سو دو سو ایسے غریب الوطن نظر آئیں گے جن کو پچاس روپے کرایہ کے مکان کی ضرورت ہو۔ پھر اس طبقے کے ہزار روپے آمدنی والے یعنی ایسے اشخاص جو پچیس ہزار کے مکان کے لئے ایک سو روپے کرایہ آسانی سے دے سکتے ہوں ان کی تعداد اور بھی کم ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ملک میں سکونت کے مکان پر پچیس ہزار روپے صرف کرنا فائدہ مند نہیں ہے اس لئے کہ بجز سرکاری ضروریات کے بہت کم ایسے لوگ ہیں جو ایسے کرایہ پر لے سکیں۔

اب رہا یہ کہ خود کی سکونت کے لئے مکان استعمال کیا جائے۔ کرایہ پر دینے کے بجائے اگر مالک مکان خود مکان میں رہے تو معاشی نقطۂ نظر سے اس کے یہی معنی ہوئے کہ وہ خود اس کا کرایہ ادا کر رہا ہے۔ پانچ سو روپے کی آمدنی والے کو پچاس روپے بطور کرایہ ادا کرنا یا خود کی آمدنی والے کو پچاس روپے بطور کرایہ ادا کرنا یا خود بارہ ہزار کا مکان بنا کر اس میں رہنا سزاوار ہے۔ لیکن اگر یہی شخص پچاس ہزار کے مکان میں رہتا ہے خواہ وہ اس کا ذاتی مکان کیوں نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ دو سو روپے کرایہ ادا کر رہا ہے کیونکہ اگر یہی پچاس ہزار روپے وہ بنک میں رکھتا تو اسے دو سو روپے ماہانہ آمدنی ہو جاتی۔

محکمۂ آرائش بلدہ نے جو نئے مکانات بنائے ہیں ان میں اسی اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ دس روپے کی آمدنی والے کے لئے ایک روپیہ کرایہ سزاوار ہے۔ اس کے لئے مکان ڈھائی سو کا چاہیئے۔ تیس روپے کی آمدنی والے کے لئے تین روپے

[illegible] کی حیثیت کا مکان چاہئے اور سو روپے آمدنی والے کے لئے ڈھائی ہزار کا مکان موزوں ہے۔ محکمۂ مذکور نے [illegible] کی مدوں اور آمدنی کا اندازہ لگا کر تین درجوں کے مکانات بنائے۔ ہر ایک ادنیٰ و متوسط طبقے کی آمدنی کے لئے [illegible] ہو سکتے ہوں۔

[illegible] آباد میں جتنی لال بیٹھ بھی انہیں اصول کے تحت بسایا گیا۔ کاش حیدرآباد کے متمول اصحاب کا شوقِ تعمیر بھی [illegible] کرتا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

البتہ پچیس سال کے متواتر تجربے کے بعد گزشتہ چند سال سے مکان بنانے والوں میں کچھ سلیقہ پایا جانے لگا ہے۔ ایک جرمن آرکیٹکٹ نے حیدرآباد میں دو تین ہی سال رہ کر اپنی مہر حیدرآباد کی طرزِ تعمیر پر لگا دی اور حال ہی میں وہ چلا۔ نوجوان ملکی آرکیٹکٹ نے مذاقِ تعمیر میں بہت کچھ اصلاح کی ہے لیکن ان اصحاب کو اب بھی ایسی ایسی فرمائشات سے سابقہ پڑتا ہے کہ وہ فنی اصول سے ہٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہمارے گرم ملک میں بڑے بڑے کشادہ دالان نہایت موزوں ہوتے ہیں لیکن "جرمن فیشن" کے دلدادہ چھوٹے چھوٹے کمرے ہی پسند کرتے ہیں۔ ہمارے مکانات میں گرد، بارش، کیڑے پتنگے، سانپ، بچھو ان سب سے حفاظت چاہئے لیکن سمنٹ کانکریٹ کی جالیاں ایسی خوش نما بنائی جانے لگی ہیں کہ گرد، بارش، کیڑے پتنگے تو کجا پرندے بھی ان میں سے داخل ہو کر گھونسلے بنا سکتے ہیں اور چوہے، بلیاں بھی مدعو ہو سکتی ہیں۔

سچ پوچھئے تو میں اس تعمیر کے اثرات کے (ہمارے سماج پر پڑ رہے ہیں اور آئندہ پڑیں گے) بارے میں زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ کچھ تو اس لئے کہ آپ کے کھانے کا وقت آپہنچا اور کچھ اس لئے کہ گھریلو مسئلوں کے متعلق سوچ بچار کرنا ضروری بھی ہے اور خطرناک بھی۔ چونکہ کمزوری ہے میں نے اس موضوع پر تقریر کرنا قبول کیا۔ خطرناک ہونے کی وجہ سے تقریر کو یہیں پر ختم کرتا ہوں۔

ستاروں کے باشندوں کو یا متقدمین کو آپ جو چاہیں کہیں۔ آپ سے جواب طلبی نہ کی جائے گی۔ لیکن ساتھیوں کی فراست اور دور اندیشی پر لحظہ بھر بھی بدگمانی کیجئے تو آپ گردن زدنی کا حکم لگا دیں گے۔ اگر میں اس گناہ کا مرتکب ہوا ہوں تو معذرت چاہی جاتی ہے۔

امیر علی ہاشم

حیدرآباد ۔ اس کتاب میں عوام اور بچوں کے لئے شہر اور ریاست حیدرآباد کے ضروری حالات سادہ اور سلیس زبان میں درج کئے گئے ہیں۔ اس کے کئی ابواب ہیں جن میں آب و ہوا، پہاڑ، دریا، پیداوار، تاریخ، طرزِ معاشرت، صنعتیں، زبانیں، طرزِ حکومت، آثارِ قدیمہ اور ذرائع حمل ونقل کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مرتبہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ بی اے۔ جامعہ عثمانیہ ہیں جن کو انشا پردازی کا خاص ذوق ہے۔ قیمت ۱۰/

اشوک اعظم ۔ یہ کتاب مجلس ادبیاتِ اطفال کی طرف سے طلبہ اور عوام کے لئے سلیس اور سادہ زبان میں لکھائی گئی ہے۔ محترمہ سیدہ مہدی جعفری صاحبہ بی اے (عثمانیہ) نے ہندوستان کے اس مشہور فرمانروا کے حالاتِ زندگی اور کارنامے دلچسپ پیرائے میں قلمبند کئے ہیں۔ کتاب باتصویر ہے۔ قیمت ۸/

آگ

سادھو سنتوں کے میل جول سے بُرے بھی اچھے ہو جاتے ہیں۔ مگر پیاگ کی بد قسمتی تھی کہ اس پر اس کا الٹا ہی اثر ہوا۔ اسے گانجے، چرس اور بھنگ کا چسکا پڑ گیا۔ جس کا پھل یہ ہوا کہ ایک محنتی اور جفاکش نوجوان سے وہ نکما اور نشہ باز بن بیٹھا۔ زندگی کے کارزار میں یہ آرام کہاں۔ کسی درخت کے نیچے دھونی جل رہی ہے۔ ایک لمبی جٹا والے مہاتما بیٹھے ہوئے ہیں۔ چیلے انہیں گھیرے بیٹھے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر سے چرس کے دم لگ رہے ہیں۔ وقفہ وقفہ سے بھجن بھی ہو جاتے ہیں۔ مزدوری میں یہ عیش و عشرت کہاں۔ چلم بھرنا پیاگ کا کام تھا۔ چیلوں کو آخرت میں جنت کی امید تھی۔ لیکن پیاگ کو دنیا میں بھی پھل ملتا تھا۔ چلم پر پہلا حق اسی کا ہوتا۔ مہاتماؤں کی پاک زبان سے بھگوان کی حمد وثنا سنتے ہوئے وہ خوشی سے مست ہو جاتا۔ اس پر غش کی حالت چھا جاتی اور وہ راگ اور رنگ سے بھری ہوئی ایک اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا۔ اس کی بیوی رات کے دس گیارہ بجے اسے بلانے آتی تو پیاگ کو بہت برا معلوم ہوتا۔ اسے دنیا کانٹوں سے بھرے ہوئے جنگل سی دکھائی دیتی۔ لیکن گھر پہونچنے کے بعد جب اُسے معلوم ہوتا کہ ابھی چولہا نہیں جلا ہے اور چنے چبینے کی کچھ فکر کرنی ہے۔ وہ ذات کا "بھر" تھا۔ گاؤں کی چوکیداری اس کی میراث تھی۔ دو روپے اور کچھ آنے تنخواہ ملتی تھی۔ وردی اور صافہ مفت۔ کام تھا، ہفتہ میں ایک دن تھانہ جانا، وہاں افسروں کے دروازوں پر جھاڑو دینا، اصطبل صاف کرنا اور لکڑی چیرنا۔ پیاگ خون کے گھونٹ پی پی کر یہ کام کرتا۔ کیونکہ جسمانی محنت اور روحانی اذیت دونوں کے لحاظ سے یہ نوکری اُسے مہنگی پڑتی تھی۔ آنسو یوں پونچھنے کہ چوکیداری میں اگر کوئی کام تھا تو اتنا ہی۔ لیکن مہینہ میں چار دن کے لئے دو روپے اور کچھ آنے کم نہ تھے۔ پھر گاؤں میں بھی بڑے آدمیوں پر نہیں تو نیچوں پر رعب تھا۔ تنخواہ گویا وظیفہ ہو چکی تھی۔ اور جب سے مہاتماؤں کی صحبت نصیب ہوئی وہ پیاگ کے جیب خرچ کے مد میں آ گئی۔ تارک الدنیا سنیاسی بن جانے کا شوق اور بڑھتا ہی گیا۔ ان سنت سنگوں کی صحبت میں آنے سے پہلے وہ گاؤں میں مزدوری کرتا تھا۔ رکمن لکڑیاں توڑ کر بازار لے جاتی۔ پیاگ کبھی "آرا" چلاتا، کبھی ہل جوتتا۔ کبھی "پور" ہانکتا۔ جو کام سامنے آ جائے اس میں جٹ جاتا تھا۔ وہ ہنس مکھ، زندہ دل، خلیق اور جفاکش آدمی تھا۔ اور ایسا آدمی کبھی بھوکوں نہیں مرتا۔ اس پر لطف یہ کہ کسی کام کے لئے نہیں نہ کرتا۔ کسی نے کچھ کہا اور وہ "اچھا بھیا" کہہ کر دوڑتا۔ گاؤں میں اس کی عزت تھی اس کے اس سلوک کی وجہ سے قحط پڑ جانے پر بھی دو تین سال اسے کچھ زیادہ مصیبت نہیں اٹھانی پڑی۔ دونوں عالم کی تو اسے فکر ہی نہ تھی یہ طاقت تو مہاتماؤں کو بھی نہ نصیب ہوئی تھی۔ مہاتماؤں کے دروازوں پر بیلوں کی تین تین جوڑیاں بندھی تھیں تو پیاگ کس گنتی میں تھا۔ ہاں جو کی دال روٹی میں شبہ نہیں تھا، لیکن اب یہ بھی روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ اس پر آفت یہ تھی کہ رکمن بھی کئی سبب سے اتنی شوہر پرست، اتنی فرمانبردار اور اتنی محنتی نہ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں پریشان کن خیالات پیدا ہو چلے تھے۔ ادھر پیاگ کو بس یہی فکر تھی کہ کوئی نامعلوم قوت اسے زندگی کے بکھیڑوں سے نجات دلا دے، اور وہ اطمینان سے بھگوان کے بھجن اور سادھوؤں کی خدمت میں مست ہو جائے۔

ایک دن رکمن بازار سے لکڑیاں بیچ کر لوٹی تو پیاگ نے کہا۔ "لا کچھ پیسے مجھے دیدے .... دم لگا آؤں"۔

رکمن منھ پھیر کر بولی "دم لگانے کی ایسی چاٹ ہے تو کام کیوں نہیں کرتے کیا آج کل کوئی بابا نہیں ہیں۔ جا کر چلم بھرو"۔

پیاگ نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "بھلا چاہتی ہے تو پیسے دیدے۔ ورنہ اس طرح تنگ کرے گی تو ایک دن کہیں نکل جاؤں گا۔ تب روئے گی۔ رکمن انگوٹھا دکھا کر بولی "روئے میری بلا۔ تم رہتے بھی ہو تو کون سونے کا قلعہ بنا دیتے ہو۔ اب بھی چھاتی پھاڑتی ہوں تب بھی چھاتی پھاڑوں گی۔" "تو اب یہی فیصلہ ہے" "ہاں ہاں! کہہ تو دیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں"۔

"گہنے بنوانے کے لئے پیسے ہیں اور میں چار پیسے مانگتا ہوں تو یوں جواب دیتی ہے" رکمن تنک کر بولی "گہنے بنواتی ہوں تو

[illegible] ہے۔ تم نے تو چیل کا چیلا بھی نہیں بنوایا۔ اتنا بھی نہیں دیکھی جاتا۔"

[illegible] دن گھر نہ آیا تو رکیمن کو فکر ہوئی۔ گاؤں بھر چھان آئی۔ چڑیا کسی اڈے پر نہ ملی۔ اس دن اس نے کچھ کھایا نہیں۔ رات کو لیٹی بھی تو بہت دیر تک آنکھ نہ لگی۔ ڈر ہو رہا تھا کہیں پیاگ نے سچ مچ کچھ کر تو نہیں لیا۔ اس نے خیال کیا سویرے اٹھ کر چپہ چپہ چھان ڈالوں گی۔ کسی سادھو سنت کے ساتھ ہوگا۔ جا کر تھانے میں رپورٹ کر دوں گی۔

ابھی تڑکا ہی تھا کہ رکیمن تھانے چلنے کو تیار ہو گئی۔ کواڑ بند کر کے نکلتی ہی تھی کہ پیاگ آتا ہوا دکھائی دیا۔ لیکن وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک عورت بھی تھی۔ اس کی چھینٹ کی ساڑی، رنگی ہوئی چادر، لمبا گھونگٹ اور شرمیلی چال دیکھ کر رکیمن کا کلیجہ دھم سے ہو گیا۔ وہ ایک لمحہ بکی بکی سی کھڑی رہی۔ پھر بڑھ کر عورت کو دونوں ہاتھوں کے بیچ میں لے لیا۔ اور اسے اس طرح آہستہ آہستہ گھر کے اندر لے چلی جیسے کوئی مریض زندگی سے ناامید ہو کر زہر کے گھونٹ پی رہا ہو۔

جب پڑوسیوں کی بھیڑ چھٹ گئی تو رکیمن نے پیاگ سے پوچھا۔ "اسے کہاں سے لا دسٹے؟"
پیاگ نے ہنس کر کہا "گھر سے بھاگی جاتی تھی۔ مجھے راستے میں مل گئی۔ گھر کا کام دھندا کرے گی۔ پڑی رہے گی۔"
"معلوم ہوتا ہے مجھ سے تمہارا جی بھر گیا۔" پیاگ نے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "دھوت پگلی" اسے تیری خدمت کرنے لایا ہوں"
"نئی کے آگے پرانی کو کون پوچھتا ہے۔"

"چل۔ دل جس سے ملے وہی نئی ہے اور جس سے نہ ملے وہی پرانی۔ لا کچھ پیسے ہوں تو دیدے۔ تین دن دم نہیں لگایا۔ پیر سیدھے نہیں پڑتے۔ ہاں دیکھ دو چار دن اس بیچاری کو کھلا پلا دے۔ پھر یہ آپ ہی کام کرنے لگے گی۔" رکیمن نے پورا روپیہ لا کر پیاگ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ دوسری مرتبہ مانگنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

پیاگ میں اور چاہے کوئی گن ہو یا نہ ہو لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ہمدرد ضرور تھا اور اس نے لاپرواہی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ ایک ماہ تک کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہ ہوا۔ رکیمن اپنی ساری چوکڑیاں بھول گئی تھی۔ بڑے تڑکے اٹھتی۔ کبھی لکڑیاں توڑ کر، کبھی چارا کاٹ کر، کبھی اپلے پاتھ کر بازار لے جاتی۔ وہاں جو کچھ ملتا اس کا آدھا تو پیاگ کے ہتے چڑھتا اور آدھے میں گھر کا خرچ نکل جاتا۔ وہ اپنی سوتن کو کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ پڑوسیوں سے کہتی، بہن سوتن ہے تو کیا۔ ہے تو ابھی کل کی آئی ہوئی۔ دو چار مہینے بھی آرام سے نہ رہے گی تو کیا یاد کرے گی۔ میں تو کام کرنے کو ہوں ہی۔"
گاؤں بھر میں رکیمن کے نیک برتاؤ کے چرچے ہوتے تھے۔ لیکن من چلا اور گھاگھ پیاگ سب کچھ سمجھتا اور اپنے ارادوں کی کامیابی پر خوش ہوتا تھا۔

ایک دن اس عورت نے کہا۔ "بہن اب تو گھر میں بیٹھے بیٹھے جی اکتا گیا ہے، مجھے بھی کوئی کام دلا دو۔"
رکیمن نے تشفی بخش آواز میں کہا۔ "کیا میرے منہ میں کالک لگوانے پر تلی ہو۔ گھر ہی کا کام کئے جاؤ۔ باہر کے لئے تو میں ہوں ہی۔"
سوتن کا نام کوشلیا تھا، جو بگڑ کر سلیا ہو گیا تھا۔ اس وقت تو سلیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن یہ لونڈیوں سی حالت اب اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ وہ دن بھر گھر کا کام کرتے کرتے مرے کوئی نہیں پوچھتا۔ رکیمن باہر سے چار پیسے لاتی ہے تو گھر کی مالک بنی ہوئی ہے۔ اب سلیا بھی مزدوری کرے گی اور مالک پن کا گھمنڈ توڑ دے گی۔ پیاگ پیسوں کا یار ہے۔ یہ بات اس سے اب چھپی نہ تھی۔ جب رکیمن چارا لے کر بازار چلی گئی تو وہ دروازہ پر ٹٹی لگائی اور گاؤں کا رنگ ڈھنگ دیکھنے کے لئے نکل پڑی۔ گاؤں میں برہمن، ٹھاکر، کائستھ، بنئے سبھی تھے۔ سلیا نے بے بسی اور مجبوری کا کچھ ایسا ڈھونگ رچایا کہ

ساری عورتیں اس پر مہربان ہوگئیں۔ کسی نے چاول دیا، کسی نے دال، کسی نے کچھ۔ نئی بہو کی آؤ بھگت کون نہ کرتا۔ پہلے ہی دن میں سلیا کو معلوم ہو گیا کہ گاؤں میں کوئی پنسہاری نہیں ہے اور وہ اس کمی کو پورا کر سکتی ہے۔ وہ یہاں سے گھر لوٹی تو اس کے سر پر گیہوں سے بھری ہوئی ایک ڈلیا تھی۔

پیاگ پچھلے پہر ہی سے چکی کی آواز سنی تو رکیمن سے پوچھا "آج تو سلیا ابھی سے پیسنے لگی۔" رکیمن بازار سے آٹا لایا کرتی تھی۔ اناج اور آٹے کے بھاؤ میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا اسے خیال ہوا کہ سلیا اتنے سویرے کیا پیس رہی ہے۔ اٹھ کر چکی والی کوٹھری میں گئی تو دیکھا سلیا اندھیرے میں بیٹھی کچھ پیس رہی ہے۔ اس نے جا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ڈلیا اٹھا کر بولی "تجھے کس نے پیسنے کو کہا ہے، کس کا اناج پیس رہی ہے؟"

سلیا تیز ہو کر بولی "تم جا کر آرام سے سوتی کیوں نہیں۔ میں پیستی ہوں تو تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ چکی کی گھر گھر بھی نہیں سنی جاتی۔ لاؤ۔ ڈلیا دے دو۔ بیٹھے بیٹھے کب تک کھاؤں گی۔ دو مہینے تو ہو گئے۔" "میں نے تو تجھ سے کچھ نہیں کہا۔"
"تم کہو چاہے نہ کہو اپنا دھرم بھی تو کچھ ہے۔" "تو ابھی یہاں کے آدمیوں کو نہیں جانتی۔ آٹا پسواتے تو سب کو اچھا لگتا ہے۔ پیسے دیتے روتے ہیں۔ کس کا گیہوں ہے۔ میں سویرے اس کے سر پٹک آؤں گی۔" سلیا نے رکیمن کے ہاتھ سے ڈلیا چھین لی۔ اور بولی "پیسے کیوں نہ دیں گے۔ کچھ بیگار کرتی ہوں؟" "تو نہ مانے گی" "تمہاری لونڈی بن کر نہ رہوں گی۔"
یہ تکرار سن کر پیاگ بھی آ پہونچا اور رکیمن سے بولا "کام کرتی ہے تو کرنے کیوں نہیں دیتی۔ اب کیا زندگی بھر دلہن ہی بنی رہے گی۔ ہو تو گئے دو مہینے۔" "تم کیا جانو۔ ناک تو میری نہ کٹے گی۔" سلیا بول اٹھی۔ "تو کیا کوئی بٹھا کر کھلاتا ہے۔ چوکا برتن، جھاڑو بہارو، روٹی پانی، پسینا کوٹنا یہ کون کرتا ہے۔ پانی کھینچتے کھینچتے میرے ہاتھوں میں گٹھے پڑ گئے۔ مجھ سے اب یہ سارا کام نہ ہوگا۔" پیاگ نے کہا۔ "تو تو ہی بازار جایا کر۔ گھر کا کام رہنے دے رکیمن کر لے گی۔" رکیمن بات کاٹ کر بولی "ایسی بات منہ سے نکالتے شرم نہیں آتی۔ تین دن کی دلہن بازار میں گھومے گی تو دنیا کیا کہے گی۔"

سلیا نے بے چین ہو کر کہا "کیا کہے گی دنیا۔ کیا کوئی عیب کرنے جاتی ہوں۔" سلیا کی جیت ہو گئی۔ رکیمن کے ہاتھ سے اختیار نکل گیا۔ سلیا کی عملداری ہو گئی۔ جوان عورت تھی۔ گیہوں پیس کر اٹھی تو اوروں کے ساتھ گھاس چھیلنے چلی گئی اور اتنی گھاس چھیلی کہ سب دنگ رہ گئیں۔ گٹھا اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ جن مردوں کو گھاس چھیلنے کا بڑا زعم تھا ان سے بھی اس نے بازی مار لی۔ یہ گٹھا بارہ آنے کو بکا۔ سلیا نے آٹا، چاول، دال، تیل، نمک، ترکاری اور مسالہ سب کچھ لیا اور چار آنے بچا لیے۔ رکیمن نے بھی سمجھا تھا کہ سلیا بازار سے دو چار آنے پیسے لے کر لوٹے گی، تو اسے ڈانٹوں گی اور دوسرے دن سے پھر خود بازار جانے لگوں گی۔ پھر سے میری حکومت ہو جائے گی۔ لیکن جب یہ سارا سامان دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں۔ پیاگ کھانے بیٹھا تو مسالے دار ترکاری کی تعریف کرنے لگا۔ مہینوں سے ایسی مزیدار چیز نصیب نہ ہوئی تھی۔ بہت خوش ہوا۔ کھانا کھا کر وہ باہر جانے لگا تو سلیا دروازے میں کھڑی تھی۔ بولا "آج کتنے پیسے ملے؟" "بارہ آنے ملے تھے۔" "سب خرچ کر ڈالے کچھ بچے ہوں تو مجھے دیدے۔" سلیا نے بچے ہوئے چار آنے پیسے دیدئے۔ پیاگ پیسے کھنکھناتا ہوا بولا "تو نے آج مالا مال کر دیا۔ رکیمن تو دو چار پیسوں میں ٹال دیتی تھی۔" "مجھے گاڑ کر رکھنا تھوڑا ہی ہے۔ پیسہ کھانے پینے کے لئے ہے کہ گاڑنے کے لئے۔" "اب تو ہی بازار جایا کر۔ رکیمن گھر کا کام کرے گی۔"
رکیمن اور سلیا میں جنگ چھڑ گئی۔ سلیا پیاگ پر اپنا قابو حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کر محنت کرتی۔ پہر رات ہی سے اس کی

[illegible] گئی ۔ دن نکلتے ہی گھاس لانے چلی جاتی۔ اور ذرا دیر سستا کر پھر بازار کی راہ لیتی۔ وہاں سے لوٹ کر بھی [illegible] کبھی سن کاتتی، کبھی لکڑیاں توڑتی۔ رکمن اس کے کام میں برابر عیب نکالتی اور جب موقع ملتا تو گوبر تھوکر اپنے ہاتھ [illegible] ۔ پیاگ کے دونوں ہاتھوں میں لڈو تھے۔ دونوں بیویاں اسے زیادہ سے زیادہ پیسے دینے لگیں اور اس کی [illegible] اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے دن رات کوشش کرتی رہتیں۔ لیکن سلیا کچھ اس مضبوطی سے جم کر بیٹھ گئی تھی کہ ہلائے نہ ہلتی۔ یہاں تک کہ ایک دن فریقین میں کھلم کھلا ٹھن گئی۔ ایک دن سلیا گھاس لے کر لوٹی تو پسینے میں تر تھی۔ بیساکھ کا مہینہ تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ اس نے سوچا نہا کر بازار جاؤں گی۔ گھاس دروازہ ہی پر رکھ کر وہ تالاب پر نہانے چلی گئی۔ رکمن نے تھوڑی سی گھاس نکال کر پڑوس کے گھر میں چھپا دی اور گٹھے کو ڈھیلا کر کے برابر کر دیا۔ سلیا نہا کر لوٹی تو گھاس کم معلوم ہوئی۔ رکمن سے پوچھا اس نے کہا ”میں نہیں جانتی“ سلیا نے گالیاں دینی شروع کیں ”جس نے میری گھاس چھوئی ہو اس کے جسم میں کیڑے پڑیں۔ اس کے باپ اور بھائی مر جائیں۔ اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں۔“ رکمن کچھ دیر تک تو ضبط کئے بیٹھی رہی۔ آخر خون میں ابال آ ہی گیا جھلا کر اٹھی اور سلیا کے دو تین طمانچے لگا دئے۔ سلیا چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ سارا محلہ جمع ہو گیا۔ سلیا کی خوبصورتی اور کام کاج سب ہی کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ وہ سب سے زیادہ گھاس کیوں چھیلتی ہے؟ سب سے زیادہ لکڑیاں کیوں لاتی ہے؟ اتنے سویرے کیوں اٹھتی ہے؟ اتنے پیسے کیوں لاتی ہے؟ ان باتوں نے اسے اپنے پڑوسیوں کی نظروں میں حقیر کر دیا تھا۔ سب اسی کو برا بھلا کہنے لگیں۔ مٹھی بھر گھاس کے لئے اتنا اودھم مچا ڈالا۔ اتنی گھاس تو آدمی جھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ گھاس نہ ہوئی سونا ہوا۔ تجھے تو سوچنا چاہئے تھا کہ اگر کسی نے لے بھی لیا ہے تو گاؤں گھر ہی کا۔ باہر کا کوئی چور تو آیا نہیں۔ تو نے اتنی گالیاں دیں تو کس کو دیں۔ پڑوسیوں ہی کو تو۔

اتفاق سے پیاگ اس روز تھانے گیا ہوا تھا۔ شام کو تھکا ماندہ لوٹا تو سلیا سے بولا — ”لا کچھ پیسے دیدے دم لگا آؤں تھک کر چور ہو گیا ہوں“۔ سلیا اسے دیکھتے ہی ہائے ہائے کر کے رونے لگی۔ پیاگ نے گھبرا کر پوچھا — ”کیا ہوا، کیوں روتی ہے؟ کہیں پتہ تو نہیں چل گیا۔ شوہر کے گھر سے کوئی آدمی تو نہیں آیا۔“

”اب اس گھر میں میرا رہنا نہ ہوگا۔ اپنے گھر جاؤں گی۔“ ”ارے کچھ منہ سے تو بول ہوا کیا؟ گاؤں میں کس نے گالی دی ہے۔ گھر پھونک دوں اس کا۔ چالان کروا دوں۔“

سلیا نے رو رو کر ساری کتھا کہہ سنائی۔ پیاگ پر آج تھانے میں خوب مار پڑی تھی۔ جھلایا ہوا تھا۔ یہ کتھا سنی تو تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ رکمن پانی بھرنے گئی۔ وہ ابھی گھڑا بھی نہ رکھنے پائی تھی کہ پیاگ اس پر ٹوٹ پڑا۔ اور مارتے مارتے بیدم کر دیا۔ وہ مار کا جواب گالیوں سے دیتی تھی۔ اور پیاگ ہر ایک گالی پر اور بھی جھلا جھلا کر مارتا تھا۔ یہاں تک کہ رکمن کے گھٹنے پھوٹ گئے۔ چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ سلیا بیچ بچاؤ میں کہتی جاتی تھی — ”واہ رے تیرا دیدہ — واہ رے تیری زبان۔ ایسی تو عورت ہی نہیں دیکھی۔ عورت کاہے کو ڈائن ہے۔ ذرا بھی منہ میں لگام نہیں۔“ لیکن رکمن اس کی باتوں کو جیسے سنتی ہی نہ تھی۔ اس کی ساری طاقت پیاگ کو کوسنے میں لگی ہوئی تھی۔ پیاگ مارتے مارتے تھک گیا مگر رکمن کی زبان نہ تھکی۔ بس یہی رٹ لگی ہوئی تھی ”تو مر جا۔ تیری مٹی نکلے۔ تجھے بھوانی کھائیں۔ تجھے مرگی آوے“ پیاگ رہ رہ کر غصہ میں تلملا اٹھتا اور آ کر دو چار لاتیں جما دیتا۔ لیکن رکمن کو اب شاید چوٹ ہی نہ لگتی تھی۔ وہ جگہ سے ہلتی بھی نہ تھی۔ سر کے بال کھولے زمین پر بیٹھی انھیں منتروں کا پاٹھ کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب غصہ نہ تھا۔ صرف ایک قسم کی ہراسانی تھی۔ اس کی ساری روح بے بسی کی آگ میں جل رہی تھی۔

اندھیرا ہوا تو رکمن اٹھ کر ایک طرف نکل گئی۔ جیسے آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل جاتی ہے۔ سلیا پک رہی تھی۔ اس نے اسے

جاتے دیکھا بھی لیکن کچھ پوچھا نہیں۔ دروازہ پر پیاگ بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ اس نے بھی کچھ نہ کہا۔

جب فصل پکنے لگی تو ڈیڑھ دو مہینے تک پیاگ کو کھیتوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ اسے کسانوں سے ملا ہوا حصہ اور ہل پیچھے کچھ اناج بندھا ہوا تھا۔ ماگھ ہی میں وہ کھیتوں کے بیچ میں تھوڑی سی زمین صاف کرکے ایک منڈھوا ڈال لیتا تھا اور رات کو کھا پی کر آگ چلم تمباکو اور چرس لئے ہوئے اسی منڈھوے میں پڑا رہتا تھا۔ جیت کے ختم تک اس کا یہی دستور رہتا۔ آج کل وہی دن تھے۔ فصل پکی ہوئی تیار کھڑی تھی۔ دو چار دن میں کٹائی شروع ہونے والی تھی۔ پیاگ نے دس بجے رات تک رکمین کی راہ دیکھی پھر یہ سمجھ کر کہ شاید کسی پڑوسن کے گھر سو رہی ہوگی اس نے کھا پی کر اپنی لاٹھی اٹھائی اور سلیا سے بولا۔ "کواڑ بند کرلے۔ اگر رکمین آئے تو کھول دینا اور سمجھا بجھا کر تھوڑا بہت کھلا دینا۔ تیری وجہ سے آج اتنا طوفان ہوگیا۔ مجھے نہ جانے اتنا غصہ کیسے آگیا۔ میں نے اسے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا۔ کہیں کسی کنوئیں میں گر نہ پڑی ہو۔ کل آفت آجائے گی۔" سلیا بولی۔ "نہ جانے وہ آئیں گی کہ نہیں۔ میں اکیلی کیسے رہوں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" "تو گھر میں کون رہے گا۔ سونا گھر پاکر کوئی لوٹا تھالی اٹھالے جائے تو؟ ڈر کس بات کا ہے۔ پھر رکمین تو آتی ہی ہوگی۔" سلیا نے اندر سے ٹٹی بند کرلی۔ پیاگ کھیتوں کی طرف چلا۔ چرس کی ترنگ میں یہ بھجن گاتا جاتا تھا۔

"ٹھگنی کیا نیناں چمکاوے

کدو کاٹ مردنگ بنائے	نیبو کاٹ منجیرا
پانچ تروئی منگل گائیں	ناچے بالم کھیرا
روپا پہن کے روپ دکھائے	سونا پہن رجھائے
گلے ڈال تلسی کی مالا	تین لوک برماوے

ٹھگنی کیا نیناں چمکاوے"

ٹھکانے پر پہونچتے ہی اچانک اس نے دیکھا کہ سامنے کھیت میں کسی نے آگ لگائی۔ ایک پل میں شعلے دہک اٹھے۔ اس نے چلا کر پکارا۔ "کون ہے وہاں۔ ارے یہ کون آگ جلاتا ہے"

دہکتی ہوئی آگ نے اپنے لپکتے ہوئے تیز شعلوں کی زبانی جواب دیا۔ اب پیاگ کو معلوم ہوا کہ اس کے منڈھوے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس کی چھاتی دھڑکنے لگی۔ اس منڈھوے میں آگ لگنا روئی کے ڈھیر میں آگ لگنا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ منڈھوے میں چاروں طرف ایک ہاتھ ہٹ کر پکی ہوئی فصل کی چادریں سی بچھی ہوئی تھیں رات میں بھی ان کا سنہرا رنگ جھلک رہا تھا۔ آگ کی ایک لپیٹ صرف ایک ذرا سی چنگاری سارے کھیتوں کو بھسم کردے گی۔ سارا گاؤں تباہ ہو جائے گا۔ انھیں کھیتوں سے ملے ہوئے دوسرے گاؤں کے کھیت بھی تھے وہ بھی جل اٹھیں گے۔ اوہ! لپٹیں بڑھتی جارہی ہیں۔ اب سوچنے کا وقت نہ تھا پیاگ نے اپنا اُپلا اور چلم وہیں پٹک دیا اور کندھے پر لاٹھی رکھ کر بے تحاشا منڈھوے کی طرف دوڑا۔ مینڈوں سے جانے میں چکر تھا اس لئے وہ کھیتوں میں سے ہوکر بھاگا جارہا تھا۔ پل پل میں آگ بھڑکتی جاتی تھی اور پیاگ کے پاؤں اور بھی تیزی سے اٹھ رہے تھے کوئی تیز گھوڑا بھی اس وقت اسے پا نہ سکتا۔ اپنی تیزی پر اسے خود تعجب ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا پاؤں زمین پر پڑتے ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں منڈھوے پر لگی ہوئی تھیں دائیں بائیں اسے اور کچھ نہ سوجھتا تھا۔ بدحواسی نے اس کے پیروں میں پر لگا دئے تھے۔ نہ دم پھولتا تھا نہ پاؤں تھکتے تھے۔ تین چار فرلانگ اس نے دو منٹ میں طے کرلئے اور منڈھوے کے پاس جا پہونچا۔ منڈھوے کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ کس نے یہ کام کیا ہے؟ یہ سوچنے کا موقع نہ تھا۔ اسے کھوجنے کی

تباہ ہو جاتی۔ پیاگ کا دھیان رکھین پر تھا۔ مگر یہ غصہ کا وقت نہ تھا۔ آگ کی لپٹیں شریر بچوں کی طرح ٹھٹھا مارتی اچھلتی کودتی کبھی دائیں طرف لپکتی۔ کبھی بائیں طرف۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لپیٹ اب کھیت تک پہونچی اب پہونچی۔ لپٹیں غصہ سے کپکپاتی ہوئی بڑھتیں اور ناکام ہو کر دوسری مرتبہ پھر دگنی طاقت سے لپکتی تھیں۔ آگ کیسے بجھے! لاٹھی سے پیٹ کر بجھانے کا خیال تھا۔ وہ تو بڑی بیوقوفی کی بات تھی۔ پھر کیا ہوا فصل جل گئی تو پھر وہ کسی کو منہ نہ دکھا سکے گا۔ آہ! گاؤں میں کہرام مچ جائے گا۔ تباہی پھیل جائے گی۔ اس نے زیادہ نہیں سوچا گنواروں کو سوچنا نہیں آتا۔ پیاگ نے لاٹھی سنبھالی زور سے ایک چھلانگ لگا کر آگ کے اندر منڈھوے کے دروازے پر جا پہونچا۔ جلتا ہوا منڈھوا اپنی لاٹھی پر اٹھایا اور سر پر لئے ہوئے سب سے چوڑی میڑ پر گاؤں کی طرف بھاگا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی آگ کا گولا ہوا میں اڑتا چلا جا رہا ہے۔ پھوس کی جلتی ہوئی دھجیاں اس کے اوپر گر رہی تھیں۔ لیکن اسے اس کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ ایک بار ایک موٹی سی لکڑی منڈھوے سے الگ ہو کر اس کے ہاتھ پر گری۔ سارا ہاتھ جھلس گیا۔ اس پر بھی اس کے پاؤں پل بھر نہیں رکے۔ ہاتھ میں ذرا بھی ہچک نہ ہوئی۔ ہاتھوں کا جلنا کھیتی کا تباہ ہونا تھا۔ پیاگ کو خود اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ اگر ڈر تھا تو یہی کہ منڈھوے کا وہ حصہ جہاں لاٹھی کا کنڈا ڈال کر اس نے اسے اٹھایا تھا نہ جل جائے کیونکہ سوراخ کے پھیلتے ہی منڈھوا اس کے اوپر آ گرے گا۔ آگ کے شعلے اسے بھسم کر ڈالیں گے۔ پیاگ یہ جانتا تھا اور ہوا کی چال سے اڑا جاتا تھا۔ چار فرلانگ کی دوڑ ہے۔ موت آگ کی صورت میں پیاگ کے سر پر کھیل رہی ہے اور گاؤں کی فصل پر۔ اس کی دوڑ میں اتنی تیزی ہے کہ شعلوں کا منہ پیچھے کو پھر گیا ہے اور ان کی دہکنے والی قوت ہوا کے تیز جھونکوں سے لڑنے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہیں تو اب تک بیچ میں آگ پہونچ گئی ہوتی اور آہ و زاری مچ گئی ہوتی۔ ایک فرلانگ تو نکل گیا۔ پیاگ کی ہمت نے ہار نہیں مانی۔ وہ دوسرا فرلانگ بھی پورا ہو گیا۔ دیکھنا پیاگ دو فرلانگ کی اور کسر ہے۔ پاؤں ذرا بھی سست نہ ہوں۔ شعلے لاٹھی کے کنڈے پر پہونچے اور تمہاری زندگی کا خاتمہ ہے۔ مرنے کے بعد بھی تمہیں گالیاں ملیں گی تم قیامت تک آہوں کی آگ میں جلتے رہو گے۔ بس ایک منٹ اور! اب صرف دو کھیت اور رہ گئے ہیں۔ تباہی۔ لاٹھی کا کنڈا اوپر نکل گیا۔ منڈھوا نیچے کھسک رہا ہے۔ اب کوئی امید نہیں۔ پیاگ جان چھوڑ کر دوڑ رہا ہے۔ وہ کنارے کا کھیت آ پہونچا۔ اب صرف دو سکنڈ کا اور معاملہ ہے۔ فتح و کامیابی کا دروازہ سامنے بیس ہاتھ پر ہے۔ ادھر جنت ہے ادھر دوزخ .... مگر وہ منڈھوا کھسکتا ہوا پیاگ کے سر پر آ پہونچا۔ وہ اب بھی اسے پھینک کر اپنی جان بچا سکتا ہے لیکن اسے جان کی پرواہ نہیں۔ وہ اس جلتی ہوئی آگ کو سر پر لئے بھاگا جا رہا ہے۔ وہ اس کے پاؤں لڑکھڑائے! ہائے! اب یہ آگ اور زندگی کا کھیل نہیں دیکھا جاتا۔

یکایک ایک عورت سامنے کے درخت کے نیچے سے دوڑتی ہوئی پیاگ کے پاس پہونچی۔ یہ رکھین تھی۔ اس نے فوراً پیاگ کے سامنے آ کر گردن جھکائی۔ اور جلتے ہوئے منڈھوے کے نیچے پہونچ کر اسے دونوں ہاتھوں پر لے لیا۔ اسی دم پیاگ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس کا سارا منہ جھلس گیا تھا۔

رکھین اس آگ کے الاؤ کو لئے ہوئے ایک سکنڈ میں کھیت کے کنارے پر آ پہونچی مگر اتنی دیر میں اس کے ہاتھ جل گئے۔ منہ جل گیا اور کپڑوں میں آگ لگ گئی اس میں اب اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ منڈھوے کے باہر نکل آتی۔ وہ منڈھوے کو لئے ہوئے گر پڑی۔ اس کے بعد کچھ دیر تک منڈھوا ہلتا رہا۔ رکھین ہاتھ پاؤں پھینکتی رہی۔ پھر آگ

اسے نگل گئی۔ رکیمن نے آگ کی جگہ لے لی۔

کچھ دیر کے بعد پیاگ کو ہوش آیا۔ سارا جسم جل رہا تھا۔ اس نے دیکھا کھیت سے ہٹ کر ہوس کی ادا آگ چمک رہی ہے۔ اٹھ کر دوڑا اور پیر سے آگ کو ہٹا دیا۔ نیچے رکیمن کی ادہ جلی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے منھ ڈھانپ لیا اور رونے لگا۔

سویرے گاؤں کے لوگ پیاگ کو اٹھا کر اس کے گھر لے گئے۔ ایک ہفتہ تک اس کا علاج ہوتا رہا۔ لیکن بچا نہیں۔ کچھ تو آگ نے جلا دیا تھا جو کسر رہ گئی تھی اسے ظلم کی آگ نے پورا کیا۔

(ہندی سے) منشی پریم چند آنجہانی مترجمہ افضل علی

محبت کی چھاؤں ۔ مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العین معاشرہ کی سچی تصویر اور معروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

صبحِ آزادی

مفہوم غیر فہم کی تفہیم کیا کریں! خالی ہوں جن کے ہاتھ وہ تقسیم کیا کریں

نیرنگِ اصطلاح میں الجھا ہو اضمیر مطلب نگار خانۂ الفاظ میں اسیر

بانگِ رحیل کیوں نہ قیادت پہ بار ہو احساسِ فرض، فرض کو جب ناگوار ہو

میری نظر میں قابلِ تحسیں ہیں وہ دماغ روشن ہیں جن کی فکر سے امید کے چراغ

کیا کم ہے یہ کہ، کشمکشِ بیش و کم تو ہے اعزاز و سربلندی کا باقی بھرم تو ہے

اوروں سے آج مانگ رہے ہیں ہمارے ہاتھ وہ حق جو ساتھ لائے ہیں اپنے جنم کے ساتھ!

درعش کی پیش رفت میں یاں انتشار ہے اور شانتی کی دیوی سمندر کے پار ہے

دورِ جدید مضحکۂ اضطراب ہے خود انقلاب منتظرِ انقلاب ہے

ہمت شکن نہیں، یہ حوادث، یہ مرحلے!
ناداں! یہ ہیں طلسمِ سیاست کے زلزلے!

بشیر النساء بیگم بشیر

خوشی کے آنسو

شیشہ ایک پتھر سے ٹکرا کر چور چور ہو گیا' اور کارڈ تیل میں تر بتر ہو گیا تھا' بے چارہ لڑکا جس کا سن تخمیناً بارہ سال ہو گا مسلسل رو رہا تھا' دو ایک تماشائی اُسے گھیرے کھڑے تھے' میں جو دفعتاً باہر نکلا اُن محاصرہ کئے ہوئے ایک خضر صورت سے دریافت کیا "حضرت! کیا تماشا ہو رہا ہے یہ"۔

آپ نے اپنی ریش مبارک کو چپکے سے کھجلاتے ہوئے فرمایا "سیکل سے ٹکر ہو گئی ہے"۔

"اور آپ تماشا دیکھ رہے ہیں" میں نے طنزاً مولانا کو ڈانٹ کر پوچھا "کدھر گیا وہ سیکل والا"۔

ان میں سے ایک نے کہا "وہ تو چلتا بنا"

افسوس لڑکے کی حالت قابل رحم تھی' شیشہ کے ایک ٹکڑے سے اس کی انگلی زخمی ہو گئی تھی'

"ادھر آنا" میں نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر کہا "اٹھاؤ اس تیل کے کارڈ کو رونے سے حاصل؟

لڑکے نے ہچکی لیتے ہوئے کہا' اب تو رحمت آپا خوب مارے گی' دو روز سے گھر میں تیل کی ایک بوند بھی نہیں تم اپنے آنسو تو پونچھ ڈالو' میں اس کا بندوبست کئے دیتا ہوں' میں اسے اپنے گھر لے آیا۔

"تمہارا مکان یہاں کہاں ہے" میں نے لڑکے سے دریافت کیا'

"بازو والی گلی کے موڑ پر"

"اچھا یہ تو بتاؤ تمہارے والد کہاں ملازم ہیں؟" جواب حسرتناک ملا "اللہ میاں کے پاس" ماں تو ایک ڈیوڑھی میں پڑھانے جاتی ہے"

تیل آنے پر میں نے لڑکے کے حوالے کیا۔ لیکن حیرت تو اس امر کی رہی کہ لڑکا یک لخت تیل لینے سے انکار کر گیا۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "میاں! اسے اپنے گھر لے جاؤ"۔۔۔ اور اس تیل کے معاوضہ میں سمجھو۔ جو گر گیا" وہ انکار کی صورت میں سر ہلاتے رہا۔ میرے زیادہ اصرار پر اس نے کہا "رحمت آپا مارے گی"۔

میں نے کہا' "ارے بابا! ۔ مار پڑے گی تو کمبخت کہ بوتل ٹوٹ گئی تھی"

"جھوٹ بولنا پڑے گا"۔

"اس میں جھوٹ کی کیا بات ہے' مار سے تو بچ جاؤ گے"۔

"مار تو مجھ پر کسی صورت میں پڑے گی' سچ بولوں یا جھوٹ"

میں اس گفتگو پر حیران ہو گیا' "خیر بابا! تمہاری مرضی' یہ تیل تو لے جاؤ"

"رحمت آپا سے پوچھ کر آؤں گا"۔ لڑکا پھر وہی رٹ لگاتا ہوا اور چلتا بنا' میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ دس منٹ گزر گئے۔ لڑکا نہ آیا۔ ملازم کو میں نے لڑکے کی خبر لینے کے لئے بھیجا۔۔۔ وہ آ کر کہنے لگا' لڑکے پر بُری طرح مار پڑی ہے۔ وہ باہر کھڑا رو رہا ہے' میں نے ملازم کو دوبارہ لڑکے کے بلانے کے لئے روانہ کیا تب بھی مایوسی ہوئی۔ "عجیب لڑکا ہے" چونکہ مجھے لڑکے سے ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہو چلی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اس کے گھر پہونچ کر راضی کروں' لڑکا تو مجھے آتا دیکھ کر اندر بھاگ گیا' میں اس کے مکان کے دروازے پر پہونچ کر ایک لمحہ کے لئے خاموش کھڑا رہا۔ معمولی مختصر سا کھپریل کا مکان' لڑکے کا نام بھی مجھے معلوم نہ تھا۔ زنجیر کھٹکھٹانے پر آواز آئی۔۔۔ "جمیل دیکھو تو سہی کون آئے ہیں"۔ کون ہیں آپ؟

"آپ کا ہمسایہ' پڑوسی"۔۔۔

"کیا چاہتے ہیں آپ" وہی نسوانی آواز آئی۔

"غالباً آپ اس لڑکے کی آپا ہیں۔ دیکھئے تو آپ کے بھائی نے جو بوتل توڑ ڈالی ہے یہ اس کا قصور نہیں محض سیکل کی ٹکر ہو جانے سے یہ حادثہ پیش آیا ہے۔

آواز آئی" آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ!"

"شکریہ تو تیل لینے کی صورت میں قبول کیا جائے گا" میں نے جواب دیا' کوئی جواب نہ آنے پر میں اپنے گھر چلا آیا اور ملازم کے ذریعہ تیل بھجوا دیا۔

اس واقعہ کو کچھ دن گزر گئے' مجھے یاد نہیں' کسی کا مجھے شکریہ قبول کرنا پڑا تھا۔ میں مکان تبدیل کر کے ایک دوسرے محلہ میں مقیم تھا۔۔۔ اتفاق کی بات ہے ایک دن میں اپنی آنکھوں کا

اسی روز مجھے ہسپتال پہونچنا' اپنے کام سے فارغ ہو کر باہر نکلا — کسی نے مجھے پکارا — مڑ کر دیکھا وہی میرا پڑوسی لڑکا تھا۔

"ارے جمیل! تم اچھے تو ہو' کیسے آنا ہوا یہاں؟"

"ہاں بیمار ہے" دوائی لینے آیا تھا"

"تمہاری رحمت آپا تو اچھی ہیں نا" اب بھی وہ کبھی کبھی تمہیں پیٹتی ہوں گی'

"جی ہاں' لڑکا بولا "ایک دفعہ رحمت آپا نے پھر مجھے پیٹا تھا —"

"بوتل توڑ ڈالی ہو گی تم نے"۔

"ہاں' ماں کی دوائی لا رہا تھا' دو ایک ہوائی جہاز سر پر منڈلا رہے تھے' میں جو اوپر دیکھنے لگا ٹھوکر ہو گئی"۔

"تب تو تم بڑے خراب آدمی ہو"

"آپ بھی یہی کہتے ہیں" اس نے کچھ افسردہ لہجہ میں کہا'

"اور کیا؟ اس طرح روز بوتلیں توڑ دیا کرتے ہو۔ جانتے ہو کتنی قیمت ہوتی ہے ان کی"

"رحمت آپا کہتی تھیں' چار چار آنے میں ایک آتی ہے"

"اس سے بھی زیادہ — اب احتیاط کرنا"

لڑکا تعمیل کی صورت میں سر ہلایا۔ مجھے جلدی تھی "اپنی رحمت آپا کو سلام کہنا" لڑکے سے میں نے کہا اور رخصت ہوا ——

جانے لڑکے کو میرے دفتر کا پتہ کیسے معلوم ہو گیا۔ شاید میرے سابقہ مکان دار نے بتلایا ہو گا۔ ایک دن وہ میرے پاس آ پہونچا —

"ارے جمیل!" میں نے تعجب سے دریافت کیا۔

لڑکا رونے لگا —

کیا ہوا تمہیں' — رحمت آپا نے مارا ہو گا' توڑ دی ہو گی کوئی بوتل۔

"نہیں" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔ "ماں چل بسی"۔

"ارے کب؟"

"چار دن ہوئے"

"افسوس!" تمہاری آپا کا کیا حال ہے"

"کچھ نہ پوچھئے' کھانا پانی حرام ہو گیا ہے۔ زمین کا بچھونا ہو گئی ہے' آنکھوں سے رات دن آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی ہے"

"آہ — بیچاری — تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی۔ شاید پتہ نہ معلوم ہو گا"

"جی ہاں' اب میں آپ کے مکان دار سے پتہ پوچھ کر یہاں تک چلا آیا"

لڑکے کو ہمراہ لئے فوراً اس کے گھر پہونچا۔ لڑکا میری آمد کی اطلاع کروانے اندر چلا گیا۔ مکان پر ایک قسم کی اُداسی اور موت کی سی خاموشی طاری تھی اور اس فضا سے متاثر ہو کر میرا دل بھی افسردہ ہو چلا تھا۔ قریب سے مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی — لڑکی پردے کے قریب کھڑی رو رہی تھی۔ تعزیتی طور پر میں نے چند تسکین و صبر کے جملے ادا کئے۔ اس کا آدھے سے زیادہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ پردہ کی آڑ سے نظر آ رہا تھا ——

میں نے کہا "رحمت! صبر و شکر سے کام لو — موت یقینی اور برحق ہے۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور راضی برضا رہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اپنی والدہ کی بے وقت موت سے بے حد صدمہ گزرا — مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے — تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ جمیل تو میرا اپنا بھائی ہے — تم بلا پس و پیش اپنی ضرورت کا مجھ سے اظہار کیا کرنا — آخر میں تمہارا ہمسایہ ہوں۔ اور ہمسایہ کو ایک دوسرے پر پورے پورے حقوق حاصل ہیں"

میں ہفتہ میں دو ایک مرتبہ اس کے گھر جاتا — کچھ سلائی اور پڑھائی کا کام رحمت کو مل گیا تھا۔ اب وہ قدرے سکون کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

کچھ دنوں کے لئے میں اپنی والدہ کی علالت کے سلسلہ میں وطن چلا گیا تھا اور وہاں ایک ہفتہ گزار کر اپنے مستقر پہونچ گیا۔ دفتر کے چپراسی سے معلوم ہوا کہ جمیل ایک دو مرتبہ مجھ سے ملنے کے لئے آ کر گیا اور جب میں دفتر برخاست کر رہا تھا وہ آ پہونچا —

"اچھے تو ہو جمیل" میں نے خیریت دریافت کی۔

"ہاں — آپا نے آپ کو پوچھا ہے"

"کل چھٹی کا دن ہے' حاضر ہوں گا"

پہلی مرتبہ مجھے مکان کے اندر بلایا گیا — معمولی مختصر سا مکان' جس میں دیوان خانہ ہے نہ حمام' ایک چھوٹا سا دالان — جس کا کچھ حصہ باورچی خانہ کے لئے وقف کیا گیا تھا۔ صحن بہت چھوٹا ——

یہ دیں ——— مکان قرینہ سے سجا ہوا صاف ستھرا تھا۔ چٹائی پر بچھی ہوئی دری اور اس پر پڑی ہوئی سفید چادر پر جمیل نے لا بٹھایا اور خود باہر چلا گیا۔

"یہ جمیل کہاں چل دئے" ———

"بازار گیا ہے" پردے سے آواز آئی ——— اس اثنا میں جمیل آگیا

"ارے میاں! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے" ——— میں نے اپنے متعلق کچھ اہتمام دیکھ کر کہا۔

رحمت آپا کہتی ہیں "کہ آپ کچھ کھائے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتے"۔

"بھئی، تم اپنی رحمت آپا سے کہہ دینا، اس کی کیا ضرورت ہے" اب مجھے جمیل کے بجائے رحمت سے یہ جواب ملا۔

" اور اس کی کیا ضرورت ہے کہ آپ خواہ مخواہ کے ہمارے لئے تکلیف اٹھائے جاتے ہیں"

" ہمدردی کے معنی اگر تکلیف کے ہیں ——— تو ایسی ہمدردی سے باز آیا" ——— دو بڑی بڑی ہنستی ہوئیں آنکھیں، دفعتہً میری نظروں نے پردہ کی آڑ میں ایک حسین مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا۔ اف خدا! میری نظریں ٹھٹک کر رہ گئیں ——— غیر ارادی طور پر میرے منہ سے آہ نکل کر رہ گئی

جب میں رحمت کی دعوت کھا کر اپنے گھر روانہ ہوا، میرے پیر ایک شرابی کی مانند لڑکھڑانے لگے، دل حسین فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا، اور آنکھوں میں ایک قسم کی کیف آور خوشی ناچنے لگی، اب میں رحمت کی محبت کے حسین و جمیل خواب دیکھ رہا تھا۔

ایک دن مجھے رحمت کی چٹھی ملی۔ کسی ضروری مشورہ کے لئے اپنے گھر بلایا تھا۔ وہ تنہا تھی اور جمیل اسکول جا چکا تھا۔ وہ تو پردہ کی آڑ میں ہو گئی ——— اور میں دری پر بیٹھ گیا "رحمت" میں نے کہا اب جب کہ جمیل گھر پر موجود نہیں، مرا یہاں آنا، کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

"یہی تو مشورہ طلب کرنے کے لئے میں نے آپ کو تکلیف دی ہے۔ میرے ایک قریبی عزیز کل مجھ سے ملنے آئے تھے ان کا خیال ہے کہ میں یہاں تنہا اور اکیلی پڑی رہتی ہوں زمانہ اچھا نہیں ہے ———

"پھر" میں کسی اور خیال سے چونک پڑا۔

" وہ کہتے ہیں، میں ان کے ساتھ وطن چلی جاؤں" ———

" اوہ! ——— میری زبان سے نکلا "ٹھیک تو ہے" ———

"آپ بھی یہی مشورہ دیتے ہیں؟"

میرا مشورہ بھلا کیا وزن اور وقعت رکھ سکتا ہے۔ میں آپ کا کوئی عزیز تو نہیں ——— ایک اجنبی ہمسایہ ———

" ایسی باتیں نہ کیجئے، مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے"

"جمیل کیا کہتا ہے اس بارے میں" ———

" وہ تو ایک منٹ کے لئے بھی راضی نہیں" ——— کل رات کہہ رہا تھا "میں تو فرید بھیا کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا" نادان کہیں کا، فرید بھیا تو کوئی اس کے بزرگ خاندان تو نہیں"

" بزرگ خاندان ہو کر کونسے تیر مارے۔ باپ کو مرکر چار سال ہوئے کسی نے ہمارے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھا تھا؟ جو اب ماں کے چلے جانے سے اس تنہائی اور بیچارگی کا احساس ہونے لگا ہے۔ سنئے! ہمارے لئے اس دنیا میں کوئی نہیں، ماں باپ کے ساتھ ساتھ سارے عزیز و اقارب مر گئے" جملہ کے اختتام پر اس کی آواز بھرائی۔

" رحمت" میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ نم آلود پلکوں کے ساتھ تقریباً میرے سامنے تھی۔ اپنے آنسوؤں کو اس طرح رائیگاں صرف نہ کرو ——— " مجھے تمھیں اس طرح افسردہ اور پریشان دیکھ کر بڑی روحی تکلیف ہوتی ہے ——— وعدہ کرتا ہوں ——— تم میری عزیز ترین دوست ہوئیں تمھیں ——— اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں"

"آپ ——— آپ ——— اس کے لب تھرائے" شدتِ جذبات سے وہ کانپ اٹھی۔

"آہ ——— آپ کتنے اچھے ہیں، وہ صرف اتنا کہہ سکی" ———

[illegible] خیالات کا حسین سہارا [illegible] گھر پہونچا اور ساری رات پُرلطف خیالوں [illegible] میں گذری ——

ان دنوں گھر پر میری شادی کے تذکرے ہو رہے تھے۔ والد چاہتے تھے کہ لڑکی تعلیم یافتہ اور مالدار ہو —— اور یہ صفات ان کی اپنی بھتیجی میں موجود تھے —— والدہ کا خیال تھا کہ اپنی بہن کی لڑکی کو بہو بنائے جو ایک معمولی خاندان کی —— معمولی پڑھی لکھی تھی —— اسی کشمکش میں دو ایک مہینے گزر گئے —— دونوں میں سے کوئی ایک بھی نتیجہ پر نہ پہونچ سکے بالآخر اس کا انتخاب میرے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا —— اب میری آزمایش کا بڑا نازک وقت آپڑا —— "فرض اور محبت" دو ایک دن میرے بھی کشمکش میں گزرے —— آخر کار رحمت کی محبت غالب آگئی۔ بہت جلد میں نے اپنے ارادے کا اظہار والدین سے کردیا جس کو دونوں نے خوشی خوشی منظور کرلیا۔

ادھر یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ ان حالات سے رحمت قطعاً ناواقف تھی۔ ایک دن علی الصباح میں اس کے گھر پہونچا۔ اس حرکت پر مجھے سخت ندامت رہی کہ میں بلا کسی اطلاع بے تحاشا اندر داخل ہوگیا، وہ ہنوز بستر راحت پر دراز تھی، بیتابانہ میں اس کی طرف بڑھا "رحمت! پیاری رحمت آج سے تم میری ہو، صرف میری! دنیا کی کوئی بڑی سی طاقت بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتی۔ آج سے تمہیں اس کلفت بھری درد انگیز زندگی کو خیرباد کہنا پڑے گا"۔ اس غم خانہ کو مسرت کی دیوی جلد سے جلد تمہیں اپنی آغوش میں لینے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ خوشیاں تم پر نثار ہونے کے لئے مضطرب ہیں"

رحمت، حسرت و مسرت کی درمیانی حالت میں مرمریں مجسمہ بنی کھڑی تھی، لیکن بہت جلد اس کی حیرت مسرت میں بدل گئی" ارے! کھڑی کیا ہو، جلد سے جلد سفر کی تیاریاں شروع کردو —— آج رات ہی کی ٹرین سے ہم وطن جارہے ہیں، وہاں ہمیں عروسی لباس میں دیکھنے کے لئے والدین، نہایت بے تابی کے ساتھ منتظر ہیں" —— وہ مسکرائی، جس طرح گلاب کی کلی نسیم صبح کے جانفزا جھونکوں سے مسکرادیتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی کیف آلود آنکھوں میں محبت آمیز جذبہ امنڈ آیا، اور دو انمول آبدار موتی دفعتہً ان آنکھوں میں نمودار ہوگئے —— یہ "خوشی کے آنسو" اس کے جذبات محبت کے بڑی حد تک آئینہ دار تھے

صابر کوسگوی

تصحیح:۔ سب رس بابت اکتوبر ۱۹۴۳ء کے صفحہ (۱۴) پر مرزا ادیب کا ایک افسانہ "جائے پناہ" شائع ہوا ہے۔ افسانہ کے ختم پر مرزا ادیب کے نام کی بجائے سہواً مظفر حسین اظہر شائع ہوگیا ہے، براہِ کرم قارئین اس کی تصحیح فرمالیں

اڈیٹر

رات کا بھولا اور دیگر افسانے:۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی، عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں۔ مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائٹیل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات (۱۶۸) قیمت عہ

بھاگ متی

(نثری خاکہ)

کردار۔ محمد قلی۔ گولکنڈے کا ولی عہد
ملا وجہی۔ قطب شاہی دربار کا شاعر۔ مصنف "قطب مشتری"
بھاگ متی چچلم کی حسین رقاصہ
سندر۔ بھاگ متی کی خادمہ
ملازم، نقیب، چوبدار، وغیرہ۔ زمانہ۔ سولویں صدی عیسوی۔ مقام۔ گولکنڈہ

:: جھنکارہ ::

داستان گو (گرج دار آواز میں) دو ہیچھے لی طرف اے گردشِ ایام تو
[کسی گرج کی آواز۔ تیز ہواؤں کا صوتی اثر۔ ناچ کی دھن تیز، تلخ دھیما ہوتے ہوتے ۔ پس منظر میں آجائے ۔]
مرد ۔ وقت کے دھارے کا رخ پھیر دیا گیا۔
عورت ۔ ہم اپنے حال سے ماضی کی طرف لوٹ آئے ۔
ع۱ یہ قطب شاہیوں کا دکن ہے ۔
ع۲ ۔ ان بادشاہوں کا سکہ رواں ہے یہاں جنھوں نے زندگی کے ہر شعبے کو سنوارا ہے ۔
ع۱ کیا ادب کیا شاعری
ع۲ تلنگی اور اردو ادب ان کی سرپرستی میں پروان چڑھ رہا ہے
ع۱ ہم اس وقت تمدن کے اس مبدائے نور پر ہیں ۔
ع۲ جہاں سے سارے دکن کو زندگی نواز حرارت اور روشنی ملتی ہے۔
ع۱ یہ ابراہیم قطب شاہ کا علاقہ ہے ۔
ع۲ گولکنڈہ وہ گولکنڈہ جہاں سے کوہ نور نکلتے ہیں ۔
ع۱ دیکھو ادب سے نگاہ روبرو جانتے ہو اس وقت ہم کہاں ہیں۔
ع۲ گولکنڈے کے ولی عہد محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں ۔
ع۱ دیکھ رہے ہو تزک و احتشام اس دربار کا ۔
ع۲ معلوم ہوتا ہے جنت زمین پر اتر آئی ہے ۔
ع۱ حسن دلنواز کی نمائش گاہ سمجھو اسے ۔
ع۲ زندگی صرف مسکراہٹ ہو کر رہ جاتی ہے یہاں ۔
ع۱ پژمردہ دل بھی ان گل عذاروں کے قہقہوں سے تازہ پھول بن جاتا ہے
ع۲ لیکن تم دیکھ رہے ہو محمد قلی قطب شاہ کو ۔

ع۱ ہاں گولکنڈے کے ولی عہد کے ماتھے پر شکن ہے
ع۲ ان کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھو ۔
ع۱ معلوم ہوتا ہے کسی گہری سوچ میں ہیں ۔
ع۲ ہاں اس انجمن میں رہ کر بھی وہ اکیلے ہیں ۔
ع۱ زبان اردو کا ہونے والا پہلا حکمران شاعر ع۲ ایک عظیم [illegible]
ع۱ جو ناگنٹے زمانہ ہے حاضر لئے ہوئے ۔ ع۲ نہ معلوم کیوں ولی عہد اس ماحول سے بیزار نظر آرہے ہیں ۔ ع۱ وہ دیکھو ملا وجہی ع۲ قطب مشتری کے مصنف
ع۱ ہاں وہی ملا وجہی درباری شاعر ع۲ وہ بھی حیرت سے ولی عہد کو منہ تک رہے ہیں کچھ کہہ نہیں سکتے ع۱ وہ دیکھو ولی عہد کا اک جنبش نظروں نے نقرئی قہقہوں کی قیمت گرا دی ع۲ دیکھو شاہی مغنی بھی موجود ہے۔
ع۱ ہاں ولی عہد نغمہ کے انتظار میں ہیں ۔ ع۲ وجہی نے ولی عہد کا دیوان مغنی کی طرف بڑھا دیا۔ ع۱ دیکھو وہ شروع ہی کرنے والا ہے اب خاموش ہو جاؤ

(پس منظر موسیقی اجاگر ہو جائے اور مغنی یہ غزل شروع کرے)

سنو لوگ میرے پریم کی کہانی — کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی
تن عشق بھیدیا ہے منج بالا بالا — ہوئی ہوں تن پیم سیں میں دوانی
محبت کی لذت فرشتاں کوں نہیں ہے — بہت سی ہوس میں یہ لذت پچھانی
جو کوئی عمر کھویا ہے ساجن ہوس میں — جیو لبھل وہی پائیا کریں جانی

(چند لمحے صرف پس منظر موسیقی)

ملا وجہی ۔ بہت خوب، بہت خوب۔ حضور! فدوی کی مجال نہیں کہ اس شعر کی تعریف کرے دہراتا ہے "محبت کی لذت فرشتاں کوں نہیں ہے" —
واہ، واہ یہ ذرۂ بے مقدار آفتاب عالم تاب کی تعریف کس زبان سے کرسکتا ہے لیکن حضور سچ عرض کرتا ہوں جی چاہتا ہے اس ایک شعر پر اپنا پورا دیوان نثار کردوں — اپنا پورا دیوان ۔
محمد قلی ۔ وجہی تم اس شعر کو صرف شعر سمجھتے ہو ۔ تم شاعر ہو وجہی دلوں کا حال جانتے ہیں شاعر ۔ تم شاعر ہو کر اسے شعر کہہ رہے ہو۔
وجہی یہ آہ ہے جس نے شعری لباس پہن لیا ہے ۔ تم اس غزل سے لطف اندوز ہو رہے ہو ۔ لیکن جانتے ہو ہمارے سارے زخم ہرے ہو گئے وجہی سارے ۔
وجہی ۔ حضور! اس درد و کرب کا سبب ۔ دیکھئے دنیا کی مسرتیں آپ کے لئے اپنا آغوش وا کئے ہوئے ہیں ۔ آج ہی عالم پناہ نے

[illegible] ایک [illegible] آپ کے حرم میں
[illegible] گولکنڈے کے ولی عہد کو
کس چیز کی کمی ہے - حسن، شعر، شراب
سب اس [illegible] اور کیا چاہئے ظل اللہ
محمد قلی - وجہی یہ سب ہمارے درد کا مداوا
نہیں - یہ ساری چیزیں ہماری نظر میں ہیچ ہیں
اگر کوئی ہم سے "چچلم" میں ایک گھنٹہ
گزارنے کے عوض یہ ساری راحتیں لے لے
تو ہم خوشی خوشی دے دینے تیار ہیں۔ ایرانی
یا افغانی حسن ہمارے لئے جاذب توجہ نہیں
ہوسکتا وجہی -
وجہی - ظل اللہ - ظل اللہ - آپ یہ کیا
فرماتے ہیں چچلم کی دیہاتی فضا گولکنڈے
کے ولی عہد کے لائق نہیں - نہیں ظل اللہ۔
محمد قلی - سونے چاندی کی چمک نے تمہاری
آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے - وجہی تمہاری
آنکھیں اس حسن کو نہیں دیکھ سکتیں جو چچلم
کے طول و عرض میں بکھرا ہوا ہے - "چچلم"
آہ "چچلم" میرے خوابوں کا مندر کیا اب
میرے لئے صرف اس کی یاد ہی باقی رہ جائے گی۔
نہیں یہ نہیں ہو سکتا ——
وجہی ! جہاں پناہ !
محمد قلی خاموش وجہی ! ہم جائیں گے ہم چچلم ضرور
جائیں گے - دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اپنے
ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی - ابا جان ہمیں
اس محل میں مقید کر کے رنگین کھلونے دل بہلائی
کے لئے دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خوش ہیں۔
(بجلی کی کڑک ! بادل کی گرج طوفانی ہواؤں
کا شور)

محمد قلی - کوئی ہے - (قدموں کی آواز)
خادم - ارشاد - عالی جاہ !
محمد قلی ! جاؤ ہمارا گھوڑا تیار کرو ہم اسی
وقت جائیں گے جاؤ جلدی کرو ——
وجہی - حضور اس طوفان میں -
محمد قلی ! ہاں وجہی اسی طوفان میں ——
طوفان و تلاطم ہمارا راستہ نہیں روک سکتے۔
ہمیں جانے دو - ہٹ جاؤ ہمارے راستے
سے ہمیں جانے دو ——
(قدموں کی آواز)

—— دوسرا ایکٹ ——

(ظل اللہ - ظل اللہ - آواز قریب سے دور
ہوتی ہوئی گزر جائے)
[طوفان و باد باراں گھوڑے کے ٹاپوں کی
آواز قریب سے دور ہوتی گزر جائے طوفان
باد باراں اس کے ساتھ موسیقی بھی جاری رہے]
ع۱ کسی نے کہا ہے ؎
شمس و قمر کی روشنی دیر و حرم میں ہو تو کیا
مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں
ع۲ محبت کا دیوتا اندھا ہوتا ہے -
ع۱ اسی لئے تیر چلاتے وقت مقامات اور
مراتب کا لحاظ نہیں کرتا -
ع۲ کہاں گولکنڈے کا ولی عہد کہاں چچلم
کی رقاصہ -
ع۱ لیکن جانتے ہو کوئی کام ....
ع۲ ہاں کوئی کام مشیت ایزدی کے بغیر
نہیں ہو سکتا -
ع۱ ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا -
ع۲ نہ معلوم اس ملاپ میں کیا مصلحت ہے

ع۱ تم گولکنڈے کے ولی عہد کا دربار بھی دیکھ چکے
اب ادھر آؤ -
ع۲ یہاں چچلم میں -
ع۱ ولی عہد کے خوابوں کی جنت ہے یہ -
ع۲ دیکھو وہ بھاگ متی اور اس کی خادمہ سندر۔
بھاگ متی - دیکھ رہی ہو سندر ! کیسی
طوفانی بارش ہے - موسیٰ ندی کو دیکھو کسی بپتا
کی ماری سندری کی آنسوؤں سے بھری ہوئی
آنکھ بن گئی ہے - آنسو ٹپکا اور سمجھو دنیا ڈوبی -
سندر - نہیں دیوی ! موسیٰ ندی چچلم کے
پاپ دھو رہی ہے -
بھاگ متی - نہیں معلوم سندر ! یہ پاپ دھو
رہی ہے یا اس کا سیلاب چچلم کو غرق کر کے رہے گا۔
سندر ! نہیں دیوی چچلم سے بھاگ بھاگ متی
سے وابستہ ہیں - وہ ڈوب نہیں سکتا - کون جانے
آئندہ یہ کیا ہونے والا ہے (گھوڑوں کے
ٹاپوں کی آواز دور سے)
دیوی دیکھئے ! وہاں ...... اس طرف ....
وہ ایک سوار - ہاں وہی دیکھئے ادھر ہی آ رہا ہے
اگر میری آنکھیں دھوکہ نہیں دے رہی ہیں تو میں
سمجھتی ہوں اپنے ہی شاہزادے کا گھوڑا ہے۔
بھاگ متی ! کیا کہا سندر ؟ شاہزادے کا
گھوڑا - پاگل تو نہیں ہو گئی - وہ بھلا اس
طوفان میں چچلم آئیں گے - گولکنڈے کا شاہزادہ
اور چچلم میں - قسمت کے کھیل بھی کیسے نرالے ہیں۔
(گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز قریب آ جائے)
سندر ! نہیں دیوی میری آنکھیں مجھے
دھوکہ نہیں دے سکتیں - وہ ہمارے
شاہزادے ہی ہیں اور ادھر آ رہے ہیں -

یہ جلدی اپنے احاطے میں آ گئے - شاہزادے
بھاگ متی ! سندر دروازہ کھول جلدی -
(قدموں کی آواز میں جیسے کچھ گڑبڑ ہے چند لمحے)
بھاگ متی ! - جہاں پناہ - آپ - اس وقت'
یہاں ! - میں کوئی خواب تو نہیں دیکھتی -
محمد قلی - نہیں بھاگ متی یہ خواب نہیں حقیقت
ہے - خواب کہہ کر ہماری لذت نظر کو بھی تو کم نہ کرو
بھاگ متی ! ہائے آئی سندر - ٹھیک ہے -
جہاں پناہ یہ خلعت بھیگ گئی ہے - آپ ذرا
یہ تن پوش ---
محمد قلی بھاگ متی تمہیں ہمارا اتنا خیال -
بھاگ متی ! کنیز ہوں جہاں پناہ ---
محمد قلی - اچھا - لاؤ - (پس منظر موسیقی چند لمحے)
بھاگ متی ! جہاں پناہ بھاگ متی کے
بھاگ جاگ گئے جو آپ نے اس جھونپڑے
کو رونق بخشی ...... لیکن ....
محمد قلی - لیکن کیا بھاگ متی ! تم کہتے کہتے رک
کیوں گئیں کہو کیا کہنا چاہتی ہو -
بھاگ متی ! ظل اللہ ! میں سمجھتی ہوں
میرے بھاگ جاگے ہیں منقریب سونے کے
لئے - آپ میری زندگی پر شہاب ثاقب
کی طرح چمک کر غائب ہو جائیں گے اور میری
زندگی کو ہمیشہ کے لئے تاریک کر جائیں گے -
بادشاہ سلامت ! اس وقت میں ایک سپنا
دیکھ رہی ہوں خوش گوار جس سے مجھے جلد
بیدار ہونا پڑے گا اس وقت میرے پاس
کچھ نہ ہوگا سوائے چند حسین یادوں کے -
آپ جب بادشاہ ہو جائیں گے - امور سلطنت
میں منہمک ہو کر یہ بھی بھول جائیں گے کہ
آپ بھاگ متی نام کی کسی ہستی کو پہچانتے تھے -
محمد قلی ! نہیں بھاگ متی ! یہ سپنا اس وقت
حقیقت بن جائے گا - ہماری محبت کی
ہم ایک دائمی یادگار بنائیں گے - تاکہ
ہمارے بعد بھی آنے والی نسلیں ہماری پریم
کہانی کو گاہ گاہ یاد کیا کریں - "پریم"
فانی نہیں "امر" ہوتا ہے بھاگ متی -
یقین ہے زمانہ کا بے رحم ہاتھ ہماری اس
یادگار کو فنا نہیں کر سکے گا -
بھاگ متی ! - آپ کس قسم کی یادگار
بنائیں گے جہاں پناہ !
محمد قلی ہم تمہیں اپنی محبت سے غیر فانی بنا
دیں گے بھاگ متی ! مادی روحانی دونوں
طریقوں سے' ہماری شاعری کا باعث
تم ہو - لہٰذا جب تک اُردو زبان زندہ
رہے گی - تم بھی زندہ رہو گی - اس وقت
کا تصور کرو جب تمہارا ایک عظیم الشان خوبصورت
شہر بن جائے گا جس میں ہر طرف علم و
فضل کے چشمے بہیں گے - دیکھ لینا ہمارا
بسایا ہوا یہ شہر جس کی بنیاد محبت پر ہے -
مستقبل میں ہندوستان کے لئے
"مشعل راہ" ثابت ہوگا - یہاں امن
اور شانتی' اتحاد و اتفاق کی سوتیں
پھوٹیں گی - ادب و زبان تہذیب و
ثقافت کی تعمیر ہو گی - یہ ہندوستان
کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کریگا -

تیسرا ایکٹ

ع ۱ - اتنی گڑبڑ کیوں ہے -
ع ۲ - جانتے ہیں ! آج محمد قلی قطب شاہ کی
تخت نشینی کا دن ہے -
ع ۱ - بھاگ نگر کے بانی کی تخت نشینی -
ع ۲ - وہ ہو کیا داد و دہش ہے -
ع ۱ - تب ہی تو خوش لے دولت کی زیادتی
کے لئے گولکنڈہ کا لفظ استعمال کیا ہے -
ع ۲ - وہ دیکھو آسمانی چھتر کے نیچے بادشاہ
کی سواری نظر آ رہی ہے -
ع ۱ - خاموش ! نگاہ روبرو ---
ایک آواز ! - ادب سے نگاہ روبرو جہاں پناہ
تشریف لاتے ہیں -
وجہی ! جہاں پناہ ! جان کی امان پاؤں
تو ایک بات عرض کرنے کی جرأت کروں !
محمد قلی ! تمہیں امان ہے وجہی ! کہو کیا
کہنا چاہتے ہو -
وجہی ! جہاں پناہ ! گولکنڈہ کے تخت
کو آپ نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے جو
شرف بخشا ہے - بندہ اس کی خوشی میں
چند اشعار سنانے کی سعادت حاصل
کرنا چاہتا ہے -
محمد قلی ! ہم خوش ہوئے وجہی شروع کرو -
وجہی (تحت اللفظ شاعرانہ انداز میں
پڑھتا ہے)

کہتے پادشاہی کیا نیں ہے یوں
کہ کرتا ہے اب قطب شاہ جیوں
بسا شہ کے انصاف سے یوں دکن
کہ بستا ہے پانی سے جوں پھول بن
شہی جوں کئے شاہ عالی جناب
نہ دارا کیا دوں نہ افراسیاب

تجھ ہذی قطب شاہ تو
شہاں سب شاہ سے کہ ہے او تو
ترا عدل ایسا ہے جگ منہار
کہ آگ اور پانی رہے ایک ٹھار
محمد قطب شہ ترا ناؤں ہے
ہما سو ترے پاؤں کا چھاؤں ہے
تو گیانی تو دانی تو داتا رہے
تو فاضل تو کامل تو اوتار ہے
تو ایسا سخی ہے ترے دھرم سے
دریا لائے کف ہنر پر شرم سے

محمد قلی ! وجہی ہمیں تم پر رشک آتا ہے۔ کوئی ہے۔ (حاضر جہاں پناہ) جاؤ وجہی کو سونے میں تو لو۔ اچھا اب دربار برخواست کیا جاتا ہے۔ وجہی تم ابھی ٹھیرو۔ مابدولت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

وجہی ! ارشاد عالی جاہ!

محمد قلی ! دیکھو وجہی! اب ہم خود مختار ہو گئے ہم اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ ہم بھاگ متی کو گولکنڈہ کی ملکہ بنانا چاہتے ہیں۔

وجہی ! بہت مناسب ہے حضور! اگر آپ اجازت دیں تو ایک نذر پیش کرنے کی جرأت کروں۔

محمد قلی ! تمہیں اجازت ہے وجہی! پیش کرو کیا پیش کرنا چاہتے ہو ——

وجہی ! جہاں پناہ آپ کی محبت کی یادگار میں۔ ایک مثنوی "قطب مشتری" لکھی ہے۔ وہ میں اس وقت حضور کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

محمد قلی ! بہت خوب! نہایت اچھی! وجہی اس کے ساتھ تم نے اپنا نام بھی زندۂ جاوید کر دیا۔ یہ اپنے زمانے اور زندگی کی ترجمان ہے۔ وجہی اسے تم نے جس زبان میں لکھا ہے معلوم ہوتا ہے ایک دن یہ زبان سارے ہندوستان پر چھا جائے گی۔

—— چوتھا ایکٹ ——

[فلمی ریکارڈ لگایا جائے "آیا بسنت سکھی برہا کا انت سکھی بن بن میں چھائی بہار]
(اس کے بعد مختلف پرندوں کوئل پپیہے وغیرہ کی پکار کا صوتی اثر پیش کیا جائے)

ع۱ بسنت آگیا

ع۲ ہاں بسنت آگیا۔ محمد قلی کی جیون پھلواری میں بسنت آگیا۔

ع۱ دیکھو شاہی محل میں بسنت منائی جا رہی ہے

ع۲ یہ قطب شاہی دور کی خصوصیت ہے۔ تیوہار ایسے ہیں جن میں بلا اختلاف مذہب و ملت سب حصہ لے سکتے ہیں۔

بھاگ متی ! اب معزز ملکہ حیدر محل ہے۔

ع۲ دیکھو جہاں پناہ اور ملکہ حیدر آباد فرخندہ بنیاد کے نئے محل کوہ طور میں داخل ہو رہے ہیں

(نقیبوں کی آوازیں دور سے آتی ہیں)

سندر (دوڑی ہوئی آکر) ملکہ جہاں پناہ تشریف لا رہے ہیں اور آپ یہاں ——

بھاگ متی ! ہاں سندر موسیٰ کی روانی نے مجھے اپنے دھار کے ساتھ آج سے تین سو سال آگے پہونچا دیا گیا۔ میں سوچ رہی تھی اب سے دو تین سو سال بعد یہ نو تعمیر شہر کتنا بدل جائے گا۔ کیا اس وقت ہماری پریم کہانی یاد رہے گی۔ سندر! جو اس شہر کی بنیاد کا باعث ہوئی۔

سندر - پریم کی یہ کہانی بھلائی نہیں جا سکتی ملکہ۔ وہ دیکھئے جہاں پناہ تشریف لا چکے ہیں۔

(نقیبوں کی صدا قریب آجاتی ہیں کے بعد قدموں کی آواز)

محمد قلی - ملکہ دیکھو ہم نے بسنت کی تقریب میں آج ہی یہ نظم کہی ہے۔ ہم اسے شاہی مطرب سے سننا چاہتے ہیں۔ کوئی ہے ——

(دو قدم آنے کی آواز)

ملازم - خداوند!

محمد قلی - شاہی مطرب کو حاضر کرو -

(قدموں کی آوازیں جیسے کوئی جا رہا ہے)

محمد قلی - ملکہ آج ہم بہت خوش ہیں - یہ ہماری پہلی بسنت ہے - ہماری جیون پھلواری کی پہلی بسنت -

ملازم - خداوند شاہی مطرب حکم کا منتظر ہے

محمد قلی - اجازت ہے شروع کرو ——

مطرب کا گانا -

بسنت کا پھول کھلیا ہے سو جیوں یاقوت رنگانی
کر و مل کر سہیلیاں سب بسنت کے تائیں جھانی
نزاکت شعر کے فن میں خدا بخشتا ہے تو تجھ کوں
معانی شعر تیرا ہے کہ یا ہے شعر خاقانی

(گانا فیڈ آن ہو جائے اور اس کے بعد روشن چوکی وغیرہ کی آوازیں شروع ہو کر پس منظر میں ہو جائیں)

ع۱ آج سارے بھاگ نگر میں دوہری خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔

ع۲ ایک بسنت دوسرے بادشاہ کی شخصی مسرت

ع۱ یہ ماحول اسی طرح شاداں و فرحاں رہے گا

ع۲ یہاں ہمیشہ امن و چین، اتحاد و اتفاق کی فضا قائم رہے گی۔

——(جھنکارہ)——

رفیعہ سلطانہ (عثمانیہ)

نئی کتابیں

۱۔ سزا (ناول) از قیسی رامپوری .... قیمت عاں ۱۲/ پتہ ادارۂ اشاعت اردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔
۲۔ گردشیں۔ از قدوس صہبائی 〃 عاں ۱۲/ 〃 〃 〃 〃 〃
۳۔ زلزلے 〃 〃 عاں ۱۲/ 〃 〃 〃 〃 〃
۴۔ قصص و مسائل از عبدالماجد دریابادی 〃 عہ ۱۲/ 〃 〃 〃 〃
۵۔ کردار 〃 ماہر القادری 〃 ۴ہر 〃 〃 〃 〃
۶۔ انگڑائیاں 〃 احمد ندیم قاسمی 〃 ۴ہر 〃 〃 〃 〃
۷۔ رنگین سپنے 〃 کوثر چاندپوری 〃 عاں ۱۲/ 〃 〃 〃 〃
۸۔ سیلاب 〃 احمد ندیم قاسمی 〃 ۴ہر 〃 〃 〃 〃
۹۔ زندگی کی ٹھوکریں 〃 رئیس احمد جعفری 〃 ۴ہر 〃 〃 〃 〃
۱۰۔ تقدیریں 〃 منظور بخاری 〃 عہ 〃 〃 〃 〃
۱۱۔ نیرنگ مقال (مجموعۂ کلام) از علامہ ضامن کنتوری 〃 عاں پتہ۔ کتاب منزل حویلی قدیم۔ حیدرآباد دکن
۱۲۔ ہماری درماندگی اور اس کا علاج۔ از ظہیر احمد ایچ۔ سی۔ ایس۔ قیمت۔ عاں۔ انڈیا بک ہاؤس۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن
۱۳۔ گیت ہی گیت۔ از میراجی۔ قیمت۔ عاں پتہ۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی
۱۴۔ شمع فروزاں (ناول) از صادق الخیری قیمت ۴ہر پتہ۔ خاتون کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی۔
۱۵۔ زہراب (ناول) از محمود احمد خاں۔ 〃 عہ 〃 〃 〃
۱۶۔ قید خانہ (افسانے) از پروفیسر احمد علی 〃 عہر 〃 رائل ایجوکیشنل بک ڈپو۔ 〃 〃
۱۷۔ تصویر۔ (ناول) از۔ اے۔ آر خاتون 〃 للعہ 〃 〃 〃 〃 〃
۱۸۔ تنقیدی جائزے۔ از ڈاکٹر سید احتشام حسین 〃 ہیے 〃 سید عبدالرزاق تاجر کتب۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔
۱۹۔ کنٹریکٹ برج۔ از محمد نصیر بی اے۔ 〃 عاں 〃 انڈیا بک ہاؤس۔ 〃 〃
۲۰۔ انقلاب (افسانے) از اعظم کریوی۔ حجم ۱۷۲ صفحے۔ قیمت عہر۔ پتہ۔ کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک۔ لکھنو۔
۲۱۔ ۱۹۴۲ء کے بہترین افسانے۔ مرتبہ حلقہ ارباب دانش۔ حجم ۱۹۸ صفحے۔ قیمت عاں 〃 〃 〃 〃
۲۲۔ لینن۔ مترجمہ تمنائی۔ حجم ۰ ۴ صفحے۔ قیمت ۵ر۔ پتہ۔ نیا سنسار کتاب گھر۔ بانکی پور۔ پٹنہ۔
۲۳۔ سرگزشت حاتم (شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات) از۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ حجم (۱۲۸) صفحے۔ قیمت عاں۔ پتہ۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد
۲۴۔ نفسیات زندگی۔ از شیر محمد اختر۔ قیمت۔ عاں۔ پتہ۔ ادارۂ اشاعت اردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔
۲۵۔ لالہ زار داغ (منتخب مصرعے اور اشعار) از فرحت جہاں۔ ۳۲ صفحے۔ قیمت ۵ر پتہ۔ خاتون کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

یہ دنیا ہے از نجم الدین صاحب شکیب ۔ حجم ۱۶۲ صفحے قیمت عا/
ناشر ۔ کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ ۔

جناب نجم الدین شکیب نے ناول "یہ دنیا ہے" نہیں لکھا بلکہ زندگی کی مختلف پُرپیچ راہوں کے چند نشانات دکھائے ہیں ۔ راج محلوں کی رنگیلی دنیا' عورت کے مختلف روپ' سرمایہ دار کی بوالہوسی' مزدور کی غیرت' قسمت کے کھیل' تدبیر کی بے بسی' لیڈری کی اصلیت' مذہب کا جنون' طوائف کا دکھ اور سماج کے گندے رستے اور ناسور سبھی اس تصویر میں آپ اجاگر دیکھیں گے۔ اس کے کردار تخیلی نہیں بلکہ موجودہ دور کے زندہ کردار ہیں ۔ ہر گناہ کی تفصیل موجود ہے ۔ لیکن پڑھ کر گناہ سے رغبت نہیں نفرت محسوس ہوتی ہے ۔ یہی ایک لکھنے والے کا کمال ہے ۔ لاکھوں گناہ کرنے والا محوری کردار اپنے ضمیر کی وجہ پاکباز ہی رہا

زبان ستھری ہے' طرز بیان دلچسپ ۔ بعض جملے تو نہایت نفیس و نازک ہیں ۔ "گناہ اتنا نیچا نہیں جتنے گناہگار کے آنسو اونچے ۔" اور "مذہب روح کی آواز نہیں جسم کا لباس بن گیا ہے ۔" کہیں کہیں بے ربطی بھی ضرور ہے ۔ اگر قابل مصنف نے کتاب کے مختلف باب قائم کئے ہوتے تو بہتر تھا ۔ کہانی کی ابتداء اور عروج نہایت شاندار ہیں ۔ لیکن خاتمہ کمزور ہے ۔ ایسے لگتا ہے کہ آخری حصہ نہایت جلدی میں لکھا گیا ہے ۔ اختتام بھی ابتداء کا سا ہوتا تو ناول زیادہ موثر ہوتا ۔ کیونکہ ناظر پر آخری حصہ ہی زیادہ اثر انداز ہوتا ہے ۔ شکیب آئندہ اس سے بہتر لکھ سکیں گے ۔ ان کی یہ دنیا تو کافی کامیاب ہے ۔

ویراں از مرزا سرفراز علی بی اے (عثمانیہ) ایچ ۔ ڈپ ۔ ایڈ (ڈبلن) حجم ۱۰۲ صفحے قیمت عہ/ ۔ ناشر ۔ کتاب خانہ انجمن ترقی اردو عابد روڈ ۔ حیدرآباد دکن ۔

مرزا صاحب کے بارہ مختصر اور نہایت مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ سب مختلف پرچوں شہاب' نگار' داستان گو' مجلہ عثمانیہ اور مجلہ طیلسانین میں شائع ہو چکے ہیں ۔ یہ مرزا صاحب کے طالب علمی کے افسانے ہیں ۔ اس لئے بار بار خامکاری کا احساس ہوتا ہے ۔ طرز بیان شگفتہ اور پلاٹ میں اکثر جان ہے ۔ لیکن افسانوں کو اچھی طرح بنایا نہیں گیا ۔ خصوصاً ہر افسانہ کا اختتام نہایت کمزور ہے ۔ "دیار مغرب" اس مجموعے میں نہایت دلچسپ ہے ۔ "اور غلط فہمی" باوجود مختصر ہونے کے نہایت حسین ہے محاورہ کی غلطیاں زیادہ ہیں ۔ مرزا صاحب اگر اب لکھیں تو یقیناً ان افسانوں سے کہیں زیادہ بہتر لکھ سکیں گے ۔

اتحادی افسانے از جناب حکیم مظفر حسین اظہر دہلوی ۔ حجم ۲۰۶ صفحے قیمت عہ/ ۔

ناشر ۔ شاعری کالج ۔ اندرون لوہاری دروازہ انارکلی ۔ حلقہ (۳۹) لاہور ۔ یہ اتحادی افسانے موجودہ اتحادیوں کے متعلق افسانے ہیں جو جنگ عالمگیر لڑ رہے ہیں ۔ بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی سیدھی سادھی پرانی کہانیاں ہیں ۔ طرز بیان بغیر عشق و محبت کے بھی دلچسپ بنایا جا سکتا تھا ۔ بچوں کے لئے یہ قصے مفید تاریخی مطالعہ ثابت ہوں گے ۔ اظہر صاحب ہندو مسلمانوں کو ان کی پرانی دوستی کی یاد دلا رہے ہیں ۔ لیکن پیرایہ دلچسپ ہوتا تو بہتر تھا ۔

انقلاب از ڈاکٹر اعظم کریوی ۔ حجم ۱۲۷ صفحے ۔ قیمت عہ/
ناشر ۔ کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ ۔

ڈاکٹر اعظم کریوی نے اپنے بارہ ایسے مختصر افسانوں کو یکجا کیا ہے جن کا محوری خیال "انقلاب" ہے ۔ ڈاکٹر صاحب اردو افسانہ نویس کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں ۔ پریم چند کے انداز پر لکھنے والوں میں اب سب سے آگے ہیں ۔ ہندوستانی تہذیب ان کے ہر افسانہ میں سانس لیتی ہے ۔ موجودہ ترقی انھیں پسند نہیں کیونکہ یہ ہمیں زیادہ سے زیادہ خود بیں اور زر پرست بنا رہی ہے ۔ وہ بصیرت کھو کر بصارت لینا نہیں چاہتے ۔ آنکھیں اندھی رہیں لیکن دل روشن ۔ یہی حقیقی کامیابی ہے ۔ مادہ پرست تہذیب نے کونسا انقلاب پیدا کیا ہے؟

وہ بچے ہر افسانہ میں اسی کی تفسیر کرتے ہیں۔ سرورق عنوان کی اچھی تشریح کرتا ہے "دن کی روشنی میں" زیر نظر مجموعہ کا سب سے اچھا افسانہ ہے۔ زبان بے عیب ہے۔

لینن | ترجمہ تمنائی۔ حجم ۴۸ صفحے۔ قیمت ۵ر

ناشر:۔ نیا سنسار کتاب گھر۔ بانکی پور۔ پٹنہ

اشالین کی نظروں میں لینن کا کیا مقام ہے؟ وہ اس کتابچہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ لینن کی زندگی نے روس کو کیونکر زندہ کیا اور مر کر بھی وہ کیسے زندہ ہے؟ اشالین نے اپنے مختلف مضامین میں اس کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ بڑے آدمیوں کی زندگی کا مطالعہ پڑھنے والوں کے کردار پر نامحسوس لیکن تعمیری اثر ڈالتا ہے۔ نئے ادب کے ترقی پسند عنصر کو سمجھنے کے لئے تو لینن کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ "لینن انقلاب کا تخلیق کار" اس مجموعہ کا سب سے بہتر مضمون ہے۔ لیکن یہ کتابچہ لینن کے مکمل حالات پر روشنی نہیں ڈالتا۔ صرف اس کے کردار کے چند پہلو روشن کرتا ہے۔

سرگذشت حاتم | مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ۔ حجم ۱۲۸ صفحے۔ قیمت عا

ناشر:۔ سب رس۔ کتاب گھر۔ خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن۔

ڈاکٹر صاحب نے دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعرا شاہ ظہور الدین حاتم کے حالاتِ زندگی نہایت تحقیق و تفصیل سے لکھے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے کلام پر ذمہ دارانہ تبصرہ کیا ہے۔

حاتم 'سودا' اور 'تاباں' جیسے اساتذہ کے استاد تھے۔ نظم و غزل دونوں میں ملکہ حاصل تھا۔ اُن کا یہ شعر اردو شاعری کے ایامِ طفلی میں کہا گیا تھا ؎

برس میں وہ کبھی برسے ہے، یہ برسوں سے برسے ہے
مقابل مت کرو باراں سے میری چشم گریاں کو

اردو شاعری کے ان محسنوں کو زمانہ نے اگر بھلایا نہیں تو ان کے شایانِ شان یاد بھی نہیں رکھا۔ ضرورت ہے کہ ان کے حالات روشنی میں لائے جائیں۔ حاتم کو ان کا یہ تذکرہ یقیناً حیاتِ نو بخشے گا۔

نمود و راز | مصنفہ محترمہ آنسہ محمودہ رضویہ۔ مدیرہ مجلہ شعاع

حجم ۲۰۹ صفحے۔ قیمت عا

مقام اشاعت:۔ دار الاشاعت انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔

"نمود و راز" آنسہ محمودہ رضویہ صاحبہ کراچی کے لکھے ہوئے چند مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بھی موصوفہ نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ طرز بیان کو دلکش و حسین بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن فارسی ترکیبوں کا بے جا استعمال ضرور کھٹکتا ہے۔ افسانوں میں حقیقت سے زیادہ تصور سے کام لیا گیا ہے۔ ہم رضویہ صاحبہ سے آئندہ اس سے بہتر کی امید رکھتے ہیں۔ کراچی سے نسوانی ادب کی یہ پہلی شعاعیں ہیں۔ اس حیثیت سے موصوفہ کے افسانے قابل تعریف ضرور ہیں۔

گھی شکر | از جناب محمد شفیع الدین نیر

حجم ۵۱ صفحے۔ قیمت ۶ر مقام اشاعت:۔ جامعہ ملیہ (دہلی)

اس کتاب میں نیر صاحب نے بچوں کے لئے سادہ و منظوم معمے لکھے ہیں۔ ہر نظم "میں کیا ہوں بتلاؤ تم پھر گھی و شکر کھاؤ تم" سے شروع ہوتی ہے۔ بچے نظم پڑھ کر خود ہی پہیلی بوجھ سکتے ہیں۔ ایسی نظمیں بچوں کو بہت زیادہ پسند ہوتی ہیں۔ جس میں انھیں اپنی عقل سے بھی کام لینا پڑے۔ کتاب کے آخر میں ہر نظم کا حل تصویروں کی شکل میں موجود ہے۔ 'مور' اور 'کتاب' والی نظمیں تو بے حد اچھی ہیں۔ یہ بچوں کو گھی شکر سے تو کیا چاکلیٹ اور ٹافی سے بھی بڑھ کر پسند آئیں گی۔ امید کہ نیر صاحب آئندہ بھی بچوں کے لئے اس قسم کا ادب مہیا کرتے رہیں گے۔

نئی کہانیاں | از جناب محمد شفیع الدین نیر

حجم ۶۳ صفحے۔ قیمت ۹ر سرورق رنگین۔ طباعت اچھی۔

مقام اشاعت۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ۔ دہلی

بچوں کے محبوب شاعر جناب نیر نے ننھے بچوں کے لئے نہایت اچھی منظوم کہانیاں لکھی ہیں۔ زبان آسان ہے۔ تصویروں سے جا بجا نظموں کی تشریح بھی کی گئی ہے "کہانی ہے یہ موٹر کی" اور "ضدی بچہ" تو نہایت پیاری نظمیں ہیں۔ یہ کہانیاں صرف

کہانیاں ... ان کے لئے معلومات کا دلچسپ ذخیرہ بھی ہیں۔ ... مبارک باد ہے کہ اس نے ننھے بچوں کے لئے اس قسم کی نہایت عمدہ کتابیں شائع کی ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بچوں کو اس قسم کے پاکیزہ اور آسان ادب کی بہت ضرورت ہے۔ یہ کتاب بچے ضرور پسند کریں گے۔

لالہ زارِ داغ | مرتبہ نزہت جہاں صاحبہ

حجم ۔ ۴۴ صفحے ۔ قیمت ۸؍ مقام اشاعت :۔ خاتون کتاب گھر اُردو بازار ۔ دہلی ۔

محترمہ نزہت جہاں صاحبہ نے فصیح الملک استاد داغ دہلوی کے کلام سے پسندیدہ دو سو مصرعے اور تین سو اشعار کا انتخاب کیا ہے ۔ کافی اچھا انتخاب ہے ۔ گو بعض جگہ معمولی اشعار کو بھی جگہ دی گئی ہے ۔

ایک شاعر کے سو شعر | از میر جہانگیر علی خاں صاحب قدسی لکچرار فارسی انٹر کالج گلبرگہ ۔

حجم ۳۲ صفحے ۔ قیمت درج نہیں ۔ مقام اشاعت :۔ مکتبہ علمیہ تیجر گنٹی ۔ حیدرآباد دکن ۔

یہ سو شعر جناب جہانگیر علی خاں صاحب قدسی کے کلام کا انتخاب ہیں ۔ موصوف نے خود ہی منتخب کئے ہیں ۔ بہتر ہوتا اگر کوئی اور سخن فہم یہ کام کرتا ۔ کیونکہ شاعر کو اپنا ہر شعر اچھا لگتا ہے ۔ اکثر آپ نے پامال مضامین باندھے ہیں ۔ بعض تو بہت اچھے بھی موجود ہیں ۔ مثلاً ؎

دل اگر ہے تو بہت داغ ہیں ارمانوں کے
کیا کمی اس کی گلوں کی جو گلستاں رکھے

شمع کا بھی عجیب عالم ہے
اپنے رونے پہ آپ ہنستی ہے

بچوں کا لندن | از آغا محمد اشرف ناشر حالی پبلشنگ ہاؤز دہلی

اس کتاب میں وہ مضامین اور قصے شامل ہیں جو لندن کی نشرگاہ سے آغا محمد اشرف صاحب نے موقع بہ موقع نشر کئے تھے اس زمانہ میں وہ لندن والے چچا کے لقب سے بی بی سی کا پروگرام سننے والے بچوں میں بہت معروف و مقبول ہو چکے تھے ۔ ان کا اسلوب بیان بہت سادہ اور رواں ہے ۔ ان کے جو مضامین اس مجموعے میں شریک ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی شخص لکھ نہیں رہا ہے بلکہ باتیں کر رہا ہے ۔ یہ مضامین اگرچہ زیادہ تر وقتی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جس شگفتگی سے لکھے گئے ہیں ان کی بناء پر یقین ہے کہ یہ ہر زمانہ میں شوق سے پڑھے جائیں گے ۔

عبدالحق اکیڈمی کی بچوں کی کتابیں

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس اثناء میں اردو میں بچوں کے ادب کی طرف خاص طور پر توجہ کی جا رہی ہے ۔ جامعہ ملیہ اور ادارۂ ادبیات اُردو کی جانب سے اس قسم کی جو کتابیں چھپتی رہتی ہیں ان کا تذکرہ اس سے قبل کیا جا چکا ہے اب عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد کی جانب سے بھی بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی بارہ کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کے مصنف مولوی شجاع احمد صاحب قائد ہیں ۔

شجاع احمد صاحب کو بچوں کی زبان اور نفسیات پر اچھا عبور حاصل ہے ان کی دو کتابیں کشمش نانی اور باتیں اس سے قبل ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے بھی چھپ کر بچوں میں بہت مقبول ہو چکی ہیں ۔ اس وقت ان کی جو بارہ چھوٹی چھوٹی کتابیں پیش نظر ہیں ان کے عنوان یہ ہیں :۔ کھٹی میٹھی پتیاں ، رابنسن کروسو ۔ لاڈلا اکبر ، پڑوسی ، عید ، چھو منتر کا دھاگا ، کپڑے ، چھتری فوج ، سادہ زندگی ، دسترخوان ، جنگ کے بعد کیا ہوگا ، سمندری جہاز ۔

یہ سب رسالے مکالمے کے انداز میں لکھے گئے ہیں اور ان کی زبان و اسلوب دلچسپ اور شگفتہ ہے جو لوگ بچوں کے ادب کے متلاشی ہیں وہ ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے ۔

فیصلہ کن جنگیں | از محمود خاں صاحب محمود ۔ ناشر :۔ ملک بک ڈپو لاہور ۔

اس کتاب کے مصنف تاریخ سلطنت خداداد اور تاریخ جنوبی ہند ....

کے مصنف کی حیثیت سے اردو کی دنیا میں معروف ہیں اور تاریخ کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندستان کی آٹھ ایسی لڑائیوں کا حال بیان کیا ہے جنھوں نے ہندوستان کی قسمت پر اثر ڈالا سب سے پہلے تھانیسر کی لڑائی کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو ۱۱۹۲ء میں دریائے سرسوتی کے کنارے پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لڑی گئی تھی۔ اس کے بعد پانی پت کی لڑائی کا حال لکھا ہے جو ۱۵۲۶ء میں ظہیرالدین بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جنگ کے چودہ سال بعد قنوج کی لڑائی ہوئی اور پھر پانی پت کی دوسری لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح تالی کوٹا، پلاسی، پانی پت کی تیسری لڑائی اور سرنگاپٹم کی لڑائیوں پر بھی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں بعض نقشے بھی ہیں اور آخر میں ایک ضمیمہ بھی شریک ہے۔ کتاب کی ترتیب اور حوالوں وغیرہ کے اندراجات کی بنا پر یہ کوشش تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے قابل داد ہے اور توقع ہے کہ مصنف ایسی تاریخی کتابوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور جنگوں کے بعد ان تحریکات اور واقعات کی طرف توجہ کریں گے جنھوں نے ہندوستان کی سماجی اور تمدنی دنیا میں انقلاب پیدا کیا اور جن کے باعث یہ ملک تہذیب و تمدن کی منزلیں طے کرتا گیا۔

ہمارے ہندوستانی مسلمان | مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین۔ ناشر:۔ اقبال اکیڈمی۔ لاہور۔

یہ اصل میں ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جس کے مصنف بنگال کے ایک سیویلین عہدہ دار ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر ہیں۔ اور اس میں مسلمانوں کے سیاسی نظریوں اور انگریزوں کے عہد میں ان کی بے چینی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن چونکہ ایک انگریز عہدہ دار کے قلم سے لکھی گئی ہے اس لئے ممکن ہے اس میں بعض امور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ناپسندیدہ ہوں تاہم اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کی مسلسل جد و جہد اور ذہنی کشمکش کا پتہ چلتا ہے اور بعض ایسی باتیں بھی منظر عام پر آتی ہیں جو اب تک تاریخی کتابوں میں شائع نہیں ہو سکیں۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے والے اس کے مطالعہ سے کافی مستفید ہو سکتے ہیں۔

کمپنی کی حکومت | از باری۔ ناشر مکتبۂ اردو لاہور۔

یہ کتاب ہندوستان کی سیاسی اور تمدنی تاریخ میں ایک مفید اضافہ ہے اور اس وقت تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں مغلوں کی سلطنت کے آخری دور سے لے کر ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام تک جو واقعات پیش آئے ان پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے۔ جو لوگ ہندوستان کی سیاسی جد و جہد کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے اس کتاب میں نہایت اہم اور ضروری تاریخی معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔

دستور الفصاحت | از حکیم سید احمد علی خاں یکتا لکھنوی۔ مطبوعہ ہندوستان پریس رامپور۔

کتاب خانۂ ریاست رامپور کی جانب سے جو مفید سلسلۂ مطبوعات شروع ہوا ہے اس کی یہ چوتھی کڑی ہے اور اس میں یکتا لکھنوی کی کتاب دستور الفصاحت کا وہ حصہ شائع کیا گیا ہے جو اردو شعرا کے تذکرے کے طور پر قلمبند کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے متعلق اس کے مرتب مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتاب خانۂ رامپور نے جو دیباچہ قلمبند کیا ہے وہ بجائے خود ایک جداگانہ کتاب ہے اور ۱۰۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مرتب نے اردو کے تمام تذکروں پر ایک عالمانہ تبصرہ کیا ہے۔ اور بعض امور میں ایسی تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے کہ ان کے اعلیٰ علمی ذوق کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ میری رائے میں ان کا یہ دیباچہ اس قابل ہے کہ اس کو علحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

اشارہ | مرتبہ تمنائی۔ ناشر۔ نیا سنسار پٹنہ۔

یہ بہار کے شعرائے اردو کے منتخب کلام کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو مرقع سخن کی طرز پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں بھی تقریباً پچیس شعرا کے مختصر سے حالات اور کلام کے

نو نہال ہیں۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سرزمین بہار میں معاصرین صاحبان فکر و نظر پیدا کر رہی ہے اور وہاں ہر طرح کی شاعری کا نشو و نما عمدگی سے ہو رہا ہے۔ دوسرے صوبوں میں بھی اگر ایسے ہی مجموعے مرتب ہو سکیں تو اردو ادب کی تاریخ اور اس کے جدید رجحانات کی نسبت مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

اس مجموعے کے مرتب تمنائی صاحب ہیں۔ انھوں نے اس کی ترتیب اور کلام کے انتخاب اور شعرا کے تعارف میں جس اعلیٰ ادبی ذوق کا ثبوت دیا ہے اس کی بنا پر یقین ہے کہ وہ بہار کے اردو ادب کے متعلق اردو دنیا کو اسی طرح واقف کرتے رہیں گے اور ہمارے ادبی ذخیرہ میں اضافہ کا باعث ہوں گے۔ "ق"

Modern Islam in India پروفیسر Wilfred Cantwell Smith کی انگریزی تالیف ہے جسے منروا بک شاپ نے انارکلی۔ لاہور سے شائع کیا ہے۔ کتاب چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ و کتابت اعلیٰ اور قیمت دس روپے سکۂ کلدار ہے، جو کسی قدر زیادہ ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ آئے دن بہت سی اردو اور انگریزی کتابیں مسلمانان ہند کے تمدنی، تعلیمی اور سیاسی مسائل سے متعلق شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن بہت کم ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جو تعصب، کوتاہ نظری، ذہنی انتشار اور فقدان معلومات سے پاک ہوں۔ چنانچہ ایک عرصے سے ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں مسلمانان ہند کی زندگی کے ہر پہلو پر عمرانی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ اس کو خود مسلمان علما نے محسوس نہیں کیا بلکہ لاہور کے کرسچین کالج کے تاریخ اسلام کے پروفیسر W.C. Smith نے اس اہم علمی خدمت کو نہایت ہی ذمہ داری اور حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کے اہم ترین شعبوں کا خالص عمرانی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا ہے۔ مولف کا تنقیدی معیار اتنا بلند اور قابلِ قدر ہے کہ اگر ہمارے علما اور نقاد، تمدنی، تعلیمی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے "معیار" تسلیم کریں تو یہ ملک اور قوم کے حق میں نہایت مفید اور سود مند ثابت ہوگا۔

اصل کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں قابل مولف نے انیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر آج تک مسلمانان ہند میں جتنے بھی رہنما اور مشاہیر گزرے ہیں اور ان بلند مرتبہ شخصیتوں کی وجہ سے جو تحریکیں مسلمانوں میں چلی ہیں ان کے تمدنی، سیاسی افکارات اور تصورات اور ان تحریکوں کے نتائج پر .... سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اور بالخصوص عصرِ جدید کے ملت اسلامیہ ہند کے معمار سر سید احمد خاں اور اقبالؔ کے اثرات جو یہاں کے مسلمانوں پر پڑے ہیں انھیں نہایت ہی جامع اور واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں کتاب کے نہایت ہی دلچسپ ابواب وہ ہیں جو اقبال کی تعلیمات اور اس کے اثرات سے متعلق مختص ہیں۔ مولف نے اقبالؔ کے افکارات پر نہایت ہی عالمانہ نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے اور تنقید عالیہ کا وہ نمونہ پیش کیا ہے جو شاید ہی ہماری زبان میں کہیں پایا جائے۔ اقبالؔ فلسفی سے زیادہ ایک شاعر تھے۔ اسی لئے مولف کو اقبال کی شاعرانہ عظمت سے ذرا بھی انکار نہیں اگر اختلاف ہے تو اس کے پیام اور افکارات سے، لیکن یہ اختلاف تعصب اور لاعلمی کی بناء پر نہیں بلکہ خالص عالمانہ ہے۔ اسی لئے مولف نے اقبالؔ کے ترقی پسند رجحانات اور رجعت پسند خیالات کا تجزیہ کرنے میں انتہائی ہوشمندی سے کام لیا ہے اور بے جا جذبات کو کہیں دخل نہیں۔ دوسرے حصے میں مسلمانان ہند کی سیاسی جد و جہد اور کشمکش پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مسلمانوں کے موجودہ سیاسی مقصد "پاکستان" اور اس کے عواقب اور مضرات پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہرحال کتاب اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی خواہ وہ مسلمان ہو یا اور کوئی ضرور اس کا مطالعہ کرے۔ "ر۔ و۔ ع"

(ایک محزوں خیال دوست کے نام)

تیرے اس گریۂ پیہم سے بھلا کیا ہوگا؟
اشکِ غم آتشِ احساس بجھانے سے رہے!
نوجوانی کے سسکتے ہوئے پیاسے ارماں!
سینۂ زیست میں طوفان اٹھانے سے رہے!

تجھ کو معلوم ہے؟ اس غمکدۂ ہستی میں
زندگانی کبھی ہمرنگِ تمنا بھی ہوئی
قلبِ انساں کی تمناؤں کی رنگین بہار
ان خزاں بار فضاؤں کو گوارا بھی ہوئی؟

یہ جہاں ہاں یہ اندھیروں کا پُراسرار جہاں
آج تک جل نہ سکے جس میں مسرت کے چراغ!
تیری آزردہ و افسردہ تمناؤں کو
کس طرح دے گا بھلا فرصتِ تکمیلِ فراغ؟

مجھ کو دیکھ عمر کی اس خواب فزا منزل میں
کتنے ارمانوں کا دم گھونٹ کے بیدار ہوں میں
بل نہ آیا کبھی پیشانیٔ ناداری پر!!
پیہم پی کے حوادث کا بھی سرشار ہوں میں

کتنے طوفان مری کشتیٔ خودداری کو —
انتقامانہ تحکم سے بلاتے ہی رہے!
کتنے سرمایہ پرستی کے سبک سیر خیال
تند خوئی کو مری وجد میں لاتے ہی رہے

لیکن اے دوست زمانے کا عمل سوز نظام
مجھ کو پابندِ قوانینِ سکوں کر نہ سکا!
صرصرِ تلخیٔ ایام کی سوگند کبھی
میں نے احساس کی قندیل کو بجھنے نہ دیا

زندگی جبر نہیں روح جو بیدار رہے
تیرگی شعلۂ خورشید سے جل جاتی ہے
عسرت و نکبت و آلام کی سنگین چٹان
گرمیٔ سعیٔ مسلسل سے پگھل جاتی ہے

کھیل کچھ اور یونہی ظلمت آلام سے کھیل
اب کوئی دم میں ابھرنے ہی کو ہے ماہِ تمام
آرہی ہے افقِ شرق سے لیلائے حیات
اپنے ہاتھوں میں لئے بادۂ گلفام کا جام

لطیف ساجد

ادارے کی خبریں

تعلیم بالغان وامتحانات میسور

تاریخ ۱۷ اگست ۱۹۴۲ء روز یکشنبہ دن کے دس بجے

مجلس تعلیم بالغان و امتحانات کا اجلاس جناب عبدالقادر صاحب سروری پروفیسر جامعہ میسور کے مکان پر منعقد ہوا۔ حسب ذیل حضرات تشریف لائے تھے۔

۱۔ جناب شیخ عبدالغفور صاحب بی اے۔ بی ٹی وائس پرنسپل گورنمنٹ ٹریننگ کالج میسور (صدر)

۲۔ جناب ٹی عبدالقدوس صاحب بی اے۔ بی ٹی مددگار مدرس گورنمنٹ ٹریننگ کالج میسور ۳۔ جناب مولوی رکن الدین صاحب سالک اردو و فارسی معلم مہاراجہ ہائی اسکول میسور۔ ۴۔ جناب میر مرتضیٰ حسین صاحب بی اے۔ بی ٹی صدر مدرس اردو پریکٹسنگ مڈل اسکول میسور۔ ۵۔ جناب عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پروفیسر اردو جامعہ میسور۔ ۶۔ افضل العلماء سید عبدالحکیم صاحب معلم اردو و فارسی مہاراجہ ہائی اسکول میسور معتمد۔

کارروائی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

جناب عبدالقادر صاحب سروری نے ادارہ کے اغراض و مقاصد اور شعبۂ تعلیم بالغان و امتحانات کا لائحہ عمل منظورہ مجلس انتظامی پڑھ کر سنایا جو باتفاق آرا منظور کیا گیا۔ لائحہ عمل یہ ہے :۔

۱۔ عوام میں ان پڑھوں کی تعلیم کا چرچا کرنا اور ان باتوں کا احساس پیدا کرنا۔

۲۔ شبینہ مدارس قائم کر کے یا دوسری طرح پر ان پڑھوں کی تعلیم کا انتظام کرنا۔

۳۔ بالغوں کی تعلیم کی تحریکات میں اعانت کرنا۔

۴۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کو ان پڑھوں کی تعلیم کے لئے رضاکارانہ طور پر آمادہ کرنا۔

۵۔ میسور اسٹیٹ لٹریسی کونسل اور ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے امتحانات کے لئے لوگوں کو تیار کرنا۔

اس لائحہ عمل کو روبہ عمل لانے کے لئے مختلف تجاویز پیش کی گئیں بالآخر طے پایا کہ :۔

۱۔ مجلس میسور اسٹیٹ لٹریسی کونسل کے مدارس کا معائنہ کرے انکو جس طرح کی مدد کی ضرورت ہو اس کا انتظام کرے۔

۲۔ میسور اسٹیٹ لٹریسی کونسل کے فارغ التحصیلوں کو ادارہ کے امتحان زبان دانی کے لئے تیار کرے۔

۳۔ اپنے گھروں کو تعلیم یافتہ بنانے کی تحریک کو آگے بڑھانے میں پُر زور حصہ لے اور ہر رکن اس میں حصہ لے (جناب میر مرتضیٰ حسین صاحب نے خاص طور پر اس کا ذمہ لیا ہے)

۴۔ طے پایا کہ جو لوگ اپنے علمی و ادبی ذوق کو بڑھانے کے لئے ادارہ کے دوسرے امتحانات میں بیٹھنا چاہیں ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۵۔ طے پایا کہ جو لوگ جامعہ مدراس کے اردو امتحانات کے لئے تیاری کرنا چاہیں ان کی بھی مدد کی جائے۔

۶۔ اردو ٹائپ کے مختلف نمونوں کا معائنہ کیا گیا اور طے پایا کہ عام طباعت کے لئے جہاں تک ہو سکے دارالطبع حیدرآباد کا جدید عثمانیہ ٹائپ استعمال کیا جائے تو بہتر ہوگا اور اگر ممکن ہو تو ادارہ کی طرف سے ایک مطبع میسور میں قائم کیا جائے۔

۷۔ طے پایا کہ مسٹر ٹی کرشنا مورتی ایم اے لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج میسور کو اس شعبہ کی رکنیت کے لئے منتخب کیا جائے۔

بارہ بجے دوپہر کے قریب مجلس برخاست ہوئی۔

شاخ ادارۂ ادبیات اردو ناگپور

تاریخ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۲ء

ادارۂ ادبیات اردو شاخ ناگپور کی مجلس عاملہ کا ایک اہم جلسہ زیر صدارت مولوی عبدالستار صاحب فاروقی مدیر الفاروق کامٹی دفتر الفاروق میں چار بجے دن میں منعقد ہوا۔ جلسہ میں شامل

حکیمی نیفض انصاری، شاہد الہاشمی، عبدالستار اشرفی، صدیق فاخر اور منشی یعقوب عالی حضرات اراکین ادارہ شریک تھے۔ مندرجہ ذیل تجاویز کافی بحث و غور کے بعد منظور کی گئیں۔

۲۔ ادارۂ ادبیات اردو شاخ ناگپور کے قیام کے سلسلے میں اب تک جو خط و کتابت اور کام ہوا ہے اس کا جائزہ لیا گیا۔ اور طے پایا کہ مرکزی دفتر کے سکرٹری زور صاحب کا خط آتے ہی فوراً جلسہ طلب کیا جائے۔

۳۔ تعلیم بالغان کی اسکیم کے پیش نظر جو شبینہ مدارس جاری کئے جانے والے ہیں اس کے ابتدائی انتظامات شروع کر دیئے گئے۔ اور عید کے بعد اس سلسلہ کا پہلا شبینہ مدرسہ ناگپور کے کسی وسطی محلہ میں کھولا جائے۔

۴۔ ادارے کے شعبۂ تالیف و تصنیف کی تحریک کے مطابق صوبہ متوسط و برار کے نوجوان ترقی پسند اور منتخب شعراء کا ایک جامع تذکرہ بنام "سی پی کے موتی" شائع کیا جائے جس میں شاعروں کا منتخب کلام مع مکمل حالاتِ زندگی اور تصاویر ہوں گی۔

اس سلسلے میں مراسلت کی اجازت دی گئی اور تمام رفقاء نے ایک ساتھ روزہ افطار کر کے جلسے کو برخاست کیا۔

قیام ہندی

اردو امتحانات سنہ ۱۹۴۴ء

نمبر شمار	نام امتحان	شریک	حاضر	کامیاب: اول	دوم	سوم	جملہ	فیصد کامیابی	شریک: اناث	ذکور	مسلم	غیر مسلم
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳
۱	اردو فاضل	۳۰	۲۴	۰	۸	۹	۱۷	۶۶	۵	۲۵	۳۰	۰
۲	اردو عالم	۱۸۸	۱۴۳	۲	۱۲	۷۴	۸۸	۶۱	۵۶	۱۳۲	۱۷۲	۱۶
۳	اردو زباندانی	۴۶۷	۳۸۱	۴	۷۸	۱۳۸	۲۲۰	۷۱	۹۰	۳۷۷	۳۹۵	۷۲
۴	خوشنویسی	۹	۷	-	-	۳	۳	۴۳	۲	۷	۹	۰
		شریک	حاضر	کامیاب بجز امتیاز		کامیاب	جملہ	فیصد کامیابی	اناث	ذکور	مسلم	غیر مسلم
۵	اردو دانی	۸۲۲	۶۲۹	۹۴		۳۷۲	۴۶۶	۷۲	۱۴۱	۶۸۱	۶۹۳	۱۲۹

شعبۂ نسواں

حسبِ معمول کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس بتاریخ ۱۰ر جولائی ۱۹۴۳ء م ۴ر محرم ۱۳۶۲ھ ادارہ کے دفتر میں ساڑھے چار بجے منعقد ہوا۔ حسبِ ذیل اراکان نے شرکت کی۔

محترمہ ... بیگم صاحبہ صدر۔ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر شریک معتمد محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ۔ محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ۔ محترمہ ... بیگم صاحبہ اور معتمد شعبہ سکینہ بیگم صاحبہ۔

مارسیہ بیگم صاحبہ سعید النساء بیگم صاحبہ اور عظمت النساء بیگم صاحبہ (معتمد) نے شرکت سے معذرت چاہی۔

اجلاس کا آغاز سابقہ روئداد کی توثیق سے کیا گیا اس کے بعد اس سے متعلق امور پر جو عمل ہوا تھا اس کی وضاحت حسبِ ذیل کی گئی۔

(۱) (الف) شعبہ کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے نظامت تعلیمات سے درخواست کی گئی کہ وہ رقم جو اب تک ادارہ کو دیجاتی تھی اب شعبہ کے نام بحال کی جائے۔ نیز گورنمنٹ ... کی رقم شعبہ کو مدارس کے قیام کے لئے دلوانے کی بھی درخواست کی گئی۔ معتمد نے بالمشافہ ناظم صاحب سے مل کر شعبہ کے کاموں پر روشنی ڈالی اور اس کی دشواریوں سے روشناس کرایا۔ ناظم صاحب نے شعبہ کے کاموں سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرماتے ہوئے درخواست پر غور کرنے کا وعدہ فرمایا۔

(۲) مدرسہ کے نصاب کے متعلق معتمد نے ناظم صاحب سے گفتگو کی تھی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔

(۳) بزمِ ادب کا دوسرا جلسہ اقبال پر جیسا کہ طے پایا تھا۔ ... (نومبر ۱۹۴۳ء) میں بمقام محبوبیہ اسکول منعقد ہوا جس میں بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ بہادر اور بیگم صاحبہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر نے بھی شرکت فرمائی۔

(اس جلسہ کی تفصیلی رپورٹ سب رس بابت جنوری ۱۹۴۳ء میں شائع ہو چکی ہے)

(۴) معتمد شریک معتمد میں تقسیم کار کا مسئلہ ہنوز طے نہ پا سکا۔ اس ضمن میں شعبہ کے لئے قواعد و ضوابط کی شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے معتمد نے ایسے قواعد مرتب کر کے آئندہ اجلاس پر مسودہ پیش کرنے کا ذمہ لیا۔ اس کے بعد حسبِ ذیل امور زیرِ بحث رہے۔

(۱) شعبہ کے مصارف میں مزید اضافہ (۲) قیامِ مدرسۂ اطفال سرکاری بمقام اڈکمیٹ (۳) امتحاناتِ ادارہ (۴) اردو کانگریس (۵) بزمِ ادب (۶) قرار دادِ تعزیت (۷) دیگر امور۔

طے پایا کہ تاوقتیکہ سرکاری امداد نظامت تعلیمات سے جاری نہ ہو جائے مدارس کے لئے کوئی اضافہ منظور نہیں ہو سکتا۔

(۲) یہ خبر بڑی خوشی سے سنی گئی کہ اڈکمیٹ میں سرکاری طور پر ایک مدرسہ اطفال کا قیام عمل میں آیا ہے یہ گویا ہماری سہ سالہ کوششوں اور جد و جہد کا ثمر ہے۔ ہم نے خود اپنے مدرسہ اطفال کو سرکار میں لے لینے کی خواہش کی تھی لیکن اب جبکہ ایک سرکاری مدرسہ قائم ہو چکا ہے ہم اپنے مدرسہ کو اس میں ضم کر دینے آمادہ ہیں۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد شعبہ کے مدرسۂ اطفال کو سرکاری مدرسہ میں ضم کر دیا جائے گا۔

(۳) امتحاناتِ ادارہ حسبِ سال گزشتہ مدرسہ فوقانیہ نسواں نامپلی میں بتاریخ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ جولائی منعقد ہوں گے جن کی نگرانی حسبِ ذیل خواتین کے ذمہ کی گئی۔

۱۸ر جولائی۔ رابعہ بیگم صاحبہ۔ سعید النساء بیگم صاحبہ۔ تہنیت النساء بیگم صاحبہ

۱۹ر " عظمت النساء بیگم صاحبہ۔ بلقیس بانو صاحبہ۔ سکینہ بیگم صاحبہ

۲۰ر " بشیر النساء بیگم صاحبہ۔ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ۔ سعید النساء بیگم صاحبہ

(۴) اردو کانگریس کے سلسلہ میں معتمد نے ارکانِ شعبہ سے درخواست کی

کو انگلش کے اسکولوں میں نافذ کرنے کے متعلق اسکیم مدون کریں جس کا ارکان حاضرہ نے وعدہ کیا۔

(۵) بزم ادب کے تیسرے جلسہ کے لئے میر تقی میر کا انتخاب کرتے ہوئے جہاں بانو بیگم صاحبہ نے شعبان کے آخری عشرہ میں اس کو پیش کرنے کا وعدہ کیا۔

(۶) فخر قوم و سلطنت نواب بہادر یار جنگ بہادر کی رحلت سے اردو زبان کو جو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے اس کو محسوس کرتے ہوئے شعبہ کی طرف سے حسب ذیل قرارداد تعزیت پیش کی گئی جس کو اراکین نے ایستادہ ہو کر منظور کیا اور جس کی ایک نقل مرحوم کی بیگم صاحبہ کے یہاں روانہ کی گئی۔

قرارداد تعزیت

اراکین شعبۂ نسواں ملک و زبان اردو کے بے مثل و نامور خطیب نواب بہادر یار جنگ بہادر کی بے وقت رحلت پر اپنے دلی جذبات الم کا اظہار کرتے ہیں نیز اردو کے لئے اس سانحۂ عظیم کو ایک ناقابل تلافی نقصان تصور کرتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہم سب ارکان شعبہ بیگم صاحبہ نواب بہادر یار جنگ بہادر کی خدمت میں گہرے رنج والم کے ساتھ اپنی مخلصانہ تعزیت پیش کرتے ہیں۔ شریک غم

رابعہ بیگم، جہاں بانو بیگم، بشیر النسا بیگم، لطیف النسا بیگم، نعیم ساجدہ بیگم، تصدق فاطمہ بیگم، بلقیس بانو بیگم، سلیمانہ بیگم، تہنیت النسا بیگم، عظمت النسا بیگم، سکینہ بیگم۔

۱۰ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء

(۷) ادارہ کے امتحانات کو مستند کرنے کے لئے معتمد صاحب امتحانات مولوی سید محمد صاحب سے استدعا کرنے کی رائے ہوئی کہ وہ سرکار میں اس کے لئے درخواست کریں۔

شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ بروز جمعہ بتاریخ ۱۸ آبان سنہ ۱۳۵۳ ف ادارہ کے دفتر میں صبح ساڑھے دس بجے منعقد ہوا حسب ذیل خواتین موجود تھیں۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر۔ محترمہ بشیر النسا بیگم صاحبہ شریک معتمد۔ محترمہ بلقیس بانو بیگم صاحبہ۔ محترمہ محل مولوی عبدالقیوم صاحب۔ محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ۔ محترمہ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ۔ محترمہ عظمت النسا بیگم اور معتمد شعبہ سکینہ بیگم صاحبہ۔

طے پایا کہ آغاز سنہ ۱۳۵۴ ف سے شعبہ کے مدرسۂ اطفال کو سرکاری مدرسہ میں ضم کر دیا جائے۔

بزم ادب کا جلسہ | اس دفعہ محبوبیہ اسکول میں کرنے کی باری ہے لہٰذا یہ تجویز ہوئی کہ لطیف النسا بیگم صاحبہ سے اس بارے میں معتمد ملاقات کر کے ماہ ذیقعدہ کے کسی دن اور تاریخ کا تعین کریں اور اس کے بعد اراکین عاملہ کو اس کی اطلاع کرائیں۔ نظام العمل لطیف النسا بیگم صاحبہ کے صوابدید پر منحصر ہوگا۔

چونکہ اس سے قبل لطیف النسا بیگم نے غالب کو اپنا موضوع قرار دیا تھا اس لئے معتمد نے تحریک کی کہ سعیدہ مظہر صاحبہ کا مضمون غالب جو خاص بچوں کیلئے لکھا گیا ہے اس موقعہ پر سنایا جائے۔ بلقیس بانو صاحبہ نے بھی "غالب کی بذلہ سنجی" پر ایک مضمون دینے کا وعدہ کیا۔ یہ ہر دو اور کچھ ناولز جن کا معتمد نے ذمہ لیا باجازت لطیف النسا بیگم پیش کئے جا سکیں گے۔

دستور العمل | حسب وعدہ معتمد نے اپنا مرتبہ کردہ مسودہ پیش کیا۔ ساتھ ہی یہ تجویز بھی پیش کی کہ اگر اراکین ان پر غور کر کے اپنی رائے دینا چاہیں تو ان کو اس کی نقلیں بھجوا دی جائیں تا کہ وہ اس پر

[illegible] سالانہ [illegible] پیش کر کے جسے اراکین نے منظور کیا۔
دیگر اراکین کو خریداری کے متعلق گزشتہ اجلاس
جلسہ [illegible] اراکین [illegible] ہوئی۔ اس کا حوالہ دیتے
ہوئے معتمد نے یہ تحریک پیش کی کہ [illegible] بیگم صاحبہ جو کہ اپنی صحت
کی وجہ سے شرکت سے مجبور ہیں اپنا انتخاب کی حیثیت رکن خصوصی
کے مجلس پر رکھا جائے اور ان کے عوض مجلس عاملہ کے لئے کسی اور
کا انتخاب کیا جائے۔

اس کے بعد معتمد نے تحریک کی کہ رکنیت عاملہ کے لئے رفیعہ سلطانہ
اور سعیدہ مظہر کے نام منظور کئے جائیں جس کی تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ
نے تائید کی اور دیگر اراکین نے بخوشی منظور فرمایا۔

دستور العمل کے قاعدہ ۱۲ فقرہ (۱) کے بموجب معتمد نے
رائے پیش کی کہ ذیلی مجالس کے لئے حسب ذیل تقسیم مناسب
ہوگی۔

مجلس بزم ادب .... داعی تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ
مجلس تعلیم و ترقی نسواں ..... " سعیدہ مظہر صاحبہ
مجلس ادب نسواں .... " رفیعہ سلطانہ صاحبہ

جس کو اراکین حاضرین نے پسند فرمایا۔

اس کے بعد ادارہ کی عمارت کا معائنہ ہوا اور جلسہ
برخاست ہوا۔

شاخ پربھنی

معتمد صاحب نے حسب ذیل رپورٹ روانہ
کی ہے۔ "چونکہ میرا تبادلہ پربھنی سے کندکور
تعلقہ دیگلور ضلع ننگنڈہ ہو گیا ہے۔ اس لئے مجبوراً ایک جلسہ عام
کر کے جدید کابینہ ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی ترتیب دی گئی
جو جلسہ عام [illegible] منظور کی گئی۔

میں اپنی خدمت معتمدی شاخ پربھنی سے سبکدوش ہو گیا
ہوں اور میری بجائے مولوی ناصر بن عبد الحبیب صاحب معتمد شاخ مقرر ہوئے
میری تمنا ہے کہ شاخ پربھنی ہمیشہ ترقی کرتی رہے [illegible]
گو رہ [illegible] سے لیکر [illegible] تک [illegible] سے جہاں تک ممکن ہوا
میں نے ادارہ کی خدمت انجام دی اور آئندہ بھی جہاں تک ممکن
ہو سکے ہر قسم کی امداد و تعاون کے لئے حاضر ہوں اور میری نیک
تمنائیں شاخ پربھنی کے ساتھ برابر رہیں گی۔"

شاخ پربھنی ۱۳۵۳ف کے لئے حسب ذیل کابینہ منتخب کی
گئی ہے۔

جدید کابینہ ۱۳۵۳ف | صدر۔ مولوی جلال الدین صاحب [illegible]
بی اے ایل ایل بی [illegible] گرداوری پربھنی۔
نائب صدر۔ مولوی مظہر علی خاں صاحب علیگ وکیل ہائیکورٹ پربھنی
معتمد۔ ناصر بن عبد الحبیب صاحب اردو فاضل۔
شریک معتمد۔ مولوی اشرف الدین صاحب نعیمی اردو فاضل منشی فاضل
خازن۔ حاجی محمد عبد الکریم صاحب جنرل مرچنٹ پربھنی
کتبخانہ دار۔ مولوی سید [illegible] صاحب اہلکار دفتر آبکاری پربھنی
اراکین انتظامی۔ مولوی شمس الحسن صاحب زبیری صدر مدرس فوقانیہ
پربھنی۔ مولوی عبد الرحمن خاں صاحب بی اے سب رجسٹرار پربھنی۔ مولوی
میر محبوب علی صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ۔ مولوی محمد [illegible]
صاحب۔ مولوی سید حبیب علی صاحب۔ مولوی سید خورشید حیدر صاحب [illegible]

روئداد جلسہ سالانہ شاخ پربھنی

ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی اور
بزم رندان (کلب) کا مشترکہ جلسہ سالانہ بتاریخ یکم آذر ۱۳۵۳ف
۶ بجے شام بتقریب سال نو زیر صدارت مولوی مرزا محمد مہدی
صاحب اول تعلقدار ضلع پربھنی منعقد ہوا۔ جس میں عہدہ داران
مقامی و وکلاء، علم و ادب سے ذوق رکھنے والے نوجوان اور
بکثرت عوام شریک تھے۔ جلسہ کا آغاز پرچم آصفی کی بلندی سے ہوا۔
معتمد ادارۂ ادبیات اردو نے ادارہ کی جانب سے اپنی رپورٹ

اور ادارہ کے مقاصد و بنیادی اصولوں پر مفصل الفاظ
میں تبصرہ کیا۔ پروگرام کے مطابق ایک تقریر اور ہر تقریر
کے بعد ایک نظم سنائی گئی۔

مولوی محمد جلال الدین صاحب اشک بی اے ایل ایل
بی امین کروڑگیری و صدر ادارہ ادبیات اردو پربھنی نے
جناب صدر و حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ دعائے سلامتی حضرت
اقدس و اعلیٰ و شاہزادگان بلند اقبال و شاہزادیان فرخ فال
پر جلسہ کا کامیاب اختتام ہوا۔

شب کے (۱۰) بجے حسب اعلان مشاعرہ مولوی محمد
جلال الدین صاحب اشک کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں
کافی تعداد شعراء و سامعین کی شریک بزم مشاعرہ ہوئی۔ طرحی
کے بعد غیر طرحی کلام بھی سنایا گیا۔ اور یہ ادبی مجلس دو بجے
شب تک نہایت سرگرمی کے ساتھ جاری رہی۔ سامعین بہت
محظوظ ہوئے۔ اور شعراء نے خاطر خواہ داد پائی

ناصر انصاری اردو فاضل معتمد

عطیۂ مخطوطات

پروفیسر احسن جاہ کاروانی صاحب مدیر شیلع ادب

کراچی نے سندھ کی اردو شاعری کا ایک قلمی مجموعہ ادارے کو بطور تحفہ
ارسال فرمایا ہے۔ اس کتاب میں کئی چھوٹے چھوٹے اردو و فارسی
رسالے بھی شامل ہیں اور اس کے تحقیقی مطالعے کے بعد اس کی تفصیلات
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد دوم میں شائع کی جائیں گی۔ ادارے کی جانب
سے جناب پروفیسر کاروانی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ انھوں نے کراچی
سے اور بھی قلمی کتب کی فراہمی کا وعدہ فرمایا ہے۔

مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اردو دکن کالج نے بھی
حسب ذیل قلمی کتب بطور تحفہ کتب خانۂ مخطوطات میں داخل کی ہیں۔
جس کے لئے ادارہ ان کا شکرگزار ہے۔

۱۔ شرح تہذیب فارسی۔ ۲۔ پنچھی باچھا اردو۔ ۳۔ گلستان فارسی
۴۔ تاریخ کیمیا اردو۔ ۵۔ قواعد عثمانیہ اردو۔

شعبۂ شعراء و مصنفین میسور

بتاریخ ۲۹ اکتوبر [illegible]

دفتر روزنامہ "آزاد" منگل بنگلور میں دن کے چار بجے اجلاس منعقد ہوا۔
حسب ذیل عہدہ دار و اراکین حاضر تھے۔

۱۔ صدر جناب فانی صاحب مدیر "فانوس"۔ ۲۔ معتمد جناب ڈاکٹر حکیم
عبد المستقیم خاں صاحب فاضل طب و جراحی سولی۔ ۳۔ جناب مولوی حسن شفیق بیگ
۴۔ جناب مولوی عبد الوہاب صاحب ایم اے بارایٹ لا صدر فورٹ ہائی اسکول
بنگلور۔ ۵۔ جناب عبد القادر سروری صاحب پروفیسر اردو مہاراجہ کالج میسور

(۱) شعبہ کا لائحہ عمل مرتبہ مجلس انتظامی ادارۂ ادبیات اردو۔
میسور منظور ہوا۔

(۲) طے پایا کہ شعبہ کی کارکردگی میں اضافہ کے لئے حسب ذیل
عہدہ داروں و اراکین کو شامل کیا جائے۔

نائب صدر۔ جناب محمد اسمٰعیل صاحب مائل۔ نائب معتمد جناب [illegible] اللہ
صاحب شوق۔ اراکین جناب عبد الوہاب صاحب ایم اے بارایٹ لا صدر
فورٹ ہائی اسکول بنگلور۔ جناب عبد الرزاق صاحب ایم اے ایل ایل بی
(علیگ) مددگار فورٹ ہائی اسکول بنگلور۔ جناب محبوب شریف صاحب
بی اے مددگار فورٹ ہائی اسکول۔ جناب منشی محمد ابراہیم صاحب ذاکق۔

(۳) طے پایا کہ عالیجناب رکن الملک سید عبد الماجد صاحب [illegible]
کی خدمت میں التماس کی جائے کہ اس شعبہ کی رہنمائی کے لئے اس کی
اعزازی رکنیت قبول فرمائیں۔ ساڑھے پانچ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

عبد القادر سروری معتمد

اردو دانی کا دوسرا امتحان

حسب تصفیہ مجلس انتظامی

اردو امتحانات [illegible] کا دوسرا امتحان اردو دانی بتاریخ ۲ نومبر
مطابق ۲۹ [illegible] کو بلدہ اضلاع اور بیرون ریاست کے جملہ
مرکزوں میں ایک ساتھ لیا جائے گا۔ فیس امتحان اور درخواستیں ۲۰ مہر
[illegible] تک دفتر ادارہ پر وصول ہو جانی چاہئیں۔ ہر صدر نظام مرکز مقرر

کے بعد مجلس سے کو ۱۲ بجے ۱۲ سید ماہ شریک ہوں۔

مجلس انتظامی کے اجلاس

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا متریہواں

جلسہ بتاریخ ۱۲ مرداد ۱۳۵۱ ف م ۱۲ اگست ۱۹۴۲ء شام کو پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر صدر المہام تعمیرات۔
عالیجناب نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات سرکار عالی۔
مولوی عبد المجید صدیقی صاحب۔
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معتمد ادارہ

آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے صدارت فرمائی۔

(۱) گزشتہ اجلاس کی روئداد پڑھ کر سنائی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی۔

(۲) کل ہند اردو کانگرس کی تفصیلات کی توثیق کی گئی۔

(۳) تاریخ دکن کانفرنس کے کام کی تفصیلات معتمد ادارہ اور مولوی عبد المجید صدیقی صاحب نے بیان کیں اور اس کے انتظامات سے متعلق تبادلۂ خیال کیا گیا۔

(۴) آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر کی صدر المہامی کی مسرت میں ادارے کی جانب سے عید الفطر کے بعد ایک عصرانہ کا تصفیہ کیا گیا جس میں ادارے کے ارباب کار اور معتمدین و رفقا کو مدعو کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں طے پایا کہ نواب صاحب موصوف سے بعد رمضان تاریخ کا تعین کیا جائے۔

(۵) شعبۂ نسواں کے مدرسہ کو کھانا پکانے کیلئے صدر صاحبہ و معتمد صاحبہ مدرسۂ نسواں کی تحریک و تائید سے اور عالیجناب نواب لیاقت جنگ بہادر نائب صدر کی منظوری کے بعد تین سو روپے کا جو قرض منجانب ادارہ دیا گیا تھا اس کی توثیق کی گئی۔

(۶) ذیلی مجلس اردو امتحانات کی تحریک کہ شعبۂ اردو امتحانات کا نام شعبۂ تعلیم بالغان ہ رکھا جائے پیش ہوئی لیکن کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ نام کی تبدیلی مناسب نہیں ہے۔

(۷) نواب معین نواز جنگ بہادر نے تحریک پیش کی کہ آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر سے بھی ادارۂ ادبیات اردو کے نائب صدر بننے کی استدعا کی جائے۔ دیگر اراکان نے اس کی تائید کی۔ کافی اصرار کے بعد نواب صاحب نے ادارہ کی نائب صدارت قبول فرمائی۔

(۸) مخزن علوم و فنون یعنی اردو انسائیکلو پیڈیا کے لئے سرکاری امداد کی جو کارروائی کی جا رہی ہے وہ پیش کی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی۔

(۹) ادارے کی عمارت کا مسئلہ پیش ہوا اور مناسب تصفیہ عمل میں آیا۔

(۱۰) حسب ذیل امور بھی شریک ایجنڈا تھے لیکن آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کئے گئے۔

(۱) ادارہ کے شعبہ جات میں تبدیلی کی ملتوی شدہ کارروائی۔
(۲) نئی شاخوں کے قیام کی توثیق۔
(۳) شعبۂ کتب دیہی کے قیام کا مسئلہ۔
(۴) سرکاری امداد کے شرائط اور ادارے کے دستور کا مسئلہ۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا ایک دوسرا اجلاس بتاریخ ۱۴ آذر ۱۳۵۱ ف مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۲ء روز پنجشنبہ شام کے ساڑھے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر صدر المہام تعمیرات۔ صدر
" نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات۔
" مولوی سید علی اکبر صاحب پرنسپل نظام کالج۔
" " عبد المجید صدیقی صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ

عالیجناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی مددگار جنرل سکریٹری۔
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ... معتمد اعزازی
گزشتہ اجلاس کی روئداد سنائی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔

(۱) ۔ سنہ ۱۳۵۲ف کا موازنہ بعد غور و خوض منظور کیا گیا۔

(۲) ۔ تحریک ڈاکٹر امیر علی صاحب۔

ڈاکٹر امیر علی صاحب کی تحریک پیش ہوئی کہ ادارے کی مجوزہ عمارت میں ایک حصہ ایوان قرآن کے نام سے مختص کیا جائے تاکہ قرآن کے کل اردو تراجم اس میں محفوظ رہیں جن کے جمع کرنے کے سلسلہ میں تین ہزار روپے کی ضرورت ہوگی یہ کام صاحب موصوف نے شروع کر دیا ہے اور اس کے لئے فی الحال تین سو روپے ادارے سے صاحب موصوف کو دیئے جائیں۔ بعد غور و خوض طے پایا کہ ۔۔

"ڈاکٹر امیر علی صاحب کو قرآن کے اردو تراجم جمع کرنے کے لئے تین سو روپے ایصال کرنے کی اس شرط سے منظوری دی جاتی ہے کہ یہ کتب ادارے کی ملک ہوں گے۔

اگر آئندہ مجلس انتظامی میں صاحب موصوف خود تشریف لائیں تو اس تجویز کی تفصیلات پر گفتگو ہو سکے گی۔"

(۳) مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد ایم اے مہتمم ادارہ کی درخواست پیش کی گئی کہ ان کی بازیافت کے سلسلہ میں جس معاہدہ کی شرط لگائی گئی ہے وہ اٹھالی جائے اور مہتمم عمر سی سالہ کے بعد جو بازیافت ہوگی اس کا تعین کیا جائے۔ کافی غور و خوض اور تبادلۂ خیال کے بعد مناسب تصفیہ عمل میں آیا۔

(۴) معتمد ادارہ نے ادارے کی جدید اور بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر عملہ میں اضافہ کے لئے جو تجاویز پیش کی تھیں ان پر غور کیا گیا اور طے پایا کہ کل ادارہ میں سے جو نوجوان ... کی ملازمت کا

معاہدہ لکھ دیں ان کے نام گزشتہ مجلس انتظامی کے فیصلے کے مطابق بیمہ کرایا جائے۔ اس سلسلے میں نئی ملازمتیں بھی منظور کی گئیں۔

(۵) ادارے کی نئی شاخوں یعنی شاخ ناگپور و شاخ میسور کے قیام کے جو اجازت نامے معتمد ادارہ نے ارسال کئے تھے ان کی توثیق کی گئی۔

(۶) سرکاری امداد کی شرائط کے بارے میں معتمد نے مجلس انتظامی کو متوجہ کیا۔

طے پایا کہ نواب معین نواز جنگ بہادر، مولوی عبدالمجید صدیقی اور معتمد اعزازی ادارہ پر مشتمل ایک ذیلی مجلس اس معاملہ میں غور کر کے ایک یادداشت مرتب کرے تاکہ سرکار میں پیش کی جائے:

(۷) ادارے کی مجوزہ عمارت کے لئے بشیر باغ روڈ پر جس اراضی کا عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے انتخاب فرمایا ہے اس کی توثیق کی گئی اور عمارت کے لئے فراہمی رقوم سے متعلق ایک مہم کا آغاز کرنے کا تصفیہ کیا گیا اور اس اپیل کا مسودہ منظور کیا گیا جو عالیجناب نواب زین یار جنگ بہادر اس سلسلہ میں جاری فرما رہے ہیں۔

(۸) چونکہ مذکورہ مسائل کے تصفیوں میں بہت دیر ہو گئی تھی اس لئے پیش نامہ کے حسب ذیل باقی ماندہ امور آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کئے گئے۔

(۱) تحریک مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کہ ادارے کے موجودہ شعبوں میں تبدیلی کی جائے۔

(۲) ادارہ میں شعبۂ کتب دیہی کے قیام کا مسئلہ۔

(۳) شعبۂ نسواں کے دستور اور جدید تنظیم کی منظوری۔

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین [illegible]
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم اے

بابت جنوری سنہ [illegible]ء
شمارہ ۱

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

اداریہ

اس شمارے سے سب رس اپنی عمر کے آٹھویں برس میں داخل ہو رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ زبان و ادب کا یہ جواں سال ماہنامہ اپنی زندگی کے ہر قدم پر اپنے سرپرستوں اور قدر دانوں کی متوقع تمناؤں کا حتی المقدور ساتھ دیتا رہا۔

جس ناساز گار زمانہ میں اس "ہونہار بروا" کی داغ بیل ڈالی گئی اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ غیر تو غیر خود اپنوں کو اس کا یقین نہ تھا کہ حیدرآباد کی اس فضا میں جو ادبی رسالوں کے لئے خاص طور پر ناساعد سمجھی جانے لگی تھی اس نونہال کو پھلنے پھولنے کا موقع نصیب ہو گا اس لئے کہ اس سے پہلے بھی کئی انفرادی اور اجتماعی کوششیں اس کٹھن راہ میں ہار مان چکی تھیں اور کئی ادبی ماہنامے جن کی اٹھان سب رس سے کہیں زیادہ امید افزا اور جن کی بنیاد کہیں زیادہ مضبوط نظر آتی تھی، دو چار قدم بھی چلنے نہ پائے تھے کہ تھک کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ یہ کہنا یقیناً خودستائی یا تعلّی نہیں ہے کہ اس سات سال کے پرآشوب زمانے میں دکن کے اس رسالے نے جس پابندی اور محنت سے زبان کی خدمت انجام دی وہ اپنی آپ نظیر ہے جو اصحاب ابتداء سے سب رس کی زندگی میں دلچسپی لیتے رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قلیل مدت میں اس پر حوادث کے بعض ایسے طوفان آئے جن کا مقابلہ کچھ آسان کام نہ تھا ابھی وہ اپنی اصلی شان میں جلوہ گر ہونے بھی نہ پایا تھا کہ جنگ کے خوفناک بادل یورپ کے دامن مطلع کو مکدر کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان سے آگ اور شعلوں کی بارش ہونے لگی۔ ناممکن تھا کہ مشرق بھی اس خونی سیلاب کی زد میں نہ آتا اور پھر ہندوستان جو اپنے صنعتی وسائل میں پہلے ہی سے تہی دست تھا ایسی معاشی الجھنوں سے دوچار ہو گیا جس سے نپٹنے کی کوئی سبیل اسے نہ سوجھتی تھی۔

ان غیر معمولی حالات میں دوسری دشواریوں کے علاوہ کاغذ کی گرانی اور کمیابی کا بھی ایک مسئلہ اہل ملک کے سامنے تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے [illegible] ادبی دنیا کو اس کا بخوبی [illegible] ہے کہ کاغذ کی [illegible] گرانی کی وجہ سے آئندہ تو آئندہ کئی پرانے [illegible] بند ہو گئے۔ پھر اس دور مصائب میں "سب رس" [illegible] "خیال" کا ایک [illegible] ہے جو ایک [illegible]

لیکن سب رس کی یہ زندگی [illegible] ان بہی خواہوں کی مرہون منت ہے جنہوں نے [illegible] صرف اس کی دستگیری کی بلکہ ہر قدم پر اس کا دل بڑھایا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ان بزرگان وطن کی ہمدردی اور امداد شامل حال نہ ہوتی تو اس ماہنامہ ادبیات اردو کو اس [illegible] یہ کامیابی نصیب نہ ہوتی اور یقیناً ادارہ آج بھی ان تمام معاونین کی قلمی اور روحانی امداد پر بجا طور پر فخر کرتا ہے جن کی روز افزوں محبت اور شفقت اس کے ممد ہمت کر [illegible] رہتی ہے۔

سات سال کے اس عرصہ میں سب رس نے جو ادبی تقریبیں منعقد کیں ان کی اہمیت نقادان علم و فن کی نظروں میں اس وجہ سے بھی قیمت رکھتی ہے کہ ان مجلسوں میں ملک کے نامور کہنہ مشقوں کے علاوہ ایسے نوعمر ادیبوں نے بھی حصہ لیا تھا جن کا شمار آجکل کے اچھے لکھنے والوں میں ہو رہا ہے۔ سب رس کے مضامین کی فہرست پر نظر ڈالئے تو عنوانوں کا تنوع اور سرخیوں کی وسعت اس بات کا اشارہ کرتی ہے کہ ان نوجوان ادیبوں نے اپنے زور قلم اپنی تحقیق اور تلاش سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر صحیح طریقے اختیار کئے جائیں تو ہماری زبان نہ صرف ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے بیان کرنے کی اہلیت رکھتی ہے بلکہ اس میں ایسی نئی راہیں نکالنے کی صلاحیت بھی موجود ہے جن پر اصناف زبان کی نئی نئی بنیادیں ڈالی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ یہی اس ماہنامہ کا مقصد رہا ہے اور یہی اس کی خدمت بھی۔

اس ضمن میں ہم دو ایک باتیں گوش گزار کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اکثر احباب کو سب رس کی اس حکمت عملی پر یہ اعتراض ہے کہ اس کوشش میں وہ کسی خاص نقطہ نظر کا حامل نہیں رہا ہے اور یہ کہ اسے ہندوستان کے رسائل کے [illegible]

جلسہ تقسیم اسناد اردو امتحانات ۱۹۴۴ء

جنرل والا شان ڈاکٹر شہزادہ معظم جاہ بہادر نے صدارت فرمائی اور
شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ نے ۱۹۴۳ء کے کامیاب
امیدواران اردو امتحانات کو اسناد اور تمغے تقسیم فرمائے۔
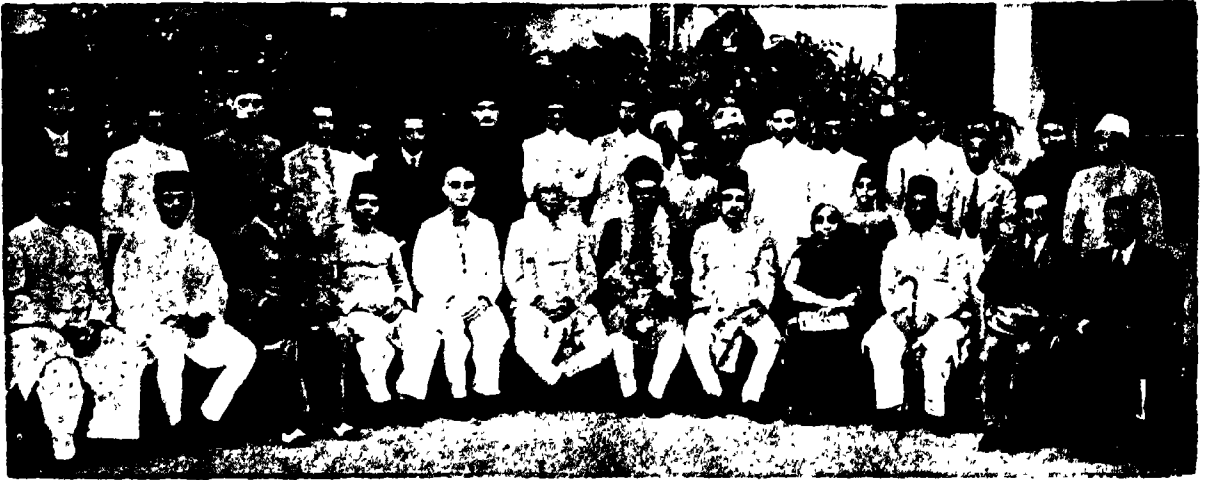
آرباب ادارہ ادبیات اردو

ادارے کے نائب صدر آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر کے عہدہ صدر المہامی پر فائز ہونے کی
مسرت میں جو عصرانہ ۱۳ اکتوبر ۴۴ء کو دیا گیا تھا اسکا ایک عکس

شمس الامراء کے سائنسی کارنامے

(۱) بیرم جس کو کل بھی کہتے ہیں (۲) چرخ و محور یعنی وہ چرخ جو اپنے محور کے ساتھ گردش کرے۔ (۳) بکرہ یعنی وہ چرخ جو اپنے محور پر گردش کرے (۴) سطح مائلہ (۵) اسفین جس کو پچر بھی کہتے ہیں (۶) لولب اس کا دوسرا نام مسطح ہے۔

ان آلات کی مدد سے بھاری وزن کی چیزوں کو آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتے ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر انسانی قوت کام نہیں آتی۔ پندرہویں اور سولھویں گفتگو میں ہر ایک کی تعریف اور اس کے استعمال کے طریقے بتلائے گئے ہیں۔ ہر ایک کی تین اقسام کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ سترہویں گفتگو میں جر ثقیل کے دوسرے آلے چرخ و محور کا بیان ہے جس کو "دوسری قوت دوم جر ثقیل" کہتے ہیں۔ اس قوت کے عمل کو چرخ، ڈول اور رسی کی مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔ اٹھارہویں گفتگو" میں بکری کے آلے کا بیان ہے جو جر ثقیل کی تیسری قوت ہے۔ "بیسویں گفتگو" میں پانچویں قوت کا بیان ہے جو اسفین آلے سے حاصل ہوتی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ انگلیاں، تیر، میخیں اور حیوانوں کے دانت اسفین کا عمل کرتے ہیں۔ اس قوت سے لکڑی اور پتھر وغیرہ پھوڑنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور جہاز کے پیچھے و کنارے تھوڑی بلندی پر اٹھا سکتے ہیں۔ "اکیسویں گفتگو" میں جر ثقیل کی چھٹی قوت کو بیان کیا گیا ہے جو لولب یا مسطح کے آلے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس قوت سے بھاری چیزوں کے اٹھانے اور دبانے کا کام لیا جاتا ہے۔ صحاف اس آلے کی مدد سے ضخیم کتابوں کو شکنجہ میں دباتے رہیں تاکہ کتاب کی ضخامت دب جائے۔

"فائدہ" کی سرخی کے تحت شاقول کی قوت کا بیان ہے جس کا جر ثقیل سے قریبی تعلق ہے۔ اس قوت سے وقت کے شمار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے اسی کلیہ کی مدد سے گھڑیال کے

(سلسلہ گزشتہ)

لاٹ تیار کئے جاتے ہیں۔

اصل کتاب کے ختم پر گفتگو سے متعلق سوالات کی تحریر کی گئی ہے تاکہ استاد شاگردوں سے سوالات کر کے جوابات پوچھے۔ انگریزی کتابوں میں جن سے ترجمہ کیا گیا ہے ایسا نہیں ہوا بلکہ کل کتابوں کے سوالات اور تعریفات کو ایک علاحدہ کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسبارے میں کتاب کے ختم پر "پوشیدہ نہ رہے" کی سرخی کے تحت حسب ذیل عبارت درج ہے:

"حکیم ریوری رنٹ جائس صاحب نے ۱۸۰۱ء میں سات کتابیں علوم ریاضی کی تیار کر کے جو چھپوائی تھیں ان میں سے چھ کتابیں ...... ترجمہ کر کے ستہ شمسیہ نام رکھا گیا اور باقی ساتویں کتاب تعریفات اور سوالات علوم مذکور میں اس واسطے لکھی تھی کہ علوم مذکور کی تحصیل کے بعد شاگردوں سے ہر ہر علم کے امتحان کے لئے سوال کر کے جواب اسکا ان سے سنے کہ یاد ہے یا نہیں اور ہم نے اس حکیم کے آئین کو بہتر جان کے ساتویں کتاب کا بھی ترجمہ کیا مگر اس میں سے ہر ہر علم کی تعریفات اور کیفیات اور سوالات علاحدہ کر کے ہر علم کے رسالے میں اس طور شریک کئے کہ آغاز رسالے میں دیباچہ کے بعد تعریفات اور کیفیات اور آخر رسالے میں سوالات اس کے داخل کرنے میں آئے تا استاذ ہر علم کی تعلیم کے بعد اسی نساب سے شاگردوں سے سوالات کر کے جوابات پوچھے تا دوسری کتاب سے سوالات کی احتیاج نہ ہو۔ تمت بالخیر"

کتاب کے آخر میں تین صفحات کا غلط نامہ اور (۴) صفحات میں علم جر ثقیل کے آلوں کی (۳۰) اشکال شریک ہیں جو لیتھو میں چھاپی گئی ہیں۔ ان اشکال پر نمبر درج ہیں اور کتاب میں جہاں جس شکل کا ذکر ہے، حاشیہ پر وہی نمبر لکھا ہوا ہے تاکہ پڑھنے والے کو شکل تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔

اس رسالہ میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ قدیم اردو ہے

حسب ذیل جملوں سے اس کی قدامت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً
" متوجہ طرف تمھاری تعلیم کے ہوتا ہوں۔"
" ساتھ ایسے ہی اعلیٰ مراتب کے متصف ہے۔"
" مسوط کر موسوم ہے۔"
" عرض خدمت رکھتا ہوں۔"
" آپ نے یہ بات پرسوں کے دن فرمائے تھے۔"
اکثر جگہ ایسے الفاظ اور املا کا استعمال کیا گیا ہے جو اب معیاری اردو میں متروک ہو چکے ہیں مثلاً

وہ کی بجائے وے
کو " " تئیں
مٹی " " ماٹی
کنویں " " کوتے
بحث " " تکرار
کسی کو " " کسو کو
بند ہونا " " موندھنا
ان سے " " ون سے

بعض حروف اور الفاظ کا رسم الخط بھی مختلف ہے مثلاً
ٹ ____ تٓ
ڑ ____ رٓ
سٹنے ____ سنے
فٹ ____ فوٹ
ٹوٹ ____ توٹ

بعض انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ کیا گیا اور بعض کا نہیں کیا گیا بلکہ ان کی اصلی شکلیں اردو میں برقرار رہیں مثلاً

پڈین۔ Pudding
چوب شولہ۔ Cork
اسفنج۔ Spunge
خط راہ۔ Line of direction
ایر پمپ۔ Air pump

علم ہیئت

یہ رسالہ ستہ شمسیہ کی دوسری جلد ہے جو (۲۲۴) صفحات پر مشتمل ہے ابتدا میں دیباچہ فہرست وغیرہ کے (۳۱) صفحات اور آخر میں دو صفحات کا غلط نامہ اور (۴) صفحات پر متن سے متعلق (۴۰) اشکال ہیں جن میں اجرام فلکی مثلاً ثوابت۔ سیارگان۔ بارہ برج اور زمین کی گردش وغیرہ کو بتلایا گیا ہے۔ صفحہ (۲) پر علم ہیئت کے آلات کو تصاویر سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی غرض وغایت اور سنہ طباعت سے متعلق اسی صفحہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

" دوسری جلد ستہ شمسیہ کی جو علم ہیئت میں ہے ..... طلبہ کی تعلیم کے واسطے سرکار شمس الامرا بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپے خانہ میں شہر فرخندہ بنیاد حیدر آباد کے درمیان ۱۲۵۶ھ میں مطبوع ہوئی۔"

یہ بھی ریوری رنٹ چالس صاحب کے انگریزی رسالہ کا اردو ترجمہ ہے جن انگریزی اصطلاحوں کا عربی اور فارسی میں ترجمہ نہ ہو سکا ان کو اسی طرح اردو میں لکھ دیا گیا ہے۔

رسالہ کی ابتدا میں (۲) صفحات کی فہرست ہے جو دیباچہ اور (۲۶) گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔ صفحہ (۶) اور (۷) پر علم ہیئت کی (۲۰) اشکال کی تفصیلی فہرست دی گئی ہے۔ دیباچہ کے بعد (۱۶) صفحات میں علم ہیئت کی تعریفات اور بیانات کو درج کیا گیا ہے تاکہ طالب علم اصل کتاب پڑھنے سے قبل انھیں یاد کرلیں اور کتاب کے سمجھنے میں آسانی ہو مثلاً ثوابت۔ سیارے۔ نظام شمسی۔ خط استوا۔ حرکت سالانہ۔ زمین الکوس۔ گہن۔ عطارد۔ زہرہ۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل۔ ہرشل۔ دمدار تارے وغیرہ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ " پہلی گفتگو" میں اجرام علوی کے متعلق استاد شاگرد کے سوالات و جوابات درج ہیں۔ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

" تلمیذ کلاں۔ قبلہ و کعبہ آج کی شب آسمان اس قدر

سے سفید پاک ہے کہ کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔"

"تلمیذ۔ جناب واقعی جیسا آپ نے بیان فرمایا سبب کثرت ستاروں کے بعد بھی جس قدر چار سو نظر کرتا ہے تارے بے حد نظر آتے ہیں ان کو کسطرح شمار کرنا کیونکہ سنا ہے استادوں نے ان کو شمار کیا ہے .... اس عقدہ مشکل کی راہ دریافت مجھ پر روشن فرمایئے۔"

"استاد ـــــ ابھی نہیں چند روز توقف کرو ......

بالفعل اسقدر ایک امر کی تعلیم تم کو میری مد نظر ہے سو جب تم شب کو اوپر کی طرف یعنی منتہائے امتداد نظری سر پر کا جس کو آسمان کر تعبیر کرتے ہیں .... فقط آنکھ سے دیکھتے ہیں وے نجوم جید جو ہم کو نظر آتے ہیں صرف باصرے کا دہوکا ہے ....

بدون استعانت دوربین کے ہزار سے زیادہ تارے نہیں نظر آتے۔ پس یہاں سے ثابت ہوا ظاہراً ہم کو جتنے تارے نظر آتے ہیں دراصل وے سب تارے نہیں ہیں بلکہ تخیلہ باصرہ کا ہے۔"

"دوسری گفتگو" میں ثوابت کی وجہ تسمیہ شکل۔ اقسام ان کے نام اور محل و توزیع کو سمجھایا گیا ہے۔"

"تیسری گفتگو میں ثوابت اور منطقۃ البروج کی تعریف اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے۔ مختلف تاروں کے نام اور ان کی خصوصیات بھی تبلائی گئی ہیں۔ چوتھی گفتگو میں تقویم کے علم سے بحث کی گئی ہے۔ چھٹی گفتگو نظام شمسی کے مسائل پر مبنی ہے جس میں یہ تبلایا گیا ہے کہ آفتاب اپنے مرکز پر قائم ہے اور اس کے اطراف (۷) سیارے اور (۱۸) چاند گردش کرتے ہیں۔ سنہ ۵۰۰ ق م میں یونان کے ایک ہیئت داں فیثاغورس نے اس نظام کو دریافت کیا۔ چھٹی گفتگو میں زمین کی شکل گول ثابت کرنے کے لئے مختلف مثالیں دی گئی ہیں۔ زمین کے محور۔ قطبین اور خط استوا کی تعریفات بیان کی گئی ہیں۔ ساتویں گفتگو میں زمین کی روزانہ گردش کا حال لکھا ہے اور تبلایا ہے کہ زمین اپنے محور پر (۱۰۰۰) میل فی ساعت گھومتی ہے۔ اسی طرح آٹھویں

اور نویں گفتگو میں روز و شب اور زمین کی سالانہ گردش کا بیان ہے۔ بارہویں گفتگو تک موسموں کی کیفیت اختلاف اور اعتدال پر معلومات درج ہیں۔ تیرہویں گفتگو میں سال کبیسہ اور اس کے پہچاننے کا قاعدہ تبلایا گیا ہے۔ چودہویں گفتگو میں چاند کی گردش کا ذکر کرکے سال کو بارہ مہینوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پندرہویں میں خسوف و کسوف۔ سولہویں اور سترہویں میں مد و جزر کا حال لکھا گیا ہے۔ اٹھارہویں گفتگو سے لیکر پچیسویں گفتگو تک مختلف سیارے مثلاً عطارد۔ زہرہ۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل۔ آفتاب اور دمدار ستاروں کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہیں۔ چھبیسویں گفتگو میں پھر ثوابت کی بحث چھیڑ دی گئی ہے۔ کتاب کے ختم پر سیاروں کی جدولیں دی گئی ہیں جو ہمنتو صاحب کی کتاب "پیانارما" سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

اس رسالے کا اسلوب بیان اور خصوصیات زبان تقریباً وہی ہیں جو پہلے رسالے کے سلسلہ میں بیان ہو چکی ہیں۔ فارسی اور عربی الفاظ کی بہتات ہے۔ مثال کے طور پر ان میں سے کچھ یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

فارسی الفاظ۔ اندک۔ بنابر۔ درہیولا۔ یہ آئینہ۔ ہمین ہمہ جا وغیرہ۔

عربی الفاظ۔ مرئی۔ تفحص۔ موہومہ۔ کماہی۔ کما ینبغی۔ سریع۔ بطی۔ محتجب وغیرہ۔

متروکات۔ دیکھے۔ کتنے۔ غلطت۔ کسو۔ سرکتے۔ تئیں وغیرہ۔

کواکب کے اقدار کی علامتیں یونانی حروف میں لکھی گئی ہیں۔ یونانی زبان میں الف کو الفا اور ب کو بیتا اور ج کو گیما اور د کو ڈلٹا کہتے ہیں۔ علامتیں یہ ہیں۔

علامت قدر اول کے کوکب کی الفا۔ α
" " دوم کے " " بیتا۔ β
" " سوم کے " " گیما۔ γ
" " چہارم کے " " ڈلٹا۔ δ

عبارت کا نمونہ ـــ "پیش از طلوع آفتاب جب مشرق طرف نظر

آتا ہے ستارۂ صبح کاہی اور جب بعد از غروب آفتاب مغرب طرف دکھلائی دیتا ہے ستارۂ شام گاہی کہلاتا ہے۔ پس جب زہرہ ایک مقام میں ہوتا ہے بشرطیکہ نقطہ تقاطع پر نہووے نظر زمین کی نظر سے بالکل محجوب۔"

رسالہ کیمسٹری | تقطیع ۶/۲۰ حجم (۲۱۰) صفحات سنہ طباعت ۱۸۴۶ء۔ یہ کتاب بھی سوال وجواب کے طریقہ پر لکھی گئی ہے۔ پہلی گفتگو سے لیکر بارہویں گفتگو تک علم کیمسٹری کے مسائل کو سمجھایا گیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کیمسٹری کا ترجمہ کیمیا نہیں کیا گیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوئی کہ کیمیا کا لفظ اردو میں ایک خاص مفہوم کو ادا کرتا تھا۔ ابتدا میں حمد کے بعد لکھا ہے۔

"دانشوران ذوفہم پر پوشیدہ نہ رہے کہ یہ رسالہ ہے مختصر چند اصول کیمسٹری کے بیان میں کہ اس علم میں ترکیب عناصر کی حقیقت جو زبان فرنگ میں اس کو کیمسٹری کہتے ہیں پائی جاتی ہے اور یہ علم بہت عجیب و غریب ہے کہ اس کی تحصیل اہل حکمت کو ضرور اور لازم ہے اور یہ علم اہل فرنگ کی زبان میں مندرج تھا لیکن حال میں ایک رسالہ اس علم کا ہندوستان سے شہر آگرہ کا چھپا ہوا ایسا آیا تھا کہ اس میں ایک صفحہ انگریزی زبان کا اور دوسرا صفحہ اس کے ترجمے کا اردو زبان میں لکھا ہوا تھا اگرچہ وہ دوبارہ محتاج چھاپے کا نہ تھا مگر یہاں طالبوں کے فائدہ کے لئے اس کے اردو ترجمے کو علیحدہ لکھوا کر چھپوایا گیا۔"

پہلی گفتگو میں علم کیمیا کی تعریف اور اربعہ عناصر کا بیان ہے۔ دوسری گفتگو میں قوت حرارت اور تھرمامیٹر کی ماہیت بیان کی گئی ہے۔ تیسری گفتگو میں گرمی کا اثر پانی پر، بھاپ اور برف کے متعلق معلومات درج ہیں۔ چوتھی گفتگو میں ہوا کا بیان ہے جس میں آکسیجن اور نیٹروجن کے خواص کو سمجھایا گیا ہے۔ پانچویں گفتگو میں جمادات کا ذکر کرتے ہوئے گندھک اور فاسفورس کے خواص بتلائے گئے ہیں۔ چھٹی گفتگو میں کوئلے اور کاربن کا بیان ہے۔ ساتویں اور آٹھویں گفتگو میں فلزات اور دھاتوں کے پگھلانے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ نویں گفتگو میں سوڈیم اور پوٹاشیم کے خواص کی تشریح کی گئی ہے۔ دسویں گفتگو میں پوٹاس اور سوڈا کی خاصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ گیارہویں گفتگو میں خاک اور اس کے متعلقات مثلاً چقماق، چکنی مٹی، چونا اور میگنیشیا کے خواص کو گنایا گیا ہے۔ بارہویں گفتگو میں مختلف ایسڈ اور سالٹ کے خواص اور ان کے بنانے کے طریقے بتلائے گئے ہیں۔

اس کتاب کی زبان اور اسلوب بیان میں وہ سادگی اور روانی نہیں پائی جاتی جو شمس الامرا ہی کی لکھوائی ہوئی ایک کتاب "کیمسٹری کا مختصر رسالہ" میں پائی جاتی ہے بعض الفاظ کا املا اس طرح لکھا گیا ہے مثلاً

تھنڈھا (ٹھنڈا)۔ بھاپھ (بھاپ) چونٹی (چوٹی)، گرا (گڑھا) وغیرہ۔

دکنی اردو کے بعض الفاظ یہ ہیں۔

آدھون۔ آدھا۔ جاہروار۔ دھڑک۔ وغیرہ

اکثر انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ انہیں اسی طرح رکھ کر مفہوم سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً

ڈکامپوزیشن۔ الیکٹریسٹی۔ نیٹرک آسڈ۔ تھرمامیٹر۔ کنڈکٹر۔ نان کنڈکٹر (بعض جگہ نن کنڈکٹر بھی لکھا ہے) سپٹن سلٹ۔ میگنیشیا۔ کاسٹک ایرچپ وغیرہ۔

جن اصطلاحات کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

قوت جاذبہ۔ رغبت۔ Attraction
جامد Solid
سیال Liquid of fluid
ہوائی Gas
سنگ چقماق Flint
شعلہ گیر Inflamable
نشاستہ Starch
حرارت Heat

خاک Earth
کشتہ Axide
چونا Lime

نمونہ عبارت ملاحظہ ہو :-

س۔ آپ نے آگے کہا کہ پانی کا بخار ہوا سے مل جاتا ہے۔ ہوا کیا شئے ہے۔

ج۔ ہوا میں دو چیزیں ہیں آکسیجن اور نیٹروجن۔ آکسیجن پانچواں حصہ ہے۔ اور باقی نیٹروجن ہے۔

س۔ ان دونوں شئے کی تعریف کیجئے۔

ج۔ جب نیٹروجن آکسیجن سے جدا کیا جاوے تو اس میں نہ کوئی جاندار سانس لے سکتا ہے نہ شعلہ جل سکتا ہے نہ پھول کھل سکتا ہے نہ نباتات اگ سکتی ہے۔ غرض کسی شئے کی زندگی نہیں ہو سکتی اور آکسیجن وہ شئے ہے کہ ضرور ہے واسطے جلنے کے اور دم لینے کے۔"

اصل انگریزی کتاب اور مصنف کا نام نہیں دیا گیا ہے اور اس کی بھی صراحت نہیں کہ ترجمہ کسی ایک شخص نے کیا یا جماعت نے۔ (نمبر ۳۰۵ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ)۔

علم آب یہ کتاب ستہ شمسیہ کی تیسری کڑی ہے جو دیباچہ اور بائیس گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔ دیباچہ کے سوا کتاب کا حجم (۲۱۲) صفحات ہے آخر میں چار صفحات کا غلط نامہ اور تین صفحات پر علم آب سے متعلق (۳۶) اشکال درج ہیں۔ دیباچہ میں اس رسالے کی تالیف کا مادہ تاریخ مذکور ہے جو یہ ہے۔

شمس الامراء کی ہے یہ تالیف

سنہ ۱۲۵۴ھ

ایک سرخی "تعریفات اور کیفیات علم آب" کے تحت بارہ صفحات میں مختلف اصطلاحوں اور آلوں کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ پہلی گفتگو سے لیکر پندرہویں گفتگو تک علم آب کی حقیقت۔ سیال اجسام کے اعتدال، دباؤ اور ان کی حرکت سے متعلق چند امور کو سمجھایا گیا ہے۔ سولہویں اور سترہویں گفتگو میں ہیڈرامیٹر اور تیرنے کی کیفیت کا حال درج ہے۔ اٹھارویں گفتگو میں سفن لے آلے کے اعمال کی تشریح کی گئی ہے۔ انیسویں اور بیسویں گفتگوؤں میں آلہ غوطہ زنی اور اس کے استعمال کے طریقوں اور فوائد کو تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ کیسویں گفتگو میں پمپ سے پانی کھینچنے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ بائیسویں گفتگو میں زبردستی کے پمپ کا ذکر ہے جس سے فوارے کا کام لیا جاتا ہے۔ آگ بجھانے کے آلہ کا ذکر بھی اسی ضمن میں کیا گیا ہے۔ کنوؤں سے پانی کھینچنے کے لئے رسی کے ڈولوں کی ساخت کا طریقہ بھی واضح کیا گیا ہے۔ پھر زنجیری پمپ کا ذکر ہے جو جہازوں کی تہ سے پانی باہر نکالنے کے کام آتا ہے۔ آخر میں شکنجہ آب کا ذکر ہے جس کی مدد سے روئی کے گٹھوں کو دباتے ہیں۔ جہازوں میں جب روئی بھری جاتی ہے تو پہلے اس شکنجہ میں اس کو دباتے ہیں جس کی وجہ سے بیس گنا زیادہ روئی بھری جا سکتی ہے۔

اس رسالے میں بھی کم و بیش وہی زبان استعمال کی گئی ہے جو اس سے پہلے کے رسالوں کی ہے۔ جملوں کی ترکیب اور ساخت کی قدامت کی چند مثالیں یہ ہیں۔

"میں تم سے کہا چاہتا تھا"

"چار تکلیل مدور کیسی رنگتیں ہیں!"

"جو جسم کہ اس کا ثقل پانی سے کم ہے"

"کس طرح پانی اصلوں کی حیات کا سبب پڑتا ہے"

"سفوف بارک ویا اور کوئی رنگین شئے کا"

"نے" کا استعمال ملاحظہ ہو:

"ہم نے اپنے استعداد و حوصلے کے موافق سمجھے"

بعض جگہ "نے" کا استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ مثلاً

"اوپر آپ فرمائے تھے"

لفظ " کر " مختلف طریقوں سے جملوں میں لایا گیا ہے۔ جیسے
مجھ سے کر دیکھو گے (مجھے کرتے ہوئے دیکھو گے)
امتحان کر دکھلائیے۔ (امتحان کر کے دکھلایئے)
بعض قدیم الفاظ بھی ملتے ہیں جو اب متروک ہیں۔ مثلاً
ماٹی (مٹی)، قیمت دار (قیمتی)، جاگہ (جگہ)
دوڑنے لاگا (دوڑنے لگا)، وسکا (اس کا) وغیرہ۔
کہیں کہیں دکنی الفاظ اور زبان کی جھلک ہے۔
سرکاؤ (ہٹاؤ) ڈھیپا (تودہ) مصمت پنا۔
(مصمت پن)، دھڑ (جسم)، ماپ (ناپ) کھلتیاں
بند ہوتیاں ہیں (کھلتی اور بند ہوتی ہیں)
انگریزی الفاظ کے املا کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ ہیڈرو
اسٹاٹکس کو کہیں ہائے ہوز اور کہیں ہائے حطی سے لکھا ہے۔
بعض انگریزی اصطلاحوں کے ترجمے کئے گئے اور بعض انگریزی
تلفظ کے مطابق اردو میں لکھے گئے۔ چند بطور نمونہ پیش کی
جاتی ہیں۔

علم آب۔ Hydrostatics
علم آب کی ترازو۔ Hydrostatic Balance
چوکھنے کا پمپ۔ Sucking pump
زبردستی کا پمپ۔ Force pump
ہیڈرا میٹر۔ Hydrametre

کتاب کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔
" علم آب جس کو یونانی زبان میں ہیڈرس
ٹاٹکس کہتے ہیں۔ علم فلسفۂ طبیعی کی ایک نوع
ہے جو طبیعت اور ثقل اور دباؤ اور حرکت
اکثر سیال کی ظاہر کرتا ہے۔"
" کسب کیسا ہی آسان ہو نہیں سمجھنا اس کے
عمل میں کچھ خطر نہیں۔ چنانچہ لکھا ہوا
دیکھنے میں آیا ہے۔ حکیم اسپالڈین اور
اس کا مددگار دونوں اپنے بنائے
ہوئے آلے میں بیٹھ کر جہاز شکستہ اور ڈوبے
ہوئے مال کے نکالنے کے واسطے دو بار
دریا کے اندر جا کر گھسے اور دفعہ سوم
ڈوبے ایک ساعت تک رہے جب وقت
بہت گزرا اور اوپر کے مددگاروں نے
کچھ اشارہ مراجعت کا نہیں پایا آلۂ غوطہ زنی
کو اوپر کھینچا دیکھے تو دونوں کی روح پرواز
ہو گئی تھی۔"

بعض صفحات کے حاشیے پر اس سلسلے کی دوسری کتابوں
مثلاً جر ثقیل، علم مناظر اور شمس الہندسہ وغیرہ کے حوالے بھی
دیئے گئے ہیں۔

علم ہوا

یہ سلسلۂ شمسیہ کی چوتھی کڑی ہے جو دیباچہ کے علاوہ
چوبیس گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب کا
حجم (۳۳۵) صفحات ہے۔ آخر میں (۴)
صفحات کا غلط نامہ اور پانچ صفحات پر علم آب سے متعلق (۳۴)
آلوں کے نقشے دیئے گئے ہیں اور مترجم نے پانچ مختلف قسم
کے فواروں کے نقشے بھی ان میں شامل کر دیئے ہیں جو کسی دوسری
کتاب سے لئے گئے ہیں۔ چنانچہ صفحہ (۹۵) کے نیچے حسب ذیل
عبارت درج ہے۔
" مترجم نے فواروں کے نقشے اور ایک کتاب سے
واسطے تفہیم کے داخل کیا۔"
کتاب کی ترتیب کا ڈھنگ وہی ہے جو اس سے پہلے کی کتابوں کا
ہے۔ ہوا سے متعلق جملہ امور کو اتنی وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا
گیا ہے کہ کوئی بات تشنہ باقی نہیں رہتی جن مسائل سے اس
کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ ان کی چند سرخیاں یہ ہیں۔
کیفیت ہوا۔ ایر پمپ۔ ہوا کا دباؤ۔ ہوا کا منتن۔ ہوا
کی لچک۔ ہوائی بندوق اور آواز، پھونکنا، اسٹیم انجن، برامیٹر
تھرمامیٹر، پیرامیٹر، ہیگرامیٹر اور آلہ بارش پیما وغیرہ۔ جن انگریزی
اصطلاحوں کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

ہوائی بندوق Air gun
آلہ ہوا کش Air pump

ہوائی آلہ Steam Engine
طول بلد Solidity of
آتش پیما Paerametre
موسمی ہوائیں Monsoon

بعض الفاظ کا املا اور تلفظ بھی اب سے مختلف ہے۔ مثلاً
جیتا ـــــ جتنا
جانوں ـــــ جانو
بانسلی ـــــ بانسری
سنا ـــــ سفنا

بعض الفاظ کی جمع کسی قاعدہ کے مطابق بنائی گئی ہے۔ مثلاً
شاخ سے شاخاں۔
سیخ سے سیخاں وغیرہ۔
"نے" "کو" "ا" اور "ون" سے جگہ جگہ استعمال ہوئے ہیں۔
"نے" کے استعمال کی دو مثالیں بطور نمونہ پیش کیجاتی ہیں۔
"ہوا کہ آپ نے تو لی تھی" "حضرت میں اس بات کو خوب سمجھا۔"
بعض مقامات پر اسم کیفیت یا حاصل مصدر کی بجائے مصدر کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً
"حضرت کیا گرچنا ہوا سے ہوتا ہے"
"تعجب ہے کہ گوشنا اکثر سنے میں کیوں نہیں آتا"
انگریزی الفاظ کے املا کا تعین نہیں کیا گیا تھا چنانچہ حسب ذیل الفاظ کو دو طرح سے لکھا گیا ہے۔
اسٹیم انجن۔ اشٹیم انجن
ترامیٹر۔ تقرما میٹر

اس کتاب کی "تینیسویں گفت گو" سے تلمیذ اور استاد کے سوال و جواب کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔
"استاد۔ اب اپنے بیان کو علم طبیعیات کے آلات کی گفتگو میں تمام کرنے کے واسطے آج تم کو پیرامیٹر اور ہیگرامیٹر کی ترکیب اور عمل دکھاتا ہوں اور کل اس کتاب کو آلہ بارش پیما کے بیان پر تمام کرتا ہوں۔
تلمیذ خود حضرت پیرامیٹر کی معنی بیان کیجئے۔
استاد۔ یہ لفظ یونانی ہے اور اس کی معنی آتش پیما ہے اور یہ ایک آلہ ہے منجمد چیزوں کی بالخصوص معدنیات کے بڑھنے کی پیمائش کے واسطے جو بسبب گرمی کے ان کو حاصل ہوتا ہے اور چیزیں کتنی بھی تھوڑی بڑھیں اس آلے کی استعانت سے تینیسویں شکل کی مانند نقطہ آنکھ سے نظر آویں گی۔"

علم مناظر یہ کتاب بستۂ شمسیہ کی پانچویں جلد ہے اور اس میں علم مناظر سے بحث کی گئی ہے۔ دیباچہ اور تعریفات علم مناظر کے صفحات کے علاوہ کتاب کا حجم (۲۰۰) صفحات ہے۔ آخر میں (۵) صفحات کا غلط نامہ اور متن سے متعلقہ (۴۴) اشکال شریک ہیں۔ اصل کتاب میں علم مقناطیس کا رسالہ بھی اس کے ساتھ شامل تھا مگر ترجمے میں اس کو علم مناظر سے علحدہ کر کے علم برقک کی جلد کے آخر میں شریک کیا گیا۔ کُل کتاب کے سنہ تالیف کے متعلق دیباچہ میں غلام محی الدین کا نکالا ہوا مادۂ تاریخ یہ ہے:

"این تالیف شمس الامرا"
۱۲۵۵ھ

دیباچہ کے بعد علم مناظر کی مبادیات اور اصطلاحات کی تشریحیں کی گئی ہیں جس سے کتاب کے سمجھنے میں آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ پوری کتاب کو بامیں گفت گوؤں پر تقسیم کیا گیا ہے جن میں علم مناظر کی مختلف شاخوں مثلاً
شعاع، روشنی، آئینہ، عینک، قوس قزح، کلان بین اور دوربین پر تفصیلی معلومات درج ہیں۔ ترجمے کی خصوصیات وہی ہیں جو اس سے پہلے کی کتابوں کے متعلق بیان کی جا چکی ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مباحث کو سادہ اور سلیس پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے۔ ترجمہ اس خوبی سے ادا کیا گیا ہے کہ عبارت میں ترجمہ پن نہیں پایا جاتا۔ جن انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ ہوا وہ حسب ذیل ہیں:–

Magic lantern قندیل سحری
Lantern لنتر یا لانتر

منہ دیکھنے کا آئینہ Looking glass
کلاں بین Microscope
منعکس دوربین Reflecting Telescope
موازی شعاعیں Convergent Rays
انقباضی شعاعیں
انبساطی شعاعیں Divergent Rays
منعکس روشنی Reflected Light

بعض الفاظ کو کہیں مذکر اور کہیں مونث استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً:۔

شعاع آتی ہے ــــ شعاعیں گرتے ہیں۔
بوڑھے کی آنکھیں ــــ آدمی کے آنکھیں۔

بعض الفاظ کا املا موجودہ املا سے مختلف ہے۔ جیسے
سابون (صابن) لبنی (لانبی)۔ بڑتا ہے۔
پڑتا ہے، ہاتی (ہاتھی)۔

عبارت میں جابجا ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اب ہماری زبان میں متروک ہو گئے ہیں مثلاً
کبھو۔ سو۔ جدی جدی۔ وو۔ دے۔ دکھنے لگی
وغیرہ وغیرہ۔

اگر کسی جملہ میں فاعل جمع ہو تو اس کا فعل بھی جمع لایا گیا ہے اور یہ دکنی زبان کی ایک خصوصیت ہے۔ مثال کے طور پر چند جملے یہاں لکھے جاتے ہیں:۔

"یاد رکھو ۔۔۔۔۔ کہ تفاوتیں ہوا میں معلوم کر سکتے ہیں برخلاف پانی کے کہ وہاں خوب دریافت نہیں ہو سکتیں ہیں"
"یہ تعریفات تمہارے ہر کام پر آئیں ہیں"
"جس جگہ وو سب شعاعیں بیچ کے خط ملیں گیں"

بعض جگہ "نے" کے استعمال کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ مثلاً
"کیا حضرت آپ سمجھے ہیں کہ روشنی چار مرتبہ کم ہوئی ہے"

یہ کتاب بھی بطور سوال و جواب کے لکھی گئی ہے۔ پندرہویں گفتگو سے ایک مکالمہ کا اقتباس بطور نمونہ یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

"تلمیذ خرد۔ حضرت بہتر بندہ ایسا ہی عمل کرے گا لیکن پھر آپ نے ابرو اور مژگاں کا ذکر نہ کیا یہ کس کام پر آتی ہیں۔

استاد ۔۔۔۔۔۔۔ ابرو بہت آنکھ کو پناہ دیتی ہے جس وقت کہ بہت روشنی آنکھ پر آتی ہے اور کوئی جسم اگر پیشانی پر سے پھسل کر آنکھ پر گرے آنکھ کو مضرت نہیں پہنچنے دیتی ہے اور مژگاں کام کرتی ہیں آنکھ کے پردے کی مانند کس واسطے کہ جب کوئی شخص سوتا ہے وو سنبھالتے ہیں۔ حادثہ روشنی کو یعنی زیادہ روشنی آنکھ میں جانے نہیں دیتی ہیں۔ ۔۔۔ اور یہ مژگاں ہزاروں صدمات سے آنکھوں کو بچاتے ہیں اور جو گرد کہ ہوا میں بھری ہوئی ہے اُن کو آنکھوں میں آنے نہیں دیتے ہیں"

علم برقک

یہ سلسلہ ستہ شمسیہ کی آخری کڑی ہے جس میں علم برقک۔ گیال وی نیزم اور مقناطیس کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

یہ کتاب بھی ۱۲۵۱ھ میں تالیف ہوئی۔ جس کا دیباچہ میں حوالہ دیا گیا ہے۔ (۱ تا ۲۰۶) صفحات میں علم برقک پر بحث کی گئی ہے اور آخر میں تین صفحات پر (۳۱) اشکال ہیں۔ (۲۰۷ تا ۲۶۲) صفحات میں گیال وی نیزم کے مسائل سمجھائے گئے ہیں اور ختم پر متعلقہ آلوں کے (۶) نقشے دیئے گئے ہیں۔ (۲۶۳ تا ۳۰۲) صفحات علم مقناطیس کے لئے وقف ہیں اور آخر میں مقناطیس کی قوتوں کو پانچ مختلف اشکال سے واضح کیا گیا ہے۔ (۳۰۳ تا ۳۲۴) صفحات میں سوالات کی فہرستیں درج ہیں کتاب کے ختم پر تینوں رسالوں کے غلط نامے علحدہ علحدہ سرخیوں کے تحت ترتیب دیئے گئے ہیں۔ علم برقک سولہ گفتگوؤں پر۔ گیال وی نیزم اور علم مقناطیس چار چار گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

ہندوستان میں انگریزی دور کا اسلامی قانون

دیگر ملکوں کے قوانین کی طرح برطانوی ہند کے قانون کی بھی دو حیثیتیں ہیں۔ ان قوانین کا ایک حصہ تو ایسا ہے جس کے اصول عالمگیر نوعیت کے ہیں اور بقیہ حصہ خاص جماعتوں اور فرقوں کے قوانین سے متعلق ہے۔ البتہ دیگر ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں فرقہ وار قوانین زیادہ ہیں۔ انگلستان میں ایک غیر اہم اقلیت یعنی یہودیوں کے لئے ازدواج وغیرہ سے متعلق بعض علٰحدہ قوانین ہیں لیکن ہندوستان میں یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ یہاں خاص اور شخصی قوانین، قانون ملک کا جزو ہیں۔ مثلاً شادی بیاہ، وراثت اور دیگر اہم امور میں مختلف فرقوں کے مختلف اصول اور قاعدے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب فریقین ہندو ہوں تو عدالتوں کو دھرم شاستر اور مسلمان ہوں تو شرع شریف کے مطابق فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ برما میں بدھی قانون پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ خاندانوں کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں بعض مقامی اور خاص قسم کے رسم و رواج بھی ہیں جن پر مثلاً سکھوں اور جینیوں وغیرہ کی صورت میں عمل ہوتا ہے۔ پارسیوں کا اپنا علٰحدہ نظام قانون ہے جسے اب ہندوستانی مقننہ کی طرف سے قانون کی حیثیت دی جا چکی ہے۔ ہندوستان میں جو یورپی اشخاص بستے ہیں، ان کی حیثیت موسمی پرندوں کی ہے اور جب کبھی وہ ہندوستان آتے ہیں، اپنے ملک کا قانون ساتھ لاتے ہیں۔ نیز ہندوستان میں بسے ہوئے عیسائیوں کے لئے خواہ وہ مقامی ہوں یا یورپی، شادی بیاہ اور طلاق وغیرہ سے متعلق علٰحدہ قانون بنایا گیا ہے۔ غرض مختلف اقلیتوں اور فرقوں کے لئے ہندوستان میں مختلف قسم کے شخصی قوانین ہیں۔ لیکن ان میں سب سے اہم دو نظام ہائے قوانین ہیں جو دو بڑی جماعتوں کے شخصی قانون سمجھے جاتے ہیں یعنی دھرم شاستر اور شرع شریف۔ انگریزی دور حکومت میں ان نظام ہائے قوانین کی کیا حیثیت رہی؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے جو کافی وقت چاہتا ہے۔ اس وقت ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ایک غیر مسلم حکومت کے زیر عاطفت اسلامی قانون ہندوستان میں کس حد تک باقی رہا اور اس پر انگریزی دور کے کیا اثرات پڑے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

مسلمانوں کا شخصی قانون، جس پر آج ہندوستان میں عمل کیا جاتا ہے، انگریزی دور میں ایک انوکھی نوعیت رکھتا ہے اور اگر غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا قانون یعنی شرع شریف اپنی ابتدائی شکل اور اصل سے بہت دور جا پڑا ہے۔ شرع شریف پر انگریزی حکومت کے اثرات کا مطالعہ کرنے سے قبل مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اس وقت کے قانون کی کیفیت دیکھی جائے جب کہ وہ پہلے پہل ہندوستان آئے کیونکہ موجودہ قانون کی اصل بنیادیں وہیں سے شروع ہوئی ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمان دو راستوں سے آئے۔ یعنی سمندر اور خشکی کے راستے۔ سمندر کے راستے جو مسلمان آئے وہ ابتداءً ملابار اور کارومنڈل پہنچے اور ان آنے والوں میں، جیسا کہ بعض روایتوں کی بناء پر معلوم ہوتا ہے، بعض لوگ عہد نبوی ہی کے اصحاب نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت یہ ہے کہ ملابار کے سامری (Zamorin) نے شق القمر کے معجزے کے بعد اسلام قبول کیا۔ یہ آنحضرتؐ سے مدینہ میں ملا۔ اس نے وہیں بیعت قبول کی اور یمن میں وفات پائی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جب راجہ سامری ہندوستان سے عرب گیا تو اس نے اپنے بیٹے سے خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی ساتھ چلے اور اسلام قبول کرے۔ بیٹے نے انکار کیا۔ اس پر سامری نے بیٹے کو عاق کیا اور اپنے بھانجے کو جانشین کیا اور کہا جاتا ہے کہ اسی کے بعد سے ملابار کے شاہی خاندانوں میں بھانجے کی جانشینی کا رواج ہوا۔ اس سلسلے میں ایک عجیب بات یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جتنے جانشین ملابار میں ہوئے، سب یہ حلف اٹھاتے تھے کہ ہم راجہ کے عرب سے واپس ہونے تک تخت نشین رہیں گے۔

ممکن ہے کہ سامری کی یہ روایت اصلیت پر مبنی نہ ہو کیونکہ سیرت یا عہد نبوی کی کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ جنوبی عرب کا تعلق ابتدائے اسلام میں ملابار سے رہا ہے۔ چنانچہ حضرت تمیم انصاری جو عہد خلفاء کے مشہور بزرگ ہیں، کارومنڈل میں بمقام کولم مدفون ہیں۔ حضرت عکاشہ کا مزار محمود بندر پر موجود ہے۔ ٹراونکور اور دوسرے بعض مقامات پر اسی ابتدائی زمانے کے بعض بزرگوں کی مسجدیں وغیرہ بنی ہوئی ہیں چنانچہ ملابار میں مالک ابن دینار کی مسجدیں آج تک موجود ہیں۔ اس ابتدائی زمانے میں جو مسلمان آئے وہ ظاہر ہے کہ حنفی یا شافعی کی طرح مقلد تو نہ ہوں گے کیونکہ حنفی اور شافعی مذہب بعد کی پیداوار ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بعد کے اور آنے والوں میں جو سمندر کے راستے سے ہندوستان آئے، عموماً شافعی تھے اور بعض مورخ کہتے ہیں کہ پہلی دفعہ یہی ہندوستان آئے۔ یمن وغیرہ میں شافعی مذہب اب تک ہے۔ جو مسلمان شافعی مذہب لے کر سمندر کے راستے سے ہندوستان آئے یہ لوگ دوسری اور تیسری صدی ہجری کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ بعض مصنف لکھتے ہیں کہ اگر مسلمان واقعی عہد نبوی میں آئے ہوتے تو ہندوستان میں ایک فرقہ ضرور ایسا ہوتا جو حنفی ہو نہ شافعی۔ اس مسئلہ پر بعض مورخ مثلاً زین الدین المعبری وضاحت سے لکھتے ہیں۔ تحفۃ المجاہدین میں جو اکبر کے زمانے میں لکھی گئی تھی، ملابار کے چشم دید واقعات مصنف نے خود ملابار جا کر لکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شق القمر پر ایمان لانے کی روایت غلط معلوم ہوتی ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری میں مسلمان ملابار آئے اور ظاہر ہے کہ امام شافعی کا اس وقت اثر تھا۔

جو لوگ خشکی کے راستے ہندوستان آئے وہ افغانستان اور ترکستان کے لوگ تھے۔ عباسی دور میں جب حنفی مذہب ملک کا سرکاری مذہب ہو گیا تو عباسی سلطنت میں حنفیت چھا گئی۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں ترکستان کے باشندوں میں جن میں مغل اور ترک دونوں شامل ہیں، وقت واحد میں دو مذہبوں نے تبلیغ کا کام شروع کیا۔ عیسائیوں اور مسلمانوں نے سابقت کی۔ اسلام اس دوڑ میں جیت گیا اور یہ لوگ مسلمان ہو کر حنفی قانون کے پیرو ہو گئے۔ بلکہ ترکوں نے تو یہ بھی حکم دے دیا کہ صرف حنفی مذہب ہی سرکاری مذہب ہے اور وہ غیر حنفی مذہب کے لئے مفتی مقرر کرتے تھے۔ حجاز وغیرہ میں حنفیوں کو قاضی مقرر کیا جاتا تھا۔ سندھ کے پہلے عرب فاتح بھیتو پولے مبا (عراق) سے آئے تھے جو حنفی مذہب کا مرکز تھا۔ محمود غزنوی جو پہلی دفعہ وادی گنگا کو عبور کر کے ہندوستان کے اندر بہت دور تک گھس آیا تھا، فارسی زبان بولنے والا ایک ترک تھا اور ترک، خواہ سلجوقی ہوں یا عثمانی، حنفی نقطۂ خیال کے مفتی تھے۔ محمود جو خود حنفی تھا خلیفہ بغداد کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو شاہی خاندان ہندوستان میں حکومت کرتے رہے، مثلاً تغلق جو ترک تھے اور لودھی جو پٹھان تھے، یہ سب حنفی مذہب اپنے ساتھ لائے۔ اس موقع پر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کا اچھی طرح تسلط ہونے تک خراسان اور ماوراء النہر کے بڑے قانونی مکاتب خیال میں حنبلی اور شافعی مذہب کا اثر بہت کم ہو گیا تھا اور ظاہر ہے کہ ہندوستانی علماء یا تو ان ہی درس گاہوں سے فیض یاب ہوتے تھے یا پھر ان ہی مقاموں سے علماء ہندوستان آتے تھے، ان خطوں میں اصل کشمکش اس زمانے میں حنفیوں اور شیعوں کے درمیان تھی اور اس سے ہندوستان بھی متاثر تھا۔ اسی لئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اولاً خشکی کے راستے ہندوستان آنے والے مسلمانوں میں صرف حنفی تھے۔ جو لوگ آج حنبلی یا شافعی وغیرہ نظر آتے ہیں، وہ بعد میں انفرادی شوق کی بناء پر ہوئے ہیں۔ خود مغل بھی حنفی مذہب کے سُنی تھے۔ البتہ مغلوں کے زمانے میں شیعہ اثرات ضرور ہندوستان آئے۔ چنانچہ خاندان مغلیہ کا بانی بابر ایران کے پہلے شیعہ بادشاہ سے

کا فی تقویت ملی تھی۔ اس کے بیٹے ہمایون نے، جب اُسے ہندوستان سے بھاگنا پڑا، ایرانی دربار میں پناہ لی اور جب اسماعیل صفوی کے جانشین طہماسپ کی مدد سے دوبارہ ہندوستان آیا تو کہا جاتا ہے کہ اس نے شیعیت پھیلانے کا وعدہ کیا تھا۔ پورا نہ ہوا لیکن اکبر کے منظور نظر افسروں میں ایک شیعہ افسر ضرور ملتا ہے جو آٹھویں امام کی نسل سے بتایا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں جو وسط ایشیا کے شخصیتیں اور نبرد آزما ہندوستان آئے، ان کے ساتھ مہاجرین بھی آتے رہے اور یہی لوگ اپنے ساتھ شیعہ مذہب لے آئے۔ مثلاً نورجہاں انہی مہاجرین میں سے تھی۔ سب سے پہلے بویہی خاندان شیعہ مذہب اپنے ساتھ لایا۔ بنی بویہ نے جب پائے تخت بغداد پر قبضہ جما لیا تو سلطان اور خلیفہ دونوں ایک ہی چیز بن گئے اور خلیفہ محض ایک کٹھ پتلی ہو کر رہ گیا۔ لیکن ایک بات ضرور قابل ذکر ہے کہ عضد الدولہ نے شیعہ ہونے کے باوجود خطبوں میں سُنّی خلفاء کا نام باقی رکھا۔ مغلوں کے زمانے میں جب ہندوستان کا سرکاری مذہب حنفی ہو گیا تو مغلوں نے دیگر فرقوں کے لئے ان کا شخصی قانون برابر قائم رکھا۔ مغلوں کے بعد شیعوں کا اثر اور بڑھ گیا اور سچ پوچھئے تو خود مغلوں کے زمانے ہی سے شیعہ زور پکڑنے لگے تھے چنانچہ دکن کی دو اسلامی سلطنتوں پر یکے بعد دیگرے شیعہ بادشاہوں نے حکومت کی۔ اورنگ زیب کے تین بھائیوں ہی سے جنھوں نے تخت شاہی کے لئے اورنگ زیب کا مقابلہ کیا، ایک شیعہ بھی تھا۔ نیز وسط اٹھارویں صدی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک اودھ کے نواب وزراء نے جو بعد میں بادشاہ کہلانے لگے اسی شیعہ مذہب کی سرپرستی کی۔

مسلمان سلاطین اور اسلامی قانون

جو اسلامی قانون وسط ایشیا سے ہندوستان آیا، اس میں ہندوستانی حالات اور رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت تبدیلیاں ہونے لگیں۔ مثلاً ذمیوں یا غیر مسلم رعایا سے متعلق جو قواعد اور عمل درآمد تھے، ان میں تبدیلی کرنی پڑی کیونکہ وہ ہندوستان میں اپنی اصلی شان کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ جس طرح عام مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اسی طرح ذمیوں سے جزیہ کی وصولی اسلامی نظم و نسق کا ایک بڑا عنصر تھا۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان سلاطین نے جزیہ وصول کرنے میں کم سے کم توجہ کی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہندوؤں کے ذاتی معاملات، مثلاً ازدواج، تہنیت، وراثت وغیرہ سے متعلق ان کو آزادی دی گئی کہ اپنی مذہبی کتابوں اور رسم و رواج کے لحاظ سے عمل کریں اور ہندوؤں کو مسلمان قاضی کے سامنے بہت کم لایا گیا۔ البتہ اسلامی حکومت نے تعزیرات اور تعزیری سزاؤں کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور اس کے لئے منو کے ضابطہ پر لحاظ نہ کیا جو بذات خود اسلامی قانون سے زیادہ سخت تھا۔ قانون معاہدے کے سلسلے میں بھی تمام فرقوں کے لئے یکسانیت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ پھر بھی جیسا کہ مسٹر بیلی کا خیال ہے، فریقین ہندو ہوں یا مسلمان یا ایک ہندو اور دوسرا مسلمان، ہر صورت میں ایک ہی حاکم عدالت ایک ہی ضابطے کے تحت کارروائی کرتا تھا۔ البتہ زمینوں کے لگان اور ملکیت سے متعلق یہ سوال سر ولیم جونس کے زمانے ہی سے بحث طلب رہا ہے کہ مغلوں نے اس سلسلے میں ہندوؤں کے رسم و رواج اور مسلمانوں کے قانون سے کس طرح فائدہ اٹھایا جو طریقہ بھی مغلوں کا اس انتظام کی نسبت رہا ہو، یہ امر یقینی ہے کہ ہر مذہب اور فرقے کے زمینداروں کے ساتھ ایک ہی طرح کا برتاؤ تھا۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ ہندی مسلمانوں نے شریعت پر کہاں تک عمل کیا اور حنفی معیار پر اسلامی قانون کی کہاں تک پابندی ہوئی، کافی دقت نظر کی ضرورت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس مسئلے کی حد تک ہماری معلومات بھی محدود ہیں۔ مغلوں کے دور میں سلاطین نے رفتہ رفتہ ہندوؤں کے ساتھ قانونی رعایت برتی حتیٰ کہ اکبر اعظم نے اپنی ہندو رعایا کو اپنے معاملات کی حد تک کافی آزادی دے دی تھی بلکہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس مغل شہنشاہ نے ایک نیا مذہب ہی تراشا تھا تاکہ تمام ہندوستانیو

کے لئے مشترک مذہب بن سکے۔ لیکن اس جدت کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ کا مشیر خاص مارا گیا اور خود اکبر سے ناراضگی کا اظہار ہونے لگا اور اسے اپنی موت سے پہلے یہ اعلان کرنا پڑا کہ سلطنت مغلیہ کا سرکاری مذہب شریعت اسلام ہے۔ اور اکبر کے پیروؤں نے تو شریعت کے نفاذ میں سختی سے پابندی کی۔ اس کے باوجود مغلوں کے زوال کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بھی شریعت پر عمل کرنے کا رجحان رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۰ء میں عالیہ عدالت کلکتہ کے سامنے یہ ثابت کیا گیا کہ برطانوی حکومت کے قیام سے کافی عرصہ پہلے ہی سے بنگال کے حکام عدالت یہ تسلیم کرتے رہے ہیں کہ مسلمان اور ہندو دونوں سود پر قرضے کا لین دین جاری رکھتے رہے، حالانکہ مسلمانوں کے شرع شریف کی رو سے سود کی ممانعت ہے۔

ملاحظہ ہو مقدمہ میاں خاں بنام بی بی جان۔ ۵ بنگال لا رپورٹ صفحہ (۵۰)۔

انگریزی حکومت اور شریعت

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی بنیاد ان معاہدات پر رکھی گئی تھی جو انگریزوں نے مغلیہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے ساتھ کئے۔ یہ مغلوں کا آخری زمانہ تھا جب کہ سلطنت کے صوبوں پر مسلمان صوبہ دار مغل شہنشاہ کے وائسرایوں کی حیثیت سے حکومت کرتے تھے۔ انگریزوں نے ان صوبہ داروں سے بنگال، بہار، شمال مغربی صوبے اور کرناٹک حاصل کئے اور ان علاقوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی سنہ ۱۸۵۸ء تک دہلی کے نام نہاد مقتدر اعلیٰ کے نام سے حکومت کرتی رہی۔ لیکن کمپنی کو ابتداءً ایک "فرمان" کی رو سے صرف دیوانی اور مال کے انتظام کا حق ملا تھا اور فوجداری انتظام کئی سال تک بنگال کے نواب ناظم کے ہاتھ میں رہا اور نظامت عدالت یا فوجداری عدالت عالیہ کلکتہ میں نہیں بلکہ نواب کے مستقر مرشد آباد میں قائم تھی۔ اس فرمان میں، جو ابتداءً سنہ ۱۷۶۵ء میں کمپنی کو عطا کیا گیا، اس چیز کی صراحت تھی کہ کمپنی تمام معاملات "شریعت محمدیؐ" اور "سلطنت کے عام قوانین" کے مطابق طے کرے۔ لیکن متعاقب معاہدات یا فرامین میں اس قسم کے تاکیدی الفاظ نہیں ملتے گو ان کی روح میں یہ حکم ضرور موجود تھا اور کمپنی کو رائے عامہ اور تاجدار دہلی کی وجہ سے اس پر ضرور عمل کرنا پڑتا تھا۔ نیز انگریز تاجروں کو مالگزاری وغیرہ وصول کرنے سے اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ قانون کی طرف توجہ کرتے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ اس وقت تک بھی مسلمانوں کا قانون ملک میں جاری تھا۔ البتہ مسلمانوں نے جن معاملات کی حد تک ہندو شاستر کے احکام روا رکھے تھے، وہ حسب حال جاری رہے۔ چنانچہ ۱۷۷۲ء کے قانون کی ایک دفعہ یہ ہے:۔

"In all suits regarding inheritance, succession, marriage and caste. and relegions usages or institutions, the Laws of the Koran with respect to Mohamadans, and those of the Shastras with respect to Gentoos, shall be invariably adhered to."

(Regulation II of 1772, by Section 27.)

ان مخصوص مسائل کو چھوڑ کر وارن ہسٹنگز کی اسکیم میں شرع پر عمل کرنے سے متعلق کوئی حکم نہیں تھا البتہ کمپنی کی زیر اثر تمام عدالتوں میں، خواہ وہ ابتدائی قسم کی ہوں یا عدالت ہائے مرافعہ، دیوانی اور فوجداری امور میں قانونی مشورے کے لئے مسلمان افسر ضرور موجود ہوتے۔ خاص طور پر فوجداری جرائم کی سزائیں شریعت کی بناء پر دی جاتی تھی، خواہ مجرم کا کوئی بھی مذہب ہو۔ ۱۷۹۰ء میں ناظم کے ہاتھ سے اختیار سماعت چھین لیا گیا اور گو اس تاریخ سے نظام قانون رفتہ رفتہ

انگریزی حکومت قائم ہو جانے لگا' پھر بھی مسلمانوں کا عنصر برابر قائم رہا حتیٰ کہ ۱۸۶۰ء میں مجموعہ تعزیرات اور پہلا ضابطہ فوجداری نافذ کیا گیا۔ قانون شہادت ہند بھی ۱۸۷۲ء میں نافذ ہوا اور اس طرح شہادت سے متعلق بھی اب انگریزی قانون کا سکہ رائج ہو گیا۔

غرض مغلیہ دور ختم ہوا اور انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہو گئی تو فطرتاً انگریز تاجروں نے اپنے تمدن اور اپنے نقطہ ہائے خیال کو پھیلانے کی کوشش شروع کر دی۔ گو ابتدا میں ان کی حیثیت نائب دیوان اور سرکاری ملازم کی تھی لیکن ان کی طاقت بڑھتی گئی اور آخر میں شاہ انگلستان کے چارٹر کے تحت بمبئی' کلکتہ اور مدراس میں حکومت قائم کی گئی۔ دیگر علاقوں میں شرع شریف ہی قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب ۱۸۵۷ء کے بعد کمپنی کی حکومت تاج کے ہاتھ میں آگئی تو انگریزی زبان رائج ہوئی اور سرکاری زبان فارسی ختم کر دی گئی۔ اب انگریزی تعلیمی اور ملکی زبان بن گئی۔ ضمناً چند روز تک اردو کی بھی سرپرستی ہوتی رہی لیکن انگریزی سرکاری اور عدالتی زبان قرار پا گئی۔ مرکزی مقننہ کے ذریعے انگلستان کے قوانین یکے بعد دیگرے نافذ ہونے لگے اور مغلیہ قانون برخاست کر دیا گیا اور جس طرح کہ اوپر ذکر کیا گیا' شہادت تعزیرات وغیرہ سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے۔ چنانچہ اب برطانوی قانون کا یہ مسلّم کلیہ بن گیا کہ ملک کے قانون موضوعہ میں کچھ نہ ملے تو برطانوی قانون سے رجوع کرنا چاہئے۔ مسلمانوں کے زمانے میں شرع اسلام کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔

گو یہ صحیح ہے کہ خالص شرع شریف خود مغلیہ دور میں پوری پابندی کے ساتھ نافذ نہ رہ سکا۔ خاص طور پر اس کے تعزیری پہلو کی سختی قانون کے نفاذ میں مانع سمجھی جاتی رہی اور رفتہ رفتہ اسلامی تعزیری احکام نرمی کے پردے میں اپنی اصلیت سے دور جا پڑے لیکن انگریزی دور میں جب مقامی رواجات کی سرپرستی شروع ہوئی تو یہ شرع شریف کے لئے بہت مضر ثابت ہوئی۔ چنانچہ بمبئی' اودھ' پنجاب اور بنگال ڈیلٹو میں بعض خاص رسوم اور رواجات کی پابندی مسلمانوں میں پائی جانے لگی۔ مغربی ہند کے عجیب وغریب رواجات شرع اسلام کا جزو بنا دئے گئے۔ خوجوں' میمنوں اور شیعیوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ اصول مرتب ہوئے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں آپس میں نفاق پیدا ہوا اور ہر جگہ کے مسلمانوں میں الگ الگ رواج بن گئے جن کی سرپرستی کی گئی۔ بعض صورتوں میں تو ایسا بھی ہوا کہ سارے ہندوستان میں کسی فرقے کے زیادہ سے زیادہ سات آٹھ افراد ہوں گے لیکن ان کے لئے بھی ان کا علٰحدہ رواج تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ اب ایک مسلم لا کی جگہ چھ مسلم لا پیدا ہو گئے۔ شیعیوں کے لئے ایک' سنیوں کے لئے ایک وغیرہ۔ ہر فرقے کو اس کے نفاذ کا اختیار دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ انتظام ہوا کہ فریقین کے مذہب کا قانون حاکم عدالت استعمال کرنے لگا۔ اگر کسی مقام کے لوگ اجتماعی طور پر مسلمان ہو جائیں اور ان کی خاص تربیت نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی قدیم روایات کو بھولتے نہیں اور اسلام کے خلاف بھی اکثر وبیشتر کسی حرکت کو برا نہیں سمجھتے۔ ملابار کے مسلمانوں میں کثرت شوہران کا رواج ہے۔ جیسا کہ ملّا نے لکھا ہے' خود حیدرآباد میں مسلمان دیول جاتے ہیں اور ناریل پھوڑتے ہیں۔ غرض رواجات کی سرپرستی سے شرع اسلام کی یہ انوکھی شان ہو گئی۔ اسی طرح جاگیرات سے متعلق عمل درآمد بھی دلچسپ ہے۔ مغلیہ دور میں بادشاہ بیٹے کو جاگیر دیتا تھا یا واپس لے لیتا تھا۔ انگریزی اثر کے تحت یہ طے ہوا کہ جاگیروں کی وراثت میں اصول یہ رہے گا کہ اولاد اکبر کو زیادہ جائداد ملے گی اور باقی کو حق پرورش۔ قاضی سے اختیار سماعت لے کر منصف کو دیدیا گیا اور منصف خواہ مسلمان ہو یا ہندو یا کوئی اور' مسلمانوں کے

شخصی قانون سے متعلق فیصلہ کرنے لگا۔ اور ظاہر ہے کہ غیر مسلم جب اسلامی قانون کو منطبق کرنے کی کوشش کرے تو اس سے لغزش اور غلطی کا کافی امکان رہتا ہے۔ چنانچہ ایسے فیصلوں کا اثر یہ ہوا کہ اسلامی تصورات میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ مقدمات کے فیصلے کے لئے آخری عدالت مرافعہ پریوی کونسل قرار دی گئی اور ایک عرصے تک پریوی کونسل کے تمام ارکان انگریز تھے جو شرع شریف کے مسائل پر غور فرما کر آخری اور قطعی فیصلہ صادر کرتے۔ امیر علی پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے پریوی کونسل میں شرکت کی۔ اسلامی قانون پر انگریزوں کی تعبیر و توضیح سے کافی برا اثر پڑا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ خالص شرع شریف سے ہٹ کر ہندی مسلمانوں کے لئے ایک الگ قانون بن گیا جسے "اینگلو محمڈن لا" کہا جانے لگا۔

اینگلو محمڈن لا خالص شرع شریعت میں انگریزی اثر کے تحت جو تبدیلی ہوئی' اسے سر رولینڈ ولسن کے الفاظ میں دو قسموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ تبدیلی ہے جو ارادی طور پر کی گئی اور دوسری وہ جو غیر ارادی طور پر ہو گئی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے' اسلامی قانون تعزیرات میں رفتہ رفتہ مختلف اوقات میں تبدیلیاں کی جاتی رہیں اور بالآخر قانون تعزیرات ہند کے نفاذ سے اسلامی قانون کی طور پر ختم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ارادی تبدیلی ہے۔ اسی طرح قانون نشان (۵) ۱۸۴۳ء کی رو سے پورے برطانوی ہند میں ادارۂ غلامی برخاست کر دیا گیا۔ قانون نشان (۲۱) ۱۸۵۰ء کے ذریعے تبدیلی مذہب کے لئے یہ سہولت پیدا کی گئی کہ مرتد ہونے کے بعد بھی کوئی شخص وراثت سے محروم نہیں ہوگا۔ ۱۸۷۵ء کے قانون بالغان کے ذریعے بلوغ کی عمر شرع اسلام کے نظریہ سے ہٹ کر علحدہ رکھی گئی اور قانون نشان (۱۰) ۱۸۹۱ء کے ذریعے شادی بیاہ کے لئے بھی خاص عمر مقرر کر دی گئی (Baillie 1. 54.)

ٹھیک اسی ارادی طریقے سے پنجاب' شمال مغربی سرحدی صوبے' اور اودھ میں قانون موضوعہ کے ذریعے حق شفعہ کے اسلامی قانون میں بڑی تبدیلی کی گئی۔ بلکہ حق شفعہ سے متعلق دوسرے صوبوں میں بھی عدالتوں کے فیصلے غیر ارادی طور پر اسلامی قانون کو بدلتے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق شفعہ کا اسلامی اصول کہیں مقامی رواج اور باہمی سمجھوتے کی بنا پر تسلیم کیا جاتا ہے اور کہیں خود مسلمانوں کے معاملات میں بھی قابل قبول نہیں سمجھا جاتا۔

اسلامی قانون میں غیر ارادی طور پر بھی بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں۔ سب سے پہلے یہ بات قابل ذکر ہے کہ یورپی تمدن کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا کہ خود ان کے لئے اسلامی قانون کے بیشتر اصول کی پابندی گراں ہو گئی۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑا عنصر عدالتیں ہیں جو اپنے فیصلوں کے ذریعے نہایت خاموشی کے ساتھ اسلامی قانون میں تبدیلیوں کا موجب ہوتی گئیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کا نظام قانون قرآن شریف اور حدیث پر مبنی ہے اور اجماع' قیاس اور استحسان وغیرہ کے ذریعے اس میں بست و کشاد کی گنجائش رہی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ قاضیوں کے فیصلے آنے والے معاملات کے لئے ہدایتیں ہوتے تھے لیکن جب قاضیوں کی جگہ ان لوگوں نے مسلمانوں کے معاملات طے کرنے شروع کئے جن کو شرع اسلام کے متعلق مبہم معلومات ہوں' یا وہ جن کو اس پر کافی عبور نہ ہو' تو ظاہر ہے کہ زمانے کی رفتار اور غلط نظائر کے انبار میں نص صریح کے اصل مقاصد اور اصل اصول بہت دور جا پڑتے ہیں۔ یہ چیز وقت اور بھی قابل لحاظ اہمیت اختیار کر لیتی ہے جب کہ فیصلہ کرنے والوں کے دل و دماغ بنیادی تبدیلیاں کرنا چاہتے ہوں۔

یوں تو شرع اسلام کے تقریباً ہر شعبے پر انگریزی تعبیر و توضیح' قانون سازی اور نظائر کا کافی اثر پڑا ہے لیکن مشتے نمونہ' نکاح' ولایت' وصیت' ہبہ' وقف اور شفعہ کے مسائل تو بقول شخصے اتنے انگریز زدہ ہو گئے کہ آج

یک مجتہد کے سامنے نت نئے نظائر کا انبار ہے اور اصل اصول جو عرب کی مقدس سرزمین سے نکلے تھے
پس منظر میں معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حکام عدالت کا مقصد صرف تعبیر و توضیح ہے اور وہ قانون
سازی نہیں کرتے لیکن اسی تعبیر و توضیح سے نظائر میں جو اصول طے پا جاتے ہیں وہ رفتہ رفتہ قانون صریح کا مرتبہ
حاصل کر لیتے ہیں اور اس میں بسا اوقات غلط قسم کے قانونی اصول بھی بن جاتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ کوئی غلط چیز
طے ہو جاتی ہے تو وہ برابر دہرائی جاتی ہے اور جب تک صریح قانون سازی کے ذریعے اسے منسوخ نہ کیا جائے، وہ برابر
اہمیت حاصل کرتی جاتی ہے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستانی مقننہ کا ہمیشہ یہ رجحان رہا ہے کہ
ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاملات میں صریح قانون سازی کم سے کم کی جائے اور اس کے لئے جب تک خود غرض مند
مطالبہ نہ کریں، مسودہ قانون مقننہ سے نہیں منظور ہوتا۔ چنانچہ ان غلط اصولوں کو روکنے کے لئے جو نظائر کے
ذریعے قائم ہو گئے ہیں، بہت کم قانون سازی ہوئی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں جو قانون وقف پاس ہوا وہ غالباً
اس نوعیت کا پہلا قانون تھا۔

ردِ عمل

انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں تو مسلمانوں پر ان کے شخصی قانون کی تبدیلی کا کوئی خاص اثر
نہیں معلوم ہوتا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ انگریزی اثر جو پوشیدہ قوت رکھتا تھا، عام مسلمانوں کی
نظر سے پس پردہ رہا اور خود علماء جو مسلمانوں کی کم سے کم مذہبی قیادت کا دعویٰ کرتے تھے، وہ بھی اسے محسوس
نہ کر سکے۔ یہ کچھ فطری بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر زمانے میں نوجوان اپنے پیشرو بزرگوں پر الزام لگاتے ہیں کہ
موجودہ خرابیاں ان کی کمزوری کا نتیجہ ہیں اور ٹھیک اسی طرح سے پیران کہن سال، نوجوانوں پر الزام لگاتے ہیں
کہ ان کی وجہ سے معاشرے کی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اصل حقیقت کیا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اتنا
ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے قانون کی تبدیلی، اس نظام کی تبدیلی جس پر مسلمانوں کو فخر رہا ہے، ہندوستان
میں کچھ انگریزی حکومت کی حکمت عملی کے سبب ہے اور کچھ ہمارے پیشروؤں کی لاپروائی اور بے حسی کے باعث
بہر حال یہی غنیمت ہے کہ بالآخر مسلمانوں کو اپنے قانون کی حفاظت کا خیال پیدا ہو گیا۔ جو خرابیاں نظائر یا عجیب و غریب
قسم کے رسوم اور رواجوں کی پابندی سے پیدا ہو گئی تھیں، ان کو مرکزی مقننہ کے ذریعے دور کرنے کی کوشش شروع
ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں وقف کے متعلق قانون منظور کروایا گیا اور اب وقف علی الاولاد بھی، جسے پریوی کونسل نے
تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا، امیر علی اور دیگر مسلمانوں کی کوششوں سے تسلیم کر لیا گیا۔

اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب اسلامی قانون پر چاروں طرف سے ضرب پڑنے لگی اور سیاسی وجوہ
سے مسلمان خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تو ایک بڑا ردِ عمل شروع ہو گیا۔ وہابی تحریک کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے۔
اسماعیل شہید جیسے لوگوں کا منشا یہ تھا کہ شریعت قائم رہے۔ ابھی حال میں مسٹر جناح کی کوشش سے "شریعت اپلی کیشن ایکٹ"
پاس ہوا اور وصیت اور تبنیت کو چھوڑ کر جملہ مسائل نکاح، وراثت، مہر، نفقہ وغیرہ میں شریعت کے لحاظ سے عمل شروع ہو گیا۔
۱۹۳۷ء کے اس قانون سے بعض خلاف شرع قوانین، جن میں بمبئی، مدراس، بنگال، آگرہ، آسام، پنجاب، یو۔ پی اور اجمیر کے
قوانین شامل ہیں، منسوخ کر دیے گئے اور جملہ خلاف شرع رسم و رواج بھی منسوخ کیے گئے۔ گو اس قانون سے پوری
اصلاح تو نہ ہو سکتی تھی لیکن بڑی اصلاح کی طرف اسے اچھا اقدام سمجھنا چاہئے۔ چنانچہ وصیت تبنیت سے متعلق
بھی شرع اسلام پر عمل کا امکان رکھا گیا ہے اور اگر کوئی خاندان ناظم ضلع کے پاس اپنے کو رجسٹر کروائے کہ وہ

شریعت کا پابند رہے گا تو پھر وہ رواج سے بے نیاز ہو جائے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں اپنے اصلی قانون پر عمل کرنے کا رجحان پیدا ہوگیا ہے خود ہندوؤں نے بھی اپنے قدیم قانون اور رسم و رواج کو چھوڑ کر نئے نئے قدم اٹھائے ہیں۔ نکاح بیوگان، بچوں کی شادی اور طلاق وغیرہ کے مسائل میں نئے مسودات منظور کرائے گئے ہیں جو یا تو اسلامی اثرات کے تحت ہیں یا انگریزی اثرات کا نتیجہ، گو یہ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ چیزیں ان کے ہاں موجود تھیں۔

حفیظ صدیقی

غزل

تقدیرِ عشق آہ و فغاں کے سوا ہے کیا؟ فرمائیے کہ آہ و فغاں ناروا ہے کیا؟

رنگینئ جہاں بھی ہے کس درجہ دل فریب اور وقت بے نیاز بھی سیماب پا ہے کیا؟

اے لطفِ ناتمام ترے لطف کے نثار جز دردِ حسرتِ دل درد آشنا ہے کیا؟

صیّاد، دام، کنجِ قفس، مرگِ بے کسی کس سے کہوں کہ معنئ حسنِ نوا ہے کیا؟

آنسو فسانہ، داغ ہے مہتاب، سانس زیست کیونکر کہوں کہ عشق کی نظروں میں کیا ہے کیا؟

پھر یاد آگئی مجھے گزری ہوئی بہار غم کے بغیر تحفۂ بادِ صبا ہے کیا؟

مجھ سے سہے نہ جائیں گے غم ہائے روزگار تیرا خیال اے دلِ درد آشنا ہے کیا؟

اے جانِ التفات! وفا کی نگاہ میں لطف روا ہے کیا؟ ستم ناروا ہے کیا؟

دل مجھ سے کہہ رہا ہے کہ توبہ کی فکر کر ابرِ سیاہ میکدہ پر چھا گیا ہے کیا؟

میری حیات سجدۂ شکرِ کریم ہے انعام اس کا میری طلب سے سوا ہے کیا؟

تو مل گیا ہے جب تو کہاں پھر مرا وجود موجود جب کہ تو ہے تو پھر ماسوا ہے کیا؟

جامہ ہے تار تار کبھی دل ہے چاک چاک

فطرتؔ تمہارے دردِ جنوں کی دوا ہے کیا؟

ملک عبدالعزیز صدیقی فطرت

تقریب کچھ تو......!

کسی جذباتی انسان کا خیال کوئی پھٹا پرانا کپڑا تو نہیں جسے اٹھا کر پھینک دیا جا سکے ——— ادب کی حقیقت کیا ہے؟ یہی ایک خیال رہ رہ کر خلش زنی کر رہا تھا! بات ہی کچھ ایسی تھی ———

عتیق اپنی شادی کی سالگرہ پر مجھے بڑے اصرار سے گھسیٹ لے گیا، یہ تقریب کچھ بڑے پیمانے پر نہ تھی بلکہ نجی طور پر اور چونکہ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس کی شادی میں شریک نہ ہو سکا تھا، اس لئے خاص کر میری غیر حاضری کو بھلانے کے لئے دوستانہ طریقے پر ترتیب دی گئی تھی ع

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے !

کھانے کی میز پر صرف عتیق، اس کی بیوی اور میں تھا۔ عتیق اپنی رفیقۂ حیات کی شدید محبت اور گہرے جذبات سے اس قدر مغلوب اور بے خود تھا جیسے کوئی رندِ بدمست ! وہ حق بجانب تھا، اس کی بیوی کا رنگ روپ، شوخیٔ رفتار و گفتار سب ایک کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کھانے پر ادھر ادھر کی گفتگو کے دوران میں کچھ شعر و ادب کی بحث بھی چھڑ گئی ——— ادب کی حقیقت کیا ہے؟ اس میں شک نہیں یہ بالکل سرِراہ تھی، لیکن عتیق نے سرور و کیف کے عالم میں اپنی بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ——— ایسی حسین رفیقہ کی معیت میں ادب کا معیار بتانا کون مشکل بات ہے؟ ——— اور پھر بڑے ہی کیف و سرور میں ڈوب کر وہ ادب کی تعریف کرنے لگا کسی جذباتی نوجوان کو موہ لینے کے لئے ایک دوشیزہ کون سے ہتھیار استعمال کرتی ہے؟ سادہ سی بات ہے شوخی، عشوہ و ناز حسنِ سحر انگیز، میٹھے بول اور بناؤ سنگار ! اسی طرح پڑھنے والوں کی دلچسپی کی خاطر شوخی، البیلا پن، حسن اور تمثیل و تشبیہہ اور حسینِ الفاظ ہی ادب کی کنجی ہے ! —

عتیق نے یہ سب کچھ یوں ہی کہہ دیا اور بولتے بولتے کیف میں ڈوب گیا، مگر مجھے ایک تازیانہ سا لگ گیا، میں نے سوچا، آخر میں بھی تو بتا سکتا ہوں کہ ادب کی اصلیت کیا ہے؟ معیارِ ادب کیا ہے؟

رات کے دس بج چکے، میں گھر آ گیا تھا میری بیوی بچے کب کے سو چکے تھے، لیکن مجھے نیند نہ آ رہی تھی نہ آئی، ادب کی حقیقت کیا ہے؟ یہی ایک سوال فٹبال کی طرح دماغ میں اچھل رہا تھا۔ میں نے بہت غور کیا، کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا، آخر کار میں اٹھا، لیمپ کی بتی بڑھائی اور بیوی کو جگا کر کہا ——— "میں ایک نہایت اہم موضوع پر لکھ رہا ہوں، ذرا تھوڑی سی چائے تو بنا دو، مگر دیکھو گڑبڑ نہ کرنا!"

میں نے الماری سے دس پانچ کتابیں نکالیں اور لکھنے بیٹھ گیا، مگر آج نہ جیسے دماغ تھک گیا تھا اور قلم تو ایک اڑیل ٹٹو کی طرح ایک سطر بھی لکھنے سے انکار کر رہا تھا، وہ جھنجھلا گیا، کرسی کا سہارا لے کر آنکھیں بند کر لیں اور قلم کے ایک سرے سے سر کھجاتے ہوئے دماغ پر بار ڈالنے لگا، اتنے میں بیوی دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی اور چائے کی پیالی میز پر رکھ کر بازو کے کمرے میں رونے والے بچے کو سمجھانے چلی گئی۔

——— چائے سامنے رکھی تھی...... اور میں بغیر چائے کے لکھ نہیں سکتا تھا..... چائے ہی تو صرف مجھے کام کی توانائی بخشتی ہے اور چائے کے بخارات کے ساتھ میرے خیالات اڑنے لگے۔

(۱) بہترین ادب دبی جذبات کی پکار ہے۔ اس پکار میں دنیا کے دکھ اور ناانصافیوں پر تڑپنے والی روح کا اضطراب ہوتا ہے، دنیا کے رنگ ڈھنگ پر کھل کھلانے والوں کا ترنم رہتا ہے، جرأت و مقاومت کا جوش ہوتا ہے، آج کل کے لکھنے والوں میں آہ اور واہ کی کمی نظر آتی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ حیاتِ انسانی کا وسیع علم ہی ادب کی کنجی ہے، یہی سبب ہے کہ موجودہ ادیب فضا میں لہرانے والے سماجی انقلاب کے جھنڈے تلے جمع ہونے کے بجائے اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی جھنڈیاں لے کر ایک دوسرے سے لڑنے ہی میں مگن ہیں!

تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد یہ خیال پسند نہ آیا اور پھر ایک خیال سوجھا ــــــــ

(۲) گوناگوں رنگوں کے اتار چڑھاؤ سے مسرت حاصل کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو مصور کے حقیقی خیال سے واقفیت ممکن نہیں، اسی طرح زندگی میں ہر گھڑی پیش آنے والے واقعات اور زیر و بم کا صحیح اندازہ نہ ہو تو ادب کی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا، اور جو اس حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے، اسے لکھنے کی اس قدر جلدی ہوتی ہے کہ وہ ہر مہینے کسی نہ کسی پرچے میں اپنی کہانی چھپی ہوئی دیکھنا چاہتا ہے، آج کل تو مختلف طبقوں اور گروہوں کی تصویریں پیش کی جا رہی ہیں، مارکسی خیالات کے زیر اثر مزدوروں کی زندگی کو رنگ دیا جا رہا ہے، بس اسی پر کچھ لکھ دینا چاہئے، یہی انسان کا اصل مدعا ہوتا ہے۔

مدعا ہوتا ہے، تتلیوں کی طرح اس خیال سے اس خیال پر اڑ بیٹھے، جاپانی پتلے کی طرح کسی پرانے خیال کو از کار رفتہ سمجھ کر یا محض ہٹ دھرمی یا کھوکھلے انکار کی بنیاد پر سیاہی کے ساتھ ترقی پسندی کا ناچ ناچنے والے اردو کے نام نہاد ادیبوں کو ادب کی حقیقت کیا معلوم؟ اور جب تک اس سے واقف نہ ہوں ان کی تحریروں کی قدر و قیمت ہی کیا ہے؟

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

پہلے تو مجھے یہ خیال پسند آیا، لیکن نظر ثانی کے بعد میرے مضمون کا لحاظ کرتے ہوئے قطعی ناموزوں معلوم ہوا۔ اس کے بعد ہی ایک اور خیال ابھرا ــــــــ

(۳) افسانوی ادب کو پیش کرنے والے غیروں کے بنائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں، انھیں لارنس، شکسپیر، ایلیٹ مرغوب ہیں لیکن نذیر احمد، آغا حشر، کالیداس، سرشار، سجاد حیدر پسند نہیں۔ غیروں کے بنائے ہوئے اصولوں اور نفیسرں کے سہارے چلنے والے ادب سے حقیقی تشفی ممکن نہیں۔ اوروں کے خیالات و الفاظ کو جذب کرنے کے بجائے اپنے ماحول کا جائزہ لے کر غور و فکر کرنا ہی اصل معیارِ فن ہے۔ اگر ایسی ہی مشقت اور جگر کاوی کی جائے تو کئی اقبال، غالب، حالی اور نذیر احمد پیدا ہو سکتے ہیں، ابھی تک ہمارے نئے لکھنے والوں کو ادب کی کنجی نہیں ملی، جس کی وجہ سے ادب کی بظاہر ترقی ہو رہی ہے اور سیلاب اڈا چلا چلا جا رہا ہے لیکن یہ سب بلبلوں اور خس و خاشاک سے زیادہ نہیں ہے ع یہ فراسے کا تبسم، یہ خس آتش سوار!

میں نے کافی غور کیا مگر ادب کا اصل امتیاز میری سمجھ میں نہ آیا، کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا آخر کار میں نے سوچا حالی، آزاد اور نیاز جیسے چند ادیبوں کے خیالات کا مطالعہ کرلے کے بعد شاید کوئی خیال سوجھے، چنانچہ ان کی چند تحریروں کو جستہ جستہ پڑھنے کے بعد ایک نظریہ سوجھا ــــــــ

(۴) آج کل افسانوی ادب نے ایک ہلچل مچا دی ہے، ادب اور افسانوی ادب میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہا، ادب کے نام کے ساتھ ہی افسانوی ادب کا تخیل پیدا ہو جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ نوجوان نسل کے دماغ میں ادب کے معنی صرف افسانوی ادب کا تصور ــــــــ یہیں غلط فہمی رچ گیا ہے۔ در اصل ہم جسے افسانوی ادب کہتے ہیں وہ ادب کی ایک شاخ ہے، ادب کے معنی اس قدر وسیع ہیں کہ انسانی دل و دماغ کو جن باتوں سے جولانی، امنگ، جوش اور مسرت حاصل ہوتی ہے وہ سب ادب ہے، وہ تحریکات ہیں جن سے دل کے تار بجتے اور ذوقِ صحیح وجد کرتا ہے۔ اور اس ادب کی کنجی مطالعہ کی وسعت، تخیل کی گہرائی اور مشاہدہ اور تجربے کی صداقت ہے، اس اہم امتیاز سے عدم واقفیت کی بنا پر آج کے ادب میں ــــــــ خصوصاً افسانوی ادب میں اوچھا پن، سطحیت اور جذبات نے قبضہ کر لیا ہے ــــــــ اور فن بے روح اور فطرت و احول کی نقالی ہو گیا ہے۔

[illegible] لکھنے والوں میں اختر رائے پوری
احتشام حسین اور دوسرے چند ادیبوں کی وہ ایک کتابیں
[illegible]

ادب صرف فن کے لئے نہیں بلکہ زندگی کے
لئے ہے "فن برائے فن" کی اصطلاح میں آج تک
نہ کسی [illegible] کا کوئی امکان ہے۔ درحقیقت
"ادب برائے ادب" ایک بے معنی اصطلاح ہے رقص
برائے رقص، گانا برائے گانا، تصویر برائے تصویر، تماشا
برائے تماشا یہ تمام باتیں ایسی ہی ہیں جیسے "حماقت
برائے حماقت"!

فن ایک انسانی عمل ہے، انسان کا کوئی عمل
بغیر مقصد اور افادیت کے ممکن نہیں، زندگی کی راہ پر
چلتے ہوئے انسان کو اچھے اور برے ہر قسم کے تجربات ہوتے
ہیں۔ کسی نہ کسی قسم کی آرزوئیں اس کے دل میں پیدا
ہوتی ہیں ان کی تمناؤں کی مخالفت ہوتی ہے اور اس کے
دل و دماغ میں جوالا پھٹ پڑتا ہے اور اس کے مختلف
بہاؤ ہوتے ہیں، انسانی جذبات کبھی شاعری کی راہ
سے بہہ نکلتے ہیں اور کبھی رقص و سرود، کبھی مصوری
اور کبھی بت تراشی اور کبھی نثر میں! ——— جس زندگی
میں پیچ و خم ہے، روشنی اور اندھیرا ہے اس کا کھلاڑی
ایک سیدھی راہ پر کیسے چل سکتا ہے، سچا فن کار اپنے
کرداروں کو زندگی کے انہی اتار چڑھاؤ کے ساتھ چلاتا ہے
اور یہی امر بن جاتے ہیں، انسان خدا اور جانور کے درمیان
کی ایک چیز ہے۔ اس کی زندگی میں ایک طوفان اور
تلاطم کا نمایاں ہونا ضروری ہے، یہ اور بات ہے کہ دبے
ہوئے میلانات ابھرنے کے لئے حالات کی سازگاری کے
محتاج ہوتے ہیں۔ ایسی تحریریں جن میں عوام کے
جذبات و احساسات کو پیش کیا جائے اور ان میں
ایسی قوت ہو کہ ہم اونگھنے کے بجائے جاگنے لگیں، بےخودی
کے بجائے ہشیاری طاری ہو جائے اور ان میں حیات بخشی
کی قابلیت ہو ترقی پسندی کے نام سے منسوب کی جا رہی ہیں۔
لیکن سنہ ۱۹۳۲ء کے بعد یا اس وقت کے ادب کا سارا رس
اس میں دکھائی نہیں دیتا، اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ آج
کے لکھنے والے ادب کی اہم خصوصیت سے ناواقف ہیں۔
وہ یا تو صرف داخلی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں اور ساری
دنیا کو "حلقۂ دام خیال" بنا کر پیش کرتے ہیں یا پھر سطح
پر تیرنے والے خس و خاشاک کو جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں،
وہ ابھی ناتجربہ کار ہیں، اس میں شک نہیں کہ وہ زندگی
کی تصویر کے لئے کیمرہ لئے کھڑے ہیں مگر ان کی سہل انگاری
شہرت پسندی یا پھر کوئی اور وجہ ہے کہ کیمرے کا فوکس
ذرا ہل جاتا ہے اور زندگی کی صحیح تصویر اُن کے ہاتھ سے
نکل جاتی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ مشاہدوں اور تجربوں
سے ان کے دلوں میں گداز نہیں پیدا ہوا، فن اور رنگینی
تو ہے مگر ادب میں روح نہیں، زندگی ہے اور نہ بلند مقصد!

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!

اقبال کے نظریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک
اور خیال نے میرے دل میں جنم لیا ———

(۲) آج کل ادب میں انسان کی فطری کمزوریوں سے
کھیلنے اور دل و دماغ کو ہوس و جذبات کی تحریص
دلانے والے ناول، عریانی اور بوالہوسی سے آراستہ
افسانے اور معشوق کی زلف و کمر سے مزین شاعری
میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اس میں شک نہیں کہ حسن و عشق کے بغیر لوچ اور
کشش باقی نہ رہے گی، ادب خشک اور بے رس ہو جائے گا،
پھر بھی دنیا کی اٹل اور کھلی حقیقتوں کو "خالِ رخِ یار"
اور "زلفِ چلیپا" اور "وصل کی راحتوں" میں
بھلا دینا قرینِ دانشمندی نہیں ہے، پند و نصیحت سے

انسان حقیقت کو نہیں بھول سکتا۔ آرٹ میں جلال اور جمال دونوں ضروری ہیں، کیونکہ ادب کا جسم فنی ہے لیکن اس کی روح بالکل سماجی ہے۔ اس لئے بدلتے ہوئے رجحانات کا خیال کرتے ہوئے اب ہمیں قوم کو "عشق و عاشقی" کے بھنور میں دیکھنا نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کو پیدا کرنا ہے جن کے جسم فولادی ہوں اور ان کی رگوں میں تیل اور پانی کے بجائے رواں دواں گرم خون ہو ― جسے وقتِ ضرورت گرایا بھی جا سکے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ادیبوں کے دلوں میں گداز پیدا ہو جائے۔ وہ قوم کی تکلیفوں، دکھ درد کو اسی طرح محسوس کریں جیسے کہ ساری قوم محسوس کرتی ہے، خلوص و صداقت ہو۔ ادیب اپنے سفینۂ حیات کو زندگی کی ہیجانی لہروں پر سے کھیتا رہے۔ برخلاف اس کے ادھورے جذبات اور کھوکھلے تجربات کے سہارے جو چیز لکھی جائے گی وہ صرف فطرت و ماحول کی نقالی ہوگی اور بالکل بے روح ع نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!

آج کے ادیب ― چاہے وہ ترقی پسند ہوں یا رجعت پسند ہوں خواہ کوئی اور پسند ― ادب کی امتیازی خصوصیات سے لاعلم ہیں، یہی سبب ہے کہ اس دور میں ایسی مضحکہ خیز اور حیرت انگیز چیزیں پھیلتی جا رہی ہیں، ادب میں فن کاری کو اہمیت حاصل ہے پھر بھی حرکت اور زندگی اس سے زیادہ اہم ہیں، فن زندگی کے تابع ہے، زندگی فن کی محتاج نہیں ہے، جیسے یہ معلوم ہو جائے وہ ادب کے لازوال خزانے پر قابض ہو سکتا ہے۔ اور جب ہمارے ادیب ان چیزوں سے واقف ہو جائیں گے تب ہی ہمارا ادب اپنی تابندگی سے دنیا کو خیرہ کر سکتا ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

اِن چھے مختلف نظریوں کے بعد میں نے کچھ قدیم فارسی اور عربی کتابوں کو الٹا اور چند انگریزی کتابیں بھی نکال لیں، عربی، فارسی کے تذکرے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا۔

(۷) ادب میں گہرائی، رس، صنائع بدائع اور کیف کا وجود خود ادب کا امتیاز ہے۔

اِن ساتوں مختلف خیالات کو میں نے خوب اچھی طرح پڑھ لیا، مجھے محسوس ہوا ― سورج کی تیز، صاف اور شفاف روشنی سات رنگوں پر مشتمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ترشح کے وقت افق پر قوس قزح اپنے سات رنگوں کو پیش کرتی ہے، کیا عجب ہے کہ یہ سات رنگ بھی ایک قوس قزح ہی ہوں؟ آخر اس کا کونسا رنگ میرے کام آ سکتا ہے، مجھے کس خیال سے اتفاق کرنا چاہئے ―

میں نے بے حد سوچا، خوب پڑھا، غور کیا، سنتا ہوں جب یہ پڑھا ہے کہ سورج کی روشنی سات مختلف رنگوں کا نتیجہ ہے، یہ پڑھ لینا اور اصولوں کو یاد کر لینا تو بہت آسان ہے، لیکن سات رنگوں سے ایک رنگ پیدا کرنا بہت مشکل ہے، ہے نا؟

میں بوکھلا اٹھا، میں نے اِن ساتوں اصولوں کو کئی مرتبہ پڑھا اور انھیں ایک دوسرے میں سمو دینے کی بے حد کوشش کی، لیکن پھر بھی کسی ایک سفید رنگ کے حاصل ہونے کی توقع نظر نہ آئی!

گھڑی نے رات کے دو بجا دئیے۔ معمہ حل کرنے والے کو حل نہیں سوجھتا ہے تو وہ گھبرا کر کاغذ اور قلم پھینک دیتا ہے، یہی کیفیت میری بھی تھی، میں نے اسے ویسے ہی میز پر ڈال دیا اور لیمپ گل کر کے سو رہا ―

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں کافی روشنی پھیل چکی تھی اور گھڑی آٹھ بجا رہی تھی، جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور باورچی خانے میں گھس گیا، رجیس بیٹھی کچھ پکا رہی تھی ― ناشتہ کھاتے ہوئے اس نے پوچھا ― کچھ پتہ چلا ادب کی حقیقت کا؟ ―

میں نے اسے رات کے سارے ذہنی انتشار اور قلبی ہیجان کی روداد سنائی۔

وہ کہنے لگی ― "صبح اٹھتے ہی میں نے آپ کے سارے خیالات دیکھے،

[illegible] کے نیچے اپنا خیال بھی لکھ دیا" ——
[illegible] کر سانے تھی ——

—— ادب کی حقیقت اور غایت کے تعین سے پہلے ہر ادیب کو انسانی زندگی کی وسیع مملکت میں قدم رکھنا چاہئے زندگی کو زندگی ہی سے سیکھنا چاہئے اسے ہر قسم کی معلومات ہوں، غیروں کی بنائی ہوئی پگڈنڈیوں پر چلنے کے بجائے اپنے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی طاقت و توانائی کا اندازہ کر کے اپنی راہ آپ بنانا چاہئے، مطالعہ و مشاہدہ اور تفکر کی گہرائی ضروری ہے!

ہمارے داخلی جذبات کو اجاگر کر کے ان میں ایک الہامی تاثر پیدا کرنے کی صلاحیت ہونا چاہئے، فن کاری سے زیادہ آفاقی اصولوں پر نظر رکھنی چاہئے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کے لئے ادب پیدا کیا جا رہا ہے ان سے ادیبوں کو انس ہمدردی اور دلی تعلق ہو، اور یہی ادب کا امتیاز ہے! —

ادیب کو انسانی زندگی کا پورا پورا علم اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ سماج کی اصلاح ہو جائے، سماج انتہا پسندی کو پہنچ جائے اور ادیبوں کے دلوں میں ایک اضطراب سا پیدا ہو جائے، ادیبوں کو اسی وقت حقیقت کا پتہ چلے گا جب کہ خود اُن کے دلوں میں ایک بے چینی اور آگ سی پیدا ہو جائے، غیروں کے چبائے ہوئے نوالوں کو چھوڑ کر اپنا لقمہ اسی وقت بنا سکیں گے جب کہ انھیں اپنے اطراف پھیلی ہوئی سماج اور ماحول سے دلی تعلق پیدا ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جس وقت سماج میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے تو ایسے وقت ادیب کے دل میں ایک عجیب رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ یکایک مطالعہ کرنے لگتا ہے اور خود بخود اس کے خیالات و افکار میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور داخلی جذبات کے زیر و بم سے غیر ارادی طور پر وہ فن کی تخلیق کرتا ہے، بسنت رُت میں جس طرح درختوں میں نئی کونپلیں اور نئی نئی پتیاں آتی ہیں اسی طرح فن میں بھی نئی نئی شاخیں نکل آتی ہیں، اس وقت سماج ایک اہم قوت اور سماجی اصلاح ہی ہمہ گیر اصول بن کر اس کے فن میں ظاہر ہونے لگتا ہے، اختر حسین، حیات اللہ، بیدی، اختر انصاری، ندیم قاسمی، ممتاز مفتی کی تحریروں میں حیرت انگیز فنی خوبیاں نہیں ہیں پھر بھی ان کے دلوں کی انتہائی گہرائی میں عوام کی فلاح و بہبود کا ایک اضطراب ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ اُن ادیبوں سے جو صرف فن ہی کو اصل سمجھے ہوئے ہیں زیادہ مقبول ہو رہے ہیں ——

آج کل ادچھا پن، عریانی اور جنسیات سے معمور ادب خس و خاشاک کی طرح بہہ رہا ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ لکھنے والے عوام کے خلوص و محبت اور صداقت پر خود غرضی کو ترجیح دے رہے ہیں، اس قسم کے پہاڑی نالے کی طرح تیز دوڑنے والے ادب میں سمندر کی سی گہرائی، سکون اور زندگی کیونکر رہ سکتی ہے؟ اپنے دل، شعور اور دماغ میں انتہائی اضطراب، ہمدردی، احساس اور محبت رکھنے والا ادیب اس طرح لکھے گا کہ اس کی تحریر کا ہر صفحہ، ہر سطر اور ہر جملہ اور ہر لفظ زندگی میں ڈوبا ہوا ہوگا۔ کیونکہ فن کار بحرِ حیات کی طوفانی موجوں اور گرداب سے اپنی کشتیٔ دل کو لے جاتا ہے، بعض حیرت انگیز قوتوں کے ساتھ وہ محبت و نفرت، ایثار و خود غرضی کی مخالف لہروں پر چھوڑ دیا گیا ہے، اسی لئے انسانی زندگی میں قدم قدم پر کشمکش ہے، اضطراب ہے، لڑائی ہے اور طوفان ہے اور یہی معیارِ فن ہے! ع

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے

ورنہ چند جملے لکھ لینا یا چند شعر موزوں کر لینا، ادیب اور شاعر ہونے کے لئے کافی نہیں ع

جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

بر جیس کے خیالات سننے کے بعد مجھے محسوس ہوا —— میں ان سات رنگوں سے ایک رنگ حاصل نہ کر سکا لیکن

برجیس نے اسے پالیا۔ ۔ واقعی اپنی بڑائی کی خاطر لکھنے کے بجائے سماج کی فلاح اور بہبود کے لئے لکھنا اور لکھنے والے کے دل میں سماج سے انتہائی محبت اور خلوص کا وجود ہی ادب کی کنجی ہے —— اور حقیقت ہے کہ جب دل میں گداز نہ پیدا ہو تو فن بے روح ہو جاتا ہے۔ اگر صرف خارجیت ہی ہو تو "دیدۂ بینا" کی بجائے "لڑکوں کا کھیل" ہی تو رہ جائے گا ————

اور مجھے اپنی رفیقۂ حیات پر فخر سا محسوس ہونے لگا عتیق کی بیوی کے حسن جمال اور نسوانیت کے دلفریب خط و خال نے میرے اندر جو احساس کمتری پیدا کر دیا تھا وہ برجیس کی اس معنوی خوبی سے کالعدم ہو گیا۔

میں نے سوچا کہ میری بیوی عتیق کی رفیقۂ حیات کی طرح تشکیل و جمیل اور حسن دلآویز کا مجسمہ نہیں ہے، اس کی سی شوخی، چنچل پن اس میں نہیں ہے لیکن اس کی فطرت اور ذہانت اس قدر بلند ہے کہ پھر کسی خیال کی تمنا نہیں رہتی۔ اس سے پہلے بارہا اس نے اپنی فطرت اور سیرت کے محاسن سے مجھے متاثر کیا تھا اور آج تو ایسا محسوس ہوا کہ حسین اور شوخ عورت آنکھوں کے لئے نور و سرور ہو سکتی ہے لیکن رفیقۂ حیات نہیں! اور خارجی خوبیوں سے زیادہ داخلی محاسن رکھنے والی عورت طوفان حیات میں ایک اچھی مونس و غمخوار اور حقیقی دوست بن سکتی ہے! ——

شاہین فاروقی

نوباغ کے گنبد

اسی طرح [illegible] کے تلے اکیلے گنبد، ہفت گنبد سے جانب جنوب واقع ہیں اسی طرح جیسا پوری مسجد کے سامنے کے تینوں گنبد جو اب نوباغ کے احاطے میں آگئے ہیں، ہفت گنبد سے دو ایک فرلانگ کے فاصلے پر جانب شمال واقع ہیں اور اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ ان میں ایک گنبد چھوٹا ہے اور دو بڑے۔

چھوٹا گنبد اس کا ہر ضلع اندر سے ۱۹ فٹ دو انچ اور باہر سے ۲۶ فٹ ۲ انچ ہے۔ اندر سے قبہ اور دیواروں کی ساری گچ جھڑ گئی ہے۔ کمانوں اور نیم محرابوں کا بھی یہی حال ہے۔ صرف مشرقی کمان کی گچ باقی ہے اور اس کے دونوں ڈھال نما پھول بھی رہ گئے ہیں۔ سوائے ان پھولوں کے اس پر کسی قسم کا نقش و نگار نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کمانیں اور نیم محرابیں بالکل بے نقش اور سادہ ہوں گی۔ اس کی بائیں طرف کے نیم محراب پر بھی ایک ڈھال نما پھول رہ گیا ہے اسی طرح جنوبی کمان کے اوپر کے آدھے حصے پر گچ اور ایک ڈھال نما پھول باقی ہے۔ مغرب رویہ محراب پر بھی ذرا سا نقش ہے جو بہت معمولی ہے اور دو ڈھال نما پھول ہیں۔ یہ تمام پھول چھوٹے چھوٹے اور بہت معمولی ہیں۔ قبہ بھی بالکل سادہ ہے سوائے لوح نما کنگروں کے اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ان تمام باتوں سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گنبد دورِ اول کے ابتدائی حصے کا ہے اس لئے کہ اس کی کمانوں کا طرز اسی دور کا ہے۔ مغربی محراب کے بیدھے بازو ایک بہت ہی چھوٹا سا طاقچہ گچ کا بنا ہوا ہے۔ کیا عجب ہے کہ گنبدوں میں طاقچہ کی ابتدا اسی سے ہوئی ہو۔

یوں تو کہنگی کی وجہ سے پورے گنبد ہی کی حالت خستہ ہے مگر قبہ کی حالت تو اور بھی بری ہے، بیچ میں اور اطراف میں کئی سوراخ پڑ گئے ہیں باوجود اس کے اوپر کی استرکاری جوں کی توں باقی ہے اور چونکہ نہ اب تک کبھی اس کی داغ دوزی ہوئی ہے اور نہ کبھی آہک پاشی کی نوبت آئی ہے اس لئے صدیوں کی بارش اور گرد و غبار سے اس کا رنگ اتنا سیاہ ہو گیا ہے جس سے ہم اس کی قدامت کا اندازہ کر سکتے اور اگر کوئی پیمانہ ایجاد ہو تو اس سے صدیوں کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔ مگر گرمیں اس وقت اس سے زیادہ سیاہ کوئی قبہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے دور اول کے قبہ کو ہم اصلی حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ وضع قطع میں یہ ایسا ہی ہے جیسے حیدر باڑی کے گنبد کا قبہ۔ وہ بڑا ہے اور یہ چھوٹا۔ اس گنبد کی دیواریں سلامی ہیں اور اس کی سیدھی۔ دور اول کے گنبدوں میں یہ گنبد سب سے چھوٹا ہے، گنبد کا چبوترہ جانب مشرق ۲ فٹ بلند ہے۔ اس کی اس بلندی کو خوبصورت اور کارآمد بنانے کے لئے اس کے نیچے تین پختہ کمانیں تہ خانہ کے شکل کی بنا دی ہیں اگر ان پر دروازے لگا دئے جائیں تو چھوٹے چھوٹے کمروں یا کوٹھوں کا کام دے سکتے ہیں۔

بڑا گنبد اس چھوٹے گنبد سے جانب مغرب، تقریباً ۳۸ فٹ کے فاصلہ پر ایک بڑا عالی شان گنبد ہے جس کا ہر ضلع اندر سے ۳۴ فٹ چار انچ اور باہر سے ۴۹ فٹ ہے۔ اندر و باہر کی اکثر گچ جھڑ گئی ہے اور گنبد خستہ حالت میں ہے۔ علاوہ ازیں وہ نقش و نگار سے بالکل خالی ہے۔ کمانوں اور نیم محرابوں پر صرف ایک ہلال نما بیل دوڑا دی گئی ہے البتہ مغرب رویہ محراب پر اس سے مختلف دوسری قسم کی خوش نما بیل ہے اور سیدھی طرف ایک طاقچہ ہے۔ اس نہایت مختصر گلکاری کے ساتھ ہر ایک پر مختلف نقش کے دو دو ڈھال نما پھول بنے ہوئے ہیں۔ باہر کی طرف بھی کمانوں پر ایسے ہی پھول بنے ہوئے ہیں۔ مغربی محراب پر ہلالی کنگرے بھی تھے جو سب کے سب جھڑ گئے۔

ان کی کچھ علامتیں بائیں جانب باقی رہ گئی ہیں۔ ان ہلالوں کی دو حالتیں ہیں، کہیں تو ان کے جڑ جانے سے کمان پر کچھ اثر نہیں پڑتا صحیح سالم رہتی ہے جیسے ہیکل باؤلی کے گنبد کی کمانیں اور کہیں ان کے جڑ جانے سے کمان شکستہ ہو جاتی ہے جیسے زیر بحث گنبد میں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلی صورت میں ہلال، کمان بننے کے بعد بنائے جاتے ہیں اس لئے وہ پوری طرح پیوست نہیں ہوتے اور دوسری صورت میں کمان کے ساتھ ساتھ اسی میں ہلال تراشے جاتے ہیں۔ مغربی محراب کی گولائی میں نہ تو کوئی پھول ہے اور نہ اس کے گوشوں میں آرائشی ستون ہیں اور نہ ستونوں کے درمیان کوئی ابھری ہوئی کمان ہے اور نہ کلام شریف کی آیتیں تحریر ہیں۔ کمانوں کے ہاتھ لٹکے ہوئے، نیچے سے پھیلے ہوئے اور بالکل سے ہیں بالکل ویسے جیسے مجاہد شاہ کے گنبد کے۔ ان تمام باتوں سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور اول کے کے ابتدائی حصے میں بنا ہوگا اس دور کی کمانوں کو اصلی حالت میں دیکھنا ہو تو اس گنبد میں دیکھنا چاہئے۔ مزید براں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہلالوں کا استعمال اس قدر عام اور مقبول تھا کہ دور اول کے ابتدائی حصے میں بھی جب کہ دوسری آرائشوں کی ابھی ابتدا نہیں ہوئی تھی ان کا استعمال کہیں کہیں ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی طرح خوزہ ماں صاحبہ کے گنبد میں بھی ان کا استعمال ہوا ہے۔ اس گنبد کا قبہ بھی اندر سے بالکل سادہ ہے صرف کتاب نما کنگرے اطراف میں ہیں۔ ممکن ہے بیچ میں گول پھول بھی ہو مگر اب وہاں کی تمام گچ ہی جھڑ گئی ہے۔ اوپر سے قبہ چپٹا ہے اور اتنا خوبصورت نہیں ہے جتنا کہ ہیکل باؤلی کے گنبد کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دور اول میں دونوں قسم کے قبے استعمال ہوتے رہے، ابھرے ہوئے اونچے اور چپٹے پست ان دونوں کی مثالیں یہاں اس چھوٹے بڑے گنبد میں موجود ہیں۔

دوسرا بڑا گنبد مذکورۂ بالا بڑے گنبد سے جانب شمال تقریباً ۷۴ فٹ کے فاصلہ پر ایک اور اتنا ہی بڑا گنبد ہے۔ اس کا ہر ضلع اندر سے ۳۳ فٹ ۲ انچ اور باہر سے ۴۹ فٹ ۵ انچ ہے۔ اس کی کمانیں اور نیم محرابیں فیروز شاہی طرز کی ہیں۔ دور اول اور دور ثانی دونوں کے نمونے یہاں آمنے سامنے موجود ہیں۔ اندر ہر طرف مچان باندھنے کے سوراخوں سے اور ویسے بھی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیواروں اور کمانوں کی استرکاری نہیں ہو سکی ہے اس لئے استرکاری سے پہلے کی حالت دیکھنی ہو تو ہم یہاں اس کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ اس گنبد میں اب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مغربی کمان کے ہر دو طرف دو بڑے طاق ہیں۔ پورے قبہ میں کمانوں اور نیم محرابوں کے اوپر اوپر تک استرکاری ہو چکی ہے اور وہ اب بھی موجود ہے چنانچہ سب سے پہلے ہر کمان اور نیم محراب پر گچ میں خوش نما طاق بنے ہوئے ہیں، ایسے آٹھ طاق ہیں۔ ان کے اوپر لوح نما کنگروں کا حلقہ پڑا ہوا ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک منقش پتلا سا حلقہ ہے، اس حلقے پر چار منقش چھوٹے چھوٹے پان ہیں اور ہر دو پانوں کے درمیان ایک گول پھول؛ اس کے اوپر کچھ فاصلے سے بیچوں بیچ ایک گول پھول ہے جس کا اکثر حصہ جھڑ گیا ہے۔

یہ تمام نقوش بہت معمولی اور ادنیٰ قسم کے ہیں۔

باہر تمام گنبد پر قبہ سے لے کر دیواروں تک استرکاری ہو چکی ہے مگر اکثر جھڑ گئی ہے۔ ہر کمان پر دو دو ڈھال نما پھول باقی ہیں۔

میر جہانگیر علی خاں

ضروری اطلاع:۔ نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ براہ کرم خریدار اصحاب نئے سال کا چندہ تقسیم کنندۂ سب رس سے باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل کر کے عنایت فرمائیں۔ اضلاع کے خریدار بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں یا وی۔ پی کرنے کے لئے دفتر کو آرڈر روانہ فرمائیں۔

علمِ جرثومیات کا امام ـــ پاسچر

لوئی پاسچر ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا۔ پاسچر کا باپ نپولین کی فوج کا ایک سپاہی تھا جس نے بعد میں ایک چھوٹے سے فرانسیسی قصبے میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور چمڑوں کی دباغت کا کام کرنے لگا۔ پاسچر کی ابتدائی زندگی نہایت ہی سادہ رہی۔ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے سائنس کا عظیم حکیم اپنی نوعمری میں بھی انتہائی فطین ہوگا وہ یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ اپنے مکتب کے زمانہ میں وہ ایک متوسط درجہ کا طالب علم تھا۔

۱۸۴۰ء میں پاسچر نے طیلسان کی ڈگری حاصل کی، اس کے ممتحنوں نے جوابی پرچوں کے دیکھنے کے بعد اس کے متعلق یہ نوٹ لکھا۔

"یونانی، لاطینی، فن خطابت، طب، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ میں بہتر، ابتدائی سائنس میں بہترین، فرانسیسی مضمون نویسی میں بہتر"۔

۱۸۴۳ء میں وہ ایک ایسے ادارے (Ecole Normale) میں داخل ہوا جہاں پروفیسروں کی ٹریننگ کا انتظام تھا اور یہیں اس نے ٹارٹرک اور پاراٹارٹرک ترشوں کے قلموں کا مطالعہ کیا گویا یہ اس کے پہلے سائنٹفک تجربے تھے۔

۱۸۲۰ء میں ایک الساسی دوافروش کیسنر نے ٹارٹرک ترشے کی تیاری کے دوران محض اتفاق سے ایک ایسا ترشہ حاصل کیا تھا جسے وہ دوبارہ باوجود کوشش کے تیار نہ کرسکا۔ گے لوسک نے اس عجیب و غریب ترشے کا امتحان کرکے اس کا نام رسمک ترشہ تجویز کیا، لیکن برزی لیس نے یہ رائے دی کہ اسے پاراٹارٹرک ترشہ کہنا چاہئے، بہرحال پاسچر کے تجربوں سے اس نامعلوم الاصل مرکب کی ساخت واضح ہوگئی۔ اس نے اس ترشے کی دو شکلیں تمیز کیں یعنی ایک وہ جو انگور کے ٹارٹرک ترشے سے حاصل ہے اور جسے عام زبان میں دست راست کا ترشہ اور دوسرا وہ جسے دست چپ کا ترشہ کہنا چاہئے۔ یہ مشاہدہ دراصل اس اہم علم کا سنگ بنیاد ہے جو بیس سال بعد تجسیمی کیمیا کے نام سے ایک مستقل حیثیت کا مالک ہوا۔

گریجویٹ ہونے کے بعد پاسچر سٹراس برگ بھیج دیا گیا جہاں اس نے اکادمی کے ریکٹر کی لڑکی ماری لاران سے شادی کرلی۔ ۱۸۵۴ء میں وہ لِل کی نئی سائنس فیکلٹی کا ڈین اور پروفیسر ہوگیا اور بہت جلد ہی اس کی جماعت علم کیمیا کی تعلیم کے لئے مشہور ہوگئی۔ اس کے دو سال بعد یعنی ۱۸۵۶ء میں لِل کے ایک شراب کے کارخانہ کا مالک نوجوان ڈین کے پاس مشورہ اور امداد کے لئے دوڑتا ہوا آیا۔ اس شخص کو جو چقندر سے الکحل تیار کرنا چاہتا تھا، اپنی اس کوشش میں سخت ناکامی ہوئی تھی۔ پاسچر نے یہ دیکھ کر کہ یہ موقع تخمیر کے مطالعہ کے لئے سودمند ثابت ہوگا فوراً اس کی امداد کے لئے راضی ہوگیا۔

اس نے تخمیر کا باضابطہ مطالعہ شروع کیا اور اپنے تجربوں میں خاص طور پر دودھ کی کھٹاس پر نظر رکھی جسے سائنٹفک زبان میں لیاکٹک تخمیر کہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ پھٹے ہوئے دودھ میں ایک خاکستری رنگ کی شے کے اندر نہایت مہین مہین دانے مرتب تھے جن کی جسامت الیسٹ سے بھی چھوٹی تھی اور وہ دیگر بیلاک حاصلات سے اس قدر مشابہ تھے کہ اب تک دوسرے کیمیادانوں اور ماہرین حیاتیات کی نظریں ان پر نہ پڑ سکی تھیں۔

جب اس خاکستری شئے کو علیحدہ کرکے اس کی نہایت قلیل مقدار تازہ دودھ میں شریک کی گئی تو پاسچر نے دیکھا کہ لیاکٹک تخمیر کی مخصوص علامتیں نمودار ہوگئیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ خاکستری شئے دراصل ایک خامرہ ہے۔

اس دوران میں پاسچر پیرس آگیا جہاں (Ecole Normale) میں سائنٹفک تحقیقات کا کام اس کے سپرد کردیا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سترہویں صدی عیسوی سے قبل ہی سائنٹفک دنیا میں زندہ اجسام کی از خود پیدائش کا نظریہ اپنی اہمیت تقریباً کھو چکا تھا، لیکن اس زمانہ میں خوردبین کی ایجاد کے ساتھ ساتھ ہی بظاہر اس کی موافقت میں نئی نئی دلیلیں مہیا ہونے لگیں۔

مثلاً بارش کے پانی اور دوسری نامیاتی مائعات میں جو ہوا میں کھلے رکھے جائیں نہایت ہی چھوٹی چھوٹی جسامت کے جاندار رونما ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ نظریہ ازخود پیدائش کی موافقت میں یہ حجت پیش کی جانے لگی کہ اگر یہ جاندار خود بخود پیدا نہیں ہوئے تو پھر کہاں سے آئے؟

دسمبر ۱۸۵۸ء میں پوشے نے سائنس اکاڈمی میں ایک مقالہ روانہ کیا جس کا عنوان تھا "مصنوعی ہوا اور آکسیجن میں نباتی اور حیوانی عضویوں کی ازخود پیدائش"۔ اس سائنسداں نے یہ بیان کیا کہ اس نے اپنے تجربوں میں غلطی کے امکانات کے سدباب کی خاص کوششیں ملحوظ رکھی تھیں اور یہ بلند آہنگ دعوی بھی کیا کہ وہ ہوا اور آکسیجن سے معرا فضا میں جانداروں کی ازخود پیدائش کو دکھلا سکتا ہے۔

ابھی سائنسداں اس مسئلہ پر بحث کر ہی رہے تھے کہ پاسچر نے خوردبین کے ذریعہ فضائی ہوا کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ہوا میں جراثیم موجود ہوتے ہیں تو انھیں روکا جا سکتا ہے چنانچہ ایک نلی میں سے جس کے ایک سرے پر شیشہ روئی کا ڈاٹ لگا دیا گیا تھا ہوا گزاری گئی تو شیشہ روئی پر جمنے والی گرد میں کئی جراثیم موجود تھے۔ اس کے بعد اس نے مسلسل تجربے کئے اور یہ دکھلانے کی کوشش کی کہ اگر کوئی نامیاتی مائع، فضائی ہوا کی دسترس سے دور رکھا جا سکے تو وہ عرصہ لامتناہی تک خالص رہ سکتا ہے۔

پانچویں مارچ ۱۸۶۰ء میں وہ لکھتا ہے کہ "جتنے تجربے میں نے اس وقت تک کئے ہیں اگر انھیں اکٹھا کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نامیاتی مائعات میں عضویوں کی پیدائش کی علت خالص فضائی ہوا کی گرد مہیا کرتی ہے"۔

اس کے بعد پاسچر نے پھر سے تخمیر کا مطالعہ شروع کیا اور اس سلسلے میں لیاکتک تخمیر کے مشاہدے کے دوران میں وہ ایک اور تخمیر سے دوچار ہوا جسے بیوٹرک تخمیر کہتے ہیں اور جس کی وجہ سے باسی مکھن میں بدبو پیدا ہوتی ہے اور چونکہ اول اول وہ اس تخمیر کا اصلی سبب نہ معلوم کر سکا تھا اس لئے وہ اس ترشے کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہوائی جراثیم کی موجودگی سے بہت متاثر ہوا۔

فروری ۱۸۶۱ء میں پاسچر لکھتا ہے "تجربوں کو متعدد مرتبہ دہرانے پر بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شکر، نشاستہ اور لیکٹک ترشے کی بیوٹرک ترشے میں تبدیلی صرف انھیں عضویوں کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہی عضوئے اصلی بیوٹرک خامرے ہیں"۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ جراثیم چھوٹے استوانہ نما اجسام ہیں جو انفرادی طور پر یا زنجیروں میں حرکت کرتے ہیں اور جب ان جراثیم کو موزوں مائعات میں اگانے کی کوشش کی گئی تو ایک اور عجیب حقیقت ظاہر ہوئی چنانچہ وہ اپنے تجربوں کی تفصیل کے دوران میں یہ بیان کرتا ہے کہ "یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ جراثیم ہوا کی موجودگی کے بغیر نمو پاتے ہیں بلکہ لطف تو یہ ہے کہ ہوا ان کی ہلاکت کا موجب ہوتی ہے"۔

اس سائنسداں نے شرابوں کی خرابی کے اسباب کا بھی تحقیقی مطالعہ کیا چنانچہ ۱۸۶۴ء میں وہ لکھتا ہے "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ شراب کی بیماریاں بھی خامروں، خوردبینی نباتے اور ایسے جراثیم کی وجہ رونما ہوتی ہوں جو فضائی تبدیلیوں، تپش کے اختلافات وغیرہ سے شرابوں میں پیدا ہو جاتے ہیں"۔ بعد میں اس نے دکھلایا کہ اگر شراب کو ابتدا میں ۵۰ سے ۶۰ سنٹی گریڈ کی تپش میں تھوڑی دیر تک رکھا جائے تو یہ طریقہ ہر لحاظ سے سودمند ثابت ہوتا ہے۔

اس زمانہ میں ریشم کی کاشت والے خطوں میں ایک وبائی مرض پھوٹ پڑا اور اس مرض کی تباہیاں بڑھنے لگیں تو لوگوں نے پاسچر سے درخواست کی کہ وہ اس وبا کا اصلی سبب دریافت کرے۔ چنانچہ اس نے بڑی ہی کدوکاوش کے بعد نہ صرف ریشم کے کیڑوں کی بیماری کی اصلی وجہ معلوم کرنے میں کامیابی حاصل کی بلکہ اس سے بچنے کی احتیاطی تدابیر بھی اہل ملک کو بتلائیں۔ اس طرح پاسچر نے فرانس کی ریشم کی صنعت کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔

اس سے فرصت ہوئی تو پاسچر نے اپنے تجربوں کا رخ ایک اور جانب پھیر دیا لیکن اس مرتبہ جذبہ حب الوطنی نے اس کو اکسایا تھا۔ بات یہ تھی کہ ایک زمانہ سے جرمنی بیئر کی تیاری کے لئے

شہرت حاصل تھی اور صنعت میں فرانسیسی جرمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ پاسچر نے یہ طے کیا کہ وہ بیر کی تیاری کا سائنٹفک مطالعہ کرے تاکہ اہل فرانس کو اس مفید صنعت سے فائدہ ہو سکے۔

اس زمانہ میں ٹمپالیرے میں بیر کا ایک کارخانہ موجود تھا۔ پاسچر نے کئی مرتبہ خود جا کر اس کارخانہ کو دیکھا اور کارخانہ والوں سے مختلف تفصیلات دریافت کیں لیکن اس کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کارخانہ کے کارکن اپنی صنعت کی کئی جزئیات سے قطعاً ناواقف تھے۔ جب کبھی ان کے گاہک کوئی شکایت کرتے یا بیر خراب ہو جانے کی اطلاع مالکوں کو دیتے تو فوراً ایک نیا خامرہ بیرون ملک سے منگوا لیا جاتا۔ اس طرح ہر مرتبہ نئے خامرے کی وجہ سے بیر کا معیار قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

پاسچر نے مختلف بیر شرابوں کے نمونے حاصل کئے اور ان پر تجربے کرنے کے بعد وہ حسب ذیل نتائج پر پہونچا۔

(۱) خاص شراب یا بیر خراب ہونے میں ہر تبدیلی کی وجہ جراثیم ہوتے ہیں۔

(۲) یہ جراثیم یا تو ہوا سے آتے ہیں یا اجزا مستعملہ سے، یا ان برتنوں میں ہوتے ہیں جنھیں بیر کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(۳) بیر میں جراثیم نہ ہوں تو وہ غیر متبدل رہتی ہے۔

اسی طرح ان سے یہ بھی دکھلایا کہ اگر تمام مشروبات کو پہلے سے گرم کی ہوئی بوتلوں میں ۵۰ تا ۵۵ درجہ تپش کے زیر اثر بھرا جائے تو ان میں مطلق خرابی نہیں ہوتی۔ اس طرح سائنسی ادب میں ایک نئی اصطلاح (Pasteurization) کا اضافہ ہوا جس سے مراد مذکورہ بالا طریقہ پر بیر یا شرابوں وغیرہ کو محفوظ کرنا ہے۔

ان کامیاب تجربوں کے بعد پاسچر نے اس مہلک بیماری پر تحقیقات کا آغاز کیا جسے انتھراکس (Anthrax) کہتے ہیں۔ فرانس میں اس متعدی مرض کے شروع ہو جانے سے زراعت کو سخت نقصان پہونچ رہا تھا، اس لئے اس سے جو مویشی متاثر ہوتے وہ آناً فاناً میں مر جاتے تھے جس گاؤں میں پہنچا تو اس مرض منحوس سے سارے کے سارے مویشی تباہ ہو جاتے تھے۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی اس وبا سے کافی نقصان پہونچ رہا تھا مثلاً ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۰ء کے درمیان روس کے ضلع نووگراڈ میں (۵۶ ہزار) زراعتی مویشی اور (۵۲۸) انسانی جانیں اس مرض کا شکار ہو گئیں۔

بہت زمانہ قبل یعنی ۱۸۳۸ء ہی میں الفرٹ کے ڈاکٹری اسکول کے ایک پروفیسر موسیو ڈیلافان نے یہ دکھلایا تھا کہ انتھراکس سے مرے ہوئے مویشی کے خون میں چھوٹی چھوٹی سلاخ نما شکلیں ہوتی ہیں لیکن یہ دریافت محض ایک دلچسپ بات ہی ہو کر رہ گئی اور کسی نے اس کی سائنٹفک توجیہ نہیں کی۔

اسی زمانہ میں ایک جرمن طبیب ڈاکٹر کاخ ان جراثیم کو مصنوعی طور پر اگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اگر ان جراثیم کو خاص غذائی محلول میں رکھا جائے تو وہ تیزی سے نمو کرنے لگتے ہیں اور چند گھنٹوں کے اندر اندر اپنی اصلی جسامت سے ۱۰۰-۲۰۰ گنا زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اس طبیب نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ کچھ عرصہ کے بعد جراثیم کے جسم میں مہین مہین دانے پیدا ہو جاتے ہیں۔

پاسچر نے ریشم کے کیڑے کی بیماریوں پر تجربہ کے دوران میں یہ دکھلایا تھا کہ یہ دانے دراصل معمولی پودوں کے تخم یا بیج سے مشابہ اجسام ہیں جن کو سائنس کی اصطلاح میں "بذرے" کہا جاتا ہے اور جن سے جراثیم کی افزائش ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ انتھراکس کا جرثومہ بھی اپنی افزائش اسی طرح کر سکتا ہے اور جب ان سے پیدا شدہ جراثیم کو مصنوعی طور پر خرگوش، چوہے، اور گنی پگ کے جسم میں داخل کیا گیا تو وہی علامات رونما ہو گئیں جو انتھراکس کی بیماری یا انتھراکس سے مرے ہوئے کسی جانور کے خون کے لگ جانے سے پیدا ہوتی ہیں۔

ان جراثیم کو جب ۴۰ درجہ سنٹی گریڈ تپش پر رکھ کر دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اب بذرے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہے لیکن اس ضمن میں ایک اور اہم بات بھی دریافت ہوئی وہ یہ کہ جراثیم

کا وہ غذائی محلول جس میں انھیں مصنوعی کاشت کے لیے رکھا گیا تھا وقت کے ساتھ اپنی مضرت رساں قوت بھی کھوتا جاتا تھا مثلاً جسم میں مصنوعی طور پر داخل کرنے پر اگر یہ کاشتی محلول ابتدا میں دس میں سے دس جانوروں کے لیے ہلاک ثابت ہوتا تو آٹھ روز کے وقفہ کے بعد یہی صرف چار یا پانچ کو ہلاک کر سکتا اور دس یا بارہ روز گزر جانے پر تو وہ بالکل بے ضرر ہو جاتا یعنی یہ معلوم ہوا کہ وہ جانوروں کے جسم میں کوئی ایسی مدافعتی قوت پیدا کر دیتا ہے جو انھیں اس مہلک بیماری کے اثرات سے محفوظ کر دیتی ہے۔

اس کے بعد ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر بہت بڑے بڑے پیمانوں پر تجربے کئے گئے اور یہ دیکھ کر سائینسدانوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ پاسچر کی یہ دریافت ایک معجزہ ہے چنانچہ اس طریقہ سے فرانسیسی کسانوں کے لاکھوں مویشی بچا لئے گئے۔

اسی سلسلہ کے تجربوں کے دوران میں پاسچر ہائڈرو فوبیا (Hydrophobia) کے مسائل کو سب پر ترجیح دیتا رہا، اس زمانہ میں اس تکلیف دہ اور خطرناک بیماری کے متعلق سوائے اس کے کچھ معلوم نہ تھا کہ

(۱) دیوانے جانوروں خصوصاً دیوانے کتے کے تھوک میں اس بیماری کا سمی مادہ موجود ہوتا ہے۔

(۲) متاثرہ جانوروں کے کاٹنے سے یہ مرض دوسروں میں منتقل ہو جاتا ہے۔

(۳) جانور کے کاٹنے اور بیماری کے اثرات کے ظاہر ہونے کے درمیان عموماً چند دنوں سے تب کہیں کئی ماہ تک کا وقفہ دکھائی ہوتا ہے۔

ایک سگ گزیدہ مردہ بچے کے لعاب دہن کو مصنوعی طور پر خرگوش کے جسم میں داخل کر کے پاسچر نے یہ ثابت کیا کہ اس طرح بیماری ایک جانور سے دوسرے میں منتقل کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد اس حاضر دماغ سائینس داں نے اپنے کے تجربوں کو دہرا کر اس سمی مادے کی قوت کو گھٹا دینے کی کوشش شروع کر دیں۔ ایک ایسے خرگوش کے دماغ کے ٹکڑے کو جو مصنوعی طور پر ہائیڈرو فوبیا سے مارا گیا تھا حاصل کر کے ایک صاف ستھرے برتن میں رکھا گیا، اور جب اس پر تجربے کئے گئے تو معلوم ہوا کہ جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور دماغ کا یہ ٹکڑا سوکھتا گیا اس کے سمی اثرات بھی کم ہوتے گئے تا آنکہ آخر میں اس کو سادہ پانی میں پیس کر عرق حاصل کیا گیا اور جب اس عرق کو کتوں کے جسم میں داخل کر کے اس کے اثرات دیکھے گئے تو خود پاسچر کو اپنی اس کامیابی پر انتہائی مسرت ہوئی۔ اس لئے کہ اب یہ کتے اس بیماری سے بالکل محفوظ ہو گئے تھے یعنی یہ کہ دوسرے دیوانے کتوں کے کٹوانے سے بھی ان میں مرض کی کوئی علامات ظاہر نہیں ہوئیں۔

جس زمانے میں پاسچر ان تحقیقات میں مصروف تھا اس کے پاس ایک کم عمر فرانسیسی لڑکے جوزف میسٹر کو لایا گیا جسے دیوانے کتے نے کاٹ لیا تھا، بڑے ہی کشمکش و پیچ کے بعد اس حکیم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس پر بھی اسی طریقہ علاج کا تجربہ کیا جائے جو کتوں کے ساتھ ہوا تھا، یعنی اس بچے کو بھی چودہ دنوں کے رکھے ہوئے دماغی مادے کا ٹیکا لگایا گیا اور مسلسل دس روز تک علاج جاری رہا جس دوران میں بارہ ٹیکے لگائے گئے اور اس طرح اس بچے کی جان بچالی گئی۔

بعد میں دو اور سگ گزیدہ مریضوں کے ساتھ اسی طریقہ علاج کو استعمال کیا گیا اور ان صورتوں میں بھی ان کی جان بچالی گئی۔

اب پاسچر نے بڑے پیمانے پر اس سلسلے میں تجربے شروع کئے اور سائنس اکادمی کے ایک اجلاس میں دنیا کو یہ خوشخبری دی کہ اس نئے طریقۂ علاج سے دیوانے کتے کا نشو فیصدی کامیاب علاج کیا جا سکتا ہے۔

پاسچر کے اپنے کام کے علاوہ اس کے لائق شاگردوں نے بھی پاسچر انسٹیٹیوٹ میں کام کرتے ہوئے کئی مہلک اور خطرناک بیماریوں مثلاً خناق وغیرہ کا علاج دریافت کیا چنانچہ ان میں سے ایک تو ہیضہ کا سبب معلوم کرتے کرتے خود اس مرض میں مبتلا ہو گیا۔

علم جرثومیات کے اس امام کی آخری عمر، شہرت، اعزاز اور علمی خطابات سے مالا مال تھی، دنیائے سائنس نے اس کی خدمات کی دل کھول کر ستائش کی اور اس کے کارناموں کو خوب سراہا۔

[illegible] سب بھول گئی تھا مگر ان سے اپنی [illegible] [illegible] کی [illegible] نیا کی [illegible] سائنس [illegible] نے [illegible] داعیٔ اجل کو لبیک کہا سائنٹیفک کارناموں کی سنہری داستان ہمیشہ کے لئے منقوش پر چھوڑ گیا

(ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ) گلچیں بیگ آبادی

رباعیات

ہر قید کو توڑ کر نکل جاتا ہوں
ہاں تجھ کو بھی چھوڑ کر نکل جاتا ہوں
اس نشہ کے قربان کہ اب تو ساقی
منہ کعبے سے موڑ کر نکل جاتا ہوں

گرتا ہوں سنبھلتا ہوں ہنساتا ہوں اسے
روتا ہوں مچلتا ہوں مناتا ہوں اسے
جس وقت کوئی گناہ کر لیتا ہوں
اپنے سے بہت قریب پاتا ہوں اسے

گو فرد عمل سیاہ کرتا ہوں میں
تجھ سے تو مگر نباہ کرتا ہوں میں
اپنے لئے کرتا ہوں جو کوئی نیکی
تیرے بھی لئے گناہ کرتا ہوں میں

توبہ توبہ الٰہی میری توبہ
رحمت کو تری بھول کے کی تھی توبہ
جتنی تھی ترے کرم سے خالی کر دی
اور مے کی جگہ شیشے میں بھر دی توبہ

اپنا دلِ چاک چاک سینے دو مجھے
پینے دو مجھے شراب پینے دو مجھے
للہ ہٹاؤ نہ ابھی جام و سبو
جینے دو خدا کے لئے جینے دو مجھے

جس وقت ہو دستیاب پی لیتا ہوں
تھوڑی ہو کہ بے حساب پی لیتا ہوں
ہونٹوں کی ترے ملے کہ آنکھوں کی ملے
جیسی بھی ملے شراب پی لیتا ہوں

تمکین سرمست

شہزادی گلبدن

(اخبار ڈان کے ایک مضمون کا آزاد ترجمہ)

شہنشاہ بابر کی لڑکی گلبدن بیگم قلعہ معلیٰ کی بے فکر عیش پسند اور روشن خیال فضا میں رہنے والی خواتین میں اپنی آپ مثال ہے۔ شہزادی نے اپنے بھانجے اکبر کے کہنے پر اپنے اشہب قلم کے ذریعہ اس زمانہ کے معرکۃ الآراء واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ گلبدن بیگم کو یہ خیال بھی نہ گزرا ہوگا کہ جس کام کو اس نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ اسے زندۂ جاوید بنائے گا۔ اور زیب النساء جیسی باکمال شاعرہ کا کلام بھی شہرت کی دنیا میں گلبدن بیگم کی تصنیف پر رشک کرے گا۔

کئی اعتبار سے شہزادی گلبدن بیگم کو واقعات کے مدون کرنے میں از حد مدد ملی۔ اول تو یہ کہ شہزادی کو ہمایوں، بابر اور اکبر جیسے جلیل القدر بادشاہوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ ثانیاً یہ کہ قلعہ معلیٰ کے واقعات اس کی آنکھوں نے دیکھے تھے مسز بیورج (Mrs. Beveridge) کے الفاظ ہیں کہ گلبدن بیگم نے اپنا اور اپنے محترم خاندان کی بے کم و کاست تفصیلات سے روشناس کرا کر دنیائے تاریخ میں ایک بڑی خدمت انجام دی ہے اس کی تحریر سلیس بیساختہ اور برمحل ہے۔

گو ابوالفضل کے ادبی شاہکار "آئینہ اکبری" یا بایزید کی تصنیف "ترقی ہمایوں" کی طرح گلبدن بیگم کے "ہمایوں نامہ" کو اہمیت نہ دیجائے لیکن بعض اعتبارات کی بنا پر شہزادی کا ہمایوں نامہ" ابوالفضل اور بایزید کی تصانیف کے مقابل میں کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا بلکہ کچھ بڑھا چڑھا ہی ہوگا۔

ہمایوں نامہ قلعہ معلیٰ کے باسیوں کی صحیح تاریخ کہی جا سکتی ہے یہ تاریخ ایک خاتون کے قلم اور زاویۂ نگاہ کا کارنامہ ہے جس کی ساری زندگی شاہان مغلیہ کی سرپرستی میں بسر ہوئی۔

شہزادی نے اپنی اس تصنیف میں دربار اور خاندانی افراد کے نام تمام حالات تعلقات واقعات بے کم و کاست بیان کیے ہیں خواہ وہ شہنشاہ بابر یا ہمایوں کے پر آشوب زمانہ سے متعلق ہوں یا شہنشاہ اکبر کے پرسکون دور سے مغلوں کے دور کی اس تاریخ (ہمایوں نامہ) کے متعلق تاریخ کے انگریزی طلبہ کو اس وقت تک علم نہ ہوا جب تک ڈاکٹر ریو (Dr. Rieu) نے ہمایوں نامہ کو مدون نہ کر لیا۔ ہمایوں نامہ کے متعلق ہندوستانی مورخین کو علم تھا مگر موجودہ دور کے تاریخ کے طلبہ کو مسز بیورج (Mrs. Beveridge) کا مرہون منت ہونا چاہیے جنھوں نے اس نسخہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اصل نسخہ ہملٹن (Hamillon) کے مجموعہ میں برٹش میوزیم میں محفوظ ہے یہ نسخہ بھی مکمل نہیں ہے کیونکہ مرزا کامران کے نابینا ہونے تک کے واقعات اس میں درج ہیں۔ اصل ہمایوں نامہ میں غالباً شہنشاہ اکبر کے بائیس سالہ دور حکومت کے واقعات درج ہیں کیونکہ نسخہ پر شاہجہاں کے قلم کا یہ ایک نوٹ ہے: "اس تاریخ میں صاحب قران (تیمور) کی فاتح اولاد اور حضرت آشیانی اکبر بادشاہ کے بائیس سالہ دور حکومت کے حالات درج ہیں۔"

جس طرح ہمایوں نامہ مختصر ہے اسی طرح شہزادی گلبدن کے حالات زندگی بھی مختصر ہیں۔ گو شہزادی کی زندگی ایک پردہ نشین خاتون کی حیثیت سے از حد خاموش اور بے خرخشہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنے والد کے مصائب اور اپنے سوتیلے بھائی کی جلاوطنی کی تکالیف کے باعث ضرور متاثر تھی۔ شہزادی گلبدن ۱۵۲۳ء میں اس وقت پیدا ہوئی جب کہ شہنشاہ بابر ہندوستان پر اپنے آخری حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ پانی پت کی لڑائی کے وقت گلبدن بیگم بمشکل تین سال کی تھی۔ شہزادی کی ماں دلدار بیگم بابر کی بیوی تھی لیکن ماہم بیگم ملکہ تھی۔ ماہم بیگم کے بچوں میں سوائے ہمایوں کے کوئی باقی نہ رہا تھا اس لئے شاہ بیگم نے شہزادی گلبدن اور اس کے بھائی ہندال کو اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا یہی وجہ تھی بابر بھی شہزادی کو بہت چاہتا تھا اور ہمایوں بھی اپنی سوتیلی بہن سے از حد محبت کرتا تھا۔ جب ہمایوں کی شادی حمیدہ بیگم کے ساتھ ہوئی تو گلبدن اور

[illegible] کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ اکبر بھی گلبدن کی عزت کرنے لگا۔ چنانچہ تمام عمر شہزادی گلبدن کی ہر طرح عزت اور قدر کیا کیا گلبدن بیگم نے اپنا ایک واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہ خواجہ نظام الدین برلاس شاہ بابر کے خلیفہ ہندوستان تشریف لائے اس وقت گلبدن بیگم نظام الدین برلاس کی بیوی کے ہمراہ انگرام گئی ہوئی تھی۔ شہزادی کی خادماؤں نے اس کو بتایا تھا کہ جب خلیفہ آئے تو شہزادی کو تعظیم کے لئے اٹھنا چاہیے چنانچہ خلیفہ کی آمد پر شہزادی تعظیم کے لئے اٹھی ۔۔۔ [illegible] بیوی پہونچی۔ شہزادی اس کی تعظیم کے لئے بھی اٹھی لیکن نظام الدین نے شہزادی کو تعظیماً کھڑا ہونے سے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ آپ کی خادمہ ہے۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ گلبدن بیگم کی کیا عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ نظام الدین اور اس کی بیوی نے شہزادی کو کئی ہزار اشرفیاں اور کئی سو گھوڑے نذر دیئے اور خاصہ پر مدعو کیا۔ ایک پر فضا اونچے چبوترے پر خلیفہ کے لئے سرخ خیمہ جس کا حاشیہ گجراتی زربفت کا تھا نصب تھا جس کے اطراف چھ مختلف اعلیٰ درجہ کے خیمے ایستادہ تھے خیمے کے اطراف ایک بہت ہی خوبصورت قنات تھی۔ خاصے کے بعد گلبدن بیگم اپنے والد بابر کے سلام کے لئے گئی۔ جس محبت کے ساتھ بابر پیش آیا اس کی تصویر شہزادی نے ان الفاظ میں کھینچی ہے "میرے قدم بوس ہونے کے بعد اس نے مجھے گود میں لیکر مختلف سوالات کئے اور از حد مسرور ہوا" جہاں کہیں بھی ماہم بیگم جاتی تھیں گلبدن بیگم ہمراہ جاتی تھیں۔ جس وقت شہنشاہ بابر دھول پور تشریف لے گئے ماہم بیگم بھی گئیں۔ ہمایوں بھی گلبدن سے محبت کرتا تھا۔ شہنشاہ بابر کی مہلک بیماری سے پہلے ہمایوں دہلی میں سخت بیمار پڑا شاہی خاندان آگرہ سے دہلی گیا اس وقت گلبدن بھی ہمراہ تھی جس وقت گلبدن بیگم بستر کے قریب پہونچی ہمایوں باوجودیکہ درد سر میں مبتلا تھا مگر شہزادی کو دیکھ کر اس نے محبت سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اسے خوش آمدید کہا۔

بابر کی انتقال کے بعد گلبدن بیگم اپنی ماں دلدار بیگم کے ہمراہ رہنے لگی لیکن اس سے ہمایوں کی محبت میں سر مو فرق نہ آیا۔ ہمایوں ہمیشہ گلبدن کے مکان پر جایا کرتا جہاں معصومہ سلطان بیگم گلرنگ بیگم اور گلچہرہ بیگم سلطان کے سلام کو حاضر ہوتیں۔ شہزادی گلبدن بیگم ہمایوں کی محبت کا ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں۔

"شہنشاہ بابر کے بعد ہمایوں نے مجھ پر اپنی عنایات کی اس قدر بارش کی کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ میں یتیم ہو گئی" شہزادی کی شادی خضر خواجہ خاں سے ہوئی جس سے دو بچے ہوئے لڑکے کا نام سعادت یار اور لڑکی کا نام سلیمہ خانم تھا۔ خضر خواجہ خاں ۱۵۵۴ء میں ہمایوں کے ہمراہ ہندوستان آیا ۱۰ سال بعد اکبر نے اسے لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا اسکی زندگی کا بیشتر حصہ اکبر کی مصاحبت میں گزرا شہنشاہ اکبر نے اس کو بڑا فوجی اعزاز عطا کیا اور کچھ عرصہ تک امیر الامرائی اہم خدمت بھی منصرم طور پر انجام دی

مورخین نے شہنشاہ اکبر کے دور میں گلبدن بیگم کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ شہنشاہ اکبر کی اتالیق کے زوال کے بعد محل کی خواتین کی اہمیت گھٹ گئی ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ شہزادی گلبدن عمر ہو چکی تھیں اسلئے وہ اپنا زیادہ وقت اپنے خانگی امور میں صرف کرتی تھیں لیکن اس کے باوجود اکبر کی نظروں میں اس کی عزت تھی جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اس نے ۱۵۸۷ء میں شہنشاہ ہمایوں کے حالات رقم کرنے کے لئے گلبدن بیگم کو حکم دیا شہزادی کے لئے اس پیرانہ سالی میں یہ کام بہت موزوں تھا اب اس کی عمر ۶۴ سال کی تھی اور اس نے اپنی آنکھوں سے تین شاہی دور دیکھے تھے۔ شہزادی نے اپنے کام کو کما حقہ انجام دیا۔ ہمایوں نامہ کی تکمیل سے دس سال پہلے گلبدن بیگم فریضۂ حج کے لئے مشرف ہوئیں۔ سفر میں ان کے ہمراہ ایک بڑا قافلہ تھا۔ قافلہ کے افراد میں بابر اور ہمایوں کے زمانے کی خواتین تھیں جن کے لئے دو جہاز مخصوص تھے۔ ابوالفضل نے اس قافلہ کی روئداد یوں بیان کی ہے "یہ قافلہ اکتوبر ۱۵۷۵ء

کو آگرہ سے روانہ ہو کر سورت پہونچا جہاں ایک سال تک ٹھیرنا پڑا کیونکہ پرتگالی قزاقوں کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ حج سے واپسی پر اس قافلہ کو جہاز کے خراب ہونے کی وجہ سے ایک سال تک عدن میں مقیم رہنا پڑا جہاں ترکی گورنر کے بیہودہ سلوک کی وجہ سے قافلہ والوں کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجہ میں سلطان مراد شاہ ترکی نے اس گورنر کو اس کی حرکت پر برطرف کر دیا۔ ۱۵۸۲ء میں گلبدن بیگم فتح پور پہونچی اور باقی ماندہ زندگی عبادت، ریاضت، غربا پروری اور خیر و خیرات کے کاموں میں بسر کی شہزادی گلبدن کی سفارش پر ہی اس کے پوتے یار محمد کی مخلصی ہوئی اور یہی شہزادی سلیم کے تاڑ سے وقت کام آئی جب اس شہزادہ نے اکبر کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ ... برس کی عمر میں ایک مختصری علالت کے بعد خاندان مغلیہ کی ... عاقلہ اور تجربہ کار خاتون نے داعی اجل کو لبیک کہا شہنشاہ اکبر نے مرحومہ کے جنازہ کو تھوڑی دور تک کندھا دیا۔

شاہ ابرار احمد فر...

غزل

ہزار بار ہو آئینِ آگہی کا ظہور
شباب ہو نہ سکے گا کبھی جنوں سے نفور

توہمات کی پُرہول ظلمتیں ہیں گواہ
حقیقتوں کی جوانی ہے کس قدر مجبور!

تلاشِ منزلِ دل اور سوزِ دل کے بغیر
رہے گی تیری یہ فکرِ مدام ناشکور

دلوں میں رقصِ تمنا نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ جوشِ موسمِ گل یہ بہارِ کیف و سرور

عجیب چیز ہے نیرنگیٔ تصورِ دوست
تمام عالمِ امکاں روائے نکہت و نور

نگاہِ شوق کو سمجھا تھا شمعِ منزلِ شوق
کسی نے دور سے آواز دی "ابھی کچھ دور"!

امانتِ غمِ جاناں لطیف ہے ساجد
اسے حیات کی غمگینیوں سے رکھ کچھ دور

لطیف ساجد

[illegible]ء کے حیدر آباد کی ایک جھلک

(لیڈی ڈفرن کی ڈائری کے دو ورق)

[illegible] چہار شنبہ ۔ دوپہر کے قریب ہم حیدر آباد پہنچے ۔ مدار المہام نواب سالار جنگ والٹر [illegible] سے ملنے [illegible] آگئے اور حیدر آباد میں خود اعلیٰ حضرت نظام اپنے تمام امراء کے ساتھ موجود تھے ۔ اعلیٰ حضرت [illegible] سیاہ بال اور گل موچھیں رکھتے ہیں ۔ آنکھیں سیاہ ہیں، ابھرا ابھرا نقشہ اور اداس سا چہرہ ہے ۔ [illegible] سیاہ ایرانی ٹوپی اور یورپین کپڑے پہنے ہوئے تھے ۔ ان کے امراء کے کپڑے اور بھی شاندار تھے ۔ ان میں سے [illegible] اور قد آور ہیں ۔ نواب سالار جنگ بھی قوی ہیکل ہیں ۔ ان لوگوں کے لباس یونی فارم جیسے ہیں اور اگرچہ [illegible] مشرقی نہیں، تاہم دلکش ہیں ۔ اکثر سفید دستار اور سیاہ چست کوٹ پہنے، سونے کے بکلوس اور کنٹھیاں لگائے [illegible]

مسٹر کورڈری ریذیڈنٹ اسٹیشن پر موجود تھے اور ہم یہاں سے سوار ہو کر ان کے گھر گئے ۔ سرکاری گاڑیاں گہری زرد [illegible] اور اعلیٰ حضرت نظام کی بگھیاں زرد اور روپہلی ہیں ۔ یہ سب چست و چالاک اور مستعد معلوم ہوتے ہیں ۔
ریذیڈنسی ایک نہایت نفیس مکان میں واقع ہے ۔ یہ کلکتہ کی ہماری قیام گاہ کے نمونے پر بنایا گیا ہے، لیکن چار بازوؤں کی جگہ صرف دو بازو ہیں، درمیانی ہال چھت تک چلا گیا ہے جس میں ایک گیلری اور کھمبوں پر دو منزلیں اور ایک نہایت خوبصورت کمرہ ہے ۔

۲۵ نومبر پنجشنبہ ۔ حضور نظام کے لئے دربار آج صبح میں منعقد ہوا ۔ میں بڑے ہال کے اطراف کی گیلری میں بیٹھی جس کا حال میں تمہیں بتا چکی ہوں ۔ یہاں سے حضور نظام کی آمد اور اس کے بعد ہونے والے تمام مراسم اچھی طرح دکھائی دیتے تھے ۔ دریچے سے جو نظارہ دکھائی دیتا تھا وہ بڑا دلکش تھا ۔ ریذیڈنسی کا باغ گھر کے بالکل سامنے ہے اور اس کے احاطے میں بعض نہایت عمدہ درخت ہیں ۔ آج یہ ساری جگہ سپاہیوں سے بھری ہوئی ہے ۔ ایک انگریزی گارڈ ان سیڑھیوں کے سامنے کھڑا ہے جو ایک چوڑے برآمدے پر جاتی ہیں ۔ یہ برآمدہ ایک کمرے کی طرح سجایا گیا ہے اور دربار ہال کے بالکل سامنے ہے ۔ باغ میں عمارت تک سوارہ فوج قطار باندھے کھڑی ہے ۔ حضور نظام اپنی زرد رنگ کی بگھی میں تشریف لائے جس میں چار سُرنگ گھوڑے جُتے ہوئے تھے ۔ کوچ مین اور سائیس بھی زرد وردی میں تھے ۔ وہ کل کی بہ نسبت آج زیادہ چست و چاق اور زیادہ مشرقی معلوم ہوتے تھے ۔ سیاہ لباس، اس پر "اسٹار آف انڈیا" کا نشان اور ان کو چمکانے والی نیلی ربن ——
یہ ان کا لباس تھا ۔ دیکھنے میں تو دربار بڑا شاندار معلوم ہوتا تھا، لیکن جو لوگ اس میں مصروف ہوتے ہیں انہیں یہ ہمیشہ نہایت غیر دلچسپ معلوم ہوتا ہے ۔ حضور نظام اور وائسرائے دونوں ایک طرح کی ڈائس پر ایک دوسرے کے برابر بیٹھ گئے ۔ اس کے بعد ہتوں والی سونے کی کرسیاں دہری قطار میں باب الداخلہ سے تخت تک نیم دائرہ کی شکل میں رکھی گئی تھیں ۔ دربار برخواست ہوا تو ڈفرن حضور نظام کو پہنچانے کے لئے دروازے تک گئے، اور وہ جلوس کی صورت میں تشریف لے گئے ۔ آج دوپہر میں ملاقاتِ بازدید تھی، لیکن افسوس ہے کہ میں اس کا تماشا نہ دیکھ سکی ۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک بالکل مختلف اور بہت ہی شاندار چیز تھی ۔ حضور نظام کے باڈی گارڈ عرب ہیں اور ان کے ملازموں کے لباس بڑے حیرت انگیز ہیں ۔

آج ہم ایک نواب صاحب کے بچوں سے اپنے گھر پر ملے۔ میں نے ان سے زیادہ پیارے بچے کہیں نہیں دیکھے سب سے بڑی ایک آٹھ سالہ لڑکی ہے اور بس کچھ ہی دنوں میں پردے میں بٹھائی جانے والی ہے۔ یہ سن کر دکھ ہوتا ہے "کاش میں مغلئی بچی ہو کر نہ پیدا ہوئی ہوتی"۔ بقیہ تین لڑکے ہیں۔ یہ سب کے سب ہیرے جواہرات لگے والے اور سونے کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ آنکھیں ان کی بڑی بڑی اور سیاہ تھیں۔ سب کے سب بڑے ہنس مکھ اور ملنسار تھے۔ دس سال کا بچہ بھی انگریزی سمجھ سکتا تھا اور دوسرے تو اچھی طرح اس میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ چھوٹے بچے میری گھڑی کو کھول کھول کر خوش ہوتے تھے، اور میرا خیال ہے کہ میں ان سے دوستی کرنے میں کامیاب رہی۔ لڑکی مجھے اپنا پہلا انگریزی خط لکھنے والی ہے۔ ان بچوں کی نگران بلغاسٹ کی رہنے والی ہے اور ڈفرن نے ایک مرتبہ اس کے باپ سے کچھ سلوک کیا تھا۔ اس عورت کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ اس کے شاگرد اپنے آپ کو اتنی اچھی طرح پیش کر سکے۔ میں ان کی ماں سے ملنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔ اس کے بعد میں اور بہت سے لوگوں سے ملی۔ ایک پارسی خاتون جنہوں نے میرا ایک کام کر دیا تھا۔ سیول سرجن اور دو لیڈی ڈاکٹر۔ ان میں سے ایک مشنری ڈاکٹر تھی۔ دوسری مسز وائٹ حضور نظام کی ملازم ہیں اور کئی برسوں سے اپنی خدمات حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہیں۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ بہت نیک نام اور بہت ہر دل عزیز ہیں۔

دوپہر ڈھلے اسپورٹس تھے۔ لیکن اتنی جلدی اندھیرا ہو گیا کہ ہم اپنا پروگرام ختم نہ کر سکے۔ "ٹینٹ پگنگ" کے علاوہ رسہ کشی بھی تھی —— ایک ہاتھی اور اس کے مقابلے میں ستر آدمی۔ میرا خیال ہے کہ ہاتھی جیت جاتا لیکن رسی ٹوٹ گئی۔ چونکہ یہ دیو اس قسم کے کھیل میں حصہ لینے پر مجبور کرنے سے خفا سا ہو گیا تھا، اس لئے یہ تجربہ دہرایا نہیں گیا۔ ہم نے ہاتھیوں کی دوڑ بھی دیکھی۔ یہ بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ یہ بڑے بڑے جانور بہت تیزی سے لڑھک رہے تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ایک دوسرے سے مسابقت کی کوئی خواہش نہ تھی۔ اس کے بعد اونٹوں کی دوڑ ہوئی۔ دوڑ کے دوران میں ایک دفعہ اونٹوں کو لٹا دیا گیا۔ ان کے سواروں نے ان پر لدی ہوئی بندوقوں کو گھٹنوں پر رکھ کر تین باڑیں ماریں، پھر سوار ہو کر چل پڑے۔ حضور نظام نے خود ایک انعام پایا۔ وہ تنہا شخص تھے جنہوں نے گھوڑا دوڑاتے ہوئے اپنے بھالے کی نوک سے زمین پر رکھی ہوئی ایک انگوٹھی کو اٹھانے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ اسپورٹس گھوڑ دوڑ کے میدان میں ہو رہے تھے۔ بازار سے نکلتے ہی آپ ایک کھلے حصے پر پہنچ جاتے ہیں جس میں سبز گھاس کا فرش بچھا ہوا ہے۔ یہ میدان بڑا ہی خوبصورت ہے۔ اس کے بیچوں بیچ ایک نفیس اسٹانڈ بنا ہوا ہے۔ تماشائیوں کا ایک بے پناہ ہجوم، باڑ کے دونوں طرف جمع تھا، جو خود بھی بڑا دلچسپ تھا۔

شام میں حضور نظام نے ہمیں واقعتاً نہایت شاندار ڈنر پر مدعو کیا۔ ہم ایک کھلی گاڑی میں سوار ہو کر روشنی کا تماشا دیکھنے نکلے۔ سارا شہر چراغاں ہو رہا تھا اور جہاں ہماری دعوت تھی اس مقام پر خوب ہی روشنی تھی۔ سڑکوں پر لنتر ہانڈیوں میں روشنی کا سامان کیا گیا تھا۔ چاروں طرف اور نیچے اوپر ہزاروں آدمی تماشا دیکھنے جمع تھے۔ کمانیں بڑی زبردست تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اصلی عمارتوں میں روشنی کی گئی ہے۔ سڑکوں پر دو طرفہ فوج کا پہرہ تھا اور رہ رہ کر "گاڈ سیو دی کوئین" کا راگ بجایا جاتا تھا، یہاں تک کہ ہم محل تک پہنچ گئے۔

یہ اطالوی طرز کی ایک نہایت نفیس عمارت ہے جس کے اطراف دو بڑے بڑے قطعات پہ باغ ہیں۔

[illegible] روشنی کی گئی تھی۔ عمارت کے اوپر بھی روشنی تھی اور گلاب کے تختے بھی منور تھے۔ ہمارا استقبال محل کے
[illegible] کمرے میں کیا گیا جو دو قطعات کے درمیان واقع ہے۔ ہم چہل قدمی کرتے ہوئے دوسرے باغ میں سے ہو کر کمرہ
[illegible] ایک ایوان میں جو ایک ہزار فیٹ سے بھی زیادہ ہوگا، دو سو مہمان ڈنر پر بیٹھے۔ درمیان میں
[illegible] سے میں دولت سرنے نہ دیکھی گی۔ میز سونے کی رکابیوں سے ڈھکا ہوا تھا جن میں پھول رکھے تھے۔
ہم ڈنر اور [illegible] باغ کی طرف دیکھتے رہے۔ انتظام نہایت عمدہ تھا اور میرا خیال ہے کہ ڈنر ڈیڑھ گھنٹے
سے زیادہ تک جاری نہیں رہا۔ حضور نظام میرے اور ڈفرن کے درمیان بیٹھے تھے۔ وائسرائے نے ان کا جام صحت
ایک نہایت عمدہ تقریر اور ایک بلند آواز میں تجویز کیا۔ حضور نظام نے جواب میں فرمایا "میں لارڈ اور لیڈی ڈفرن
کا جام صحت تجویز کرتا ہوں۔" اس کے بعد ہم باغ میں آتش بازی کا تماشا دیکھتے ہوئے ایک گھنٹے تک مصروف
رہے۔ ہمارے مقابل پانی میں ڈفرن کا، میرا اور حضور نظام کا عکس نظر آرہا تھا۔ دونوں مرد ہاتھ ملا رہے تھے۔
اور میں [illegible] کی طرح سبز لباس میں ملبوس کھڑی تھی۔ تھوڑے سے فاصلے سے یہ نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا۔
میں نہیں سمجھتی کہ میں تمہیں آتش بازی کی ساری تفصیلات بتا بھی سکوں گی۔ کیونکہ یہ ایک دوسرے سے بہت
مختلف ہیں۔ ان میں آواز نہیں ہوتی، یہ نیچے سے اوپر اٹھتے ہیں، اوپر جا کر پھلجھڑی سی چھوڑتے ہیں اور آخر میں
بہت بڑے "خوش آمدید" پر ختم ہوتے ہیں جو آسمان پر لکھا نظر آتا ہے۔

جمعہ ۲۶ فروری۔ بارہ بجے تک وائسرائے کو کام تھا۔ میں نے برار کے ایک وفد سے ملاقات کی جو میرے
فنڈ کے سلسلے میں آیا تھا۔ پھر ان چھ طلبہ کو دیکھنے کے لئے گئی جو طبی کام کے لئے تربیت حاصل کر رہے ہیں
پھر ہم باہر نکلے۔ سکندرآباد اور بلارم سے ہوتے ہوئے کوئی گیارہ میل گئے ہوں گے۔ سکندرآباد میں ایک
ایڈریس دیا گیا۔ ہال کی سیڑھیوں پر ناچنے والی لڑکیاں ہاتھ میں جلتی شمع لئے گاتی کھڑی تھیں۔ یہ ایک قدیم
اور دیہاتی رواج ہے۔ ان کے بعد ایک مقامی مدرسے کی لڑکیاں اور ایک فوجی یتیم خانے کے بچے تھے۔ ایڈریس
کے ساتھ ایک پلیٹ بھی پیش کی گئی اور اس کا خوبصورت ڈبہ ایک چاندی کی کشتی میں پیش ہوا۔ واپسی میں
ہم ایک بڑے تالاب کے بند پر سے حیدرآباد کنٹینجنٹ کے مس ہاؤز پہنچے تک ہم کئی عمدہ بارکوں کے سامنے سے
گزرے۔ کرنل بل یہاں کے کمانڈنگ افسر ہیں۔ عہدہ داروں نے اپنے ناچ کے خوبصورت کمرے میں ہمیں
ایک نہایت عمدہ لنچ دیا۔ ڈفرن نے کنٹینجنٹ کا جام صحت تجویز کیا اور ہم دوسری مصروفیات کے انجام دینے
کے لئے روانہ ہوگئے۔ سالار جنگ نے ہمیں تالاب میر عالم پر چائے پر مدعو کیا تھا اور آفتاب غروب ہونے سے پہلے
ہمیں گھوڑے دوڑاتے پندرہ میل جانا تھا۔ بالآخر یہاں پہنچنے کے بعد ایک گھنٹہ نہایت پرلطف طریقے پر
گزرا۔ تالاب مصنوعی ہے اور ایک بند کے ذریعے پانی کو روکا گیا ہے جو عام اصولوں پر نہیں بنایا گیا ہے۔
یہ ایک طویل ریلوے پل سے مشابہ ہے۔ کمانیں تالاب کی سمت میں اندر کی طرف مڑی ہوئی ہیں اور
ان کا پشتہ میدان کی طرف ہے۔ یہ بند تالاب کا نہایت حسین کنارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس پشتے سے
اپنی نظریں ہٹا لو تو یقین نہیں آتا کہ یہ تالاب مصنوعی ہے کیونکہ یہ اتنا حسین ہے۔ ارضیاتی مرکبات
کے یہاں عجیب عجیب تماشے نظر آتے ہیں۔ حیدرآباد کے چاروں طرف پتھر اور چٹانوں کے ڈھیر کے ڈھیر کچھ
عجیب طرح بکھرے پڑے ہیں۔ جیسے کسی دیو نے انہیں برسایا ہو، یا جیسے زمین اتنی بہہ گئی ہو کہ آخر میں صرف پتھر ہی پتھر

رہ جائیں۔ اس تالاب میں ایسی بہت سی پہاڑیاں ہیں جن پر جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی ہے۔ یہ نہایت ہی [illegible] معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی پہاڑی پر ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے اسٹیمر [illegible] گئے جہاں حضور نظام بھی ہم سے آملے۔ تالاب کا ایک چکر لگایا اور غروب آفتاب کا منظر دیکھا، جس سے ہم بہت ہی محظوظ ہوئے۔

گھر پہنچنے کے لئے ہمیں ڈنر کے لئے بس کپڑے ہی بدلنے کی مہلت مل سکی۔ ہم شہر میں سے ہو کر گزرے جسے پھر چراغاں کیا گیا تھا۔ مسٹر گورباڑی نے اپنے نفیس کمرے میں ناچ کا انتظام کیا تھا جس میں حضور نظام اور ان کے بہت سے امراء موجود تھے۔ اعلیٰ حضرت نے وقت کا زیادہ حصہ گیلری میں بیٹھے ناچ دیکھتے ہوئے گزارا۔ ڈفرن بہت جلد غائب ہو گئے، لیکن میں سیر کے بعد بھی موجود رہی۔

شنبہ ۲۷ر۔ صبح میں سارے مرد بھالوں سے چیتے کا شکار کرنے گئے تھے اور دو کا شکار کر لائے۔ غریب جانوروں کو پنجروں سے چھوڑتے ہیں اور شکاری بھالے لئے گھوڑوں پر سوار ہو کر ان کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ لارڈ ولیم نے ایک چیتے کا شکار کیا۔ وہ اور ان کا گھوڑا لوٹ پوٹ ہو گئے لیکن خیر ہوئی کہ چیتے کو صرف فرار کی فکر تھی۔ اگر غریب آکران کی یہ ہیئت کذائی دیکھتا تو مزا آجاتا۔ میرے حکم سے وائسرائے کو ایک ہاتھی پر نہایت حفاظت کے ساتھ سوار کر دیا گیا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ شکار کا تماشا اچھی طرح نہ دیکھ سکے ہوں گے، تاہم وہ صحیح سلامت گھر واپس آئے جس کے لئے میں اتنی فکرمند تھی۔

آج وہ بہت مصروف تھے اور حیدرآباد کے تمام معاملات نپٹ لینا چاہتے ہیں۔ ریذیڈنٹ، وزیر خارجہ، حضور نظام اور سالار جنگ سے طویل ملاقاتیں رہیں۔ ان کے نتائج سے وہ بہت خوش تھے، لیکن چونکہ کوئی پبلک بیان اس موضوع پر نہیں دیا گیا ہے اس لئے میں تمہیں کوئی بات نہیں بتاؤں گی۔

صبح میں میں دواخانہ دیکھنے گئی، اور لنچ کے بعد ان حیدرآبادی نواب صاحب کی بیوی سے ملی جن کے بچوں کے بارے میں میں نے کل تمہیں بتایا تھا۔ وہ اپنے دیوان خانے میں تھیں، خود ان کے اندرونی گھر میں نہیں۔ نواب صاحب ہماری ملاقات کے وقت موجود تھے۔ اسی طرح وہ سارا زندہ دل کنبہ بھی موجود تھا۔ وہ ایک حسین بی بی ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور اس [illegible] سرخ اور سنہری رنگ کی ساڑی میں وہ لپٹی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں اور سر پر ہیرے اتنے تھے جیسے لاد دیا گیا ہو۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی سمجھتی ہیں اور کچھ الفاظ کہنے کی کوشش بھی کی۔

اس کے بعد دوپہر میں ڈفرن اور میں ایک اور صاحب کے مکان پر گئے جو حیدرآباد کے بہت بڑے امراء میں شمار ہوتے ہیں۔ حضور نظام یہاں بھی آئے تھے۔ یہاں ہم نے چائے پی اور ”امیزان گارڈ“ کو دیکھا جو پوری وردی میں حبشن عورتوں پر مشتمل تھا۔ پھر کچھ آدمی ہمارے آگے چلنے لگے۔ سوار اور گھوڑے دونوں بہت بے آرام اور بے کل نظر آتے تھے۔

ہمارا دن ریذیڈنسی میں ایک دعوت کے ساتھ ختم ہوا۔ حضور نظام کو پھر میرے اور وائسرائے کے درمیان جگہ دی گئی۔ میرے دوسرے بازو پر سر مینری پینڈر گھاسٹ تھے۔

دس بجے کے قریب ہم اسٹیشن پہنچے اور رات اپنی ریل کے ڈبوں میں گزاری۔ اس کے بعد ہمیں پورے دو دن ریل میں گزارنے ہیں، صبح چار بجے سے لے کر ۹ بجے رات تک اور ہم دوشنبہ ۳۰ر کی دوپہر میں میسور پہنچ جائیں گے۔

سید مبارز الدین رفعت

اس شمارے سے ہم نے یہ تہیہ کیا ہے کہ سوال و جواب کا ایک مستقل سلسلہ سب رس میں شروع کیا جائے۔ اس عنوان کے تحت ہمارے خریداروں کے ایسے سوالات کا حتی الوسع جواب دیا جائے گا جو ادبی یا علمیاتی قسم کے ہوں' یا ان سے علم و معلومات میں اضافہ ہونے کا قرینہ ہو۔ مجلس ادارت سب رس کے مطالعہ کرنے والوں سے ان تمام سوالات کو خوشی قبول کرنے اور ان کے جواب دینے کے لئے تیار رہے گی۔

عنقا

سوال: ... اکثر عنقا کا ذکر آتا ہے' کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ یہ کون جانور ہے؟ در اصل اس کی کوئی اصلیت ... رکھتا ہے؟ عبدالستار

جواب: عنقا ایک ایسا قیاسی پرندہ ہے جس کے وجود پر قدیم زمانے کے لوگ نہ صرف یقین رکھتے تھے بلکہ کئی سیاحوں اور مورخوں نے اس کے دیکھنے کا دعویٰ بھی کیا تھا' عنقا کو یونانی زبان میں (PHOENIX) کہتے ہیں یعنی "چمکدار رنگت والا جانور" گو بعض وقت اس لفظ سے "پام کا درخت" بھی مراد لی جاتی ہے۔

مختلف اقوام کی بعض تحریروں میں اس جانور کا تذکرہ ملتا ہے مثلاً زمانہ قدیم میں ہیرڈوٹس HERODOTUS اور ... نے اس کا ذکر کیا ہے' ان لوگوں کے بیانات سے قدیم مصریوں میں اس جانور سے متعلق طرح طرح کی ... تھیں' مثلاً ان کے نزدیک عنقا ایک ایسا جانور تھا جس کا نچلا دھڑ خیر جیسا اور اوپری حصہ پرند کا ہوتا تھا' یہ ... میں تمام دنیا کے جانوروں میں یکتا خیال کیا جاتا تھا' نہایت مقدس بھی سمجھا جاتا تھا' اس لئے کہ مصری تناسخ پر یقین رکھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد روح عنقا کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ اسی لئے وہ اپنے بادشاہوں کی قبروں میں اس پرند کے لئے غذا اور خوش بو دار اشیاء رکھ چھوڑتے تھے'

بعض عنقا کو خوبصورت ارغوانی رنگ کا ایک ایسا پرند سمجھتے تھے' جس کا قد عقاب کے برابر ہوتا تھا' اور گردن سنہری رنگ کے پروں سے مزین ہوتی تھی' اس کے علاوہ اس کے سر پر پروں کا ایک تاج ہوتا اور آنکھیں اس قدر روشن ہوتیں کہ ان پر ستاروں کا گمان ہوتا تھا'

اس پرند کی پیدائش کے متعلق بھی طرح طرح کی باتیں بیان کی جاتی تھیں مثلاً یہ کہ جب عنقا (۵۰۰ (۶۰۰ سال زندہ رہنے کے بعد ضعیفی کے آثار محسوس کرنے لگتا' (بعض مصنفین نے اس کی عمر ۱۲ سے ۱۳ سو سال تک بھی بیان کی ہے) تو جنگل سے خوش بو دار لکڑیاں جمع کر لاتا تھا اور پھر ان کے ڈھیر کو آگ لگا کر خود اس پر بیٹھ جاتا تھا۔

بعد میں اس خاک سے ایک اور عنقا کیڑے یا پیوند کی شکل میں نمودار ہوتا تھا' اور جب یہ نوزائیدہ پرند اڑنے کے قابل ہو جاتا تو اپنے باپ کے ڈھانچے کو چونچ میں لے کر مصر کے شہر ہیلو پولیس (HELIPOLIS) کی جانب پرواز کرتا' اس شہر میں سورج کے دیوتا کا مندر تھا اور یہاں ہمیشہ آگ سلگتی رہتی تھی' چنانچہ وہ اس ڈھانچے کو اس مقدس آگ میں جلنے کے لئے ڈال دیتا تھا'

بعض لوگوں کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ عنقا ہر پانچ یا دس سال میں ایک مرتبہ عربستان سے ہیلو پولس کی جانب پرواز کرتا تھا' چنانچہ پلائنی نے ایسے بعض شواہد کا ذکر کیا ہے جو اس کی رائے میں معتبر تھے۔ ایک مصری ماہر کہتا ہے کہ شہر (HELIPOLIS) میں سارس یا کلنگ کی قسم کا ایک پرند جس کا نام بنو یا بینو تھا' آفتاب کی پرستش کے ساتھ پوجا جاتا تھا' اور چونکہ بینو "پام کے درخت" کو بھی کہتے ہیں اس لئے ان کا خیال ہے کہ غالباً یہی پرند مصریوں کا "عنقاد" ہوگا لیکن قدیم عربی روایتوں میں عنقا کو عرب' شام' ہندوستان یا حبش کا باشندہ کہا گیا ہے' نیز بینو کی جو تصاویر قدیم مصری

ستادیں موجود ہیں۔ ان سے عنقا کا سراپا بھی نہایت مختلف ہے۔
بعض محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ عنقا مشتری ستارے کا نام ہے جو صبح کا ستارہ ہونے کی حیثیت سے آفتاب کا رہبر سمجھا جاتا تھا۔

عربوں میں عنقا کے متعلق کئی افواہیں مشہور تھیں۔ بعض اس کو پرند بعض حشرات کی قسم کا جانور سمجھتے تھے۔ نیز یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ اسبسطوس عنقا کے پروں سے تیار کیا جاتا ہے اس لئے کہ اس پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

عبداللہ یافعی نے مرآۃ الخیال سے نقل کیا ہے کہ نواحِ اصحاب الرس میں ایک میل اونچا پہاڑ تھا، جس میں ہر طرح کے طیور رہا کرتے تھے، ایک دفعہ کسی برس میں ایک پرند بزرگ خلقت، طویل العنق، جس کا منہ آدمیوں کا سا اور اعضاء میں ہر ایک جانور کی مشابہت پائی جاتی تھی، اس پہاڑ پر آ نکلا، اول اول ان جانوروں کو ستانا اور ہلاک کرنا شروع کیا، پھر وہاں کے آدمیوں کے بچوں پر چوٹ کرنے اور پکڑ پکڑ کر کھانے لگا، ساکنان اصحاب الرس اس پرند کو عنقائے مغرب کہا کرتے تھے، جب اس جانور نے حد سے زیادہ ستانے پر کمر باندھی تو سب جمع ہو کر اپنے پیغمبر حنظلہ بن صفوان علیہ الرحمۃ والرضوان کے پاس گئے، وہ ان کی دعا کے سبب اس آفت سے نجات پائی، کہتے ہیں جب سے یہ جانور کسی جزیرہ میں چلا گیا ہے۔

غالباً ایرانیوں کا قیاسی پرندہ سی مرغ، الف لیلیٰ اور مارکو پولو کے تذکروں کے سب پرندے بھی عنقا کی خصوصیت کے حامل تھے۔

بہرحال بعد میں رفتہ رفتہ دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ عنقا کا وجود محض فرضی ہے، اس لئے کہ اکثر نایاب، ناپید یا قیاسی اشیاء کو عنقا کہنے لگے، چنانچہ اردو کا محاورہ "عنقا ہونا" فارسی کے "عنقا شدن" کا لفظی ترجمہ ہے مثلاً ؎

سایہ کو بتہ نہ تھا شجر کا　　عنقا تھا نام جانور کا　　(مثنوی گلزار نسیم)

چاند

سوال ۔ کیا چاند میں آبادی ہے؟ اور اگر آبادی ہے تو کس قسم کے لوگ یہاں بستے ہیں؟　　پریم ناتھ

جواب ۔ اگر زندگی سے ہماری مراد وہ حیات ہے جس کے مختلف مظاہر ہم ہماری دنیا میں دیکھنے کے عادی ہیں تو چاند میں اس قسم کی کسی شے کے وجود کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ چاند میں "ہوا اور پانی" کا فقدان ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ ہوا یا فضائی گیس اور پانی زندگی کے لوازم ہیں۔ آج سے تین چار سو سال قبل تک بھی لوگ یہ سمجھتے رہے کہ چاند میں زندگی کے آثار ہوں گے، چنانچہ جرمنی کا مشہور سائنس داں کپلر چاند میں نظر آنے والے آتش فشاں پہاڑوں کے متعلق غلطی سے یہ قیاس کرتا رہا کہ وہ چاند میں بسنے والے انسانوں کی بنائی ہوئی حصاریں ہوں گی، لیکن بہت زمانہ بعد معلوم ہوا کہ یہ مردہ آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے ہیں۔

ہوا اور پانی کی عدم موجودگی کے علاوہ چاند کا ایک حصہ ہمیشہ آفتاب کی تیز شعاعوں کی زد میں آتا ہے اور دوسرا اس سے چھپا رہتا ہے، اس لئے ہوا نہ ہونے کی وجہ سے یہاں اس قدر سخت گرمی اور سردی پڑتی ہوگی کہ چاند میں کسی قسم کی حیات کے وجود کا قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا۔ گو بعض ماہرین اب تک یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں کی بعض گہری وادیوں میں اب بھی کچھ نہ کچھ فضائی گیسیں باقی ہوں گی جن کی وجہ سے ممکن ہے ان مقامات پر ادنیٰ قسم کے بعض نباتات پیدا ہوتے ہوں گے۔

لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ چاند ایک ایسی "دنیا" ہے جس میں جانور تو جانور پودوں کا بھی وجود نہیں البتہ اس "زمین" پر اونچے اونچے پہاڑوں کے ایسے سلسلے میلوں تک چلے گئے ہیں، جن کے ساتھ گہری تاریک وادیاں ہیں ان پہاڑی علاقوں کو ہم دوربین کی مدد سے اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔

م۔ ر۔ س

EGYPTIAN MYTH & LEGEND　DA'MECKENZIE　　ح ۱ دیکھئے صفحہ (۱۸۸)

ح ۲ دیکھئے فرہنگ آصفیہ جلد دوم صفحہ (۲۹۰)

تنقید و تبصرہ

[illegible] مترجمہ محمود احمد خاں ایم اے، دہلوی
حجم ۱۵۰ صفحے۔ قیمت عہ۔ ناشر۔ خاتون [illegible] بازار۔ دہلی

[illegible] محمود احمد خاں صاحب نے ترجمہ کیا ہے [illegible] ایک ناولٹ کا۔ اور اس کا مقدمہ جناب [illegible] نے لکھا ہے جو خود ایک بہت اچھے اور کافی پرانے [illegible] ہیں۔ کہانی کا پس منظر مصر ہے۔ جس کی سرزمین [illegible] کی جنم بھوم ہے۔ قصہ کافی دلچسپ ہے اور [illegible] "بھوک" کیسے تمناؤں کو پامال کرتی ہے۔ [illegible] نے اور احساسات کو مجرم بناتی ہے۔ اور قسمت کیسے عجیب و غریب کھیل انسانی کھلونے سے [illegible] ہیں۔ یہ المیہ کہانی انہی حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔

دل کے آنسو

رئیس احمد جعفری
حجم ۹۶ صفحے قیمت عہ۔ ناشر۔ مکتبہ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی ع۳۔ ٹائٹل کے لحاظ سے موزوں خوبصورت گردپوش۔

رئیس احمد جعفری نے چھے مختصر افسانے لکھے ہیں۔ پلاٹ تقریباً ہر افسانے کا اچھا ہے اور دلچسپ بھی۔ لیکن جعفری صاحب افسانے کا خاتمہ ناقص طور پر کرتے ہیں۔ جس سے افسانے کی خوبی باقی نہیں رہتی۔ ابتدا اور عروج کافی اچھے ہوں لیکن اختتام جابکدستی سے نہ کیا جائے تو افسانے کا اثر مٹ جاتا ہے۔ اس کے لئے ابھی مشق کی ضرورت ہے۔ دیکھئے یہ افسانے عام پڑھنے والوں کے لئے دلچسپ ثابت ہوں گے۔

بیل بوٹے

از مظفر حسین شمیم
حجم ۱۴۴ صفحے۔ قیمت عاں۔ ناشر مکتبہ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی ع۳۔ رنگین گردپوش۔

زیر نظر مجموعہ بیل بوٹے شمیم صاحب کے لکھے ہوئے مختلف مضامین، افسانوں، تبصرہ اور مقالوں کا مجموعہ ہے۔ مختلف عنوانات پر مختلف چیزیں موصوف نے لکھی ہیں اختصار کا بہت زیادہ لحاظ رکھا ہے۔ ان میں سے تقریباً سب مضامین ہندوستان کے عام بچوں کے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

لیکن اس قسم کے مجموعے کی اشاعت نہ اردو ادب کے لئے نفع بخش ہے نہ اردو داں طبقے پر کوئی احسان آج کل ادیب بننا اور چند کتابوں کا مصنف بن جانا نہایت آسان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ادب کی خدمت کا صحیح طریقہ بہت کم ادیب جانتے ہیں۔ اور ذمہ داری کا احساس تو بہت ہی کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ شمیم صاحب واقعی کوئی اچھی چیز پیش کرنے کی کوشش کریں گے

شمس بازغہ

آنسہ محمودہ رضویہ صاحبہ مدیرہ مجلہ شیع
حجم ۹۷ صفحے۔ قیمت عہ۔ مقام اشاعت انجمن ترقی اردو کراچی سندھ۔

محترمہ محمودہ رضویہ نے کئی ایک کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے ایک شمس بازغہ بھی ہے۔ آنحضرت صلعم کے مختلف واقعات زندگی محترمہ نے اپنے مخصوص طرز میں بیان کئے ہیں۔ باوجود کئی ایک کتابیں لکھنے کے ان کی ادبی ترقی کی رفتار پسندیدہ ہے۔ اچھا ہوتا اگر وہ افسانوی کتابیں لکھنے کی بجائے علمی اور تاریخی لکھتیں۔

گاؤں سدھار کے گیت

اسٹر محمد شفیع الدین نیر
حجم ۸۰ صفحے قیمت درج نہیں
ناشر۔ آزاد بک ڈپو کوچہ چیلاں۔ دہلی۔

نیر صاحب بچوں کے شاعر ہونے کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں یہ گیت بھی ان کی نظموں کی طرح عام فہم اور ستھرے ہیں۔ لیکن بچوں کی بجائے ان کے مخاطب گاؤں کے باسی "دیہاتی بھائی" ہیں۔ دیہات کے متعلق تو بہت کچھ لکھا جا چکا۔ لیکن دیہاتیوں کے لئے

یہ اچھے رنگ کی پہلی اور کامیاب کوشش ہے۔ دیہات سدھار کا یہ مطلوبہ معلومات آفریں اور دلچسپ طریقہ یقیناً فائدہ مند ثابت ہوگا۔

شمع فروزاں

مترجمہ صادق الخیری ایم اے۔ حجم ۱۰۲ صفحے قیمت عہ۔ مقام اشاعت خاتون کتاب گھر۔ دہلی۔

امریکہ کی نوبل پرائز یافتہ خاتون مسز پرل بک کے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ لایق مترجم صادق الخیری صاحب ایم اے نے کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کیا ہے "شمع فروزاں" ایک قدامت پرست چینی گھرانے کی تصویر ہے جسے ایک انگریزی تہذیب سے متاثر لڑکے نے اجاڑ دیا۔ یہ ایک فرض شناس ماں، خدمت گزار بہو، وفادار بیوی اور غیور و کم سخن عورت کی کہانی ہے۔ جس نے بہار کے انتظار میں سات سال تک آرزوؤں، امیدوں کے چمنستان کی آبیاری کی۔ لیکن خزاں کے ایک ہی جھونکے نے جسے پامال کردیا اور جب تمنائیں مردہ، آرزوئیں بے کام ثابت ہوئیں تو اس نے موت کے دامن میں پناہ لی۔

زبان شستہ و پاکیزہ ہے۔ داستان الم انگیز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ چینی زندگی کو جیتا جاگتا دکھایا گیا ہے۔ اس قسم کے اعلیٰ ادبی ترجمے ہمارے ادب کے لئے بے حد مفید ثابت ہوں گے

اچھی لڑکی

مصنفہ راحت النساء بیگم انصاریہ معلمہ مدرسہ صنعت و حرفت نسواں سرکار عالی۔ حجم ۹۶ صفحے قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ۔ اندرون دبیرپورہ محاذی مسجد اثنا عشری مکان میر تراب علی صاحب مدرس نمبری (۷۳۵)

محترمہ راحت النساء بیگم صاحبہ نے لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل ایک بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ اس میں ایک سلیقہ مند اور ایک پھوہڑ لڑکی کا بہت اچھی طرح مقابلہ کیا ہے اور جتایا ہے کہ لڑکیوں کو اچھی تعلیم اور صحیح تربیت کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ تاکہ آئندہ زندگی میں وہ اچھی بیوی اور اچھی ماں ثابت ہو۔ نیک سلیقہ مند اور پڑھی لکھی لڑکیاں خود بھی آرام پاتی ہیں اور دوسروں کو بھی آرام دیتی ہیں۔ زبان سلیس اور عام فہم ہے اور کہانی کی دلچسپی شروع سے آخر تک برابر قائم رہتی ہے۔ کم عمر لڑکیوں کو ضرور یہ کتاب پڑھنی چاہئے تاکہ وہ خود اس سے سبق لے سکیں۔ موصوفہ اگر آئندہ بھی بچیوں کے لئے ایسی کتابیں لکھیں تو اچھا ہو۔ کتاب کی ظاہری شکل و صورت اس کی سیرت جتنی اچھی نہیں۔ اگر گرد پوش اچھا بنایا جاتا تو پھر کتاب ہر طرح دلکش ہوتی۔

۱۹۴۳ء کے بہترین افسانے

مرتبہ۔ عبادت بریلوی حجم ۲۰۰ صفحے۔ قیمت عالہ ناشر۔ حلقۂ ارباب دانش۔ کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنو۔

عبادت بریلوی ایم اے۔ سکریٹری حلقۂ ارباب دانش لکھنو نے اُردو ادب کے نوچوٹی کے لکھنے والوں کے افسانوں کو ایک جا کیا ہے۔ اس سے پہلے ہر سال بہترین نظمیں شایع ہوتی رہی ہیں۔ لیکن افسانوں کا یہ مجموعہ اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بہترین افسانے اور پسندیدہ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن نئے ادب کی رفتار کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں افسانوی ارتقاء کی یہ مکمل تاریخ ہے۔ آئندہ اگر ہر سال کے افسانے یونہی شایع ہوتے رہیں۔ تو بہتر سے بہتر افسانوی ادب کی تدوین آسانی سے ہوتی رہے گی۔

افسانوں کا انتخاب تین ادیبوں نے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے معیاری افسانوں کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن عوام خود مطالعہ کے بعد معلوم کرسکتے ہیں کہ واقعی یہ کہاں تک ۱۹۴۳ء کے بہترین افسانے ہیں۔

۱۴۱۔ مرزا محمود حسین بیگ
۱۴۲۔ سید محمود علی
۱۴۶۔ شیخ محبوب
۱۴۷۔ عبدالحفیظ
۱۵۰۔ سید الطاف حسین
۱۵۲۔ سید عبدالکریم
۱۵۳۔ محمد حسین
۱۵۸۔ شاہ محمد صالح
۱۶۱۔ سیف الدین
۱۶۶۔ صلاح الدین
۱۷۰۔ محمد بشیر خاں
۱۷۶۔ عبداللہ بن عمر
۱۷۸۔ سید رسول
۱۷۹۔ محمد خاں
۱۸۰۔ منور حسین
۱۸۱۔ شیخ فرید
۱۸۲۔ شیخ حسین
۱۸۳۔ راجیا
۱۸۴۔ سید عبدالغنی
۱۸۵۔ شیخ محبوب
۱۸۶۔ بشیر علی
۱۸۷۔ شیخ حمید
۱۸۸۔ سید مومن علی
۱۸۹۔ محمد چاند
۱۹۰۔ عبدالرؤف
۱۹۱۔ غلام غوث
۱۹۲۔ محمد خواجہ حسین
۱۹۳۔ سید معین الدین
۱۹۴۔ شیخ عبدالمجید
۱۹۵۔ محمد غوث
۱۹۶۔ اکبر علی خاں
۱۹۷۔ محمد عبدالرحیم
۲۰۲۔ اکبرالدین خاں
۲۰۳۔ میر عطا علی
۲۰۴۔ غلام مصطفیٰ خاں
۲۰۵۔ محمد یوسف
۲۰۶۔ رحمت حسین
۲۰۷۔ محمد برہان
۲۰۸۔ رام شنکر
۲۰۹۔ محمود علی
۲۱۱۔ عبدالحمید شاہ خاں
۲۱۲۔ وزیر شاہ خاں
۲۱۳۔ محمد عبدالقادر
۲۱۴۔ محمد برہان
۲۱۵۔ محمد رحمت علی
۲۱۶۔ سوامی داس
۲۱۷۔ محمد یوسف شریف
۲۱۸۔ محمد شہاب الدین
۲۱۹۔ موہن سنگھ
۲۲۱۔ محمد عبدالکریم خاں
۲۲۵۔ محمد عبدالمجید خاں
۲۲۸۔ محمد کریم الدین
۲۳۳۔ ابراہیم خاں
۲۳۴۔ سید ضیاء الدین
۲۳۷۔ داؤد خاں
۲۳۸۔ عبدالرشید خاں
۲۳۹۔ قطب الدین
۲۴۰۔ حاجی شریف
۲۴۲۔ سالم
۲۴۳۔ عبداللہ
۲۴۴۔ محمد
۲۴۶۔ محبوب
۲۴۷۔ فیروز
۲۴۸۔ سعید
۲۴۹۔ عبدالقادر
۲۵۰۔ عبداللہ
۲۵۱۔ سلیمان
۲۵۲۔ عبدالرحمن
۲۵۴۔ حسین
۲۵۵۔ سالم
۲۵۶۔ محبوب
۲۵۷۔ محمد بن آدم
۲۵۸۔ محمد بن حسن
۲۶۰۔ منیا
۲۶۱۔ سید رضی الدین احمد
۲۶۲۔ سید عبدالقیوم شاہ قادری
۲۶۴۔ امیر علی
۲۶۶۔ احمد حسین
۲۶۷۔ سید محبوب حسین
۲۶۸۔ میاں خاں
۲۶۹۔ سید یٰسین
۲۷۰۔ بجرنگ سنگھ
۲۷۱۔ حسین علی
۲۷۲۔ مرزا احمد بیگ
۲۷۳۔ معین الدین
۲۷۶۔ سید عبدالحی
۲۷۷۔ عبدالرحیم
۲۷۸۔ قادر خاں
۲۷۹۔ مصطفیٰ حسین
۲۸۰۔ امیر حسین
۲۸۱۔ مرزا مصطفیٰ علی بیگ
۲۸۲۔ سید سلطان
۲۸۳۔ محمد بن سالم
۲۸۴۔ محمد یوسف
۲۸۶۔ جنگیا
۲۸۷۔ سید جعفر
۲۸۸۔ حبیب بیگ
۲۸۹۔ میر ارشد علی
۲۹۰۔ مظفر حسین
۲۹۲۔ سید خواجہ حسین
۲۹۳۔ سید خواجہ [illegible] الدین
۲۹۵۔ سرمد خاں
۲۹۶۔ دستگیر شاہ
۲۹۷۔ عبدالعزیز
۲۹۸۔ میر اسمٰعیل علی
۳۰۱۔ گل محمد خاں
۳۰۳۔ عبداللہ
۳۰۴۔ سید وجیہ الدین
۳۰۵۔ سردار خاں
۳۰۶۔ شیخ احمد
۳۰۸۔ عبدالغنی خاں
۳۰۹۔ محمد انور خاں
۳۱۰۔ احسن محمد
۳۱۲۔ غلام احمد خاں
۳۱۳۔ عمر خاں
۳۱۴۔ محمد معین الدین
۳۱۵۔ باکر حسین
۳۱۶۔ غلام افضل خاں
۳۱۷۔ ولایت حسین
۳۱۸۔ [illegible] خاں

[illegible]
[illegible]
۳۲۱- [illegible]
۳۲۲- [illegible] خاں
۳۲۳- عبد[illegible] خاں
۳۲۴- [illegible]
۳۲۵- [illegible] علی
۳۲۶- [illegible] حسین

مرکز [illegible]

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۴۲۹- محمد [illegible] خاں
۴۳۰- عبدالمجید خاں
۴۳۲- [illegible] علی
۴۳۴- عبدالعظیم خاں
۴۳۹- [illegible] محمد
۴۴۰- محمد نذیر الدین
۴۵۰- شیخ اسمٰعیل
۴۶۹- عبدالغنی
۴۸۰- عثمان خاں
(کامیاب)
۳۳۸- محمد غوث
۳۴۱- محمد محمود خاں
۳۴۳- سعادت اللہ خاں
۳۴۵- عبدالغنی
۳۴۶- سید محی الدین
۳۴۷- محمد حسن الدین
۳۴۸- عبدالرزاق
۳۴۹- محمد جہانگیر
۳۵۰- محمد مخدوم حسین

۳۴۶- عثمان خاں
۳۴۷- احمد حسین
۳۴۸- نیاز علی خاں
۳۴۹- فضل احمد خاں
۳۵۰- بسم اللہ خاں
۳۵۱- عبدالجبار خاں
۳۵۲- عبدالغفور
۳۵۵- شیخ مولانا
۳۵۶- رام چرن سنگھ
۳۵۸- عبدالرزاق
۳۶۰- محمد محبوب
۳۶۱- عبدالکریم
۳۶۲- شکور خاں
۳۶۳- محمد ابراہیم
۳۶۵- شیخ کریم
۳۶۶- حسن شریف
۳۶۷- شریف محمد
۳۶۸- شیخ رحیم
۳۷۱- امام علی خاں

مرکز بشیر آباد (ذکور)

(کامیاب)
۳۷۳- سید سعید الدین احمد
۳۷۴- محمد عبدالرفیع
۳۷۷- محمد امین الدین
۳۷۹- اننت راؤ
۳۸۲- سوامی
۳۸۳- سید نظام الدین

۳۸۵- سید نفیس الدین نسیم

مرکز بشیر آباد (اناث)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۴۰۴- مہر النساء بیگم
(کامیاب)
۳۸۶- رحیم النساء بیگم
۳۸۹- اختر جہاں بیگم
۳۹۰- آمنہ بیگم
۳۹۱- اصغری بیگم
۳۹۲- امت اللہ بیگم
۳۹۳- اختر النساء بیگم
۳۹۴- منور خاتون
۳۹۵- احمد النساء بیگم
۳۹۶- بلقیس بیگم
۳۹۷- ضامن خاتون
۳۹۸- ممتاز جہاں بیگم
۳۹۹- رحمت بانو
۴۰۰- سکینہ بیگم
۴۰۱- بیگم جانی
۴۰۲- رقیہ بیگم
۴۰۳- چاند بیگم
۴۰۵- شاہ جہاں بیگم

مرکز بمبئی (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۴۱۸- جدو پرشاد
۴۳۶- عبدالرزاق
۴۵۰- قاسم
(کامیاب)
۴۱۰- اسمٰعیل
۴۱۲- اسمٰعیل بھائی
۴۱۳- امام الدین
۴۱۶- بدر الدین
۴۲۱- حاتم بھائی
۴۲۳- خوشحال داس
۴۲۵- رام چندر
۴۲۷- رمضان علی
۴۳۱- سید تراب علی
۴۳۳- بشیر احمد
۴۳۵- شیخ داؤد
۴۳۹- شیخ محمد قاسم
۴۴۰- شیخ ولی محمد
۴۴۱- عباس
۴۵۲- کرشنا
۴۵۴- گردھر لال
۴۵۷- محمد خالد
۴۶۵- نصیب اللہ خاں
۴۶۹- ہارون
۴۷۰- ہدایت اللہ
۴۷۱- وتاترے
۴۷۲- منوہر
۴۷۳- پربھاکر
۴۷۴- وسنت

مرکز بمبئی (اناث)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۴۸۲- مسز دھرم وتی
۴۸۶- مس لیلا
(کامیاب)

[illegible]

۹۰۰۔ [illegible] خاں

۹۱۲۔ [illegible]

۹۱۴۔ سید [illegible]

۹۲۱۔ [illegible]

مرکز [illegible] (اناث)

(کامیاب با امتیاز)

۹۲۳۔ اقبال النساء بیگم

۹۲۸۔ [illegible] بیگم

(کامیاب)

۹۲۴۔ فضیلت النساء بیگم

۹۲۵۔ قمر سلطانہ خاتون

۹۲۶۔ اختر بانو

۹۲۷۔ وحیدہ بانو

مرکز ناگر کرنول (ذکور)

(کامیاب با امتیاز)

۹۲۹۔ محبت علی خاں

۹۳۲۔ قمر خاں

۹۳۴۔ محمد بن صالح

(کامیاب)

۹۳۳۔ محمد اسمٰعیل خان

۹۳۵۔ عبد الحمید

۹۳۶۔ رام سنگھ

۹۳۷۔ [illegible] احمد خاں

۹۳۸۔ شیخ [illegible]

۹۴۰۔ محمد حسین

۹۴۱۔ محمد ابراہیم

۹۴۳۔ داؤد خاں

۹۴۴۔ امین الدین

۹۴۶۔ اسد اللہ خاں

۹۴۸۔ محمد جعفر علی

۹۵۰۔ مرزا حسن علی بیگ

۹۵۱۔ بسم اللہ خاں

۹۵۲۔ محمد اکبر علی

۹۵۵۔ حبیب خاں

مرکز ناگر کرنول (اناث)

(کامیاب بہ امتیاز)

۷۷۶۔ طیبہ بیگم صدیقی (دوم)

(کامیاب)

۷۷۸۔ محبوب بیگم

۷۷۹۔ حلیمہ بیگم

مرکز نظام آباد (ذکور)

(کامیاب بہ امتیاز)

۹۶۱۔ محمد حسین

۹۶۳۔ بشیر احمد

۹۶۴۔ محمد عبد الرحیم

۹۶۶۔ محمد عثمان خاں

۹۸۰۔ نرسلو

۹۸۲۔ بی اشتنا

۹۸۴۔ بی پربھو رام

(کامیاب)

۹۵۸۔ سید محبوب علی

۹۵۹۔ عبد الستار

۹۶۰۔ شیخ علی

۹۶۲۔ محمد بدیع الدین

۹۶۸۔ کاشی ناتھ راؤ

۹۶۹۔ جناردھن راؤ

۹۷۰۔ راگھولو

۹۷۱۔ کے گوبندوالا

۹۷۲۔ وینکٹ نرسیا

۹۷۴۔ کے راجیندر

۹۷۵۔ وی وینکٹیشم

۹۷۶۔ کے۔ وینکٹیشم

۹۷۷۔ شنکر

۹۷۹۔ اروتی راؤ

۹۸۱۔ ایم ملیا

۹۸۳۔ دتا ریڈی

مرکز نظام آباد (اناث)

(کامیاب بہ امتیاز)

۶۸۶۔ جمیل النساء بیگم

۶۸۷۔ سیدہ حجاب الزہرا ہاشمی

۶۸۸۔ کریم النساء بیگم

۷۰۱۔ عائشہ بی

(کامیاب)

۶۸۵۔ شمس النساء بیگم

۶۸۹۔ جعفری بیگم

۶۹۰۔ نظام خاتون

۶۹۱۔ سلیم النساء بیگم

۶۹۲۔ حلیمہ بیگم

۶۹۳۔ فرید بی

۶۹۴۔ خورشید النساء بیگم

۶۹۶۔ صاحب النساء بیگم

۶۹۷۔ غفور النساء بیگم

۶۹۸۔ حامد النساء بیگم

۶۹۹۔ سیدہ تہذیب النساء بیگم

۷۰۲۔ امیر النساء بیگم

مرکز ہنگولی (ذکور)

(کامیاب)

۶۰۳۔ زادے شیام

۶۰۷۔ شیو داس

۶۰۸۔ پرسرام

۶۱۰۔ سید لیاقت علی

۶۱۱۔ محمد ابراہیم

۶۱۲۔ محمد ہاشم

۶۱۳۔ خواجہ فصیح الدین خاں

۶۱۴۔ میر حمایت علی

۶۱۵۔ محمد اسمٰعیل خاں

۶۱۶۔ محمد عبد الحق

۶۱۷۔ محمد عبد الوہاب

۶۲۱۔ محمد ثناء اللہ خاں

۶۵۶۔ پنڈرت راؤ

۶۵۹۔ بالکشن

۶۶۰۔ نارائن

۶۶۲۔ نارائن

۶۶۳۔ ارپا

مرکز ہنگولی (اناث)

(کامیاب)

۶۲۲۔ طاہرہ بیگم

۶۲۳۔ عابدہ بیگم

۶۲۴۔ عابدہ بیگم

۲۵۔ شمشاد بیگم
۲۶۔ اختر افشاں بیگم
۲۷۔ عابدالنساء بیگم
۲۸۔ زاہدہ بیگم
۲۹۔ بشیرالنساء بیگم
۳۰۔ قمرالنساء بیگم
۳۳۔ قمرالنساء بیگم
۳۴۔ اختر آرا کلثوم بیگم
۳۵۔ صفیہ بیگم
۳۶۔ ہاجرہ بیگم
۳۷۔ عزیزالنساء بیگم
۳۸۔ زینت النساء بیگم
۳۹۔ حفیظ النساء بیگم
۴۰۔ سروری بیگم
۴۱۔ عابدہ بیگم
۴۲۔ عزیزالنساء بیگم
۴۳۔ زینب بیگم
۴۴۔ شاہجہاں بیگم

شعبۂ تعلیم بالغاں و اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن شاخ بنگلور اور ننجن گوڈ کا قیام

۲۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ریاست میسور اضلاع میں تعلیم زبان اردو کے مطالعہ کے ذوق کی ترقی اور توسیع کے سلسلے میں بنگلور اور ننجن گوڈ میں، شعبۂ تعلیم بالغاں و اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا قیام عمل میں آیا ہے اور ہر جگہ پر ممتاز مقامی کارکنوں پر مشتمل مجلس انتظامی کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔

بنگلور

صدر۔ جناب ایم عبدالوہاب صاحب ایم اے بار ایٹ لا صدر مدرسہ فوقانیہ، فورٹ بنگلور۔

نائب صدر (۱) جناب متولی جے ایس ظفر عادل صاحب۔

(۲) جناب بی، عبدالرؤف صاحب قریشی۔

معتمد۔ جناب بی عبدالجلیل صاحب ایم اے۔

شریک معتمد۔ جناب محمد ابراہیم صاحب۔

خازن جناب عبدالرزاق صاحب۔

ارکان۔ آر، او، جبار خاں صاحب۔ جے عبدالقادر صاحب۔ جناب خلیل اللہ شریف صاحب۔ جناب محمد غوث صاحب۔ جناب عبدالرسول صاحب۔ جناب محمد صالح صاحب۔ جناب عبدالقدوس۔ جناب عبدالجلیل صاحب۔ جناب عبدالصمد صاحب۔ جناب سید بابا صاحب۔ جناب عبدالصمد خاں صاحب۔

ننجن گوڈ

صدر جناب سید یٰسین صاحب۔

معتمد۔ جناب محمد عبدالمجید خاں صاحب۔

ارکان۔ جناب محمد غیب صاحب۔ جناب اکبر شریف صاحب۔ جناب بی محمد غیب صاحب۔ جناب سید اسداللہ صاحب۔ جناب مولوی سید حامد عمادالدین صاحب۔

روداد شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا جلسہ بمقام دفتر محل تاریخ ۲۸ دسمبر ۱۹۵۲ء کو بوقت صبح ساڑھے دس بجے منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اراکین نے شرکت کی۔

۱۔ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ
۲۔ ؍؍ بشیرالنساء بیگم صاحبہ
۳۔ ؍؍ جہاں بانو بیگم صاحبہ
۴۔ ؍؍ تہنیت النساء بیگم صاحبہ
۵۔ ؍؍ سعیدالنساء بیگم صاحبہ
۶۔ ؍؍ عظمت النساء بیگم صاحبہ (مسز قیوم)
۷۔ ؍؍ رفیعہ سلطانہ بیگم صاحبہ
۸۔ ؍؍ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبہ

محترمہ عظمت النساء بیگم صاحبہ نے شرکت سے معذوری کا پیام بھیجا اور مصدق فاطمہ بیگم نے بوجہ ناسازی مزاج شرکت نہ کی۔

سابقہ اجلاس کی روداد کی سماعت و توثیق کے بعد اس سے متعلق امور پر غور کیا گیا۔

(۱) بزم ادب کے جلسے کے لیے لطیف النساء بیگم صاحبہ سے یہ طے ہوا تھا کہ ذوالقعدہ میں یہ جلسہ ترتیب دیا جائے لیکن لطیف النساء بیگم صاحبہ نے کہلا بھیجا کہ لیڈی فخر الدین کے لیے مدرسہ محبوبیہ میں خاص تیاریوں کی وجہ سے فرصت نہ ملی

[illegible] سکتا آخر فقرہ [illegible]

[illegible] مستقل [illegible] کی درخواستیں [illegible] پیش کرنے پر طے ہو چکا تھا کہ سرکاری [illegible] کے بعد اس کا تصفیہ کیا جائے گا لیکن مگر انکار [illegible] پیدا ہو گئے ہوئے اس کی فوری تصفیہ کی [illegible]

[illegible] طے پایا کہ معلمہ کو پانچ روپیہ ماہوار [illegible] ۱۵ آذر سے دیئے جائیں لیکن ان کی [illegible] وصول ہونے کے بعد ہوگی۔

چندہ سالانہ [illegible] شدہ رقم مبلغ (للعہ) روپے نقدیہ [illegible] صاحب نے معتمد کے حوالے کئے۔

اس کے بعد دستور العمل اور اس کے قواعد زیر بحث آئے۔ اراکین کی جانب سے جو ترمیمیں بتائی گئیں اور ان پر غور کیا گیا۔ قاعدہ نمبر ۳ فقرہ ۲ (متعلق مدت رکنیت) جہاں بانو بیگم اور عظمت النساء بیگم کا خیال تھا کہ سہ سالہ ہونا زیادہ مناسب ہوگا لیکن کیونکہ قاعدہ کی رو سے دوبارہ منتخب ہونے کی گنجائش موجود تھی اس لئے کثرت رائے ان کے خلاف تھی اور دو سالہ میعاد برقرار رکھی گئی۔

قاعدہ نمبر ۳ کے تیسرے فقرے کی مسز قیوم اور تہنیت النساء بیگم نے قید اٹھا دینے کی سفارش کی تھی اور دوسرے رکن کی طرح عہدہ داروں کو بھی دوبارہ نامزد کئے جانے کی تجویز کی تھی جس کی تائید بشیر النساء بیگم صاحبہ، جہاں بانو بیگم صاحبہ اور سعید النساء بیگم صاحبہ نے کی لیکن معتمد نے اصول کے لحاظ سے اس فقرہ کی منظوری کی درخواست کی اس کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی ترمیم سے اپنا اختلاف ظاہر کیا۔ کثرت رائے چونکہ معتمد کے خلاف تھی اس لئے تصفیہ کو مجلس انتظامی کی صوابدید پر چھوڑنے کی رائے ہوئی۔

بقیہ قاعدے بکثرت آراء منظور ہوئے اور دستور العمل بحیثیت مجموعی صرف قاعدہ نمبر ۳ فقرہ ۳ کی ترمیم کے ساتھ منظوری

مجلس انتظامی کو نافذ کر دینے کی اجازت اراکین سے حاصل کی گئی۔ کیونکہ یہ اجلاس بطور خاص دستور العمل کی منظوری و نفاذ کے متعلق تھا اس لئے اس کے بعد دوسری کوئی کارروائی نہ ہوئی اور مجلس برخاست کی گئی۔

(نوٹ) اجلاس کے ختم پر محترمہ عظمت النساء بیگم صاحبہ کی پیش کردہ تحریک تعزیت منظور کی گئی جو حسب ذیل ہے۔

شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی منعقدہ ۲۸ آذر ۱۳۵۴ف م ۲۸ نومبر ۱۹۴۴ء میں خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالمجید خان ثانی کی وفات حسرت آیات پر جو قرار داد تعزیت منظور کی گئی اس کو حسب تصفیہ مجلس علیا حضرت شہزادی ہز ہائینس در شہوار بیگم صاحبہ شہزادی برار کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

"خلیفۃ المسلمین اعلیٰحضرت سلطان عبدالمجید خان مرحوم کی وفات حسرت آیات پر ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کی یہ مجلس انتظامی اپنے دلی رنج و الم کا اظہار کرتی ہے۔ سلطان مرحوم اس عثمانی خاندان کے چشم و چراغ اور جلیل القدر سلطان تھے جس نے اسلام کی خدمت کے علاوہ علم و فضل کی بھی صدیوں سرپرستی کی ہے۔ ان کی وفات سے مسلمانان عالم کو جو صدمہ پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔ خاص کر ہز ہائینس حضرت علیا شہزادی صاحبہ برار کو اپنے پدر محترم کی مفارقت کا جو دلی صدمہ ہوا ہے اس سے یوں تو کل خواتین اسلام متاثر ہوئیں لیکن خاص کر دکن کی خواتین اس سے بیحد غمگین ہیں۔ ہماری دلی دعا ہے کہ باری تعالیٰ سلطان مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور علیا حضرت شہزادی صاحبہ کو اس جانگداز سانحہ میں صبر و استقامت عطا فرمائے۔"

معتمد شعبۂ نسواں

تاریخ دکن کانفرنس

ادارہ کے شعبۂ تاریخ کی تحریک پر جو تاریخ دکن کانفرنس منعقد ہورہی ہے اس کی رکنیت استقبالیہ کیلئے عالیجناب نواب علی یاور جنگ بہادر نے حسب ذیل دعوت نامہ اجرا فرمایا ہے۔

جناب والا!

سرزمین دکن اور خاص کر مملکت حیدرآباد کی تاریخ اپنی گوناگوں خصوصیات اور اہمیت کی وجہ سے ماہرین تاریخ کا مرکز نظر بنی رہی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر مورخین اور سرکاری وخانگی ادارے کام کرتے آئے ہیں۔ یہ کام اب ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا ہے جبکہ شعبۂ تاریخ ادارۂ ادبیات اردو نے محسوس کیا کہ تاریخ دکن سے متعلق ماہرین تاریخ اور صاحبان ذوق ایک مرکز پر مجتمع ہوں اور دکن کی تاریخ کے کام کو آگے بڑھانے میں ایک دوسرے سے استفادہ کریں۔ نیز اس سے دلچسپی رکھنے والوں کے آپس کے میل ملاپ اور ذہنی تعلقات میں اضافہ ہو۔

اس تخیل کے پیش نظر ادارۂ ادبیات اردو کی تحریک اور شعبۂ تاریخ جامعۂ عثمانیہ۔ انجمن تاریخ و اثریات حیدرآباد۔ دفتر دیوانی و مال سرکار عالی۔ محکمۂ آثار قدیمہ۔ بزم تاریخ جامعۂ عثمانیہ اور ہسٹری یونین نظام کالج کے اشتراک سے طے پایا کہ ایک انجمن تاریخ دکن سوسائٹی قائم کیجائے جو ہر دو سال میں کسی نہ کسی مقام پر اپنی ایک کانفرنس بھی منعقد کرتی رہے چنانچہ اس کی پہلی کانفرنس اپریل ۱۹۴۵ء میں منعقد کیجائیگی جس میں مختلف جامعات اور اداروں کے ماہرین تاریخ کے علاوہ ایسے اصحاب بھی شرکت کریں گے جو تاریخ دکن کے متعلق کام کر رہے ہیں یا اس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس انجمن اور کانفرنس کی سرپرستی اعلیٰحضرت [illegible] سلطان العلوم خسرو دکن و برار نے ازراہ معارف پروری قبول فرما کر عزت بخشی ہے۔ آنریبل سر [illegible] صدر المہام مال حکومت سرکار عالی نے اس انجمن کی پہلی کانفرنس کی صدارت قبول فرمائی ہے اور ہز اکسلنسی نواب صاحب چھتاری صدر اعظم دولت آصفیہ ازراہ علم دوستی اس کا افتتاح فرمائیں گے۔

تاریخ دکن کانفرنس کی اس پہلی [illegible] اجلاسوں کی صدارت اور ان میں شرکت [illegible] لئے دکن اور ہندوستان کے مشاہیر [illegible] اکثر نے اس دعوت کو قبول بھی کرلیا ہے۔

کانفرنس کے سلسلہ میں دکن کے تاریخی آثار [illegible] نیز تاریخی کاغذات کی ایک [illegible] کی نمائش بھی منعقد کی جائیگی [illegible] اہل ملک میں تاریخ دکن کا ذوق بڑھانے میں [illegible]

انعقاد کانفرنس کے انتظامات ایک مختصر کمیٹی [illegible] کے سپرد ہیں جو اس امر کی متمنی ہے کہ اس مفید تحریک کو کامیاب بنانے میں دکن اور اس کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے [illegible] خاطر خواہ اعانت فرمائیں گے۔

کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کی رکنیت کے لئے دس روپیہ چندہ مقرر کیا گیا ہے لیکن امید ہے کہ آپ اپنی جانب سے کوئی عطیہ بھی ارسال فرمائیں گے۔ رکن مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے کانفرنس کے عام اجلاسوں میں شرکت کے مجاز ہونے کے علاوہ آپ کی خدمت میں وہ کتاب بھی بطور تحفہ ارسال کی جائیگی جس میں اس اجتماع کے خطبے۔ مقالے۔ تجویزیں اور روئداد شائع ہوگی۔

مجلس استقبالیہ کی رکنیت کا چندہ اور عطیہ براہ کرم مجلس انتظامی کے معتمد مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی یا خازن ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کے نام دفتر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد کے پتہ پر ارسال فرمایا جائے۔

علی یاور جنگ

ایوت محل ضلع مسلم کانفرنس کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ بصدارت جناب پروفیسر شور صاحب ترتیب دیا گیا تھا جو بہت کامیاب رہا۔ اراکان شاخ کی جانب سے ایوت محل ضلع مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں۔

یہ اجلاس ضلع میں اردو مدارس کی معتدبہ تعداد کے پیش نظر ضلع بورڈ ایوت محل سے درخواست کرتا ہے کہ نہ صرف جہاں تناسب آبادی بلکہ ماتحت اردو مدارس کے ساتھ دفتری مراسلت وغیرہ میں سہولت کے خیال سے بھی ضلع بورڈ مدارس کے ماتحت ہر لوکل بورڈ کے آفس میں ایک اردو داں مسلم کلرک کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

یہ اجلاس ضلع بورڈ ایوت محل اور میونسپل کمیٹی ایوت محل کے اس سرکلر کے خلاف سخت احتجاج بلند کرتا ہے جس کی رو سے اردو مدارس کے تمام رجسٹروں کے اندراجات کا مرہٹی زبان میں ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

یہ اجلاس ضلع بورڈ کے اس اقدام کو اردو زبان کی ترویج و اشاعت و افادیت اور اردو مدارس کے قدرتی حق پر ضرب کاری سمجھتا ہے۔ لہٰذا یہ اجلاس حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس سرکلر کو جہاں تک اس کا اردو مدارس سے تعلق ہے کالعدم ٹھیرائے۔

یہ اجلاس ڈی سلوا اسکیم کے مطابق اردو زبان کے جملاتی طریقہ تعلیم کی غیر افادیت بلکہ مضرت کے متعلق اساتذہ اردو کی پیہم شکایات کو مناسب اہمیت دیتے ہوئے پراونشل انجمن ترقی اردو ناگپور کو توجہ دلاتا ہے کہ وہ جملاتی طریقہ تعلیم کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق صاحب، ڈاکٹر زور صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سجاد مرزا صاحب جیسے مستند ماہرین تعلیم سے استصواب رائے فرما کر اردو داں پبلک کے لئے اس باب میں صحیح راہ عمل پیش کرے۔

شاخ اندولہ ضلع گلبرگہ

صدر۔ ڈاکٹر امنگن گڑہ صاحب وکیل۔ کتب خانہ دار مولوی حکیم محمد عبد[illegible]شریف صاحب طبیب یونانی اندولہ۔
خازن۔ نرسنگ راؤ صاحب پٹواری اندولہ۔
معتمد۔ سید عثمان صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ اندولہ۔

شاخ کلیانی

شاخ ادارہ کلیانی کا جلسہ تقسیم اسناد ۲۲ [illegible] بتاریخ ۲ [illegible] زیر صدارت عالیجناب فیضمآب نواب سید محمد جمال الدین محمد خاں بہادر دام اقبالہٗ والی اسٹیٹ کلیانی منعقد ہوا جس میں جناب نواب سید محمد مظہر حسین خاں صاحب برادر زادہ نواب صاحب ممدوح اور مولوی شیخ خلیل اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی تعلقدار اسٹیٹ کلیانی مولوی سید سبط نبی صاحب بی اے ایل ایل بی منصف۔ مولوی نظام علیخاں مددگار۔ مولوی اکبر شمس الدین صاحب [illegible] کوتوالی اور دیگر معززین شریک تھے یہ جلسہ اندرون قلعہ حوض چاندنی چبوترہ کے متصل منایا گیا جہاں ایک پنڈال تیار کیا گیا تھا۔ جلسہ کا آغاز مشاعرہ سے ہوا جس میں جناب مصحف، مرزا، مائل، حبیب، عطا، نقیح نے اپنا غیر طرحی کلام سنا کر جلسہ کو محظوظ فرمایا۔ آخر میں صدر آرائے بزم عالیجناب نواب صاحب بہادر کی نظم "نجارہ ل" پڑھی گئی جو کیفیت پر مبنی تھی۔ مشاعرہ کے خاتمہ پر مولوی غلام محی الدین صاحب رکن تعمیر نے شاخ کی کارگزاری کی سالانہ رپورٹ سنائی۔ مولوی سید تاج الدین صاحب منشی فاضل نے "نذر عقیدت" کے عنوان سے ایک مضمون سنایا جس میں نواب صاحب بہادر کے تابناک عہد کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ مولوی شہاب الدین صاحب نے اپنی تقریر میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کی مختصر تاریخ بیان کی آخر میں نواب صاحب ممدوح نے شرکائے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کلیانی میں علمی مذاق کی ترقی پر اظہار خوشنودی فرمایا اور اکبر الہ آبادی کا ایک شعر پڑھ کر طلبہ کو اس پست و ذلیل ذہنیت سے بچنے کی بطور خاص نصیحت کی کہ وہ جب تعلیم سے بہرہ مند ہو کر نکلتے ہیں تو اپنے ان پڑھ اور غریب والدین کو نہ صرف حقیر نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں بلکہ انھیں والدین ماننے میں بھی تامل ہونے لگتا ہے۔ تقسیم اسناد کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

محمد عطا [illegible]

[illegible] ہنگولی

[illegible] ارشاد شعبہ نسواں ادارہ ادبیات اردو شاخ [illegible] بوقت ۲ ساعت دن بمقام [illegible] مدرسہ نسواں تار ہنگولی زیر صدارت محترمہ مسز [illegible] صاحبہ انصاری دوم تعلقدار منعقد ہوا اس جلسہ میں [illegible] سے زائد ہندو اور مسلم خواتین موجود تھیں۔ [illegible] صاحبہ کی تلاوت کے بعد حمیدہ بیگم خورشید معتمد شعبہ نسواں نے سالانہ رپورٹ سنائی خواتین اور طالبات نے تقریریں کیں اور اچھی اچھی نظمیں سنائیں معتمد شعبہ نسواں نے [illegible] رپورٹ میں بیان کیا کہ یہ سارا کام عالیجناب ڈاکٹر [illegible] صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو اردو زبان کی ترقی اور اشاعت میں منہمک ہیں ایک اور شخصیت محمد عثمان خاں صاحب کی [illegible] ہے۔ صاحب موصوف ہی کی کوشش سے ۱۳ آذر [illegible] سے اس شعبہ کا قیام عمل میں آیا تیسری اہم شخصیت محترمہ قمر النساء بیگم صاحبہ کی ہے جن کی صدارت اور نگرانی میں یہ ادارہ چل رہا ہے یہی ہستیاں شکریہ کے قابل ہیں۔ گزشتہ سال کے نتائج صد فی صد رہے اس سال اردو قابل میں ایک شریک ایک کامیاب۔ اردو عالم، شریک ۵ کامیاب اردو دانی میں ۱۱ شریک ۱۱ کامیاب اس طرح نتیجہ ۹۰-۹۵ فیصد رہا۔ اس سال گزشتہ سالوں سے زیادہ طالبات شریک ہیں۔ نگرانی صاحبہ معلم نسواں مرہٹی ہنگولی نے تعلیم نسواں کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے بیان کیا کہ اصلاحات کے تحت ملکی طبقہ نسواں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے نمائندے منتخب کرنے ہوں گے۔ لیکن جب تک ہم تعلیم حاصل نہ کریں اور اپنی صلاحیت نہ پیدا کریں کس طرح اپنے طبقہ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ زبان اردو ہر ہندوستانی کی مادری زبان ہے کسی خاص قوم یا فرقہ کی نہیں۔ چنانچہ سر تیج بہادر سپرو، مسٹر راج گوپال اچاری، مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت جواہر لال نہرو جیسی ممتاز ہستیاں بھی زبان اردو کی حامی ہیں علاوہ ازیں بہت سے ہندو مؤلفین نے بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

میں ادارہ کی سطح ایک [illegible] نے نسوانی [illegible] کے تحت بہت کچھ کام کیا ہے۔ محترمہ صدر جلسہ مسز نجم الدین صاحبہ انصاری نے اپنے خطبہ صدارت میں ارشاد فرمایا کہ اس ادارے سے مجھے ذاتی دلچسپی ہے کیونکہ یہ ایک ایسی زبان کی ترقی میں مصروف ہے جو ہندو مسلمان دونوں کی مشترکہ ملکیت اور ان کے اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے محترمہ موصوفہ نے فرمایا کہ مجھے توقع ہے کہ شعبہ نسواں میں دوسری ادبی سرگرمیاں مثلاً مجلس مناظرہ تصنیف و تالیف کی کوشش جاری کی جائے گی۔ سردست ہنگولی کی ایک جامع تاریخ کی تیاری کی جانب ادارہ کو توجہ کرنی چاہیئے اس کے علاوہ خواندگی کی مہم کو تیزی کے ساتھ جاری رکھا جائے۔ ہماری بہت سی بہنیں لکھنا پڑھنا نہ آنے کی وجہ سے نہ صرف زمانے کی رفتار سے ناواقف ہوتی ہیں بلکہ گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اپنا نقصان کر لیتی ہیں۔ ادبیات اردو کے شعبہ نسواں کو چاہیئے کہ گھر گھر پھر کر ان پڑھ لڑکیوں اور ماؤں کو لکھنے پڑھنے سے واقف کرائیں۔ مجھے توقع ہے کہ شعبہ نسواں اس کی جانب عملی قدم اٹھائے گا۔ میں خود اپنے فرصت کے اوقات کو اس خدمت کے لئے پیش کرتی ہوں امید کہ دیگر معزز خواتین بھی اس کی جانب توجہ کریں گی۔ آخر میں میں اعلیٰحضرت سلطان العلوم کے عمر و اقبال میں ترقی کی دعا کرتی ہوں جن کی بدولت دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔

تقسیم اسناد کے بعد کامیاب ہونے والی طالبات کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے بعد ازاں خواتین نے عصرانہ میں شرکت کی۔ بعد ختم عصرانہ صدر جلسہ نے بطور خاص شعبہ نسواں کی امداد کے لئے خواتین کی توجہ منعطف کرائی۔ فہرست مرتب کیا کر صدر جلسہ اور مسز حامد علی صاحب منصف نے ایک ایک روپیہ نقد عنایت فرمایا۔

حمیدہ بیگم خورشید

[illegible] کا کوئی ذخیرہ نہ تھا۔ [illegible] طلبہ سے امید کرتا ہوں کہ اس [illegible] کے جلسہ کو بہار کیا دیتا ہوں۔ [illegible] ایسا ہے۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے [illegible] جذبات کا اظہار کرتا ہوں۔ [illegible] کا ہے وہ سب ہمارے آقائے [illegible] حضرت جنت مکان اعلیٰ کی نیک صفات [illegible] ہے۔ ہم سب حضرت جنت مکان عالی ظل اللہ [illegible] کے عمر و اقبال میں ترقی کی دعا کرتے ہیں۔

آخر میں آپ نے دارالمطالعہ شعبۂ طلبہ ٹاؤن کمیٹی کی [illegible] کو گراں قدر عطیہ عطا فرمایا اس کے بعد [illegible] نے معزز صدر و حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ [illegible] کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

پیام عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب

شعبہ طلبہ ٹاؤن کمیٹی کے سالانہ جلسہ کا [illegible] موصول ہوا۔ مجھ کو آپ کے اس جلسہ میں ضرور شریک ہونا تھا لیکن بعض اہم کاموں کی وجہ سے ان دنوں میرا بلدہ میں رہنا بہت ضروری ہے۔ میں اپنی عدم شرکت کی آپ اور آپ کے جلسہ کے صدر راجہ شیوبچن رائے صاحب جاگیردار سے معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ جیسے ہونہار نوجوان اپنے لائق صدر کی رہنمائی میں اردو زبان اور ادب کی سچی خدمات انجام دیں گے۔ اردو زبان ہندو مسلم اتحاد کا سنگم ہونے کے علاوہ ہمارے ملک سرکار عالی اور آئندہ کے وطن کی مادری زبان ہے۔ اس کے تحفظ اور ترقی کے لئے ہر کوشش ہر بہی خواہ ملک کا مقدس فرض ہے۔ آپ کے جلسہ کی کامیابی کے لئے میری بہترین تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

پیام جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد

جناب نے اپنے شعبہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت دے کر میری جو عزت افزائی فرمائی اس کے لئے میں آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ بعض ناگزیر وجوہ کی وجہ سے اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ آپ میری طرف سے اپنے صدر راجہ شیوبچن رائے صاحب جاگیردار سے معذرت چاہئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اردو زبان کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے میں آپ کی تمام سرگرمیوں میں غائبانہ شریک ہوں۔ اور آپ کی ہر ایک تحریک سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ اردو زبان ہندو مسلم اتحاد کا نتیجہ ہے اور یہی وہ واحد ذریعہ ہے جو اہل ملک کو قریب تر کر سکتا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ آپ نوجوان اپنے بزرگوں کی سرپرستی میں اپنی زبان کی سچے معنوں میں خدمت انجام دیں۔

ہندستانی تمدن

تاریخ ہند کے اکثر طالب علم پروفیسر ایشوری پرشاد کی ان قابل قدر کتابوں سے واقف ہوں گے جو انگریزی میں شائع ہو کر اونچے علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ ہند کا مطالعہ ایک خاص نقطۂ نظر سے کیا ہے۔

ہندستانی تمدن اسی مصنف کی ایک ضخیم کتاب کا ترجمہ ہے جس میں انھوں نے ہڑپا اور موہنجوداڑو کے قدیم ہندی تمدن سے لے کر گپت خاندان کے تدریجی کارناموں تک کی عمرانی، مذہبی، سیاسی اور فنی تحریکات کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ اسی تدریجی پس منظر میں کرنے کے عادی ہو جائیں تو سب سے پہلے ہمارے سامنے جو چیز آئے گی وہ اس کی بوقلمونی ہے کس طرح مختلف قومی اور تمدنی قوتیں ملیں۔ ان میں ربط ضبط پیدا ہوا اور اس ربط ضبط نے رنگ برنگ کے رد عمل پیدا کئے اور پھر کس طرح ہزاروں برس کی عمرانی، مذہبی، سیاسی اور فنی تحریکوں نے مل جل کر مستقل تمدنی سرمایہ مہیا کرنے میں حصہ لیا۔ اگر ہماری نظر ان سب چیزوں کا احاطہ کر سکے تو تاریخ ہمارے لئے سب سے بڑا اخلاقی درس بن جائے۔

موضوع اس قدر ٹھوس ہے پھر بھی کتاب کے انداز بیان میں خشکی یا بوجھل پن نہیں۔"

از رسالہ آجکل بابت ۱۵ جنوری ۱۹۴۵ء

عمارتِ ادارہ

نومبر کے سب رس میں عمارت ادارہ کی تعمیر کے لئے فراہمی رقم کی جو اپیل شایع ہوئی ہے اس کا ملک اور بیرون ملک میں فراخدلی سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے جو علم دوست اصحاب سرزمین دکن کے اس علمی اور ادبی مرکز کی تعمیر میں ادارۂ ادبیات اردو کا ہاتھ بٹا رہے ہیں ان کی فہرستیں رقموں کی تفصیل کیساتھ سب رس میں شائع ہوتی رہیں گی۔ اس سلسلے میں اردو کے بہی خواہوں کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ تعلقہ گنگاکھیڑ کے ایک جوان آبکاری نے اپنی قلیل تنخواہ میں سے ہر مہینے ایک روپیہ کا عطیہ دینے کا پیش کش اپنے حسب ذیل کارڈ کے ذریعہ سے کیا ہے۔

"حضرت قبلہ السلام علیک

بعد از قدمبوسی عرض ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ادارہ کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے جسکے لئے رقم چندہ وصول کیجا رہی ہے۔ اگر ارباب ادارہ میری یہ گزارش قبول فرمائیں تو میں ہر ماہ بغرض تعمیر عمارت ادارۂ ادبیات اردو اپنی تنخواہ سے ایک روپیہ ادا کرتا رہوں گا۔

جواب کا منتظر — خادم محمد برہان الدین اردو عالم

جوان آبکاری گنگاکھیڑ"

یہ کارڈ ادارہ کے ایک علم دوست اور سرگرم رفیق مولوی عارف الدین حسن صاحب ڈویژن آفسر آگرکول کے نام آیا تھا جس کو انھوں نے حسب ذیل تحریر کیساتھ دفتر ادارہ پر ایصال فرمایا ہے۔

"مسٹر برہان الدین اردو عالم کامیاب جوان آبکاری ضلع پربھنی کا کارڈ ملفوف کر رہا ہوں کہ آپکے ادارہ کی تعلیم نے صرف مادۂ علمیت ہی نہیں بڑھایا بلکہ جذبۂ ایثار و خدمت گزاری ملک بھی پیدا کیا۔ میں کبے انتہا متاثر ہوا۔ جناب اس کا جواب انھیں راست عطا فرمادیں۔"

یہ تو حیدرآباد کے ایک غریب بہی خواہ اردو کا ایثار تھا اب بیرون ریاست کے ایک علم دوست کی تحریر کا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"میں نے سوچا کہ اس موقع پر ادارہ کی کچھ خدمت کروں۔ لہٰذا میں نے طے کیا کہ جبتک ادارہ کی عمارت تعمیر نہ ہوگی اسوقت تک سالانہ پچیس ۲۵ روپیہ اپنی آمدنی سے اس فنڈ میں ادا کرتا رہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اور ادارہ میری اس حقیر پیش کش کو قبول فرمائیں گے۔"

یہ مولوی فیض انصاری صاحب معتمد انجمن اشاعت اردو ناگپور کے خط کا اقتباس تھا اس کے ساتھ صاحب موصوف نے پچیس ۲۵ روپے کا چک بھی ایصال فرمایا ہے۔

ہم ان دونوں صاحب ایثار علم دوستوں اور اردو کے بہی خواہوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور متوقع ہیں کہ ادارہ کو ایسے ہی سیکڑوں بہی خواہ حاصل ہوں گے۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
[illegible]
[illegible]

سب رس

جلد [illegible] — بابت اپریل ۱۹۴۵ء — شمارہ ۴

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ [illegible] منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

اردو میں سائنسی ادب

قرآن السعدین | یہ اخبار ... [illegible] ... کلمے اور ہر صفحے میں ... [illegible]
... [illegible] ... ہو کر شائع ہوتا تھا۔
... [illegible] ... اس کی دوسری
جلد ... [illegible] ... جس پر ... [illegible] ... درج تھا۔ اس
اخبار پر حسب ذیل عبارت درج رہتی تھی:۔

"قرآن السعدین

نمبر (۲۴) جلد ۲ قیمت ماہواری دو روپیہ اور ... [illegible]
دے بیس روپیہ سالانہ اور گیارہ روپیہ ششماہی مورخہ ۲۳ اگست
یوم شنبہ ۱۸۴۸ء"

اس کا حجم عموماً (۱۲) صفحات ہوتا تھا کبھی کبھی ایک دو
صفحات کا ضمیمہ بھی شامل کر دیا جاتا تھا۔ اس اخبار میں تمام
ہندوستان کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ علمی، تاریخی اور
سائنسی مضامین کو بھی بطور خاص جگہ دی جاتی تھی۔ تصویریں
بھی شریک رہتی تھیں جو لیتھو میں خوبصورت چھپتی تھیں۔
فلکیات، نباتات، حیوانات وغیرہ پر اکثر اشاعتوں میں کچھ
نہ کچھ ضرور لکھا گیا ہے۔ اس کی افادیت کے بارے میں
جلد دوم نمبر (۲۵) میں صفحہ (۲۴۹) پر جو عبارت درج
ہے اس کا اقتباس یہ ہے:۔

> "قرآن السعدین کو جاری ہوئے دو سال
> گزرتا ہے۔ وہ مرم نارائن اس کا مہتمم یا تو
> سکالر یا ماسٹر مدرسہ دہلی کا ہے۔ حال کی
> نسل کے بہبود اور ترقی کے واسطے جیسے
> مفصل لکھا اخباروں میں سے میری دانست
> میں وہ بہت بہتر ہے .... اس کی زبان
> میں آمد ہے آورد نہیں باعث اس کا
> یہ ہے کہ اس کے مضامین انگریزی سے

(۱ اخبار [illegible]

اردو میں ترجمہ کئے جاتے ہیں۔
میں اس اخبار کو بہم پہنچانا [illegible]
کے ساتھ تشبیہ دیتا ہوں جو [illegible]
کے پڑھنے کے قابل ہے۔ [illegible]"

اب ہم یہاں اس اخبار کے صفحہ ۲۴۰ تا ۲۴۱ بابت
۲۳ اگست ۱۸۴۸ء کی عبارتیں نقل کرتے ہیں:۔

بیان نباتات کا

نباتات ایسی قسم کے اسجار دیکھنے میں آتی ہیں جو
کبھی ہندوستان میں دیکھنے نصیب نہیں ہوتے۔ ثعلب ایک
قسم کی نباتات ہے جو ہندوستان میں جا کر بہت قیمت پاتی
ہے اور گراں قیمت سے بکتی ہے۔ سچ ہے، [illegible] اس کے ہوتا
اس کے درخت کھڑے ہیں۔ یہی ثعلب ہندوستان میں
عطاروں کے ہاتھ یہاں کے لوگ بیچتے ہیں وہ ثعلب جو
اصل ولایت سے آتی ہے اس میں اور اس میں بہت فرق
ہے لیکن بسبب شکل و شباہت کے تمیز نہیں ہو سکتی۔ ایک
بوٹی اسجار ایسی دیکھنے میں آئی کہ اس میں زہر
اس قدر ہوتا ہے جیسا کہ بچھو یا سانپ کی کاٹنے میں
ہوتا ہے اس کا نام بچھو ہے اس بچھو کے درخت کی
یہ صورت ہے کہ وہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک مادہ
دوسرا نر، مادہ کا درخت چھوٹا ہوتا ہے۔ قریب آدھ گز
کے اور نر بہت بڑا ہوتا ہے اگر اس کے پتے کے تئیں ہاتھ
کسی کا لگ جائے فوراً ہاتھ پر آبلے پڑ جائیں اور تکلیف ایسی
ہوتی ہے جس طرح بچھو کے کاٹنے میں ہوتی ہے۔ اور یہ ہاتھ
میں اسی طرح کی اٹھا کرتی ہیں۔ ۲۳ تاریخ جولائی کو دامن
میں میرے ہاتھ اس بوٹی کا پتا لگا تھا اسی وقت آبلے پڑ گئے
اور تکلیف اور سوزش اس قدر تھی کہ برداشت نہ کر سکتا
تھا غرض کہ دوسرے روز تک ہاتھ کا عدم رہا۔

بہ قیمت گراں ہندوستان میں نکالے جاتے ہیں اسجائے
مفت ہر ایک آدمی کے بدون خواہش پھٹ جاتی ہے مفت
میں آدمیوں کا خون پیتے کو ہیں۔ واسطے ادا ء حاجت
بشری کے جو شخص جنگل میں جاتا ہے یا غار میں اوترتا
ہے دوچار جونک کو خون پلا آتا ہے۔ سانپ اس پہاڑ
میں کوڑیالے بہت دیکھنے میں آئے اژدہا بھی بہت
ہیں ایک اژدہا کہ قد اس کا قریب دو بالشت کے اور
دل اس کا دو دانگ مدور قریب ہمارے بنگلے کے رہتا
ہے۔ بسبب عدم فرصت کے اتنا ہی حال لکھا گیا جو
خدمت عالی میں بھیجتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ بوقت
فرصت بہت حال ضروری مع حال نباتات اور حیوانات
کے مشرح لکھ کر عرض کروں گا۔ الراقم کریم الدین از
کوہ مسوری

اس اخبار کے صفحہ (۴۷۹) مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۴۵ء
میں ایک نئے رسالہ "خیر خواہ ہند" کا تعارف کرایا گیا ہے جو لالہ
رام چندر مدرس علوم انگریزی مدرسہ دہلی ماہانہ شائع کرتے تھے
صفحات (۵۰) اور چندہ ماہانہ ایک روپیہ تھا۔ یہ رسالہ ہم کو
دستیاب نہ ہو سکا لیکن اس اخبار میں اس رسالے کے بعض مضامین
کو نقل کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس رسالہ میں بھی
سائنسی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ ہم یہاں ان کے اقتباس
درج کرتے ہیں۔

"جاننا چاہیے کہ فقط وہ علوم جن سے انسان کی راحت
اور نیکی زیادہ ہو سکے وہی قابل تحصیل اور فکر اور تامل کرنے
کے ہیں منجملہ ان کے ریاضیات اور طبیعیات اور سیاست
مدنی اور اصول قوانین اور علم اخلاق اور تاریخ اور معرفت طبیعی
اور طب وغیرہ......"

"حکمائے متقدمین نے یہ دیکھ کر کہ آفتاب ہر روز مشرق
سے طلوع کر کے مغرب میں غروب ہو جاتا ہے یہ قیاس کیا کہ
وہ گرد زمین کے گردش کرتا ہے خلاف اس کے حکمائے متاخرین
نے بہت سے تجربات سے قیاس بالا کے برعکس ثابت کیا......
باستعانت اور باقول کے ثابت کیا کہ زمین آفتاب کے گرد
بیضوی مدار میں گردش کرتی ہے......"

اخبار نمبر (۳۳) مورخہ ۲۳ اگست ۱۸۴۵ء میں
ماسٹر رام کی تصنیف "عجائبات روزگار" چھپ کر شائع
ہونے کی خبر ہے اس کتاب کے صفحہ (۱۲۰) کی عبارت نقل کی ہے
جس کا اقتباس یہ ہے:-

"سات ستارے اس قدر بڑے ہیں کہ بعض
ان میں کے زمین سے ذرا چھوٹے ہیں اور
وہ ستارے جو ذرا ذرا سے آسمان پر چمکتے
ہوئے معلوم ہوتے ہیں فی الحقیقت مثل
مانند آفتاب کے ہیں اور ان کے گرد بہت سے
سیارے مثل کرۂ زمین کے گردش کرتے
ہیں اور ان سب سیاروں میں مخلوقات
کی کسی نہ کسی طرح کی بستی ہے......"

صفحہ (۴۹۶) اور (۴۹۰) پر "فرد تقسیم منافع
مطبع العلوم منافع فیصدی ایک روپیہ یکم دسمبر ۱۸۴۴ء لغایت
آخر اگست ۱۸۴۵ء" کی سرخی کے تحت حصہ داروں کے
نام مع حصص و منافع درج ہیں جن میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں:
"مسٹر سپر نجر صاحب، مفتی صدر الدین خاں صاحب،
رائے رام سرن داس صاحب، مولوی مملوک علی صاحب، لالہ
راد ہا کشن، الطاف حسین، ماسٹر نور محمد"

صفحہ (۴۹۶) پر ایک اور اخبار "صدر الاخبار" کا
ذکر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں بھی کیمیائی مضامین شائع
ہوتے تھے۔ اس عبارت کا اقتباس یہ ہے:-

"صدر الاخبار و تاریخ الافکار مورخہ چہارم اپریل
ماہ کے مطالعے سے گزرا اس میں ثبوت اختلاف شکل عروسی
کا نتائج افکار لالہ منولال صاحب اسسٹنٹ سول انجینیر سے مندرج
ہے......اس میں شک نہیں کہ اختلاف مذکور لالہ صاحب
و صاحب مہتمم صدر الاخبار کے ملاحظے سے نہ گزرا ہوا اور اس
انھوں نے اپنی ہی فکر سے نکالا ہو مگر اظہار اس امر کا کہ وہ
کسی کتاب میں نہیں ہے اس بات پر دال ہے کہ انھوں نے
کتابوں پر نظر نہیں کیونکہ اگر صاحب موصوف نے تحریر اقلیدس
انگریزی جو باہتمام کلکتہ بک سوسائٹی کے ۱۸۴۱ء میں چھپی ہے
ملاحظہ کی ہوتی تو وہ اس امر کو نہ فرماتے......"

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

[illegible] سائنس کی تحقیق ہمارے لئے تخلیقِ حیات
[illegible] ایک راز بنی ہوئی ہے۔ حیات کی مادی ترین اکائی
[illegible] خلیہ ہے۔ ماہرین کیمیا بآسانی خلیہ کی
تحلیل [illegible] عناصر ترکیبی میں کر سکتے ہیں۔ یہ عناصر نوعیت
کے اعتبار سے [illegible] ہیں جن سے بے جان اشیاء
ترکیب پاتی ہیں۔ معمل میں بلا کسی دقت کے ان عناصر کو اسی
کی تناسب سے جو خلیہ میں پایا جاتا ہے ترکیب دیا جا سکتا
ہے مگر اصل خلیہ نہیں بلکہ ایک خلیہ نما جسم ہوتا ہے جس میں
حیات کی صفت قطعاً مفقود ہوتی ہے۔ چونکہ سائنس کے
اساسی اصول مانع ہیں کہ حیات کو روح یا ایک غیر مادی
اور فوق الفطرت جوہر مانا جائے، اس لئے مجبوراً ماہرین
سائنس اسی مفروضہ میں پناہ لیتے ہیں کہ کسی نہایت بعیدی
زمانہ میں حرارت اور فضائی حالات کا ایسا نادر اجتماع اتفاقاً
واقع ہوا کہ ان کے تحت یہی ترکیب پیدائش حیات کا باعث
ہوئی اور ان حالات کا مجموعہ پھر اسی صورت میں نہ واقع
ہوا اور نہ پیدا کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے اب حیات اس کے
عناصر کی کسی مصنوعی ترکیب سے پیدا نہیں کی جا سکتی۔ ماہرین
تنقید بھی ادبی شاہکار کی کیفی تحلیل بآسانی اس کے صفات ترکیبی
میں کر سکتے ہیں، وہ اس کی پائندہ دلکشی اور اثر و جاذبیت
کا راز اس کے اسلوب بیان، طرز انشاء، زبان کی شستگی، جذبات
کی لطافت، خیالات کی رفعت، موضوع کی عظمت اور اہمیت
میں تلاش کرتے ہیں۔ اس کے رونما ہونے کے اسباب و علل
کا پتہ مصنف کی فطری قابلیت، سابقہ تجربات اور اس کی
ذہنی تشکیل میں حصہ لینے والے عوامل خاص طور پر عصری
روح میں لگاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اتنی تحلیل و
تدقیق کے بعد بھی ادبی شاہکار ایک معمہ ہی بنا رہتا ہے۔
ایسے ادبی شاہکار بھی پائے جاتے ہیں جن میں تنقید کی
رو سے نقائص اور خامیاں بھری نظر آتی ہیں مگر
ان کی طاقتور کشش سے کوئی منصف مزاج نقاد انکار نہیں
کر سکتا۔ یہ کشش شاید ان نقائص ہی کے اندر اجتماع کا نتیجہ ہو۔
بہرحال اگر ہم حقیقی روح ادب کے متلاشی ہیں تو ہمیں
ایسی دوسرے درجہ کی تخیل کے شاہکاروں کا جو فنی آرائش و
تزئین کے حشو و زوائد سے معرا ہیں بہ نظر غائر مطالعہ
کرنا چاہیے جن تنقید کی کسوٹی پر پرکھے ہوئے شاہکاروں
میں یہ روح ہوتی ضرور ہے مگر ان کے دبیز حجابوں کے اندر
کا اس کا مشاہدہ امر محال ہے۔ اسی نکتہ کی توضیح کے لیے میں
ایک ایسی کتاب کی مثال لیتا ہوں جس کو ادبی شاہکار کہتے
ہوئے مجھے مطلق تامل نہیں ہوتا اگرچہ نقادان ادب اس کو
ایک سرسری نظر ڈالنے کی بھی شاید زحمت گوارا نہ کریں۔
کتاب کا نام "نشتر" ہے مگر اصل میں وہ نشتر نہیں جو
صرف سطحی چوکے لگاتا ہے بلکہ ترکش ہے جس کا ہر تیر پڑھنے
والے کے دل میں گھر کئے بغیر نہیں رہتا۔ سیدھا سادہ مختصر
سا افسانہ ہے۔ تشبیہ و استعارہ کی چاشنی ہے نہ صنائع و
بدائع کی رنگ آمیزی۔ اشخاص جو اس میں حصہ لیتے ہیں
دنیا کی مشہور و معروف ہستیاں نہیں بلکہ متوسط طبقہ کے
معمولی افراد ہیں [illegible] کسی خاص غیر معمولی
صفت یا کمال [illegible] واقعات جو بیان کئے
گئے ہیں تاریخی اہمیت رکھنے والے حالات نہیں بلکہ انہی افراد
کی روزمرہ کی خانگی زندگی سے متعلق ہیں۔ مگر ہر واقعہ ان
اشخاص کی سیرت کے اندرونی پہلوؤں کو اس طرح روشن
کر دیتا ہے جس طرح برق کی چمک ایک لمحہ کے لئے گرد و پیش
کی اشیاء سے پردۂ ظلمت اٹھا لیتی ہے۔ جس زمانہ کی یہ
کتاب پیداوار ہے اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی ضرور
ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ روح عصری کا اثر کس حد تک اس کی
تشکیل کا ذمہ دار ہے۔ یہ زمانہ اٹھارویں صدی کے اواخر
یا انیسویں صدی کے آغاز کا ہے۔ جب کہ تنزل و ادبار کی
گھٹائیں ہندوستان پر اور خاص طور پر مسلمانان ہند پر
چھائی ہوئی تھیں۔ اولوالعزمی اور بلند حوصلگی سرے سے

غالب تھی۔ قوائے عمل شل [illegible] کے سرچشمے خشک ہو گئے تھے۔ تصور حیات پر مسرت رنگ غالب تھا۔ سہل انگاری کا رباب زندگی سے مسرت ایک سُر سنائی دیتا تھا۔ حسن آسانی عدل و دماغ کے رگ و ریشے میں انحطاط کی سمیت سرایت کر چکی تھی۔ شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے چھین لی تھی۔ سیاست اور کشور کشائی سے توجہ ہٹ کر ادنیٰ قسم کے عیش و عشرت پر مرکوز ہو گئی تھی۔ منتہائے نظر زندگی کا آرام اور معراج مناحظ نفس تھا۔ ایسے ناسازگار اور ناساعد زمانے میں انسان اپنے ذاتی کمال سے کتنی ہی پرواز کرے اعلیٰ معیار تک اس کی رسائی محال ہوتی ہے۔ قوم کی عام پستی کسی ذی کمال فرد کو بھی ابھرنے کا موقع نہیں دیتی [illegible] طرح موسم خزاں میں کوئی ایک پودا بھی بار ور نہیں ہو سکتا۔ ان ناموافق حالات میں اس چھوٹی سی کتاب نے جنم لیا۔

مصنف ایک معمولی سیدھا سادھا شخص ہے جس کی سادگی سادہ لوحی کی حد تک پہنچ گئی ہے جن معاملات کو وہ بیان کرتا ہے ان کے مضمرات پر اس کی نظر نہیں پڑتی جس موقع میں خود کو پاتا ہے اس [illegible] سے بے خبر رہتا ہے۔ کسی گہرے حکیمانہ نکتہ کا اس [illegible] سرسری [illegible] کر دیتا ہے کہ گویا اس کا ذہن گہرائی میں جانے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا۔ ایک ماہر فنی ادیب جن استادانہ چالوں اور ہنرمندانہ تدبیروں سے ناظرین کے دل کو موہ لینے کی کامیاب کوشش کرتا ہے مصنف ان سے نابلد ہے۔ اس کی نظر صرف ظاہر پر پڑتی ہے۔ مگر جو اسے نظر آتا ہے بلا کم و کاست پیش کر دیتا ہے۔ اس طرز نگارش سے اگرچہ اس کے فن اور ذہانت و لیاقت کی قدر ہمارے دل میں گھٹ جاتی ہے مگر اس کے خلوص اور ذہنی دیانت داری کی قدر بہت بلند ہو جاتی ہے۔ کسی جگہ بھی ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ حقیقت کے اصلی خط و خال پر انشار پردازی کے رنگین نے پردہ ڈال دیا ہے۔

کتاب آپ بیتی ہے اور مصنف خود ہی اس کا ہیرو [illegible] [illegible] غالباً ادب کی مشکل ترین صنف ہے اور اس [illegible] بچا کر چلنا پڑتا ہے چونکہ وہ خود مرکز ہو کر تمام [illegible] اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور ذاتی تعصبات [illegible] میں اصل حقیقت مسخ شدہ نظر آتی ہے۔ اس کی کوشش دانستہ یا نادانستہ یہی ہوتی ہے کہ اپنے عیوب پر پردہ پوشی کرے۔ اور اپنی خوبیوں کو خوب نمایاں اور ابھار کر ظاہر کرے۔ مصنف کی صاف دلی اور طبعی انکسار نے اسے ان کانٹوں میں الجھنے سے بچا لیا ہے وہ اپنے محاسن کا ذکر کرتا ہے تو بے جا فخر کے بغیر جس کی وجہ سے ناظرین پر یہ تذکرہ گراں نہیں گزرتا اور بعض اوقات وہ اپنی کارگزاریوں کا بیان اس سلیقے سے کرتا ہے کہ ناظرین کے تفنن طبع کا باعث ہوتا ہے۔ زمانۂ حال کے آپ بیتی لکھنے والے جنھوں نے آزاد خیالی اور صاف گوئی کے مکتب میں تربیت پائی ہے عموماً ایک دوسری غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں جو پہلی غلطی کی ضد ہوتی ہے۔ وہ جس کو ہم فخر معکوس سے منسوب کرتے ہیں یہ لوگ اپنے عیوب اور خطاؤں کی کھلم کھلا بے باکی اور دیدہ دلیری سے تشہیر کرتے ہیں اور اپنی بداعمالیوں کو مزے لے کر بیان کیا کرتے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی صاف گوئی اور رائے عامہ سے بے پروائی کا اثر ناظرین کے دل میں بٹھا دینے پر تلے ہوئے ہیں اور اپنے جذبۂ خود نمائی کی تشفی صاف سیدھے طریقے سے نہیں بلکہ چھپی ہوئی عیارانہ چال سے کر رہے ہیں۔ مصنف کا دامن اس فخر معکوس کے دھبے سے بھی پاک ہے۔ وہ اپنی لغزشوں کا اظہار ندامت و انکسار کے ساتھ کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے قدرتاً اسے ہماری ہمدردی حاصل ہو جاتی ہے۔ قصہ کی ہیروئن کوئی نامور شہزادی یا امیرزادی نہیں نہ وہ کوئی باکمال عالی مرتبت خاتون ہے۔ اس کا تعلق سماج کے اس بد قسمت طبقے سے ہے جس کے متعلق عام انسان رقت و ہمدردی کے نہیں بلکہ نفرت اور حقارت کے جذبات محسوس کرتے ہیں۔ کوئی واقف فن

[illegible] کر ایسے حالات میں جن میں رکھا گیا ہو کی
[illegible] کی کبھی ہمدردی حاصل کرنا ممکن
[illegible] ہو گیا ہے۔ مگر یہ قصے کا کمال ہے کہ [illegible]
[illegible] پوری ہمدردی پیر دین کے قبضہ
[illegible] میں چلی جاتی ہے اور آخر تک اس ملکیت پر اس کی
[illegible]۔ ہر لمحہ کی وقت ہر قدم پر ہمارے
[illegible] جاتی ہے۔ اس کا دل غیر معمولی طور پر حساس
ہے۔ [illegible] محبت کی اس میں بے پایاں استعداد ہے۔
اس [illegible] کی لطافت اور ذہن کی نزاکت خراج تحسین
حاصل کرنے میں کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ وہ ایک درخشاں
و تاباں نگینہ ہے جو ایک بھدی اور بدرنگ انگوٹھی میں جڑا
ہوا ہے اور ہماری توجہ اس کی حسن و خوبی پر اس مضبوطی سے
مرکوز ہو جاتی ہے کہ اس کے گرد و پیش کے امور جو کدورت پیدا کرتے
ہیں وہ ہمارے شعور میں راہ ہی نہیں پاتے۔ اس کی سخن فہمی
موقع شناسی، نکتہ رسی، بذلہ سنجی، شیریں کلامی، خوش گفتاری
[illegible] اور سب سے بڑھ کر ایک اعلیٰ نصب العین سے اس کی
عقیدت و وابستگی ناظرین کے قلوب میں احترام و محبت کا ہیجان
پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کا انجام حزنیہ پر ہوتا ہے۔ اور
یقینی ہے کہ یہی انجام اس کی شوخی طبیعت سے ایک
گونہ مطابقت رکھتا ہے۔ خانگی زندگی کی پر سکون راحتوں
اور خاموش خوشیوں سے مستفیض ہوتے تصور کرنا
ہمارے لئے سخت دشوار ہے۔ جو شعلہ جل کر ہی ختم ہوتا ہے
سوز سے نجات پانا اس کے لئے ممکن نہیں۔ جس قسم کا شعلۂ
عشق اس کالبد خاکی میں بھڑک رہا تھا اس کی آخری منزل
سکون نہیں موت ہی ہو سکتی تھی۔ اور کون کہہ سکتا ہے ممکن
ہے جس کو ہم آخری منزل باور کرتے ہیں وہ بھی ایک فرودگاہ
[illegible] ہو۔ اگر اس کا انجام عام قصوں کی طرح تاہل اور
فارغ البالی کی زندگی پر ہوتا تو شاید ہمیں ایسا ہی عجیب معلوم ہوتا
کہ گویا ہم برق کو محمل فانوس میں جا گزیں دیکھ رہے ہیں۔
یا [illegible] کو بانسری سے سن رہے ہیں۔

کتاب میں اشعار کثرت سے ہیں مگر چونکہ حسن شاہ اور
خانم جان کی زندگی ایک مسلسل پر ترنم نظم معلوم ہوتی ہے اور
اشعار اس سے کچھ اس خوبی سے ربط کھاتے ہیں کہ تصنع یا آمد
کا کہیں احساس نہیں ہونے پاتا۔ بہت سے اشعار ایسے
بھی ہیں جو عام طور پر متداول ہیں اور کثرت استعمال سے پامال
ہو گئے ہیں مگر حیرت ہے کہ جب ہم انہی کو اس قصہ میں
پڑھتے ہیں تو ہم ان کو ایک نئی تازگی زیادہ گہرے معنی اور
خوش گوار تلازمات سے معمور پاتے ہیں گویا ہم ان اشعار
کو پہلی مرتبہ پڑھ رہے ہیں اور ان کی حسن و خوبی کا پہلی
دفعہ ادراک کر رہے ہیں۔ زیادہ تر اشعار حافظ سے لئے گئے
ہیں اور یہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا اس لئے کہ حافظ کا رنگ
تغزل کچھ ایسی شوخی اور جاذبیت رکھتا ہے اور اس کے
اشعار قلب انسانی کی گہرائیوں کو اس طرح آئینہ کرتے ہیں کہ
اس کی مثال کسی اور شاعر میں ملنی مشکل ہے۔ دیوان
حافظ کی شرحیں ان گنت ہیں اور شارحین نے کبھی اپنے
خیالات ان میں ٹھونسے اور کبھی دور کے معنی ان سے
کھینچ نکالنے میں انتھک کوششیں کی ہیں۔ یہ کتاب بھی
ایک اعتبار سے اشعار حافظ کی شرح ہے جو ایک انوکھے
انداز سے کی گئی ہے۔ تڑپتا ہوا دل اور نازک حسیات
رکھنے والے دو حقیقی انسان اپنی واقعی زندگی سے اس کی
تفسیر کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر مقام حافظ کے کسی
نہ کسی شعر کی توضیح و تشریح کرتا اور اس کے مجرد خیال
کو مقرون صورت میں پیش کرتا ہے۔ طوالت کے خوف
سے صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حسن شاہ اپنی سادگی یا سادہ لوحی سے خانم جان کو
کھری کھری سنا دیتے ہیں۔ خانم جان رنجیدہ ہو جاتی ہے ؎

گل بخندید کہ از راست نرنجیم و لے
ہیچ عاشق سخن تلخ بہ معشوق نگفت

یہ بے رخی سے ہٹ جاتی ہے تو وہ حیران اور متعجب ہو جاتے
ہیں ؎

آں ترک پری چہرہ کہ دوش از برِ ما رفت
آیا چہ خطا دید کہ از راہِ خطا رفت

دوسرے موڑ حسن شاہ خواستگارِ معافی ہو کر جاتے ہیں۔

تا منفعل نہ گشت بیجانہ بیکشش
می آرم اعتراف گناہ نہ بودہ را

خانم جان کے چہرے سے خفگی مترشح ہے۔

دیشب کہ می آمد رخسارہ برافروختہ بود
تا کجا باز دلِ غمزدۂ سوختہ بود

اور لگ موجود ہوتے ہیں۔ اظہارِ ندامت برملا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اپنے سر کا سایہ اس کے قدموں پہ ڈالتے ہیں۔ کیا انشاء پردازی کا ایک دفتر بھی اس سے زیادہ اور موثر پیرائے میں احساسِ ندامت کو ظاہر کر سکتا ہے۔ وہ اسوقت سایہ پہ لات رسید کرتی ہے ؎

رسمِ عاشق کشی و شیوۂ شہر آشوبی
جامۂ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود

مگر حسن شاہ کو عتاب میں الفت کی جھلک نظر آتی ہے۔

گرچہ می گفت کہ زارت بکشم می دیدم
کہ نہانش نظرے با منِ دل سوختہ بود

بہت جلد عارضی عتاب پر دائمی الفت غالب آجاتی ہے اور مصالحت ہو جاتی ہے۔

گر ز دستِ زلفِ مشکینت خطائے رفت رفت
ور ز ہندوئے شما بر ما جفائے رفت رفت
گر دل از غمزۂ دلدار بارے برد برد
درمیانِ جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

حسن شاہ طلبگارِ نظرِ عنایت ہوتے ہیں۔

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

وہ بظاہر بے اعتنائی مگر بہ باطن کمالِ دلجوئی سے ایک الائچی ان کی طرف پھینک دیتی ہے ؎

بہ معرفت مباش کہ در من یزید عشق
اہلِ نظر معاملہ با آشنا کنند

کتاب میں بعض خطوط بھی ہیں جو حسن شاہ [illegible] کی باہمی مراسلت کا نتیجہ ہیں۔ خطوط میں تصنع تکلف [illegible] کا رنگ غالب ہے۔ القاب مغلق پر شکوہ اور طول [illegible] کی ایک طلائی زنجیر معلوم ہوتا ہے۔ عام اور سطحی خیالات ہیں۔ جن کی آرائش و زیبائش پر ان کی انشاء پردازی نے ساری قوت صرف کر دی ہے مگر ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ناول حسن شاہ کے تخیل کی پیداوار ہوتا اور وہ انشاء پردازی کے میدان میں اپنے حسبِ مرضی تگ و تاز کر سکتے تو وہ کیسا ہی [illegible] سے عاری اور لفاظی سے معمور ہوتا۔ پنج رقعہ اور [illegible] کی طرح بے مقصد لفاظی اور بے معنی سخن سازی اس کی امتیازی خصوصیت ہوتی۔ مگر ایک پاکیزہ اور سچے پاک عشق کی بدولت اور پُر خلوص غم کے طفیل سے انہی کے دماغ کی پیداوار ایک ادبی شاہکار ہے جو خاص و عام کے لئے مساوی طور پر ایک خاص قوتِ کشش رکھتا ہے۔ وہ حقیقی معنی میں زندگی اور حقیقی تجربہ سے معمور زندگی کی ایک نقش ہے۔ کتاب ایک داستانِ غم ہے، داستانِ درد و الم ہے اور غم و الم سے ہر انسان گھبراتا ہے مگر عجیب اور بظاہر متضاد حقیقت ہے کہ غم انسان کے لئے جو کشش رکھتا ہے مسرت میں نہیں پائی جاتی۔ اکثر زندۂ جاوید افسانے الم انگیز ہی ہیں۔ طربیہ سے تھوڑی دیر کے لئے انسان دل بہلا لیتا ہے مگر حزنیہ اس کے دل پر گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے اور اسے بلند سطح پر ابھار دیتا ہے۔ اور اس کے جذبات کا تزکیہ کرتا ہے۔ مسرت کی کنہ تک انسان پہنچ جاتا ہے مگر غم کی کنہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ غم اگر حقیقی عظمت رکھتا ہے تو انسان اس کے آگے حیران اور ششدر رہ جاتا اور مبہوت ہو کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے جذباتی انداز میں احترام بھی شامل ہوتا ہے۔ وہ احترام جو ایک [illegible] فہمِ انسانی حقیقت ہی پیدا کر سکتی ہے۔ شاید مسرت کے مقام سے غم کا مقام قلبِ کائنات سے قریب تر ہے اس کا ثبوت حافظ کے [illegible]

با صبا در چمنِ لالہ سحر می گفتم
کہ شہیداں کہ اند ایں ہمہ خونیں کفناں
گفت حافظ من و تو محرمِ ایں راز نہ ایم
از مئے لعل حکایت کن و شیریں دہناں

صلاح الدین

ادب اور معاش

[illegible] مسائل کی طرح ادب اور معاش بھی ایک مستقل مضمون کا موضوع بن سکتا ہے لیکن مجھے اعتقاد ہے کہ ہمارے [illegible] سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ فرشتہ خیالی کی بجائے اگر نظامِ زندگی کے کسی شعبے پر خالص دنیاوی نقطۂ نظر سے [illegible] کی بنیاد اس کی نشو و نما معاشیات کے تابع ہوگی۔ جو کہ نفس کشی کا ذریعہ سہی لیکن اس سے زندگی [illegible] دیتی ہے۔ دمشق میں جب قحط سالی ہوئی تو عشق پیشہ دیوانے بھی پندارِ محبت کو بھول گئے تھے۔ غرض [illegible] لوگوں کی طرح ادیبوں کو بھی ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جہاں انھیں معاشی سکون ہو۔ پراگندہ روزی [illegible] پراگندہ دل ہو جائیں تو ان کا انتشارِ خیال ایک ذہنی ملالت سے کم نہیں ہوتا۔ ان ادیبوں کو چھوڑیئے جو ادبی [illegible] کے لئے اپنے دوسرے معاشی ذرائع سے ایک فراغت حاصل کرتے ہیں بلکہ ان کے متعلق غور کیجئے جنھوں نے ادبی کام کو بحیثیت پیشہ اختیار کیا ہے۔ ایسے ادیبوں کے لئے 'پیشہ ور' کا لفظ استعمال کرنا زیادتی ہوگا۔ تاہم میں اظہار کی [illegible] کے لئے معافی چاہتے ہوئے انہیں پیشہ ور ادیب ہی کہوں گا۔ مجھے کہنا یہ ہے اردو کا یہ دور بھی جس میں ہم زندگی [illegible] میں پیشہ ور ادیبوں کے لئے سازگار نہیں۔ ہماری صحافت اتنی مالدار نہیں اور نہ اس کے شعبے میں اتنی وسعت ہے کہ وہ [illegible] روزگار ادیبوں کے لئے ایک معاشی طمانیت کا ذریعہ بن جائے۔ البتہ نشرگاہوں سے ایک حد تک ادیبوں کی وصول [illegible] ہو رہی ہے۔ اس کا اعتراف ایک دوست نے اپنے ایک مضمون میں کیا تھا جس کا عنوان "ادب اور معاش" تھا۔ اس کے خلاف کئی گوشے سے یہ آواز بلند ہوئی ہے کہ نشرگاہوں کے نزدیک مغنی لڑکیاں، ادیبوں اور شاعروں سے زیادہ معاوضہ پانے کی مستحق قرار دی جاتی ہیں اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ نشرگاہوں میں برخود غلط اور حاسد [illegible] جمع ہو گئے ہیں۔ تنقید کی اس تلخی میں کہاں تک صداقت ہے اس کے متعلق ہم اس لئے کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ اس کے ڈانڈے ذاتیات سے ملے ہوئے ہیں۔ بعض وقت شخصی مایوسی، تنقید کو یک رخی بنا دیتی ہے۔ یہاں ایک اصول کے طور پر یہ دیکھنا ہے کہ نشرگاہوں میں ادیب کا کیا مقام ہے اور غناکار کا کیا مقام۔ موسیقی اور ادب دونوں کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے اور اس کے باوجود کہ موسیقی اور رقص کے ذریعے تعمیرِ حیات میں عوامل کا کام لیا جا سکتا ہے میں ادب کو حسین تر آرٹ کہوں گا۔ نشرگاہیں بلاشبہ غناکار کو ادیب کے مقابلے میں کم معاوضہ دیتی ہیں لیکن وہ غناکار سے ادیب کے مقابلے میں زیادہ کام بھی لیتی ہیں۔ کوئی شاعر دو گھنٹوں تک اپنا کلام سنانا پسند کرے گا اور نہ سننے والے اسی توانائی اور تازگی سے دو گھنٹے تک اسے برداشت کر سکیں گے لیکن ایک غناکار مسلسل گھنٹوں گاتا ہے اور اسی طرح شوق سے سنا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیقی جذباتِ انسانی پر راست اثر کرتی ہے لیکن شعر غور و فکر کا توسط ڈھونڈتا ہے۔ موسیقی دل کی راہ سے دماغ کو بیدار کرتی ہے لیکن شعر دماغ سے ہو کے دلوں کو گرماتا ہے۔ اس لئے عوام کا (جو ریڈیو سنتے ہیں) ذہنی معیار بہت کم شعر کی بلندی کا حریف ہو سکتا ہے۔ ریڈیو والوں کے نزدیک جس طرح غناکاروں کے معیاری اعتبار سے مختلف درجے ہیں، اسی طرح شاعروں کے مرتبوں کو بھی انھوں نے متعین کیا ہے۔ اسی معیار اور مرتبے کے اعتبار سے وہ معاوضے بھی ادا کرتے ہیں اور جب کوئی شاعر محض غناکار ہی ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو دو معیارات سے جانچنا پڑتا ہے۔ شاعر کی حیثیت سے وہ صفر ہوتا ہے اور غناکار کی حیثیت سے وہ آفتابِ موسیقی نہیں ہوتا اس طرح اس کی حالت قابلِ رحم ہو جاتی ہے اور اس سے ہمدردی کرنے کو جی چاہتا ہے۔

میکش

بڑا آدمی کس کو کہتے ہیں

(ہندی نظم)

(۱)

اپنے کو جو کہے بڑا، وہ بڑا نہ جگ میں کہلاتا
اور لوگ جس کو کہتے ہیں بڑا وہی سمجھا جاتا
بڑا نہیں ہوتا کوئی بھی دھن دولت کے پانے سے
نہیں بڑا بنتا ہے نر کچھ اونچے محل چنانے سے

(۲)

سچ پوچھو تو بڑا آدمی ہونا سب سے ٹیڑھا کام
بڑے گنوں کے بنا نہ ہوتا کبھی بڑے لوگوں میں نام
جو تم ہونا بڑا چاہتے، تو اس کا ہے ایک اپائے
دُربل، دین، اناتھ جنوں کی تن من دھن سے کرو سہائے

(۳)

بھلے برے کا گیان نہ جس کو اہنکار میں رہتا چور
اپنی آپ بڑائی کرتا، کرودھ، لوبھ جس میں بھرپور
ایسا منُش دھنی بھی ہو، تو بڑا نہ وہ کہلاوے گا
سمجھدار لوگوں کے آگے، چھوٹا سمجھا جاوے گا

(۴)

سدگن سے جو بڑے بنے ہیں، بڑے وہی کہلاتے ہیں
بدھیمان، ودوان جنوں میں سادر آدر پاتے ہیں
پڑھنے پاٹھک! جو بڑا بنا چاہو تو تج کر سب ابھیمان
سب سے چھوٹے بنو، یہی ہے سب سے سُندر سیدھی راہ

مادھو پرشاد مصر

---

۱ آدمی ۲ تدبیر ۳ کمزور ۴ مفلس ۵ یتیم ۶ انانیت ۷ آدمی ۸ عقلمند ۹ قاری ۱۰ الرت ظلم، نااتفاق

اد[illegible] کی لفظیات

[illegible] زبان میں بھی نثر کے تنقیدی ادب کی ابتداء بہت بعد میں ہوئی ہے۔ اس لئے کہ ادب اور شاعری [illegible] کتابیں [illegible] جاتی رہیں ان کے لئے زیادہ تر فارسی زبان کو استعمال کیا گیا ہے حالانکہ ان کتابوں [illegible] اردو کے شاعر تھے اور ان میں سے بعض تو میر تقی میر اور میر حسن جیسے باکمال استادِ سخن بھی ہیں۔
[illegible] بات ہے کہ بعض شعراء نے اپنے کلام میں نقد شعر سے متعلق بہت اچھی بحثیں کی ہیں اور اس موضوع [illegible] پہلے گولکنڈہ کے ملک الشعراء ملا وجہی نے آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل اپنی کتاب "قطب مشتری" [illegible] میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ وضاحت کی ہے اور اس کے بعد کے کئی شاعروں مثلاً ابن نشاطی، ملک الشعراء غواصی [illegible] حاتم نے بھی اپنے کلام میں نقد شعر کے اصول پیش کئے لیکن یہ سب نظم کے پیرایہ میں تھا اور ضرورتِ شعری کی [illegible] شعراء مجبور تھے کہ شاعری کے عام اسلوب سے سرگرداں نہ ہوں اسی لئے ادبی تنقید کی لفظیات کے ارتقاء میں ان کے اس قسم کے اشعار سے زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ مجبوراً ہمیں نثر کی کتابوں کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔

اردو نثر میں ہماری شاعری کا پہلا تذکرہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل مرزا علی لطف نے مرتب کیا تھا اور یہ تذکرہ بھی ایک اور فارسی تذکرے "گلزارِ ابراہیم" پر مبنی ہے لیکن لطف نے ترجمہ نہیں کیا بلکہ تالیف کی یعنی "گلزارِ ابراہیم" کے مصنف نواب علی ابراہیم خاں کی مختصر اور مجمل عبارتوں کو مرزا علی لطف نے اپنی ذاتی معلومات اور تحقیق و کاوش کی بنا پر اس طرح شرح و بسط کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے کہ اکثر و بیشتر مقامات پر جہاں علی ابراہیم صرف دو چار سطریں لکھ سکتے تھے علی لطف نے دو چار صفحوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح علی لطف کا تذکرہ گلشن ہند بجائے خود ایک جداگانہ کتاب بن گیا ہے اور اس کا مستقل تالیف [illegible] سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں اگرچہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی تحریک پر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں سہل اور آسان اردو نثر لکھنے کا آغاز ہو چکا تھا لیکن علی لطف کی عبارتیں قدیم اردو نثر کی طرز میں بالعموم مقفیٰ اور مسجع ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی دو عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہو گا کہ اردو میں پہلے پہلے ادبی تنقید کا کیا ڈھنگ تھا اور اس کی لفظیات کس قسم کی اصطلاحوں پر مشتمل تھی۔

دہلی کے ایک ابتدائی شاعر محمد شاکر ناجی کے سلسلے میں علی لطف لکھتے ہیں :۔

> "محمد شاہ فردوس آرامگاہ کے وقت میں اس نے شہرت پائی ہے اور بطور قدما کے طرز ایہام بہم کرتا طبع آزمائی ہے۔ خوش طبعی اور ظرافت سے بیشتر سروکار رکھتا تھا اور عالم کی ہجو کرنا شعار رکھتا تھا۔ شیوۂ قدیم میں صاحب دیوان ہے اور وضع سابق میں شاعر خوش بیان ہے۔"

اردو کے سرتاج شعرا میر تقی میر کی نسبت علی لطف نے یہ رائے ظاہر کی ہے:۔

> "غرض اس تردد سے زبان قلم کی اور خراش سے عارض رقم کی مراد یہ ہے کہ ناقدردانی سے اغنیا کی اور نافہمی سے اہل دنیا کی اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے اور ہوائے شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا وہ نان شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے۔"

یہ عبارتیں اصل میں اردو ادبی تنقید کا پہلا نمونہ ہیں اور ان کے مصنف نے فارسی عبارتوں کی تقلید میں

قافیے کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے اور اس لئے تصنع اور آورد کا دخل بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب کے تقریباً پچاس سال بعد دہلی میں مولوی کریم الدین نے اردو شعرا کا ایک اور تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" مرتب کیا۔ یہ بھی "گلشن لطف" کی طرح ایک اور کتاب پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں بھی مولف نے اپنی جانب سے [illegible] کیا ہے۔ یہ کتاب دراصل گارساں دتاسی کی "استوار دیلا لترا چور ایندوی اے ایندوستانی" کا ایک اردو ترجمہ ہے۔ اس میں کریم الدین نے علی لطف کی طرح قافیوں اور سجع کا التزام نہیں کیا۔ بلکہ سادہ اور روزمرہ کی زبان استعمال کی ہے لیکن وہ بھی موجودہ ادبی اردو سے بہت مغائرت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر اس کی بھی دو عبارتیں پیش ہیں۔ پہلے محمد شاکر ناجی ہی کے متعلق مولوی کریم الدین کی تنقید ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:-

"بہت شوخ مزاج تھا ہر کسی کی ہجو کرتا تھا۔ راہ چلتے سے لڑتا تھا۔ ہر ایک سے بڑتا تھا۔ اس سے ہر ایک کو نجات پانی مشکل تھی۔ بجائے ناجی کے اگر پاجی تخلص اختیار کرتا تو میرے نزدیک بہت بہتر تھا۔"

"گلشن ہند" سے میر تقی میر کے متعلق رائے اوپر نقل ہو چکی ہے اب کریم الدین کی زبان سے اسی باکمال شاعر کا حال معلوم کیجئے۔

"شعر اس کا تمام شعرائے سابقین و متاخرین سے بے شک بہت اچھا ہے۔ تمام فنون نظمیہ وہ جانتا تھا۔ خصوصاً غزل اور مثنوی اس کی سب سے بہتر ہے۔ آج کے زمانہ تک تمام شعراء اس کے اچھے ہونے میں شک نہیں کرتے۔ یہ شاعر واقع میں ایسا ہے کہ اگر اس کو بادشاہ شعراء کہیں تو بجا ہے۔"

ان دو کتابوں کی عبارتوں کے مقابلے سے معلوم ہو گا کہ پچاس سال کے عرصے میں اردو کی ادبی تحریروں میں کیا فرق پیدا ہوا تھا اور ادبی تنقید کی لفظیات کس طرح تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق کی بات ہے کہ طبقات شعرا کے بھی ٹھیک پچاس سال بعد محمد حسین آزاد نے "آب حیات" لکھی جو اردو کی تیسری تنقیدی کتاب کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کتاب کی تالیف کے بعد ہی واقعہ یہ ہے کہ اردو تنقید نگاری صحیح معنوں میں عالم وجود میں آئی۔ محمد حسین آزاد نے زبان میں ایسی شگفتگی اور الفاظ کے مطالب میں ایسی قطعیت پیدا کر دی کہ تنقید لکھنے والوں کا راستہ بہت کچھ صاف ہو گیا۔ انھوں نے بھی محمد شاکر ناجی کی ہجو گوئی کا ذکر کیا ہے لیکن معلوم ہو گا کہ زبان میں کتنی علمیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"تیز مزاج اور شوخ طبع بہت تھے۔ راہ چلتے سے الجھتے تھے اور جس کے گرد ہوتے تھے اسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔"

میر تقی میر کی نسبت آزاد نے جو رائے ظاہر کی ہے اس کا نمونہ پیش کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس سے معلوم ہو گا کہ آزاد نے ادبی تنقید کی لفظیات کو کتنا معین اور شائستہ بنا دیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:-

"میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔

[illegible] میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے"

[illegible] آزاد کے بعد حالی اور شبلی نے ادبی تنقید کی ایسی عمدہ خدمت کی کہ اب یہ ایک ایسی شاہراہ بن گئی ہے کہ [illegible] بے خوف و خطر چل سکتا ہے۔ حالی اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے انگریزی کی تنقیدی [illegible] کا اردو میں تجربہ کیا۔ ان کا مقدمۂ شعر و شاعری اردو ادبی تنقید کی پہلی کتاب ہے جس میں یورپ کے [illegible] خیالات سے استفادہ کیا گیا ہے اور ادبی تنقید کی لفظیات اور اصول کے متعین کرنے میں مدد لی گئی ہے۔ [illegible] آزاد اور شبلی دونوں کے مقابلہ میں زیادہ سہل اور سادہ تھا اور اسی اسلوب میں انھوں نے مقدمۂ شعر و شاعری کے علاوہ "حیات سعدی" "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" جیسی بلند پایہ کتابیں مرتب کیں جن کو بعض جگہ ادبی تنقید کے شہ پارے سمجھے جاتے ہیں۔

شبلی کا اسلوب بیان اپنی رنگینی اور عالمانہ شوکت کے باعث اردو کے تنقیدی ادب میں خاص کر قابل ذکر [illegible] ہے کہ شبلی کے بعد سے اب تک اردو کے جتنے انشاپردازوں نے بھی تنقیدی ادب لکھنے کی کوشش کی وہ شبلی ہی کے اسلوب سے متاثر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے نہ تو محمد حسین آزاد کی طرح روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی کے ذریعے سے اپنی تحریروں کو بامزہ بنانے کی کوشش کی اور نہ حالی کی طرح اتنی سادگی [illegible] اختیار کی کہ عبارتیں بے رنگ ہو جائیں۔ انھوں نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا اور صحیح معنوں میں اس علمی و ادبی تحریر کو معراج کمال پر پہنچا دیا جو آج اردو کی ایک معیاری علمی تحریر سمجھی جاتی ہے اور جس میں عہد حاضر کے بڑے سے بڑے ادیب اور نقاد مثلاً مولوی عبدالحق، مولانا سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی اور قاضی عبدالغفار، اعلیٰ سے اعلیٰ تنقیدی مضامین اور کتابیں تحریر کر رہے ہیں۔

شبلی کی شعر العجم اور موازنۂ شعر و شاعری اردو کی وہ تنقیدی کتابیں ہیں جن کا اسلوب اور زبان ابھی عرصے تک نمونے کا کام دیتے رہیں گے۔ شبلی اور حالی کے اسلوب میں جو فرق ہے وہ ان مثالوں کے ذریعے سے واضح ہو سکے گا۔

حالی اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں اردو غزل کے عشقیہ مضامین کی بحث میں لکھتے ہیں :-

"ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے۔ مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ داغ کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی، روزمرہ کی پابندی اور محاورہ کی بہتات کے طرز ادا میں ایک شوخی اور بانکاپن ہے، جو اسی شخص کا حصہ ہے۔"

شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں صنائع و بدائع کی سرخی کے تحت میر انیس کی یوں مدافعت کی ہے۔

"میر انیس جس زمانے میں تھے شاعری کا مدار صنائع و بدائع پر رہ گیا تھا۔ مبالغہ، ایہام اور مناسبات لفظی یہی چیزیں شاعری کا کمال خیال کی جاتی تھیں۔ میر انیس کو انہی لوگوں میں رہنا سہنا تھا۔ انہی سے داد سخن لینی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ انہی کی قدردانی پر معاش اور ضروریات زندگی کا انحصار تھا۔ ایسی حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ وہ

[illegible]

[illegible]
[illegible] محبت کی راہیں
[illegible] کر بھی نہ آئے
[illegible] ایک مدت سے راہیں
[illegible] ہے میری [illegible]
[illegible] حسرت لبوں پر ہیں آہیں
[illegible] تڑپے
تمہاری ہیں یہ چشم و دل یارگاہیں
[illegible] جو تم آ رہی تھیں
جھکا لی تھی نرگس نے اپنی نگاہیں
یہی [illegible] اب ہیں بے تابیوں کے
کبھی اشکباری کبھی سرد آہیں
کرشمہ تمہاری نگاہوں کا ہے یہ
بہاروں میں ویران ہیں خانقاہیں
جلا [illegible] اپنی مقدر کے تارے
[illegible] نالے نہ شب کی آہیں
[illegible] میری جو تم بس رہی ہو
فضاؤں کی دنیا ہے میری نگاہیں
[illegible] نکھرتی ہے نکہت
بہت منتظر ہیں گلستاں کی راہیں

عزیز احمد

اشنان

سحر افق سے اگل رہی تھی — جوانی شب کی پگھل رہی تھی
نسیم ہلکے سے کسمسا رہی تھی — تھکی دنیا سنبھل رہی تھی
فضا میں جو تھا تمام دھندلکا
کہر تھا شبنم کا ہلکا ہلکا
ان آخری ساعتوں میں شب کی — نکھر رہی تھی کنہاری ندی
ندی پہ اک نوجوان لڑکی — نہا کے زلفیں جھٹک رہی تھی
کلائی میں چوڑی بج رہی تھی
جوانی بے خوف سج رہی تھی
نگاہ میں بادۂ شبانہ — جبیں پہ بجلی کا آشیانہ
لبوں کی خاموشیاں غنا — ہر ایک انداز شاعرانہ
اشارہ فطرت کا پا گیا میں
کچھ اور نزدیک آ گیا میں
مجھے جو اس نے قریب پایا — نظر جھکایا، بدن چرایا
سمجھ میں کچھ اور تو نہ آیا — جھجک کے فوراً گھڑا اٹھایا
سمیٹی کچھ اس ادا سے ساری
سمٹ گئی کائنات ساری

علی احمد

سوال وجواب

سوال :۔ جب ہم سوتے ہیں تو کیا ہمارا دماغ بھی سوجاتا ہے ؟ ص۔ا
جواب ۔ ہمارے دماغ کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو ہمیشہ بیدار رہتا ہے خواہ ہم سو رہے ہوں یا جاگتے ہوں اور اگر یہ
حصہ اپنا کام کرنا بند کردے اور سو جائے تو ایسی نیند اور موت میں کوئی فرق نہ ہوگا ۔
دماغ کا یہ ایسا حصہ جس کے متعلق ہم کو راست کوئی احساس نہیں ہوتا اور نہ اس کو ادراک [illegible] سے
کوئی تعلق ہوتا ہے ، تمام دماغی حصوں کے نیچے واقع ہوتا ہے اور حرکت قلب اور تنفس پر قابو رکھتا ہے ۔ دماغ کا
سب سے بالائی حصہ جو ادراک اور قوت غور وفکر کا مبدا ہے سوائے کم عمر یا دودھ پیتے بچوں کے کمل طور پر کبھی نہیں
سوتا ، لیکن باقی تمام دماغ بالکل اسی طرح آرام کرتا ہے جس طرح کہ ہمارے جسم کے دیگر حصے ۔ نیند جس قدر گہری ہوگی
اسی قدر صحت کے لئے اہم اور قیمتی ہوگی ۔
خواب اور سپنے اس بات کی دلیل ہیں کہ ہماری نیند کے وقت بھی دماغ کے کچھ حصے کام کرتے رہتے ہیں ۔
نہ صرف یہ بلکہ ہم کئی تجربوں سے یہ بھی ثابت کرسکتے ہیں کہ ہمارے سوجانے کے بعد دماغ کا بالائی حصہ [illegible] کسی کاوش
کے معروف رہتا ہے ، مثلاً اکثر ایسا ہوا ہے کہ رات میں کسی سائینس داں نے کام کرتے کرتے کسی تجربے کو تشنہ
چھوڑ رکھا ہو ، کسی شاعر نے کوئی نظم ادھوری رکھ دی ہو ، کسی مہندس نے کوئی ریاضی کا مسئلہ حل کئے بغیر
ہی رکھ دیا ہو ، اور صبح ہوتے ہوتے سائینس داں اپنا تجربہ ٹھیک کرلیتا ، شاعر اپنی نظم مکمل کرلیتا اور مہندس
اپنا مسئلہ حل کرچکتا ہے ، ظاہر ہے کہ جسم کے دیگر حصوں کے سوتے وقت دماغ اپنا کام کرتا رہتا ہے
لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ دماغ کو آرام کی ضرورت نہیں ، اصلی جسم میں دماغ ایک
موٹر کار کی بیاٹری کے مماثل ہے اور اس بیاٹری کو ہر مرتبہ چارج ہوتے رہنا چاہیئے ورنہ وہ کسی کام کی نہیں
رہتی ، دماغ کو سکون اور آرام پہونچانا دراصل اس کو دوبارہ بر[illegible]انا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سوکر اٹھنے کے بعد ہم خود کو
بہت ہی بشاش محسوس کرتے ہیں ۔ کہا گیا ہے کہ دنیا میں سب سے طاقتور مفرح شئے نیند ہے اور یہ حرف
بہ حرف صحیح ہے ۔

ن ۔ ھ

معلم بالغاں

از مولوی سید زاہد حسین صاحب ایم اے ۔ ایم ایڈ

تعلیم بالغاں کو موجودہ زمانے میں جو اہمیت دی جارہی ہے اس کے پیش نظر یہ کتاب ادارہ کی طرف سے
شایع کی گئی ہے ۔ تعلیم بالغاں کی اہمیت ، بالغوں کی نفسیات ، طریقۂ تعلیم اور چند عملی تجاویز پیش کی گئی ہیں ۔
تعلیم بالغاں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے ۔ صفحات (٥٦) قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ
سب رس کتاب گھر ۔ رفعت منزل خیرت آباد ۔ حیدرآباد دکن

کالے پانی کا مفرور قیدی

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

[illegible] کو [illegible] کی تلاش تھی۔ وہ عقاب کی طرح جیپی پر جھپٹا اور اس سے پیشتر کہ بیچارا [illegible] خنجر پورا اس کے قلب کو چیرتا ہوا نکل گیا، جیسی کٹی ہوئی شاخ کی طرح زمین پر آرہا [illegible] کے بعد اس کا جسم بے حرکت ہو گیا، اس قدر طویل عرصہ کے بعد آج بھی اس بھیانک سین کی ہر ایک [illegible] ذہن میں اس طرح محفوظ ہے گویا یہ واقعہ کل ہی ہوا تھا۔

بادشل کے بھائی ڈی ڈے نے تحریک کی کہ رات کے کھانے پر جیپی کی ٹانگ کا بھنا ہوا گوشت ضرور ہونا چاہیے [illegible] بھی فوراً تائید کی، اس نے کہا " جیپی ایک درندہ تھا اور درندے کا گوشت کھایا جاسکتا ہے" [illegible] نے بھی اس کا ساتھ دیا، چنانچہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر جیپی کا جگر ایک لکڑی میں چھید کر کباب [illegible] اور اس گروہ کے جوان کے لئے جیپی کی ٹانگ ہی کو جلا کر آگ تیار کی گئی، رات میں جب سب مل کر اس کو کھانے کے لئے بیٹھ گئے تو مجھ بھی طوعاً وکرہاً اس میں شریک ہو جانا پڑا اس لئے کہ انکار یا اعتراض کی مجھ میں جرأت نہ تھی اور نہ اس کا موقع ہی تھا۔

ان واقعات کا سب پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ رات میں کسی نے بات چیت کی کوشش تک نہ کی، ہمارے ساتھیوں میں سب سے شقی القلب آدمی بھی اس منحوس دن کے ہیبت ناک واقعات کو اپنے ذہن سے بھلا نہ سکتا تھا، آزادی کی اس راہ میں ہم تین لاشوں کو اپنے پیچھے چھوڑ رہے تھے،

[illegible] دن کے مسلسل سفر کے بعد ہم افتاں وخیزاں امریکی ہندیوں کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں داخل ہوئے، امریکیوں کی یہ آبادی دریائے مارونی کے کنارے واقع تھی اور یہاں ہمیں کھانے پینے کو کچھ مل بھی گیا لیکن سفر کی تکان سے چور ہو کر جب ہم بے خبر سوگئے تو ان ظالموں نے ہماری آمد کی اطلاع ولندیزی حاکموں کو دے دی چنانچہ جب آنکھیں کھلیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چار ولندیزی سپاہی پستول ہاتھ میں لئے ہماری نگرانی کر رہے ہیں۔

اس مرتبہ مجھے پھر نادیبی کمپ بھیج دیا گیا، جہاں میرا نام غیر اصلاح پذیر اشخاص کی فہرست میں درج ہو گیا قیدیوں کے اس بدقسمت گروہ کا نادیبی کیمپ چاروین میں واقع تھا جس جگہ سال کے بارہ مہینے ملیریا اور [illegible] کا دورہ رہتا۔ اور جہاں تقریباً مادرزاد ننگے قیدی نیم وحشی انسانوں کی صورت میں مچھروں اور دوسرے [illegible] کیڑوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیئے جاتے۔ لیکن اس مرتبہ پھر اللہ نے مجھ پر فضل کیا۔ اس لئے کہ ایک نئے گورنر کی وجہ سے جسے میں نے نہایت رقت آمیز خط لکھا تھا مجھے اسّی دنوں کی سخت عقوبت کے بعد ایک اچھے مقام پر بھیج دیا گیا۔

فرانسیسی گیانا میں میری بودوباش کے دوران میں میں نے مزید دو مرتبہ بھاگ نکلنے کی ناکام کوششیں کیں۔ چنانچہ اسی کی پاداش میں مجھے رائل کے جزیرے کو بھیج دیا گیا ——— رائل اس کالے پانی کے ان تین خوفناک جزیروں میں سے ایک ہے جہاں جاکر کوئی قیدی زندہ واپس آنے کی توقع نہیں کرتے اس سلسلہ کے [illegible] سینٹ جوزف اور ڈیولس آئیلانڈ (شیطان کا جزیرہ) ہیں جہاں سخت عادی مجرم اور قوی غدار رکھے جاتے ہیں۔

رائل کے جزیرہ میں مجھے لاکاسے اونز کی اس مشہور بارک میں داخل کیا گیا جہاں تعزیری بستی کے چھٹے ہوئے قیدی رکھے جاتے ہیں ان بارکوں کی زندگی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان کا صحن تقریباً ہر روز

[illegible] کا قانون نافذ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ ہر مجرم کو قید سے آزاد ہونے کے بعد مساوی مدت تک [illegible] ہو کر رہنا پڑتا تھا۔

ایک خیال [illegible] یہ تھا اس لئے کہ نو آبادی کا کوئی آدمی ان قیدیوں سے کسی قسم کا واسطہ رکھنا ہی [illegible] کی بعض وحشی عورتیں تک ان مجرموں سے شادی کرنے کو اپنی توہین خیال کرتی تھیں، فرانس [illegible] مجرموں کو ہی ہے بغیر دور دراز ممالک میں جا کر قسمت آزمائی کرتے اس نو آبادی کے نام سے نفرت [illegible] دنوں میں یہ حصۂ ملک نکبت، بہیمیت اور بے آئینی کے لئے مثال ہوگیا۔

[illegible] فرانسیسی گیانا اپنے کاری کے بے راہ روی اور [illegible] کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اس قدر وسیع ملک [illegible] پچاس میل سے کم سڑکیں ہیں نہ کوئی تجارت ہے نہ کسی صنعت کا نام و نشان ہے نہ کوئی فیکٹری ہے [illegible] ہر مہینے ایک سامان سے لدا ہوا جہاز اس کے ساحل پر آکر ٹھیرتا ہے اور اپنا بار اتار کر خالی ہی واپس چلا جاتا ہے۔

[illegible] زیادہ قبل سے ہی فرانسیسی حکومت کو اس نو آبادی کی ناکامی کا علم ہو چکا ہے چنانچہ ہر وہ گورنر جو یہاں [illegible] ہے اس کو ترقی دینے کی مقدور بھر کوشش کرتا، بعض کافی اگانا چاہتے تو بعض کوکو پیدا کرنے کی سعی کرتے۔ کئی گورنروں نے تو یہاں تک ہاتھ پاؤں مارے کہ فرانس سے لوگوں کو ترغیبیں دے دے کر بلوایا — لیکن یہ تمام کوششیں ہمیشہ نقش بر آب ہی رہیں۔ اس دارالخلافے کی آبادی تقریباً گیارہ ہزار ہے جس میں (۷۰۰) کے قریب قیدی اور (۳۰۰) آزاد مجرم ہیں۔ قیدیوں کو بظاہر کافی آزادی میسر ہے اس لئے کہ دن بھر وہ شہر میں [illegible] پھرتے ہیں لیکن رات کو واپس آکر انھیں کال کوٹھڑیوں میں بند ہو جانا پڑتا ہے۔

جزیرے میں اپنی بود و باش کے معاملات میں وہاں کے مفصل حالات قلم بند کرتا رہا، اور بعد میں ان کاغذات کو نو آبادی کے نو وارد گورنر موسیو سیڈو کے یہاں راز میں روانہ کر دیا، میری یہ محنت اکارت نہیں گئی اس لئے کہ ان کاغذات کو دیکھ کر نئے گورنر کو مجھ سے دلچسپی ہوگئی اور جب مجھے کائین منتقل کر دیا گیا تو اس نے ازراہ عنایت نو آبادی کے محافظ خانے کی ترتیب کا کام میرے ذمے کر دیا۔

اس دفتر میں میں نے کئی ماہ تک سخت محنت سے کام کیا، ہزاروں مثلیں دیکھیں، کئی کتابوں، مضمونوں اور مجرموں کی رپورٹوں کا تفصیلی مطالعہ کیا، نظم و نسق کی روداد، قیدیوں کی غذا، لباس یا دیگر سہولتوں کی فہرست اور طبی امداد کے بجٹ کی تفصیلیں پڑھیں اور ان سب سے جی کھول کر استفادہ کیا اور وہ مواد حاصل کیا جو بعد میں اس جہنم آباد کے رازہائے سربستہ پردہ کے طشت از بام کرنے میں میرے کام آیا۔

[illegible] گورنر سیڈو بڑا نیک مزاج تھا، اپنے زمانۂ حکومت میں نو آبادی کی حالت سدھارنے کے لئے اس نے وہ سب کچھ کیا جو ایک حاکم کر سکتا تھا، لیکن نو آبادی کی کمیٹی ہر قدم پر اس کی راہ میں نئی رکاوٹیں پیدا کرتی رہتی تھی [illegible] میرے لئے اس کا وجود ایک رحمت سے کم نہ تھا، اس لئے کہ اس کے تبادلے کے بعد جلد مجھے دوبارہ قید تنہائی کی [illegible] سزا بھگتنے کے لئے رائل کے جزیرے کو بھیج دیا گیا یہاں میں نے اپنی قید کے سب سے بدترین تین سال گزارے۔ [illegible] جب فضا خاموش ہونے لگتی تو میں اندازہ لگا لیتا کہ رات آرہی ہے۔ اس لئے کہ اس غار نما کوٹھڑی میں جہاں [illegible] اندھیرا ہی رہتا، روشنی سے صبح یا شام کا اندازہ لگانا مشکل تھا، چنانچہ ہر روز جب سمندری پرندوں کی [illegible] سے مجھے آفتاب کے طلوع ہونے کا پتہ لگ جاتا تو میں کوٹھڑی کی دیوار پر اپنے ناخن سے ایک نشان بنا دیتا،

تاکہ اس طرح ان کا حساب رکھنے میں سہولت ہو سکے۔

۳ نومبر ۱۹۳۸ء کو جس اس جہنم آباد میں میرے داخل ہونے کے ٹھیک پندرہ سال بعد میرے کے کنڈے کے قفل میں مجھ کسی کے کنجی لگانے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور محافظ نہایت لاپروائی کے ساتھ ایک دستاویز میرے حوالے کر کے چلا گیا، لیکن اندھیرے میں رہتے رہتے میری بصارت اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ میں اسے ٹھیک نہ پڑھ سکا۔ بہرحال معلوم ہوا کہ اس دستاویز کی رو سے میں آئندہ ایک "آزاد مجرم" تھا۔

آزاد مجرم! یعنی میں بے گھر بے در راستے کے آوارہ کتے کی طرح زندہ رہنے کے لئے آزاد تھا! جنگل جنگل مارے مارے پھرنے اور درندوں کا شکار بننے کے لئے آزاد تھا، لیکن نو آبادی کی حدود سے باہر کے دروازے دس سال کے لئے مجھ پر بند تھے ــــ میں آزاد تھا ــــ مگر دنیا میں نہ میرے لئے آذوقے کا کوئی سہارا تھا ــــ نہ زندہ رہنے کی کوئی سبیل۔

میں نے بھی وہی پیشے اختیار کئے جو آزاد مجرم اپنے پیٹ کی آگ بجھانے اختیار کرتے ہیں۔ میں نے جنگل میں ایک جھونپڑا ڈال لیا اور یہاں رہ کر میں یا تو تیتریاں پکڑتا یا جنگل کے درختوں سے بڑ کھ کر کے اس سے طرح طرح کے کھلونے تیار کرتا اور انھیں شہر کے کباڑیوں کے ہاتھ بیچ ڈالتا، اس نیم وحشی زندگی میں مجھ پر کیا کیا گزری اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں، بڑے دن کے تہوار پر اور کچھ نہ ملا تو میں نے طوطے بھون لئے، آزادی کی دوکے کیا ہو ہر سال نو کا جشن اور ایسٹر کی عید پام کے گودے اور گوہ کے تلے پر منائی، میرا جسم تو چڑیوں اور جوؤں کا مستقل کیمپ بن چکا تھا اور میرے پیر جونکوں کے زخموں سے چھلنی ہو چکے تھے۔

روپے کی مجھے سخت ضرورت تھی اور میرے پاس ایک حبہ بھی نہیں تھا، اس لئے کہ اس عذاب سے چھٹکارا پانے کے لئے کم از کم ایک ڈونگی تو ضروری تھی اور ایک معمولی ڈونگی بھی سو فرانک سے کم میں نہ مل سکتی تھی اور پھر سمندر میں پندرہ روز کے راشن کے لئے پچاس فرانک تو خرچ ہو ہی جاتے۔

ایک روز میں سینٹ لارین میں بیٹھا ہوا اپنی قسمت کو رو رہا تھا کہ ایک سیاح نے جو موٹی سن ہیٹ پہنے ہوئے تھا، اشارے سے مجھے بلایا۔

"کیا میاں کوئی ایسا قیدی مجھے مل سکتا ہے جو انگریزی بات کر سکتا ہو؟" اس نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں مجھ سے پوچھا۔

"تھوڑی بہت تو میں بھی بول لیتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"میں اس جزیرے میں ایک قیدی مسمی بل بی نائے کو تلاش کر رہا ہوں" اس نے انگریزی میں بات کرتے ہوئے دریافت کیا "یہ وہ شخص ہے جس کا تذکرہ "شیطانی جزیرے" کی مصنفہ بلانڈ نائل نے اپنی کتاب میں کیا ہے (بات یہ ہے کہ کئی سال قبل جب اس خاتون نے اس جزیرے کی سیاحت کی تھی تو میں نے اپنے روزنامچوں کے مسودے چند فرانک کے عوض اس کے ہاتھ فروخت کر دیے تھے، چنانچہ اس مشہور ناول کی بنیادیں انھیں روزنامچوں پر رکھی گئی تھیں)

میں نے کہا "کہئے میرا نام ہی بل بی نائے ہے؟"

معلوم ہوا کہ یہ اجنبی کسی امریکی فلم کمپنی کے کرتا دھرتاؤں میں سے تھا، اور یہ لوگ ایک ایسا فلم بنانے کی دھن میں تھے جس کا قصہ اس شیطانی جزیرے سے متعلق تھا اور اس میں ایک ایسا منظر بھی آتا تھا جس میں

یہ شخص چونکہ حیرت سے بالکل بھاگ نکلا تھا چنانچہ فلم کمپنی کے دیگر عہدہ داروں نے اس آدمی کو
بھیجا تھا تاکہ وہ مجھ سے ملاقات سے ذاتی طور پر واقفیت حاصل کر سکے۔
وہ مجھ سے پوچھنے لگا " اگر کوئی قیدی اس مقام سے بھاگ نکلے تو وہ کونسا راستہ اختیار کریگا۔
کیسے پہنچ سکیگا کیا دشواریاں پیش آئیں گی " وغیرہ وغیرہ۔
رات بھر میں اس کے سوالات کا جواب دیتا رہا۔ اس دوران میں میں نے اس آدمی کے لئے قید خانوں کے
نقشے اور جزیروں کی تصویریں کھینچ کر دیں۔ غرض جس قدر بھی معلومات مجھ سے
حاصل کی جا سکیں اس کے ساتھ ساتھ میں اپنی پچھلی فراری کی تمام ناکام کوششوں اور ذاتی تجربوں کو بھی بیان
کرتا جاتا تھا جن کا اقتباس وہ اپنی ڈائری میں کرتا جاتا تھا۔
جب اجالا ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کا طیارہ جو اسے اس جزیرے میں لایا تھا اسے لے جانے کے
لئے کھڑا ہے لیکن جانے سے پہلے اس نے میرے ہاتھ میں (۲۰۰) ڈالر کے نوٹ رکھ دئے ——— یہ رقم
میں اپنی فراری کے چوتھے اقدام میں صرف کرنا چاہتا تھا۔
اس مرتبہ تو میں آزاد ہو کر ہی رہوں گا۔ نہ جانے کتنی بار میں نے اس جملے کو اپنے دل میں دہرایا۔
کئی دنوں تک میں اپنے ساتھیوں کی تلاش میں قید خانے کی بستی کا کونا کونا چھانتا رہا۔ مجھے ایسے لوگوں
کی تلاش تھی جو نہ صرف جسمانی حیثیت سے فولاد کی طرح مضبوط ہوں بلکہ جن کے دلوں میں آزادی کی لگن بھی
آگ کی طرح بھڑک رہی ہو، بہر حال بڑی تلاش کے بعد مجھے پانچ ایسے ساتھی مل گئے جو میری مطلب کے تھے
اور خوش قسمتی سے ان میں کا ایک آدمی جہاں دیدہ ملاح بھی تھا۔
مارچ ۱۹۳۵ء کی شب کو ہم ایک مقررہ مقام پر جمع ہوئے اور رات کی تاریکی میں ساحل کے ایک
ویران مقام کی جانب روانہ ہو گئے، جہاں ایک چینی تاجر نے ہمارے لئے ناؤ کے چھپا رکھنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن
جب ہم اس جگہ پہونچے تو ہم نے دیکھا کہ یہاں ایک بہت چھوٹی سی ڈونگی جو مطلوبہ ناؤ کی نصف بھی نہ ہوتی تھی،
پڑی ہوئی ہے اور اس میں رکھا ہوا سامان بھی اتنا نہیں ہے جتنے کے لئے ہم سے روپیہ لیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ
اس بدمعاش نے ہمیں دھوکا دیا تھا اور عین اس وقت جب ہمارے لئے قدم پیچھے ہٹانے کا کوئی سوال نہ تھا
اس نئے افتادے سے میں پریشان ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا ہماری مہم شروع ہونے سے قبل ہی ناکام ہو گئی۔
لیکن نہ جانے وہ کونسی چیز تھی جو ہمیں واپسی سے روکتی تھی، ہم نے کہا " ہرچہ بادا باد " اور پھر اللہ کا
نام لے کر کشتی پر سوار ہو گئے اور بہاؤ کے رخ چلنے لگے، دریا کے دہانے پر پہونچ کر ہمارے ساتھی ملاح شفلو نے
کہا " اب ہم کو پال کھول دینا چاہئے " اور پھر وہ خود پتوار کا ڈنڈا سنبھال کر بیٹھ گیا۔
سچ جانئے معمولی حالات میں کوئی کوتاہ سے کوتاہ عقل انسان بھی اس قسم کے سفر کی جرات نہ کرتا
لیکن ہم پر آزادی کا بھوت کچھ ایسا سوار تھا کہ اس اقدام میں کوئی بڑے سے بڑا خطرہ بھی ہماری نظروں میں
رتی برابر اہمیت نہ رکھتا تھا، رات بھر ہم اسی طرح اندھیرے میں کشتی کھیتے رہے اور جب صبح ہوئی تو ہم نے
دیکھا کہ ہماری کشتی بہت دور سمندر میں نکل گئی ہے اور ہمارا پیچھا کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔
میں نے ایک مٹی کے تیل کے ڈبے میں کوئلے جلائے اور اس پر چائے تیار کرنے لگا، یہی گھری چائے ہمارا
صبح کا ناشتہ تھی، اس لئے کہ ہمارے ساتھ اس بدمعاش چینی نے جو سامان خورد و نوش رکھا تھا وہ بہت ہی
کم تھا اور ہم اسے نہایت سخت ضرورت کے وقت استعمال کرنا چاہتے تھے، چنانچہ کسی نے بھی ناشتہ نہ ملنے کی

[illegible] ہو سکتی ہیں"
[illegible] انداز میں ہم نے ان کی دکھلائی ہوئی سمت کی طرف نظریں اٹھائیں ۔ دھندلی
[illegible] میں پہاڑوں کی چوٹیاں سبز اور زرد رنگ میں صاف نظر آ رہی تھیں ۔ ہمارے [illegible] جذبات
[illegible] اس منظر کے ساتھ ہی ختم ہو گئے اور ہم فرط خوشی سے بچوں کی طرح ناچنے اور چلانے لگے ۔

[illegible] دنوں کی طویل مدت کے بعد ہماری کشتی کو ساحل کا وصال نصیب ہوا ، جب ہم قریب پہونچے تو
[illegible] ساتھیوں نے چاہا کہ کود کر چمکتے ہوئے ریتیلے ساحل پر جا نکلیں ۔ لیکن وہ اس قدر کمزور اور ناتواں ہو چکے
تھے کہ وہ سیدھے چل نہیں سکتے تھے ۔ بلکہ انھیں ریت پر گر کر بچوں کی طرح سرکنا پڑ رہا تھا ،
خشکی پر پہونچنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ماہی گیروں کی ایک جھونپڑی میں دو ایک ہانڈیاں رکھی ہوئی ہیں
اور ان میں شکر اور نمکین مچھلی بھری ہوئی ہے ۔ ہم نے سمجھا کہ یہ اللہ کی دین ہے اور اپنی مٹھیاں بھر بھر کر کھانے
لگے اور جب بھوکے جانوروں کی طرح پیٹ بھر کھا چکے تو تھکاوٹ اور نیند نے ہمیں آ دبوچا —— جس کے
بعد نہ معلوم کب تک ہم سوتے رہے ۔
بہت دن چڑھے ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے ایک گاؤں کا رخ کیا ، یہاں کے انگریز حاکموں نے جو گیانا
کے فرانسیسی حکمرانوں سے نفرت کرتے تھے ، ہمارا افسانہ نہایت ہمدردی سے سنا ، ہمیں کھانا اور کپڑا دیا گیا
اور جب ہم ایک دو روز آرام کر چکے تو ایک کشتی بھی یہ کہہ کر ہمارے حوالے کی گئی کہ اگر ہم چاہیں تو بھاگ کر کسی اور
جزیرے میں اپنی جانیں چھپا سکتے ہیں ۔
[illegible] اور جون کو ایک انگریزی اگن بوٹ کے ذریعے ہماری کشتی کو کھینچ کر سمندر میں پہونچا دیا گیا ، اس سے مدعا یہ
تھا کہ ہم ان لاتعداد انگریزوں کے مقبوضہ جزیروں سے ہوتے ہوئے جو اس سمندر میں ایک زنجیر کی کڑیوں کی
طرح پھیلے ہوئے ہیں میامی پہونچ جائیں ۔
اس کے بعد کچھ دنوں تک تو ہم ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک سفر کرتے رہے لیکن آخری مرتبہ
جب ہم نے ایک جزیرہ چھوڑا تو ہم سمندر میں بھٹک گئے ، اور اس طرح چھ دنوں تک مسلسل بہتے رہنے کے بعد ہم
نے یقین کر لیا کہ اب خدا ہی ہمیں کبھی ساحل کی صورت دکھلا سکتا ہے پھر ایک بار وہی اگلی مصیبتوں نے ہمیں آ گھیرا
ہماری غذا ختم ہونے لگی اور پانی کا قطرہ قطرہ بچایا جانے لگا ، لیکن سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ
ہم لوگ پھر ایک مرتبہ اپنا صبر کھونے لگے تھے ،
ٹرینیڈاڈ سے نکلنے کے ٹھیک سولھویں روز بعد ایک سمندری طوفان نے ہماری کشتی کو ایک ایسے ویران
ساحل پر پھینک دیا جس سے ہم واقف نہ تھے ، کشتی ایکسپریس ٹرین کی رفتار کے ساتھ ساحل سے ٹکرائی اور ٹکرا کر الٹتے
الٹتے بچ گئی ، اس گڑبڑ میں ہمارا سامان سمندر کی موجوں کے حوالے ہو گیا اور ہم بے یار و مددگار گرم گرم ساحلی
ریت پر پھینک دیئے گئے ۔
اس آسمانی عذاب سے ہم سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ جنگل کے کسی نامعلوم گوشے سے چند امریکی ہندی
تیر کمان اور برچھے لئے ہوئے ہم پر ٹوٹ پڑے ، اور ہمارے رہے سہے سامان کا زبردستی جائزہ لینے لگے ، جب ہم
نے انھیں روکنے کی کوشش کی تو ان کی دھمکیاں سنجیدہ ہوتی ہوئی معلوم ہونے لگیں ۔ اس لوٹ مار میں انھوں
نے ہماری ہر شے [illegible] چیز کر رکھ دی اور جب واپس جانے لگے تو ہمارے کپڑے تک اتروا لئے ۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لٹیرے، امریکی ریڈ انڈینوں کی ایک قدیم نسل سے تعلق رکھتے تھے جنھیں ہمارے ہاں "سیٹی بجانے والے ہندی" کہتے ہیں، بہر حال انھوں نے اپنی مہربانیوں سے ہمیں غلاظت و گندگی سے اس قدر بھیا دیا کہ اب نہ ہمارے پاس پہننے کے لئے تن پہ ایک چیتھڑا ہی تھا اور پانی پینے کے لئے کوئی برتن۔ ان کے ساتھ ہم نے غم دور ہونے تک کا لا۔

گرم گرم تپتی ہوئی ریت پر ہم کسی نامعلوم مقام کی طرف چلنے لگے، اس سفر میں چار روز تک ہمیں کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ راستے میں کبھی کبھی ہم چقماق کی مدد سے آگ روشن کر لیتے اور ٹڈیاں یا کیڑوں کو پکڑ کر ان پر بھون لیتے۔ یہی ہماری غذا تھی اور انھیں پر ہمارا گزارا تھا، راستے کی ناہمواری سے ہمارے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے اور ہمارے جسم مچھروں اور زہریلے کیڑوں کے کاٹنے سے سرخ ہو گئے تھے، لیکن اس پر بھی ہماری ہمتیں بندھی ہوئی تھیں اس لئے کہ اللہ کے فضل سے اب ہم میں کسی قسم کا جھگڑا یا مخالفت نہ تھی، محض خوف اور جان کے خطرے نے ہمیں متحد کر دیا تھا۔

اس سفر کے چوتھے روز جب آفتاب غروب ہونے لگا تھا اور ہم رات کے بسیرے کے لئے چاروں طرف نگاہیں دوڑا رہے تھے، ہمیں کچھ فاصلے پر گھاس کی چند جھونپڑیاں نظر آئیں۔ ہم نے غور سے دیکھا تو ان کے سامنے ماہی گیروں کے بڑے بڑے جال بھی لٹکتے ہوئے نظر آئے، بھوک اور آرام کے اشتیاق میں ہم ان جھونپڑیوں کی طرف دیوانہ وار دوڑنے لگے اور جب ان کے قریب پہونچے تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ کیونکہ یہاں کوئی آدمی یا آدم زاد کا نام نہ تھا ——— شاید یہ ماہی گیروں کی عارضی آرام گاہیں تھیں اور وہ اپنے شکار کی تلاش میں بحیرے پر چلے گئے تھے، بہر حال یہاں ہمیں ایک بڑی تانبیل جھونپڑی کی چھت سے لٹکتی ہوئی مل گئی اور جب ہم اسے آناً فاناً بھون کر چٹ کر چکے تو لباس کی تلاش میں ان جھونپڑیوں کا جائزہ لینے لگے۔ مگر یہاں سوائے چند بوسیدہ چیتھڑوں کے کچھ نہ تھا اور ہم لباس کی کسی توقع سے ہاتھ اٹھا ہی چکے تھے کہ ایک ساتھی نے کسی جھونپڑی سے آواز دی، معلوم ہوا کہ اسے وہاں چند مچھلی پکڑنے والوں کے لنگے مل گئے تھے، اور انھیں پاکر وہ خوشی سے ناچ رہا تھا۔

لے برت نے کہا "کچھ نہ پہننے سے تو یہی لنگے غنیمت ہیں" اور پھر وہ انھیں ایسے شوق سے پہننے لگا جیسے کوئی غیر فرانسیسی اجنبی پیرس کے سلے ہوئے کپڑے پہن کر خوش ہوتا ہے۔ پھر ہم نے اس لباس کا ایک فوری فائدہ تو محسوس کیا وہ یہ کہ اب مچھر اور کیڑے ہم کو اس قدر دق نہ کرتے تھے۔

دوسرے روز اس ہیئت کذائی میں ہم مارے مارے پھر رہے تھے کہ کولمبیا کے سپاہیوں کی ایک ٹکڑی نے ہمیں دیکھ لیا اور پیٹ پکڑ کر قہقہہ مارنے اور ہنسنے لگے، ان میں سے ایک نے کہا "ارے یار ان ڈاڑھی مونچھوں والی عورتوں کو اپنے یہاں ضرور لے چلنا چاہئے، کپتان انھیں دیکھ کر یقیناً خوش ہوگا۔ برسوں بعد ایسی مخلوق نظر آتی ہے"

ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم کولمبیا کے ساحلی شہر سانتا مارتا پہونچا دیئے گئے، ان سپاہیوں کے افسر نے ہمارے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کیا، ہمیں کھانا کھلایا گیا اور کپڑے دیئے گئے، لیکن جیسا کہ ہم کو بعد میں معلوم ہوا فرانسیسی قونصل کو ہمارے آنے کی خبر بھی کر دی گئی۔

(باقی آئندہ)

[illegible]ادی کے غیر مطبوعہ خطوط

[illegible]ین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی کے نام مشاہیر اردو نے وقتاً فوقتاً جو خطوط لکھے تھے [illegible] کو ادارہ کی طرف سے مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی شاعرِ اقبال کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اردو زبان کے مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی کے مکتوبات خطوط بھی اسی سلسلہ میں مرتب ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند خطوط ناظرین سب رس کی دلچسپی اور افادہ کی خاطر ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔

(۱)

الہ آباد۔ ۱۱، ستمبر ۱۹۱۲ء

عالی جناب مدظلہ

اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوں کہ آپ سے امیر با توقیر اور مجسمہ روشن ضمیر اور عالم باعمل و مدبر اور حکیم صاحب شرح و تفسیر کے دل میں میری جگہ ہے۔ اگرچہ آپ وفور بیان مسائل توحید سے اپنی روحانی ترقی کرتے جاتے ہیں اور دنیاوی ترقی اس راہ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہے تاہم ایسے آثار پائے جاتے ہیں کہ آپ کے ایوان دولت کی شمعیں روشن تر ہو جائیں۔

چند روز ہوئے آپ کے بھانجے صاحب نے سرفراز فرمایا تھا۔ سبحان اللہ ان کی قابلیت ان کے دلآویز اخلاق سے دل خوش ہو گیا۔ بڑوں کے بڑے ہی ہوتے ہیں۔

دنیا سے میں ایسا دل برداشتہ ہو گیا ہوں کہ کیا عرض کروں۔

ہجر میں اس غم کے مجھ پر سانس لینا بار ہے
زندگی ظالم مگر اب تک گلے کا ہار ہے

اس مطلع سے تسکین ہوتی ہے۔

یہ عمر کب تک وفا کرے گی زمانہ کب تک جفا کرے گا
مجھے قیامت کی ہیں امیدیں جو کچھ کرے گا خدا کرے گا

ایڈیٹروں سے ناک میں دم ہے۔ بلقانیوں کے ظلم کے خیال سے کہیں میری زبان سے نکل گیا تھا۔ ع

بحمد اللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

یہ اسی وقت کہا تھا جب صرف سرویا اور آسٹریا کی بحث تھی۔
دوسرا مصرع صاف تھا۔

اس قدر کیں سختیاں بلقانیوں نے بے گناہوں پر

بالآخر چرخ ان کے سر کو زیرِ سنگ لایا ہے۔ ایڈیٹر صاحب صباحات نے یہ اشعار اس وقت چھاپے جب اعلانِ جنگ منجانب ٹرکی ہو گیا۔ ان پر اعتراض ہوا ہے۔ اگرچہ مجھ سے ہنوز کچھ نہیں کہا گیا تاہم کلفت ہوتی ہے۔
ایڈیٹر صاحب کی یہ بھی رکاکت ہے کہ ان کے نام پرائیوٹ چٹھی آئی تھی۔ انھوں نے اس کو چھاپ دیا۔ خدا بلاؤں سے

جلد نجات دے۔ سوسائٹی کا تعلق خواہ مخواہ مجبور کرتا ہے۔ اگر تندرست ہوتا تو جنگلوں پہاڑوں میں بھاگ جاتا مگر خوب کرنا کیا ہے۔

فکریں کبھی تھیں اس کی راحت مجھے بڑی ہو
اب کہہ رہا ہوں یا رب تکلیف میں کمی ہو

آپ کا ساتھ ہوتا تو شاید عافیت میں گزرتی۔ لیکن بہت دوری ہے۔ خدا کرے شرف حضوری میسر آئے۔ وہاب مضامین تعمیل ارشاد میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ ذرا اطمینان خاطر ہو لے۔ اگرچہ یہی ظاہر ہے کہ

دل کی جو خواہش ہے وہ سامان ہونے کا نہیں ۔۔۔ الغرض دنیا میں اطمینان ہونے کا نہیں

دعاگو
اکبر

(۲)

الہ آباد۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء

عالی جناب

دونوں نظمیں دلکش ہیں۔

دشمن کو محبت سے مروت سے کرو زیر
نکلا ہے کہیں کام فقط تیر و تبر سے

کیا عمدہ نصیحت ہے۔

شاداب بہر خدا نغمۂ توحید سنا

اصل بات یہی ہے۔

کسی والانامے میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ پنجاب میں جنگ و اختلاف ہے اور انہی وجوہ سے میں نے مسلک توحید و صلح کل اختیار کیا ہے۔ یہاں بھی ہندو مسلمان شیعہ سنی کی بحثوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ توحید و صلح کل کے مسائل کو برابر بیان فرماتے رہیئے اور ان پر زور دیجئے۔ میرا خیال زیادہ تر آپ سے ملازمت حاصل کرنے کے لئے ہی تھا اور ہے کہ ان امور پر زور دیا جائے۔ اور عمدہ مضامین پیدا کئے جائیں۔

پرسوں ایک مطلع ذہن میں آیا تھا۔ عرض کرتا ہوں شاید پسند فرمایئے۔

نہ مستقبل کی سنتے ہیں نہ کچھ ماضی کی کہتے ہیں
جو اہل وجد ہیں وہ حال ہی کے ساتھ رہتے ہیں

یا یوں پڑھیے :— حال ہی میں مست رہتے ہیں۔

میرا دل تو اس خیال سے بہت تسکین پاتا ہے کہ آپ ایسا ذی علم، باثر، با اقتدار رئیس ملک توحید و صلح کل کے مسئلہ پر متوجہ ہے۔

حضور والا نے ایسے پاکیزہ اشعار موزوں فرمائے کہ حیرت ہوگئی۔ اور مرحبا و تحسین کا کلمہ بے اختیار زبان پر آیا۔ کیا کہوں بہت ضعیف ہوں ناتواں ہوں کوئی باسلیقہ رفیق سفر ملتا تو خدمت عالی میں حاضر ہو کر چند روز غم غلط کرتا۔ میرے آرام کا اہتمام خدام والا پر چھوڑتا مگر قبل اس کے خود جناب نے ارادہ تشریف آوری و امید ملاقات کا اظہار فرمایا تھا کہ کشش بڑا ارادہ پیدا ہوا۔

اللہ آپ کو شاد کام رکھے۔

دعاگو
سید اکبر حسین

(۳)

[illegible] علی جناب مدظلہ

آداب بجا لاتا ہوں۔ صحیفۂ کرامت کا صدور باعث انبساط خاطر ہوا۔ نہایت شوق سے آپ کے مضمون کا [illegible] جو کہ اب میں آپ نے پنجاب کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ شرک۔ اسی لئے غیر خدا کو [illegible] تقسیم کر رکھا ہے۔ اگرچہ ہم کیا ہماری سعی کیا۔ دنیا کا مزاج ہی یہ ہے۔ خوب ہوتی تو دنیا کیوں ہوتی۔ لیکن بہرحال [illegible] توحید پر زور دیتے رہنا عمدہ ترین شغل زندگانی ہے۔ اگرچہ میری غزل میں ایک شعر ہے۔

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا	میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

اس غزل کے دو تین شعر اور عرض کر دوں۔ ایسا سامع کہاں پاؤں گا۔

مجھ سے کچھ امید تھی ہی نہیں	آرزو کوئی دل نے کی ہی نہیں
چاہتا تھا بہت سی باتوں کو	لیکن افسوس اب وہ جی ہی نہیں
جرأت عرض حال کیا ہوتی	نظر لطف اس نے کی ہی نہیں

خواجہ صاحب سے سفر دکن کی نسبت کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ ان سے تو ملنا ہی دشوار ہو رہا ہے۔ وقت ایسا نازک ہے کہ بدگمانیوں سے محفوظ رہنے کو لوگوں نے مکالمت و مجالست و زیارت احباب سے کنارہ کشی کو اولیٰ سمجھا ہے۔ خصوصاً وہ زبانیں [illegible] طبیعت جن پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

دن بھر اک ایک منہ کو تکتا ہے   بات کرنے میں عیب تکتا ہے

اگر اچھا رہا، ہمت بندھی تو خواجہ صاحب رفیق سفر کافی ہوں گے اور یوں تو آپ کی قدردانی اور محبت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بے تکلف استمداد کروں گا۔

اللہ آپ کو شاد و بامراد رکھے۔

خاکسار
اکبر حسین

(۴)

الہ آباد۔ ۲۲ نومبر سنہ ۱۳ء

جناب والا مدظلہ

عید سے مجھ کو کیا نسبت۔ لیکن تبریک کے تار اور کارڈ کا شکر گزار ہوں۔ پریم بھگت کا مضمون خوب ہے۔ اکثر لوگ ایک ایک کاپی لے گئے۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ سکھوں اور آریوں میں کیا وجہ اختلاف رہی اور اظہار مخالفت نے کیا پیرایہ اختیار کیا ہے۔

توحید پر مضامین و رسائل تحریر فرماتے رہیے۔ بنی آدم ہمیشہ لڑیں گے۔ مگر موحد کا دل ٹھکانے رہے گا۔ اور کیا کچھ [illegible] چلا اگر دل لگا ہے۔ خدا یا زمانے نے آپ پر یہ نعمت پیش کر دی ہے۔ زہے نصیب۔

خواجہ صاحب حیدر آباد تشریف لے جاتے ہیں۔

خوشا حالِ کہ عہا تش تو باشی

افسوس کہ مجھ کو موقع صحبت نہیں مل سکا۔ لیکن جب میں آپ کے دل میں ہوں تو حاضری مجھے میسر ہے مجھ کو اس سے انبساط ہے کہ آپ قدر دانی فرماتے ہیں۔

دعاگو
اکبر

(۵)

میں نے خود یہ خیال کیا تھا کہ کبھی بہت بلندی طبیعت میں توانائی پائی تو خواجہ صاحب کی اپنی صحبت پر آمادہ کروں گا۔ میں آپ کی محبت اور قدر دانی کے مزے لیتا ہوں اور شکر گزار رہوں۔ کیا دل ہو گا جس میں اس نا چیز کی جگہ ہے۔

الٰہی در جہاں باشی با قبال جواں بخت و جواں دولت جواں سال

دعاگو
سید اکبر حسین

(۶)

الہ آباد۔ ۳ر دسمبر ۱۴ء

حضور والا

خواجہ صاحب سے یہ سن کر کہ میرے نہ آنے کا آپ کو افسوس ہوا دل بہت نازاں ہوا۔

منکہ باشم کہ در آں خاطرِ عاطر گزرم
لطفہا می کنی اے تحریر صد گونہ کرم

اس وقت حالت ایسی تھی کہ افسوس مفارقت ہی کا پہلو مفید تر تھا۔ زندگی باقی ہے۔ اللہ کو منظور ہے تو یہ امید کبھی پوری ہی ہو گی کہ آپ سے با اطمینان و تفصیل مکالمت و مجالست ہو۔

علالت و ناتوانی پست ہمت کئے دیتی ہے۔ دنیا کا کیا پوچھنا۔ شان ظہور تو یہی ہے لیکن نخلت شکن اسباب اکثر عالم دل کو بدل دیتے ہیں۔ رات ایک مطلع بے ساختہ ذہن میں آیا۔

سب سے بہتر کیا ہے انساں کو جو کرنا چاہیئے
موت کا خائف جو ہے بس اس پہ مرنا چاہیے

خواجہ صاحب کی خدمت میں تسلیم۔ اس کے ساتھ ایک لطیفہ بھی

خواجہ سے کیونکر نہ ہوتا پادری کو سوءِ ظن
پیر اِک بے دخل کرتا ہے سدا اتوار کو

خاکسار
اکبر

(۷)

الہ آباد۔ ۱۵ر دسمبر ۱۴ء

حضور والا

کرمت نامے سے سرفرازی حاصل ہوئی۔ کیا کیا شعر فرمائے ہیں۔ مرحبا صل علی۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

خواجہ صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ خدمت سابقہ پر بحالی کی امید قائم ہوئی ہے۔ خدا آپ کو فائز المرام اور حاشیہ بوسان بساط دولت کو شاد کام کرے۔ آپ کا خیال با کمال ارباب مذاق کے لئے ہر رنگ میں دلکش ہے۔ بوریا پر بیٹھے گا تو تیا مرید ہے مسند پر بیٹھئے تو مصاحب ہے۔ لڑنے کو نکلئے تو جان نثار ہے۔ کچھ ارشاد ہو تو وجد میں آنے کو طیار ہے۔

میری ناتوانی اور افسردگی روز افزوں ہے۔

آپ کا خیر طلب
اکبر حسین

[illegible]

"مل گئی! مل گئی!! مل گئی!!!" درخشاں کا مقبول عام
ایڈیٹر [illegible] ننھے چھوٹے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ادبی
دنیا [illegible] تھا اور جیسے اس نے اپنی زندگی
وقف کر دی تھی جب تک کالج میں رہا اس کی خدمات ایک
[illegible]۔ کالج چھوٹا تو تلاش معاش میں سرگرداں
پھرنا پڑا۔ اس نے رسالہ یا اخبار جاری کرنے کا ارادہ کیا۔
[illegible] دوستوں اور عزیز و اقارب نے سفارش کر کے اچھے چندے
[illegible] کا وعدہ کیا مگر اس نے کسی کی نہ سنی۔ کسی سے
[illegible] پر کچھ سرمایہ لیا اور کسی سے قرض لیا اور اس طرح
سب سے پہلے "درخشاں" ایک ماہوار رسالہ نکالا۔ رفتہ
رفتہ اس کے حوصلے بڑھنے لگے۔ "درخشاں" کے علاوہ کئی اور
رسالے اور ایک اخبار شائع کرنا شروع کیا۔ قرضہ ادا کر دیا
اور خود بھی ایک پریس کا مالک ہو گیا۔

دوست احباب اور عزیز و اقارب نے خاص
طور پر بوڑھی ماں نے اس کی شادی کی کوشش شروع کی
مگر وہ ہمیشہ ٹالتا چلا گیا وہ یہی کہتا: "جب کسی کو پالنے کے لائق
ہو جاؤں گا تو شادی بھی کروں گا۔ اب تو خود کو پالنے
کے لالے پڑے رہیں۔" لیکن اس میدان میں آجانے کے بعد
اس کے پاس دولت آگئی کہ وہ ایک کو کیا کئی کو پال سکے۔ نیز
عزت اور شہرت تو اس کے قدم چومتی تھی۔ جہاں بھی وہ لڑکی
[illegible] مشہور ہو جاتی مگر وہ ابھی انتخاب نہ کر سکا تھا۔ ہر
دوشیزہ کو جس پر اس کی نظریں پڑیں، ہر طرح سے جانچا
مگر کوئی لڑکی معیار پر نہ اترتی۔ وہ ایسی لڑکی چاہتا تھا جو زیادہ
حسین نہ بھی ہو تو اپنے میں کسی قدر رعنائی رکھتی ہو، حسن سیرت
کی مالک ہو اور سب سے بڑھ کر اس میں علمی اور ادبی مذاق ہو۔
یہ زمانہ ناصر کے لئے عجیب کشمکش کا تھا۔ ادھر ماں
قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی تھی اور اس کا بے حد تقاضا تھا کہ جیتے
جی بہو کا راج دیکھ لے۔ عزیز و اقارب الگ تنگ کر رہے تھے۔

وہ سوچتا کیا کروں اور کیا نہ کروں۔
ایک نئی افسانہ نگار خاتون "شمائل" کے اکثر افسانے
اس کے پاس آتے تھے اور اکثر "درخشاں" میں چھپ بھی چکے تھے۔
اپنی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے ناصر کا خیال اس طرف
گیا ہی نہ تھا۔ لیکن ایک روز جبکہ وہ ڈاک دیکھ رہا تھا شمائل
کا ایک تازہ افسانہ مع ایک طویل خط کے ملا۔ شمائل کے افسانے
کی تعریف میں اکثر خطوط اسے مل بھی چکے تھے۔ اس نے اس کا
خط دیکھ کر ناصر کا خیال اس طرف منعطف ہوا۔ پہلی بار اس نے
شمائل کے متعلق سوچا "کیا یہ میری بیوی بن سکے گی۔"
ادبی قابلیت اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ افسانوں کے
پلاٹ سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے دل میں اصلاحی سرگرمی
موجود ہے۔ اس طرح ضرور وہ حسن سیرت کی بھی مالک ہوگی۔"
اس طرح ناصر شمائل کو پرکھ گیا۔ اب سوال حسن صورت
کا رہ گیا تھا۔ ناصر نے سوچا "اگر وہ زیادہ حسین نہ بھی ہو تو
مضائقہ نہیں۔ کچھ تو رعنائی رکھتی ہوگی۔ یہ پاک و پاکیزہ خط
لکھنے والی عورت حسین ہونا ہی چاہیے۔"
کئی روز تک ناصر شمائل کے خیال میں رہا۔ دل و دماغ
پر عجیب سروری کیفیت طاری تھی۔ آنکھیں شوخی سے ناچ
رہی تھیں۔ ہونٹوں پر ہر دم تبسم کھیل رہا تھا۔ تیسرے روز
شام کو وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے پہلے تصفیہ کر چکا تھا کہ شمائل
سے وہ ضرور شادی کرے گا۔ اس دل خوش کن تصفیہ سے وہ
بے قابو ہو گیا اور پکارا "مل گئی! مل گئی!! مل گئی!!!"
اب ایک سوال رہ گیا تھا کہ آیا شمائل شادی شدہ
ہے یا نہیں۔ مگر اس کا جواب بھی آسانی سے معلوم کرنے کی ایک ترکیب
نکل آئی۔ ایک ماہ بعد "درخشاں" کا خصوصی نمبر نکلنے والا تھا۔
ناصر نے سوچا۔ درخشاں کے خاص لکھنے والوں کے حالات اور
تصاویر بھی اس پرچہ میں شامل کر دی جائیں۔ اس طرح وہ
شمائل کے حالات سے بھی آگاہ ہو جائے گا اور تصویر بھی مل جائے
گی۔ چنانچہ اس نے خاص خاص مضمون نگاروں سے
التماس کی کہ وہ اپنے حالات اور تصویر جلد از جلد روانہ فرمائیں۔

شمائل کو اس نے خاص طور دعوت دی۔
شمائل کو خط لکھنے کے بعد ناصر کسی گہری بے چینی
نہ تھا وہ ہمیشہ ڈاکیہ کا انتظار کرتا۔ یہ وہی ناصر تھا جو بعض دفعہ
افسانہ نگاروں کے ان جملوں پر جو فراق اور ہجر کی کیفیت
پر لکھے گئے ہوں بے اختیار ہنس دیتا مگر اب ناصر کی بھی وہی
حالت تھی۔ بلکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی حالت ان
افسانے کے کرداروں سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اکثر عاشق
سے مایوس ہو کر چاہتا کہ تخلیہ میں بیٹھے اور خوب روئے۔
آخر دو ہفتہ بعد شمائل کا خط آیا۔ چھوٹا سا لفافہ اور
اس پر شمائل کی تحریر دیکھ کر ناصر بے اختیار ہو گیا۔ دل بلیوں
اچھلنے لگا۔ بار بار وہ دل سے سوال کرتا۔ "اگر وہ شادی شدہ ہو تو"
مگر دل سے کوئی جواب نہ پا کر خاموش ہو جاتا۔ لفافہ کھولنے سے
پہلے اس نے لفافہ کو دبا کر دیکھا۔
شاید کوئی سخت سی چیز اس میں موجود تھی یعنی تصویر یا
ناصر کی حالت متغیر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ لفافہ کھولنا چاہتا تھا
مگر ہاتھ اس کی مدد نہیں کر رہے تھے۔ اس کی حالت ایسی
ہی تھی جیسے کسی چور کی چوری کے وقت ہوتی ہے۔ بمشکل تمام
ناصر نے خط کھولا۔ ایک پری چہرہ خاتون کی تصویر اس میں موجود
تھی۔ عمر سولہ اٹھارہ کی لگ بھگ تھی۔ ایک ادائے مستانہ
سے باغ کی ایک روش پر کھڑی تھی۔ ہاتھ میں ایک گلدستہ تھا۔
ناصر نے آہ بھر کر تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے
دل میں وہی سوال پیدا ہوا "کیا وہ شادی شدہ ہے" وہ
چونک گیا۔ کاغذات کو الٹ پلٹ کر کے اس نے وہ کاغذ نکالا
جس میں شمائل کے حالات تھے۔ سرسری طور پر پڑھا۔ آہ!
شادی کا کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔ یعنی وہ غیر شادی شدہ ہے۔
اس کا ہاتھ خود بخود دل کی طرف گیا۔ ناصر آنکھیں بند کر کے
خاموش بیٹھ گیا اور بہت دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔
وہ چاہتا تھا کہ ماں سے ذکر کرنے سے پہلے شمائل کے
رجحانات معلوم کرے۔ چنانچہ اس نے شمائل کو نہایت رنگین
پیرائے میں ایک خط لکھا جس میں اپنی دلی آرزو کا اشارتاً
ذکر کر دیا اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔
ایک ہفتہ کے بعد شمائل کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ
وہ ناصر کے دل کی بات جان گئی ہے۔ ناصر نے اس کی اس
دور بینی کی داد دی۔ ملنے کے بارے میں شمائل نے صاف لکھا۔
"جب آپ چاہیں اور جہاں آپ چاہیں میں ملنے کو تیار
ہوں۔"
ناصر کو منہ مانگی مراد مل گئی۔ مگر ملنے کے مقام کا تعین ایک
اہم مسئلہ تھا دو روز سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا کہ "۲۲ دسمبر
کو شام کے پانچ بجے وہ "لنکس ہوٹل" کے کمرہ نمبر ۵ میں ملے۔"
ناصر کو امید تھی کہ شمائل راضی ہو جائے گی۔ چنانچہ ہوا بھی یہی
اس لیے اس نے کمرہ کو ایک ہفتہ پہلے ہی کرایہ پر حاصل
کر لیا۔ دن بھر ناصر اس کمرہ میں پڑا رہتا اور وہ ایسی حرکات
کرتا کہ ہر دیکھنے والا اسے ضرور مفقود الحواس جانتا۔ اپنی
کرسی کے سامنے وہ دوسری کرسی رکھتا اور مصروف گفتگو
ہو جاتا گویا شمائل اس کے سامنے موجود ہے۔ اپنی گفتگو کو فصیح
اور پر اثر بنانے کے لیے وہ ہر جملے کے بعد ضرور شعر استعمال کرتا۔
بہرحال انتہائی کشمکش کے یہ چند دن کسی طرح گزر گئے
۲۲ دسمبر کا دن آگیا۔ پانچ بجے کا وقت مقرر کیا گیا تھا مگر ناصر
وہاں حسب معمول صبح سے موجود تھا۔ خدا خدا کر کے گھڑی
نے پانچ بجائے۔ ناصر کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ وہ کرسی پر
سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب گیا۔ اور ہوٹل کے پھاٹک پر نظریں
گاڑ دیں۔ کسی عورت کو نہ آتے دیکھ کر دور دور تک نظریں
دوڑائیں مگر وہ ناکام واپس آ گئیں۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔
اس کا سارا بدن لرزاں تھا۔ اس وقت ناصر کی حالت اس
بچے کی طرح تھی جو امتحان کا پرچہ کسی قدر خراب کر کے نتیجہ کا
منتظر ہو جو ابھی ظاہر ہونے والا ہے۔
دروازہ پر دستک ہوئی۔ ناصر نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔
باہر ہوٹل کا بیرا کھڑا تھا۔ اس نے طشتری بڑھائی جس میں ایک
کارڈ تھا۔
"شمائل"

[illegible] نے کہا ایک ... ہر ... عورتوں کے
[illegible] ناصر کو پہلی بار اس بات کا احساس
[illegible] ہو رہا ہے۔ مگر اس نے تصویر کہاں دیکھی تھی!
[illegible] نہ سکا۔ اسے اس بات پر رنج تھا کہ اس
[illegible] سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔
[illegible] خیالات میں غلطاں تھا کہ برقعہ میں سے آواز
آئی۔

"ذرا بتائیے آپ نے مجھے کیوں یاد کیا تھا۔"

"جی!" ناصر نے اپنے پراگندہ خیالات کے سلسلے کو منقطع کر کے کہا "میرا مقصد! یعنی میں یہ چاہتا تھا...... مجھے [illegible] آپ خوب لکھتی ہیں۔"

"شکریہ!" جواب ملا "اور کچھ"

ناصر کے سنبھلنے سے پہلے ایک اور حملہ ہوا۔

"جی! اور تو کچھ نہیں" ناصر ابھی اپنے جذبات کو قابو میں نہ لا سکا تھا "آپ ادھر کرسی پر آ جائیے نا...... اور یہ برقعہ...... میرا مطلب ہے...... گرمی ہو رہی ہوگی آپ کو"

"یعنی برقعہ اتار دوں؟" "جی ہاں! میرا مطلب یہی ہے۔"

نقاب اٹھا۔ ناصر کو امید تھی کہ ایک حسین دل گداز جلوہ گر ہوگا مگر وہاں سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان مرد کھڑا تھا۔

مگر اس حملہ کے لئے تیار رہتا اس کا سر چکرانے لگا اور وہ میز پر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب سے ہوش آیا کمرے میں نہ وہ نوجوان مرد تھا اور نہ برقعہ۔ میز پر اس کا اپنا بھیجا کھلا رکھا تھا جس میں کسی نے انتہائی عجلت سے لکھا تھا!

"مکرمی! تسلیمات"

شمائل بھی اپنے خطوط کو اسی طرح شروع کرتی تھی۔ آگے تحریر تھا۔

"آپ کی یاد فرمائی کا شکریہ!"

یہ معلوم کر کے کہ آپ جیسے ادبی خادم عشق اور محبت کی پینگیں بڑھا کر شریف عورتوں پر ڈورے ڈالتے ہیں۔ بہت افسوس ہوا آپ کو یہ معلوم کر کے شاید تعجب ہوگا کہ میں ہی شمائل کے نام سے افسانے لکھا کرتا تھا اور جو تصویر "درخشاں" کے خصوصی نمبر کے لئے روانہ کی گئی تھی وہ ایک ایکٹرس کی تھی جو بہت عرصہ پہلے کسی رسالہ میں چھپی تھی۔ اس لئے خصوصی نمبر میں جو حال ہی میں شائع ہونے والا ہے وہ تصویر نہ چھاپی جائے تو بہتر ہے۔

طالب خیر
خورشید احمد

شفقت رضوی

محبت کی چھاؤں :- مرزا اظفر الحسن صاحب بی اے کے چھ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے چھ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔

نوجوانوں کے نصب العین معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کیلئے ایک شائستہ تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع ۱۳۲ صفحات قیمت مجلد عہ

رات کا بھولا اور دیگر افسانے :- پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے، ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔

طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۰ قیمت عہ

پچپن کے بعد

پرانا [illegible] حضرت غفراں مکاں مرحوم کے عہد میں خصوصاً محرم کے چہلے دہے میں عجیب سوانگ اور تماشے ہوا کرتے تھے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ انہیں ایام محرم میں ایک روز دیکھتا کیا ہوں کہ ایک ٹکڑی چلی آ رہی ہے۔ غالباً چالیس پچاس آدمی ہوں گے۔ کوئی دس پندرہ آگے چل رہے ہیں۔ باقی باقاعدہ قطار باندھے ہوئے ان کے پیچھے آ رہے ہیں۔ آگے چلنے والے کہتے تھے کہ "پچپن سال ہو گئے"۔ اس کے جواب میں دوسرے سب کے سب ایک ساتھ کہتے تھے کہ "جیتے جیتے سو گئے"۔ اس کے ساتھ ہی راستہ پر چت لیٹ جاتے تھے۔ پھر اٹھتے اور تھوڑی دور یہی نعرہ لگاتے ہوئے جاتے اور راستہ پر لیٹ جاتے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اسی طرح ہر محلہ سے گزرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت غفراں مکاں نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا سوانگ ہے تو عرض کیا گیا کہ حال میں پچپن سال کی جو گشتی نافذ ہوئی ہے اس کی نقل کی جا رہی ہے۔ یعنی اچھا خاصا آدمی پچپن سالہ عمر ہوتے ہی بیکار ہو جاتا ہے جو مرنے کے برابر ہے۔

اس وقت تو مجھے زیادہ لطف نہیں آیا بلکہ اس لطیفہ کو سمجھ نہ سکا۔ لیکن بعد میں جب میں ملازم ہوا اور ملازمین کو وظیفہ پر علٰحدہ ہوتے ہوئے دیکھا کہ کس قدر رنج و پریشانی ہوتی ہے۔ اور توسیع کے لئے کس کس طرح کوشش کی جاتی ہے تو سمجھ میں آیا کہ یہ لوگ غالباً موت تک ملازمت سے علٰحدہ ہونا نہیں چاہتے ہیں۔ ان میں اکثر اس آنے والے وقت کے لئے بالکل تیار نہیں رہتے اور وظیفہ کو ایک بلائے ناگہانی خیال کرتے ہیں۔

وظیفہ اور پچپن سالہ عمر کی تھوڑی سی صراحت کر دینی مناسب ہے۔ سرکار نے عام رعایا کے حقوق کو پیش نظر رکھ کر ایک قاعدہ مقرر فرما دیا ہے کہ پچپن سال کی عمر یا بعد ضرورت پچیس سالہ ملازمت پر بھی وظیفہ [illegible] تاکہ دوسرے عہدہ داروں کو بھی ترقی کا موقع ملے۔ اس [illegible] نہیں کہ وظیفہ پانے والا عہدہ دار ناکارہ [illegible] وہ کام کے قابل نہیں ہے۔ ضعیفی [illegible] آپ کا تخیل ہے۔ جس کو ہرگز دل میں جگہ نہ دینا چاہیے۔ آپ کی تشفی کے لئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ وہ یہ بعض وقت سرکار عظمت مدار کے وظیفہ یاب عہدہ داروں کو ہماری سرکار بڑی بڑی ذمہ دارانہ خدمات عطا کرتی ہے حالانکہ وہ بھی پچپن سال پر اپنی خدمت سے وظیفہ پر علٰحدہ ہو چکے ہیں۔ اس لحاظ سے محض پچپن سالہ عمر انجام دہی کار کی مانع نہیں ہے۔

بہت سے ملازمین وظیفہ کے وقت متردد رہتے ہیں اور اکثر بوجہ کثرت اولاد فکرمند ہوتے ہیں کہ اب قرض کیونکر ادا ہوگا۔ بچوں کی پرورش اور لڑکیوں کی شادی کا کیا انتظام ہوگا۔ عموماً زمانہ ملازمت میں اخراجات کا لحاظ نہیں کرتے اور اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ پریشانی ہے۔ میرے تجربہ میں ان پریشان لوگوں میں مسلمان زیادہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ ابتدائے ملازمت سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک روز ہم کو ملازمت سے علٰحدہ ہونا ہے لیکن اس کو پیش نظر رکھ کر اپنے اخراجات کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اور ایک حصہ تنخواہ کا محفوظ نہیں کیا جاتا۔ اب تو سرکاری بیمہ میں بہت سہولت پیدا ہو گئی ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ علاوہ اس کے دوسری معتبر کمپنیاں بھی ہیں۔ اگر باقاعدہ کفایت شعاری کے ساتھ ایک مقررہ موازنہ پر عمل کیا جائے تو کافی بچت ہوگی اور کوئی منفعت بخش جائداد بھی وظیفہ تک خرید لی جا سکتی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کے پاس بہ لحاظ وظیفہ کافی آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن ان کو بھی اپنی علو مرتبت اعزاز کے جانے کا [illegible] رہتا ہے۔ ایک بڑے عہدہ دار جنہیں کئی بار توسیع مل چکی تھی وظیفہ کے قریب یہ کہتے تھے کہ [illegible]

[illegible] ایک مصیبت ہے۔ [illegible] قصبہ میں مکان بنا کر [illegible] آپ کسی معاملہ کو بڑا آدمی [illegible] سلام کرے اور یہ بھی ہے کہ [illegible] ایک دلی مسرت ہو کہ ہم ابھی تک برسر [illegible] بڑے شہر میں تو ہم کو کوئی پوچھے [illegible] ایسی شان و شوکت کے دلدادہ اور دوسرے [illegible] عہدہ داروں کے لئے تو حقیقت میں پچپن سال کی [illegible] سے کم نہیں۔

اگر ابتدائے ملازمت ہی سے اپنے کو خادم ملک [illegible] خدمت گزار رعایا سمجھیں بلکہ بالشان و شکوہ عمل کریں تو وظیفہ کے وقت آپ کی جدائی عام طور پر ناگوار رہے گی اور آپ ہر جگہ عوام میں ہر دل عزیز رہیں گے۔

بعض عہدہ دار بعد وظیفہ کے تلاش معاش میں سرگرداں رہتے ہیں ان میں سے کچھ تو اپنے اثرات و تعلقات کی بناء پر دو تین سال کے لئے مختلف ملازمتوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور بڑی تعداد میں باوجود کوشش کے ناکام رہتے ہیں۔ ان کوشش کرنے والوں میں سے بعض کمی آمدنی کو پورا کرنے کے لئے ملازمت کی جستجو کرتے ہیں اور چند ایسے بھی رہے جو اپنی بیکاری کو دور کرنے اور جو کچھ تھوڑی بہت حکومت [illegible] کو حاصل کرنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ مشکل سے سو میں ایک یا دو ایسے بھی نکلیں گے جو اپنی آمدنی پر قناعت کر کے اپنا وقت عبادت [illegible] و خدمت ملک و قوم کے لئے وقف کرتے ہیں۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ وظیفہ کے بعد گوشہ نشین بن جائیے اور کوئی کام نہ کیجئے۔ موقع ملے تو ضرور ملازمت کیجئے اور اپنی آمدنی میں اضافہ کیجئے۔

بعض وظیفہ یاب عہدہ دار تو غضب کرتے ہیں کہ باوجود بیماری و کمی بینائی و خرابی ہوش و حواس کے صرف طلب زر کی خاطر دوبارہ ملازمت کی تلاش میں رہتے ہیں

ایسی ذہنیت کے لوگ ملازمت حاصل کر کے اپنی عزیز عمر کو قبل از وقت ختم کر دیتے ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ ہر وظیفہ یاب دوبارہ ملازمت کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اور نہ ہر وظیفہ یاب کو ایسے مواقع ملتے ہیں۔ میرا روئے سخن عام وظیفہ یاب عہدہ داروں سے ہے ہر شخص کو اپنی صحت اور دوسرے حالات پر غور کر کے عمل کرنا مناسب ہے۔

حقیقت میں اصل کام کرنے کا وقت بشرط صحت وظیفہ کے بعد کا ہے۔ کیونکہ بچپن تو تعلیم حاصل کرنے میں صرف ہو جاتا ہے اور جوانی سے وظیفہ تک حصول تجربہ کے لئے وقف ہے۔ علم و تجربہ کے بعد عمل کا وقت وظیفہ کے بعد کا ہے جب کہ عقل پختہ اور تجربہ مکمل ہو جاتا ہے۔

وظیفہ کے بعد اگر حقیقت میں پچپن سال کی عمر ہے اور اوائل شباب و زمانہ ملازمت پاک و صاف گزرا ہے تو پھر اس کا لطف دیکھئے کیسے آرام و اطمینان سے آپ کی بقیہ عمر گزرتی ہے۔ اگر علم کا شوق ہو تو اس سے بہتر کونسا وقت مل سکتا ہے! تحریر و تقریر کے لئے بے فکری اور دلجمعی کی ضرورت ہے جو وظیفہ کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ زراعت و تجارت بہترین مشاغل ہیں۔ کچھ نہیں تو باغبانی صحت اور دل بہلائی کا خاص مشغلہ ہے۔ اگر خدا نے استطاعت دی ہو تو سفر کرنے میں لطف آئے گا۔ اور معلومات میں اضافہ ہو گا۔ بہرحال بیکاری سب سے بدتر ہے جو کچھ ہو سکے کیجئے اور اپنے کو مشغول رکھئے کیونکہ مشہور ہے کہ بیکار وظیفہ یاب بیماریوں کا شکار بن جاتے ہیں اور بہت جلد مر جاتے ہیں۔

بعض حضرات وظیفہ کا جز سرکار کو فروخت کر کے کچھ رقم لے لیتے ہیں۔ یہ نہایت نازک کام ہے۔ سوائے اشد ضرورت اور ناگزیر حالات کے ایسا سودا کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اگر عمر زیادہ ہوئی تو گھاٹے میں رہتے ہیں۔ ایک تو وظیفہ کے باعث نصف آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس پر

[illegible] تحریک سے کامیابی کی کوشش کے لئے پیش کرتا ہوں۔
[illegible] ان کی تکمیل اور

(یہ تقریر حیدرآباد ریڈیو سے نشر کی گئی)

سید محمد تقی

سویرا

بجھانے دیئے لگا ہے اب اس اندھیرے میں
کچھ ایسی دیر نہیں رہ گئی سویرے میں

وہ دور افق پہ سپیدی کا کھل رہا ہے نشاں
ہر ایک سمت سے آثارِ صبحِ نو ہیں عیاں

سسک رہے ہیں وہ تاریکیوں کے ہمراہی
سہم کے بیٹھ گئی راستے میں گمراہی

جو ظلمتوں میں چمکتے تھے ہو گئے بے نور
خود اپنا خونِ جگر پی گئی شبِ دیجور

نہ وہ شکار رہے اور نہ گھات میں صیاد
مٹا جہادِ مسلسل سے زندگی کا تضاد

جواں فضاؤں میں حل ہو گئے مثالِ شہاب
وہ مالکانِ زمیں غاصبانِ خانہ خراب

نئے اصول بنے ہیں نئے جہاں کے لئے
مئے حیات ہوئی عام این و آں کے لئے

عابدی

انوار :- حضرت علی اختر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور کائنات پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔
موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ سب رس کتاب گھر سے طلب فرمائیے۔

تصحیح :- سب رس فروری [illegible] میں پروفیسر سرور کی ایک نظم "عرضِ نیاز" شائع ہوئی تھی۔ اس کے ایک مصرعہ میں "موج" کی بجائے "نوح" شائع ہو گیا۔ صحیح مصرعہ یہ ہے۔ (بے آگ شعلے بے موج طوفاں) ادارہ

اپریل

اپریل کا مہینہ زندہ دلی کے مظاہروں کو لئے ایک زندگی کا پیام ہوتا ہے۔ قدیم روما والے اپریل کو اپریلس کہتے تھے جس کے معنی کھلنے کے ہیں۔ یہ نام انھوں نے غالباً اس لئے رکھا ہوگا کہ اس موسم میں کلیاں کھلتی ہیں۔ انگلستان کے پرانے باشندے اس کو ایسٹر کا مہینہ کہتے تھے۔ اس مہینے کی پہلی تاریخ کو اپنے قاصد ادھر ادھر بھیجنے کا رواج کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح کی سنت کے طور پر شروع ہوا۔ حضرت مسیح نے اپنے قاصد اسی دن ادھر ادھر بھیجے تھے۔ حضرت مسیح کی زندگی کا یہ واقعہ ازمنۂ وسطیٰ میں ایک اعجازیہ کا موضوع بنا رہا جو ایسٹر کی تقریب میں کھیلا جاتا تھا۔ اس مہینے کی پہلی تاریخ کو انجان لوگوں کے ساتھ مذاق کرنے اور ان کو بے وقوف بنانے کا رواج سارے یورپ میں عام ہو گیا۔ معلوم نہیں اس کی ابتدا کب ہوئی۔ باور کیا جاتا ہے کہ انگلستان اور جرمنی والوں نے فرانس کی تقلید میں پہلی اپریل کی تقریب منانا شروع کی۔ فرانس میں جو لوگ پہلی اپریل کو بیوقوف بنائے جاتے ہیں ان کو "اپریل کی مچھلی" کہا جاتا ہے۔ انگلستان میں انھیں "اپریل کا بیوقوف" سمجھا جاتا اور اسکاٹ لینڈ میں "گوک"۔ انگلستان میں سب سے زیادہ عام مذاق جو اس دن کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کو بے وقوفانہ کام پر لگا دیا جائے یا کسی سے ملاقات کا تصفیہ کرکے ملاقات نہ کی جائے یا پھر کسی راستہ چلنے والے سے کہا جائے کہ اس کے چہرے پر مکھی بیٹھی ہے یا کیچڑ لگی ہوئی ہے اور جب وہ کیچڑ صاف کرنے یا مکھی اڑانے کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو سب چلاتے ہیں "اپریل کا بے وقوف"۔

یورپ والے بہت مصروف زندگی بسر کرتے ہیں اس لئے انھوں نے مذاق اور بے وقوفی کے لئے ایک دن مقرر کر لیا۔ بے روزگاری اور فرصت نے ہندوستان کو بے وقوف بنا رکھا ہے اور ہندوستانیوں کی زندگی کو مذاق۔ اس لئے ہمارے ملک میں مذاق اور بے وقوفی کی وجہیں کہیں زیادہ ہیں۔ ہم میں سے ہزاروں روزانہ بے وقوف بنتے ہیں اور اپنی بے وقوفی کو مذاق سمجھ کر ٹال دیتے ہیں۔ غرض ہماری زندگی کا ہر دن "پہلی اپریل" ہے۔ بیروزگاری اور فرصت کے سلسلے میں یہ کہنے دیجئے کہ بیروزگاری ایک صلاحیت ہے جو کام کرنے والوں کو شکست خوردہ بنا دیتی ہے اور فرصت ایک وقفہ ہے جو جھونپڑی میں محلوں کے خواب دکھاتا ہے۔ ہماری زندگیوں سے اگر شغل کی آہ اور فرصت کی واہ کو نکال دیا جائے تو سہرا خواب و خیال کی دنیا ختم ہی ہو جائے گی۔ خیر تو جب تک ہمارے ملک پر یورپ کی تہذیب کا اثر نہیں پڑا تھا۔ "اپریل" کو منانا تو ایک طرف سمجھا ہی نہیں گیا تھا۔ لیکن مشرق کے لئے جب سے مغرب نے اپنے آپ میں کشش پیدا کر لی ہے ہم میں سے بعض لوگ اس رسم میں شریک ہو گئے ہیں۔ کیا برا ہے اگر اس بہانے دل میں ایک لہر اٹھے۔ اور ہونٹوں پر ایک تبسم آئے۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ مذاق مذاق میں فرق ہے۔ اگر سرکس کے مسخرے کی طرح ہم قلابازیاں لگانے لگیں تو یہ ایسا ہی مذاق ہوگا جیسے ہندوستانی فلم کے ہیرو کی فراق دوست میں سنجیدگی۔ جب تک تمسخر اور مذاق میں فرق نہ کیا جائے گا قہقہوں سے منہ بگڑتے رہیں گے، ہونٹوں پر تبسم نہیں آئے گا۔ قہقہے تو ڈگڈگی بجا کر اور بندر نچا کر ہر مداری وصول کر لیتا ہے لیکن سچی مسکراہٹ کو دل سے ہونٹوں پر کھینچ لانا آسان کام نہیں۔ دل کو ہنسانے کے لئے ایک پاکیزہ مذاق کی ضرورت ہے اور مذاق کی پاکیزگی اپنے اطراف نازک حدیں رکھتی ہے۔ ذرا ان حدوں سے نکلے اور مذاق کرکرا ہو گیا۔

یہ تو ہوا مذاق۔ آئیے بے وقوفی کے متعلق بھی کچھ سن لیجئے۔ بیوقوفی جو کچھ بھی ہو لیکن بے وقوف بنانے والوں سے زیادہ بے وقوف بننے والوں کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ بے وقوف بنانے والوں کا فرض صرف یہی ہے کہ وہ بے وقوف بناتے وقت خود بیوقوف نہ بن جائیں۔ لیکن بے وقوف بننے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ بے وقوف نہیں۔ محسوس کریں لیکن اپنی بے وقوفی کو

[illegible] بے وقوف ایسے ہیں جو بے وقوف [illegible] "عقلمند بے وقوفوں" کی [illegible] ایک کو بے وقوفی کا احساس ہوتا ہے [illegible] کر دوسروں کو بے وقوف بنانا چاہتا ہے [illegible] کو بے وقوفی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ [illegible] عقل مندی کی سند سمجھتا ہے۔ عقلمند بے وقوف [illegible] دنیا میں ہزاروں طرح کے مستقل بے وقوف ہوتے ہیں۔ ایک بے وقوف تو وہ ہے جس کو "روشنی طبع" بے وقوف بنا دیتی ہے اور وہ ہر دوسرے شخص کو اپنے مقابلے میں بے وقوف سمجھتا ہے۔ ممکن ہے دنیا ایسے بے وقوفوں سے کسی دور میں خالی نہیں رہی ہو۔ لیکن موجودہ دور جس طرح پروپگنڈے کا دور ہے اسی طرح سے روشن طبع بے وقوفوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اگر سارے عقلمند کا نفرنسیں منعقد کرنا جلوس نکالنا نعرے لگانا اور قرار دادیں منظور کرنا چھوڑ دیں تو دنیا اتنی بے وقوف نہ رہے جتنی کہ اب ہے۔ خیر ایک بے وقوف وہ ہے جس کی بے وقوفی محض جاہلیت یا کم علمی ہوتی ہے۔ جب تک اس کے دیوان خانہ میں سند نہ ٹنگے کالج کی تعلیم جب تک درخواستوں کے ساتھ منسلک نہ ہو اور درخواستیں جب تک "بشرف ملاحظہ" سے شروع ہو کر "واجب تھا عرض کیا" پر ختم نہ ہوں اس کی بے وقوفی میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ عقل کی پیمائش سند کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک بے وقوف وہ ہے جو بے وقوف بنانے کے لئے بے وقوف بنا پھرتا ہے۔ لوگ اسے بیوقوف سمجھ کر خود بے وقوف بنتے ہیں اور وہ بے وقوفی سے اپنے سارے کام نکال لیتا ہے۔ فقیر اپنے آپ کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر روتا ہے۔ "ایک پیسہ لوں گا ہزار گنا دوں گا۔" ہم اسے پیسے دیتے ہیں۔ لیڈر کہتا ہے "ساری دنیا خطرے میں" اور ہم اس کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ ایک بے وقوف وہ ہوتا ہے جس کو ساری دنیا عقلمند کہتی ہے۔ یہ بے وقوف "لال بجھکڑ" قسم کا ہوتا ہے اور لال بجھکڑ کے قسم کا کام کرکے عقل مند مشہور ہو جاتا ہے۔ ایک بھینس نے اپنا سر ایک مٹکے میں پھنسا لیا تھا۔ گاؤں والے پریشان ہوئے کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک ہی حل تھا اور وہ "لال بجھکڑ" کی مدد لینا۔ چنانچہ لال بجھکڑ کو صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کیا گیا۔ لال بجھکڑ نے اپنی تدبیر سے فوراً مشورہ دیا کہ پہلے تو بھینس کی گردن کاٹ ڈالی جائے۔ اس طرح بھینس کا سر نکل جائے گا۔ اب رہ گیا سر تو اس کے لئے پتھر سے مٹکا پھوڑ دیا جائے۔ ہاں تو اس قسم کے بے وقوف کی مدد سے ہر مسئلہ ایک نیا مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ اور مسائل کے ہجوم میں وہ ایک عقلمند کی طرح اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ ایک بے وقوف وہ ہے جس کو حالات بے وقوف بنا دیتے ہیں۔ حالات سے بنے ہوئے بے وقوفوں میں سب سے زیادہ دلچسپ ماضی کو پوجنے والا ہوتا ہے۔ وہ ماضی میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ حال اس کے آنسوؤں میں بہہ جاتا ہے۔ اور مستقبل تو دھندلی نگاہوں کو دکھائی ہی نہیں دیتا۔ حال کا بے وقوف خود فراموش ہوتا ہے۔ اسے اپنی بھی خبر نہیں ہوتی۔ خود کو دھوکہ دیتا ہے۔ دوسروں کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ اس طرح بعض وقت بے حال اور بعض وقت بحال ہو کر حال کو بے مصرف بنا دیتا ہے۔ مستقبل کا بے وقوف سراب کے پیچھے دوڑتا ہے۔ دن کو خیال اور رات کو خواب اس کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ یہ شیخ چلی کی طرح ہوائی قلعے بنانے میں زندگی بسر کر دیتا ہے۔ ایک بے وقوف وہ ہوتا ہے جسے مطلبی بے وقوف کہہ سکتے ہیں۔ یہ بے وقوف گربۂ مسکین بن کر آستینوں میں سانپ کی طرح کھیلتا ہے۔ اور جب مطلب نکل جاتا ہے تو شیر کی طرح جھپٹ کر اپنی بے وقوفی کا خراج وصول کر لیتا ہے۔ ایک بے وقوف وہ ہوتا ہے جس کو بے وقوفی سے فطری مناسبت ہوتی ہے۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اپنی بے وقوفی کے مظاہرے کرتا ہے اس کی بیوقوفی اکثر

لوگوں کا بھی بلاق ہے۔ اور بعض وقت نقصان کرتی ہے۔
غرض دنیا میں ہر طرح کے ہزار بے وقوف ہیں آپ
سوچیں یا نہ سوچیں، میں تو اکثر یہ سوچتا ہوں کہ میرا شمار
بے وقوفوں کے کس گروہ سے ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں
کہ میں اگر اپنے آپ کو بے وقوف نہ سمجھوں تو دوسرے
بھی مجھے بے وقوف نہ سمجھیں۔

ان سب سے علیحدہ ایک ان بے وقوفوں کا گروہ
ہے جس میں عقلمند سے لیکر بے وقوف تک سب نظر آتے ہیں۔
ان اصحاب کو پہلی اپریل کی خوشی میں حماقت کرنے پر مجبور
کیا جاتا ہے۔ مجھے کیا آپ کو بھی ہمدردی ہے ان تمام
جنھوں نے اس مہینے کی پہلی تاریخ کو دھوکے میں کوئی نہ
کوئی حماقت کی۔ جھنجلائے اور پہلی اپریل کے خیال سے
ہنسنے لگے۔ اور میری کیا آپ کی بھی مبارکباد ان لوگوں کے لئے
جنہوں نے دوسروں کو بے وقوف بنانے میں کامیابی
حاصل کی اور خود بے وقوف نہیں بنے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنگ کے زمانہ میں ہنسی
اور مذاق کا کوئی موقع نہیں ہے لیکن بے وقوفی ہر شکل
صرف ایک ہی رخ کی کوشش کرتا ہے [illegible]
ہے بے وقوفی اور سنجیدگی سے مذاق بھی پیدا ہو سکتا ہے۔
اطالیہ نے مذاق سمجھ کر ایک کام کیا نتیجے میں پہنچ [illegible]
جرمنی جنگ کی دنیا میں کئی دفعہ بے وقوفیاں کر چکا ہے لیکن
ہر بے وقوفی کو مذاق سمجھ کر پی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ
یہ بے وقوفی ہی آخر میں عقلمندی کو شکست دینے والی ہوگی اور
دنیا آمریت کے احمقانہ مظالم سے چھٹکارا پاکر رہے گی۔

میکش

گریہ و تبسم: صاحبزادہ میکش کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام قیمت (عا)

محبت کی چھاؤں: مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العین معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع ۱۳۲ صفحات قیمت مجلد عہ

کاغذ کی ناؤ: صاحبزادہ میکش کے مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے جن میں غریبوں کی زندگی کے عکس ہیں ہر ڈرامہ تمثیلی کرداروں کو پیش کرتا ہے اور تقریباً تمام تمثیلی کردار غریبوں کے مسائل حیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان ڈراموں میں تمثیل نگار کی روح کی تڑپ اور دل کی دھڑکن اپنے حقیقی جذبات کو لفظی پیکر پہنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ طرز بیان انتہائی سادہ اور شگفتہ ہے۔ صفحات ۱۴۰ قیمت ۸؍

[illegible] خزاں چمن پہ غضب — ہے چمن پھر بھی اک جہانِ طرب
[illegible] ہی دستی — زر بکف غنچہ اس میں پھوٹا کب
[illegible] بیدِ لرزاں میں — ہمسری کا نہیں ہے کوئی سبب
[illegible] و نہالِ باغِ خدا — ہیں ایک ان ہی قدوں کا نصب
گرد آلود تاک سے جیسے — چمک اٹھی جبیں طلا زر جب
[illegible] نے پیتل کو کیسا سونا! — خود کھلونا ہے طفلکِ کتب
فرق بہ اصل و پاک گوہر میں — کیوں دکھائیں نہ بلبل و عقرب

ہیں شریف و رذیل ایسے ہی
منظرِ لطف و رونمائے غضب

(۲)

آدمی آدمی نہیں یکساں — گرچہ فی الاصل آدمی ہیں سب
کر کے سب سے برابری کا سلوک — دل میں پچھتائے جا رہا ہوں اب
ہم محلہ ہیں میرے شیخ گھرو — نام سے ہے عیاں وقارِ نسب
بھائی! آداب عرض کرتا ہوں — خود کہا میں نے ان کو دیکھا جب
[illegible] کی نہیں انھوں نے کبھی — گرچہ میرا عمل تھا درسِ ادب
[illegible] مجھے خیال آیا — آخر اس پر سرکشی سے کیا مطلب
میں جو چپ آج ہو گیا عمداً — چل دیئے شیخ جی بھی مہر بہ لب

کیا قیامت ہے اے علی منظور
ہیں گھرو صاحب تک سلام طلب

سید علی منظور

[illegible] ہے اور تھا اور صاحب عالیشان [illegible] صاحب کہلاتے ہیں۔

تم

تم وہ دل پہ لگا ہے کہ دکھائے نہ بنے
اور چاہیں کہ چھپائیں تو چھپائے نہ بنے

تم میری زندگی میں بہار بن کر آئے۔ قرار بن کر دل کی اجڑی بستی آباد کی۔ اب جبکہ تم رگ رگ میں سما چکے ہو مجھے بسمل کی طرح تڑپا رہے ہو۔ تم میرے درد سے لاپروا میری تڑپ سے بیگانہ ہو گئے ہو ——— آرزو تو یہ تھی تم کو آنکھوں کا نور دل کا سرور بنا کر رکھتی۔ اپنی زندگی کے چند روز تمہارے سایہ میں چین سے گزارتی۔ میرا دم تمہارے قدموں پر نکل جاتا اور میری زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا۔ لیکن فلک کج رفتار کو یہ منظور نہ ہوا ——— میں نے آفتاب کا طلوع بھی دیکھا اور غروب بھی۔ مگر زندگی کا روشن پہلو ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہا۔ میں غروب کا مقصد نہ سمجھ سکی۔ کاش انسان پہلے اپنے انجام کو سوچ لے۔ لیکن۔ تم نے مجھے سوچنے کا موقع بھی نہ دیا۔ شاید یہی میری تباہی کا باعث ہوا۔ ہر عروج کے ساتھ زوال اور بدر کے ساتھ ہلال ہے ——— لیکن میں اپنی منزل پر پہنچ بھی نہ سکی ——— پہلی ہی سیڑھی پر خزاں نے مجھے لوٹ لیا۔ اب اس کا گلہ کس سے کروں خدا سے ——— یا ——— بندہ سے ——— تمہاری محبت میرے دل ہی نہیں جان کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے ——— اب یہ جان کے ساتھ ہی جائے گی ——— مگر یہ جان بھی بہت سخت اور کٹھن ہے ——— نہ نکلتی ہے نہ چین لینے دیتی ہے ——— یہ تھا محبت کا آغاز ——— اور یہ انجام ہے ———

ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی تجھ کو
ہائے اس دردِ محبت کو چھپاؤں کیونکر

م۔ح۔ب

غزل

تو اور تیری عبادت گاہیں
منزل ایک ہزاروں راہیں
اٹھتیں ایسی کس کی نگاہیں
تھم گئے آنسو رک گئیں آہیں
کیا جانیں بے چاری نگاہیں
دل کو دل سے ہوتی ہیں راہیں
دل میں شوقِ منزل لیکر
چلتا ہوں، بنتی ہیں راہیں
کون خطا کارِ الفت ہے؟
میرا دل یا تیری نگاہیں؟
پھر کیا ہے معیارِ الفت
چاہنے والے کیونکر چاہیں
شاید دل پر آنچ ہے آئی
آگ لگاتی نکلیں آہیں
درد کا ناممکن نہیں درماں
ہو سکتا ہے آپ جو چاہیں
غم کا مداوا، دل کی تسلی،
چند تبسم، چند نگاہیں
ہر ذرہ ہے حسن بداماں
کس کو چاہیں کس کو نہ چاہیں؟
ٹوٹی امیدوں کے ہیں نظارے
جلتے آنسو، ٹھنڈی آہیں
پیہم نقشِ پا کا تسلسل
پیدا کر دیتا ہے راہیں

دامودر فوگی شاکر

پس اندازی کی اہمیت

[illegible] کے متعلق یہ اکثر سننے میں آتا ہے کہ وہ اپنی بات پر بہت کم قائم رہتے ہیں اور بار بار اپنی [illegible] لوگوں کو ضروریات پر آمدنی کا زیادہ سے زیادہ حصہ صرف کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور کبھی [illegible] زیادہ سے زیادہ پس اندازی کی تلقین کرنے لگتے ہیں۔ ماہرین کی رائے میں اس قسم کی تبدیلی [illegible] سے پیدا ہوتی ہے۔ کساد بازاری کے حالات میں صرف میں اضافہ روزگار میں اضافہ [illegible] ہوتا ہے کہ کساد بازاری کے برے اثرات کو جلد دور کیا جا سکتا ہے۔ جنگی معیشت کا [illegible] مقصد دشمن کے خلاف فتح پانا قرار پاتا ہے اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل جنگ [illegible] کی ضروریات کو پورا کرنے پڑتے ہیں۔ اگر عوام اپنے صرف میں کمی نہ کریں تو حکومت آسانی سے ان وسائل کو حاصل نہیں کر سکتی۔ اس لئے صرف میں کمی اور پس اندازی کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

[illegible] کے دوران میں حکومت کے مصارف کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ ان مصارف کی پابجائی کئی مختلف [illegible] سے کی جاتی ہے۔ ان طریقوں کو اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عوام اپنے صرف میں کمی کریں۔ [illegible] قسم کے محاصل میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور نئے نئے محاصل عائد کئے جاتے ہیں۔ لیکن قوم میں محاصل [illegible] برداشت کرنے کی صلاحیت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر جنگ کے تمام کے تمام مصارف محاصل کے ذریعے سے پورے کئے جائیں تو معاشرہ پر اس کے برے اثرات پڑتے ہیں اور اس لئے حکومتیں محاصل میں [illegible] اضافے کے ساتھ ساتھ عوام اور اداروں سے زیادہ سے زیادہ قرضے حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔ حکومت کو قرض دینے والے اشخاص ضروریات کو ملتوی کر کے صرف میں کمی کرتے ہیں۔ عام طور پر حکومتیں قرضے کے اختیاری طریقے کو پسند کرتی ہیں۔ حکومت قرضے لینے کا اعلان کر دیتی ہے اور عوام کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ چاہیں تو قرضہ دیں۔ کسی قسم کا جبر نہیں کیا جاتا۔ البتہ اخباروں، سینما، اشتہارات اور جلسوں کے ذریعے سے جنگ کے دوران میں لوگوں کے قومی جذبات کو ابھار کر صرف میں کمی کرنے اور حکومت کو قرض دینے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ شہروں اور دیہات میں پس اندازی کے ہفتے منائے جاتے ہیں اور عوام کی طرف سے پس اندازی کی مہم کو منظم کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ راتب بندی اور بعض دوسرے معاشی کنٹرول (مثلاً خانگی سرمایہ کاری پر حکومت کا تسلط) قائم کر کے افراد کو صرف میں کمی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ [illegible] محسوس کیا گیا ہے کہ قرضے حاصل کرنے کے صرف اختیاری طریقے کو اختیار کر کے کم آمدنی پانے والے اشخاص کو قرضے دینے کی ترغیب نہیں دلائی جا سکتی۔ اگر ان کے صرف میں کمی نہ کی گئی تو آمدنی بڑھنے کی وجہ سے یہ لوگ اشیا کی محدود مقداروں کو خریدنے کی کوشش کریں گے جس کا لازمی نتیجہ قیمتوں کا بڑھنا اور افراط زر کے برے اثرات پیدا ہونا ہوگا۔ انہی حالات کو روکنے کی غرض سے انگلستان کے مشہور ماہر معاشی لارڈ کینیس نے موجودہ جنگ شروع ہونے کے چند مہینوں کے بعد لازمی پس اندازی کی ایک اسکیم پیش کی تھی۔ شروع کے دو سالوں تک حکومت برطانیہ اور برطانوی عوام نے جن کے مفاد کی خاطر اصل میں یہ اسکیم تیار کی گئی تھی، اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی لیکن دو سال بعد حالات نے مجبور کیا کہ اس کو اختیار کیا جائے۔ [illegible] کم آمدنی پانے والے اشخاص بھی لازمی طور پر اپنی آمدنی کا ایک خاص فی صد حکومت کو بطور قرض

[illegible] دیتے ہیں جب تک جنگ جاری ہے قرض دینے والوں کو سود ملتا رہے گا اور جنگ کے ختم کے وقت پر ان قرضوں کی رقم واپس کی جائے گی۔

دوسری حکومتوں کی طرح حکومت ہند کے مصارف بھی جنگ کی وجہ سے کئی گنا بڑھ گئے ہیں واقعہ یہ ہے کہ حکومت ہند نے اپنے مصارف کو بڑی آسانی سے پورا کر لیا ہے۔ اس سلسلہ میں [illegible] مختلف طریقوں سے اختیاری اور لازمی قرضے لئے گئے ہیں۔ حکومت ہند کے [illegible] کے باوجود اتحادی اقوام کی جنگی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے افراط زر کی پالیسی اختیار کرنی پڑی۔ جس کی وجہ سے زر کی مقدار بڑھی اور ہندوستانی معاشرہ کو افراط زر کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ حیدرآباد کی معیشت چونکہ برطانوی ہند کی معیشت سے بالکل جدا نہیں ہے اس لئے یہاں افراط زر کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ حالی روپے کی مقدار میں اتنا زیادہ اضافہ نہیں ہوا ہے جتنا کہ کلدار کی مقدار میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت سرکار عالی کے موازنہ میں توازن قائم کرنے کا مسئلہ کوئی بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس جنگی حالات کی وجہ سے حکومت کی آمدنی جنگ سے پہلے کے مقابلہ میں تقریباً دوچند ہو گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سال کے مالیہ میں تین کروڑ کی بچت کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ ہمارے یہاں سب سے اہم مسئلہ افراط زر کے حالات کو روکنا اور اس کے اثرات سے معاشرہ کے مختلف طبقات کو محفوظ رکھنا ہے۔ اس کے لئے پچھلے سال زائد منافع پر محصول عائد کیا گیا تھا۔ یہ محصول اس سال کے مالیہ میں بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ یہاں اس کا تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محصول زائد منافع کے سلسلے میں جو بھی رقم وصول کی جائے گی اس کا ایک خاص فی صد جنگ کے بعد ادا کرنے والے اداروں اور افراد کو واپس کر دیا جائے گا۔ تاکہ جنگ کے بعد کساد بازاری کے حالات میں واپس شدہ رقم سے کاروبار کی حالت کو سدھارنے میں مدد مل سکے اس طرح سے انھیں لازمی طور پر پس انداز کرنے کے لئے مجبور کیا گیا ہے۔ کم آمدنی پانے والے اشخاص کو ترغیب دلانے اور سہولت پہنچانے کی خاطر حکومت سرکار عالی کی طرف سے (Cash Certificates) جاری کئے جاتے ہیں اور بنک اور دوسرے اداروں کے لئے سرکاری ہنڈیوں کے طریقے کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی آمدنی کا ایک حصہ لازمی طور پر حکومت کے پاس بطور امانت جمع کیا جائے۔ ان امانتوں پر دو فی صد سالانہ سود دیا جائے گا اور یہ امانتیں پانچ سال کے بعد یا جنگ ختم ہونے کے ایک سال کے بعد واپس کی جائیں گی۔ لازمی پس اندازی کی اسکیم کے تحت افراد اور کمپنیوں سے ایسی آمدنیوں کا ایک خاص فی صد بطور امانت طلب کیا جائے گا جو محصول زائد منافع سے مستثنیٰ ہوں۔ چھ ہزار سالانہ یا اس سے کم آمدنی پانے والے اشخاص پر اس اسکیم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ جن اشخاص کی آمدنی چھ ہزار سے بارہ ہزار روپے سالانہ ہے انھیں دقتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے خاص طور پر گنجائش رکھی گئی ہے۔ اگر وہ بیمہ یا پراویڈنٹ فنڈ میں اپنی آمدنی پر ادا شدنی امانت کی شرح کے دوچند سے زائد قسطیں دیتے ہوں تو ان سے امانت کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ جیسے جیسے آمدنی میں اضافہ ہوگا آمدنی کا زیادہ فی صد لازمی پس اندازی کے سلسلے میں دینا پڑے گا۔

[illegible] اسکیم کو نافذ کرکے حکومت سرکار عالی نے بالکل صحیح اقدام کیا ہے [illegible] صنعتی کے علاوہ طبقے پر محصول آمدنی یا انکم ٹیکس عائد نہیں کیا گیا ہے ۔ [illegible] روپے ماہانہ سے زیادہ آمدنی پانے والوں کے لئے لازمی پس اندازی کی [illegible] کم تنخواہ والوں کے لئے اس قسم کی کوئی اسکیم جاری نہیں ہوئی ہے ۔ یہ طریقہ صحیح [illegible] اسکیم کم تنخواہ والوں کے لئے انگلستان جیسے ملک میں زیادہ آسانی اور کامیابی سے چلایا [illegible] ملک کے حالات میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے یہاں مزدور طبقہ کے لئے لازمی [illegible] کرنا کرنے میں بہت سی دقتیں پیدا ہوں گی ۔ کمرشیل صنعتوں کے لئے مزدور اور زرعی [illegible] اس کے دائرہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا البتہ بعض منظم صنعتوں کے مزدوروں کو جنگی [illegible] شکل میں انعام یا Bonus تقسیم کرکے لازمی قرضے ادا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے ۔

زرعی طبقے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اس وقت کے حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنی زائد آمدنی [illegible] جمع کرے تاکہ اس وقت کی پس اندازی ہوئی دولت جنگ کے بعد کی ضروریات اور زمین کی ترقیات وغیرہ پر صرف کی جا سکے گی ۔ اس وقت یہ دیکھا جا رہا ہے کہ زرعی طبقہ اپنی خوشحالی کا [illegible] شادی وغیرہ پر بہت زیادہ صرف کر رہا ہے ۔ یا پھر یہ لوگ اپنی زائد آمدنی سے سونا [illegible] خرید رہے ہیں ۔ ان کے لئے اس طرح سے اپنی آمدنی کو خرچ کرنا کسی طرح سے بھی مفید نہیں ہے اس وقت سونا اور چاندی کی قیمت دوسری چیزوں کی طرح کئی گنا بڑھی ہوئی ہے اور یہ ایک لازمی [illegible] ہے کہ معمولی حالات میں ان کی قیمت موجودہ قیمت کی نصف اور تہائی بھی نہ رہے گی ۔ اس لئے اپنی رقم کو ایسی چیزوں کی خریداری پر جن کی قیمت گرنے والی ہے، صرف کرنے میں سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہیں ۔ زرعی طبقے کے لئے لازمی پس اندازی کو اس طرح سے اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت لیوی کے طور پر غلہ ان سے وصول کیا جا رہا ہے اس کی قیمت پوری کی پوری اس وقت ادا نہ کی جائے بلکہ اس کا ایک خاص حصہ مختلف طریقوں سے حکومت کی تمسکات میں لگا دیا جائے بقیہ قیمت کے بدلے میں یہ تمسکات کاشتکاروں کو دیدی جائیں ۔ یہاں اس بات کا تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زرعی اجناس کی قیمت کا تعین کرتے وقت ان کے مصارف پیدائش کا بھی خیال رہے ۔ کاشتکار کو معقول قیمت ملے تاکہ وہ منافع کمانے کے قابل ہو سکے ۔ زرعی طبقے کو اختیاری پس اندازی کی ترغیب بھی مختلف طریقوں کو اختیار کرکے دلائی جا سکتی ہے ۔ یہ لوگ جاہل ہونے کی وجہ سے حالات سے واقف نہیں ہوتے ۔ پروپیگنڈا کرکے یہ چیز واضح کی جائے کہ اس وقت خرچ میں زیادہ فائدہ نہیں الٹا نقصان ہے ۔ [illegible] اندازی ہی موجودہ حالات میں ان کے لئے بہتر ہے ۔ ان کے لئے ڈاک خانہ کے سیونگ بنک میں سہولتیں [illegible] سے کچھ زیادہ کام نہیں لئے گئے اس سلسلے میں انجمن ہائے امداد باہمی سے بہت مفید کام لیا جا سکتا ہے ۔ یہ انجمنیں ایسے کھاتے کھولیں جن میں کاشتکار اپنی رقم اس شرط کے ساتھ جمع کرے کہ یہ رقم جنگ کے ختم ہونے کے بعد ہی واپس کر دی جائے گی ۔ امریکہ میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ بعض چیزوں کی قیمتیں اقساط کی شکل میں جنگ کے دوران میں ادا کر دی جائیں گی اور جنگ کے اختتام پر رقم ادا کرنے والوں کو چیزیں ملیں گی اس طریقہ کو

حیدرآباد میں زمیں طبقے کے لئے بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ کاشتکار اپنی اپنی [illegible] میں چاندی [illegible]
خریدنے کے لئے اقساط ادا کرتے رہیں اور جنگ کے ختم ہونے پر انھیں ان کی مطلوبہ چیزیں فراہم کی [illegible]

ایسے لوگ جن کی آمدنی پانچ سو روپیہ ماہوار سے کم ہے انھیں بھی پس انداز کرنے کی ترغیب دلائی [illegible]
اس کا بہترین طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ پروپگنڈے کے موزوں طریقے اختیار کر کے سیونگس بنک میں انھیں اپنی
رقمیں جمع کرنے کا مشورہ دیا جائے اور یہ رقمیں جنگ کے دوران میں واپس نہ کی جائیں بلکہ جنگ کے ختم
ہونے پر ادا کی جائیں۔ اس سے بھی کہیں زیادہ مفید طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کے بیمہ کی افادیت کا چرچا
زیادہ سے زیادہ کیا جائے۔ اب تک تعلیم یافتہ طبقے نے بیمہ کے فوائد کو صحیح طریقے پر سمجھنے کی کوشش نہیں
کی ہے اور اس لئے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاتا اور بہت سے ایسے اشخاص
جن کی آمدنی اچھی خاصی ہوتی ہے اپنی اولاد کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑتے۔ حکومت سرکار عالی نے سرکاری
بیمہ کا طریقہ رائج کیا ہے لیکن اس سے بھی جو فائدہ اٹھایا جاتا ہے وہ خاطر خواہ نہیں۔ سرکاری ملازمین صرف
تکمیل ضابطہ کی خاطر اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بیمہ کے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ وسعت
دی جائے تاکہ لوگوں میں پس اندازی کی عادت پیدا ہو۔

اب تک لازمی اور اختیاری پس اندازی کے جو طریقے بیان کئے گئے ہیں ان کا معاشرہ کے نقطۂ نظر
سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ حکومت صرف مالدار اور سرمایہ داروں ہی کی مقروض نہیں رہے گی بلکہ دوسرے طبقات بھی
قومی قرضے کے مالک بن جائیں گے اور حکومت کے مالیاتی استحکام میں مختلف افراد اور طبقات کی دلچسپی بڑھ
جائے گی۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ کم آمدنی پانے والا اور متوسط الحال طبقہ گرانی کی وجہ سے
ویسے ہی پریشان ہے۔ اگر اسے پس اندازی پر مجبور کیا جائے تو اس کی مشکلات میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا
لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ پس انداز نہ کرنے سے حالات اور زیادہ ابتر ہو جائیں گے جب
ہر شخص یہ کوشش کرے گا کہ اشیاء جو حکومت کی خریداری کے بعد محدود مقدار میں باقی رہ گئی ہیں
ان کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر خریدے تو اس کا لازمی نتیجہ چیزوں کی قیمت کا بڑھنا اور افراط زر کے حالات
میں شدت کا پیدا ہونا ہوگا۔ افراط زر سب سے زیادہ غریب طبقہ کو متاثر کرتا ہے۔ سرمایہ داروں اور مالداروں
کو منافع کمانے کے اور مواقع پیدا ہو جاتے ہیں دولت کی تقسیم میں عدم مساوات بڑھ جاتی ہے۔ مزید برآں
اس وقت جب کہ روپے کی قدر صرف پانچ یا چھ آنے کے برابر رہ گئی ہے چیزوں کو خریدنے میں نقصان ہے
جنگ کے بعد جب کہ حالات میں دوبارہ توازن قائم ہو جائے گا اور روپیہ اپنی اصلی قدر پر آ جائے گا اس وقت
روپیہ صرف کر کے زیادہ مقدار میں چیزیں حاصل کی جائیں گی۔ غرض پس اندازی اور کفایت شعاری خود
عوام کے نقطۂ نظر سے بھی بہت زیادہ مفید ہے اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ بھوکے مر کر پس انداز
پس انداز کریں۔ کہنے سے یہ مراد ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنی ضروریات ملتوی کریں، سفر کم کریں۔ دعوتیں
کم دیں اور رسومات اور شادیوں وغیرہ پر زیادہ صرف نہ کریں۔ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے
کام لیں اور ایسی ضروریات جن کو ملتوی کیا جا سکتا ہے ملتوی کر دیں۔ جنگ کے بعد اپنی ضروریات کی
تکمیل کم روپیوں سے کی جا سکے گی۔ اس وقت پس انداز کی ہوئی دولت سے جنگ کے بعد زیادہ مقدار میں

[illegible] معیار زندگی کو بہتر بنایا جا سکے گا۔ اب جو کارخانے جنگی ضروریات کی چیزیں [illegible] جنگ کے بعد عوام کی ضروریات پوری کرنے والی اشیا تیار کریں گے۔ چیزوں کی [illegible] ظاہر ہے کہ وہ سستی بھی ہوں گی۔ اس وقت محنت کی کمائی کو کام میں [illegible] حاصل ہوگا۔ غرض اس وقت کفایت شعاری اور پس اندازی افراد اور حکومت دونوں کے نقطۂ نظر سے مفید ہے۔

[illegible] پس اندازی کے فوائد صرف جنگ کے دوران ہی تک محدود نہیں ہیں جنگ کے ختم ہونے پر پس اندازی اور کفایت شعاری کے اور بھی بہتر نتائج پیدا ہوں گے۔ حیدرآباد میں معاشی منصوبہ بندی (جس کا مرکزی مقصد عوام کا معیار زندگی بلند کرنا ہے) کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہوگی اور یہ سرمایہ جنگ کے دوران میں پس اندازی ہوئی دولت سے حاصل کیا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ جنگ کے بعد لوگوں کی قوت خرید میں کمی روزگار میں کمی کی وجہ سے ہوگی۔ لیکن اس کمی کی تلافی ایک حد تک پس انداز کی ہوئی دولت سے کی جا سکے گی اور کساد بازاری (جو جنگ کے بعد عموماً پیدا ہوتی ہے) کے حالات کو روکا جا سکے گا۔ اس طرح سے سرمایہ اور قوت خرید کی کمی کو جنگ کے دوران میں بچائی ہوئی دولت کے ذریعے سے دور کیا جا سکے گا اور ملک کی صنعتی ترقی میں مدد ملے گی۔ جنگ کے دوران میں بچانے اور مختلف قسم کے کاروبار میں لگانے کا ایک اور بڑا فائدہ بھی ہوگا۔ اب تک سرمایہ کے مالک صرف چند مالدار طبقات رہے ہیں اور انہی کی دولت میں مزید اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جب چھوٹی چھوٹی بچتیں کرنے والے اپنے سرمایہ کو مختلف کارخانوں میں لگائیں گے تو وہ بھی کارخانوں کے حصہ دار بن جائیں گے اور اس طرح سے معاشرہ کے لئے اچھے اثرات پیدا ہوں گے، دولت کی تقسیم عدم مساوات میں کمی ہو جائے گی۔ جنگ کے دوران میں افراط زر کے اثرات کو روکنے اور جنگ کے بعد صنعتی ترقی کے لئے پس اندازی بہت ضروری ہے جب تک ملک میں صنعتی ترقی نہیں ہوگی اور اس کی حیثیت زرعی ملک جیسی رہے، عوام کا معیار زندگی بلند نہیں ہو سکے گا۔ اس اہم موقع کو ہاتھ سے نہیں کھونا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں افسوس کرنا پڑے۔

امتیاز حسین خاں

معلّم بالغاں

از مولوی سید زاہد حسین صاحب ایم اے۔ ایم ایڈ

تعلیم بالغاں کو موجودہ زمانے میں جو اہمیت دی جا رہی ہے اس کے پیش نظر یہ کتاب ادارہ کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ تعلیم بالغان کی اہمیت، بالغوں کی نفسیات، طریقۂ تعلیم اور چند عملی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ تعلیم بالغاں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ صفحات (۵۶) قیمت ۱۲/

(ملنے کا پتہ) سب رس کتاب گھر۔ رفعت منزل خیرت آباد حیدرآباد دکن

ادھورے گیت

بانسری کی دھن میں کچھ گیت ڈھلتے ہی رہے
نت نئے ارماں مچلتے ہی رہے
آسماں سے بارشِ انوار ہو
بہہ رہی ہو چاندنی
پھیل جائیں نور کی کرنوں کے جال
رقص فرما ہوں مناظر گا رہے ہوں آبشار
گونج اٹھا ہو فضاؤں میں کوئی نوخیز راگ
ایک لامحدود نغمہ، اک مسلسل گیت، اک جھنکار ہو
جیسے پائل کی صدا ——
سطحِ دریا پر اچھلتی کودتی لہروں کا رقص
تیز ہو نبضِ حیات
گا رہی ہو کائنات
رقص کرتی ہو جوانی کی بہار
وقت کے یہ کیف زا لمحے نہ گن
میں نے صدیوں کو نچھاور کر دیا ——
ان حسیں لمحات پر
انبساط و کیف سے معمور ہیں
اک سرودِ غیر فانی، ایک لطفِ جاوداں
تشنگیٔ روح آسودہ نہیں
شوق کا یہ پیچ و تاب
نوجوانی ہے سراپا اضطراب
زندگانی ہے تمنا کا سراب
ایک نامعلوم غم !
ایک نغمہ، اک فسانہ، ایک غم انجام یاس
سیکڑوں برسوں سے اب تک تشنۂ تکمیل ہے

سردار الہام

غزل

غباروں سے الجھ جاتا ہے [illegible]
ارے تو یہ تری [illegible]
کوئی تارا فلک سے ٹوٹ جائے
لرز جاتی ہے راتوں کی سیاہی
جنوں کو کیا نشاط و غم سے مطلب
محبت میں فقیری ہے نہ شاہی
ہوس صورت گرِ ہر حق و باطل
معاذ اللہ جہانِ مرغ و ماہی
برہنہ سر برہنہ پا ہے آدم
بہت آساں ہے تیری کج کلاہی
عبادت اک فریبِ سوزِ پنہاں
ارے تو یہ طلسمِ خانقاہی
زمیں کو چین ہی لینے نہ دیں گے
محبت کے یہ ہنگامے الٰہی
مری آوارگی منزل نشاں ہے
دلیلِ راہ میری بے نگاہی
کہاں وہ خوابگہ کا تیری عالم
کہاں یہ پیدا و پنہاں تباہی

عزیز حامد مدنی

تنقید و تبصرہ

ہندوستان کی تجارت

از معین الدین بلگامی بی اے عثمانیہ
قیمت ۸ - حجم ۴۰ صفحے
مقام اشاعت۔ فاطمہ منزل
حمایت نگر۔ حیدر آباد دکن

زیر نظر پمفلٹ میں ہندوستان کی تجارت پر سیر حاصل بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور سات عنوانوں کے تحت موضوع کو واضح کیا گیا ہے۔ (۱) ہندوستان کی معیشت میں تجارت کی اہمیت (۲) ہندوستان کی تجارت کے اقسام (۳) اندرونی تجارت (۴) بیرونی تجارت (۵) توازن تجارت و توازن ادائی (۶) تجارتی پالیسی (۷) موجودہ جنگ کے ہندوستان کی تجارت پر اثرات۔

موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے کارآمد کتاب ثابت ہوگی۔

ہندوستان کے زرعی مسائل

از شفیق الرحمن بی اے عثمانیہ قیمت ۸ حجم ۸۲

مقام اشاعت۔ فاطمہ منزل۔ حمایت نگر۔ حیدر آباد دکن

ہندوستان زراعتی ملک ہے اور اس کی ترقی کا انحصار محض زرعی ترقیوں پر ہے۔ گیارہ عنوانات کے تحت زراعت کے معاملات کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے (۱) تاریخی پس منظر (۲) زرعی ترقی میں حکومت کا حصہ (۳) زمین کی زرخیزی (۴) کھاد کا استعمال (۵) ذرائع آب پاشی (۶) زمین کٹ (۷) تقسیم و انتشار اراضی (۸) زرعی آلات (۹) مویشی (۱۰) زراعت دوران جنگ میں (۱۱) زرعی ترقی کا مستقبل۔

نارعین کے لئے نہایت مفید معلومات یک جا کئے گئے ہیں اور نہایت اچھی طرح زراعت کے مستقبل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ضمناً مویشیوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔

ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک

از محمد طاہر حامد عثمانیہ
قیمت ۸ حجم ۸۰

ناشر۔ ادارۂ معاشیات، فاطمہ منزل حمایت نگر [illegible]

زیر نظر کتاب چھ حصص پر [illegible] (۱) [illegible] کی تعریف (۲) مختلف ممالک میں امداد باہمی [illegible] کی ضرورت (۳) ہندوستان میں امداد باہمی کا [illegible] (۵) امداد باہمی کے ادارے (۶) [illegible] امداد باہمی (۷) امداد باہمی کا عملی پہلو اور مستقبل۔

کافی اچھا مطالعہ ہے۔ اس تحریک سے ہندوستان میں ناکامی کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور اس کی امید ظاہر کی گئی ہے کہ اگر اس کو صحیح اصول پر چلایا جائے تو بہت مفید ہوگی۔

ہندوستان کی قومی آمدنی

از توفیق محمد خاں بی اے عثمانیہ قیمت ۸ حجم ۸ صفحے

پتہ۔ فاطمہ منزل حمایت نگر۔ حیدر آباد دکن۔

مضمون کو چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) قومی آمدنی سے کیا مراد ہے؟ (۲) ہندوستان کی قومی آمدنی کے مختلف اندازے (۳) قومی آمدنی معلوم کرنے کے طریقے (۴) قومی آمدنی میں اضافہ کی تجاویز۔

معاشیات کے طالب علم یا معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے ضرور پڑھیں۔

ہندوستان کا نظام بنک کاری

از نظام اوتار بی اے عثمانیہ
قیمت ۸ - حجم ۸۰ صفحے

پتہ۔ فاطمہ منزل۔ حمایت نگر۔ حیدر آباد دکن۔

چار عنوانات کے تحت بنک کاری پر بحث کی گئی ہے (۱) بنکوں کی اہمیت (۲) ہندوستان میں بنک کاری کی تاریخ (۳) ہندوستانی بازار زر (۴) ریزرو بنک۔

اس چھوٹے سے کتابچہ میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "ذ۔ س"

اطلاع۔ براہ کرم اپنے ذمے کا چندہ روانہ فرماکر شکریہ کا موقعہ عطا کیجئے۔

اداروے کی خبریں

مرکز اردو امتحانات بمبئی کا جلسہ تقسیم اسناد
۸ اپریل اتوار کے دن

[illegible] انجمن اسلام ہائی اسکول میں ایک جلسہ ہوا جس میں ان طلبہ کو جو ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے اردو امتحانات میں بمبئی مرکز سے کامیاب ہوئے سندیں دی گئیں۔ جلسہ کی صدارت جناب ڈاکٹر [illegible] الرحمن صاحب پرنسپل اسمٰعیل کالج نے فرمائی۔ جناب پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے کامیاب طلبہ کو مخاطب کیا۔

جلسہ کی ابتدا پنڈت کیفی کی مشہور نظم "ہماری زبان" سے ہوئی جس کو ایک طالب علم نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا۔ اس کے بعد انجمن اسلام کے مددگار معتمد اعزازی نے امتحانات کی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ سندوں کی تقسیم کے بعد ہر امتحان میں بمبئی مرکز سے درجۂ اول میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کو کتابیں بطور انعام دی گئیں۔ یہ انعامات انجمن اسلام کو شہر بمبئی کی انجمن ترقی اردو کی طرف سے وصول ہوئی تھیں۔

پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے کامیاب امیدواروں کو مبارکباد دینے کے بعد ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان کی ضرورت و اہمیت پر ایک مختصر مگر جامع تقریر فرمائی۔ صاحب موصوف نے فرمایا کہ اگر ہندوستان ایک ہونا چاہتا ہے اور اگر ہندوستانی ایک دوسرے کی باتوں کو نہیں بلکہ دلوں کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا تنہا حل یہی ہے کہ سارے ملک کی زبان ایک ہو جائے۔ پھر جناب موصوف نے بتایا کہ اردو ہی ہر حیثیت سے ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے کی اہل اور حقدار ہے۔

جناب صدر نے اپنی تقریر میں کامیاب طلبہ کو اور آگے قدم بڑھانے کی ترغیب دلائی اور یہ امید ظاہر کی کہ یہ امتحانات اردو یونیورسٹی کا سنگ بنیاد ثابت ہوں گے۔

منگار، معتمد اعزازی انجمن اسلام بمبئی

مرکز اردو امتحانات بمبئی کی رپورٹ
(۸ اپریل کے جلسہ تقسیم اسناد میں پڑھی گئی)

جناب صدر!

بمبئی میں تعلیم بالغاں کا کام ایڈلٹ ایجوکیشن کمیٹی کے تحت ایک عرصے سے جاری ہے۔ اسی طرح بمبئی ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی سرپرستی میں تعلیم یافتہ حضرات کو دوسری زبانوں کے ساتھ اردو پڑھانے کا کام بھی ایک مدت سے انجام پا رہا ہے۔ لیکن پہلی صورت میں تعلیم ایک بہت محدود معیار پر پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی اور دوسری صورت میں کوئی باضابطہ نصاب اور معیار مقرر نہیں تھا۔ چند نوجوانوں کی جنھیں اردو زبان سے بہت دلچسپی ہے، ایک بہت ہی مختصر سی جماعت نے یہ طے کیا کہ دونوں صورتوں کی اصلاح کی جائے اور اس کے لئے مناسب یہ سمجھا گیا کہ ان تمام لوگوں کے لئے جو مختلف کلاسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہوں امتحانات مقرر کئے جائیں۔ خوش قسمتی سے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی سرپرستی میں تین چار سال سے باضابطہ نصاب و معیار کے تحت اردو امتحانات ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان اردو دوست نوجوانوں نے ادارہ سے درخواست کی کہ بمبئی میں بھی ان امتحانات کا مرکز قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ ادارہ نے بڑی خوشی سے مرکز بنانے کی اجازت دی اور بمبئی میں اس سلسلہ کا پہلا امتحان دسمبر ۱۹۴۳ء میں ہوا۔

ادارہ کی طرف سے یہ امتحانات سال میں دو بار یعنی جولائی اور دسمبر میں ہوا کرتے ہیں۔ جولائی میں چار امتحانات یعنی اردو دانی، اردو زباں دانی، اردو عالم، اردو فاضل ہوا کرتے ہیں۔ لیکن دسمبر میں صرف ابتدائی یعنی اردو دانی کا امتحان ہوتا ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۴۳ء

میں جب بمبئی میں پہلے پہل مرکز قائم ہوا تو صرف اردو دانی کا امتحان ہوا جس میں ۲۷ امیدوار شریک ہوئے اور ان میں ۱۲ کامیاب ہوئے۔

بانیان مرکز نے یہ محسوس کرکے کہ یہ ایک نہایت مفید اور اہم کام ہے اور چند افراد اس کو باضابطہ طور پر انجام نہیں دے سکتے اس کو انجمن اسلام کے سپرد کردیا تاکہ ایک پبلک ادارہ کی سرپرستی میں یہ مفید و اہم کام بہتر طور پر انجام پا سکے۔ چنانچہ اس سلسلے کا دوسرا امتحان جولائی ۱۹۴۲ء میں انجمن کی سرپرستی میں ہوا۔ اس دفعہ مختلف امتحانات میں امیدوار شریک ہوئے جن کی تعداد حسب ذیل ہے:-

اردو عالم	اردو زبان دانی	اردو دانی
۳ امیدوار	۱۰ امیدوار	۵۶ امیدوار

ان امتحانات کا نتیجہ حسب ذیل رہا:-

اردو عالم -	۳	امیدواروں میں	۳ کامیاب
اردو زبان دانی -	۱۰	"	۸ "
اردو دانی -	۵۶	"	۲۷ "

اردو دانی کے امتحان میں ایک خاتون بھی شریک تھیں اور یہی مرکز میں اول آئیں۔

اردو دانی کے امتحان میں دو تعلیم یافتہ ہندو حضرات بھی شریک تھے۔

اسی سال کا دوسرا امتحان دسمبر ۱۹۴۲ء میں ہوا اور حسب معمول صرف اردو دانی کا امتحان ہوا۔ اب کے بار ۵۸ امیدوار امتحان میں شریک ہوئے جن میں ۳۹ کامیاب ہوئے۔

امیدواروں میں ۱۳ تعلیم یافتہ خواتین بھی تھیں جن میں ایک پارسی اور ۱۲ ہندو تھیں۔ یہ تمام خواتین امتحان میں کامیاب ہوئیں اور دو امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئیں۔

مرد امیدواروں میں ۶ تعلیم یافتہ ہندو بھی تھے۔ ان میں چار کامیاب ہوئے اور ایک نہ صرف امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے بلکہ مرکز میں اول آئے۔

یہاں ہم بمبئی ایڈلٹ ایجوکیشن کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس نے ہماری درخواست پر ہمارے نصاب کے مطابق تعلیم دینا منظور کیا اور طلبہ کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی۔

ہم لٹریسی کلاسوں کے سپروائزر صاحبان کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ لوگ اس سلسلہ میں انجمن کا ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔

ہم جناب تصدق حسین صاحب ہیڈ ماسٹر میونسپل کرلا اینگلو اردو ہائی اسکول، جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب سکریٹری صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ اور جناب انصار علی صاحب، مدرس انجمن اسلام ہائی اسکول کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان حضرات نے گزشتہ امتحانات کے موقعہ پر زبانی امتحان کے سلسلے میں ہماری مدد فرمائی۔

ادارۂ ادبیات اردو امتحانات کے سلسلے میں ہم کو اکثر مراعات دیا کرتا ہے۔ ہم اس کے لئے ادارہ کے شکر گزار ہیں۔

معتمد اعزازی - انجمن اسلام - بمبئی

رودادِ مجلس عاملہ شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمقام دفتر ادارہ - رفعت منزل بتاریخ ۱۶ اسفندار ۱۳۵۲ف صبح ساڑھے دس بجے منعقد ہوا - حسب ذیل ارکان نے شرکت کی۔

۱- محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ	۴- محترمہ بلقیس بانو صاحبہ
۲- " عظمت النساء بیگم صاحبہ	۵- " سعید النساء بیگم صاحبہ
۳- " تہنیت النساء بیگم صاحبہ	۶- " بشیر النساء بیگم صاحبہ

محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نے بذریعہ خط شرکت سے معذوری ظاہر فرمائی اور محترمہ [illegible] سلطانہ صاحبہ کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ اورنگ آباد میں ہیں۔ بذریعہ ٹیلیفون یہ اطلاع ملی کہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبۂ نسواں کا مزاج ناساز ہے اور وہ تشریف نہیں لاسکیں۔ اس لئے

... صاحب نے ٹیلی فون پر گفتگو فرمائی اور ... باہمی مشورے کے بعد معتمد صاحبہ ہی کے ... مطابق اجلاس کی کارروائی شروع کی گئی۔

سابقہ روئداد کی سماعت اور توثیق کے بعد مطلع کیا گیا کہ شعبۂ نسواں کی جانب سے جو قرارداد تعزیت حضرت شہزادی صاحبہ برار کی خدمت میں پیش کی گئی تھی اس کے جواب میں شہزادی صاحبہ نے شکریہ فرمایا ہے۔
اس کے بعد حسب ذیل امور زیر غور رہے۔
(۱) ذیلی مجالس کی روئداد (۲) بزم ادب کا ساہی جلسہ۔
(۳) مدرسہ لغات کی سرکاری امداد سے دست برداری۔
(۴) چندہ رکنیت کی وصولی کا انتظام۔
(۵) حساب آمدنی و خرچ شعبہ۔

(۱) ذیلی مجالس کے معتمدین میں سے صرف محترمہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ معتمدۂ "مجلس ادب نسواں" نے مطلع کیا ہے کہ ان کی مجلس کی تشکیل اور نظام العمل کی ترتیب کا کام تقریباً ختم ہو چکا ہے اور ارکان مجلس نے شعبۂ نسواں کی رکنیت بھی قبول کی ہے جن کے نام پڑھ کر سنائے گئے اور ان کی ایک فہرست ادارے کے دفتر کو روانہ کی گئی تاکہ ان تمام کی خدمت میں شکریے کے ساتھ رکنیت کے فارم روانہ کئے جائیں۔

(۲) محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ نے بزم ادب کا سہ ماہی جلسہ محبوبیہ گرلز اسکول میں منعقد کرنے کا وعدہ فرمایا تھا اور پھر وائسرائن کی تشریف آوری کے سلسلے میں مصروفیت کا عذر کرتے ہوئے مطلع کیا تھا کہ جلسہ جلد سے جلد منعقد کرنے کی ممکنہ کوشش کی جائے گی مگر اس کے بعد مزید کوئی اطلاع نہیں ملی اس لئے طے پایا کہ محترمہ کی خدمت میں اس جلسے کے متعلق یاد دہانی کرتے ہوئے یہ استدعا کی جائے کہ بعجلت ممکنہ اس کا انتظام فرمائیں اور اگر ربیع الاوّل کے مہینے میں مقرر کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

(۳) مدرسۂ بالغات (اڈک میٹا) کو مبلغ (للعہ) جو سرکاری امداد ملتی ہے اس کے متعلق یہ وضاحت کی گئی کہ تعمیل نصاب کی پابندیاں وغیرہ شعبے کے اغراض و مقاصد کو متاثر کرتی ہیں اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ ایسی صورت میں اس امداد سے دست بردار ہو جانا زیادہ مناسب ہے۔ دیر تک غور اور بحث کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ اس معاملہ کو معتمد صاحبہ شعبۂ نسواں کے سپرد کیا جائے اور انھیں اختیار ہوگا کہ اگر مناسب سمجھیں تو دست بردار ہو جانے کی کارروائی فرمائیں۔ ان کی رائے سے ارکان مجلس کو بہر صورت اتفاق رہے گا۔ اس تجویز کو جملہ ارکان نے متفقہ طور پر پسند کرتے ہوئے منظور کیا۔

(۴) چندہ رکنیت کے لئے طے پایا کہ حسب سال گزشتہ اس دفعہ بھی محترمہ مسز قیوم صاحبہ کو ذمہ دار بنایا جائے کہ وہ گزشتہ سال کا بقایا اور ۱۹۴۵ء کا چندہ وصول کر کے معتمد صاحبہ کے یہاں روانہ فرمائیں۔

(۵) معتمد صاحبہ شعبۂ نسواں کا مراسلہ گوشوارہ جمع و خرچ صدر صاحبہ نے پڑھ کر سنایا ارکان کو شعبہ کی آمدنی اور خرچ سے مطلع کیا گیا اور اس کے بعد اجلاس برخاست ہوا۔

رپورٹ دورۂ نرمل

خورداد ۱۳۵۴ف میں ادارہ کی طرف سے ایک وفد ضلع کی شاخوں کے دورے پر روانہ ہوا تھا۔ اس وفد کو اپنے دورے کے سلسلے میں نرمل پر کچھ دیر ٹھیرنا پڑا۔ اس زمانے میں ملا فخر الحسن صاحب مدرسہ فوقانیہ کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ صاحب موصوف سے ملاقات کے بعد یہ طے پایا کہ نرمل میں بھی ادارے کی ایک شاخ قائم کی جائے۔ چنانچہ ارکان وفد نے دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں نرمل کے اکثر اصحاب سے ملاقات کی

اور شام میں ایک جلسہ منعقد کرکے ادارہ کے مقاصد کو
واضح کرتے ہوئے قیام شاخ کی تحریک کی جو بہ غلبۂ آراء
منظور ہوئی اسی جلسہ میں ایک مجلس انتظامی بھی تشکیل دی
گئی اور توقع تھی کہ اضلاع کی دیگر شاخوں کی طرح شاخ
نرمل بھی اردو زبان کی خدمت انجام دے گی اور نرمل
میں تعلیم بالغان کی مہم کا آغاز کیا جائے گا۔ لیکن اس
شاخ کا قیام ایسی منحوس گھڑی میں عمل میں آیا کہ آج تک
اس نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور حرف غلط کی طرح
مٹ کر رہ گئی تھی۔ مجھے اس کا بڑا قلق تھا اور جب کبھی
اس کا خیال آتا تو ایک روحانی تکلیف ہوتی۔ میں موقعہ
کا متلاشی تھا کہ کسی طرح اس شاخ کو پھر سے زندہ
کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میرے ایک دوست اور جامعہ کے ممتاز
فارغ التحصیل مولوی محمد بن علی باوہاب صاحب بی اے
نرمل کے تحصیلدار منتخب ہوئے۔ میں نے صاحب موصوف
سے نرمل کی شاخ کا حال بیان کیا اور انھیں توجہ دلائی
کہ کسی طرح نرمل کی شاخ کا احیا کیا جائے۔ تحصیلدار صاحب
نے اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس وقت تو آمادگی ظاہر
نہ کی لیکن مستقبل قریب میں اس کام کے پورا کرنے کا
وعدہ فرمایا۔ حسن اتفاق سے میرے ایک دوست مسٹر
شوکت علی خاں ایم اے نرمل کے دوم تعلقدار ہوکر
آگئے۔ صاحب معز کو اردو علم و ادب سے خاص دلچسپی
ہے اور تحصیلدار صاحب کے توجہ دلانے پر انھوں نے
بھی اس کام میں دلچسپی لینے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ
تحصیلدار صاحب نے . . . . . . مورخہ ۱۰ اردی بہشت
۱۳۵۲ف میں مجھے نرمل آنے کی دعوت دی تاکہ شاخ کا
احیاء ہو اور ایک دارالمطالعہ اور مدرسہ شبیہ کا افتتاح
کیا جائے۔

میں ۱۰ اردی بہشت ۱۳۵۲ف کو شام کے ۸ بجے
کی ٹرین سے نظام آباد روانہ ہوا۔ ٹرین نظام آباد
پر دس بجے پہنچی اور میں نے رات وہیں گزاری۔ صبح

مولوی سید غوث صاحب ایم اے دوم تعلقدار [illegible]
ادارۂ ادبیات اردو دوم تعلقدار سے ملاقات [illegible]
ایک سرکاری کانفرنس کے سلسلے میں نظام آباد [illegible]
لائے تھے۔ صاحب موصوف سے یہ میری پہلی [illegible]
ہیں آپ کی علمی قابلیت، ملک و قوم کی خدمت کے جذبے
اور حسن اخلاق سے بے حد متاثر ہوا۔ ساڑھے [illegible]
بجے کی بس سے روانہ ہوکر ساڑھے تین بجے نرمل [illegible]
جناب تحصیلدار صاحب نے اپنے مکان پر میرے قیام [illegible]
انتظام کیا تھا۔ صاحب موصوف میرے منتظر [illegible]
کھانے سے فارغ ہوکر تھوڑی دیر آرام کیا جلسہ دوسرے
دن شام کو رکھا گیا تھا۔ شام میں ۶ بجے دوم تعلقدار
میری ملاقات کے لئے تشریف لائے اور تھوڑی [illegible]
مولوی عبدالجبار صاحب سبحانی صدر مدرس بھی [illegible]
ان اصحاب سے ملاقات رہی۔ دوم تعلقدار صاحب
قیام شاخ اور ادارے کے متعلق تبادلۂ خیال [illegible]
یہ صحبت تقریباً دو گھنٹے رہی۔ دوم تعلقدار صاحب
رات کے کھانے پر مدعو فرمایا۔ حسن اتفاق سے اس
دعوت میں مولوی عبدالقیوم خاں صاحب [illegible]
ڈائرکٹر کاریوریشن، مولوی سید حسین صاحب [illegible]
مہتمم کوتوالی عادل آباد، مولوی سرتاج بیگ خاں
دوم تعلقدار عادل آباد اور مولوی شرف الدین [illegible]
وکیل نظام آباد بھی شریک تھے۔ منصف صاحب [illegible]
مہتمم صاحب تعمیرات سے بھی ملاقات ہوئی۔

دوسرے دن دوپہر میں صدر مدرس صاحب
نے کھانے پر مدعو فرمایا۔ شام میں ۶ بجے عالی جناب
مولوی شوکت علی خاں صاحب ایم اے دوم تعلقدار
کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا جس میں عوام [illegible]
علاوہ جناب منصف صاحب، جناب مہتمم صاحب [illegible]
سیٹھ لوڈو رام صاحب، سیٹھ سوپ کرن صاحب
اور وکلاء صاحبین شریک تھے۔ جناب تحصیلدار [illegible]

[illegible] نہایت ہی موثر الفاظ
[illegible] میرا تعارف کرایا۔ اس کے
[illegible] ایک مختصر تقریر کی جس میں ادارہ کے مقاصد
[illegible] کی اہمیت و ضرورت کو بیان کیا اور یہ
[illegible] تعلیم بالغاں کو کیا اہمیت حاصل
[illegible] کی خدمت در اصل ایک قومی خدمت ہے۔
[illegible] ہی ہندو مسلم اتحاد کا سنگ قرار دی جا سکتی ہے۔
ابھی چند دن پہلے ہندوستان کی عام زبان کا فیصلہ
کرنے کے لئے وردھا میں گاندھی جی کی صدارت میں ایک
کمیٹی منعقد ہوئی تھی جس میں ڈاکٹر تاراچند، مولانا سلیمان
ندوی، ڈاکٹر عبدالحق وغیرہ شریک تھے۔ ان حضرات
نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ تصفیہ
کیا کہ ہندوستان کی عام زبان ہندوستانی ہو سکتی ہے۔
جو اردو اور ناگری رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ اردو لکھنے
والوں کو ناگری اور ناگری لکھنے والوں کو اردو رسم الخط
سیکھنا چاہئے۔ بہرحال اب یہ طے پا گیا کہ ہمارے ملک کی
عام زبان اردو ہوگی۔ اس لئے ہندوستان کے ہر خطہ میں
رہنے والوں کو خواہ ان کا تعلق کسی مذہب یا فرقے سے
ہو اردو کی ترقی کے لئے کوشش کرنی چاہئے کیونکہ یہی
ہماری قومی زبان ہے۔ میں اپنی تقریر کو طول دینا نہیں
چاہتا کیونکہ باتیں تو بہت کی جا سکتی ہیں لیکن میں
اس کا قائل ہوں کہ باتیں کم ہوں اور کام زیادہ۔ تھوڑا
اس سلسلے میں نرمل کے رہنے والوں سے استدعا کروں گا
کہ اپنی زبان کو پھیلانے اور اس کو ترقی دینے کے لئے
ہر ممکن مدد سے دریغ نہ فرمائیں اور وہ لوگ جو
لکھنے پڑھنے سے محروم ہیں ان کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔
حضرات میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج کل کسی کو
لکھنا پڑھنا سکھانا بہت بڑی نیکی ہے۔ مجھے آپ سے
بڑی بڑی توقعات ہیں۔ امید کہ آپ میری اس گزارش
پر ضرور توجہ فرمائیں گے اور اس بات کا پکا ارادہ
کرکے یہاں سے اٹھیں گے کہ نرمل میں کوئی شخص
ان پڑھ نہ رہے گا۔

اس کے بعد عالی جناب دوم تعلقدار صاحب
نے میری تقریر پر تبصرہ فرماتے ہوئے جن الفاظ میں میرا
تعارف کرایا شاید میں اس کا مستحق نہ تھا۔ یہ محض
صاحب موصوف کی عالی ظرفی، حسن اخلاق اور خلوص
تھا۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ادارۂ ادبیات اردو
کئی سال سے ملک میں اردو کی خدمت انجام دے رہا ہے۔
اس کے بانی ڈاکٹر زورؔ صاحب قابل مبارکباد ہیں
کہ انھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور گورنمنٹ کی امداد
کے بغیر ادارہ قائم کیا اور اسے کامیابی سے چلا رہے
ہیں۔ یوں تو ہندوستان میں اور کئی ادارے ہیں جن کو
ہماری حکومت کی طرف سے رقمی امداد ملتی ہے۔
لیکن ادارۂ ادبیات اردو کی ہم سب کو مدد کرنی چاہئے
کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا رہا۔ میں تمام باشندگان
نرمل کی طرف سے شاہدؔ صاحب کو یقین دلاتا ہوں
کہ نرمل کی شاخ اردو زبان کی خدمت کرے گی کیونکہ
یہ ہماری مادری اور سرکاری زبان ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو نے اب ایک یادگار کام
کی طرف قدم اٹھایا ہے اور وہ اس کی ذاتی عمارت ہے۔
غالباً شاہدؔ نے عمداً اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ ادارہ کا
مسلک دست سوال دراز کرنا نہیں ہے لیکن میں
اس کام کی اہمیت کے پیش نظر یہ کہنا ضروری سمجھتا
ہوں کہ اہل ملک کو ادارہ کی عمارت کے لئے دل کھول کر
مدد کرنی چاہئے۔ یہ ایک یادگار عمارت ہوگی۔ عمارت فنڈ
کے لئے عالی جناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر
صدر المہام تعمیرات و نائب صدر ادارۂ ادبیات اردو
کی طرف سے اپیل شائع ہوئی ہے عمارت کا مجوزہ نقشہ
بھی اس میں شریک ہے۔ یہ عمارت سلطان العلوم کے
عہد میمنت مہد کی ایک عظیم الشان یادگار ہوگی۔

خدائے تعالیٰ نے جن لوگوں کو دولت عطا فرمائی ہے وہ ضرور ملک کے اس اہم کام میں رقمی امداد فرمائیں گے تاکہ آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کے اس درخشاں کارنامے پر فخر کریں - میں نہایت مسرت کے ساتھ اس کا اعلان کرتا ہوں کہ سیٹھ لوڈورام صاحب نے عمارت کے لئے ایک سو روپے کا گراں قدر عطیہ عنایت فرمایا ہے۔
جناب صدر نے شاخ نرمل کی مجلس انتظامی کے عہدہ داروں کے انتخاب کے لئے تحریکیں پیش کرنے کی اجازت عطا فرمائی اور مندرجۂ ذیل اصحاب بہ اتفاق آراء منتخب ہوئے -

صدر - مولوی شوکت علی خاں صاحب دوم تعلقدار
نائب صدر " عبدالجبار سبحانی صاحب صدر مدرس مدرسۂ فوقانیہ نرمل
معتمد - مولوی امام بخش کمل صاحب ایم اے (علیگ)

ارکان مجلس انتظامی کا انتخاب جناب صدر صاحب دیگر عہدہ داروں کے مشورہ سے فرمائیں گے۔
اس کے بعد میں نے صدر جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور سیٹھ لوڈورام صاحب کے عطیہ کا منجانب ادارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے عمارت فنڈ میں حصہ لینے کے لئے حاضرین جلسہ سے استدعا کی - جناب مولوی محمد بن علی باوہاب صاحب تحصیلدار نے جناب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور یہ پر لطف صحبت ۸ بجے برخاست ہوئی -
جناب تحصیلدار صاحب نے شام کے کھانے پر مقامی عہدہ داروں کو مدعو فرمایا تھا - مختلف اصناف سے تبادلۂ خیال کیا گیا اور یہ دعوت رات کے ۱۲ بجے ختم ہوئی -

خواجہ حمید الدین

خازن مولوی محمد بن علی باوہاب صاحب تحصیلدار

کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ

حیدرآباد کے بانی اور اردو کے پہلے صاحب دیوان کا مجموعۂ کلام جو برسوں کی محنت اور تحقیق کے بعد جمع کیا گیا ہے۔ محمد قلی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ - مقدمہ میں اس کے کلام اور سوانح حیات پر عالمانہ بحث کی گئی ہے - یہ کلیات پہلی دفعہ ہزاروں روپے کے صرفہ سے شائع ہوا ہے - کئی کم یاب قلمی تصاویر بھی پہلی دفعہ اس مجموعہ میں شائع ہوئی ہیں - صفحات (۱۰۶۸) قیمت مجلد ۸ روپے

میر محمد مومن

عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے - دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے - انھوں نے ہزار ہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلیٰ بچھا دی تھی اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف ہے - میر محمد مومن ایک اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے - ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں - تقریباً ۳۰۰ سو صفحات مع تصاویر قیمت عہ

دلچسپ ادبی کتابیں

[illegible] طرز سخن کے نوادر

[illegible] [illegible] مجموعہ [illegible] کی نظموں اور غزلوں کا بہترین [illegible] ہے۔ جناب [illegible] حیدرآباد کے نوجوان شعرا میں ایک خاص [illegible] کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالی جناب [illegible] صاحب کا دیباچہ عربی اور جناب پروفیسر سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جدید شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام قیمت عالہ

نیو زندگی | مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں (۱۰۱) نظمیں (۱۷) غزلیں اور (۵) رباعیات ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدرآباد کے پختہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدردان دور دور پھیلے ہوئے ہیں اردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ علی منظور صاحب عہد حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی صفحات (۲۱۲) قیمت عہ

انوار | حضرت علی اختر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر اُن کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر [illegible] دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے جدید اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے صفحے [illegible] قیمت مجلد

ارمغان جذب | پنڈت رگھوبیدر راؤ صاحب جذب (عالم پوری) کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے سنسکرت اور بھاشا کی شاعری کے اخلاقی اور ناصحانہ پہلو کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اکثر رباعیاں سنسکرت اور بھاشا کے شعرا کے خیالات کا عکس ہیں اور بعض خود ان کے دل و دماغ کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ سادگی، سلاست، خیالات سلجھے ہوئے اور طرز بیان اس قدر سادہ اور بے تکلف کہ معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکے۔ ہر رباعی دل کی دھڑکن ہے جو شعر کے جسم میں بٹ گئی ہے ابتدا میں جناب ماہر القادری صاحب کا ایک بسیط اور معلومات آفریں مقدمہ ہے جس میں انھوں نے سنسکرت اور ہندی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ صفحات (۱۲۰) قیمت مجلد ۱۲ر

ماہ لقا | یہ مولوی عزیز احمد صاحب بی اے آنرز (لندن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ و مصنف شہزادی در شہوار کی طویل نظموں کا مجموعہ ہے جن میں یورپ کی شاعری کے مفید اثرات جلوہ گر ہیں۔ جدید یا ترقی پسند اردو شاعری کے دلدادہ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ صفحات [illegible] قیمت عہ

سراج سخن | شاہ سراج اورنگ آبادی اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ پروفیسر عبد القادر صاحب سروری نے سراج کے کلام کا پاکیزہ انتخاب کیا ہے۔ اگرچہ ان کا زمانہ دو سو سال پہلے کا ہے لیکن ان کا کلام بہت صاف ہے جس کا یہ دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے۔ پروفیسر سروری صاحب کے محققانہ اور پُر از معلومات مقدمہ سے اس مجموعہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ جو اصحاب پاکیزہ اور سلیس و سادہ شاعری کے دلدادہ ہیں وہ اس بہترین انتخاب کی قدر کریں گے صفحات ۱۵۲ قیمت ۱۲ر

ایمانِ سخن | مولوی سید [illegible] صاحب ایم اے نے اردو کے عہد آصفجاہی
کے ملک الشعراء شیر محمد خان ایمان کے کلام کا انتخاب کیا ہے جس کے ساتھ
ان کا بلند پایہ مقدمہ بھی ہے جس میں انھوں نے ایمان کے حالاتِ زندگی
اور شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ ایمان اردو کے اساتذۂ سخن میں شمار
کئے جاتے ہیں اور ان کے کلام اور قصائد کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں
تعداد صفحات (۱۳۶) قیمت ۱۲؍

فیضِ سخن | میر شمس الدین محمد فیض اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد
مانے جاتے تھے۔ وہ ایک صاحبِ دل بزرگ تھے۔ ان کا کلام ان کے دل
کی آواز ہے۔ وہ ایک خاص مکتبِ شاعری کے بانی بن گئے تھے جو
عاشقانہ شاعری میں تصوف کی رنگ آمیزی کرتا ہے۔ ڈاکٹر
سید محی الدین صاحب قادری زور نے حضرت فیض کے کلام کا بہترین
انتخاب شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کا ایک بصیرت افروز مقدمہ
بھی ہے جس میں فیض کی حیات اور شاعری پر محققانہ بحث کی گئی ہے

اس کتاب میں غزلیات کے علاوہ فیض کی مثنویوں اور دیگر
کلام کا بھی انتخاب شامل ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
حضرت خواجہ میر درد اور شاہ سراج اورنگ آبادی کے بعد تصوف و
عرفان اور شعر و سخن کا امتزاج جتنا اچھا حضرت فیض کے کلام میں
موجود ہے کسی اور اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ تعداد صفحات (۱۴۴)
مع تصویر مرقد حضرت فیض قیمت ۱۲؍

بادۂ سخن | ڈاکٹر احمد حسین مائل کے کلام کا دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے
ان کے کلام میں سادگی اور خداداد بےتکلفی ہے اس انتخاب کے ساتھ
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا معرکۃ الآرا مقدمہ بھی شریک ہے
جس میں داغ اور مائل کے معرکوں کا بھی تذکرہ درج ہے صفحے ۱۴۰ قیمت ۱۱؍

کیفِ سخن | حضرت کیفی ایک بوقلموں طبیعت کے سخن گو تھے۔ آزاد خیالی،
لطیفہ سنجی ان کے کلام میں جا بجا جھلکتی ہے وہ حیدرآباد کے جدید شعراء
کے بلند بانکی طرح اندازوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری
زور نے ان کے کلام کا انتخاب ایک [illegible] کے ساتھ
مرتب کیا ہے اردو شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لئے [illegible]
مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ حضرت کیفی دکن کے [illegible]
اس انتخاب میں ان کی چند نظموں کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔

متاعِ سخن | نواب مرزا یار جنگ بہادر عزیز داغ دہلوی کے شاگرد
اور حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں [illegible]
اور زبان کی پاکیزگی نمایاں ہوتی ہے۔ اس انتخاب کے ساتھ جناب
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا مقدمہ بھی ہے جس میں
ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے شاعری اور زبان کا مذاق
رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔
تعداد صفحات (۱۳۶) مع تصویر شاعر قیمت ۱۲؍

مرقعِ سخن جلد اول | یہ دکن کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر
تذکرہ ہے جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ طلبہ فارغین اور اہل قلم نے
اس تذکرہ کی تالیف میں حصہ لیا ہے۔ یہ تذکرہ پانچ دوروں پر
منقسم ہے ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس کی
ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر عہد کے مشاہیر شعرا کے
حالات ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے ان شاعروں کے
تذکرے کے ساتھ دیگر ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے شعرا کے نام
دیئے گئے ہیں تاکہ اردو شاعری کا تاریخی منظر معلوم ہو سکے۔
شاعروں کی تصویروں کے علاوہ فرمانروایانِ دکن اور قدردانِ
ادب و شعر کی بھی تصویریں شریک ہیں۔ [illegible] صفحے [illegible] مع تصویر [illegible]

مرقعِ سخن جلد دوم | پچاس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے
اس کی ترتیب بھی اسی ڈھنگ پر ہے جیسی پہلے کی ہے۔ ہر شاعر کے
سوانح حیات اور نمونۂ کلام کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری پر تبصرہ
بھی کیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے حیدرآباد کی گزشتہ اور
موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے [illegible] تعداد [illegible]

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم اے

جلد ۸ بابت جولائی ۱۹۴۵ء شمارہ ۷

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

ارمانِ مسرت

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

(دریا کے کنارے ایک چٹان پر ایک دوشیزہ سر نیوڑائے بیٹھی ہے۔ کچھ سوچ رہی ہیں۔ نظر کے انہاک چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماضی کی کسی خیالی تصویر میں محو ہے۔ اس کے پاس ہی ایک جوان کھڑا ہے جس کا رنگ سانولا مائل اور چہرہ مسکراتا ہوا ہے۔ سینہ پر ایک فوجی تمغہ آویزاں ہے۔ اس کی نظریں دوشیزہ پر جمی ہوئی ہیں۔ دریا کی سطح پر سکون ہے۔ کوئل کو کو کر رہی ہے۔ گرما کا موسم مئی کا مہینہ مطلع صاف اور دھوپ تیز ہے۔ دریا کے کنارے جو راستہ ہے اس کی دونوں جانب جھاڑیاں پھولوں سے لدی کھڑی ہیں۔)

دوشیزہ۔ خدا جانے وہ کیا کہے گا۔

جوان۔ کہے گا کیا۔ آخر اتنے دنوں تک کہاں مر رہا تھا!!

دوشیزہ۔ وہ اس سے پہلے آ ہی نہ سکتا تھا۔ ہائے اللہ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔

جوان۔ اور مجھے تو تم سے دشمنی ہے نا!

دوشیزہ۔ مجھے جنگ سے اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

جوان۔ آخر میں بھی تو جنگ ہی پر گیا تھا!

دوشیزہ۔ (اسے چھوتے ہوئے) آہ!

جوان۔ کیا واقعی...... (آواز رک جاتی ہے بولا نہیں جاتا)

دوشیزہ۔ نہیں۔ نہیں جم! تمہاری طرح نہیں!!

جوان۔ پھر پریشانی کی کیا بات ہے؟ ہمت سے کام لو!

دوشیزہ۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔

جوان۔ کوئی پاپ ہے۔ کوئی گھومتا ہے!

دوشیزہ۔ مجھے اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ مگر کیا معلوم تھا کہ وہ واپس آجائے گا؟

جوان۔ (اکھڑپن سے) اس میں کیا قباحت ہے۔ صاف صاف کہہ دینا کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔

دوشیزہ۔ کہہ تو دوں...... لیکن..........

جوان۔ (اس کے شانوں کو پکڑ کر) بلو! مکو ڈ نے ... مجھ سے جو چال چلنے کی کوشش کی تو تم دونوں میں سے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گا!!!

(دوشیزہ اس کی فیض پاش نظروں کو دیکھ کر سہم جاتی ہے اور خوشامدانہ انداز میں اس کے قریب ہو جاتی ہے۔) تو پھر کیا جم! مجھ سے یہی امید ہے؟

جوان۔ تو آؤ اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے نکل چلیں۔

(وہ انکاری طور پر سر ہلاتی ہے)

جوان۔ آخر ٹھہرنے سے فائدہ؟ دنیا کے راستے ہم پر کھلے ہوئے ہیں!

دوشیزہ۔ اب اس وقت تو میرا جانا ناممکن ہے۔ اس کے بعد البتہ اسے بھول جانے کی کوشش کروں گی۔

جوان۔ خدا تمہاری مدد کرے۔

دوشیزہ۔ وقت کیا ہو گا جم؟

جوان۔ کوئی ۳ ½ بجے ہوں گے۔

دوشیزہ۔ (دریا کے کنارے والے راستہ کو مڑ کر دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔)

اس نے ۴ بجے آنے کو کہا تھا۔ اب تم جاؤ۔

جوان۔ جاؤں کیوں۔ کیا کسی کا ڈر پڑا ہے۔ آخر وہ ہے کیا۔

دوشیزہ۔ (بیدلی سے) اچھی طرح نہیں کہہ سکتی۔ میں نے اسے تین سال سے نہیں دیکھا ہے اور تمہاری ملاقات کے بعد تو میں نے اس کا خیال تک نہیں کیا۔

جوان۔ آخر کچھ تو کہو۔ پست قد ہے کہ لمبا۔ دبلا ہے یا موٹا۔

دوشیزہ۔ بس تمہاری ہی طرح ہو گا۔ اچھا اب تم چلے جاؤ۔

جوان۔ یہ غیر ممکن ہے۔ تمہارے بغیر ہرگز نہیں جا سکتا۔ توپ کی گرج، گولوں کی بوچھاڑ تو مجھے اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکی تو پھر انسان تو انسان ہی ہے۔

دوشیزہ۔ (اسے ملتجیانہ انداز میں دیکھ کر) جم!

جوان ۔ بے تکلفی سے [illegible] اسے سینہ سے لگا لیتا ہے ۔

دوشیزہ ۔ [illegible] اگر وہ دیکھ لے تو ۔

جوان ۔ اگر میں ڈر جاتا تو کبھی اتنے دنوں تک غائب رہ کر تم سے یہیں ملا کرتا ۔ وہاں سے کب کا رفو چکر ہو چکا ہوتا ۔ مجھے تم سے اتنی ہی محبت ہے ۔

دوشیزہ ۔ اچھا وعدہ کرو کہ اس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ گے ۔

جوان ۔ ایسا ہی ہوگا ۔

دوشیزہ ۔ نہیں وعدہ کرو ۔

جوان ۔ اگر وہ خاموش رہا تو میں بھی کچھ نہ ہوں گا ۔ ورنہ اگر ذرا بھی اچھل کود کی تو ایسا مزا چکھاؤں کہ حضرت کو چھٹی کا دودھ یاد آئے ۔

دوشیزہ ۔ ہائے اب میں کیا کروں ۔

جوان ۔ مجھے تم سے محبت ہے میں کسی طرح تمھاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا ۔

دوشیزہ ۔ غالباً وہ بھی یہی کہے ۔

جوان ۔ پھر یا تو وہ رہے گا یا میں !!

دوشیزہ ۔ مجھے ڈر ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جوان ۔ جب تک دم میں دم ہے کس کی مجال ہے جو بال بھی بیکا کر سکے وہ اکیلا آئے یا یار دوستوں کو لے کر سب کے خون سے دریا کو رنگ دوں گا ۔ کوئی ہمیں شمہ برابر بھی نقصان نہیں پہونچا سکتا (خنجر نکالتا ہے)

دوشیزہ ۔ نہیں جم ! اس کی ضرورت نہیں لاؤ مجھے دیدو ۔

(ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

جوان ۔ کیوں ڈر گئیں ؟ (مسکرا کر) تم عورتیں ان مناظر کو دیکھ ہی نہیں سکتیں جن سے ہم مرد دن رات کھیلا کرتے ہیں ۔ میں نے پانچ منٹ کے اندر ہزاروں آدمیوں کو دم توڑتے ہوئے دیکھا ہے ۔ ان کی لاشیں میدان جنگ میں اس طرح بے گور و کفن پڑی تھیں جیسے مکھی مار کاغذ پر مکھیاں ۔ میں خود بھی بارہا موت کے منہ سے نکلا ہوں اور دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے ۔ پھر ایک اور سہی ۔ میں اس سے کچھ تعرض کروں گا ۔ بشرطیکہ وہ بھی مجھ سے نہ چھیڑے ۔ نہیں تو تم جانتی ہو میں کتنا اکھڑ ہوں وہ جہاں کہیں ملے بس وہیں اس کا صفایا کر دوں گا ۔

سن رہی ہو ڈیزی ! میں نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں ۔

دوشیزہ ۔ ایسا سہانا وقت لڑنے کا نہیں دیکھو چڑیاں بھی خوشی منا رہی ہیں ۔

جوان ۔ یہ سب اسی کا منحصر ہے ۔ میرے سینگ تو نہیں کہ خواہ مخواہ لڑتا پھروں ۔ ڈیزی ! میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔ تمھاری زلفوں کا اسیر ۔ تمھاری آنکھوں کا متوالا ہوں ۔ مجھے تمھاری ہر چیز سے محبت ہے ۔

دوشیزہ ۔ میں بھی تمھاری پوجا کرتی ہوں جم ! مجھے تم ساری دنیا سے زیادہ پیارے ہو !!!

جوان ۔ یا اللہ تیرا شکر ہے ! شاباش ڈیزی میں یہی سننا چاہتا تھا ۔ آؤ مجھے پیار کرو ۔

دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاتے ہیں ۔ اتنے میں دور سے کسی کے گانے کی آواز آتی ہے ۔ دوشیزہ تڑپ کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے اور مڑ کر دریا کے کنارے والے راستہ کو دیکھتی ہے ۔ جوان پاس والی جھاڑی میں چھپ جاتا ہے آواز قریب تر ہو جاتی ہے ۔

میخانۂ الفت میں ✦ فردوس مسرت میں

اس شوخ حسین کے ساتھ ✦ اک جشن مناؤں گا

دوشیزہ ۔ یہ وہی ہے !

جوان ۔ گھبراؤ نہیں ! میں تو یہیں ہوں !!

گانا ختم ہو جاتا ہے ایک فوجی چٹان کی دوسری جانب سے آتا دکھائی دیتا ہے ۔ سنہرے بال دھوپ میں چمک رہے ہیں ۔ بھورا رنگ ۔ چھریرا بدن ۔ لبوں پر مسکراہٹ ۔ لیکن چہرے سے تھکن ظاہر ہوتی ہے ۔

فوجی ۔ ہیلو ڈیری ! میری پیاری ڈیزی !!

(دوشیزہ آنے والے کے مقابل راستہ روکے کھڑی ہے ۔ تھوڑے سے تامل کے بعد جواب دیتی ہے)

ہلو جیک ! مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے ۔

فوجی :۔ کہو کہو ڈیزی! آج کے مبارک دن کیا کہنا ہے؟ مجھے بھی تم سے اتنی باتیں کہنی ہے کہ سالوں میں پوری نہ ہوں۔ ڈیزی! تم مجھ سے ناراض تو نہیں؟

دوشیزہ :۔ تم بہت دیر سے آئے۔

فوجی :۔ یہ سچ ہے۔ مگر فوجی قوانین پر کس کا بس ہے۔ میں دیر سے آنے پر مجبور تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمھیں بھول گیا تھا۔ نہیں بلکہ میں ہر وقت تمھاری ہی یاد میں مگن رہتا تھا۔ جوں جوں واپسی کا دن قریب آتا جاتا تھا۔ میری مدہوشی بڑھتی جاتی تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ جب یہاں سے نجات ملی تو تمھارے ساتھ خوب جشن مناؤں گا۔ ہنسوں گا قہقہے لگاؤں گا سراپا عشرت بن جاؤں گا۔ غرض تمھارے ملنے کی خوشی مجھے دیوانہ کئے دیتی تھی۔ تمھیں یاد ہوگا، ڈیزی کہ جب جانے سے پہلے تم سے اسی جگہ رخصت ہو رہا تھا تو تم نے مجھ سے کہا تھا "جنگ سے جلد واپس آنا اور مجھ سے شادی کرنا" مجھے تمھارے یہ الفاظ آج تک یاد ہیں۔ میں فوجی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ آؤ مجھ سے شادی کرکے میری دنیا کو عیش و مسرت سے بھر دو۔ زندگی کی کلفتوں کو محبت کے نغموں میں گم کردیں۔ آؤ میری پیاری میرے قریب آؤ۔

دوشیزہ :۔ نہیں!

فوجی :۔ (حیران ہوکر) نہیں! کیوں نہیں؟

(جوان جھپٹ کر جھاڑی سے نکلتا ہے اور دوشیزہ کے پاس آکر کھڑا ہوجاتا ہے)

جوان :۔ اس لئے!

فوجی :۔ میں آپ کو نہیں پہچانتا۔ کون ہیں یہ ڈیزی؟

دوشیزہ :۔ یہ میرے منگیتر ہیں۔

فوجی :۔ اب سمجھا! کیا میں آپ کا خنجر دیکھ سکتا ہوں۔

جوان :۔ (جس کے ہاتھ میں برہنہ خنجر ہے) خبردار! میرا مذاق مت اڑانا۔

فوجی :۔ خدانخواستہ میں آپ کا مذاق کیوں اڑاؤں مجھے تو تمام چیزوں پر ہنسی آتی ہے خود اپنی ذات پر بھی اچھا تو آپ سے کب ملاقات ہوئی ڈیزی؟

جوان :۔ دل سے دل ملنے دیر نہیں لگتی۔

فوجی :۔ بڑی خوشی کی بات ہے! میں ڈیزی کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کے دل کی حفاظت کرنا۔

جوان :۔ کیا بکواس ہے! ڈیزی میری ہے مجھ کو تمھیں کہنے کی ضرورت نہیں۔ جو چیز میری ہے مجھے فکر ہی رہے گی۔ اب تمھیں کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

فوجی :۔ یہی تو میں بھی عرض کر رہا ہوں جناب! آپ خواہ مخواہ الجھ رہے ہیں۔ میں نے مصیبت کا نہایت خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ہے اور گزشتہ چار سال میں ایک مرتبہ بھی ملول نہیں ہوا۔ آپ اپنی درشت کلامی سے میرے جذبۂ مسرت کو مٹانے کی لاکھ کوشش کریں لیکن کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ خدا حافظ

پیاری ڈیزی!

دوشیزہ فوجی کی طرف بڑھتی ہے۔

جوان :۔ دور رہو اس سے!

دوشیزہ ہچکچا کر رک جاتی ہے اور دفعتہ رونے لگتی ہے۔

فوجی :۔ ہیں یہ کیا ڈیزی! روتی کیوں ہو؟ میں نے لاکھوں دلدوز مناظر دیکھے ہیں لیکن کسی دوشیزہ کا رونا نہیں دیکھا جاتا۔ ہم میں سے کس سے شادی کروگی؟ بولو تمھیں کون پسند ہے؟

دوشیزہ :۔ (جوان کی طرف اشارہ کرکے) وہ

فوجی :۔ بس ٹھیک ہے۔ خوش رہو۔ آباد رہو۔ میری آرزو تھی کہ تم سے مل کر خوب جشن مناؤں گا سو وہ آرزو پوری ہوگئی۔ تم سے مل لیا اب خوشی مناؤں گا۔

خدا حافظ ڈیزی!

(ہنستا ہوا چلا جاتا ہے دوشیزہ اور جوان دونوں کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ یہاں تک وہ نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور صرف قہقہے کی آواز سنائی دیتی ہے۔)

جوان :۔ آخر اسے ہو کیا گیا ہے!

دوشیزہ :۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ شائد.........

(گالزوردی)

مرزا متین احمد بیگ [illegible]

دکن میں عمارت بیدر کی ابتداء

[illegible] کہ بیدر کا عروج بہمنی دور میں ہوا اس وقت اس شہر کی آبادی (۲۰،۰۰۰) لاکھ سے کم نہ تھی۔ سلاطین بہمنی نے بیدر کو ایسا بہتر نمونہ پیش کیا جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں مشکل ملتی ہے۔ ان کی سطوت و جبروت کی دھاک تمام دکن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پانچ لاکھ سے زیادہ کی جمعیت تیر ہزار ہاتھی کا دل جنگ میں رہتا تھا اور ایک ہی عزم ہو کا نہ میں کئی علاقے مفتوح ہو جاتے تھے۔ باایں ہمہ متانت و سنجیدگی بلند حوصلگی اور خلوص نیت کا اسلامی نمونہ، انصاف و معدلت کے ساتھ حکمرانی کرنا زراعت و صنعت و حرفت میں دلچسپی لینا یہ تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ علوم و فنون کے قدردان تھے۔ ایران۔ عراق۔ عجم۔ عرب مصر۔ ترکستان اور شام کے علماء شہرت سلطنت کی وجہ سے بلا طلب جوق جوق چلے آتے تھے۔ یہاں ان کی آؤ بھگت ہوتی تھی اور بادشاہ بے انتہا مراعات سے کام لیتے تھے۔ جن روشن دماغ بادشاہوں کے ایسے کارنامے ہوں پھر انھوں نے علوم و فنون کی اشاعت و ترویج کے واسطے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلاطین بہمنی نے اپنے ڈیڑھ دو سو برس کے زمانۂ حکمرانی میں علوم و فنون کی وہ سرپرستی کی جو شاید ہی کسی حکومت نے کی ہو۔ یہی سبب تھا کہ ممالک اسلامیہ کے ایسے چیدہ اور برگزیدہ علماء نے بیدر میں بود و باش اختیار کی۔ جن کے فیض سے بیدر مالا مال ہو گیا اور خود بیدر میں اس پایہ کے علماء پیدا ہوئے کہ جن کے فیوض علمی کی آبیاری سے نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان کی درس گاہیں سیراب ہو رہی ہیں۔

شیخ محمد الدین جلال حمزہ بڑے پایہ کے عالم و فاضل گزرے ہیں۔ آذری تخلص تھا۔ حضرت شیخ محی الدین طوسی کے مرید تھے حضرت شاہ نور الدین کرمانی کے مصاحب بھی تھے۔ جواہر الاسرار عجائب الدنیا۔ سعی الصفا۔ بہمن نامہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں شہاب الدین احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر تشریف لائے۔ احمد شاہ بہمنی کے زمانہ تک آپ نے بہمن نامہ لکھا ہے اور اس میں عمارات شاہی و قصر شاہی کے متعلق قصیدہ بھی درج ہے آپ بڑے پایہ کے شاعر اور تصوف میں کامل تھے۔ حج حرمین شریفین سے فارغ ہو کر اسفراین سے بیدر آئے اور ایک مدت رہ کر پھر وطن کو واپس ہوئے۔ (۳۵) برس کی عمر میں سنہ ۸۶۶ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

ملا سامعی یہ بڑے زبردست شاعر اور اپنے وقت کے مانے ہوئے ہیں۔ آپ علاء الدین شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر آئے آپ کا یہیں وصال ہوا۔ ملا سید طاہر استرآبادی علم لغت اور نجوم میں زبردست عالم ہوئے ہیں آپ شاعر بھی تھے علاء الدین شاہ بہمنی کے زمانہ میں آپ پیدا ہوئے اور یہیں انتقال کیا۔ محمود گاواں کے مزار کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ ملا عبد الغنی مفتی نجم الدین یہ دونوں سلطان احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور بیدر میں انتقال کیا۔ ان دونوں کے مزار بیدر میں کہاں ہیں معلوم نہ ہو سکا۔ علاء الدین بہمنی کے زمانے میں حکیم ارزقی پیدا ہوئے۔ شعر گوئی میں بڑی مہارت تھی اور اپنے زمانہ کے استاد تھے بہمنیہ زمانہ کے شاہی حکیم تھے۔ آپ کا مزار بیدر میں حضرت کرمانی صاحبؒ کی چوکھنڈی میں ہے۔ ملا محمد قاسم مشہدی بڑے لائق مجتہد اور شاعر تھے دولت بہمنیہ کے فضلائے عصر میں آپ کا پایہ ارفع و اعلیٰ تھا۔ دولت بہمنیہ کی طرف سے حافظ شیرازی کو بلانے آپ ہی کو بھیجا گیا تھا۔ حکیم کارسی علاء الدین شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر آئے۔ حکیم شاعر اور منجم تھے۔ نظام شاہ بہمنی کے اتالیق بھی تھے۔ ملا شمس الدین محمد امام اصمعی فاضل لغت کے خاندان سے ہیں محمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر آئے۔ یہ بزرگ بڑے عالم اور ولی کامل ہوئے ہیں۔

حضرت شیخ نور سمنانیؒ حضرت شاہ نعمت اللہ ملتانیؒ حضرت شاہ محب اللہ الحسینی المشہور خواجہ ابو الفیضؒ نبیرہ خواجہ بندہ نوازؒ حضرت سید سادات سید حنیف صاحب قبلہ حضر

سید شاہ زین الدین گنج نشین، مولانا حاجی سرور، سعید الدین تاج قند [illegible] مولانا شمس الدین[illegible]، مولانا علاء الدین جوہری صدر العلماء، شیخ الاسلام محمد مہیر، مولانا امیر محمد عرف مولانا منیر صاحب گوہیری، مولانا شیخ حسام الدین صاحب ملتانی، مولانا سید حسن ملتانی دولت آبادی، ملا عبدالکریم ہمدانی جیسے ہزارہا علماء اکمل فضلاء و اہل کمال نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے بیدر دکن کو علوم و فنون کا معدن بنا دیا۔

پہلے زمانہ میں مدرس کے واسطے جداگانہ عمارتوں کے بنانے کی جانب [illegible]ھ تک مسلمانوں نے توجہ نہیں کی۔ اس زمانہ کے علماء اپنے گھروں، مسجدوں اور خانقاہوں میں تعلیم و تعلم کا کام انجام دیتے تھے اور ان کا طریقۂ تعلیم بھی بالکل سیدھا سادہ ہوتا تھا۔ استاد مسجد میں بیٹھ جاتا اور اس کے گرد و پیش شاگردوں کا حلقہ بن جاتا تھا۔ اساتذ خالصتاً للہ درس دیتے تھے اور ان کے شاگرد امیر و غریب سب چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے تحصیل علم کرتے تھے اس کے بعد اسلامی دنیا میں سب سے پہلے نیشاپور اور بغداد میں مدرسے کے لئے عمارتیں تیار ہوئیں اور دوسرے ملکوں میں اس کی تقلید ہونے لگی۔ دکن میں بھی وہی قدیم طریقہ [illegible]ھ تک جاری رہا چنانچہ حضرت شیخ نور آسمانیؒ کی خانقاہ، حضرت شاہ خلیل اللہ کرمانیؒ کا آستانہ، حضرت شاہ ابراہیم قادری الملتانی کی مسجد ابھی بیدر میں موجود ہیں جن میں تشنہ کامان علم تحصیل سے سیراب ہوتے تھے۔ سلطان مراد شاہ ثانی شہنشاہ روم کا انتقال [illegible]ھ میں ہوا اور سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ [illegible]ھ میں تخت نشین ہوا تو قسطنطنیہ میں [illegible]ھ میں بیت العلوم بنانا شروع کیا تو اس کا ہمعصر یوسف عادل خان بانی خاندان عادل شاہیہ بیجاپور کے مشورے سے ملک التجار خواجہ جہاں محمود گاواں وزیر اعظم دولت بہمنیہ نے سلطان السلاطین جلال الدین محمد شاہ ثانی بہمنی کے زمانہ میں بیدر میں مدرسہ کی شاندار عمارت تعمیر کرائی جس کے چپہ چپہ سے آج بھی فیضان علم کی کیفیت مترشح ہے اور جس کے در و دیوار نقش و نگار سے مزین اور ترویج علوم و فنون کی حقیقت [illegible] مثانی [illegible] ثبوت ہے کہ لوح مدرسہ پر باہتمام و اہل [illegible] یہ صدا آویزہ گوش ہے کہ

قال اللہ تعالیٰ وسیق الذین اتقوا ربہم الی الجنۃ زمرا حتی اذا جاءوھا وفتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوا من الجنۃ ...... [illegible] رب العالمین۔

[illegible]ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور [illegible] سال کی مدت میں اس کی تعمیر ختم ہوئی اور [illegible]ھ میں افتتاح ہوکر سلسلۂ درس کا آغاز ہوا۔ تاریخ تعمیر آیت قرآن شریف ربنا تقبل منا سے [illegible]ھ نکلتی ہے یہ ایسی و مانیہ تاریخ ہے جس کے سبب محمود گاواں کا مدرسہ مقبول عام ہوا۔ یہ چو گوشہ مستطیل اور نہایت خوبصورت نفیس و دلفریب وضع کی عمارت ہے جس کی نقاشی اور ساخت بے نظیر ہے۔ طول (۰۰) گز اور عرض (۵۵) گز ہے۔ دو مینار اور سہ کاسہ چند گنبدوں کے بنوائی گئی تھی۔ میناروں کا ارتفاع (۱۲۵) فٹ ہے اور سمنان و کاشغر کی عمارتوں کی وضع پر بنائے گئے تھے۔ تعمیر مدرسہ میں سنگ سیاہ اور مضبوط اینٹ اور چونہ سے سارا کام لیا گیا ہے اور عمدہ عمدہ قدیم مسالے سے اس کی مضبوطی کی گئی ہے۔ رو کار اور مینار مدرسہ پر بہت رونقی چینی نقش و نگار کا کام ہوا ہے اور نہایت نفاست سے آیات قرآنی کی تحریر کی گئی تھیں جن میں تین فٹ کے قریب حروف موٹے ہیں اور وسعت حروف ۶ انچ سے کم نہیں ہے۔ قلم اتنا خوش خط اور بے نظیر نسخ اور دوائر پر مبنی ہے کہ گھنٹوں دیکھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی اور آنکھوں میں تازگی آتی جاتی ہے اور ہر زندہ دل سیاح اور فنون لطیفہ کے شائق کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ ہندوستان کی ساری قدیم و جدید عمارتوں میں مدرسہ محمودیہ کے جیسی عمارت ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی اور نہ دکن میں اس کی نظیر ہے۔ حالانکہ اس کے بعد سلاطین بحری و عادل شاہی نے اپنے اپنے شہروں احمد نگر

[illegible] ایک بہت ہی عمدہ طرح کا تعمیر کیا تھا لیکن اب [illegible] محمود گاواں کو مدرسہ کے [illegible] کی خدمت کے لئے [illegible] تھا اور [illegible] کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

عہد بہمنیہ میں لاکھوں روپیہ کی آمدنی کی جاگیرات اور عطیات مدرسہ کے لئے وقف تھے۔ اس کی فیاضی سے درس و تعلیم، مدرسہ کے اخراجات اور طلبہ کے طعام و قیام اور لباس کے مصارف پورے ہوتے تھے۔ سلطان محمود شاہ بہمنی کے زمانہ تک یہ مراعات جاری رہیں۔ مدرسہ کی ترمیم و آہک پاشی [illegible] کا ایک خاص انتظام تھا اس کے لئے ہر سال مدرسہ بہمنی جاگیر کے علاوہ کئی ہزار تنکہ (اس زمانہ کا سکہ) [illegible] دیے جاتے تھے۔ اس کی اصل سند راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

حضرت شیخ بہاء الدین سہروردی کے مرید و خلیفہ حضرت شیخ جلال الدین جمالی تھے۔ اپنے مرشد کے اشارہ سے جمالی تخلص فرمانے لگے۔ وہاں سے آپ حجاز تشریف لے گئے سلطان مرزا والی ہرات کے زمانہ میں ہرات پہونچے اور مولانا میر علی شیر کے توسل سے حضرت جامی کے پاس تشریف لے گئے جہاں ایک عرصہ تک رہے۔ آپ نے حضرت جامی کو بیدر چلنے کے لئے توجہ دلائی اور مولانا جامی علیہ الرحمۃ نے شیخ جمالی کو جامعہ محمودیہ کی صدارت کے لئے تحریک کی لیکن زوال سلطنت بہمنیہ کے حالات سے دونوں بزرگوں نے ارادہ ترک فرمایا۔ وہاں سے شیخ جمالی ہندوستان آگئے اور بابر کی صحبت میں رہے آپ کا وصال ۹۴۲ھ میں ہوا دہلی میں مزار ہے۔ آثار صنادید میں آپ کا ذکر ہے۔ ملا داؤد بیدری، قطب العصر مولانا شیخ ابراہیم قادری الملتانی، شیخ ابراہیم سرہندی، حافظ عبدالعزیز قادری ملا اس مدرسہ کے امام المتکلمین تھے۔ میری مرتبہ کتاب "جامعہ محمود گاواں" میں مفصل حالات درج ہیں جو ہنوز طبع نہیں ہوئی۔

مدرسۂ محمود گاواں کا نصاب تعلیم یہ تھا۔ صرف و نحو عربی زبان میں، منطق۔ ریاضیات۔ ہندسہ۔ ہیئت۔ فقہ حدیث۔ علوم معقول و منقول۔ حکمت۔ ادب اور معنی میں [illegible]

ہوتا تھا۔ بعض درجوں میں علوم دینیات کے درس کی نشستیں تھیں اور بقیہ حصوں میں حفاظ اور تجوید قرآن اور حدیث کے طالب علم رہتے تھے۔ جہاں روزانہ صحیح بخاری شریف کے درس سے پہلے اس کا ختم ہوتا تھا۔ اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ ابتدائی جماعتوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ایسے طلبہ "معید" کہلاتے تھے۔

امتحانات مدرسہ محمودیہ۔ اس میں تعلیم کے دو درجے تھے۔ ملازم اور مدرس۔ پہلا امتحان کامیاب ہونے پر ملازم کی سند ملتی تھی اور طالب علم کا نام ایک خاص رجسٹر میں جس کو روزنامچہ عالیوں کہتے تھے درج ہوتا تھا۔ درجہ ملازم کے نصاب کے دو حصے تھے۔ پہلے میں بلاغت اور علم کلام کی انتہائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، اور دوسرے میں اصول فقہ تفسیر حدیث عقائد کی تعلیم ہوتی تھی۔ ملازم صرف دوم درجہ کے شہروں کا قاضی (جج) یا نائب قاضی (اسسٹنٹ جج) ہو سکتا تھا۔

مدرس کے درجوں کے لئے کوئی خاص مضمون یا امتحان نہ تھا بلکہ ایک مدت معینہ تک لازم تھا کہ وہ اونچی جماعتوں کو خاص خاص مضامین پر لکچر دیا کرے اس مدت کے بعد ان کو ایک سند ملتی تھی۔ مدرس کو سند ملنے کے بعد ان کو سلطنت پر جلیل القدر منصب کا استحقاق ہو جاتا تھا۔ بلحاظ تعلیم مدرس کی کئی قسمیں تھیں۔ کاتب۔ منشی۔ مولوی۔ ملا۔

ملا تعلیم کا سب سے آخری درجہ تھا۔ وزارت۔ قضاۃ۔ صدارت۔ قاضی القضاۃ کی خدمتیں انہیں کو دی جاتی تھیں۔

ملا تاج اللہ قاضی القضاۃ۔ ملا راج اللہ صدر العصر ملا نجن۔ ملا محمود صدر جہاں کے لقب سے عہد بہمنیہ میں عرصۂ دراز تک وزیر اوقاف و عطیات رہے۔ عہد بہمنیہ میں علوم و فنون کی اشاعت اس وسیع اور مستحکم پیرایہ سے ہوئی تھی کہ چھوٹے چھوٹے قصبات اور مواضعات تک ملا نظر آتے تھے۔ ایک صدی تک ان کی یہ گرم بازاری کروڑوں مسلمانوں کے امن و امان کا باعث ہوئی اور اب بھی ہزاروں مواضعات میں پچھلے نامور ملاؤں کے خاندان کی یادگاریں کچھ نہ کچھ پائی جاتی ہیں۔ ان کی تلاش سے قدیم خاندانوں کے شجرے اور حالات دستیاب ہو سکتے ہیں۔ میں نے اس قسم کا بہت کچھ مواد جمع کر لیا ہے۔

سید محمد بیدری

بات میں بات

ہر گلکدہ نیچر کی خوشبو سے مہکتا ہے
ہر مزرعہ نیچر کے دامن میں لہکتا ہے

گاتی ہے صبا غزلیں نیچر کے سوا کس کی
معمورِ لطافت ہے ہر صنفِ لطیف اس کی

بہتے ہوئے دریا کیا خاموش ہی بہتے ہیں
بہتے ہیں تو نیچر کے کچھ راز بھی کہتے ہیں

گل پیرہنوں پر بھی نیچر کا تصرف ہے
ہے ہے یہ جمالستاں۔ جو پھول ہیں [illegible]

ننھے سے جو یہ گیند سے ہنستے ہیں بولوں میں
کیا ان کو بھی نیچر نے پالا نہیں جھولوں میں

پھولوں کو نسیم ایسے جھولوں میں جھلاتی ہے
تخئیل سے ہی جن کی نیند اب مجھے آتی ہے

گلشن ہی کے پھولوں میں نیچر کی جھلک ہے کیا
نیچر ہی کا جلوہ ہے تاروں کی چمک ہے کیا

جھرمٹ میں ستاروں کے جو زلف ہے کمر بستہ
چاند آئے گا لینے کو کس حور سے گلدستہ

دروازہ پہ سورج کے کب چاند نے دستک دی
سورج کی تپش نے ہی کیا چاند کو ٹھنڈک دی

ہے چاند بھی نیچر کا سورج بھی ہے نیچر کا
نیچر کے مظاہر بھی ہیں حسن فزا کیا کیا

نیچر ہی کے دامن سے وابستہ ہے شعریت (۲)
بے کیف نہیں ہوتا یہ عالمِ کیفیت

چلتی ہے مری دنیا نیچر کے اشاروں پر
احساس شگفتہ ہے فی الحال بہاروں پر

نیچر میں ہوں میں بھی گم یہ گم شدگی میری
اے تابعِ فنکاراں! محتاج نہیں تیری

جو کچھ بھی میں لیتا ہوں نیچر ہی سے لیتا ہوں
داد ایسے عطیہ پر نیچر ہی کو دیتا ہوں

ہے سب سے بڑی مجھ میں بس ایک یہی خوبی
تقلید نہیں کرتا دنیا میں کسی کی بھی

اشعار مرے بالکل نیچر کے مطابق ہیں
لفظاً بھی موافق ہیں معناً بھی موافق ہیں

تو محوِ تصنع ہے نیچر پہ نظر میری
ہاں ہاں مرے رستے سے ہے راہ جدا تیری

آتا ہے تجھے مجھ پر کیوں رشک خدا جانے
کیا مجھ میں وہ جوہر ہے تو جس کو بھلا جانے؟!

آگاہ میں اس سے ہوں جو تیرا تہیہ ہے
یہ لطفِ سخن یکسر قدرت کا عطیہ ہے

قدرت کے عطیہ کو اے بوالہوسِ یکتا
تو چھین نہیں سکتا میں بیچ نہیں سکتا

سید علی منظور

برسات کی ایک رات

(تنقید رواں)

برسات کی رات کا سماں ہے
چاند ابر کے پردہ میں نہاں ہے
بجلی مچل رہی ہے سو رنگ
دامانِ جمالِ آسماں ہے
وہ چاند نے گویا آنکھ کھولی!
سرچشمۂ نور ضو فشاں ہے

کرنیں ہیں کہ نور کے ہیں زینے
اف کتنا قریب آسماں ہے
تارے سوئے ہوئے ہیں شاید
غائب تنویرِ کہکشاں ہے
لے دے کے ہوا تھا چاند بیدار
لو پھر وہ نگاہوں سے نہاں ہے

لیکن مرے دل کی بزمِ غم میں
تو معطرازِ جانِ جاں ہے
میں ہوں ترا ذکرِ دل نشیں ہے
میں ہوں تری یادِ دلستاں ہے
آنکھوں کو ہے شغلِ گریۂ پیہم
دل عاشقِ نالہ و فغاں ہے

لی بدلی نے اک اور کروٹ
روئے مہتاب پھر عیاں ہے
بدلی کے کنارے ہیں منور
تارِ سیماب ضو فشاں ہے
یہ چاندنی کا جمالِ صد رنگ
لب بستہ سی طاقتِ بیاں ہے

پھر لکۂ ابر آگے آیا
پھر عارضِ ماہ بے نشاں ہے
انوار میں امتزاجِ ظلمت
ظلمت میں نور ضو فشاں ہے
آواز اک آئی "پی کہاں" کی
مطلب یہ کہ تیرا پی کہاں ہے؟

یہ رات۔ یہ نالۂ جگر دوز
خاموشی کو حسرتِ فغاں ہے
یہ رات یہ اشتیاق کا جوش
ہر جذبۂ دل مری زباں ہے
یہ رات یہ دلنواز منظر
اے داورِ حسن تو کہاں ہے

یہ رات یہ ابر و ماہ کا حسن
فطرت کا کمالِ فن عیاں ہے
گم ہیں دل و نظر کہیں اور
مجھ کو کچھ اور ہی گماں ہے
مہتاب کے عارضِ حسیں پر
شاید ترے بوسہ کا نشاں ہے

عبدالعزیز فطرت

[illegible]
[illegible] صاف تھا۔ جواب
[illegible] ایک [illegible]
[illegible]
[illegible] پھر [illegible]
جاتی ہے)

سلیم۔ (اندر سے بولتا ہوا آتا ہے۔ قدموں کی چاپ دروازے کے نزدیک آکر رک جاتی ہے)۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر مجھے بھی ــــ ہیں! ــــ ارے بھئی ــــ (آہستہ سے) نام تک بھی دریافت ــــ (بلند آواز سے) ارے بھئی ــــ بھئی اجنبی! ــــ ارے مسافر میاں! ــــ اے کسی دوست کا پتہ پوچھنے والے!

(وقفہ۔ بادل گرجتا ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے اور بارش برسنے لگتی ہے۔)

ــــ بیچارہ ــــ بیچارہ! بے چارہ بھیگ جائے گا۔ ٹھٹھر جائے گا۔ کسی نالی میں گر کر اکڑ جائے گا ــــ مجھے سوچنا چاہیے تھا۔ اپنی پریشانیوں کا شکار ایک میں ہی کیا کم ہوں کہ ایک بیچارے بھٹکے ہوئے مسافر کو ــــ (رک جاتا ہے ــــ دور سے پانی میں چلنے کی آواز)

بوڑھا۔ (دور سے نزدیک آتے ہوئے) ارے بھئی اس محلے میں کوئی اللہ کا بندہ جاگ بھی رہا ہے کہ سب کے سب مر گئے؟ ([illegible])

سلیم۔ میں زندہ ہوں بھئی ــــ میں جاگ رہا ہوں ــــ کیا بات ہے بھلا (انداز [illegible])

بوڑھا۔ دم رکتے رکتے سردی سے پسلی تک ہل جائے۔ یہ کڑاکے کا جاڑا ــــ بیٹے ــــ یہ جاڑا ــــ بے انتہا ــــ مر جاؤں گا میں ــــ آہ!

سلیم۔ اندر آجاؤ ــــ اندر آجاؤ ــــ اندر آکر باتیں کرو (قدموں کی چاپ ــــ دونوں اندر کمرے میں) بیٹھ جاؤ ــــ لکڑیاں سلگ رہی ہیں ابھی ــــ تم وہ ایک [illegible] ــــ میں تمہارے لئے انڈے لے آؤں ابلے ہوئے ــــ تم کانپ رہے ہو ٹھنڈ سے۔

بوڑھا۔ انڈوں وڈوں کی ضرورت نہیں بیٹا ــــ تم بیٹھو۔ خود ہی آگ تاپ لوں گا [illegible] منہ سے بھاپ نکلتی [illegible] دانتوں [illegible] کی آواز)

بوڑھا۔ بس میرے بچے ــــ اب فاصلے سمٹ گئے ہیں ــــ تم مجھے کوئی خاندانی نظر آتے ہو۔ اس عمر میں یہ تہذیب و تہذیب ــــ یہ رکھ رکھاؤ ــــ یہ مسافر نوازیاں ــــ خاندانی ہی تو کیا کرتے ہیں یہ ــــ تم اس گھر میں اکیلے رہتے ہو بیٹا؟

سلیم۔ بالکل اکیلا۔

بوڑھا۔ جی نہیں اکتاتا؟

سلیم۔ اکتاتا تھا کسی زمانے میں۔ مگر اب تو چڑیا بھی آجائے کمرے میں تو وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ چاہتا ہوں۔ بس یونہی تنہا پڑا رہوں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا۔

بوڑھا۔ میرا آنا تمہیں ناگوار تو نہیں گزرا؟

سلیم۔ بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔

بوڑھا۔ لیکن تم گھبرائے ہوئے سے تھے کچھ؟

سلیم۔ بات یہ ہے بڑے میاں کہ تم سے پہلے ایک شخص آیا تھا یہاں۔ کسی دوست کا پتہ پوچھتا پھر رہا تھا۔ میں دن بھر تنہا بیٹھے بیٹھے تھک جاتا ہوں۔ تو کسی سے تعلقات بڑھا کر اپنے آپ کو محبوس کر دینے کی بجائے راہ چلتوں پر پھبتیاں کستا ہوں۔ انہیں بیوقوف بناتا ہوں۔ اس طرح میرے دل کو تسلی ہوتی ہے۔ اس بے چارے سے بھی میں نے یونہی کیا۔ بات تک نہ کرنے دی۔ اسے یقین ہو چکا ہو گا کہ میں دیوانہ ہوں۔ ہوا سے یہ کھڑکی بجنے لگی۔ میں اسے بند کرنے اندر آیا۔ اور جب باہر جا کر دیکھا تو وہ غائب تھا!

بوڑھا۔ نام کیا بتایا تھا اس نے؟

سلیم۔ میں نے اسے نام بتانے کا موقع ہی نہیں دیا۔

بوڑھا۔ کیسا تھا؟

سلیم۔ اندھیرے میں خاک نظر آتا۔

بوڑھا۔ آواز کیسی تھی اس کی؟

سلیم۔ آواز؟ ــــ آواز کے متعلق میں کیا کہوں ــــ بس یوں سمجھ لو کہ ــــ کوئی پچیس چھبیس کے لگ بھگ کی عمر والوں کی آواز میں جو ایک قسم کی ــــ ایک قسم کی تھرتھراہٹ ــــ یا یوں کہہ لو کہ لرزش سی کپکپاہٹ سی، جھرجھری سی ــــ یعنی ــــ یعنی کراری آواز تھی!

بوڑھا۔ یہ نہیں بتایا کہ اسے کون سے

نمبر کی تلاش تھی؟

سلیم :- میرے مکان کا نمبر پوچھا تھا بیچارے نے۔ مگر میں ٹال گیا۔

بوڑھا :- تم نے ظلم کیا بیٹا۔ تمھاری سنجیدگی اور حلم دیکھ کر تو میں شک تک نہیں کر سکتا کہ تم ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں بھی کر سکتے ہو۔ تم نے بہت برا کیا۔

سلیم :- میں بہت شرمندہ ہوں۔ دراصل میرا خیال تھا کہ جب اس کی مایوسی آخری حد تک جا پہنچے گی تو میں اسے گلے لگا لوں گا، اسے اندر لے آؤں گا چائے پلاؤں گا، سگرٹ پیش کروں گا، اسے اس کے دوست کے گھر چھوڑ آؤں گا۔ مگر اس پر میری وحشت کا میرے اندازہ سے کہیں زیادہ اثر ہوا۔

بوڑھا :- بھٹکے ہوؤں سے مذاق نہ کیا کرو بیٹا۔ ورنہ تقدیر کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں اور وہ ایسے مذاق کر گزرتی ہے کہ پچھتاوا بیکار ثابت ہوتا ہے۔ تم کیا جانو۔ میں نے تمھاری طرح کتنوں سے مذاق کیا، کتنوں پر پھبتیاں کسیں، کتنوں کو سیدھی راہ سے بھٹکایا، میں نے ہزاروں سے ——— (رک رک کر تھمنے کے بعد) تم نے کسی عورت کا بھی مذاق اڑایا ہے؟

سلیم :- رہنے دو ایسی باتوں کو بڑے میاں!

بوڑھا :- اس میں شرم کی کونسی بات ہے؟

سلیم :- کیا فائدہ ایسی باتوں کا۔ یونہی ——— خواہ مخواہ ——— بس پریشانی ہوگی مفت میں۔

بوڑھا :- تم ہاں یا نہیں میں جواب دے دو۔ تم نے کسی عورت کا بھی مذاق اڑایا ہے؟

سلیم :- خدا جانے تم کون ہو بڑے میاں۔ رات کا تو کیا، دن میں صبح کو بھی دو گھڑی کہیں میری دکھتی رگیں ٹٹول کر تسکین کیا لو گے۔ میں تلخ اور کڑی حقیقتوں سے منہ موڑے خوابوں کا رسیا ہوں آج کل۔ فضول باتیں سوچتا رہتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ یہ کارنس جس کے دونوں سرے دیوار میں پیوست ہیں اگر چھت سے الگ ہو کر فرش اور چھت کے درمیان معلق ہو جائے۔ بوسنے لگے گانے لگے ——— (ہنستا ہے) اور اگر روشندانوں کی دوریاں سانپوں کی طرح بل کھاتی فرش پر رینگنے لگیں۔ اور اگر یہ دری سلیمانی کہانیوں کی جادو کی دری کی طرح مجھے ساتھ لیتی اوپر فضا میں اڑ جائے۔ اگر ———

(بوڑھا کھانستا ہے)

اگر آگ کا ایک شعلہ گول مول گیند سی بن کر میرے سر کے ارد گرد گھومنے لگے۔

بوڑھا :- یعنی سب ان ہونی باتیں میری مرضی کے مطابق ہونے لگیں۔ تو جی بہلا ہے میرا۔

بوڑھا :- یعنی تمھارا جی دکھی ہے آج کل؟

سلیم :- میں بہت دکھی ہوں بڑے میاں بہت دکھی ہوں۔ اور آج تو ——— اور بیچارا اجنبی ——— کسی ماں کا لال ——— بھٹکا ہوا بے کس مسافر ——— ٹھٹھر رہا ہو گا کسی دکان کے تختے تلے میں بڑا بیوقوف ہوں۔

بوڑھا :- پچھتاوا بے سود ہے میاں ——— تمھارا نام کیا ہے؟

سلیم :- سلیم ——— اور تمھارا؟

بوڑھا :- میرا نام کبھی محمود المظفر علی خان تھا، مگر اب تو محمود ہی کافی ہو گا۔ مجھے کے گھٹنے اور بڑھنے کے ساتھ ساتھ نام بھی گھٹتے رہتے ہیں۔ ایک زمانے میں سارے شہر کا مشہور ٹھیکے دار تھا۔ کوڑی لاکھا تھا، اثر پاتا تھا۔ بڑے مزے سے گزر ہوتی رہی کہ اچانک۔ (باہر بہت زور سے گرجتا ہے)

سلیم :- بیچارا اجنبی۔

بوڑھا :- ہاں تو بڑے مزے سے گزر ہوتی رہی کہ اچانک ایک ناگن ———

(رک جاتا ہے)

سلیم :- ناگن؟

بوڑھا :- یعنی عورت ——— لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

سلیم :- رکھے ہوئے ناسور کو پھر سے چھیڑ دو گے بڑے میاں۔ اور پھر یہ تو تم جانتے ہو گے کہ ———

بوڑھا :- (فوراً بات کاٹ کر) کہ ناسور بہنے لگیں۔ تو بڑی مشکل سے رکتے ہیں۔

سلیم :- بالکل!

بوڑھا :- لیکن اگر پیپ بہتا رہے تو صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ ورنہ رگ رگ میں زہر بھر جاتا ہے اور ———

سلیم :- (بات کاٹ کر) یعنی تم میرا دکھڑا سن کر ہی دم لو گے!

بوڑھا :- شاید میں تمھارے کسی کام آ سکوں۔

سلیم :- کام وام تو رہی باتیں ہیں۔ کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ یہ دنیا خود غرضوں کی بستی ہے۔ میں کہتا ہوں مجھے

تمہارے [illegible]
[illegible] گے۔
بڈھا۔ [illegible] لیکن تھا
[illegible]
[illegible] ہاں میرا [illegible]
[illegible] غرض بھی
ہو!
سلیم۔ بیچارا، انھیں یاد آگیا مجھے۔
اس کا شکریہ کوئی بھی پہرہ!
بڈھا۔ اتنے جذباتی ہو تو یہ رتبہ
ہی نصیب ہو سکتا ہوتا!
سلیم۔ وہ جذبات کی ایک رو تھی!
بڈھا۔ اور یہی جذبات کی ایک رو
ہے ——— اور پھر یہ تو تم نے پانچویں
جماعت میں پڑھا ہوگا۔ کہ ندیاں گزر
جاتی ہیں!
سلیم۔ عجب آدمی ہو،
بڈھا۔ تمھاری عنایت ہے ———
ہاں تو کیا تم ———
سلیم۔ بات کاٹ کر، سناتا ہوں
بابا سناتا ہوں۔ کرسی آگے کھینچ لو ذرا
(کرسی کی آواز) ہوں، ہاں تو کیا سوال
تھا تمھارا؟
بڈھا۔ کیا کبھی تم نے کسی عورت کا بھی
مذاق اڑایا ہے؟
سلیم۔ میں کسی عورت کا مذاق نہ
اڑا سکا۔ البتہ ایک عورت نے میرا مذاق
ضرور اڑایا ہے!
بڈھا۔ کیسے؟
سلیم۔ یہ بھی عام طریقے سے،

بڈھا۔ آخر محبت کیسے ہوئی؟
سلیم۔ جیسے آج کل کے نوجوان
کو ہو جاتی ہے۔ جیسے بہار آتی ہے کلیاں
مسکراتی ہیں، چٹکتی ہیں۔ پھول بنتی
ہیں۔ اور مرجھا جاتی ہیں!
بڈھا۔ یہ شاعری ہے! ———
ذرا آنچ کم کرو بھئی۔ گرمی ہونے لگی ہے
باہر بارش بھی رک گئی ہے شاید۔ (وقفہ)
رک گئی ہے، کھڑکی سے آسمان دیکھو
سلیم میاں۔
سلیم۔ (قدموں اور کھڑکی کی آواز)
آسمان صاف ہو رہا ہے! (واپس آکر
کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)
بڈھا۔ پھر میں تو تمھارا حال سن کر ہی
جاؤں گا۔ معاف کرنا بھئی، مجھے ایسی باتیں
کرنے کا حق تو نہیں لیکن تمھاری نرمی اور
ظرافت دیکھ کر یہ جرأت کر بیٹھا ہوں۔
سلیم۔ آدھ گھنٹہ پہلے تم مجھ سے
ملکر شاید مایوس ہوتے لیکن اس بے گھر سفر
نے میرے احساسات کی دنیا بدل دی ہے،
وہ بدو عادات ہے کہیں۔
بڈھا۔ کوئی کرنہ گدا ڈھونڈھ لے گا۔
تم کیوں جان ہلکان کرتے ہو اچھی، ہاں تمھیں
محبت ہو گئی ایک لڑکی سے۔ کیا تھا اس
لڑکی کا نام؟
سلیم۔ نام وام سے تمھیں کوئی سروکار
نہیں ہونا چاہیے۔
بڈھا۔ لیکن اگر تم مجھے نام بتا دو تو کیا
میں ڈھنڈورا پیٹتے لوگوں کا گلی گلی میں؟
میں بوڑھا بیچارا ——— ستر ا بہتر ا۔

نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت ———
نہ اپنی ———
سلیم۔ (بات کاٹ کر) پروین تھا
اس کا نام
بڈھا۔ کیا؟
سلیم۔ پروین۔
بڈھا۔ ٹھیک ہے۔
سلیم۔ کیا مطلب؟
بڈھا۔ یعنی اگر تم کوئی ایسا ویسا بیہودہ سا
نام لے دیتے تو میری توقعات کا دم گھٹ جاتا۔
سلیم۔ تم مجھے خوش مزاج معلوم
ہوتے ہو!
بڈھا۔ تمھاری عنایت ہے ———
ہاں تو پھر؟
سلیم۔ تو وہ لڑکی تھی بڑی ———
ایسا کوئی لفظ نہیں سوجھتا جو اس کا اخلاق
کا صحیح ترجمانی کرسکے۔ یعنی وہ بہت ———
بہت ہی ———
بڈھا۔ شرمیلی تھی۔
سلیم۔ بالکل الٹ ——— شرم تو
اسے چھو تک نہیں گئی تھی۔ بس چلتی پھرتی
چنگاری تھی وہ ——— ایک جگہ چین نہیں۔
پارے کی طرح تڑپ رہی ہے۔ کبھی صوفے
پر ہے تو کبھی قالین پر۔ کبھی کھڑکی میں
ہے تو کبھی آتش دان کے پاس ———
یہ تصویر کس کی ہے؟ یہ پردے کہاں سے
آئے ہیں؟ ریکارڈ بجاؤ ——— نہیں نہیں۔
بند کردو ریکارڈ ——— چلو سیر کو چلیں۔
نہیں رہنے دو سیر ویر کو ——— باتیں
کریں گے ——— یہ حالت تھی اس کی،

بوڑھا۔ پھر؟

سلیم:۔ پھر وہ یہاں سے چلی گئی۔

بوڑھا:۔ یعنی یہ خبر ــــــ

سلیم:۔ یعنی یہ محل چھوڑ گئی۔ اس کے ابا جان کو معلوم ہو گیا سب کچھ۔ اور پھر ایک نیا عاشق بھی پیدا ہو گیا اس کا۔ محمد اسد نامی یہیں وکالت کرتا ہے کمبخت۔ سنا ہے آج کل اس کی بس میں ہے۔ میں نے کیا کیا اہتمام کروا یا تو جا کر کہ "اتنا اس استعمال کرو طبیعت نازل ہو جائے گی"

بوڑھا:۔ بڑی خبر رکھی۔ اس کی کوئی نشانی ہے تمہارے پاس؟

سلیم:۔ چند خطوط ہیں۔

بوڑھا:۔ چلو خط ہی سن لیں۔

سلیم:۔ (کھسیانی ہنسی ہنستا ہے) ہنسنے دو بڑے میاں۔ کیوں خواہ مخواہ پریشان کرتے ہو۔ اب ختم ہوئی میری کہانی۔ تمہارا ہی احسان کیا کم ہے کہ ــــــ

بوڑھا:۔ میرا احسان!۔

سلیم:۔ ہاں ہاں۔ تمہارا ہی احسان کیا کم ہے کہ تم نے مجھے چند لمحوں کے لئے اس روحانی کرب سے بچائے رکھا جو اس اجنبی کے خوفناک تصور نے میری نس نس میں بھر دیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے ایک بے گناہ کا کلیجہ چبا لیا ہے۔ اور میرے ہاتھ اور دانت اور ہونٹ خون آلود ہو رہے ہیں ــــــ لیکن اب بارش تھم گئی ہے، چاند نکل آیا ہے، اگر اب وہ یہاں آ نکلے تو خدا کی قسم میں اٹھائے پھروں اسے، مگر وہ مجھ دکھیا کے ہاں پھر کیسے آئے گا! ــــــ اگرچہ میں نے اسے دیکھا نہیں۔ لیکن اس کی آنسو بھری

سے لبریز آنکھیں، پھیکا لباس، پیلا چہرہ سب کچھ نظر آ رہا ہے ــــــ اُف!

بوڑھا:۔ پھر وہی بات؟ سلیم میاں، کیوں دلگیر ہوئے ہو خواہ مخواہ۔ اٹھاؤ وہ خط۔ تمہارا جی بہل جائے گا اور میرا وقت کٹ جائے گا۔

سلیم:۔ (اٹھتا ہے۔ کرسی کی گھسٹنے کی آواز آتی ہے) عجب آدمی ہو بڑے میاں! اصل میں تمہارا چہرہ اتنا نورانی اور بولنے کا انداز اتنا پیارا ہے کہ مجھ سے انکار نہیں بن پڑتا ــــــ لے آتا ہوں وہ خط!

[سلیم کے قدموں کی چاپ، الماری کھلنے کی آواز اور پھر سلیم کے واپس ہونے پر قدموں کی چاپ، اس دوران میں بوڑھا یونہی گنگناتا رہتا ہے۔]

سلیم:۔ یہ ہے ان خطوں کا بنڈل۔ پہنچ کر معلوم نہیں شاید کہ میں ان خطوں کی [illegible] اسے ساری دنیا میں ذلیل و رسوا کر سکتا ہوں۔ اصل میں اسے احساس ہی نہیں، اور اگر احساس ہو جائے اسے تو زخمی کبوتر کی طرح لوٹتی پھڑکتی میرے قدموں پر آن گرے ــــــ صرف اگر اسے احساس ہو جائے اس کا ــــــ

بوڑھا:۔ سوچیں گے، سوچیں گے۔ پہلے تم کوئی خط تو سناؤ۔

(کاغذ کی آواز)

سلیم:۔ یہ ایک خط ہے۔ بیتے ہوئے دنوں کے ہیولے تیرتے پھرتے ہیں نگاہوں میں۔ لکھتی ہے:۔

پیارے سلیم [illegible]

[illegible]

(نہایت [illegible])

سلیم:۔ (ہراساں [illegible]) ارے! یہ کیا؟ ریوالور؟ [illegible] ریوالور؟ جس نے تمہیں [illegible] تھیں ــــــ

بوڑھا:۔ (بات کاٹ کر [illegible]) اور تیز آواز میں) میز پر رکھ دو [illegible] اوپر اٹھاؤ اور پیچھے ہٹ کر [illegible] ورنہ ریوالور سے گولی نکلے گی۔ اور [illegible] چھت سے جا چپکے گا۔

سلیم:۔ لیکن آخر [illegible]

بوڑھا:۔ (غصے میں) میں کہتا [illegible] رکھ دو یہ کاغذ ــــــ یوں ــــــ اٹھاؤ ــــــ پیچھے [illegible] کی خوش نصیبی [illegible] اگر تم نے [illegible] کی تو یاد رکھو یہ تمہارا [illegible] ریوالور [illegible] گی۔ ہاتھ سے موت اگل دے گا تم سمجھے! (قدموں کی چاپ) [illegible] پروین کے خطوط کا بنڈل ــــــ [illegible] باہر [illegible] جائیں [illegible] قسمت [illegible]

سلیم:۔ ([illegible]) میری [illegible] ناجائز فائدہ اٹھا

[illegible]

خط ... [illegible] ... ان
... نہیں [illegible]
کے ... [illegible] ... پیدا
ہو ... بیٹھے ہوئے ... [illegible]
ظلم ہے۔ دیکھو بڑے میاں۔ میں
تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں ——
بوڑھا۔ (گرج کر) ہاتھ مت جوڑو۔ جو
کچھ کہنا ہے کہہ جاؤ۔ رات آدھی ہو چکی
سلیم۔ (آہ بھرتے ہوئے) پچھلے
زندگی ... [illegible] ... چھ سات سالوں میں
جس چیز نے مجھے بار بار زندہ رہنے پر مجبور
کیا۔ وہ پروین کی محبت ہی تو ہے۔ وہ محبت
مجھ ... [illegible] ... لیکن اس کی محبت کی
یہ نشانیاں تو مجھ سے نہ چھینو۔ دیکھو بڑے میاں
میں ... [illegible] ... ہوں۔ اس الماری میں
کتابوں ... [illegible] ... ایک پلندہ پڑا ہے اس میں
کوئی دو ہزار کے نوٹ ہوں گے۔ کونے والے
سوٹ کیس میں دو تین سو روپے کی نقدی
ہوگی۔ تم ... [illegible] ... لے سکتے ہو۔ یہ صوفے
یہ قالین یہ ... [illegible] ... فریموں والی تصویریں
یہ ... [illegible] ... جو چاہو لے سکتے ہو۔ تم
تمام ... [illegible] ... لیکن بڑے میاں یہ
خطوط ... [illegible] ... بڑا ... [illegible] ... ان ہونی

بالکل ہوائی قلعے۔ (بوڑھا کھانستا ہے)
تمہیں پروین کے خطوط کے لئے بیدردی
کیسا ... [illegible] ... پڑا ہے تم بوڑھے ہو تمہارے
بال کھچڑی ہو چکے ہیں۔ تمہیں جوانوں کے
ان کمسیوں سے کیا لگاؤ۔
بوڑھا۔ کچھ اور کہنا ہے تو وہ بھی کہہ ڈالو
سلیم۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ تم کہو
تو میں تمہارے پیر چھولوں۔ پر یہ خطوط ——
بڑے میاں —— دیکھو —— تم دیکھتے
ہی نہیں میری طرف —— تم سنتے ہی
نہیں!
بوڑھا۔ میں سن چکا ہوں اور سن سلیم
یہ خط تمہیں نہیں مل سکتے۔ وہ بھولی بھالی
لڑکی تمہارے اس کرتوت سے واقف ہو چکی
ہے۔ کہ تم ان کے ذریعے اسے بدنام کرنے کی
دھن میں ہو۔ اس نے روتے ہوئے مجھ سے
اس کا ذکر کیا۔ سو مجھے یہ ناخوشگوار فرض ادا
کرنا پڑا۔ میں یہ خطوط لئے جا رہا ہوں۔ تم اپنے
دل کی رونق کے لئے یادوں کی تصویریں
تیار کرو۔ آخر یاد بھی تو محبوب کی بہت بڑی
دین ہے۔
سلیم۔ مجھے شاعری سے ذرا بھی مس نہیں
ایسی ——،
بوڑھا۔ (بات کاٹ کر) لیکن ابھی ابھی تم نے
ایک اجنبی سے کہا تھا کہ تم خوابوں کی دنیا کے
بسنے والے ہو!
سلیم۔ تم نے سب کچھ سنا؟
بوڑھا۔ ہاں۔
سلیم۔ اور پھر تم نے اس بے چارے کو
جانے دیا۔

بوڑھا۔ میں ذرا سی نیکی کے لئے اتنی بڑی
نیکی کو کیسے فراموش کر سکتا تھا۔
سلیم۔ تو کیا اب تمہارے دل میں کسی
دکھی سے ہمدردی کی ایک چنگاری تک باقی
نہیں رہی؟
بوڑھا۔ میرا دل سرد ہے!
سلیم۔ کیا تم ——
بوڑھا۔ (بے پروایانہ) میں کچھ نہیں سننا چاہتا
اب میں جاتا ہوں۔ اور تم کو نصیحت کرتا ہوں
کہ جذباتی نہ بنو۔ کیونکہ جذباتی انسان واقعات
کی گردن پر سوار نہیں ہو سکتا۔ ان کے قدموں سے
لپٹ پڑا رہتا ہے!
(قدموں کی چاپ)
سلیم۔ بڑے میاں (چیختا ہے) بڑے میاں!
بوڑھا۔ تمہارا گلا خوب چلتا ہے!
سلیم۔ بڑے میاں! میں پوچھتا ہوں
کیا کائنات کی کوئی قوت تمہیں اپنے ارادے
سے باز نہیں رکھ سکتی!
بوڑھا۔ اس وقت کائنات کی سب سے
بڑی قوت میرا ارادہ ہے! —— چودھری
محمد اسد کا ارادہ۔
سلیم۔ اسد کا؟ تم اسد ہو!
(دروازہ بند ہونے کی آواز)
سلیم۔ (پکارتا ہے) اسد۔ اسد (دروازہ
کھول کر باہر آواز دیتا ہے) اسد!
(وقفہ)
سلیم۔ (زور سے دروازہ بند کرتا ہے)
ظالم، وحشی، بدتمیز —— یہ سب اسی
کمبخت اجنبی کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ وہی سبز قدم
میرے ہولناک افسانے کا عنوان ہے، قہر ٹوٹے

اس پر ——— اکڑا پڑا ہو کسی نالی میں!
(وقفہ۔ قدموں کی چاپ جو قریب آ کر رک جاتی ہے)
ارشد۔ بڑے میاں
اسد۔ (یعنی بوڑھا) جی
ارشد۔ بڑے میاں نمبر چوبیس کونسی گلی میں ہوگا۔
اسد۔ یہی تو مکان نمبر چوبیس ہے ——— لیکن چودھری محمد اسد صاحب کا مکان نمبر بیالیس۔
(وقفہ)
ارشد۔ اس شہر کے سارے باسی دیوانے تو نہیں ہو گئے؟
اسد۔ تمھارا شبہ بجا ہے، لیکن شبہات غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ تم اپنے اتنے عزیز دوست کو بھی نہیں پہچان سکے۔ یہ سفید ڈاڑھی اور یہ خوفناک پگڑی تمھاری نگاہ کو دھوکا دے رہی ہے شاید ——— لو ——— اب دیکھو،
ارشد۔ (معمولی سے وقفہ کے بعد مسرت سے) اسد بھیا۔ اسد بھیا! (وقفہ وہ دونوں گلے ملتے ہیں) یہ روپ کیسے دھارا؟
اسد۔ میں تمھیں کہا کرتا تھا نا کہ محبت میں کئی روپ دھارنے پڑتے ہیں۔ سو آج وہ نظریہ حقیقت کی صورت میں تمھارے سامنے ہے، اس مکان میں رہنے والے مسٹر سلیم، جن کا دماغی توازن آج کل بگڑا ہوا ہے اور جو اب سے دو ماہ پیشتر بہت زیادہ بگڑ چکا ہے۔

اسی سے وہ ——— محبت کرتے تھے۔ ایک لڑکی ہے پروین سے، دونوں میں ———
ارشد۔ (بات کاٹ کر) آہستہ بولو۔
اسد۔ (اسی لہجہ میں) یہ ریڈیو الہ مجھے آہستہ بولنے کی اجازت نہیں دیتا، کہتا ہے گرجو، دہاڑو شیروں کی طرح۔ اور سارے شہر کو سناؤ۔ کہ پروین نے اسے خط لکھے۔ اور پھر ——— جیسا کہ ہوتا آیا ہے، پروین نے میری طرف توجہ کی اور پھر ———
ارشد۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔
اسد۔ (ہنس کر) ہاں! جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، اس نے ایک اور کو مرکزِ توجہ بنا لیا۔ میں نے اسے سمجھایا بجھایا۔ کہ لڑکی یہ طرزِ عمل ٹھیک نہیں۔ میں بڑا کڑا انسان ہوں۔ میں خواب دیکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے فریب دیکر تم کہیں کی نہیں رہو گی۔ مگر وہ ایک نہ مانی!
ارشد۔ یہ آواز کیسی تھی؟
اسد۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔
ارشد۔ کسی کے قدموں کی چاپ تھی شاید
اسد۔ سلیم صاحب گھوم رہے ہوں گے اپنی خوابگاہ میں ——— خیر ——— تو مجھے معلوم ہوا کہ اس نے سلیم کو بے شمار خطوط لکھے ہیں۔ جو سلیم کے پاس محفوظ ہیں۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان خطوط کو اپنے قبضے میں کروں۔ اور پروین کو یہ خوف دلا کر کہ میں اس کے سارے راز گلی گلی میں افشا کرتا پھروں گا ——— اسے اپنا لوں، سو میں اس بھیس میں سلیم کے ہاں آیا۔ اور اس سفید ڈاڑھی اور اس کالے ریڈیو الہ کی مدد سے

وہ خطوط حاصل کر لئے [illegible] جیب میں [illegible]
ارشد۔ تم نے [illegible] اسد۔
اسد۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ کیا تم نے [illegible] اچھائی برائی کے پرانے [illegible] سے اپنا دامن نہیں چھڑایا۔ میں نے تمھیں مدت ہوئی کہا تھا کہ [illegible] وہ تمھیں [illegible] اور بدی کی [illegible] دکھا دے گا۔
ارشد۔ عجیب آدمی ہو [illegible] کے قابل کر رہا [illegible]؟
اسد۔ تم میری باتیں نہیں سمجھو گے۔ تم [illegible] رہے ہو [illegible] لو بھیا! [illegible] چلے!
ارشد۔ لیکن تم؟
اسد۔ میرے لئے سلیم صاحب نے [illegible] بیاہی تھی۔ مجھے ٹھنڈ [illegible] لگ رہی! میں آج بہت ہی خوش ہوں۔
ارشد۔ (چند لمحے کا وقفہ) شکریہ مگر بھیا تم نے غلط نمبر کیوں لکھا خط میں؟
اسد۔ جب میں نے پہلے پہل تمھیں سلیم سے باتیں کرتے سنا، تو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم نے نمبر لکھنے یا یاد رکھنے میں غلطی کی ہے۔
ارشد۔ تم ہماری باتیں سنتے رہے اور پھر مجھے یہاں کیوں بیٹھنے دیا؟
اسد۔ دوسرا معاملہ بہت نازک تھا۔ معمولی تکلیف کرنے میں [illegible] خاموش اور [illegible] بھلا کیا نمبر لکھا تھا میں نے؟

پروین:- میرے پاس ہوجانے کا لائسنس ہے۔
اسد:- [illegible] ہو گی پروین؟
پروین:- (چونکتی ہے اور سنبھلتے ہوئے کہتی ہے) اِل لوں گی۔ معمولی بات ہے۔
اسد:- (تندی سے) اس سے بھی معمولی۔
پروین:- (دورسے) دس لوں گی۔ یہ جناب کی ہابی (Hobby) ہے۔
اسد:- اگر کل یہ خطوط تمھارے بابا کے ہاتھوں میں نہ ہوں، تو میرا نام اسد نہیں!
پروین:- (بیست و دو ے) کوئی دوسرا نام تجویز کر رکھو اپنے لئے۔
اسد:- عجب بدلولی ہو گئی ہے۔
(مختصر سا وقفہ) ارشد۔ نکالنا تو رلیا ہے۔ کمبخت چینی کی واپسی جیب میں ہو گا۔ میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نہیں دیکھ سکتا کہ یہ نازک سی لڑکی مجھ ایسے جیتے کڑے نوجوان کا یوں منہ چڑاتی نکل جائے۔
ارشد:- ہوش کی دوا کرو۔ ابھی ابھی سلیم پر برس رہے تھے۔ اب خود تمھارے منہ سے کف جاری ہے۔
اسد:- ارشد۔ وقت ضائع نہ کرو۔
ارشد:- بھئی کچھ سوچو تو سہی۔ تم نادان لڑکی کے ان خطوط سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انسانیت کی عام سطح سے کتنے نیچے اتر جاؤ گے؟ سوسائٹی میں تمھیں کتنا ذلیل سمجھا جائے گا اور پھر نیچے ہوئے جیل میں وہ رس کہاں جو خود گرنے والے پھل میں ہے۔
اسد:- میرا کلیجہ اگر پتھر کا ہوتا تو شاید میں برداشت کر لیتا سب کچھ۔
ارشد:- جذباتی نہ بنو۔
اسد:- ارشد تم مردم شناس نا صحیح نہیں۔ تم نے اچھا نہیں کیا مجھے روک کر ــــ اچھا ــــ پچھلے کی اندرونی جیب میں خطوط کا وہ موٹا بنڈل ہوگا۔ نکالو ذرا میں اپنے کوٹ میں محفوظ کر لوں۔
ارشد:- خطوط۔
اسد:- ہاں ہاں خطوط۔
ارشد:- پروین کے لکھے ہوئے خطوط!
اسد:- ہاں ہاں پروین کے لکھے ہوئے خطوط۔
ارشد:- وہ پروین کے پاس ہیں۔
اسد:- (گھبرا کر بلند آواز میں) کیا مطلب؟
ارشد:- وہ میں نے پروین کو دے دیئے ہیں!
اسد:- (غصے میں) کیوں؟
ارشد:- تم ٹھنڈے دل سے سنو تو کہوں۔
اسد:- (گرج کر) یہ تم کیا کر رہے ہو ارشد؟
ارشد:- میں سچ کہہ رہا ہوں۔ خطوط کا وہ بنڈل اب پروین کے پاس ہے۔ بھولی سی نادان لڑکی ہے۔ جذبات کی رو میں آ کر جو خطوط اس نے لکھے انہیں ناجائز دباؤ کا ہتھیار بنا لینا سفلہ پن ہے۔ اب وہ اپنی جگہ خوش ہو گی اور سلیم اور اسد کا روحانی بخار بھی چند دنوں میں اتر جائے گا اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔
اسد:- ارشد! تم [illegible] بہا خنجر گھونپ دیا ہے تم نے [illegible] کی جنت میں شعلے بھڑکا [illegible]
ارشد:- میں نے [illegible] بات کہی ہے۔
اسد:- میں تعاقب کر [illegible] گلیوں میں بھٹک رہی ہوگی۔
ارشد:- تم نہیں جا سکتے۔
اسد:- مجھے جانا ہوگا۔
ارشد:- (تحکمانہ انداز میں) اسد۔
اسد:- میں تمھیں بتا دوں ارشد کہ تم نے ایک اجنبی لڑکی پر رحم کھا کر اپنے عزیز دوست پر مصیبتوں کا پہاڑ گرا دیا۔ تم میری اخلاقی زبوں حالی سے واقف ہو پھر مجھے اپنے اخلاق کی دلدل میں پھنسانے سے فائدہ۔
ارشد:- میں نہیں چاہتا کہ تم محض جسمانی حظ کے لئے چند معصوم دوشیزاؤں کے احساسات سے کھیلو۔ تمھیں سلیم سے بھی صلح کر لینی چاہئے۔
اسد:- ارشد تمھارا دماغ تو نہیں پھر گیا؟
ارشد:- جب تم سلیم سے گلے مل رہے تھے تب میں تمھارے ساتھ کمرے میں آنا [illegible] چاہتا تھا۔
اسد:- ارشد میں برداشت نہیں کر سکتا۔
ارشد:- تمھیں برداشت کرنا ہوگا۔
(قدموں کی چاپ۔ سلیم کمرے کے دروازے پر کھڑا دیکھتا ہے)

حسنِ سوگوار!

ایک دوشیزہ! سراپا حسرت و اندوہ و یاس!
ہو گئی کمسنیِ غم سے پھول سا چہرا اداس!
نرم و نازک لب مگر تفسیرِ تبسم کا مزار
غنچۂ فردوس شکارِ گردشِ لیل و نہار
حسن کی رنگیں بہاروں پر خزاں چھائی ہوئی
اک کلی کھلنے پہ بھی پژمردہ، سنولائی ہوئی
مرکزِ جور و ستم، پامالِ غم، قلب و جگر!
کیسے دیکھوں، آہ یہ منظر! کہاں تابِ نظر!!
اشک باری، بے قراری، آہ و زاری تا کجا!
تا کجا! اے پیکرِ غم۔ سوگواری تا کجا!
مانتا ہوں یہ وہ غم ہے جس کا درماں ہی نہیں!
جو حوادث سے نہ ٹکرائے وہ انساں ہی نہیں
جانتا ہوں تجھ کو حاصل ہی نہیں صبر و سکوں!
حشر ساماں ہے ترے دل میں غمِ سوزِ دروں!!
خوب واقف ہوں! تری دنیائے ارماں لٹ گئی!
ابتدا ہی تھی کہ ـــــ! بزمِ لطف ساماں لٹ گئی
یہ بھی سچ ہے زندگی ہے اب تہِ دامانِ ابر!
انتہائے حسرت و غم ہی سہی! لازم ہے صبر!
نقشِ حرماں بن کے نازک دل پہ صدمہ رہ نہ جائے
نوجوانی! شورشِ طوفانِ غم میں بہہ نہ جائے
ہو نہ جائے تو کہیں اس درجہ بیزارِ حیات
دھندلی دھندلی سی نظر آنے لگے یہ کائنات!
غنچۂ فردوس ـــــ نہ ہو جائے کہیں بے رنگ و بو
سرد پڑ جائے نہ یکسر خواہشِ ذوقِ نمو!!
کون دیگا پھر ترے جلوؤں کو نظروں کا خراج!
چھین لے گا وقت جب اس حسن کی عظمت کا تاج
التجائے شوق ہے بیدار کر ذوقِ نظر
پھر باندازِ دگر دنیائے دل پامال ـــ کر

مجیب خیرآبادی

حشرِ جذبات

کہیں دنیا میں نہ تھا حسن کا ساماں پیدا
میری نظروں نے کیا جلوۂ امکاں پیدا
لاکھ دنیا میں ہوں میرے لئے زنداں پیدا
میری تخئیل سے ہیں دشت و بیاباں پیدا
اب دے مجھ کو فریبِ چمن اے رنگِ بہار
میرے دامن پہ ہے اشکوں سے گلستاں پیدا
جذب ہو جائیں دو عالم کے مناظر جس میں
آنکھ کر دہر میں تو وسعتِ داماں پیدا
یہ محبت کی حکایت ہے نہ ہوگی کبھی ختم
اسی عنوان سے ہوگا نیا عنواں پیدا
کیوں ابھی سے ہے تجھے جلوۂ نو کی امید
انتہا کفر کی ہو لے تو ہوا ایماں پیدا
جوشِ اشکوں کا برا ہو کہ کھلا عشق کا راز
سوز پنہاں ہے، مگر دولتِ داماں پیدا
تیرے ہی ذوقِ جنوں میں ہے کمی کچھ ورنہ
ذرے ذرے سے ہے اک روحِ بیاباں پیدا
دیکھ لو ثاقبِ وارفتہ کو تم غور سے آج
مدتوں ہوگا نہ پھر ایسا غزل خواں پیدا

ثاقب کانپوری

تیموری آرٹ

ایمیل بلوشے کی ایک کتاب ایرانی فن تصویر مختصر مگر منظر عام پر آنے والی ہے۔ اس کا ایک حصہ یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ ہندوستانی تاریخ نے تیمور کی جیسی تصویر کھینچی ہے، عیاں ہے۔ اس کے ساتھ اس تصویر کا بھی مقابلہ کیجیے۔

مغلوں کے زوال کے چند ہی روز بعد دنیا کا زبردست فاتح تیمور لنگ، وسط ایشیا کے افق پر نمودار ہو چکا تھا۔ اسی سبب سے ایران طوائف الملوکی کی فتنہ پردازیوں کا زیادہ عرصے تک شکار نہ رہ سکا۔

تیمور ترکی نژاد تھا۔ بمقام کش پیدا ہوا۔ غالباً یہ مقام اب شہر سبز کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی معرکہ آرائیوں نے ابتدا ہی سے اہل عالم میں اس کے نام کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ اور اس نے وسط ایشیا پر فتح پا لی تھی۔ کئی سال تک بے خانماں پھرنے کے بعد، جس میں اسے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا، مشرقی ترکستان اور ماوراء النہر کے علاقوں کو مسخر کر لیا۔ اسی سال اس نے ایران کی تسخیر کا بھی منصوبہ باندھ لیا تھا۔ لیکن پورے ملک کی تسخیر میں کئی سال لگ گئے۔ اگرچہ خراسان کی طرح، بعض مشرقی صوبوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی، تاہم جنوبی ایران، اس وقت تک جزو سلطنت نہ بن سکا، جب تک تیمور نے آذربائیجان، سیستان اور جارجیہ کے علاقوں کو چاروں طرف سے گھیر کر ان سے اپنی طاقت کا لوہا نہ منوا لیا۔ ستر ہزار باشندوں کو تہ تیغ کر کے، اس نے شہر اصفہان پر قبضہ کیا تھا۔ شیرازیوں نے اس خوف سے کہ کہیں ان کا بھی یہی حشر نہ ہو، تیمور کے استقبال کے لیے، پہلے ہی سے شہر کے دروازے کھول دیے تھے۔ غرض ۹ سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد، تمام جنوبی ایران اس کے زیر اقتدار آ گیا۔ اس وقت تیمور نے سمرقند کو اپنا دارالخلافہ قرار دے کر نظم و نسق کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ باوجود اس کے تیموری فوجوں کی پیشقدمی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ حتیٰ کہ اس کی سلطنت کی حدود شرق میں ہندوستان اور مغرب میں روس کی سرحدوں سے جا ملیں۔

اس میں شک نہیں کہ تیمور ایک سخت گیر فاتح تھا۔ لیکن تہذیب و شائستگی کی خوبیوں سے بھی عاری نہ تھا۔ جس وقت بھی اس نے لوٹ کھسوٹ یا تاخت و تاراج کا بازار گرم کیا، نہایت دانشمندی اور دور اندیشی سے کام لیا۔ ناکاروں کو تباہ اور قابل قدر اشیاء کو محفوظ کر کے سمرقند لے جایا کرتا۔ جذبۂ حسن پرستی اس کی فطرت میں موجود تھا۔ یہی خصوصیت اسے اپنے پیشرو، سکندر اور چنگیز خاں سے ممتاز کرتی ہے۔ تیمور نے اپنے دارالسلطنت کو حقیقی معنی میں سونے کی چڑیا بنا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باج گزار ممالک کی مختلف اقوام کے اساتذۂ فن، اس کے دربار میں کھنچے کھنچے چلے آئے تھے۔ تیموری حکومت ہی کو یہ ناز زیبا ہے کہ اس نے تصویر سازی جیسے فن لطیف میں ایک نئے ذوق کی تشکیل کی، اور اسی کے بابرکت دور میں، ایرانی فن تصویر کی نشو و نما بھی مکمل ہوئی۔

تیمور اس دار فانی سے رحلت کر چکا تھا۔ لیکن اس کے جانشین اس کی اتباع میں، آرٹ کی سرپرستی کیے جا رہے تھے۔ تاوقتیکہ فلک کج رفتار کی فتنہ پردازیوں نے، قضائے مبرم بن کر انھیں اقتدار سے محروم نہ کر دیا۔ زوال کا یہ

کی فنی دلچسپیوں میں رتی بھر بھی فرق نہ آنے پایا۔ شاہان تیموریہ اس دنیا سے چل بسے، اوراق کی یاد ہمارے دماغوں سے محو ہو چکی، لیکن وہ آرٹ جو ان پرستاران فن کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھا تھا، اس جہان کے اسمائے گرامی کی ہمیشہ [illegible] یہی آرٹ عرصۂ دراز تک ان شیدایان فن کے ناموں کو قائم و دائم رکھے گا۔

گوناگوں تہذیب و تمدن کی نمائندہ دو سربرآوردہ ہستیاں، جو تیموریوں سے پہلے گزر چکی تھیں، تیموری آرٹ میں بھی ان کی روح ایک دوسرے سے متصل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیموری عالیشان عمارتوں میں، اندرونی اور بیرونی دیواروں کی پچی کاری، اسی روح پرور کیفیت کو پیش نظر کرتی ہے۔ اور یہی پچی کاری نے اپنی ہم عصر کتابی تصویروں ([illegible]) کو بھی بڑی شدت سے متاثر کیا تھا۔ محض متاثر ہی نہیں بلکہ اس صنف کے گوشے گوشے میں بھی اپنی روح کو جاری و ساری کر دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ استاد گنگ، تیموری مکتب تصویر کا بانی تھا۔ اس قائدِ فن حسن کار کے متعلق کچھ زیادہ واقعات نہیں ملتے۔ سوائے اس کے کہ اس نے استاد جہانگیر بخاری کو تعلیم دی تھی، جو ندرۃ المصورین کے لقب سے مشہور ہے۔ اور استاد جہانگیر نے اپنی باری میں بہزاد کے استاد پیر سید احمد تبریزی کو فن سکھلایا تھا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ داستانی طبائع میں جذبۂ شاہ پرستی کا فقدان کتنا زبردست خسارہ ہوتا ہے کہ استاد گنگ جیسی شخصیت کی زبان زد عام زندگی کے حالات تک معلوم نہیں! جس کی وجہ سے بعض لوگ اسے محض ایک داستانی شخصیت تسلیم کرتے ہیں۔ حقیقت حال کچھ بھی ہو اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ تیموری مکتب کا کوئی بانی تھا یا نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ تیموری آرٹ ایک خاص رتبہ پر پہنچ چکا تھا۔ جس کے بعض حقیقی کارنامے ہم تک پہنچے ہیں۔ بہرحال اس مکتب کی برتری کسی صورت میں کم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے برعکس وہ سب افراد اس مکتب میں جذب ہو جاتے ہیں، [illegible] کے نفیس، مادی حیثیت سے اس مکتب کا [illegible]

تیموری آرٹ کی باقیات۔

(۱) اس دور کی باقیات [illegible] میں سب سے مقدم خواجوی کرمانی کا مسودہ قلمی نسخہ ہے جس پر [illegible] درج ہے۔ جنید نے اس کی تصویریں بنائی تھیں [illegible] (۱۳۹۶ء) اس وقت برٹش [illegible] میں محفوظ ہے۔ تیموری [illegible] میں جس آرٹ کی مزاولت کی جاتی تھی، یہ حیرت انگیز کارنامہ، اسی فن کی صحیح صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اسی طرز کی وجہ سے عجائب خانے کا مایۂ ناز [illegible] مانا جاتا ہے۔ اس شاہکار کے پیکروں میں ملائمت اور نازکی کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ مغل اثرات ہنوز زائل نہ ہو سکے تھے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ روایتی ایشیائی [illegible] کا جامع اتحاد [illegible] کے بعد، اس مرقع میں بھی [illegible] کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ پیکروں کے بشرے بالکل چینی قطع کے ہیں۔ خالص ایرانی مناظر کو، چینی ایرانی (مخلوط) طرز کی عمارتوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اصول و عمل کے لحاظ سے ارتباط کی تمام خوش اسلوبی کے باوجود، کبھی تو جوش [illegible] کا احساس پیدا ہوتا ہے، اور کبھی نزاکت و لطافت ذوق کی طرف خیال منتقل ہو جاتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس مخلوط احساس سے قدرت مصورہ میں نقص پیدا ہونے کے بجائے اس کی دلکشی و دل بستگی میں مزید اضافہ ہی دکھائی دیتا ہے۔

(۲) بلخی کے شہرت یافتہ مرقع کا ذکر بھی اہم ہے۔ اس مرقع کی تصویروں کو ابتدا میں سلطان احمد نے ترکستان میں جمع کیا تھا، اس میں جنگل بلخی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک ترکی شہزادے کی تصویر بھی شامل کر دی گئی تھی، اس لئے اس تصویر کی نسبت سے اس وقت سے اس البم کا نام ہی بلخی کا مرقع یا البم مشہور ہو گیا۔ یہ نسخہ کئی ہاتھوں سے گزرتا ہوا کتابوں کے ایک شوقین

[illegible] کے [illegible] کو لڑکوں نے
[illegible] کیا۔ اس طرح کی
[illegible] ایک اور تصویر بھی شامل
[illegible] میرا سلالی
[illegible] کے [illegible]
کی [illegible] قوتوں کے عجائب خانے میں
[illegible] جیسے حقیقت
کے [illegible] رنگ یہاں منتخب کیا
گیا [illegible] جس کو اس نے یونانی تمرکی آرٹ میں
میں [illegible] سرو کی ہر شکل کے
ساتھ [illegible] بلند پہنچانے شگفتہ کا حسن
[illegible] چمن پر بلبلان خوش الحان کے نغمہ سرا ہونے
کی [illegible] استاد زور قلم کے ساتھ منکشف کی گئی تھی جس کے
[illegible] میں مصور کا تخیل صرف ذہن ہوتا ہے کہ یقیناً
قسمت نے مصور کو رموز سربستہ سے آگاہ کرنے کی خاطر،
اپنا سینہ چاک کر کے ہی نہیں دکھلایا، بلکہ ان کی عمیق ترین
گہرائیوں میں ڈبو بھی دیا ہے۔

(۳) برٹش میوزیم میں سنہ ۱۳۱۰ھ کا ایک تیموری
قلمی نسخہ رکھا ہے، جس میں بہ قلم سیاہی وطلائی، قالینوں اور
قلمی کتب کے حاشیوں کے نقشے بنے ہوئے ہیں، ان کی
تزئینی تفاصیل کو غیر معمولی نفاست کے ساتھ بنا کر
نہایت پرتکلف اور دیدہ زیب رنگوں سے آراستہ کیا
گیا ہے۔

(۴) سنہ ۱۴۲۳ھ کا مجموعہ مسودات، جو ۲۹۲ نسخوں پر
مشتمل ایک کتابچے کی شکل میں مجلد ہے، [illegible]
نے اسے محفوظ کر رکھا ہے، جس کو اعلیٰ حضرت سلطان سلاطین
العرب والعجم، دین پناہ سلطان سایہ ظل اللہ قہرمان الماء
والطین، محرک الاسلام والمسلمین، ناصب رایات
العدل والاحسان، قامع بنیان الظلم والطغیان السلاطین
ابو المظفر شاہ سکندر، فرد القرنین ابن عمر شیخ ابن امیر

تیمور گورگان بہادر خان خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کی خدمت عالی
میں نذر گزرانے کی خاطر ترتیب دیا گیا تھا، تفصیلی کوہستانی
کی حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ چونکہ اس نسخہ میں جسم عریاں
بھی شامل ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اہل یورپ
کو اس میں بے حد سامان دل بستگی ملے، جن کو ان کے [illegible]
آرٹ میں اعلیٰ ترین احساسات وجذبات کے اظہار کا ایک
بہترین وسیلہ کہا جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس جگہ اسے
ایسے ہی یورپی اثرات کے تحت، ایرانی آرٹ کی رسمی پابندی
میں بنا دیا گیا ہو۔

دودمان تیموریہ میں سب سے نامور شہزادہ شاہرخ تھا،
اپنے قبلہ [illegible] ہرات سے مملکت کے نظم ونسق کو
چلا رہا تھا۔ فن مصوری کے جو درخشاں ستارے اس کے دربار
کی زینت بنے ہوئے تھے، اس کام کی تکمیل انھوں نے سمرقند
میں نہ کی تھی، ہرات میں کی۔ یعنی تیموری دور کی ابتدا سے
ایرانی آرٹ میں جن اہم ترین محاسن کا سیلاب امڈا چلا آرہا
تھا، اس کا سب چل کر نہایت مربوط ومنظم طریقہ پر جذب کر لیا۔
چنانچہ چینی نقاشی سے یکساں ہی قلم خط کشی، عراقی طرز سے
طلائی ونقرئی پرداز کاری ([illegible]) اور اطالوی طرز
سے عہد عتیق کی نورانی درخشندگی، اخذ کی گئی تھی۔ اور ان سب
ماخوذہ اجزاء وعناصر کا خوش آہنگ ملاپ، اس زمانے
کا اسلوب کار تھا۔ اطالوی اثرات تیموری دربار میں،
غالباً ان ایلچیوں کے توسط سے داخل ہوئے ہوں گے، جو
ایشیا کی بزرگ ہستی کو کرا اپنی اطاعت کیشی جتلانے
کی غرض سے آتے تھے۔ گو کہ ابھی بہزادی آرٹ کے کمال
نفاست سے دوچار ہونا باقی ہے، تاہم تیموری آرٹ کے
شاہرخ دور کے متعلق اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس زمانے کی
آرٹ، کل ایرانی فن تصویر میں، نہایت لطیف وصناعانہ
رنگ بندی وکلر اسکیم کے نمونوں کو پیش نظر کرتا ہے۔

(۵) جاپانی مال کی سیاہی قلم نقاشی کے چند نمونے ڈاکٹر
[illegible] کے ہاں موجود ہیں، جن کو انھوں نے یلدز کے شاہی

ساری

___ موٹربس کے انجن نے موبل آئیل کے گھونٹ لیئے اور دوسرے ہی لمحہ سامنے والی
پگڈنڈی پر بنی عمارتوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی! ______
عتیق سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا' لیکن اس کی وجہ بہت دن بعد ملے ہوئے لنگوٹیا یار کی جدائی
نہ تھی ____ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کل جب دکاندار نے اسد کے سامنے ریشمی ساریاں پیش کیں' تو اس نے
ساری کو کئی مرتبہ الٹ پلٹ کر دیکھا' دبایا اور مسلا' لیکن پھر بھی اس نے پسند نہیں کیا! اس کی قیمت جارجٹ کی
ساری سے صرف چند روپے زیادہ تھی اور ممکن تھا کہ کچھ بحث و تکرار کے بعد تھوڑی سی کمی ہو جاتی! مگر کس قدر حیرت
ہے کہ اسد نے پسند ہی نہیں کیا!

شاید چند روپیوں کی بحث کے لئے ایسا کیا ہو؟

نہیں!

اس نے تو میرے بچوں کے لئے بہت سی دیہاتی مٹھائیاں اور میوے لائے تھے' کیا کنجوس آدمی ایسا کر سکتا ہے؟
پھر جب اُسے اپنی بہن کے بچوں کی یاد آئی تو اس نے بالوشاہی بھی خرید لی! تنگ ظرف ہرگز ایسا نہیں کر سکتا؟

پھر کل اس کے ریشمی ساری نہ خریدنے کا معمہ ______
انہیں خیالات کے بے پناہ سمندر میں غوطے لگاتا ہوا دفتر پہنچا' ابھی ابھی ڈاک آئی تھی' اسے محسوس ہوا'
خط کے سرنامہ کی تحریر سے اس کے اندر اندر کے مضمون کا پتہ نہیں چلتا اسی طرح ایک آدمی کے دلی جذبات سے
اس کی بیوی ___ دوست ___ بھائی' بہن کوئی بھی واقف نہیں ہو سکتا۔

رات بستر پر لیٹے لیٹے یہی خیال عتیق کو ستا رہا تھا ___ کیوں اسد نے ریشمی ساری نہیں خریدی؟ —
اس نے اپنی آنکھیں بند کریں' اتنے میں بچہ اس کے پاس آگیا' اس کے گال سے اپنے رخسار ملتے ہوئے کہنے لگا —
ابا' مجھے اچھی موٹر لا دیں گے نا؟
جب عتیق نے موٹر دینی منظور کی تو بچہ خوشی خوشی سو گیا' سامنے کھونٹی پر عتیق کی شیروانی ٹنگی تھی' بہت پرانی ہو گئی تھی
اسے خیال آیا ___ اب ایک شیروانی سلوانی چاہئے —

اور ساتھ ہی اس کی نظر اپنے پہلو میں سوئے ہوئے بچے پر پڑی وہ اپنے آپ سے کہنے لگا' یہ شیروانی تو
ابھی دو مہینے کام دے گی لیکن پہلے بچے کی موٹر ______!

اس خیال کے ساتھ ہی پھر اُسے اسد کی خریدی ہوئی ساری کا خیال آیا' وہ سوچتا رہا' جانے کیا کیا
سوچتا رہا' تھوڑی دیر بعد نیند لگ گئی' مگر نیند میں بھی دماغی سکون میسر نہ ہوا۔

دوسرے دن بھی احساسات کا بچھو رہ رہ کر اس کے قلبی سکون پر نیش زنی کرنے لگا' اس نے اسد کو
خط لکھ کر اس معاملے کی تفصیلات دریافت کرنے کا تہیہ کر لیا' لیکن اس کا ارادہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا'
صبح جب وہ دفتر پہنچا تو آج کی ڈاک میں اسد کا خط تھا' سادہ کارڈ نہیں ______ اچھا خاصا وزنی لفافہ!
دو آنے کے ٹکٹ چسپاں کیے گئے تھے اس پر' عتیق حیران تھا کہ اتنا بڑا خط کیا ہوگا؟ اس نے نہایت ہی
عجلت اور بیم و رجا کے عالم میں لفافہ چاک کیا۔ پہلی دو چار سطریں پڑھنے کے بعد وہ بھول گیا کہ وہ دفتر میں

بیٹھا ہے، وہ فرفر خط پڑھنے لگا ——

—— سچ تو یہ ہے کہ تمہارا مختصر سا کارواں حیات جنت ارضی سے کم نہ تھا، اس میں شک نہیں کہ تمہارے پاس دو دن بڑے ہی آرام سے گزرے، مدت کے بعد تم سے مل کر میں اپنے آپ کو بھول بیٹھا تھا، مگر وہ نیلی ریشمی ساری والا واقعہ —— اس ساری کی قیمت صرف چودہ روپے زیادہ تھی اور تم یہ خریدنے کے لئے اصرار کر رہے تھے، لیکن میں نے تمہاری بات سنی ان سنی کر دی، تم نے خیال کیا ہوگا آخر گاؤں والا ہے، پیسے پیسے کے لئے جی لوٹتا ہو تو کیا تعجب؟ لیکن شفیق، سچ کہوں؟ —— وہ بخل نہیں تھا کنجوسی نہ تھی، پھر ——

ساری ہاتھ میں لے کر میں نے بار بار الٹا پلٹا اور مسلا ضرور —— لیکن اس کی نفاست، چمک زریں کناری اور آڑھی ترچھی لکیریں! کتنی دلفریب تھیں۔ اس کے لمس سے ایسا محسوس ہوا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، انتہائی بھیانک، ڈراؤنا اور بھیانک خواب! صبیحہ کی موہنی صورت میری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگی تھی! اس ساری نے بہت پرانی یاد تازہ کر دی! یا کیسی زخم دل ہی کہو نا! وہ پھر رسنے لگا، ایسی نرم اور ملائم چیز پر میں نے زندگی میں صرف ایک بار ہاتھ پھیرا تھا، اسی لئے ——

وہ شام مجھے یاد ہے، ساون کا مہینہ تھا، آسمان پر کالی کالی گھٹائیں فیل بے زنجیر کی طرح گھوم رہی تھیں، ساری فضاء پر ایک اداسی کا عالم تھا، ایسے میں ایک مفلوک الحال شخص ساری بیچنے کے لئے لایا، ساری پچاس روپے میں بک رہی تھی، میں تو پسینہ میں شرابور ہو گیا، سارا جسم کانپنے لگا جیسے میرے اندر سے کسی نے زندگی چھین لی تھی، میری حالت اس شخص کی سی تھی جس کے قریب ہی کسی سوراخ سے سانپ نکل آیا ہو — اور یہ نیلی ریشمی ساری زمین پر، پلنگ پر، نہایت عجیب طریقے سے پھیلی ہوئی تھی، میں ہکا بکا رہ گیا، دماغ پھٹا جا رہا تھا، میں نے چیخ چیخ کر کہا — "اس سانپ کو ہٹاؤ، میری نظروں سے دور کرو!"

ممکن ہے دنیا مجھے پاگل سمجھے، عقلمند لوگ لمبے لمبے ہاتھ کر کے پکار اٹھیں گے، پریشانی کی بات ہی کیا تھی؟ ساری معمولی کپڑا ہی تو ہے! لیکن اس کاروباری دنیا سے ذرا ہٹ کر احساسات و جذبات کی دنیا میں داخل ہو جائیں تو؟ قومی جھنڈا، جس پر ہمارے جذبات، احساسات، محبت اور خلوص کی تہہ جمی ہوئی ہوتی ہے، ایک معمولی کپڑا ہی تو ہے! ایک ٹکڑا معمولی قیمت کا! لیکن اس کی خاطر ملک کے جانباز اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ سیکڑوں سپہ سالاروں کو جھنڈے کی ایک لہر آزادی کا وہ پیغام دیتی ہے جس کا ہم اظہار بھی نہیں کر سکتے، اس تھوڑے سے کپڑے میں مستقبل، ماضی، تہذیب، معاشرت، مذہب اور آزادی کی زندہ تاریخ دکھائی دیتی ہے۔

میں نے جب اس ساری کو اس طرح بکتے دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اس ساری کے پیچھے جو روح فرسا تاریخ تھی وہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ اس میں کسی خاندان کی کتنی ہی زندگیوں کے دکھ حسرتیں، ناکامیاں چھپی ہوئی تھیں، اس میں میری زندگی کے عبرت انگیز واقعات چھپے ہوئے تھے، میرے مظالم کی داستان تھی۔ تم کہو گے مظالم اور میں؟ ہاں میں! اتنا ہیچ اور کمینہ بن گیا تھا! یہ ساری میری تباہی کی آخری سیڑھی تھی!

[illegible]، ایک زمانہ تھا، سرکار، دربار اور سماج میں میری عزت تھی، اسلاف کے عادل شاہی عہد [illegible] ہوئے امتیازات کو انگریزی حکومت نے باقی رکھا تھا، کتنے ہی گاؤں قبضے تھے، اسلاف کے خون پسینہ [illegible] حاصل کی ہوئی دولت و عزت ہمارے گھر غلامی کر رہی تھی، لیکن جب نیا نظام قائم ہوا تو عسکری قوتوں [illegible] کوئی موقع نہ رہا اور اپنی صلاحیتوں کو سماجی امور میں تبدیل کرنے کا بھی کوئی طریقہ نظر نہ آیا، تعیش [illegible] ہی ایک شغل تھا، اس وقت کی سماجی حالت ایسی تھی کہ جوا، طوائف، شراب اور اسی قبیل کی [illegible] عادتوں نے اہمیت حاصل کرلی تھی، موٹروں اور بگھیوں کا ذکر کرنا فخر و مباہات کا اظہار تھا، ایسے مشاغل میں دولت بکھیرنے والا شخص ہی زیادہ کامیاب رہتا تھا۔ اس وقت یہ چیزیں سماجی اور خاندانی شرافت [illegible] تھیں مگر آج سماج کس قدر بدل گیا ہے، محنت، شرافت اور صداقت کو اہمیت حاصل ہے، یہ کیفیت [illegible] تھی، اس وقت ہم ماگ رنگ کو ہی زندگی سمجھتے تھے، ہماری بے اعتدالی اور ہوس پرستی ہماری مقبولیت کا ذریعہ تھی۔ امارت کا احساس، دولت کا نشہ اور عیش کوشی میں زندگی کے دن بڑی تیزی سے گزر رہے تھے۔ دماغ اور دل ہیجانی لہروں پر ڈول رہے تھے، جذبات میں اضطراب تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میرا خیال تھا —— لڑکیاں چاہے جانے ہی کے لئے پیدا کی گئیں، ان کے بدن کی ساخت، ان کے رہنے کا رنگ ڈھنگ، لمبے لمبے سیاہ بال، رسیلی آواز، سج دھج، گڑیوں کی طرح ادھر ادھر گھومنا ایسی چیزیں ہیں کہ انسان کے دل میں گدگدی پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتیں ایک مسکراہٹ سے قیدی بنا لینا بھی وہ جانتی ہیں اور ہر دوشیزہ کا مینائے شباب اسی لئے ہے کہ وہ الٹ پلٹ کر توڑ دیا جائے، اب سوچتا ہوں، وہ سب ایک جوش تھا جیسے پانی میں سوڈا ڈال دیا گیا، محبت اور پیار ایک بدہضمی ہے۔ لیکن لڑکیوں کا نام سن کر ہیجان پیدا ہوتے والی منزل سے بھی گزرا ہوں، اس وقت درجنوں نام یاد تھے، لیکن آج ——

چاروں طرف ایک نظر ڈالتا ہوں تو وہ سب کی سب ابھی تک پڑی سڑ رہی ہیں، کسی کی اپنے شوہر کے ساتھ ایک حیثیت ضرور ہے، آدمی حیثیت والا جانور ہے! کم از کم سماج کے بنانے والے تو عقلمند تھے۔ وہ آدمی کے مقابلے میں عورت کا سر نیچا کرنا نہیں چاہتے تھے، مرد عورت پر حکومت کرتا ہے۔ یہ اس کی حیثیت ہے۔ لیکن مجھے کیا غرض؟ ہوگا کوئی سماج! وہاں آدمی رہتے ہوں گے! —— اب تو جان لیا میں نے بھی!

آج سے پندرہ برس پہلے میری شادی ہوئی تھی، لیکن شادی کی مقدس ذمہ داریوں سے میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتا تھا، میں نے کبھی بیوی سے کھل کے بات نہیں کی۔ وہ بدصورت تھی؟ نہیں وہ حسین تھی، اس قدر کہ اگر کسی مٹی کے پتلے کو آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی تو وہ بھی رقیب کی تلوار کا شکار بن جاتا! لیکن جب یہ حسن مجھے مسرت بخشنے کی کوشش میں تھا تو میں بازار کی گھناؤنی خوبصورتی کا شکار تھا، دل و دماغ کی بے راہ روی میں بیوی کے سکھ اور چین کی کیسے فکر؟ عورت کی زندگی کچھ اور تھی، ہم ہر قسم کی وحشت، آزادی اور بے راہ روی جائز سمجھتے تھے عورتیں زیادہ سے زیادہ مقید، محکوم اور بے زبان جانور کی طرح تھیں! باہر جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی، اوروں سے میل ملاپ معیوب اور اپنے شوہر سے گفتگو میں کمتری کا اظہار معیار شرافت تھا، عورت کے جوالا مکھی کو سماج کی چٹانیں راستہ ہی نہیں دیتی تھیں، دوسری عورتوں کے رنگ محلوں میں ہی ہمارا وقت گزرتا تھا، ہمارے قہقہے، عشق و ہوس اور دل کی ساری

رنگینیاں وہیں پوری ہوتی تھیں، پھر بیویوں کا حال کون پوچھتا؟ . . . .
میں اکثر راتوں میں کھانے کے بعد گھر سے نکل جاتا اور صبح تک باہر ہی رہتا تھا، یہ چیز صبیحہ کے لئے ناگوار ہوتی لیکن اپنے دکھ کے اظہار کی ہمت اس میں نہ تھی۔ اس وقت گرہستی کا مسلک یہ تھا کہ شوہر کے عیب پر ناک بھوں نہ چڑھائے، وہ اپنی ہزاروں مصیبتوں کو اپنی چال ڈھال، رفتار و گفتار سے بھی ظاہر نہ ہونے دیتی تھی، ڈھل ڈھل کے دل ہی دل میں غم کھاتی رہی، میں اکثر یہ اس کے چہرے سے جان لیتا تھا، لیکن اس وقت احساسات کی نزاکت ہی جل چکی تھی۔
آدمی کو اپنی زندگی کے بہت کم واقعات یاد رہتے ہیں، خیر جانے دو!

آخر کار بچہ پیدا ہوا، دو ماہ بعد وہ بچے کو ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر میرے پاس لے آئی، اس دن وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی، کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت ماں بننے کے بعد ایک شگفتہ پھول بن جاتی ہے۔ وہ منظر آج بھی میرے دل پر نقش ہے، یہی نیلی ساری پہنے ہوئی تھی، ساری کی دلکشی سے اس کے چہرے پر مسرت کھیل اٹھی تھی یا پھر اس کے شوق کی پرچھائیاں اسے اس قدر حسین بنا رہی تھیں، بہرحال صبیحہ انتہائی مسرت و شادمانی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

اس دن اس نے نہایا تھا، بال کھلے چھوڑ دئے تھے، جیسے اندھیری رات کو دن کی شاخیں اٹھائے ہوئے تھیں، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل تھا، جسم کی طرح شاید دل بھی پاک ہو گیا تھا، جسم سے، دل سے پاکیزگی جیسے پھوٹ رہی تھی، عورت کی زندگی میں محبت ہی تو بڑا جذبہ ہے! ان دنوں جیسے وہ بہار پر تھی، اس کی صباحت پر زردی جھوم رہی تھی، ایک قسم کی جاں بخش مٹھاس اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی، زندگی کی تلخیاں احساس مسرت میں ضم ہو گئی تھیں، یہ مسرت کا احساس نہ تھا، اس کی نگاہوں میں رحم و ہمدردی تھی، التجا تھی۔
بچے کو ہاتھوں میں لئے کتنی دیر تک دیکھتی رہی، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، میں آگے بڑھا، لڑکا پیدا ہونے سے مجھے کتنی مسرت ہوئی! لیکن اُسے روتا دیکھ کر حیرت ہوئی، پوچھا ——— "یہ کیا؟ خوشی کے وقت آنسو کیسے؟"
اس نے ایک لمبی سانس لی اور بولی ——— "ناگ پیدا ہوا ہے! کتنا زہر پھیلائے گا؟ کون جانے!"
میں نے کوئی جواب نہ دیا، کتنا بڑا طنز تھا میری زندگی پر۔ یہ تم سمجھ سکتے ہو!

میری ہوس پرستی نے مجھے عقل و دل دونوں سے بیگانہ کر دیا، ایک ... نے مجھے دیوانہ بنا دیا، دن کا اکثر حصہ اور بیشتر راتیں میں اسی کے ہاں گزارتا تھا، ایک دن میرے دل میں خیال آیا کہ میں اپنے ہوس کے کھلونے کو اس نیلی ریشمی ساری میں ملبوس دیکھوں، یہ ساری صبیحہ کی تھی! شادی پر اس کے بھائی نے تحفہ دی تھی، اس ساری پر وہ جان دیتی تھی، اس نے شاید دو مرتبہ سے زیادہ نہیں پہنا تھا، لیکن میں نے دغا کی، ظالم بن گیا، جھوٹ گھڑی ختم ہو گئے لوگ جس کی اس قدر عزت کرتے تھے، وہ شخص اس قدر نیچ؟ ہاں، آج کل سارے عزت والے نیچ اور کمینے ہیں! دنیا ایک فریبی دغا باز، بدنیت اور عیار کی عزت کرتی ہے، یہ میدان اسی کے ہاتھ آتا ہے! ہمدردی، احسان اور شرافت سبھی ڈھونگ، خودغرضی کا بہروپ! غریبوں اور حاجت مندوں کا خون نچوڑ کر ان کی ہڈیوں کو چوس کر پھر انھیں کے سامنے روٹی کا ٹکڑا ڈال کر ہمدردی اور سخاوت کا دعویٰ کیا؟ اپنے سوانگ کے نبھاؤ کا کتنا حسین طریقہ!
اور لوگ ——— دنیا کے سارے آدمیوں سے مجھے کچھ نفرت سی ہو گئی ہے، دنیا بیکار ہے! ویسے تو بیسیوں آدمی ملے، میں انھیں کچھ کچھ پہچانتا ہوں، وہ صرف آدمی تھے، اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ ان آدمیوں کے بڑے بڑے

بہت سے گویا لیکن ان کی کوئی خاص آواز نہ تھی، اور اگر تھی تو کوئی قیمت نہیں تھی، اس طرح دنیا میں کچھ لوگ ہیں ان کے پاس دولت ہے، موٹریں ہیں اور حویلیوں میں سامانِ عیش! میں بھی کبھی انھیں میں تھا!
—— ان کے پاس اعزاز ہے، رتبہ ہے، وہ شریف بھی کہلائے جا سکتے ہیں سماج میں ان کا زیادہ اثر ہے، لیکن کیا ان میں خلوص، ہمدردی اور انسانیت ہے؟ بس ایسی ہی جیسے ان کروڑوں آدمیوں کی آواز!! ——
میں بھی کتنا خوش تھا اسلاف کے کارناموں پر! پدرم سلطان بود، میرے لئے فخر تھا لیکن ان کی ہمت، بہادری اور جرأت سے میں نے ہیجڑا کا کام چھین لیا، نام نہاد تہذیب اور خود ساختہ سماج کے حسین نقاب کے دھوکے میں ویشیا کے لئے ہر قسم کا پاپ کیا، میں نے صبیحہ سے کہا کہ میرے ایک دوست کے گھر تقریب ہے، اسے ایک ریشمی ساری کی ضرورت ہے، پہلے اس نے پس و پیش کیا، لیکن مجھے مصر پا کر ساری حوالے کر دی، میں نے بڑی ہی خوشی سے یہ ساری لے جا کر طوائف زادی کو دیدی اور اسے اس ساری میں ملبوس دیکھ کر بدمست ہو گیا جذبات نے مجھے ذلیل کر دیا تھا!

اس کے بعد ایک دوست کی شادی میں صبیحہ گئی ہوئی تھی، وہاں اس طوائف کو گانے پر بلایا گیا تھا، وہ اس روز اسی نیلی ساری میں ملبوس تھی، صبیحہ نے طوائف کے جسم پر اپنی ساری دیکھی تو ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی، اس نے مجھ سے بات چیت بند کر دی، مسلسل ڈیڑھ ماہ کی علالت کے بعد وہ پھر کبھی بیدار نہ ہوئی ——
عتیق! اگر میں وہ نیلی ریشمی ساری خرید تا تو جب کبھی میری بہن اسے پہن کر میرے سامنے آتی —— مجھے اپنے مفلوج ہونے کا احساس ہوتا، جو میرے لئے انتہائی روح فرسا اور جاں گسل ہوتا!

عتیق دنیا میں اندھے سے زیادہ اپاہج محتاج ہوتے ہیں —— گھر کی ملکہ کی مسکراہٹ سے ہماری زندگی کی مسرتوں کا چشمہ ابلتا ہے، بیوی سے حیوانیت کا برتاؤ کر کے کوئی خوش نہیں رہ سکتا اور پھر عورت کے دکھ! —— جو لاکھی کی طرح اندر ہی اندر ابلتے رہتے ہیں، وہ نظر نہیں آتے مگر کیا کم تکلیف دہ ہوتے ہیں! —— کیوں ہے نا؟

تمہارا اسد

شاہین فاروقی

دو رُباعیاں

احساس کی زنجیر ہلا دیتا ہے   جذبات میں ہلچل سی مچا دیتا ہے
دھوئے ہوئے مہتاب کی ضو پاشی میں   یہ کون مری نیند اڑا دیتا ہے

منظور ہر اک ظلم کئے جاتا ہوں!   سہتا ہوں الم زہر پیئے جاتا ہوں!
جینے کی امید؟ اور زمانے کے یہ طور   میرا ہی جگر ہے کہ جیئے جاتا ہوں!

تحسین سروری

مداری

ڈھل گیا سورج تپش کم ہوگئی لیکن ابھی ! خاک کے سینوں میں سوزاں ہے مسلسل آگ سی
دوپہر ڈھل کر یہ عالم ہے در و دیوار کا موت پر ہو آسرا جیسے کسی بیمار کا
یہ محلہ جس میں نوے فی صدی مزدور ہیں سرخوشوں کو جانتے ہیں سرخوشی سے دور ہیں
آکے ملتا ہے جہاں دو تنگ کوچوں کا سرا اور وہیں سے ایک ہو کر بڑھ گیا ہے راستا

اک مداری اس طرح دکھلا رہا ہے اپنا کھیل
پڑ رہی ہے دل میں بچوں کے خوشی کی داغ بیل

ان کنے بچوں کے کہ جن کی زندگی کی شاہراہ کوئی سرمایہ نہیں رکھتی بجز فریاد آہ
بے کلی نے صبر کے رستے پہ ڈالا ہے جنھیں بے بسی نے ضبط کے سانچے میں ڈھالا ہے جنھیں
جن کے حصے کا کہیں خوفِ خدا باقی نہیں منصفی میں جن کے حق کا فیصلہ باقی نہیں
جن کی مایوسی نہیں رکھتی خوشی کی آرزو ! بے طرح ارزاں ہے جن کے دست و بازو کا لہو

اے مداری گائے جا دفلی بجا کر گائے جا
ان غریبوں کے جگر پاروں کے دل بہلائے جا

جانے پھر ان کو کشاکش یہ تبسم دے نہ دے ڈگڈگی کی تال، ہنسی کا ترنم دے نہ دے
ان کے ہونٹوں پر نہ جانے پھر ہنسی آئے نہ آئے زندگی پر آب و رنگِ زندگی آئے نہ آئے؟
جانے ان کو وقت کوئی قہقہہ دے، یا نہ دے؟ خود غرض قانون محنت کا صلہ دے یا نہ دے؟
ان کی فہرستِ پریشانی میں راحت ہو نہ ہو عمر بھر پھر ان کو یوں ہنسنے کی فرصت ہو نہ ہو

ان کی ظلمت میں فرشتے روشنی لکھتے نہیں
بھول کر فردِ جوانی میں خوشی لکھتے نہیں

احسان دانش

دنیا

میرا سہاگ اس وقت لٹا جب کہ بچپن شباب سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا اور میں عورت کہلانے سے پہلے ہی بیوہ کہلانے لگی۔

مجھے شوہر سے بچھڑے ایک سال بھی نہ ہونے پایا تھا کہ خالہ بی نے مجھ کو کسی اور کے ہاتھوں بیچ ڈالنے کی ٹھانی۔ مجھے یہ بات پسند نہ تھی۔ اپنا پیارا ساجد رہ رہ کر یاد آنے لگا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ سب کی چوری ایک [illegible] لاکھوں گیت اور وہ سپنا ہیں۔۔۔ دیکھے ہوئے کہ اب تنہائی میں دہراتے تھے۔ میں فلم کی ہیروئین اور وہ ہیرو معلوم ہوتے تھے۔

لیکن بیت گئے وہ دن ———— !

ہم ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے، دو ننھے دوستوں کی طرح۔ حالانکہ سماج ہمیں شادی کے بندھنوں میں باندھ چکا تھا۔ پھر بھی ہم اس کی آلائشوں سے پاک تھے۔ اس لئے کہ میں ابھی ننھی تھی اور ساجد بچہ۔

خالہ بی نے ——— مجھے ایک دولت مند بوڑھے سے بیاہ دیا۔ کتنا ظلم ہے جوانی کو بڑھاپے کی آغوش میں سونپ دینا۔ وہ ہونٹ جو موت کا تلخ گھونٹ پینے کے قابل ہوں وہ کس لئے گلابی ہونٹوں سے رستی ہوئی شرابِ جوانی پئیں ———— ! اف! کتنا بڑا گناہ !!

لیکن مشرقی لڑکیوں کے منہ میں زبان ہو تو بولیں۔ ان کی زبان پر تو شرم کی مہر لگی ہوتی ہے اور دل میں سماج کی فرسودہ روایات کا خوف، وہ ہنسی خوشی اپنی آرزوؤں کو سماج کے نذر چڑھاتی ہیں۔ میں نے بھی اپنی قربانی چڑھائی۔ آہوں اور طوفانی اشکوں کے ساتھ۔

میرا "جوان نما" شوہر سینگ کٹا کر بچھڑوں میں ملنے کا شیدائی تھا۔ روز ڈاڑھی بناتا، مونچھوں پر خضاب چڑھاتا، لمبی لمبی حنائی زلفوں میں "عروس بہار" ڈالتا اور چھیلا بنا رہتا۔ چندھیائی آنکھوں میں سرمہ لگائے چکن کی اچکن اور تنگ مہری کا پاجامہ پہنے بیٹھا جیسے منہ میں گلوری دبائے مجھ سے نوجوانوں کی طرح چھیڑ کرتا۔ عمر سے ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بوڑھے سے اظہار محبت سن کر شرم نہیں آتی بلکہ تنفر پیدا ہوتا ہے۔ اپنے حسن کی تعریف سن کر جی خوش نہیں ہوتا بلکہ بیٹھا جاتا ہے۔ اپنے سے چھیڑ کرتے ہوئے دیکھ کر تغافل کو نہیں انتقام کو جی چاہتا ہے۔ میری حالت پنجرے میں پھنسے ہوئے پرند کی سی تھی، جسے نہ اڑنے کو پر ہوں اور نہ بھاگنے کے لئے جگہ۔ مجھے اس کی ہر بات نصیحت معلوم ہوتی تھی چاہے وہ ازدواجی ہی کیوں نہ ہو اور میں حافظ کے اس شعر پر عمل کرتی تھی جو شاید بچپن میں مولوی صاحب کے ہاں پڑھا تھا ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند   جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

وہ پیرِ دانا تھا۔ لہٰذا وہ باپ کہلانے کی تمام صلاحیتیں رکھتا تھا اور شوہر بننے کی صورت بھی نہیں۔ مجھ کو اس سے انتہائی نفرت ہو چلی تھی۔ ہر جذبے کی انتہا تضاد کیفیت پیدا کرتی ہے۔ میرا تنفر بھی محبت میں بدل گیا ———— ؟

گرما کی شام تھی۔ چائے پی چکنے کے بعد اپنے گلاب کے باغیچے میں گلگشت کر رہی تھی۔ ابر پارے فضا میں کہیں کہیں اڑتے پھرتے تھے۔ ہوا میں کسی قدر خنکی آ چلی تھی۔ صنوبر پر مشرقی حرماں نصیب پرند چیخ رہا تھا۔

اس کی دلدوز چیخ نے میرا دل ہلا دیا اور میں بے تاب ہو گئی۔ آنکھوں سے دو نقرئی آنسو نکل پڑے سہمتے
خشک لبوں سے سسکتی ہوئی آہ — طبیعت غیر ہوئی جاتی تھی، خود کو سنبھالنے کے لئے مرمریں نشست پر بیٹھنے
پلٹی ہی تھی کہ —— ایک خوب رُو نوجوان میری طرف ٹکٹکی باندھے جانے کب سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔
پریشان سی ہو گئی اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک ہی خیال تھا جو بار بار دل میں آرہا تھا کہ "میرے
میں یہ کون درانہ چلا آیا" ہیجانی کیفیت اس شدت سے طاری تھی کہ میں کچھ کہہ نہ سکی اجنبی نوجوان نے خود مسکراتے
ہوئے شوخ لہجے میں کہا "آداب عرض کرتا ہوں" میری پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آخر جرأت کر کے پوچھا "آپ

"ناچیز جمیل" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"او —— آپ ہیں جمیل میاں، کیوں کیسے آنا ہوا۔ اور آئے بھی تو اطلاع تک نہ دی۔ اس
پر آدمی بھیج دیا جاتا ——" میں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لیا، جانے کیوں؟۔

وہ مسکرا پڑے اور شرارت سے کہا "اور کچھ پوچھئے گا؟ ایک ہی سانس میں اتنے سوال"

"تو ہرج ہی کیا ہے" میں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں" وہ سنجیدہ بنتے ہوئے بولے "کالج میں چھٹیاں ہو گئیں، گھر لوٹنے کی بجائے ا
چلا آیا" ذرا کی ذرا وہ رک گئے اور پھر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "اپنی نئی بھاوج
دیکھنے"

"تعطیلات یہیں گزاریئے گا"

"جیسی آپ کی مرضی"

وہ مشرقی لباس میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے پریشان اور دراز بال، ادبی لگاؤ،
مذاق اور رومان پسندی پر غمازی کر رہے تھے۔ سنہرے چشمے میں سے نرگسی آنکھیں چمک رہی تھیں، جوانی کے
نے ان کی سانولی رنگت میں ایک دلکشی پیدا کر دی تھی۔ ان کی جاذبیت میرے دل میں کھب گئی۔

وہ میری طرف دیکھ رہے تھے اور میں انھیں گھور رہی تھی۔ نظریں نیچی ہونے سے پہلے ہی دل
پار ہو گئیں —— وہ افسانوی ہیرو معلوم ہوتے تھے۔

گرما بسر کرنے کے لئے ہم برفانی وادی "زیبان" میں آٹھیرے۔ آتشیں آفتاب نے افق کی گود میں اپنا
چھپا لیا تھا۔ لیلائے شب کے دراز گیسو "زیبان" کی رومان پرور فضا پر لہرانے لگے تھے اور اس کی کا
پر کے جھر جھر کرتے جھومر کی سنہری کرنیں صنوبر اور شمشاد کی چوٹیوں سے بوس و کنار کر رہی تھیں، میر
جمیل میاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ نرگس کوئی دلکش گیت گنگناتی آئی اور شربت کے بلوریں گلا
پر رکھ دیئے۔

میں نے سرخ سرخ شربت کا ایک گھونٹ پی کر گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا "کیوں جمیل م
آج آبشار کی سیر کیسی رہے گی؟"

"بہت پُر کیف" انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "لیکن بھیا؟" "پڑے سوتے ہوں

نرگس بول اٹھی "آبشار کی سیر کے ساتھ کشتی رانی ہو جائے تو کیا کہنے"

"واللہ لطف آجائے" جمیل تقریباً چیخ اٹھے۔

"دیکھنا نرگس ذرا ہوشیار رہو" میں نے ہدایت کرتے ہوئے کہا "صاحب بیدار ہو جائیں تو کچھ کہہ سن کر ٹال دینا"

"تو ہم نہ چلیں" اس نے بسورتے ہوئے کہا

"کل ہمارے ساتھ چلنا' اچھی طرح سیر کرا لائیں گے" جمیل میاں نے اس کو جواب دیا اس کے گالوں اور ہونٹوں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔اس نے گردن ہلا کر رضامندی ظاہر کی۔

میں جھنجھلا کر بولی "نہیں وہ آپ کے ساتھ نہ جائے گی"۔ وہ بولے "کیوں آپ چلیں اور وہ بیچاری منہ دیکھا کرے"۔

"ہوں بےچاری ـــــ بڑا رحم آتا ہے نا آپ کو" میں خواہ مخواہ بگڑی جا رہی تھی۔ وہ مناتے ہوئے بولے "اچھا اب چلئے بھی۔خفا ہونے کا یہ وقت بھی تو نہیں"۔ان کے اس جملے پر مجھے ہنسی آگئی۔ وہ اپنے مضبوط ہاتھ میں میرا ہاتھ تھامتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

عورت کتنی کوتاہ دل ہوتی ہے۔اپنے محبوب کی نگاہ کسی اور پر پاتی ہے تو جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح اس کے تیور زہریلے ہو جاتے ہیں۔لیکن مرد! کتنے سادہ دل' کتنے سادہ لوح اور بھولے ہوتے ہیں۔

ہم دریائے سین کی طرف روانہ ہو گئے۔

صنوبر کے سایوں تلے ساحل پر پہونچ کر دو نشستہ طاؤسی کشتی کرایہ پر لی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنا ننھا سفینہ مضطرب موجوں کے سپرد کر دیا وہ سفینہ کھے رہے تھے اور میں پانی کے نقرئی قطروں سے کھیل رہی تھی۔

"آپ نے تو چپ کی سادھ لی۔کچھ بولئے نا" انھوں نے مجھ سے کہا۔میں چپ ہی رہی تو انھوں نے کہا "موسم بڑا سہانا ہے" "ہاں جمیل بڑی سہانی رات ہے۔لیکن ...."

"لیکن کیا" انھوں نے فوراً سوال کیا۔

یہ مسکراتا چاند' ساکت و صامت دریا' خوابیدہ ننھی ننھی موجیں اور ہچکولے کھاتا ہوا سفینہ۔پھر اس سفینے کے تم کھیون ہار۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی خوابوں کے جزیرے میں اڑے جاتے ہیں"۔کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

انھوں نے چپو رکھ دئے۔"ہاں بھابی جان زندگی ایک خواب ہی تو ہے اور ہماری ـــــ خصوصاً میری زندگی تو "ایک خواب ہے کسی دیوانے کا"۔

"یہ خصوصاً میں" کے کیا معنی' بات تو ہماری ہو رہی تھی"۔

"ہاں ہو تو رہی تھی' لیکن انسان اپنے ہی متعلق کچھ کہہ سکتا ہے۔جو خود اپنی زندگی کی گتھیاں نہ سلجھا سکا ہو وہ کسی اور کی زندگی پر کیسے حکم لگا سکتا ہے"۔

کیوں نراس ہو اپنی زندگی سے' ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے ـــــ" میری آواز حلق میں پھنسنے لگی اور میں چپ ہو رہی وہ کہنے لگے۔

"بس جو بھی دیکھا بہت دیکھا کاش اندھا ہوتا اور وہ بھی نہ دیکھ سکتا!"

کیوں بہکی بہکی باتیں کئے جا رہے ہو۔ میرا دل دھڑک رہا ہے للہ ایسے شگون زبان سے نہ نکالو"

وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ میں نے کہا "اک ذرا میرے قریب آجاؤ جمیل" وہ ذرا کی ذرا جھجکے پھر قریب آگئے ۔

"اور قریب آجاؤ نا، لیٹ جاؤ، تمہیں سکون کی ضرورت ہے میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

وہ بچوں کی طرح میری گود میں لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے ان سے کہا "جمیل کوئی گیت سناؤ گے"

"نا" وہ کچھ کھوئے کھوئے انداز میں بولے ۔تو کوئی رومانی نظم ہی سہی ——— وہ "آتشکدہ" ہے نا مخدوم کی وہی سنا دو"۔ میں نے پیار بھرے انداز میں فرمائش کی ۔

وہ ایک لمحے تک ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے پھر بولے "یہ رومانی نظارے، تنہائی، قرب، شعر اور موسیقی ۔! آخر!! بخدا میں اس کی تاب نہیں لا سکتا۔ کیوں امتحان لے رہی ہو میرا ——— بخدا اس ساز کو نہ چھیڑو جس میں فریاد مچل رہی ہو ۔ وہ یک بہ یک اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے "چلئے ۔اب ہمیں لوٹ جانا چاہئے"

صبح خوش گوار تھی "زیبان" میں آفتاب کی نرم اور سنہری کرنیں غذائیت کی طرح ضروری ہی نہیں بلکہ دلفریب مناظر کی جاذبیت بڑھانے کے لئے لازمی ہیں ۔ دریائے "سین" کی ننھی ننھی موجیں "منزل" (میری قیام گاہ) کی سنگین دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں ۔ بادبانی کشتیاں آ اور جا رہی تھیں ۔ دور سے آنے والی کشتیوں کے سفید مستول کسی ہندوستانی بیوہ کے آنچل کی طرح سسک سسک کر لہرا رہے تھے ۔ رومان پسند سیاحوں کی حسین ٹولیاں گھومتی پھرتی تھیں ۔ ہر طرف شادمانی ہی شادمانی تھی ۔ پتے پتے اور بوٹے بوٹے پر مسرت جھلک رہی تھی ۔

جمیل میاں آبنوسی دریچے کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹیکے دریا کی سیر کر رہے تھے ۔ ان کے سیاہ دراز بال مچل مچل کر سانولے سلونے گالوں کی بلائیاں لے رہے تھے ۔ میں قہوہ بنا رہی تھی ۔ جب تیار کر چکی تو وہ بھی آگئے اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "کتنی حسین ہے یہ وادی! جی میں خواہ مخواہ چاہت کی امنگ پیدا ہوتی ہے"۔ نرگس نے جو پاس ہی کھڑی قہوہ میں شکر ملا رہی تھی، کن انکھیوں سے مجھے تاکتے ہوئے سوال کیا "کس سے بابو صاحب"

میں جھلا کر چیخ اٹھی "تجھ سے چڑیل"

وہ سنجیدہ سی ہو گئی ۔ جمیل میاں نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا "اس حسین وادی، نقرئی جھیل، لہلاتے سبزے، تھرکتی موجوں، جھاگ اڑاتے ساحل، جگ مگ جگ مگ کرتے چاند، جھل مل جھل مل کرتے تاروں غرض اس خوابوں کے جزیرے کے ذرہ ذرہ کو چاہنے اور ہو سکے تو چاہے جانے کی آرزو ہے نرگس"

"او مائی ورڈ! ز در تھ" میں نے جملہ چست کیا ۔

"تو اظہار تعشق ہو رہا تھا" جمیل میاں کے بھیلے نے غصہ میں کانپتے ہوئے کہا ۔ شاید انھوں نے صرف آخری جملے سنے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ"، جمیل حالت استعجاب میں کہہ اٹھے ۔

"میرے گھر میں میری نظروں کے سامنے اور میری بیوی سے اظہار محبت کر رہے ہو اور پوچھتے ہو کیا کہہ رہے ہیں آپ! اللہ رے بے باکی!! اپنے بھائی کے گھر پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں"۔

"بھیا"

"بس خاموش ـــــ" جواب سے بھیا کہا۔ نکل جاؤ میرے گھر سے ـــــ اسی وقت"
جمیل بھی بگڑ گئے "ہاں چلا جاؤں گا ـــــ لیکن بھیا شرم آپ کو آنی چاہئے نہ کہ مجھے ۔ شرم اس کو آنی چاہئے جس نے کسی کی زندگی پر ڈاکہ ڈالا ہے، کسی کے جذبات سے کھیلا ہے اور کسی کے سازِ زندگی کو چور چور کردیا ہے صرف اس آرزو میں کہ شاید اس سے کوئی نغمہ نکلے تو تعیش سماعت ہو۔ جس طرح رباب پر ایک فن کار ہی کی انگلیاں راگ راگنیاں پیدا کرسکتی ہیں، اسی طرح حسن کے ساز کو جوانی ہی ہم آہنگ زیست کرسکتی ہے ـــــ کاش آپ کے خشک بازو کسی کی مینائی گردن میں حمائل ہونے سے پہلے ہی شل ہوجاتے ۔ آپ کے خشک ہونٹ کسی کے آتشیں لبوں کو چھیڑنے سے قبل ہی بے حس ہو جاتے اور آپ کے جذبات ٹھہوائی جوانی سے ہم آغوش ہونے سے پہلے ہی فنا ہوجاتے ـــــ" کہتے کہتے وہ کمرے سے چلے گئے ۔ اسی شام کی گاڑی سے وہ وطن لوٹ گئے ۔

وہ چاہے کس قدر ہی مختصر ہو
محبت کی جوانی زندگی ہے

محبت کا خواب کتنا سہانا اور کس قدر ناپائیدار ہوتا ہے ۔ کاش زندگی ایک ننھا سا حسین خواب ہی بن جائے ۔ لیکن ظالم فطرت کو کیوں قرار آنے چلا تھا ۔ اس کی رگ رگ میں ذوقِ فنا انگڑائیاں لیتا رہتا ہے اور شاید فطرت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ ناپائیدار ہے ۔ عبدیت اور معبودیت کا بے نام فرق یہیں جاکر ختم ہوتا ہے ۔ حسن کار بھی خالق، حسنِ ازل بھی خالق، اس کی مخلوق بھی فانی اس کے شہ کار بھی فانی ؎

نہ تو اور نہ میں اور نہ وہ جاودانی
ازل کے مصور کا ہر نقش فانی

ارے توبہ، رہنے بھی دو اس خالق و مخلوق اور بقا و فنا کی الجھنوں کو میں کہہ رہی تھی جمیل میاں کو گئے چار سال بیت گئے ۔ انہوں نے بھلا دیا یہ تو میں کہہ نہیں سکتی ۔ ہاں میں نے انھیں ابھی تک دل میں بسائے رکھا تھا اور اگر انہوں نے بھلا دیا ہو تو اس میں ان کا کیا قصور! ؎

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمہیں بھلا سکے

یوں بھی یاد اور بھول اضافی چیزیں ہیں، محبت سے ان کا تعلق؟ ہاں تو چار سال بعد کی بات ہے کہ ان کی شادی کا دعوت نامہ ملا ۔ ہمیں بلایا تھا ۔ میں بہت خوش تھی ۔ شاید ان بیاہی لڑکی بھی آرزوئے وصل کی لطیف چٹکیوں سے دل ہی دل میں اتنا خوش نہ ہوتی ہوگی ۔ کیوں نہ خوش ہوتی میرے جمیل کی شادی تھی نا ۔ شادی کسی کے ساتھ کیوں نہ ہو، وہ میرا محبوب ہی تو تھا ۔ مجھے خود دیکھئے شادی ہوئی بڑے بھائی سے اور دل ہار آئے جمیل سے ۔
"بوڑھے" کو میرے انبساط پر بہت اچنبھا ہوا اور انھیں یقین ہوچلا کہ مجھے جمیل سے کوئی تعلق خاطر نہیں اس لئے وہ شادی میں شریک ہونے پر راضی ہوگئے ۔

سورج کی زرد شعاعیں نیم جان پتوں پر پھیل رہی تھیں۔ شہتوت اور دیوار کے دراز سائے وحشت ناک معلوم ہوتے تھے۔ خشک ٹہنیوں اور سوکھے پتوں کی رگڑ سے جو آواز نکلتی ایسا معلوم ہوتا تھا مرثیہ خوانی ہو رہی ہے۔ ہوا کے گرم جھونکے اس اداس فضا کو اور بھی بھیانک بنا دیتے تھے۔ ہر طرف وحشت اور ہر سمت خوف و ہراس طاری تھا ——— جیسے دنیا ماتم کدہ بنی ہوئی ہے۔

جمیل میاں کے مکان پر سناٹا چھایا ہوا تھا نہ در پر دربان نہ باغیچہ میں مالی، نہ چہل پہل نہ شور ہنگامہ، نوبت کی آواز نہ شہنائی کی سریلی دھن، نہ ڈھول کی تھاپ نہ ڈومنیوں کا گانا ——— میرا ماتھا ٹھنکا۔ خشک اور بوڑھے درخت پر الو .... چیخ اٹھا — میرا جی بیٹھ گیا، نبضیں چھوٹ گئیں۔ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ لیکن کانوں میں کسی کی جانی پہچانی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی کہہ رہا ہو "بھابی جان ——— میری جان، تمہارا کب سے انتظار ہے۔ آ بھی جاؤ، دیکھو نا ہم ایسے میں بھی تمہیں کو یاد کر رہے ہیں۔" قدم اٹھ گئے اور میں دوڑنے لگی۔ زور سے بہت تیز۔ کبھی اتنی تیزی سے نہیں دوڑا تھا۔ وہ تو خیر گزری ڈرائنگ روم میں جمیل میاں کی ممانی گئیں اور میں سنبھل گئی۔ سانس پیٹ میں سمانے لگا تو منہ سے نکل گیا "جمیل میاں"

کہاں کا سلام کیسا پیام، کیسی خیر و عافیت اور کدھر کی مبارک سلامت۔ شاید ہونی کو حیات پہلے ہی محسوس کر لیتے ہیں۔ انھوں نے ایک آہ کھینچی، آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ کہنے لگیں ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے

بس اس کو تو تمہارا ہی انتظار تھا۔ "یعنی آپ کیا کہہ رہی ہیں"
"سچ کہہ رہی ہوں بیٹی" ان کی آنکھوں سے گنگا جمنا ابل پڑی اور سسکیوں کے درمیان رکتے رکتے کہا "آٹھ دن پہلے بھلا چنگا تھا۔ ادھر شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں ادھر اس کے دشمن بیمار پڑ گئے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں تپ دق ہے، مرض پرانا ہو چلا ہے، اندر ہی اندر گھن لگ گیا ہے۔ زندگی کی کوئی امید نہیں اور کل تو ڈاکٹر جاوید نے ایکس رے کے بعد بالکل نراس کر دیا۔"
میں بے قابو ہو کر بولی "ان ڈاکٹروں کا کیا کہنا یہ تو خدائی فوجدار ہیں، جسے چاہا مار ڈالا جسے چاہا چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ زندگی اللہ کے ہاتھ ہے، میرا معبود ضرور انھیں بچا لے گا، اس اٹھتی جوانی پر ضرور ترس آ جائے گا اسے۔"
"نہیں بیٹی، موت بوڑھے اور جوان کو تھوڑا ہی دیکھتی ہے۔ بس جس کی سر گئی وہ سدھارے لیکن میرا جمیل کہتا تھا کہ نہیں ڈاکٹر! میں آج نہیں مر سکتا ——— اس کے آنے تک میں زندہ رہوں گا۔ کوئی قوت مجھے نہیں مار سکتی۔ زندگی صرف چند ساعتوں کے نظام ہی کا نام تو نہیں بلکہ زندگی ایک نظام نامے کے تحت چلتی ہے۔ دیکھو میرے ذمے ایک اور کام رہ گیا ہے۔ اسے پورا کر لوں تو سدھاروں، چاہے اس کے پورا ہونے میں کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو ——— میں نہ مروں گا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے کمرے کی طرف چل پڑیں۔

جمیل آنکھیں بند کئے بستر علالت — نہیں، نہیں بستر مرگ پر پڑے تھے۔ بس ہڈیاں ہی ہڈیاں اور اور سانس ہی سانس باقی تھی۔ قدم کی آہٹ پر انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چشم شہلا، اب چشم بیمار ہو گئی تھیں۔ بخدا میں تاب نہ لا سکی۔ لیکن کیا کرتی چپ ہی رہی، وہ آہستہ آہستہ بولے۔ ع "بہت دیر کی مہرباں آتے آتے"

پھر اپنے سوکھے ہوئے ہاتھ میری طرف بڑھا دئے۔ میں اپنے آپ کو ان کی آغوش میں سونپ دیا۔ انہوں نے اپنی نازک انگلیاں میرے بالوں میں پھیرتے ہوئے "بھابی جان ہمیں یہ خیال ہو چلا تھا کہ کہیں ہماری روح قبر کی تاریکیوں میں تیرا یہ شعر دہراتی رہے —

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

لیکن تم آ ہی گئیں۔ کتنا خیال ہے ہمارا"

انہوں نے اپنی آغوش میں مجھے بھینچ لیا۔ مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس ایک لمحے کے لئے ساری کائنات میرے اختیار میں ہے اور ہماری محبت پھیلتے پھیلتے کون و مکاں پر چھا گئی ہے ——— لیکن ان کے ہونٹوں کا ارتعاش ساکت ہو گیا اور باہوں کی گرفت اور سخت، مضبوط اور روح نواز ———

حسینی شاہد

گھٹائیں

سر کہسار گھٹاؤں کا بہکنا تو یہ!
دل میں طوفان نہ بیدار کہیں ہو جائے
آم کے پیڑ پہ کوئل کا چہکنا تو یہ!
یہ نہ ہو پھر مجھے جینے کا یقیں ہو جائے
میری خوں گشتہ تمنا کا بہکنا تو یہ
کشتیٔ عمر نہ ساحل کے قریں ہو جائے

سرِ مژگاں کوئی آنسو نہ ڈھلک آئے کہیں
اس سے پیماں ہے اسیری میں جیوں گا تا زیست
جام خود ساقیٔ فطرت ہی جو بھر لائے کہیں
نہ پیوں گا نہ پیوں گا نہ پیوں گا تا زیست

موج و گرداب مرے شوق کی تصویریں ہیں
ان جواں مرگ ارادوں کی تباہی تو یہ!
ہائے بے بس ہوں مرے پاؤں میں زنجیریں ہیں
سرِ کہسار گھٹاؤں کی سیاہی تو یہ!
دل میں طوفان نہ بیدار کہیں ہو جائے
یہ نہ ہو پھر مجھے جینے کا یقیں ہو جائے

افسر آذری
(امرتسر)

تنقید و تبصرہ

نادرات شاہی

از شاہ عالم بادشاہ - مرتبہ - امتیاز علی خاں عرشی - ناشر کتاب خانہ رامپور -

ابوالمظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی ہندوستان کے آخری مغل بادشاہوں میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کی سند عطا کرکے انھوں نے اس ملک میں برطانوی سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ ان کی زندگی بہت پریشانیوں میں گزری اور آخرکار غلام قادر خاں نے ان کو بینائی سے بھی محروم کر دیا تھا۔

شاہ عالم فارسی، اُردو اور ہندی تینوں زبانوں کے ادیب اور شاعر تھے اور یہ کتاب نادرات شاہی ان کے اردو اور ہندی کلام کا ایک مجموعہ ہے، جو اصل شاہی مسودے کی ترتیب کے مطابق ہندی اور اُردو دونوں رسم الخطوں میں شائع کیا گیا ہے۔

کتب خانۂ ریاست رامپور کی دوسری مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی خاص اہتمام کے ساتھ اردو اور ہندی ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور ابتدا میں تقریباً ساٹھ صفحات کا ایک مقدمہ مولوی امتیاز علی عرشی نے قلم بند کیا ہے جس میں بادشاہ کے حالات اور کتاب کی خصوصیات وضاحت سے بیان کی ہیں۔ یہ کام بہت سلیقے اور تلاش و تحقیق کے ساتھ کیا گیا ہے اور اس کے لئے مرتب کی جتنی بھی قدر افزائی کی جائے کم ہے۔

اصل مجموعے میں جو غزلیں شریک ہیں وہ زیادہ تر اُردو ہی ہیں البتہ ان کو ناگری رسم الخط میں بھی لکھا گیا ہے لیکن محض رسم خط کی وجہ سے ان اردو غزلوں کو ہندی غزلیں نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ حصۂ غزلیات کے بعد جو نظمیں اور دوہے شامل ہیں وہ سب ہندی میں ہیں اور ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ عالم کو ہندی کا بھی بڑا اچھا ذوق حاصل تھا اور اس زبان پر بھی انھوں نے بڑی حد تک قابو حاصل کر لیا تھا۔

اس مجموعے کی اشاعت سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اکبر اور جہانگیر نے ہندو مسلم اتحاد کی جو بنا ڈالی تھی وہ مغلوں کے آخری تاجداروں کے زمانے میں بھی مستحکم تھی۔ اور مغل بادشاہ اپنی مسلمان اور ہندو رعایا دونوں کے ادب اور کلچر سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔

اقوال اہل بیت نبی مختار

از سید محمد حسین جعفری مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن۔

یہ تقریباً پانچ سو ساٹھ صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں علامہ مجلسی کی مشہور عربی کتاب بحار الانوار کی جلد اول کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

بحار الانوار امامیہ مذہب کی ایک بلند پایہ کتاب ہے جس میں حضرات ائمۂ معصومین کے اقوال سے مختلف دینی و دنیوی علوم اور احکام کو منضبط کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کی پہلی جلد میں زیادہ تر علم و عقل سے متعلق حضرات ائمۂ معصومین کے اقوال درج ہیں۔ بحار الانوار کی دوسری بعض جلدوں کا ترجمہ اُردو میں ہو چکا ہے لیکن پہلی جلد کا ترجمہ اب تک نہیں کیا گیا تھا۔ ترجمے سے قبل مولوی محمد حسین جعفری صاحب نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جو بجائے خود ایک کتاب ہے اور جس میں انھوں نے ائمۂ طاہرین کے حالات اور تاریخی واقعات پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس مقدمے کے بعد خود علامہ محمد باقر مجلسی کے حالات تقریباً پچاس صفحات میں لکھے گئے ہیں اور ان تمام ابتدائی اوراق کی ترتیب میں مصنف نے بڑی محنت اور جانکاہی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا یہی ابتدائی حصہ اصل ترجمۂ بحار الانوار سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ محمد حسین جعفری صاحب کو عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے اتنی دقت محسوس نہیں

ہوئی ہوگی [illegible] کتاب کے مقدمے کی تالیف میں ہوئی ہے۔ مناسب [illegible] وہ اپنے مقدمے کو ایک علیحدہ کتاب کی شکل میں شائع کریں کیونکہ اس میں جملہ [illegible] شعراء کے تفصیلی حالات شامل ہو گئے ہیں۔

موت و حیات

از شاطر حکیمی۔ ناشر سی۔ پی اکیڈیمی ناگپور۔

شاطر حکیمی صوبۂ متوسط کے خوش فکر شعراء میں ایک اچھی جگہ کے مالک ہیں اور اپنے ترقی پسند رجحانات کے باعث عہد حاضر کے نوجوان اُردو شعراء کی صف میں شامل نظر آتے ہیں۔ وہ جس مقام پر پیدا ہوئے اور جہاں نشو و نما پائی اس کے لحاظ سے ان کی یہ خصوصیات خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ صوبۂ متوسط، دوآبۂ گنگ و جمن یا پنجاب یا دکن کی طرح اُردو زبان اور ادب کا مرکز نہیں سمجھا جاتا لیکن عہد حاضر میں اس سرزمین سے اچھے اچھے شاعر، انشاپرداز اور صحافت نگار پیدا ہوتے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے یقین ہے کہ ایک روز یہ صوبہ بھی اُردو کے خدمت گزاروں کا مامن و مخزن ثابت ہوگا۔

شاطر حکیمی کا یہ مجموعۂ کلام ان کے تابناک مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ زمانے کے رجحانات سے پوری طرح واقف بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں دلگدازی بھی اور زندگی پائی جاتی ہے۔ زبان پر بھی انھیں قابو حاصل ہے اور قافیوں اور ردیفوں میں ترنم پیدا کرنے کے راز سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں کے عنوان بھی بہت دلچسپ اور بے تکلف مقرر کئے ہیں۔ یقین ہے کہ ان کا یہ مجموعہ اُردو شاعری کی دنیا میں اپنی جگہ پیدا کرے گا۔

ہندوستانی معاشیات کے مبادی

از شرف الدین بی۔ اے (عثمانیہ)

ناشر انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد

یہ ضخیم کتاب سلسلۂ مطبوعات انجمن طیلسانین عثمانیہ کی چودھویں کڑی ہے۔ اور اس کا پیش لفظ مولوی محمد حبیب الرحمن صاحب ناظم سررشتۂ تجارت و حرفت نے قلم بند کیا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں اگرچہ انگریزی کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے لیکن برطانوی ہند کے علاوہ مملکت آصفیہ کی معاشی زندگی کے متعلق بھی جگہ جگہ حالات کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ کتاب سات ابواب پر منقسم ہے پہلا باب قدرتی ذرائع اور آبادی، دوسرا ہندوستان میں معاشی تغیر، تیسرا زراعت، چوتھا صنعتی ترقی۔ پانچواں حمل و نقل اور تجارت، چھٹا زر، قیمتیں اور بنک کاری اور ساتواں مالیات کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ بہرحال پوری کتاب علمی معاشیات کی ضروری معلومات سے مملو ہے اور چونکہ اسلوب بیان بہت سادہ اور سلیس ہے اس لئے توقع ہے کہ عام اُردو داں اس کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

شیرازہ

از احسان دانش۔ ناشر۔ مکتبۂ دانش، ڈونگ لاہور۔

احسان دانش پنجاب کے مشہور شعراء میں سے ہیں اور اب تک ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے بعض پر اس رسالے میں تبصرہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ ان کا ایک جدید مجموعہ ہے جو غلام معین الدین ای۔ سی۔ ایس کے نام معنون کیا گیا ہے اس کو "آتش گل"، "داغوں کے پھول" اور "جھنکارین" کے عنوانات کے تحت تین حصوں پر منقسم کیا ہے پہلے دو حصے نظموں پر مشتمل ہیں اور آخری حصہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔

احسان دانش شاعر مزدور کے لقب سے مشہور ہیں اور اس وقت سے مزدوروں کی ترجمانی کرتے آئے ہیں جب کہ جدید ترقی پسند شعراء کا گروہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان کے کلام میں جوش اور اثر دونوں موجود ہیں اور وہ حزن و ملال کی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ بھی ان کی شاعری کے جدید رجحانات کا دلچسپ نمائندہ ہے اور توقع ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

موجودہ جنگ کے اثرات قانون بین الممالک پر

از رشید صدیق حسین بی اے۔ ایل ایل ایم ناشر انجمن طیلسانین عثمانیہ۔ حیدر آباد۔

یہ اس انجمن کے سلسلۂ مطبوعات کی پندرھویں کڑی ہے اور در اصل وہ مقالہ ہے جو جامعۂ عثمانیہ کے امتحان ایل ایل ایم کے لئے قلم بند کیا گیا تھا۔ اس میں کوئی پچاس عنوانات کے تحت قانون بین الممالک سے متعلق ضروری اور تحقیقی معلومات درج ہیں اور خاص طور پر فلسطین، شام اور لبنان اور حیدر آباد میں یوروپینوں اور امریکیوں کو جو خصوصی مراعات حاصل ہیں ان کے متعلق معلومات دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

ہندوستانی ساہتیا

از برج لال۔ مطبوعہ چشتیہ پریس حیدر آباد۔

برج لال صاحب کو اردو کی خدمت کا ایک اچھا ذوق حاصل ہے انھوں نے مختلف اصحاب کے مضامین کے مجموعے شایع کرنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ زیر نظر مجموعے میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا مضمون "ہمارے مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم" کے عنوان پر اور کرشنا سوامی صاحب مدیراج کا مضمون "پربھو کی تلاش" قابل ذکر ہے۔ پہلا معلومات کے لحاظ سے بہت مفید ہے اور دوسرا اپنے دلچسپ اسلوب بیان کی وجہ سے دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ آخری مضمون خود برج لال صاحب کا ہے جو "اسلام اور ہندوستان" کے عنوان پر لکھا گیا ہے۔ برج لال صاحب کا خیال ہے کہ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے رسالے مختلف اصحاب سے مرتب کرا کے شایع کریں۔ ان کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور توقع ہے کہ ان کی قدر افزائی کی جائے تو وہ اردو کے لئے مفید خدمت انجام دے سکیں گے۔

"ق"

سرگزشت حاتم

دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعرا شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور اردو فارسی کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور قال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔ تشنگان ادب اور محققین کے لئے یہ نادر تحفہ ہے۔ صفحات (۱۲۸) طباعت وکتابت دیدہ زیب قیمت عہ

ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیرت آباد حیدر آباد دکن

ہندوستانی تمدن

از پروفیسر ڈاکٹر ایشورا ٹوپا۔ ڈی فل پروفیسر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ۔

یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندوستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح وبسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کجا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ جو لوگ قدیم ہندوستان سے واقف ہونا چاہتے ہوں اس کو ضرور پڑھیں۔

صفحات (۴۰۰) قیمت عہ

ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر رفعت منزل

خیرت آباد حیدر آباد دکن

خوشی کی بات ہے کہ مولوی قاضی خیر الدین صاحب معتمد طلبہ [illegible] ان طلبہ میں سے اتفاق کر کے اردو امتحانات میں شریک کروایا۔ ۱۳ مئی کو کامیاب امیدواروں کو اسناد تقسیم کرنے کے لئے [illegible] گاؤں کے چند معزز حضرات نے جلسہ کا معقول انتظام کیا۔

جلسہ تقسیم اسناد دیہی گاؤں یکم مئی ۱۹۴۳ء موتی لال صاحب [illegible] کے مکان میں ایک جلسہ عام کیا گیا۔ دیہات میں منادی کرا دی گئی تھی۔ جلسہ کا آغاز ٹھیک [illegible] بجے ہوا۔ مولوی شیخ حسین صاحب نائب معتمد، ابوالظفر محی الدین صاحب سابق معتمد کی تائید پر مسٹر [illegible] پٹیل نے جلسہ کی صدارت کی۔ مولوی شیخ حسین صاحب مولوی ابوالظفر محی الدین صاحب نے ادارہ کے اغراض و مقاصد پر کافی روشنی ڈالی۔ آخر میں صدر جلسہ نے بھی تعلیم کی اہمیت پر مختصر تقریر کی اور کامیاب طلبہ کو اسناد تقسیم فرمایا۔

۲ مئی ۱۹۴۳ء کو [illegible] گاؤں سے سون پیٹھ روانہ ہوئے جہاں مولوی شیخ [illegible] صاحب [illegible] نے جو ایک [illegible] ہیں، گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اور اپنے یہاں قیام و طعام کا معقول انتظام کروایا جس کے ہم بہت مشکور ہیں۔

جلسہ تقسیم اسناد سون پیٹھ [illegible] ۲ مئی ۱۹۴۳ء کو مدرسہ وسطانیہ سون پیٹھ میں ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جلسہ مسٹر [illegible] راؤ [illegible] تحصیلدار [illegible] کی صدارت میں منعقد ہوا۔ قصبہ ہذا کے حسب ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر [illegible] راؤ صاحب، منوہر راؤ صاحب بخشی اول مددگار مدرسہ ہذا۔ مولوی سید احمد صاحب [illegible]، مولوی قاضی بشیر الدین صاحب، مولوی غلام محبوب صاحب منشی [illegible]، [illegible] راؤ صاحب وکیل، مولوی محمد ہاشم صاحب، [illegible] راؤ صاحب وکیل، [illegible] شنکر راؤ صاحب، حسین میاں صاحب [illegible]، ہری بھاؤ صاحب، انت راؤ صاحب، مولوی شیخ [illegible] میاں صاحب تاجر۔ جلسہ کے آغاز پر مولوی شیخ حسین صاحب مولوی ابوالظفر محی الدین صاحب نے ادارہ کے اغراض و مقاصد بیان کئے۔ ازاں بعد صدر جلسہ نے بھی اپنے زریں خیالات سے حاضرین کو مستفید کیا اور سندیں تقسیم کیں جلسہ کے ختم پر طلبہ اردو امتحانات میں شریک ہوئے۔

۳ مئی ۱۹۴۳ء کو [illegible] دفتر ادارہ ادبیات اردو کو واپسی ہو گئی۔

تعلیم و تدریس کا مفت انتظام اردو امتحانات کی تیاری کرائی جا رہی ہے روزانہ صبح درس ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر مولوی شیخ حسین صاحب مولوی فرزند الدین صاحب مولوی خیر الدین صاحب، مولوی ابوالظفر محی الدین صاحب (جو بغرض استفادہ تعطیلات موسم گرما تشریف لائے) خورشید النساء بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں [illegible] معتمد شاخ [illegible] مولوی سعید الدین صاحب درس دے رہے تھے۔

ادارہ کے حالات مولوی شیخ حسین صاحب، مولوی فرزند الدین صاحب مولوی سعید الدین صاحب اور دیگر ارکان نہایت سرگرمی سے کام انجام دے رہے ہیں کتب خانہ کا انتظام سعید الدین صاحب کے ذمہ ہے ابتدا سے اب تک ادارہ جناب قاضی محبوب الدین صاحب کے دیوان خانے میں ہے جس کا ادارہ بہت ممنون و مشکور ہے۔ علم کا ذوق بڑھانے کے لئے ادارہ کے دار المطالعہ سے لوگوں کو کتابیں دی جاتی ہیں روزانہ عوام اور ارکان دار المطالعہ میں آتے ہیں افسوس ہے کہ ادارہ کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے اخبار رہبر دکن ایک سال سے بند ہے۔

بلڈنگ فنڈ صدر ادارہ کی اپیل پر ادارہ ہذا نے تقسیم اسناد کی عمل ملتوی کر دیا ہے اس فنڈ کی تکمیل کے لئے عالی جناب [illegible] تعلقدار صاحب میر مجلس ادارہ ہذا سے ملاقات کی گئی۔ امید کی جاتی ہے کہ حسب استطاعت دفتر ہذا سے بلڈنگ فنڈ کے لئے رقم روانہ کی جائے گی۔

اردو امتحانات بابت [illegible] سال حال ادارے [illegible] کے اردو امتحانات [illegible] جولائی ۱۹۴۳ء کو [illegible]

حسب ذیل مرکزوں میں منعقد ہوئے۔
الندہ۔ انمولہ۔ بانسواڑہ۔ بشیر آباد۔ بلدہ (اناث) بلدہ (ذکور) بلدہ (فوج) بلولی۔ بیبی۔ پرلی۔ تانگلی۔ جگتیال۔ دوم کنڈہ۔ کوڑنگل۔ گدوال۔ سنگلے گانڈل۔ مومن آباد (فوج) میبوپ۔ ناگر کرنول۔ نظام آباد۔

ادارہ کی طرف سے حسب ذیل اصحاب بحیثیت صدر نگرانکار تشریف لے گئے تھے جنھوں نے تاریخ اور وقت مقررہ پر امیدواروں کا امتحان لیا۔

مولوی کلیم اللہ حسینی صاحب مولوی فاضل (الندہ) مولوی محمد حسین صاحب اطہر (انمولہ) مولوی مظہر الدین صاحب (بانسواڑہ) مولوی احمد اللہ حسینی صاحب (بشیر آباد) مسٹر راما کرشن راؤ پستکی (بلولی) مولوی خیر حسن صاحب ایم اے (بیبی) مولوی محمد امیر الدین صاحب (پرلی) مولوی رکن الدین صاحب حسان (تانگلی) مولوی شیخ محمد اسمٰعیل صاحب (جگتیال) مولوی ظہیر الدین صاحب (دوم کنڈہ) مسٹر شیشیا (کوڑنگل) مولوی معین الدین صاحب ایم ایس سی (گدوال) نواب باقر علی خاں صاحب (سنگلے گانڈل) مولوی حمید الدین صاحب (نظام آباد) مولوی احمد محی الدین صاحب منشی فاضل (ناگر کرنول)۔

مرکز بلدہ ذکور و اناث حسب سابق سٹی کالج اور نواہ ہائی اسکول نام پلی مقرر کئے گئے تھے۔ مرکز فوج نظام بیج اور پولیس فتح میدان قرار پائے۔ مرکز بلدہ کے صدر نگران کار مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار جامعہ عثمانیہ مرکز بلدہ فوج کے صدر نگران کار پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی تھے۔ مرکز اناث کی نگرانی محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ، محترمہ نابغہ بیگم صاحبہ، محترمہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور اور محترمہ مسز عبد الرحمن صاحب مدیر وقت نے فرمائی۔

مولوی اکبر الدین صاحب ایم اے اور مولوی خیر الدین صاحب وکیل نے مرکز بلدہ کی نگرانی میں صدر نگرانکار صاحب کی بہت مدد فرمائی۔ مرکز فوج کی نگرانی میں جناب راج صاحب سکسینہ ایم ایس سی، مولوی عبد الحفیظ صاحب صدیقی ایل ایل ایم، مولوی عبد القادر صاحب فائق (عثمانیہ) اور مولوی ابو الظفر محی الدین صاحب نے ہاتھ بٹایا۔

مرکز اناث کی نگرانی میں محترمہ اختر النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ نے بڑی مدد دی۔

جملہ مراکز کی تفصیلی روئداد میں سلسلہ وار شائع کی جا رہی ہے۔

مرکز نظام آباد ۸ جولائی سنہ کو رات کے ساڑھے نو بجے نظام آباد پہونچا۔ اسٹیشن پر مولوی محمد حسین خاں صاحب معتمد شاخ ادارہ نظام آباد تشریف لائے تھے۔ مسافر بنگلہ میں قیام و طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ معتمد صاحب کو قیام و طعام کا خاص خیال تھا جس کی وجہ سے آرام رہا۔ ۱۰۔۱۱ شہریور سنہ ۱۳۵۵ف کو ٹھیک وقت پر امتحان شروع ہو گیا۔ مولوی انیس الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ نظام نے از راہ عنایت مدرسہ کا بڑا ہال ذکور کے امتحان کے لئے اور ایک دوسرا کمرہ اناث کے لئے دیدیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ فرنیچر اور سیاہی کی دواتیں بھی دلا دیں تھیں جس کی وجہ سے معتمد صاحب کو بہت سہولت ہو گئی۔ نیز صاحبزادہ مولوی میر اکمل خاں صاحب مہتمم تعلیمات نے اپنے دفتر سے اناث کے پردہ کے لئے روٹیاں وغیرہ فراہم کر دی تھیں۔

ذکور کے امتحان میں معتمد صاحب کے علاوہ وینکٹ کشور سنگھ صاحب صدر مدرس ڈارینڈی کلاں تعلقہ کاماریڈی، مولوی محمود صاحب نائب معتمد شاخ ادارہ، مسٹر ڈی راجنا اور مولوی عبد الاحد صاحب مددگاران مدرسہ تحتانیہ بلدہ نظام آباد اور مولوی محمود علی خاں صاحب محمود نے نگرانی فرما کر بہت مدد دی۔

طبقہ اناث میں جناب صفیہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسوان وسطانیہ نے بحیثیت صدر نگران کار مسلسل تین روز نگرانی فرما کر اپنی انتہائی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ صدر صاحبہ نے اپنی مدد کے لئے ایک اور نگرانکار محترمہ شفیقی بائی صاحبہ کو بھی بلا لیا تھا۔ اس کے علاوہ خادمہ بھی طالبات کو پانی پلانے کے لئے موجود تھی۔

جناب [illegible] صاحب [illegible] کپل کرمکل اینگریٹ
[illegible] انتہائی [illegible] بہت انکار سے
کام [illegible] کر کے انتہائی مسرت حاصل کی [illegible]
[illegible] میں آپ ہی کی توجہ خاص کا
مرہون منت [illegible] کہ ایسے خدمت گزاران قوم کی ضرورت
[illegible] ناسازی مزاج امتحان گاہ تشریف نہ لا سکے۔
[illegible] ہوا۔

سب سے [illegible] کر مولوی غلام محمد صاحب وکیل قابل ذکر
ہیں معلوم ہوا کہ صاحب موصوف ہی کی بدولت وہاں ادارہ
قائم ہوا اور چل رہا ہے۔ بانی بھی وہی ہیں۔ اپنا زیادہ وقت
امتحان گاہ میں دیکر انتہائی دلچسپی کا ثبوت دیا۔

۲۰ خورداد [illegible] کو مولوی غلام احمد صاحب کے ہمراہ
صاحبزادہ میر احمد علی خاں صاحب مہتمم تعلیمات و مولوی بشیر احمد
صاحب مہتمم خزانہ امتحان گاہ تشریف لائے تھے۔ مہتمم صاحب
تعلیمات نے تمام پرچوں کو بغور ملاحظہ کرکے معیار کے متعلق اظہار
خوشنودی فرمایا۔

معتمد صاحب ادارہ نظام آباد کی زبانی معلوم ہوا کہ دو سالہ
اسناد تقسیم شدنی ہیں۔ اس کے لئے ایک جلسہ منعقد کرنیکی
کوشش میں ہیں۔ موصوف نے انتہائی کوشش کی کہ ہماری
موجودگی میں ہو جائے۔ لیکن اکثر عہدہ دار تعطیلات کی وجہ
مستقر پر نہیں تھے۔ جناب مہتمم صاحب تعلیمات و خزانہ نے
امید دلائی کہ قریب میں جلسہ تقسیم اسناد منعقد کریں گے معتمد
صاحب موصوف و مہتمم صاحب تعلیمات کا یہ خیال ہے کہ سابقہ
ارکان کی تبدیلی ضروری ہے۔ کام کرنے والوں اور دلچسپی
رکھنے والوں کو شریک کرنا چاہیے۔

آخر میں معتمد صاحب شاخ ادارہ نظام آباد کا شکریہ
ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جن کی وجہ مجھ کو ہر طرح آرام رہا
نیز موصوف پڑتے پانی میں مجھے اسٹیشن نظام آباد پر سوار
کرا کے واپس ہوئے۔

مجید الدین

مرکز پرلی

بتاریخ ۲۰ امرداد [illegible]ف بوقت ۶-۵۰ م کو
اسٹیشن [illegible] حیدرآباد دکن سے روانہ ہوکر تقریباً
۱۰ بجے شب اسٹیشن پر مولوی شیخ محمد نذیر صاحب معتمد ادارہ ادبیات
اردو مستقر پرلی مع ارکان موجود تھے۔ صاحب موصوف سے ملاقات
کے بعد جناب نے دیگر ارکان کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد آبادی کو
روانہ ہوئے مدرسہ تحتانیہ میں قیام کا انتظام تھا۔

مدرسہ تحتانیہ قصبہ پرلی میں ہی امتحان کا انتظام تھا۔
تاریخ مقررہ سے پہلے ہی نشستوں کا انتظام ہوچکا تھا ٹھیک
۱۰ بجے امتحان زبان دانی کا آغاز کیا گیا۔ امتحان گاہ میں معتمد ادارہ
کے علاوہ مولوی نواز الدین صاحب، مولوی شیخ حسین صاحب،
مسٹر بھوانی پرشاد صاحب، مسٹر داد ہو راؤ صاحب موجود تھے۔

مدرسہ تحتانیہ نسواں میں طالبات کے امتحان کا انتظام تھا جس کی
نگرانکار صدر معلمہ صاحبہ تھیں۔ وقت سے ۵ منٹ پیشتر پرچہ جات
بذریعہ مولوی شیخ محمد نذیر صاحب معتمد ادارہ صدر معلمہ صاحبہ کی
خدمت میں روانہ کر دیئے گئے تھے۔ دوران امتحان میں مولوی
غلام رسول صاحب اول مددگار وسطانیہ پرلی امتحان گاہ میں
تشریف لائے اور تھوڑی دیر کے بعد واپس ہوئے نیز وقتاً
فوقتاً تشریف لاکر تھوڑی دیر نگرانی کرتے رہے۔

زبان دانی کا زبانی امتحان لیا گیا اور حسب نظام اوقات
اردو عالم کے پرچہ جات لئے گئے۔

ادارہ کے عام حالات:- دار المطالعہ مولوی قاضی لطف الدین
صاحب کے دیوان خانے میں ہے جس کو موصوف نے ادارہ کے لئے
وقف کر دیا ہے۔ مولوی فصیح الدین صاحب مدرس وسطانیہ۔
شرافت علی صاحب مدرس، مولوی عبدالقادر صاحب ادارہ
کے ارکین ہیں۔ دار المطالعہ میں کوئی اخبار نہیں آتا البتہ
سب رس آیا کرتا ہے۔ معتمد صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ
سعید الدین صاحب ایک نوجوان محنتی ادارہ کے خیر خواہ تھے مگر وہ
فکر معاش میں بیڑ چلے گئے ہیں جن کی روانگی کے باعث
ادارہ اب خاموش ہو گیا ہے۔

ادارہ کا کوئی مستقل سرمایہ نہیں ارکان ادارہ موقع و محل سے نہایت خوبی سے کاروبار ادارہ انجام دے رہے ہیں۔ ادارہ کی عمارت کے لئے چندہ کا آغاز کیا گیا ہے جس میں جناب محسن بن شبیر صاحب مرحوم تعلقدار مومن آباد کا خاص حصہ ہے۔

قیام و طعام کا انتظام مولوی شیخ محمد وزیر صاحب معتمد ادارہ شاخ لیری کے مکان پر تھا انتظام معقول رہا۔ ادارہ کی جانب سے شیخ محمد وزیر صاحب و دیگر ارکان کا شکریہ ادا کیا گیا۔

ناکلی ضلع اورنگ آباد

چہارشنبہ کے روز ۲۹ امرداد کو ساڑھے چار بجے دن کی ٹرین سے اورنگ آباد کی طرف روانہ ہوا پندرہ سولہ گھنٹوں کے طویل سفر کا خیال ہی طبیعت کو قبل از وقت تھکا دینے کے لئے کیا کم تھا۔ اس پر ہمراہان کو ذوق کی لا انتہا غیر دلچسپ گفتگو مستزاد تھی۔ جگہ ملی بھی تو ایسے ڈبے میں جو مارواڑ کے تاجروں اور صرافوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ہمنشیں نے گفتگو سیاست حاضرہ سے شروع کی تو خوش ہوا کہ سفر کی گھڑیاں لطف و آرام سے گزر جائیں گی اور تھکن کا احساس نہ ہونے پائے گا۔ لیکن چند منٹوں کے بعد گفتگو کا رخ بازار کے نرخ کی طرف پھر گیا اور گھنٹوں کے بعد بھی گفتگو بازار کے بھاؤ سے آگے نہ بڑھنے پائی۔ ان کو اصرار تھا کہ میں بھی کچھ کہوں۔ میں کہتا کیا جب سننا بھی میرے لئے بار تھا۔ بہرحال وہ رات آنکھوں میں کٹ گئی صبح نمودار ہوئی اور دھندلکا صاف ہوا تو اورنگ آباد کا اسٹیشن سامنے تھا۔

اسٹیشن سے باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ خلد آباد کو جانے والی بس ٹرین کے آنے سے ایک گھنٹہ قبل جا چکی ہے اب وہاں تک جانے کے لئے تانگے کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ رات کے سفر کی تھکن کے ساتھ پیش آنے والے سفر کا خیال ہمت شکن تھا، لیکن وقت پر ناکلی پہنچنا بھی ضروری تھا۔ بہ مجبوری تمام تانگے میں بیٹھا اور خلد آباد کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس سے سفر کی کلفت اور سرگرانی یک گونہ کم ہو گئی۔ خلد آباد میں مجھے لینے کے لئے شاخ ادارۂ ادبیات اردو ناکلی کے معتمد جناب وزیر خاں صاحب پہلے ہی سے آئے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچنے کے بعد ناکلی چلنے کی ٹھیری [illegible] وہاں معلوم ہوا کہ دلچسپ سفر تو اب شروع ہو رہا ہے [illegible] سے ناکلی جانے کے لئے گھوڑے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں کے بعد ہم ناکلی میں داخل ہوئے۔

خیال تھا کہ شاید ناکلی جاگیر [illegible] آبادی بھی کسی تعلقہ کے مستقر سے کم نہ ہوگی لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی مردم شماری پانسو سے زیادہ نہیں ہے اور صرف [illegible] مکانات مٹی اور کچے ہیں۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس مختصر سی آبادی میں ۲۰ امیدوار ادارہ کے مختلف امتحانات میں شریک تھے۔ اس کے علاوہ تین امیدواروں نے گزشتہ سال جامعہ نظامیہ کے امتحان منشی میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی تھی اور اس سال بھی اس امتحان کی تیاری میں بعض امیدوار مشغول ہیں۔ مجھے مولوی وزیر خاں صاحب نے بتایا کہ یہ ساری علمی سرگرمی وہاں کے صدر مدرس مولوی کریم خاں صاحب اور اورنگ آباد کے وکیل شاخ ادارہ ناکلی کے سرپرست مولوی شیخ لعل صاحب علی ایس سی ایل ایل بی عثمانیہ کی پرخلوص کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس وقت میری حیرت اور بڑھ گئی جب میں نے سنا کہ ایک خانگی مدرسہ بھی "مدرسہ سلطانیہ اسلامیہ" کے نام سے قائم ہے۔ وکیل صاحب کے پرخلوص ایثار اور سادگی اور طالب علمی کے ابتدائی دور سے لیکر اب تک جو مشقتیں برداشت کرکے انھوں نے مسلسل ترقی کی ہے اس کو سنکر بڑی حیرت ہوئی۔ علاوہ ازیں اورنگ آباد میں ایک خانگی اقامت خانے کے مصارف بھی مستقلاً ان کی ذاتی آمدنی سے پورے ہوتے ہیں۔ پھر نادار طلبا اور مفلوک الحال لوگوں کی مالی امداد الگ رہی۔ تین دن تک امتحانات ہوتے رہے۔ اس عرصے میں وہاں کے ختلم کوتوالی مولوی محمد جعفر صاحب کا مہمان رہا جن کی مہمان نوازی اور مخلصانہ گفتگو نے دل سے اجنبیت کا احساس مٹا دیا۔ ان کے علاوہ شیخ لعل صاحب، کریم خاں صاحب، وزیر خاں صاحب، قاضی تاج الدین صاحب اور وہاں کے تحصیلدار صاحب کے مخلصانہ سلوک کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ ان حضرات سے مختلف مباحث کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو کے متعلق بھی گفتگو رہی۔ مولوی کریم خاں صاحب نے ان تجاویز کا ذکر کیا جو انھوں نے ادارہ کے سامنے پیش کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادارہ کے امتحانات کو مقبول عام ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ حکومت ان کو مسلمہ قرار دے۔ یہ ایک ایسی مفید تجویز ہے جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خود ادارہ کے ارباب اقتدار کوشاں ہیں۔ ناکلی میں جن امیدواروں نے امتحانات میں شرکت کی ہے ان کی فہرست کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختصر سی آبادی کا اتنے امیدواروں کا شریک ہونا بجائے خود لائق تعریف ہے۔ مجھے "اردو دانی" کے نصاب امتحان کے موقع پر محسوس ہوا کہ لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں تعلیم میں [illegible] جس کے لئے صدر معلمہ صاحبہ مستحق مبارکباد ہیں۔ ان طالبات کے جوابات سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ امتحان اردو زباندانی کے لئے بڑی آسانی سے تیار کی جا سکتی ہیں۔ ۲ شہریور کو ناکلی سے رخصت ہوا۔ لیکن وہاں کے رہنے والوں کے خلوص اور سادگی کی یاد اب تک حافظے میں محفوظ ہے۔ یہ چیزیں قصبہ میں زیادہ نظر آتی ہیں۔

ادارے کی خبریں

روداد ... شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمقام ... بروز ... مورخہ بہشت ... مطابق یکم اپریل ... بوقت ... ساعت شام منعقد ہوا۔ اور حسب ذیل ... نے شرکت کی۔

... صاحبہ، محترمہ شبیر النساء بیگم، محترمہ جہاں آرا بیگم صاحبہ، محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ، محترمہ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ، محترمہ سعید النساء بیگم صاحبہ، محترمہ رفیعہ سلطانہ بیگم صاحبہ اور معتمد شعبہ۔

محترمہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے اس سے قبل محترمہ سلطانہ عزیز صاحبہ کا نام رکنیت شعبہ کے لئے پیش کیا تھا اس اجلاس میں انہیں نے آئیں موصوفہ کی کارکردگی کے سامنے معتمد نے شعبہ کی مجلس انتظامی کی رکنیت کے لئے ان کا نام پیش کیا جس کو جملہ ارکان نے بخوشی منظور کیا۔

دوسرے ارکان نے جو شریک اجلاس نہ ہو سکے تھے، معذرت کے خطوط روانہ کئے۔ اجلاس کا آغاز توثیق روئداد سابقہ کیا گیا اس کے بعد حسب ذیل امور پر غور ہوا۔

مدرسہ بالغات اڈیکیٹ کی سرکاری امداد سے دست برداری کا مسئلہ معتمد نے بتلایا کہ تنہا معتمد کا اختیاری نہیں ہو سکتا جیسا کہ سابقہ اجلاس میں طے پایا۔ اس لئے دوبارہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ معتمد نے اپنی رائے دیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ سردست امداد سے دست بردار نہ ہوں بلکہ اس رقم کو اس دوسرے مدرسہ کے نام منتقل کروادیں جس کے قیام کے بارے میں ارکان سے حسب ایجنڈا مشورہ لیا جانے والا ہے۔

مدرسہ کے لئے سلطانہ عزیز صاحبہ تصدق فاطمہ صاحبہ اور رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے ڈراما کرکے رقم فراہم کرنے کا وعدہ فرمایا۔ اور رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے چندہ کے ذریعہ بھی رقم جمع کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد حسب ذیل ایجنڈا پر غور کیا گیا۔

(۱) رپورٹ ذیلی مجالس (۲) قیام مدرسہ رکاب گنج اور سرپرستی شعبہ۔ (۳) گوشوارہ جمع و خرچ (۴) دیگر امور

(۱) ذیلی مجالس:- تصدق فاطمہ صاحبہ داعی بزم ادب نے معتمد کے خط کے وصول نہ ہونے کا اظہار کیا اور اسی باعث لطیف النساء بیگم صاحبہ سے بھی ملاقات نہ کر سکنے کی معذرت کی۔ رپورٹ وہ اس دفعہ پیش نہ کر سکیں کیونکہ امتحان کی وجہ بہت مصروف رہیں۔

رفیعہ سلطانہ صاحبہ داعی ادب نسواں نے آئندہ اجلاس پر اپنی روئداد پیش کرنے کا وعدہ کیا۔

سعیدہ ناظر صاحبہ داعی تعلیم و ترقی نسواں بوجہ ناسازئ مزاج شریک نہ ہو سکیں۔ محترمہ نصرت النساء بیگم صاحبہ کا ایک خط جو بذریعہ بشیر النساء بیگم صاحبہ معتمد کے نام وصول ہوا تھا پڑھ کر سنایا گیا جس میں موصوفہ نے ایک مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور ارباب شعبہ سے درخواست کی تھی کہ اس کی سرپرستی قبول کریں۔ سردست مدرسہ کے لئے محترمہ بیگم صاحبہ جمعدار عبدالجبار نے اپنی ڈیوڑھی دینے کا وعدہ کیا ہے۔

غور کرنے کے بعد ارکان نے طے کیا کہ سرپرستی قبول کرلی جائے لیکن مالی امداد سے معذوری کا اظہار کردیا جائے۔

معتمدہ نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر نصرت النساء بیگم نے مدرسہ کو بحسن و خوبی چلا لیا تو اس رقم سے جو بالغات اڈیکیٹ کو مل رہی ہے بجائے دست بردار ہونے کے اس مدرسہ کے نام منتقل کرنے کی کارروائی کی جائے۔ اس رائے سے جملہ ارکان نے اتفاق کیا۔ اس ضمن میں معتمد سے درخواست کی گئی کہ جلد از جلد نصرت النساء بیگم کو اطلاع دیں کہ شعبہ کی سرپرستی میں دوشنبہ ... کو مدرسہ کا افتتاح مقرر کریں۔

دیگر امور:-
رفیعہ سلطانہ صاحبہ کی تحریک پر کہ چندۂ رکنیت بجائے سالانہ کے

سہ ماہی کر دیا جائے پر غور کیا گیا اور طے پایا کہ چندۂ سالانہ کی
ادائی ارکان کی سہولت اور مرضی پر ہو کہ جس طرح چاہیں
ادا کریں۔ چندے کی کتاب میں نام درج کر دیئے جائیں گے
اور چندوں کی ادائی سہ ماہی، ششماہی یا سالانہ جس طرح
چاہیں ارکان کر سکیں گے۔

روئداد مجلس انتظامی اردو امتحانات

اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس یکشنبہ ۲ خورداد [illegible] مطابق [illegible] اپریل [illegible]ء صبح ساڑھے نو بجے نظام کالج میں منعقد ہوا۔
حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

(۱) مولوی سید علی اکبر صاحب پرنسپل نظام کالج۔ صدر
(۲) مولوی محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج نائب صدر۔
(۳) مولوی فضل حق صاحب پروفیسر انگریزی نظام کالج۔
(۴) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔
(۵) مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ریڈر تاریخ جامعۂ عثمانیہ۔
(۶) مولوی فخر الحسن صاحب لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج۔
(۷) مولوی میر محمد عالم صاحب مددگار ناظم تعلیمات۔
(۸) مسٹر شام سندر صدر انجمن پست اقوام۔
(۹) مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب مددگار ناظم پنشن و اسٹامپ۔
(۱۰) مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اردو سٹی کالج۔
(۱۱) مولوی خواجہ حمید الدین صاحب ایم اے مہتمم ادارہ۔

۱۔ گزشتہ اجلاس کی روئداد پڑھی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔
۲۔ اردو امتحانات کے مرکز بمبئی کی یہ تحریک پیش ہوئی
"زبان دانی کے اختیاری مضامین میں ترجمے کے لئے گجراتی زبان کو بھی جو بمبئی کی عام زبان ہے شامل کر لیا جائے۔"
طے پایا کہ اگر مرکز بمبئی سے اس امتحان میں بیشتر پاس سے
زیادہ تعداد میں ایسے امیدوار شریک ہوں جو بطور مضمون [illegible] گجراتی ترجمہ لیں تو اس کا پرچہ مرتب کیا جائے۔
۳۔ ممتحنین کے معاوضے کے سلسلہ میں پرچے مرتب کرنے اور پرچے کو جانچنے کے لئے [illegible] کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ اور طے پایا کہ امتحانات کی فیس چونکہ قلیل رکھی گئی ہے اس لئے موجودہ معاوضے میں تبدیلی مناسب نہیں ہے۔ البتہ سال حال بعد امیدواروں کی درخواستیں وصول ہو جانے پر اگر یہ معلوم ہو کہ ان کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے تو اس مجلس انتظامی کی ذیلی کمیٹی معاوضے کی شرح میں حسب ضرورت ترمیم کرے۔
۴۔ [illegible] کے پہلے امتحانات کے لئے ممتحنین کا تقرر عمل میں آیا۔

روئداد مجلس انتظامی

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس بتاریخ ۱۶ خورداد [illegible] م ۲۰ اپریل [illegible]ء شام کے ساڑھے چھے بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔
حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔
عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر
" نواب معین نواز جنگ بہادر
" مولوی سید علی اکبر صاحب
" مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب
" مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
" ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور
مولوی محمد یونس صاحب ناظم آرائش بلدہ کو بھی عمارت ادارہ کے مقام کے تصفیے کے سلسلہ میں جناب صدر نے اس اجلاس میں شرکت کے لئے مدعو فرمایا تھا۔ اور انھوں نے بھی شرکت فرمائی۔
گزشتہ اجلاس کی روئداد سنائی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔ حسب ذیل امور شریک ایجنڈا تھے۔
۱۔ عمارت ادارہ کے لئے مقام کا تعین۔
۲۔ مخزن علوم وفنون (اردو انسائیکلوپیڈیا) کے لئے

[illegible]

۳۔ عملۂ دفتر ادارہ کے مشاہروں میں اضافے [illegible] صاحب [illegible] تجاویز جن کی تفصیلات [illegible] ختم کی گئی تھیں۔

۴۔ [illegible] مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی خریدی [illegible] نسبت ذیلی کمیٹی کی سفارش۔

۵۔ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں نظام کالج میں عام معلوماتی تقاریر کا انتظام۔

۱۔ گزشتہ اجلاس کی روئداد کے سلسلہ میں معتمد ادارہ نے توجہ دلائی کہ شعبۂ نسواں کے لئے جو دستور العمل منظور کیا گیا تھا اس میں ایک مسئلہ غور طلب تھا جس کی طرف معتمد شعبۂ نسواں نے دستور کے آخر میں خاص طور پر ایک نوٹ کے ذریعے اشارہ کیا تھا۔ اس کو پڑھ کر سنایا گیا اور کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ دستور کے فقرہ جات ۳ و ۲ کی ترمیم کر کے دستور کی منظوری کی اطلاع شعبۂ نسواں کو دیجائے۔

قاعدہ ۳ ۔ فقرہ ۲۔ مجلس عاملہ کے عہدہ دار اور ارکان ایک سال کے لئے نامزد کئے جائیں گے اور ختم مدت پر دوبارہ نامزد ہو سکیں گے۔"

اس تصفیہ کی رو سے فقرۂ ۴ کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لئے اس کو حذف کر دیا جائے۔

۲۔ عمارت ادارہ کے لئے مقام کے تعین کے سلسلے میں عالیجناب صدر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ وہ اور مولوی محمد یونس صاحب نے بعد غور و خوض طے کیا ہے کہ صرف دو ہی مقامات ایسے ہیں جو ادارے کی عمارت کے لئے موزوں ہیں:

(۱) حسین ساگر کے کنارے وہ مقام جہاں اب محکمۂ اسکیات واقع ہے۔

(۲) بشیر باغ کے عقب کا وہ مقام جو حسین ساگر کے بند کے ختم پر واقع ہے۔

اس سلسلہ میں مولوی محمد یونس صاحب نے نقشہ دکھا کر مقامات کی وضاحت کی۔ کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ پہلا مقام ادارے کی عمارت کے لئے زیادہ موزوں ہے اور اس کے حصول کے لئے عالیجناب نواب صدر المہام بہادر سررشتۂ تعمیرات سے استدعا کی جائے۔

جناب صدر نے وعدہ فرمایا کہ اب چونکہ ایک مناسب مقام کا انتخاب مجلس انتظامی نے قطعی طور پر کر لیا ہے اس لئے نواب ظہیر یار جنگ بہادر صدر المہام متعلقہ اور عالیجناب صدر اعظم بہادر سے بہت جلد اس کے حصول کا تصفیہ کرا لیں گے نیز یہ کہ ادارے کی عمارت کا سنگ بنیاد حضرت والا شان نواب اعظم جاہ ولیعہد بہادر شہزادہ برار کے دست مبارک سے رکھایا جائے گا اور عمارت بننے کے بعد اس کا افتتاح کرنے کی اعلیٰ حضرت بندگان عالی سے استدعا کی جائے گی۔

۳۔ مخزن العلوم و فنون کے لئے سرکاری امداد کی جو اسکیم بنائی گئی ہے وہ ملتوی کر دی گئی اور طے پایا کہ آنریبل مولوی سید محمد اعظم صاحب کی موجودگی میں اس پر غور کیا جائے گا۔

۴۔ عملۂ دفتر ادارہ کے مشاہروں میں اضافے کا مسئلہ آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا گیا اس لئے کہ آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر آج کے اجلاس میں شریک نہیں تھے۔

۵۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے کتب خانے کی خریدی کی نسبت جو ذیلی کمیٹی بنائی گئی تھی اس نے چونکہ اپنی کوئی سفارش اب تک پیش نہیں کی ہے اس لئے سفارش آنے تک اس مسئلہ کو ملتوی کیا گیا۔

۶۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں عام معلوماتی تقاریر کا اسکیم مرتب کرنے کے لئے ایک ذیلی کمیٹی بنائی گئی جس میں مولوی سید علی اکبر صاحب۔ پروفیسر مجید صدیقی صاحب اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی شامل رہیں گے۔ اس مسئلہ کی نسبت مولوی سید علی اکبر صاحب نے تفصیل سے وضاحت فرمائی اور اس امر کا وعدہ فرمایا کہ ان مفید اور ضروری تقریروں کا انتظام وہ اپنی نگرانی میں نظام کالج کے ہال میں فرما دیں گے۔

روداد مجلس انتظامی۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس تاریخ ۲۴ خورداد [illegible] مطابق ۲۰ اپریل [illegible] شام کے چھ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر
" نواب معین نواز جنگ بہادر
" مولوی عبد المجید صدیقی صاحب
ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر اور مولوی سید علی اکبر صاحب نے بذریعہ ٹیلیفون شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

حسب ذیل امور شریک ایجنڈا تھے۔

۱۔ عملۂ ادارہ کے مشاہروں میں اضافے کے لیے محاسب صاحب ادارہ کی تجاویز۔
۲۔ کتب خانہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے خریدی کی نسبت ذیلی کمیٹی کی سفارش۔
۳۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں عام معلوماتی تقاریر کی اسکیم۔

(۱) عملۂ دفتر ادارہ کے مشاہروں میں اضافے کے لئے محاسب صاحب نے جو تخمینہ پیش کیا تھا۔ اس کو بعد ترمیم مناسب منظور کیا گیا۔

(۲) تعلیم بالغان کے سلسلے میں جن معلوماتی تقاریر کے انتظام کے لئے ایک سب کمیٹی مولوی سید علی اکبر صاحب۔ مولوی عبد المجید صدیقی صاحب اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی پر مشتمل بنائی گئی تھی اس نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۲ خورداد [illegible] میں جو اسکیم مرتب کی تھی اس کو پیش کیا گیا۔ طے پایا کہ اس کی نسبت آئندہ مجلس انتظامی میں غور کیا جائے۔

(۳) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے کتب خانے کی خریدی کے بارے میں سب کمیٹی نے ابھی کوئی قطعی رائے نہیں پیش کی ہے اس لئے کہ اس کتب خانے کا معائنہ نہیں ہو سکا لہٰذا طے پایا کہ آئندہ مجلس انتظامی تک کل رپورٹ تیار کی جائے۔

شاخ ہمناباد

بتاریخ ۱۹ خورداد [illegible] م ۲۴ اپریل [illegible] بصدارت مولوی سید اسمٰعیل صاحب بی اے ایل ایل بی تحصیلدار تعلقہ ہمناباد جلسۂ تقسیم اسناد و امتحانات اردو بابتہ [illegible] منعقد کیا گیا اور صاحب صدر نے اسناد تقسیم فرمائے۔ اس کے بعد سید اسمٰعیل صاحب وکیل و صدر شاخ ادارہ نے یہ تحریک پیش کی کہ معتمد شاخ مولوی سید شیر زماں صاحب اپنے تجارتی کاروبار کی وجہ سے عدیم الفرصت رہتے ہیں اس لئے دفتری کاروبار کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ عہدۂ معتمدی و صدارت میں اس طرح تبدیلی ہو تو مناسب ہے کہ صدر معتمد اور معتمد صدر ہو جائے اور ارکان میں بھی تبدیلی ہو تاکہ ادارہ کے کاروبار دفتری باضابطہ طور پر چل سکیں چنانچہ یہ تحریک بالاتفاق منظور ہوئی اور حسب ذیل عہدہ دار و ارکان کا انتخاب عمل میں آیا۔

(۱) مولوی سید شیر زماں صاحب سوداگر افغانی۔ صدر
(۲) سید اسمٰعیل صاحب وکیل۔ معتمد
(۳) پنڈت مرڈواڑپا صاحب " ۔ رکن
(۴) پنڈت بھیم راؤ صاحب " " "
(۵) مولوی محمد صدیق صاحب " " "
(۶) " محمد عبد الوحید صاحب " "
(۷) " نبی الحسن صاحب صدر مدرس رکن
(۸) " محمد عبد الغفور صاحب سوداگر "
(۹) " سید عبد الرحمٰن صاحب "
(۱۰) " حاجی محمد حسین صاحب سوداگر "

شاخ پرلی

۱۱ خورداد [illegible] مطابق یکم مئی [illegible] کو ادارۂ ادبیات اردو کے امیدوار فراہم کرنے کے لئے مولوی شیخ حسین صاحب نائب معتمد مولوی ابو الظفر محی الدین صدیقی سابق معتمد شعبہ طلبہ نیلی گاؤں روانہ ہوئے جہاں مولوی ہدایت علی صاحب پولیس پٹیل نے امیدوار فراہم کرنے میں بڑی امداد فرمائی جس کے ہم بہت ممنون ہیں۔ بڑی

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
[illegible] سکینہ ایم ایس سی

سب رس

جلد ۸ — بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۵ء — شمارہ ۱۰

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے عہد آفریں برقی پریس میں چھپ کر خیریت آباد سے شائع ہوا

یادگار تغیر ہے۔ اسی زمانے میں نثر پر زیادہ توجہ کی گئی۔ اردو میں تنقید کو پہلی بار متعارف کیا گیا۔ فرسودہ موضوعات کو اور مافوق الفطرت پہلوؤں اور پریوں کے قصے کہانیوں سے اردو ادب نے بیزاری کا اظہار کیا۔ ٹھوس علمی و معنوی مضامین کتابیں اور حقیقی ناول لکھے جانے لگے۔ نذیر احمد، شبلی، حالی، سرسید اور ان کے رفقائے کار کا اس دور کے ادب کی تعمیر میں بڑا حصہ رہا ہے۔ اردو ادب کا یہی تعمیری دور مہدی حسن کے مضامین کا زمانہ ہے۔ ان کو تاریخ، فلسفہ اور تنقید سے از حد دلچسپی تھی۔ ادب کے دلدادہ اور خصوصاً اردو ادب کے بڑے شائق تھے۔ ان کے مضامین اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ اردو ادب میں ٹھوس علمی مواد فراہم کرنے کے لئے اپنی جانب سے ہر ممکنہ کوشش کرنے تیار تھے۔ خود بھی فرصت کے اوقات میں لکھتے تھے اور دوسرے اچھے لکھنے والوں کو لکھنے پر اکساتے تھے۔

مہدی حسن کے مضامین کو بآسانی تین شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ایسے مضامین جو در اصل اپنے وقت کے رسالوں یا کتابوں پر تبصرے ہیں یا جن میں کسی وقتی ادبی تحریک پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے (۲) علامہ شبلی کی علمیت' ان کی تصانیف سے متعلق مضامین (۳) خالص علمی اور ادبی مضامین

مہدی حسن اپنے وقت کی ادبی تحریکات اور تصانیف سے بہت باخبر رہتے تھے۔ ملک کے متعدد ادبی رسالے ان کے زیر نگاہ ہوتے اور ان کی ادبی بحثوں میں یہ بڑے شوق سے حصہ لیتے۔ "تمدن عرب" پر کسی نے سخت تنقید کی تھی اور اس کے مصنف پر چند الزامات عائد کئے تھے اس کے جواب میں ایک مضمون "تمدن عرب پر ایک علمی چٹھی" کے عنوان سے لکھا جس میں تفصیل سے کتاب کی خوبیاں گنائیں اور کتاب کے نفس مضمون اور ترجمے کے اسلوب دونوں پر وسعت نظر سے بے لاگ رائے دی۔ یہ مضمون تمدن عرب کا ایک مجمل تبصرہ کہلایا جاسکتا ہے۔ اسی قبیل کے دوسرے مضامین میں "ایک خط" "البیان" "ادارۂ ادبیہ" "نظام الملک طوسی" وغیرہ شامل ہیں۔

مولوی اسلم جے راجپوری نے "شعر العجم" پر چند اعتراضات کئے تھے اس کے جواب میں "شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جس میں نمبر وار ہر اعتراض لکھ کر اس کا تشفی بخش جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

ان مضامین میں مہدی حسن نے اردو زبان اور ادب کی مقبولیت اور وسعت کے لئے جگہ جگہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت اردو صحافت کی ترقی پر بار بار زور دیا ہے۔ "البیان" اور "معارف" کی حمایت میں مضامین لکھے اور اردو داں پبلک سے بااصرار درخواست کی کہ یہ اور اس طرح کے علمی و ادبی رسالوں کی حمایت ان کے اہم فرائض میں داخل ہے۔

شبلی اور ان کی تصانیف سے مہدی حسن کو دلچسپی نہیں عشق تھا۔ منجملہ تیس مضامین کے کوئی دس کے قریب مضامین شبلی اور ان کی تصانیف پر لکھے گئے ہیں۔ علاوہ بریں دوسرے مضامین میں جہاں جہاں موقع آیا ان کے قلم نے شبلی کی مدح سرائی میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ دراصل مہدی حسن کو تاریخ اور خصوصاً فلسفۂ تاریخ اور تاریخ اسلام سے از حد دلچسپی تھی۔ شبلی ہی وہ شخص تھے جنھوں نے اردو میں پہلی بار ان موضوعات پر تحقیق و تدقیق سے قلم اٹھایا اور بیش بہا کتابیں...... پیش کیں مہدی حسن کی شبلی پرستی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اردو میں خالص علمی لٹریچر دیکھنا چاہتے تھے۔ ملک کے پست مذاق طبقے سے تو کوئی امید تھی البتہ جو اس کے اہل ہیں ان سے طالب تھے کہ وہ کچھ لکھیں۔ ہم عصر مصنفین میں سرسید، حالی اور شبلی ہی وہ حضرات تھے جو خلوص اور محنت سے اردو میں علمی مواد فراہم کر رہے تھے۔ شبلی کی شعر العجم" اور "موازنۂ انیس و دبیر" جیسی تنقیدی کتابیں اردو کے لئے بالکل نئی تھیں

[illegible] زبان کے بڑے شائق تھے۔ ان وجوہ کے علاوہ شبلی کو چاہنے کی ایک اور وجہ ان کے ذاتی خوشگوار [illegible]۔ دونوں ایک دوسرے سے بہ کمال مروت پیش آتے اور ہمیشہ خلوص و محبت کا اظہار کرتے۔

"[illegible] عرب اور پروفیسر شبلی" "علامہ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ" "آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ" "[illegible] ایک فلسفیانہ نظر" "شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی" وغیرہ ان کے چند دلچسپ مضامین ہیں جن میں [illegible] شبلی کی تحریر اور ان کی زندگی پر بہ حیثیت عالم، مورخ، محقق، سوانح نگار اور نقاد روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مہدی حسن کی شبلی سے والہانہ دلچسپی اور محبت کی وجہ سے شبلی اور ان کی تصانیف سے متعلق بے لاگ تنقید کی امید رکھنا درست نہیں۔ گو پھر بھی جو کچھ انھوں نے لکھا ہے دلچسپ اور دلکش لکھا ہے کہیں کہیں دلائل و براہین سے تبصرے کا رنگ بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

شبلی کی جو بھی کتاب چھپ جاتی یہ اس پر مضمون لکھتے۔ جہاں کسی نے شبلی پر اعتراض کیا یہ اس کا منہ توڑ جواب دینے تیار ہو جاتے۔ گو مہدی حسن نے اکثر جگہ "شبلی پرستی" کی دھن میں تقریظ و تنقید کے جادۂ اعتدال سے انحراف کیا لیکن اپنے ایک مضمون "حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک" میں تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے انتہائی سلامت روی کا ثبوت دیا۔ یہی نہیں بلکہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ انتہائی فیاضی سے شبلی کی بعض فروگزاشتوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط خودداری بھی معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں ہے۔ شبلی نے "الکلام" لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے دور جدید میں مذہب کو معقولات عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی۔"

مہدی حسن کے مضامین کا اہم ترین حصہ ان کے علمی و ادبی مضامین ہیں۔ ان مضامین میں زیادہ تر ادبی موضوع یا معاشری اور تاریخی مباحث پر قلم اٹھایا ہے۔ "حکمائے یونان پر ایک سرسری نظر" مختصر مگر دلچسپ ہے۔ "بیسویں صدی کا آغاز اور دماغی صحت غیر فانیوں سے" اور "ترکوں کی معاشرت" معلومات آفریں مضامین ہیں۔ مہدی حسن شبلی کی مکمل تقلید کرنا چاہتے تھے۔ گو خود کو کبھی تحقیقی مضامین لکھنے کا موقع نہ ملا لیکن رجحان ادھر ہی تھا۔ فلسفہ تاریخ اور تاریخ اسلام کے متعلق جو کچھ بھی جانتے تھے اکثر اس کا اظہار اپنی تحریروں میں کرتے رہتے تھے۔ جرمن مستشرق وان کریمر کی "تاریخ اسلام" کا اردو میں ترجمہ شروع کیا تھا جس کے کچھ اجزا "مخزن" میں "افادات وان کریمر" کے نام سے شائع کئے تھے لیکن عدیم الفرصتی کی بناء پر اس کی تکمیل سے بھی قاصر رہے۔

مرحوم کو ادب اور تنقید سے غایت دلچسپی تھی۔ اردو میں تنقید عالیہ پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن انھیں اس کا بھی احساس تھا کہ اردو میں اعلیٰ پایہ کی تصانیف کی بہت کمی ہے۔ "ارتقائے ادب اردو" "اردو لٹریچر کا نفس واپسیں" "مشرق اور انشاء پردازی کا دور جدید" ان کے اعلیٰ ادبی مذاق اور شستہ خیالات کے گواہ ہیں۔ ادب پر ان کی نگاہ بڑی اونچی تھی۔ ملک میں سستے لٹریچر کے شائع ہونے کے بہت شاکی تھے۔ ایک مضمون میں رقم طراز ہیں "ہمارے ہاں دو چار معزز مستثنیات کے سوا عموماً اہل قلم صحیح قوت فیصلہ نہیں رکھتے یعنی اپنی استعداد کا صحیح مصرف نہیں جانتے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی پیداوار دماغی بلحاظ اوصاف و مقدار عموماً دوم درجہ کی ہوتی ہے"۔۔۔۔ یہ مستقل مصنفین کی حالت ہے صحافت یعنی مضمون نگاری اس سے بھی گزری ہے۔ غیر ذمہ دار لٹریچر کی ایک مقدار کثیر ہے جو جرائد عصریہ کے ہاتھوں ملک میں تقسیم ہوتی رہتی ہے۔

اور چونکہ لکھنے والے کسی موضوع پر تیار نہیں ہوتے یعنی قلم اٹھانے سے پہلے پڑھتے نہیں ہیں اس لئے ان کے خیالات و مقالات کا زیادہ تر حصہ سطحی ہوتا ہے۔ نتیجہ معلوم کہ جس پرچے کو دیکھئے عذر بے قدری ہوتا ہے۔"

"اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ" والے مضمون میں سرسید، آزاد، شبلی، حالی اور نذیر احمد کے کارناموں پر صحیح اصول تنقید سے روشنی ڈالنے کا ملک کے اہلِ قلم حضرات سے مطالبہ کیا ہے تاکہ اردو میں جو کچھ قیمتی لٹریچر ملتا ہے اس پر تنقید عالیہ کا حق ادا ہو جائے۔

مہدی حسن جب کسی بات کو کہنا چاہتے تو انتہائی بے باکی اور بغیر کسی جھجک کے کہتے۔ یہ ان کی طبیعت کا خاص پہلو تھا گو اس کی وجہ سے انھیں مخالفتیں بھی مول لینی پڑیں۔ نذیر احمد سے انھیں شکایت تھی کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق کام نہیں کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ نذیر احمد کی وسیع علمیت اور قابلیت کا غلط استعمال ہے جو لکچروں کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ نذیر احمد کو انھوں نے اپنے ایک مضمون "نذیر احمد اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے ذریعے بہ کمال اصرار ایک قاموس الاسلام لکھنے کی طرف متوجہ کیا تھا۔ انجمن ترقی اردو سے اس شکایت کی بناء پر کہ وہ کوئی ٹھوس علمی کام کو انجام نہیں دے رہی ہے اسے کھلے الفاظ میں اپنے فرض کی کوتاہی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ "انجمن ترقی اردو سے چنداں امید نہیں، لائق سکریٹری ہر سال چند بے غایت رسائل کو فرضِ کفایہ سمجھتے ہیں لیکن اس قسم کی بے اصولی اور خود رو اشاعت سے زبان کی ترقی نہیں ہوتی نہیں نہیں جانتا کہ اس وقت تک کوئی لائق ذکر کام کیا گیا۔" خود مولوی عبدالحق سے وہ اس بات کے شاکی تھے کہ وہ بجائے اپنی قابلیت کو کسی مستقل تصنیف کے لئے استعمال کرنے کے مقدمات لکھنے پر ٹال دیتے ہیں۔

مہدی حسن کے بالخصوص دو مضامین "اردو لٹریچر کا نفس واپسیں" اور "ارتقائے ادب اردو" آج بھی پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہیں، جن میں انھوں نے اردو زبان کی ترقی اور وسعت کے مسئلہ پر پروفیسر براؤن کی رائے کے ساتھ تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہمیشہ ادب کے تعمیری پہلو پر رہا اور وہ سب سے پہلے زبان کی بنیادوں کو مستحکم کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ جس کے لئے انھوں نے تجویز پیش کی تھی کہ اردو زبان کی ایک جامع لغت، ایک مجموعہ محاورات و اصطلاحات اور قاموس کے بغیر اردو کی وسعت و ترقی کے لئے کوشش کرنا بے سود ہے۔ مہدی حسن اپنے زمانے کے ادبی رجحانات سے گہرے متاثر تھے۔ "ادب لطیف" کی جو ہوا پہلے پہل اس زمانے میں چلی تھی یہ بھی اس میں مبتلا تھے۔ ادب لطیف کو دراصل مغربی ادبیات سے لیا گیا تھا اور ٹیگور کی گیتانجلی کی اشاعت سے اسے آگے چل کر اور تقویت پہنچی تھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اچھے لکھنے والے عنقا تھے اور ادب لطیف آج کل کے سستے افسانوں کی طرح ابتذالِ ادب کی صورت ہو کر رہ گیا تھا۔ مہدی حسن نے بھی "بنتِ عم" اور "فلسفۂ حسن و عشق" وغیرہ میں اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کے اسلوب کی شگفتگی اور تحریر کی رنگینی کے سوا اس میں کوئی نئی اور دلچسپ بات نہیں ملتی بلکہ بعض جگہ تو ان کی رومان پسندی عریانیت کی سرحدوں سے ملتی نظر آتی ہے۔

"افاداتِ مہدی" میں ادب کے طالب علم کو ایک حد تک یوں دلچسپی ہو سکتی ہے کہ ابتدائے بیسویں صدی کے ادبی رجحانات اور موضوعات کے چند مرقعے اس میں موجود ہیں جس سے اس زمانے کے اردو کی بعض دلچسپ تحریکات اور مباحث سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ مگر ایک عام قاری کو شائد ان مضامین میں موضوع اور خیالات

کے اعتبار سے کوئی وجہ جواز نظر نہ آئے۔ بعض مضمون تشنہ ملیں گے بعض خیالات پرانے ہونے کی وجہ سے غیر دلچسپ معلوم ہوں گے۔ بعض ادبی بحثیں بے وقت کی راگنی معلوم ہوں گی اور بعض تاریخی اور تنقیدی مضامین وقت گزر جانے اور علم و ادب میں ترقی ہونے کی وجہ سے پھیکے نظر آئیں گے۔ لیکن جو چیز ان سب کی تلافی کرنے والی ہے وہ ہے مہدی حسن کا اسلوب بیان۔ ان کے اسلوب کو ابھی اور پختہ ہونا چاہئے تھا۔ بعض مقامات پر نامانوس الفاظ اور ترکیبیں بھی مل جاتی ہیں کہیں کہیں جملوں کی بناوٹ عجیب سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن طرز ادا کی انفرادیت کہیں بھی کم ہونے نہیں پاتی۔ مہدی حسن بلاشبہ ایک انفرادی طرز کے انشا پرداز تھے۔ ان کی طبیعت کا رکھ رکھاؤ اور نفاست پسندی ان کی تحریر میں جذب ہو گئی تھی۔ الفاظ بڑے سلیقے سے استعمال کرتے محاورے بڑے قرینے سے جڑتے چلے جاتے۔ عبارت کی خاص خصوصیت اس کا اتار چڑھاؤ ہے۔ کہیں لہجہ وقت کے لحاظ سے سنجیدہ کبھی گرم و تیز اور کبھی نرم ہو جاتا تھا۔ اسلم جیراجپوری اور احسن مارہروی پر تنقید کرتے وقت جو لہجہ ہے اس کی تندی "بحثِ عم" میں باقی نہیں رہتی۔ ان کی تنقیدوں میں اکثر طنز کا چبھتا ہوا پہلو مضمر ہوتا۔ یہ طنزیہ انداز ان کی خاص خصوصیت ہے۔ اسلم کے متعلق لکھتے ہوئے کہتے ہیں:۔ "میرا خیال ہے کہ ملک میں ایسے نفوسِ قدسی صدیوں میں پیدا ہوں گے جو منصفانہ تنقید اور تنقیص بے جا یعنی عیب گیری کی حد فاصل کا احساس کر سکیں اس لئے بے محل جنبشِ لب سے خاموشی اچھی۔ یہ خیر سے گونگے ہوں تو اعتراض کی بات نہیں۔ لیکن بولنے اور آدمی کی طرح نہ بولئے تو مجھے شکایت ہوگی۔ حسن خلوص اور سچ کا کیا ٹھکانا ہے کہ شعر العجم کے جزئی عیوب بھی ریویو نگار کے خیال میں اتنے ہیں کہ اگر وہ ابھار کر دکھلائے جائیں تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے"! طنز کا یہی پہلو مولوی عبدالحق کے متعلق لکھتے ہیں تو اور زیادہ ابھر جاتا ہے "مذاق صحیح ہو تو یہ کام یورپ کے سہارے کرنے کے ہیں۔ مجھے اتنا موقع نہیں۔ دوسروں کو "کلام غالب" پر دیباچہ لکھنے لکھانے سے فرصت نہیں ایک صاحب "نقاد" سے متقاضی ہیں کہ دیباچہ لکھواؤ۔ یہ دیباچہ کیا بلا ہے؟ آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔ اگر مقدمہ سے غرض ہے تو سیدھے عبدالحق کے پاس حیدر آباد جائیے۔ تنقید و تبصرہ منظور ہے تو مجھے مجبوراً کہنا پڑتا ہے اس کا دور ختم ہو چکا۔"

شبلی ان کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "نذیر احمد اور آزاد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کر لیا ہے"۔ یہ رائے بالکل درست لیکن نذیر احمد اور آزاد کا رنگ ایک جگہ جما نہیں۔ مہدی حسن علمی و تاریخی مضامین لکھتے تو نذیر احمد کا اسلوب آزاد کے طرز پر حاوی ہوتا نظر آتا۔ ان کے ادب لطیف کے ٹکڑوں میں آزاد کا رنگ بالکل کھلا ہوا ملتا ہے۔ الفاظ کی دروبست اور محاوروں کا شوق بالکل وہی عبارت کی ترکیب، رنگینی، روانی، البیلا پن اور شگفتگی بالکل آزاد کی سی تھی۔ مگر تکلفات کا وہ عالم نہ تھا۔ طرز بیان ہمیشہ ہلکا پھلکا رہتا۔

ایک جگہ عبارت کی روانی اور بے ساختگی دیکھئے "یہ حالت جس قدر مایوس کن ہے اس سے زیادہ لائق افسوس ہے۔ مگر ایک مشہور انشاپرداز کا خیال سن رکھئے کہ جس طرح ہر شعلۂ محبت مصیبت کا گھر ہے۔ مشغلۂ سخن سب سے بڑھ کر ہے۔ حسن کلام کے پیچھے نہ دیکھئے۔ سارے اہل قلم بری طرح جئے اور عمر بھر روٹیوں ہی کے محتاج رہے۔"

زور بیان کی کتنی اچھی مثال ہے:۔ "بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامۂ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہے جس سے کچھ دنوں کے لئے اخباری افق کی فضائے بسیط ایک دم سے تیرہ و تار ہو گئی۔ کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا؟

ہرگز نہیں۔ صرف حاسدین کی کم نظری تھی؛ دلوں کی جمی ہوئی سیاسی لغزش قلم سے ٹپکی اور بری طرح ٹپکی"۔

اجمال اور اختصار ان کی تحریر کی خاص خصوصیت ہے۔ لیکن اس اجمال نے کہیں بھی ان کے اسلوب کی اثر انگیزی کو دھیما نہیں کیا بلکہ اکثر جگہ اثر اجمال کے سہارے بڑھتا گیا ہے۔ ایک جگہ کس خوبی سے لکھتے ہیں:۔ "سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔

لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں" ذیل کا اقتباس مہدی مرحوم کی انشائے لطیف کا بے مثال نمونہ ہے۔ یہ خاص انہی کا رنگ تھا جو انہی کے ساتھ ختم ہوگیا:۔

"مہرالنساء کا وہ واقعہ کس قدر دلچسپ ہے جب اس نے باغ کی ایک روش پر جہانگیر کے ہاتھ سے کبوتر لے کر چھوڑ دئے تھے۔ پروفیسر آزاد نے جس خوبصورتی سے اس کو دکھایا ہے انشا پردازی کو آج تک اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے۔ آپ وہ سماں دکھائیے جب مہرالنساء جوان بیوہ کی حیثیت سے شاہی محل میں رہنے سہنے لگی ہے۔ لیکن ہائے وہ حسنِ افسردہ جو اپنی تونوں سے واقف ہو۔ خوب جانتی تھی بجلی کدھر گرے گی"

جی چاہتا ہے کہ ان کے لطیف انداز تحریر کی اور بھی مثالیں پیش کروں لیکن طوالت کا خوف دامن گیر ہے۔ مہدی افادی اگر کسی وجہ سے یاد رکھے جانے کے قابل ہیں تو وہ ان کا طرز بیان ہے۔ اگر ان کی عمر وفا کرتی تو وہ اردو کے بے مثل انشا پرداز ہوتے۔ ان کی تحریر کے رکھ رکھاؤ، گھلاوٹ، سج دھج، بانکپن اور اثر انگیزی پر ان کا جاندار اظہارِ ادا مستزاد تھا۔ افسوس کہ اردو کا ایک نوخیز صاحب طرز جو یقیناً اس کے مستقبل کو سنوارنے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوتا یوں بے وقت دنیا سے اٹھ گیا۔

محمد احسان اللہ

افکارات

دل مرا خوگرِ حرماں ہے تمہیں کیا معلوم ہر نفس شعلہ بداماں ہے تمہیں کیا معلوم

زندگی موت کا عنواں ہے تمہیں کیا معلوم رنج و غم سلسلہ جنباں ہے تمہیں کیا معلوم

حسن اک عالمِ طوفاں ہے تمہیں کیا معلوم عشق اک وادیٔ پیچاں ہے تمہیں کیا معلوم

سوزِ الفت کی تپش، دردِ جدائی کی خلش دل کے داغوں سے نمایاں ہے تمہیں کیا معلوم

اشک آلود نگاہوں کا فسانہ توبہ! حسرت و یاس کا عنواں ہے تمہیں کیا معلوم

میری مجبور نگاہوں میں محبت کی جھلک غمِ کونین کا ساماں ہے تمہیں کیا معلوم

دردِ الفت کی قسم، آج تمنائے عظیم موت سے دست و گریباں ہے تمہیں کیا معلوم

عظیم (حیدرآبادی)

حامد نگر (دہلی)

انگریزی زبان میں ڈرامے کی ابتدا

انگریزی زبان میں ڈرامے کی ابتداء یوں بھی دلچسپ اس وجہ سے ہو جاتی ہے کہ دیگر زبانوں میں اور انگریزی زبان میں ڈرامے کی ابتداء حسن اتفاق کہئے یا کسی اور وجہ سے مذہبی روایات کی رہین منت ہے۔ اس لئے ربط مضمون کی خاطر بطور تمہید ان دیگر زبانوں میں ڈرامے کی ابتداء کے حالات کا مختصراً ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ جس سے تکمیل مضمون کے ساتھ موضوع بحث کے دیگر پہلو پر بھی روشنی پڑ سکے۔

ہندوستان میں ڈرامے کی ابتداء تقریباً اس وقت سے ہوتی ہے جب سے کہ شاعری کا رواج ہوا ہے۔ سنسکرت میں لفظ (ناٹک) ناٹ سے نکلا ہے جس کے معنی ناچ کے ہیں اور لفظ (روپک) بھی جس کے معنی بھیس بدلنے کے ہیں سنسکرت کی ناٹک کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ جہاں تک ادبی تحقیق کا تعلق ہے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں (ناٹک) کی بنیاد مذہب کے ساتھ پڑی ہے۔ اس سے متعلق ایک مشہور روایت ہے کہ بہت سے دیوتاؤں نے ہم خیال ہو کر دیوتائے علم برہما کے پاس ایک عرضداشت گزرانی جس میں یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ ان کی دل بہلائی کے لئے کوئی موزوں سامان مہیا کیا جائے۔ برہما نے ان کی درخواست منظور کی اور ان کے لئے ناٹ وید ایجاد کی جس میں مکالمہ رگ وید سے حاصل کیا۔ نقالی یجر وید سے اگانا سام وید سے اور ناچنا اتھروید سے۔ وشوا کرما کو فوراً حکم ملا کہ وہ ایک رنگ شالہ یا اسٹیج تیار کرے۔ یہ رنگ شالہ اندر بھون میں تعمیر کیا گیا اور تیوہار اندر دھوج کے موقع پر رنگ شالہ میں پہلا ناٹک جو کھیلا گیا وہ امرت منتھن تھا۔ اس ضمن میں ایک اور روایت بھی ہے کہ سب سے پہلا رنگ شالہ جس نے بنوایا وہ راجا رتیش ہے۔ جس نے اداکاری گندھرپ اور اپسراؤں کے سپرد کی۔ الغرض اس قسم کی قدیم روایتوں سے یہ تو ضرور پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ڈرامے کا رواج بہت قدیم سے ہے اور ابتداً یہ چیز پوجا پاٹ کے موقع پر ناٹک کے نام سے پیش ہوتی تھی جس میں دیویوں، دیوتاؤں، رشیوں اور منیوں کی زندگی کے حالات پیش کئے جاتے تھے۔ اور بعد کو راجا، مہاراجا خود اس قسم کے ناٹکوں میں بحیثیت ہیرو کے حصہ لینے لگے تھے۔

مصر کی مشہور کتاب "Book of Dead" بھی غالباً سوائے مذہبی ڈرامے کے کچھ اور نہیں ہو سکتی جس میں (Dead) اہم اداکار اور دیگر اداکار دیوتا ہیں۔ مگر یہودیوں کے پاس ڈرامے کو کوئی فنی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم ان کی عبادات کے طریقوں کی چھان بین سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ڈرامائی عناصر ان کی عبادات میں کسی نہ کسی صورت میں شامل تھے۔

یونانیوں کے پاس اداکاری کا رجحان دیگر اقوام کے مقابلہ میں زیادہ پایا جاتا تھا اور یونانیوں کے حسن کارانہ ذوق کا ذکر ہی کیا ہے جب کہ جدید ڈرامے کے المیہ (Trugedy) حصہ کی بنیاد قدیم (Greek Tragedy) پر رکھی گئی ہے۔ ان کے ہاں بھی عبادات کے طریق اور ڈرامائی مظاہروں میں بہت قریب کا تعلق ہے۔ یونانیوں کے مشہور دیوتا (Dionysius) کی پرستش کے موقع پر ساری رسومات کی ادائیگی میں یہ بات ملحوظ رکھی جاتی تھی کہ رسوم ڈرامائی شکل میں پیش کئے جائیں۔ ان کا یہ دیوتا (معابد) چونکہ (Athens) میں واقع تھا اس لئے زائرین کا ایک ہجوم رہا کرتا تھا۔ ایسے موقع پر یونانی

ڈراموں کو منظوم پیرایہ میں پیش کیا جاتا تھا ۔ ان ڈراموں میں قومی ویر اور بہادروں کے مشہور کارنامے اور ان کی زندگی کے حالات اس انداز میں پیش کئے جاتے تھے تاکہ ناظرین کے قلوب میں جہاتی جذبات پیدا ہو جائیں۔ لیکن بعد کو ان ڈراموں میں سیاسی اور قومی مسائل بھی شریک کئے جانے لگے ۔ تاہم اس بات کا خیال ضرور رکھا جاتا تھا کہ ڈراما نویس ڈرامے کی تیاری میں اور اداکار اداکاری کے موقع پر عبادتی تقدس کو رخصت نہ ہونے دیں۔

یونانی ڈرامے کا ذیلی مقصد اصلاح اخلاق، ذوق تعلیم اور سیاسی شعور کا پیدا کرنا بھی ہوا کرتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ یونانی ڈراما مذہبی تعلیمات اور تلقین کا دوسرا نام تھا۔ بدیں وجہ یونانی ڈرامے کی ابتدا کو مقابلتہً شروع ہی سے اعلیٰ حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستانی اور یونانی ڈرامے کے متعلق جو کچھ پیش کیا گیا ہے عام حیثیت سے اس کا اطلاق راست اور بے کم وکاست جدید فن ڈراما پر ہوتا ہے، اس طرح انگریزی ڈرامے پر بھی

جب عیسائیت کا آفتاب یورپ پر طلوع ہوا اور گیلیلو (Galileo) کے اصول تعلیمات نے لوگوں کے ذہنوں میں مکمل انقلاب بپا کر دیا اور فاتح روم کمزور اور نحیف (Judee) کے قدموں پر سرنگوں تھا تو نئے خدا کی پرستش کرنے والوں نے پہلے پہل ڈرامائی اور رومانی میلانات کو نفرت سے دیکھنا شروع کیا۔ بہ الفاظ دیگر رومانی اسٹیج میں بجائے المیہ اور ڈرامائی رجحانات کے (Athletic) مناظرے اور مجادلے (Gladiatorriot) کے میلانات زیادہ کارفرما ہونے لگے ۔ رومانی ڈراما باوجود یونانی ڈرامے کی پیداوار ہونے کے اپنے اندر وہ اخلاق اور تقدس نہیں رکھتا تھا اور یونانی ڈراما جو انتہائی مذہبی اور مقدس فرائض کی بنیادوں پر قائم تھا رومیوں کے ہاتھوں میں صرف کھیل اور تماشا بن کر رہ گیا۔

رومی چونکہ یونانیوں کی طرح اعلیٰ مذاق اور حسن کارانہ جذبات سے لگاؤ نہ رکھتے تھے اس نے وہ ڈرامائی فن کو بالکل پست اور مبتذل انداز میں پیش کرکے تفریح طبع کا سامان مہیا کر لینا کافی سمجھتے تھے ۔ دورِ اول کے نصرانی جو آنے والی دنیا کے لئے ایک سرچشمۂ مسرت وشادمانی محفوظ کرنا چاہتے تھے رومی (Amphe -Theatre) کے بھیانک اور دل ہلا دینے والے مناظر دیکھ نہ سکے جن میں انسان خونخوار جانوروں کی بھینٹ چڑھا دیے جاتے تھے اور وہ چونکہ ایک سادہ اور تصنع سے معرا زندگی کے متلاشی تھے اس قسم کے حالات کے خلاف ایک زبردست تنفر اور ردعمل اپنے اندر محسوس کرنے لگے اور بالآخر شاہ (Constantine) کے دور میں ان کے سدباب کے لئے امتناعی احکام جاری کئے گئے۔

بہرحال مسیحیت نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ عوام کے قلب ودماغ پر رومی کھیل تماشوں کا کس قدر گہرا اثر مترتب ہے اور اس کے خلاف مسیحیت کو کس قدر اہم اور مشکل جنگ کرنی ہے علاوہ ازیں عیسائیت نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ عبادات کے غیر دلچسپ طریق اور خشک پند ونصائح عوام پر بہ مشکل اثر انداز ہو سکتے ہیں جب کہ عوام کی آنکھیں رومی تفریحات اور تفریح گاہوں کے دلپذیر مناظر سے لطف اندوز رہ چکی ہوں ۔ ایسی صورت میں اور ان حالات کے تحت مسیحیت کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنی تلقین وتعلیم کو ایسے جاذب پیرائے اور دلپذیر اسلوب میں عوام کے سامنے پیش کرے کہ وہ قدیم عقیدہ سے متنفر نہ سہی کم از کم بیزار ہو کر جدید عقیدے کو اپنے دل میں جگہ دیں۔

مسیحیت کو اپنے ابتدائی نقوش گہرے طور پر ترسیم کرنے کے لئے عبادات کے طریق میں ڈرامائی عنصر کو

شریک کرنا پڑا اس طرح سب سے پہلے (Communion) کو عوام کے سامنے پیش کیا گیا - جس میں مسیح کی موت اور مصائب کے حالات کو نہایت ہی والہانہ اور درد انگیز انداز میں بتلایا گیا تھا - غیر مسیحی دنیا میں یونانی ڈراما کی مرکزیت انسانی خدا (Dionysus) پر ختم ہوتی تھی اور دورِ مسیحیت میں ڈراما کی مرکزیت خدائی انسان (Christ) پر موقوف تھی مگر (Dr. Hase) اپنی کتاب (Miracle plays) میں یہ لکھا ہے کہ "دورِ مسیحیت کے تمدن میں عوام کے لئے وہ کشش و جاذبیت نہ تھی جو غیر مسیحی زمانے میں یونانی تمدن نے پیش کی تھی - چنانچہ سولھویں صدی عیسوی میں عیسائیت کے پیرو مسیح کو اگرچہ یونانی خداؤں اور دیوتاؤں پر تفوق حاصل تھا لیکن مسیحی تمدن کو وہ کشش اور اثر نصیب نہ ہوا جو یونانی تمدن کی میراث تھی - چوتھی صدی عیسوی میں متذکرہ حالات کے تحت "The passion of Christ" المیہ پیش کیا گیا - ہم یہ یقین سے نہیں کہتے کہ ڈراما نویس کا مقصد آیا کوئی ادبی معیار کا ارتقا مقصود تھا یا مسیح کی آمد کا پیام دینا تھا - بہرصورت اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس المیہ کا پیشتر حصہ (Euripides) سے ماخوذ ہے - ازاں بعد سولھویں صدی عیسوی میں ڈرامے کی طربیہ نگاری کی ابتدا یوں ہوئی ہے کہ (Hroswitha) نامی ایک مسیحی جوگن نے (Gander) (Their Terence) کی اتباع میں چھ طربیہ ڈرامے پیش کئے جو صرف مسیحی معبد کی چار دیواری تک محدود اور جو خاص طور سے مسیحی جوگن کی دل بہلائی کے لئے تصنیف کئے گئے تھے اور آج کے جدید ترقی یافتہ فن ڈراما کی ابتدا ان متذکرہ قدیم المیہ و طربیہ ڈراموں سے ماخوذ ہے - علاوہ عباداتی طریق میں ڈرامائی عنصر کو شریک کرنے کے ایک اور کوشش جو کی گئی وہ یہ تھی کہ مذہبی تقاریب مثلاً (Easter - good Friday) ڈرامائی شکل میں منائے جانے لگے اور بتدریج ان ڈراموں میں علاوہ مقدس انجیل کے مسیحیت کے تاریخی اجزا کا بھی کافی حصہ شریک کیا گیا - جب اس ڈرامائی ادب نے مسیحیت کو پوری طرح اپنے اندر سمانے کی صلاحیت پیدا کر لی اور جب عوام کو دلچسپی ہونے لگی تو لاطینی زبان کو مقامی زبان سے بدلا گیا اور لاطینی زبان نے جب پوری طرح چولا بدلا تو ڈراما مذہبی بندھن سے آزاد ہو کر منصۂ شہود پر آیا اور اس طرح وہ بالآخر ہر دل عزیز ہو گیا -

اب ہم اس سرسری خاکہ کے بعد اس تحقیق کی طرف رجوع ہوں گے جو ہمیں انگریزی زبان کے ڈرامے کے منبع اور سرچشمہ کی طرف رہبری کرتی ہے - دوسرے ممالک میں اور خاص طور سے فرانس میں جدید ڈرامے کا سرچشمہ مذہبیات، ادبیات اور موسیقی وغیرہ ہیں مگر انگلستان میں اس کی ابتدا دوسرے ذرائع سے ہوئی یعنی ابتدائی حالات میں اس میں مذہبی رجحان و میلان پایا جاتا تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ اس کا سرچشمہ صرف مذہب ہی ہے کیونکہ اگر مذہب ایک طرف زبردست عنصر تھا جس نے قرون وسطیٰ کے مزاج کو موزوں کیا تو دوسری طرف رزمیہ میلان بھی اس کے قومی کردار کا طرۂ امتیاز تھا - اس طرح دور وسطیٰ کے فرنگیوں میں ہمیں مذہبی پیشوا بھی ملتا ہے اور میدان کارزار کا علم بردار بھی - اس طرح ابتدائی انگریزی ڈرامے کے محرک دونوں ہوا کرتے تھے - اول الذکر کو اگر تلقین مقصود تھی تو آخر الذکر کو تفریح - اس طرح انگریزی ڈرامے کی پیدائش اور پرورش کی ذمہ دار یہ دو جماعتیں تھیں جن میں سے ہر ایک کو اپنا مقصد ملحوظ تھا -

محمد عبدالجبار فاروقی

رادھا

رمیش چھاپہ خانہ میں ملازم تھا۔ اس کو اپنی بیوی سندرا سے بے حد محبت تھی۔ سندرا کا دل بھی محبت سے معمور تھا۔ رادھا باپ کی نورِ نظر اور ماں کی لختِ جگر تھی۔ وہی ان کے اندھیرے گھر کا چراغ تھی۔ رمیش کی مالی حالت خراب نہ تھی۔ اس کا دل بھی بہت غنی تھا۔ وہ اکثر رادھا کے لئے بازار سے قسم قسم کے کھلونے لایا کرتا اور رادھا اپنا بیشتر وقت گڑیا گڈے کی شادی رچانے میں گزارتی تھی۔

زمانہ ایک حالت پر نہیں رہتا' رادھا کا بچپن بھی دیکھتے دیکھتے گزر گیا۔ اب وہ شباب کے پُر فضا باغ میں قدم رکھ چکی تھی ایک پھول تھا جو ویرانے میں کھلا تھا۔ اس کی معصومیت اور بچپن کے مجسمہ سے شباب کا رنگ جھلکنا شروع ہوگیا۔ اس کے والدین اس کی معصوم اور حسین صورت دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے۔ انھیں اب رادھا کی شادی کی فکر ہوئی۔ وہ رادھا کو ایک بڑے گھرانے کی بہو بنانا چاہتے تھے' جہاں دولت اور چین کا مینہ برستا ہو لیکن وہ نسوانی جذبات سے بالکل نا آشنا تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ عورت کی مسرت دولت سے نہیں خریدی جا سکتی۔ انہیں تو صرف اپنے فریضہ سے سبکدوش ہونے کی لو لگی تھی۔

بیسیوں رشتے توڑنے کے بعد جو رشتہ انہیں پسند آیا' وہ سندر کا تھا۔ محض اس لئے کہ وہ پچاس ہزار کی جائداد کا وارث تھا۔ اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اکیلا رہا کرتا تھا۔ شرافت اور سچائی کا مجسمہ تھا۔ قدرت ہمیشہ سچائی اور شرافت کے خلاف بغاوت کرتی ہے' غرض اس کے پاس دنیوی عیش کے سب سامان تھے۔ لیکن ایک چیز نہ تھی اور وہ تھی صحت۔ وہ دائم المریض تھا جس کے متعلق ڈاکٹروں کا فیصلہ تھا کہ وہ تھوڑے دنوں کے بعد زندہ نہ رہے گا۔ مگر خاندانی لال بجھکڑوں نے ڈاکٹروں کی رائے کو ہذیان سمجھا اور الٹا فتویٰ دے دیا کہ شادی تو ایسی اکسیر دوا ہے جس سے تمام مرض دور ہو جاتے ہیں۔ غرض رادھا کی شادی دھوم دھام کے ساتھ سندر سے ہوگئی اور والدین نے پچاس ہزار روپیوں پر اس کو فروخت کر دیا۔

رادھا کو اپنے شوہر کے مکان کا باوا آدم ہی نرالا نظر آیا۔ وہ میکے میں اپنا سارا وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنسی خوشی میں گزارتی تھی لیکن یہاں صرف دو ہی ہستیاں موجود تھیں۔ ایک تو خود اس کی اپنی ذات اور دوسری اس کا مریض شوہر سندر۔ دولت اس کے قدم چومتی تھی لیکن رادھا کو دولت سے مطلق رغبت نہ تھی۔ وہ اپنے والدین کی تنگ خیالی پر دل ہی دل میں افسوس کرتی تھی۔ وہ سماج کو ایک بے پناہ سمندر سمجھ رہی تھی جس کی خوفناک موجوں میں ہر عورت کی انفرادی شخصیت اور ہر انقلابی ذہنیت کے لئے موت کا سامان ہے۔ وہ ایک دل برداشتہ خادمہ کی طرح شوہر کی خدمت کرتی تھی' والدین کی غلطی کا واحد علاج صبر سمجھتی تھی اور کبھی اس کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی۔ وہ صرف ایک چیز کی خواہاں تھی اور وہ تھی شوہر کی تندرستی۔

رادھا کے ہاتھوں کی مہندی بھی میلی نہ ہونے پائی تھی کہ اس کے پتی کی کشتیٔ حیات بیماریوں کے گرداب میں پھنس کر تھپیڑے کھانے لگی "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ تمام معالج اس بات پر متفق تھے کہ وہ بچ نہیں سکتا۔ تندرستوں کو مریض کی سانس بھی مہلک ثابت ہوتی مگر رادھا جو بلبل کی طرح اس پھول کے سامنے رکھ کر آہ و فغاں کیا کرتی تھی' وہ اس نزاعی سانس کو اپنی زندگی سمجھ رہی تھی اور یہ سمجھے ہوئے تھی کہ محبت کو فنا نہیں۔

سندر نے کروٹ لی اور اپنی بے رونق آنکھیں کھولیں۔ رادھا سامنے کھڑی تھی۔ اس کا سانس پھولا

رادھا کی پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ سندر کی حالت اب آخری وقت کا پیام سنا رہی تھی۔ کچھ دیر تک سندر حیرت کی نگاہ سے رادھا کو دیکھتا رہا اور پھر کہنے لگا رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوتا رادھا۔ انسان پانی کا ایک بلبلا ہے۔ اس کو ٹوٹنے دیر نہیں لگتی۔ اس حباب کو خواہ ہوا کا تیز جھونکا توڑ دے یا وہ خود پانی میں مل جائے ایک ہی بات ہے۔ موت کی دوا دنیا میں نہیں ہے مگر میں موت سے نہیں گھبراتا۔" یہ باتیں رادھا نے اپنے پتی کی زبانی سنیں اور زخمی ہرن کی طرح تڑپ کر کہنے لگی "کوئی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج دنیا میں موجود نہ ہو۔ جو طاقت آدمی کو بیمار ڈالتی ہے وہ تندرست کرنا بھی جانتی ہے۔ ناگ والے کے پاس ناگ کے کاٹے کا تریاق بھی تو ہوتا ہے۔" سندر کی قوت گویائی فرط غم اور حسرت و یاس کی وجہ سے سلب سی ہو گئی۔ نیم بے ہوشی کی حالت اس پر طاری ہو گئی۔ رادھا جو اس کے پلنگ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی دعا کرنے لگی "خداوند! میرے شوہر کو تندرست کر دے اس کی بجائے مجھے موت دے۔ وہ میرا چین ہے وہ میرا عیش ہے جب وہ زندہ نہ ہوگا تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گی"

سندر نے کروٹ لی اور تھوڑا سا پانی رادھا کے ہاتھ سے پیا۔

آسمانی دیوتاؤں نے رادھا کے درد بھرے نالوں کو سن لیا اور سندر کو موت کے طوفان سے نکال کر زندگی کی خوش گوار وادی میں ڈال دیا۔ سندر اچھا ہوتا گیا اور اطمینان کی زندگی کے سانس لینے لگا لیکن رادھا کے جسم کی نزاکت اس موذی مرض کے مقابلے کے قابل نہ تھی وہ اس سے متاثر ہو گئی۔ اس کے چہرہ کی سرخی زردی سے بدل گئی۔ اس کا بھرا ہوا جسم، ابھرا ہوا سینہ، ہڈیوں میں تبدیل ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس موذی مرض نے اس کے جسم کی روح کھینچ لی۔ اس کی دعا قبول ہو چکی تھی۔ اس کا شوہر تندرست ہو گیا تھا اس کی پچاس ہزار کی جائداد اس بدنصیب رادھا کو موت کے پنجے سے نہیں بچا سکی۔ آخر کار اس مرض مہلک کی بدولت رادھا دنیا سے رخصت ہو گئی اور دنیا کو بتلا گئی کہ والدین کی ذرا سی غلطی اولاد کے لئے موت کا پیام ہے۔ ؎

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

محمد عزیز الرحمٰن (عثمانیہ)

محبت کی چھاؤں:- مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کار فرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ اس کا حسین و جمیل سرورق دیکھتے ہی اس کتاب کے بے باک اسلوب اور اس کے افسانوں کی بے پناہ شوخی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

ہماری کتابیں

موجودہ علمی و تحقیقی کساد بازاری، اور انتشار ذہنی و افلاس دماغی کے زمانہ میں جب ہم ہندوستان کی سال بہ سال فہرست تصانیف پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو نہ علم و تحقیق کی کساد بازاری پر ماتم کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور نہ انتشار ذہنی پر نالۂ و شیون کرنے کا، اور نہ ہی افلاس دماغی پر آہ و بکا کرنے کا شائبہ باقی رہتا ہے۔

بلکہ ہندوستانی مصنفین کا ہجوم بے پایاں اور ہندوستانی تصانیف کی فراوانی دیکھ کر نہ صرف ہماری اشک شوئی ہو جاتی ہے بلکہ ملک کی زرخیز زمین کی طرح [illegible] انگیز و معارف خیز دماغوں کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تحقیقات کا یہ انبار، کتابوں کا یہ انبوہ، جرائد و رسائل کی یہ کثرت، ماہناموں، روزناموں کی یہ بہتات، مقالات و مضامین کی یہ فراوانی، افسانوں کی یہ افزونی ملک کے روز افزوں، ترقی یافتہ حالات و نتائج کی آئینہ دار ہے۔ کیونکہ جس سرزمین کے باشندے تمام دنیا میں ⅕ کی حیثیت رکھتے ہوں، جو ملک دنیا کے مہذب ممالک کے مقابلے میں اپنے رقبہ کی وسعت، آبادی کی کثرت، معدنی و دولتی حیثیت سے نمایاں مقام پر فائز ہو، اس کے لئے اتنی علمی ترقی، تصنیفی و تالیفی اضافہ حیرت افزا نہیں۔ بلکہ علم و عمل کی کوتاہی، تصنیف و تالیف کی سست رفتاری یقیناً اس براعظم کی پسماندگی و سہل انگاری کی روشن دلیل ہوگی چالیس کروڑ نفوس کی اس بھیڑ میں دو چار ہزار کتابوں کی تصانیف کی تعداد ایسی کوئی غیر معمولی نہیں ہے کہ اس پر اظہار تعجب کیا جائے۔ کیونکہ کسی قوم کی تہذیب و تمدن کے ارتقا کا اندازہ کرنے کے لئے اس کا ترقی یافتہ گروہ ہی ہوا کرتا ہے اور درحقیقت یہی ممتاز گروہ قوم کی تمام طاقتوں کا مرکز، مجموعی کوششوں کا مرقع ہوتا ہے۔ یہ لوگ بقول لیبانؔ زمانہ کی طویل گردشوں کے نتیجے ہوتے ہیں۔

مصنف، شاعر، فلسفی، مفکر، سیاسی سب اسی میں داخل ہیں اس لئے مذکورۂ بالا تصنیفات کی فہرست تعجب انگیز نہیں۔ تصویر کا یہ روشن رخ نہایت مسرت زا، حوصلہ افزا ہے۔ کاش! اس حقیقت کا صرف یہی درخشانی پہلو ہوتا۔ لیکن ہماری سخت کوتاہی ہوگی اگر ہم اسی حقیقت کے تاریک پہلو کا پردہ نہ اٹھائیں۔

ہماری مسرت کی کچھ انتہا نہ ہوتی اگر ان تصانیف کا اکثر و بیشتر حصہ خود ان کے ذاتی غور و فکر، ذاتی محنت و ریاضت ذاتی جد و جہد کا رہون منت ہوتا۔ لیکن ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ ان شائع شدہ تصانیف میں سے بہت زیادہ حصہ انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور روسی تصنیفات سے ماخوذ یا خلاصہ ہوتا ہے اور ہمارے مصنفین انتہائی سرخوشی و سرمستی میں اس شراب مستعار کو اپنی تصنیفات کے ساغروں میں ڈال کر قدح خواران بزم کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور وہ ہاتھوں ہاتھ لے کر گرمئ محفل کا سامان بنا دیتے ہیں۔

خدانخواستہ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی قوم کے پاکیزہ خیالوں، اجنبی زبانوں کے شاہکار حصوں کا اپنی زبان میں منتقل کر دینا لسانی گناہ ہے نہیں نہیں! کسی زبان کے عروق مردہ میں نیا اور تر و تازہ خون داخل کرنا خود نئی زندگی پیدا کرنے کے مرادف ہے لیکن کسی زبان کو لذیذ و غیر لذیذ طعام سے اس قدر شکم پری کر دینا بھی باعث امتلا اور موجب بدہضمی ہے۔

سچ پوچھئے تو اس کا حقیقی سبب ہماری غلامانہ ذہنیت ہے جو ہم کو اختراعِ فکر، ابداعِ خیال کے

ہمارے کو اندھا دھند تقلید کی دعوت دیتی ہے کیونکہ فاتح قوم کا تمدن، فاتح قوم کے معتقدات مفتوح اقوام کے رگ و ریشہ میں نہ صرف سرایت کر جاتے ہیں۔ بلکہ جزو بدن بن جاتے ہیں، جس کے نتیجہ میں قومی مزاج، قومی خصائص قومی شعائر رفتہ رفتہ آمادۂ فنا ہونے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب ہم کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں، کوئی مقصد لے کر عازم سفر ہونا چاہتے ہیں تو نہ ہمارے سامنے سوچا سمجھا طریقہ کار ہوتا ہے نہ سمجھا بوجھا ہوا راستہ، جس ڈگر پر دوسرے لوگوں کو چلتا ہوا دیکھتے ہیں ہم بھی چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ نہ افق منزل کا پتہ، نہ جادۂ مقصد کا سراغ۔ ہم چلتے رہتے ہیں۔ اپنے سفر کو جاری رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ دوسرے لوگ چل رہے ہیں دوسری قومیں سفر زندگی کی تگ و دو میں مصروف ہیں لیکن نتیجہ میں نہ ہم منزل تک پہونچتے ہیں نہ مقصد کو پا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ بجز تقالاتہ جبنت اور غلامانہ فطرت کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پرانے آسمان کے نیچے کوئی چیز نئی نہیں ہے اور چراغ ہی سے چراغ ہمیشہ سے جلتا ہوا چلا آتا ہے لیکن قومی مزاج، قومی خصائص سے پہلوتہی اور چشم پوشی بھی ارتقائے انسانیت کے لئے ایک رکاوٹ ہے صرف ایک محدود و بیخ بستہ ماحول پر قناعت کر لینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

خود ہم جب بقول ایک انگریزی مصنف علم و تحقیق کے دریائے بیکراں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم علم و ادب کے کچھ علحدہ اور پوشیدہ سرچشمے ہیں۔ یہی وہ سرچشمے ہیں جہاں ہمارے موجودہ مصنفین پہنچ کر اپنے خیالات کے کم آب نالوں کو ان کے پانی سے اس قدر لبریز کر دیتے ہیں کہ وہ کناروں سے ابل پڑتے ہیں۔ یہ وہ علمی و ادبی نایاب ذخیرے ہیں جن میں سے ہر شخص اپنے اپنے حسب منشا چن چن کر آپ کے سامنے ایک وسیع دسترخوان بچھا دیتا ہے۔

یورپ کی علمی تحقیقات، فنی و عملی مصنوعات کا راز کیا ہے؟ مجھے اس کے جواب دینے کی شاید ضرورت نہیں بلکہ ان یورپین محققین کی طرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہے جو یورپ کے اسی دور نشاۃ ثانیہ کو اندلس کے عربوں کی تہذیب و تمدن کا مرہون احسان سمجھتے ہیں۔ علم و فن کا یہ وسیع خزانہ انہیں نایاب ذخیروں کی بدولت ہم تک پہونچا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ اہل یورپ نے اس علمی و تحقیقی متاع کو اپنے قومی و تہذیبی سانچے میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا ہے کہ خود ہمیں شناخت کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔

خداوند عالم نے اس اخذ و اقتباس کی عادت سے علوم و فنون کے لئے کیا بارآور نتائج پیدا کئے؟ کیا اس طریقہ کو کتابوں کے ناگزیر تنزل کے باوجود ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ تک علم و حکمت کے بیجوں کو قائم رکھنے کا ذریعہ قرار دیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت نے کمال حکمت و فیاضی کے ساتھ ایک ملک سے دوسرے ملک تک بیجوں کے پہونچانے کا انتظام بعض پرندوں کی شکم پروری کے ذریعہ سے کیا ہے۔ حالانکہ وہ طیور بظاہر باغوں اور کھیتوں کے ناجائز لٹیرے معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل وہ فطرت کے حمال ہیں تاکہ اس کی رحمتوں کو پھیلا کر اس کو دیرپا بنائیں۔ اسی طرح متقدمین کے نازک خیالات اور ٹھوس معلومات کو یہ لٹیرے مصنف اپنی تصنیفات کے بازوؤں میں لے اڑتے ہیں اور وقت کے نہایت دور خطے میں ان کو گرا دیتے ہیں تاکہ وہ بڑھیں اور پھلیں، پھولیں۔ ان کی بہت سی کتابیں آواگون کے

پھیر میں آکر نئی شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ ایک مستند تاریخ افسانہ، ایک داستان کہن عالم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔
اور ایک خشک و متین فلسفہ کا رسالہ دلچسپ و دلکش مضامین کے سلسلہ کا ذخیرہ بن جاتا ہے۔
پس ہم کو متقدمین کے زوال اور ان کی یک قلم فراموشی پر افسوس نہیں کرنا چاہئے۔
مگر اسی کے ساتھ ہم کو اپنے اسلاف ہی کی نتائج ہوئی تحقیقات پر قانع ہو کر نہیں بیٹھنا چاہئے بلکہ قدرت نے ہم کو فکر و نظر کی بیش بہا دولت سے جس قدر فیض یاب کیا ہے اس سے کام نہ لینا کفران نعمت کے مرادف ہے اپنے قوائے علمیہ کی طرح قوائے عقلیہ کو بھی بروئے کار نہ ہونا ہی ہماری نہندگی و سربلندی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ ہمارے مصنفین کے لئے اس کی اشد ضرورت ہے اور اسی میں ہماری کامیابی کا راز مضمر ہے۔

وجدی الحسینی (بھوپال)

سرگزشت حاتم:۔ دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعرا شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور اردو فارسی کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور قال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔ تشنہ گان ادب اور محققین کے لئے یہ نادر تحفہ ہے۔
صفحات (۱۲۸) طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت ۱۲/

شاد اقبال:۔ اقبال اور شاد دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے گی کہ علامہ اقبال مرحوم اور مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنۃ آنجہانی کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے اس کو اہتمام سے مرتب کیا گیا اور یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اقبال کی زندگی اور کردار کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق دوسرے ذرائع سے کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ہے شاد و اقبال کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ صفحات (۱۷۶) قیمت عہ/

ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر

خیرت آباد۔ حیدرآباد دکن

وجہی کی سب رس

دکن ہندوستان کا دل ہے۔ علم وادب کی سرپرستی جیسی کچھ یہاں ہو رہی ہے اس سے کوئی ناواقف نہیں۔ خصوصاً اردو کو اس بے ہنگم دور میں پناہ دینے والے دکھنی ہی ہیں۔ وہ دن حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے جب یہ کہا جاتا تھا کہ دلی اور دلی کے بعد لکھنو ہی اردو کا مرکز ہے۔ اب دلی اور لکھنو والوں سے زیادہ اس مرجھائے ہوئے پودے کو دل کے لہو سے سینچنے والے دکھنی ہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ زبان شمال والوں کی تھی دکھنیوں کو ملی اور انھوں نے سر آنکھوں سے لگایا اور یوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اہلِ زبان کے احسان مند بن گئے۔ بلکہ اردو کو اس قدر زیادہ محبوب رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ نام نہاد "اہلِ زبان" کے منہ کھولنے سے بہت پہلے دکھنی یہ زبان بولتے پالتے تھے۔ اس میں شاعری کرتے اور کتابیں لکھتے تھے اور اس کو ایک ادبی زبان بنا چکے تھے۔ چنانچہ ولی، قطب شاہ اور ملا وجہی اسی خاکِ دکن سے اٹھے۔

کچھ دنوں پہلے تک فیضی کو نثر نگاری میں پہلا استاد سمجھا جاتا تھا اور یہ "استادی" محض ناواقفیت کی بنا پر تھی۔ ہم اکثر یونہی اپنی انجانی نادانی سے کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ اب تحقیقات نے علم کا میدان وسیع کر دیا ہے اور نئے نئے واقعات و حالات روشنی میں آتے جا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر ہمیں اپنے پہلے فیصلہ کو باطل قرار دے کر ایک نئی رائے قائم کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ وجہی، فیضی سے پہلے بہت دنوں پہلے ہوا ہے۔

دکھنی زبان یعنی اردو کی ابتدائی صورت میں ہمیں سب سے پہلے شعر و سخن کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے پہلے ادبی اور درباری زبان فارسی ہوا کرتی تھی۔ شمالی ہند کے لوگ فارسی ہی میں تمام کاروبار کیا کرتے تھے۔ وہ اردو کو اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ اس میں کچھ لکھیں پڑھیں۔ یوں ایک زمانہ تک انھوں نے اسے منہ نہ لگایا۔ لیکن دکھنیوں نے سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی کہ یہ ادبی زبان بن جائے۔ ولی اور قطب شاہ جیسے شاعروں نے جو اردو کے سب سے قدیم شاعر ہیں اردو یا دکھنی میں شاعری کی اور اس زبان کو اس قابل سمجھا کہ اس میں داستانِ دل سنائی جا سکتی ہے۔ ولی کا کلام شمالی ہند میں بھی پہنچا اور جب لوگ اس سے واقف ہوئے تب ہی انھیں معلوم ہوا کہ جس زبان کو وہ عام زبان اور ادبی وسعتوں کے لئے ناکافی سمجھتے تھے وہ ولی جیسے استاد کے لئے ذریعۂ اظہارِ جذبات بھی بن سکتی ہے۔

جس طرح اس زبان کو شعر و شاعری کے لئے سب سے پہلے دکھن والوں نے استعمال کیا، اسی طرح اس کو نثر نگاری سے مالا مال کرنے کا سہرا بھی دکھنیوں ہی کے سر ہے۔ اس کے ثبوت میں سب سے پہلی جو قابلِ ذکر اور معیاری کتاب ہمیں ملتی ہے وہ ملا وجہی کی تصنیف کردہ کتاب "سب رس" ہے۔

"سب رس" سے پہلے نثر میں ایک دو رسائل اور بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ایسے نہیں کہ ادب میں انھیں کوئی خاص اہمیت دی جا سکے۔ وہ خالص ادبی حیثیت والے نہیں نہ ادب کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ تو مذہبی تبلیغ کے لئے لکھے گئے تھے کسی مسئلہ وغیرہ پر بحث تھی اور بعض فلسفیانہ موضوع پر تھے۔ اس قسم کے رسائل کو جو بہت مختصر ہوتے ہیں ایک مستقل کتاب کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

ملا وجہی کی اس کتاب کو پڑھنے اور اس کی زبان پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دکھنی نثر کا استاد فارسی زبان کا کافی بڑا شاعر تھا۔ اس کا ایک ضخیم کلیات ہمیں ملتا ہے۔ اس کا ایک اردو دیوان بھی تھا لیکن ہنوز اس کا پتہ نہ چل سکا۔ وجہی جب فارسی میں شاعری کرتا ہے تو یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ

اسے اس زبان پر کافی عبور حاصل ہے۔ وہ فارسی الفاظ کا صحیح مصرف و تلفظ جانتا ہے۔ وہ متبحر عالم ہے۔ یہی وجہی جب دکھنی زبان میں نثر لکھتا ہے تو الفاظ کا املا وہی لکھتا ہے جو عام طور پر بول چال میں استعمال ہوتا ہے۔ وہ "صحیح" کو "سہی" لکھتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے اس لفظ کی اصلیت معلوم نہیں یا وہ برتنا جانتا نہیں بلکہ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک آزاد قوم کا فرد ہے۔ اگر کسی دوسری زبان کا لفظ استعمال کرنا چاہتا بھی ہے تو وہ اسے اپنا لیتا ہے۔ اس کی صورت وہی رکھتا ہے جس طرح اس کی زبان بنا ڈالے۔ اس طرح وہ ایک دوسری زبان کا غلام ثابت ہونا نہیں چاہتا۔

آج کل ہماری ذہنیت بہت بدل گئی ہے۔ ہم الفاظ کو ان کی اصلی شکل و صورت میں برتنا چاہتے ہیں اور حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ غیر زبانوں کے الفاظ ہم ویسے ہی استعمال کریں جس طرح وہ اپنی اصلی زبان میں مستعمل ہیں۔ یہ ہماری غلامانہ ذہنیت ہے۔ ہم اپنی کوئی رائے نہیں رکھتے ہم صرف غیروں سے مرعوب ہونا چاہتے ہیں۔ ہم صرف احکام کی تعمیل سر جھکا کر کرنا جانتے ہیں اور یہی غلامی کا سایہ ہمارے سارے ادب کو دھندلائے دیتا ہے۔

ایک اور بات جو سب رس پڑھ کر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک آزاد دماغ کی تخلیق ہے۔ جو اپنی ذاتی رائے رکھتا تھا۔ جو اپنے طور پر سوچنا جانتا تھا اور اسے اس قدر آزادی حاصل تھی کہ وہ جو سوچے اسے لکھ سکے۔ وہ اوروں کی لگائی ہوئی سے مسائل کو پرکھتا نہ تھا بلکہ اس کا اپنا ایک زاویۂ نظر تھا۔ اسے پڑھتے پڑھتے ہمیں تعجب ہونے لگتا ہے کہ جب ہماری ہی قوم کے ادیب آزاد تھے تو کیسے اور کیونکر سوچتے تھے اب اگر اس انداز سے ہم سوچیں بھی تو ہمارا غلام قلم لکھنے سے قاصر ہے، عاجز ہے۔ زندگی کے حقائق اب بھی وہی ہیں جو اس زمانے میں تھے لیکن انداز نظر بے شک بدل گیا ہے۔

وجہی کے بعد آج تک حیدرآباد دکن کی سرزمین نے اتنا بڑا ادبی انسان نہیں پیدا کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قلی قطب شاہ ایک ضخیم دیوان کا مالک ہوا ہے۔ لیکن وہ بھی نثر کے میدان میں ہارا جاتا ہے ان دونوں میدانوں میں فرد اور کامل ہمیں جو ملتا ہے وہ یہی ملا وجہی ہے۔ وہ نثر میں "سب رس" کے علاوہ اور دو کتابوں کا مصنف ہے "قطب مشتری" اور "تاج الحقائق"۔ اس کا شاہکار سب رس ہی ہے۔

یہی اس کی سب کتابوں میں ممتاز، اسے زندۂ جاوید بنانے والی ہے۔ اس کا مضمون کافی طویل ہے۔ خود وجہی کی عمر کی طرح طویل و دراز۔ اس میں کئی ایک خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔ اس کی لمبی عمر کے سارے تجربات کا نچوڑ ہے۔ اسے پڑھ کر حیرت یوں ہوتی ہے کہ وجہی باوجودیکہ پرانے زمانہ کا آدمی ہے مگر اپنے اندازِ نظر اور طریقۂ فکر کے لحاظ سے وہ آج کل کے نوجوان ادیبوں جیسا ہے۔ وہ "ادب برائے زندگی" کا قائل ہے۔ اس کے ہر ہر لفظ میں زندگی تڑپتی ہے اور پڑھنے والا اسے کوئی اجنبی نہیں سمجھتا بلکہ اپنی ہی طرح اس آب و گل کی دنیا کا رہنے والا انسان خیال کرتا ہے۔ وہ بھی گوشت پوست سے بنا ہے۔ وہ دکھوں کو محسوس کر کے روتا ہے اور زندگی کی مسرتوں پر مسکرا دیتا ہے۔ اس کی بات بات میں جان ہے، ت اور تڑپ ہے۔

وجہی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی خاص طبقہ کو اپنا کر اپنا ادبی دائرہ تنگ نہیں کرتا۔

وہ اپنے موضوع میں اپج کے ساتھ ساتھ وسعت بھی پیدا کرتا ہے اور زندگی کی نہ بدلنے والی حقیقتوں اور مسائل حیات پر وہ ہر ایک طبقہ کے زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے زندگی کو بہت زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ خود کو ایک انسان سمجھ کر اس نے انسانوں کو پرکھا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ہر طبقہ کی بہترین ترجمانی کرتا ہے اور اپنے دور کا بہت موزوں نمائندہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کا ادب عوام اور عام لوگوں کا ادب ہے۔ یہ کتاب اس زمانہ کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر ہے۔ اس دور کی سیاست، درباری زندگی اور عام طبقے کے خیالات، امرا کے حالات سبھی اس مرقع میں نظر آتے ہیں۔ وہ کسی خیالی دنیا کا خواب دیکھنے والا مصور نہیں بلکہ ایک حقیقی اور واقعی دنیا کا چابکدست عکاس ہے۔

اس کی کتابوں میں "سب رس" سب سے آخری تصنیف ہے۔ یہ اس کی لمبی عمر کے آخری دور میں لکھی گئی۔ اس وقت تک وہ دنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو گیا تھا۔ وہ تلخ و شیریں تجربات کا مزہ چکھ چکا تھا۔ جوانی کی نادانیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں اور بڑھاپے کے غور و فکر سے آشنا ہو گیا تھا۔ زندگی ڈھل چکی تھی۔ لیکن خیالات پختہ ہو گئے تھے۔ یہی فن کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس نے تمام منازلِ حیات کبھی ہنسی خوشی سے اور کبھی رو دھو کر طے کئے تھے۔ وہ بہت دور چلا آیا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر عمر رفتہ کو دیکھا اور اسے وہ ساری باتیں ایک ایک کرکے یاد آگئیں جو اس لمبے لمبے راستے پر اسے پیش آئی تھیں۔ اسی یاد کو، انہی تجربات کو اس نے ملفوظ کر دیا۔ جہاں دیدہ ہونے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ کونسی بات کیسے کہی جا سکتی ہے۔ اس نے چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ یعنی ابراہیم قطب شاہ کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ اس کو ماحول بھی سازگار ملا۔ گولکنڈہ اس وقت علم و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وجہی کا خاص طرز بہت جلد مشہور ہو گیا اور اس کی اکثر شعراء سے چشمک تھی۔ محمدؐ قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے درباری رنگ کو بھی اس کی آنکھیں دیکھتی رہیں۔ اس کے سامنے گولکنڈہ کی سیاسی بساط کئی مرتبہ جمی۔ گولکنڈہ کی ساری زندگی اس کے قلم سے "سب رس" میں ٹپک گئی ہے۔ یہ اس کے سارے تجربات کا نچوڑ ہے۔ نام بھی "سب رس" اس نے خوب ہی رکھا۔ زندگی کا ہر رخ اس میں روشن ہے۔

"قطب مشتری" میں اس نے لکھا کہ مٹی کا عشق، محمد قلی قطب شاہ کے ساتھ نہایت تفصیلانہ رنگ میں لکھا ہے۔ اس دور کی جزئی تفصیلات بیان کی ہیں۔ علم و ادب، تہذیب و تمدن، خیالات و رجحانات، رسم و رواج بھی وجہی کے یہاں ملتے ہیں۔ خارجی و داخلی دونوں پہلو جھلکتے ہیں۔

وجہی محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ محمدؐ قطب شاہ کے دور میں یکایک رنگ بدلا گویلے اور شاعروں کی کوئی قدر نہ رہی۔ ایرانی امرا نظر سے گر گئے ملک کے علما و فضلا کو دربار میں باریابی ہوئی۔ شعر و سخن کی بجائے ادب و فلسفہ کی سرپرستی ہونے لگی۔ غواصی جو وجہی سے کم عمر تھا منظر میں ابھرا اور وجہی پس منظر میں چلا گیا...... بہت دنوں بعد ایک اور دفعہ وجہی کے دن پھرے۔ عبداللہ قطب شاہ عنفوان شباب میں جب بادشاہ ہوا تو پھر اس کے نانا قلی قطب شاہ کا زمانہ لوٹ آیا۔ وجہی پھر چمک اٹھا۔ مذہب امامیہ جاگ اٹھا۔ کیونکہ عبداللہ کی تربیت میں اس کی ماں حیات بخشی بیگم کا بڑا حصہ تھا۔ غرض وجہی کا یہ آخری زمانہ تھا۔ بادشاہ مہربان ہوا اور ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ وجہی نے "سب رس" لکھی۔ اپنے قلم کی ساری قوتیں اس میں بھر دیں کیونکہ یہ اس کی حاصلِ زندگی تھی۔ اس کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے۔ اس کی نثر دل کے لئے یہ منعش راہ کا کام کرتی ہے۔ ۱۰۴۵ھ میں یہ کتاب لکھی گئی۔ اس کے بعد تاریخ ادب میں وجہی کا نام نظر نہیں آتا۔ گویا اس کا شاہکار ہی آخری ادبی کارنامہ تھا۔

زینت ساجدہ

شاعر امرء القیس

عرب کی شاعری زمانۂ جاہلیت میں اوج کمال پر تھی۔ عرب شاعر قومی تمدن و معاشرت کا معیار ہوتا تھا اور قومی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ شعراء کی آزادی طبع انہیں ہر اس شخص کی ہجو کرنے پر آمادہ کر دیتی تھی جو ان کے خلاف منشاء عمل کرتا جس سے وہ شخص تمام قبیلے میں ہدف ملامت بن جاتا تھا اور ہر ایک اسے نہایت ذلیل و خوار تصور کرنے لگتا تھا اور کوئی شاعر اگر کسی کی تعریف کر دیتا تو اس شخص کی بے حد تعظیم و تکریم کی جاتی تھی۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب شعراء میں باہم معرکہ آرائیاں اکثر وہاں کے بازاروں یا میلوں میں ہوا کرتی تھیں اور جس شاعر کا کلام مایۂ ناز تصور کیا جاتا اس کے کلام کو خانۂ کعبہ میں معلق کر دیا جاتا تھا تاکہ دوسرا آدمی اس سے بہتر کلام پیش کر سکے۔ یوں تو اس زمانے میں متعدد مشہور شعراء گزرے ہیں لیکن امرء القیس کو اپنے تمام ہمعصر شعراء پر نمایاں فضیلت حاصل تھی چنانچہ بعض ارباب ذوق و فن نے اس کو جسد شاعری میں بہ منزلہ سر کے قرار دیا ہے۔

امرء القیس اسلام سے چالیس سال قبل گزرا ہے۔ اس کا باپ قبیلہ کندی سے تھا۔ امرء القیس ایک نہایت آزاد منش اور حسن پرست انسان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی آزادی فطرت اور حسن پرستی ہر وقت اسے ایک پری وش کی جستجو پر ابھارتی رہتی تھی اس لئے وہ ملک الضلیل کے لقب سے مشہور رہے اور اس کی بے شمار محبوبہ عفیفہ جن میں ام حویرث اور غنیزہ قابل ذکر ہیں۔ غنیزہ اس کی چچا زاد بہن بھی تھی جس کے فراق میں اس نے اپنا بے نظیر قصیدہ اہل ذوق کے سامنے پیش کیا اور خوب داد تحسین حاصل کیا۔

عرب کا او بدو صحیفۂ فطرت پڑھ کر شاعر بنا۔ ضروری تھا کہ اس کا کلام سراپا فطری اور اثر میں ڈوبا ہوا ہو۔ چنانچہ وہ اپنے مخصوص انداز سے قصیدہ اس طرح شروع کرتا ہے وہ ایک رہ نورد ہے راستے میں وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں کبھی وہ اپنی معشوقہ کے دیدار سے پہلی بار مشرف ہوا تھا اور اب وہاں ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اس زمانۂ گزشتہ کی یاد دہرا رہے ہیں عہد رفتہ کی یاد شاعر کو بے قرار کر دیتی ہے اور وہ چند لمحے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے وہاں ٹھیر جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے ؎

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل | بسقط اللوی بین الدخول فحومل
فتوضح والمقراط لم یعف رسمہا ! | لما نسجتہا من جنوب و شمال

(ترجمۂ اشعار) ٹھیر جاؤ اے دوستو! اور مجھے اپنے حبیب اور اس کے مکان کی یاد تازہ کر لینے دو جو توضح، مقراط، دخول اور حومل کے درمیان تھا اور اب تک باد شمالی و جنوبی کی آمد و رفت نے اس کے دلکش نشانات کو ناپید ہونے نہیں دیا۔

یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ شاعری اگرچہ کہ ایک غیر مادی شئے ہے لیکن مادیت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور ہر قوم کا ادب اس کے تمدن و معاشرت، اخلاق و آداب اور خیالات کا آئینہ دار ہوتا ہے چنانچہ زمانۂ جاہلیت کی ایک غیر متمدن اور سادہ لوح قوم کے شاعر امرء القیس کے کلام میں بھی سادہ خیالات اور عام فہم تشبیہات و استعارات کا پایا جانا لازمی ہے۔ وہ جس مضمون کو چاہتا بغیر کسی ہیر پھیر اور تکلف کے اشاروں، کنایوں میں بیان کر دیتا تھا ؎

الارب یوم کان منہن صالح | ولا سیما یوم بدارۃ جلجل

(ترجمہ) دارۃ جلجل پر وہ اتنا مبارک دن تھا کہ کوئی دن اس کے برابر نہیں ہے۔ دارۃ جلجل ایک تالاب کا نام ہے اور اس شعر میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب کہ قبیلے کی چند عورتیں وہاں نہانے گئی تھیں شاعر کی شوخ نظر پ

اس قسم کے نظاروں کی منتظر رہا کرتی تھیں اس کی حسن پرست فطرت نے اسے اس وقت وہاں پہنچا دیا۔ اس کی شوخ طبیعت رنگ لائی، اس نے چپکے سے سب عورتوں کے کپڑے چھپا دیئے۔ ان عورتوں میں اس کی معشوقہ عنیزہ بھی تھی جب سب عورتیں نہا کر کپڑے تلاش کرنے لگیں تو امرءالقیس ان کو اور خصوصاً عنیزہ کو کپڑوں کی گٹھری دکھا دکھا کر عجیب انداز سے ہنسنے لگا۔ اس واقعہ سے ہمیں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگرچہ امرءالقیس ایک اخلاقی جرم کا مرتکب ہوا تھا لیکن اس نے اس کی پردہ پوشی کی بجائے بلا تامل تشہیر کر دی اور اپنی خوبیوں کے ساتھ کمزوریوں کو نظر انداز ہونے نہ دیا یقیناً یہ انسانیت کا ایک اعلیٰ کردار اور زندگی کا ایک اہم پہلو ہے جس کے بغیر سازِ زندگی بے سرا اور بےکیف رہ جاتا ہے۔

صحرائے عرب کی پرسکوت وسعت۔ لوؤں کی لپٹ۔ باد صرصر کے طوفان، تپتی ہوئی ریت کی موجیں تاروں بھری روپہلی راتوں میں قافلہ والوں کے پرزور قہقہے اور جوش آور نغمے اور ریگستان میں جرس کی گونجتی ہوئی صدائیں، جا بجا کھجوروں کے جھنڈ خوبصورت اونٹ، گائیں اور دوسرے صحرائی جانور اگر خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں تو کیا شاعر نے ان کی تصویر کو الفاظ کا ایسا جامہ پہنایا ہے کہ تصور انھیں ہوبہو سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے۔

فادبرن کالجزع المفصل بینہ		بجید معم فی العشیرۃ مخول

اور یہ بات ہمیں شاعر کی زبانی ہی معلوم ہوئی کہ عرب کی گائے کا متہ اور سر سیاہ اور باقی جسم سفید ہوتا ہے۔ شاعر نے گایوں سے ان کی مشابہت بتا کر گائے کے حسن میں چار چاند لگا دیئے اور ان کے منتشر ہونے کو اس مالا سے تشبیہ دے کر جس کے موتی سنہری تار میں الگ الگ پروئے ہوئے ہوں منظر کو اور زیادہ دلکش کر دیا ہے۔

امرءالقیس کو یہ کمال حاصل تھا کہ جب وہ کسی واقعہ کو بیان کرتا یا کسی چیز کا خاکہ کھینچتا تھا تو اس کی جزئیات تک کو نہ بھولتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے کہ وہ نہایت صبا رفتار اور حملہ آور ہے اور اسے اتنی قدرت تھی کہ وہ سامنے دوڑتا دوڑتا اچانک مڑ کر پیچھے اس طرح دوڑنے لگتا ہے جیسے کسی پتھر کو سیلاب بلندی سے نیچے تیزی سے پھینک دے ؎

مکر مفر مقبل مدبر معاً		کجلمود صخر حطہ السیل من عل

متعدد تشبیہات کو ایک ہی شعر میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ایک جاہل بدو شاعر امرءالقیس کے کلام پر نظر ڈالئے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کس خوبی سے اس کام کو انجام دیتا ہے ؎

لہ ایطلا ظبی و ساقا نعامتہ		وارخاء سرحان و تقریب تتفل

گھوڑے کی دونوں رانیں ہرن کی رانوں کی طرح، پنڈلیاں شترمرغ کی پنڈلیوں کی مانند بتا کر اس کی صبا رفتاری کو بھیڑیئے کی تیز روی اور خرامی رفتار کو لومڑی کے بچے کے پھدکنے سے تشبیہ دی ہے۔

شاعر کی جدت پسند طبیعت ہر چیز کو ایک نئے روپ میں پیش کرنے کے لئے بے قرار رہتی تھی۔ وہ اپنے ہمعصروں سے محبوبہ کی نازک انگلیوں کو معمولی مسواک سے تشبیہ دیتے ہوئے بارہا سن چکا تھا اس کی جدت پسندی رنگ لائی اور اس نے محبوبہ کی نرم و نازک سے انگلیوں کو وادی ظبی کے سفید اور لمبے لمبے

خوبصورت کیڑوں کے مشابہ بتا کر اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت پیش کیا ہے

و تعطو برخص غیر شثن کانہ   اساریع ظبی او مساویک اسحل

زمانہ جاہلیت کے عرب شعراء کے کلام سے وہاں کے حالات پر اتنی روشنی پڑتی ہے کہ ان کا کلام اہلِ خود عرب کی تاریخ بن گیا۔ عرب طبعاً نہایت مہمان نواز ہوتے ہیں اور امراءالقیس اس بات کا یقین ہمیں اس طرح دلاتا ہے

وقربة اقوام جعلت عصامها   على كاهل منى ذلول مرحل

اگرچہ کہ وہ شاہی خاندان کا ایک اعلیٰ فرد تھا لیکن فخریہ کہتا ہے کہ "میں نے بارہا پانی کی مشک گردن پر رکھ کر مہیا کی ہے اور قافلے والوں کی مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا"

شجاعت اور دلیری عربوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوتی ہے اور اس کی مثالیں ہمیں امراءالقیس کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں

و واد کجوف العیر قفر قطعته   به الذئب یعوی کالخلیع المعیل

شاعر اپنی شجاعت کا اظہار یوں کرتا ہے کہ اس نے بے خوف و ہراس بھیانک اور ویران وادیاں طے کی ہیں ایسی وادیاں جو بھوکے گورخر کے شکم کے مانند گھاس وغیرہ سے بالکل خالی تھیں۔ یہ سادہ تشبیہات کی ایک نادر مثال ہے کیونکہ عرب ان ہی اشیاء کی تشبیہہ دیا کرتے تھے جو ان کے مشاہدہ میں آتی تھیں تاکہ سامع مطلب آسانی سے سمجھ سکے اور شعر زیادہ موثر ثابت ہو یہ طریقہ ایک عرب شاعر کے لئے بے حد موزوں تھا کیونکہ وہ صحرائی اور شکاری خانہ بدوش قوم ایران یا ہند کے یاسمن و نرگس اور گل و بلبل کیا جانتی اور ایسی رنگین تشبیہات کہاں سے لاتی جب کہ اس نے خواب میں بھی ایسی چیزیں نہ دیکھی تھیں اور شاعری کے لئے ضروری ہے کہ اسباب بھی موجود ہوں۔ ایک دفعہ ابن الرومی سے لوگوں نے دریافت کیا کہ تم ابن المعتز سے اچھے شاعر ہو لیکن تشبیہات اس کی سی کیوں نہیں دیتے ہو اور مثال کے طور پر ابن المعتز کا یہ شعر پیش کیا جو ماہ نو کی تعریف میں ہے

فانظر اليه كزورق من فضة   قد اثقلته حمولة من عنبر

ماہ نو کو ایک چاندی کی کشتی سے تشبیہہ دی ہے جو عنبر سے لدی ہوئی ہے اور اس کے بوجھ سے ایک جانب جھک گئی ہے۔ آسمان کا رنگ نیلا ہوتا ہے اس لئے اسے عنبر سے تشبیہہ دی ہے۔ ابن الرومی بے اختیار بول اٹھا "خدا کسی کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا ہے ابن المعتز امیر ہے گھر میں جو کچھ دیکھتا ہے اس کی تشبیہہ پیش کرتا ہے"

امراءالقیس نے اہلِ عرب کے عادات و خصائل پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس لق و دق صحرا میں پانی کی قلت کی وجہ سے اکثر بدو شکار کا کچا گوشت کھا کر اپنے گھوڑوں کی ایال سے ہاتھ پونچھ لیا کرتے تھے

ونمسح باعراف الجياد اكفنا   اذا نحن قمنا عن شواء مضهب

آدم کی پیدائش سے لے کر آج تک ہر قوم میں حب الوطنی کا جذبہ نمایاں رہا ہے۔ چنانچہ سرزمینِ عرب اگرچہ کہ ایک چٹیل میدان اور لق و دق صحرا کے سوا کچھ نہیں نہ وہاں ایران کے پھولوں سے لدے ہوئے چمن ہیں نہ پنجاب کی صاف و شفاف پانی کی نہریں جن سے موسم گرما میں لطف اندوز ہو سکیں لیکن شاعر کا جذبہ

صب الوطن میں دیوان کے موسم بہار کا ایسا دلکش منظر پیش کرتا ہے کہ انسان اس سے مسحور ہو کر بجائے ایک لق ودق صحرا کے اپنے آپ کو وادی غبیط کی سرسبز و شاداب سرزمین میں محسوس کرنے لگتا ہے جہاں ابر بہار نے رنگ برنگ کے پھول کھلائے ہیں ؎

والقی بصحرا الغبیط بعاعہ　نزول الیمانی ذی العیاب المحمل

مختصر یہ کہ امراء القیس کے کلام سے ہمیں ملک عرب کے حالات بہم پہنچتے ہیں کیونکہ اس نے بدوؤں کی نفسیاتی کیفیات جنگجو عربوں کے حالات ان کی فیاضی و مہمان نوازی اور بہادری ان کے خیالات اور صحرائی جانوروں، اونٹوں اور گھوڑوں کے حالات سب اس طرح ترتیب دیئے ہیں کہ پڑھنے والا پاس کی چیزوں اور ماحول سے بالکل بے خبر ہو کر عرب کی اس ریتیلی سرزمین کی سیر کرنے لگتا ہے ۔　قدسیہ

گاؤں کی شام

اپنی کرنوں کو سمیٹا مہر عالم تاب نے
اپنی منزل پر تھکے ہارے مسافر آ گئے
موجزن دریا کی آنکھوں میں خمار آنے لگا
دور لہراتے ہوئے پرچم کی لہریں تھم گئیں
چل دیئے گھر کی طرف سب دھوپ کے مارے کسان
بیچ سے کھیتوں کے یوں مبہم جھلکتی ہے سڑک
دور افتادہ مکانوں سے دھواں اٹھنے لگا
حسن کی کچھ دیویاں پنگھٹ سے گھر جانے لگیں
گنگناتیں، جھومتیں، مڑتی ہوئیں، گاتی ہوئیں
لہلہاتے پھول پودے سب اچانک تھم گئے
گاؤں کی شورش سکوں کی وادیوں میں کھو گئی

فرش رنگیں خود بخود میدان سے اٹھنے لگے
راستوں کے چلنے والے چلتے چلتے تھم گئے
آبشاروں کی روانی پر سکوں چھانے لگا
جھاڑیوں کے سائے میں آوارہ نہریں تھم گئیں
ہند کی قسمت کے مالک یعنی بے چارے کسان
کفر کے بادل ہیں جیسے نور ایماں کی چمک
طائروں نے قصد اپنے آشیانوں کا کیا
ہر طرف تنہائی پا کر موج میں گانے لگیں
مستیوں کی رو میں گاگر اپنی چھلکاتی ہوئیں
شام کے اورنگ پر زریں ستارے جم گئے
سبزۂ بیگانہ کے مانند دنیا سو گئی

اے دل محزوں ہر اک شے چپ ہے اس دریا کے پاس
تو بھی سو جا گود میں لے کر ہجوم درد و یاس

اشعر ملیح آبادی

فریاد

موسمِ خوشگوار آیا ہے
دردِ بے کر قرار آیا ہے

چھایا چھایا سا ابرِ مستی ہے　　ہر طرف زندگی برستی ہے
یاد آتا ہے اک حسیں کافر　　روٹھا روٹھا سا ہے دلِ مضطر
گلستاں کا عجیب منظر ہے　　جو دکھائے نصیب بہتر ہے

عہدِ رفتہ کی سرگزشت نہ پوچھ
میری تقدیر کی نوشت نہ پوچھ

مجھ کو آنکھیں ملی ہیں اشک نصیب　　جیسے تارے ہوں دو قریب قریب
مسکراتی ہے جب عروسِ بہار　　لوٹ لیتی ہے زندگی کا قرار
جب نگاہیں گلوں پہ پڑتی ہیں　　دل کی آبادیاں اجڑتی ہیں
چاند تاروں کو دیکھتا ہوں میں　　آبشاروں کو دیکھتا ہوں میں

ہائے وہ ربطِ شمع و پروانہ
لب پہ بلبل کے گل کا افسانہ

چرخ پر قوس جب نکلتی ہے　　زندگی کروٹیں بدلتی ہے
ایسے ماحول میں کسی کی یاد　　کون سنتا ہے عشق کی فریاد
سطحِ آبِ رواں پہ غولِ حباب　　دل کے داغوں کا کامیاب جواب

کاش ہوتا وہ قلبِ مضطر میں
یہ کمی رہ گئی مقدر میں

جبریل

...دو زبان کا تشکیلی دور

اردو زبان کی ارتقا کی تاریخ میں، شاید ہی کوئی ...ر اتنا اہم ہو جتنا کہ اس کا تشکیلی دور ہے۔ یہ زمانہ ہندو... تاریخ میں نہایت ہیجان کا زمانہ تھا، جس میں سیاسی ...ری کے علاوہ، لسانی افراتفری بھی اپنے منتہا کو پہنچ گئی ...۔ ہندوستانی ماہرین لسانیات کے اقوال کے مطابق ...ں زمانے میں ہندوستان کی ہند آریائی زبانیں ایک ...ہوری دور سے گزری تھیں، جو ان کا "آپ بھرنشہ" دور، ...نی متوسط ہند آریائی دور کی پراکرتوں کے موجودہ بھاشاؤں ...طرف مائل ہونے کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں ہند آریائی ...بولیوں کا اتنا کافی ادب ہم کو نہیں ملتا، کہ ہم ان کے تدریجی ...ارتقا، کا عمدگی سے مطالعہ کر سکیں۔ اردو کے تعلق سے تو ...مسئلہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی تشکیل میں ...ی ایک بولی کو دخل نہیں ہے، بلکہ اس زمانے کی ان ...م ہندوستانی بولیوں جیسے قدیم پنجابی پراکرت، ...ج بھاشا، بانگرو، راجستانی اور ہندایرانی زبان، ...رسی کا بھی حصہ ہے۔ ہند آریائی بولیوں میں اختلافات ...ہ ساتھ، مشابہتیں بھی اتنی ہیں کہ متعلم لسانیات ...ے لئے ہر قدم پر غلطی کا امکان ہے، اور جو رائے وہ قائم ...رے گا، اس کی رو سے ایسے نظریے بن جانے کا احتمال ...ہے، جن کے نتائج دور رس ثابت ہو سکتے ہیں۔

اردو زبان کی ابتدا کے مسئلہ پر پچھلے چند سال سے ...اردو کے بعض سنجیدہ محققین، سرگرم تحقیق ہیں اور اس کا ...تھوڑا بہت ادب بھی پیدا ہو چکا ہے، جو رسالوں کے چند ...مضامین اور ایک دو کتابوں پر بھی مشتمل ہے۔ جس میں "دکن میں اردو" "اردوئے قدیم" "پنجاب میں اردو ...ور" اردو شہ پارے" کے علاوہ "نقوش سلیمانی" اور ...رسالۂ اردو" کے وہ مضامین بھی شامل ہیں، جو اس ...موضوع پر، وقتاً فوقتاً شایع ہوئے ہیں۔ ان میں قدیم مخطوطات کی چھان بین کر کے اردو کے قدیم ترین ادب کو اکٹھا کرنے کی بیش بہا کوشش کی گئی ہے۔

اس سارے مواد کی، ہم کو یقیناً ضرورت ہے اور اب اس کے سامنے آجانے کے بعد، مواد کے مستند ہونے کی چھان بین اور مخطوطات کے متن کا لسانی مطالعہ کرنے کی بھی ضرورت ہے، جس کے بعد ہی ہم یہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو نے اپنی تشکیل میں کن کن بولیوں سے مدد لی اور کس جز کی حد تک، اور اس پر اپنا کیا اثر ڈالا۔ یہ کام ظاہر ہے کہ کسی ماہر لسانیات کا ہے اور یہ فن ہندوستان کے لئے ابھی نیا ہے۔ چنانچہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی اس کے عالم کم ہیں۔ ایسی تحقیق کے لئے، متعلقہ موجودہ زبانوں کے علاوہ، متوسط ہند آریائی زبانوں یعنی پراکرتوں اور قدیم ہند آریائی یعنی سنسکرت پر عبور حاصل کئے بغیر قدم اٹھانا دشوار ہے۔

حالیہ زمانے میں صرف تین کتابیں ایسی شایع ہوئی ہیں، جن میں اس مسئلہ تک صحیح فنی راستے سے پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتابیں "ہندوستانی لسانیات" "ہندوستانی صوتیات" اور "پنجاب میں اردو" ہیں۔ اول الذکر دو کتابیں، ٹھیٹ فنی ہیں اور آخر الذکر کتاب، گو تاریخی اور بیانی ہے، پھر بھی کسی حد تک فنی بحثوں پر بھی مشتمل ہے۔ ابھی ابھی ایک کتاب جامعہ کلکتہ کے مشہور پروفیسر لسانیات ڈاکٹر سنوتی کمار چیٹر جی کی "ہند آریائی زبانیں اور ہندی" کے نام سے شایع ہوئی ہے، جس کا تعلق زیادہ تر ہندی زبان کے مسائل سے ہے، تاہم اردو کے بعض پہلوؤں پر بھی، اس سے روشنی پڑ سکتی ہے، کیونکہ بنیادی طور پر ہندی کی قواعد اردو سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لیکن

مصنف کو، فارسی اور عربی سے، اتنی نفرت ہے کہ وہ ان دونوں زبانوں کی بنیادی شکل کے لئے عام پسند اصطلاح "ہندوستانی" سے بھی ناراض ہیں، کیونکہ انھیں اس میں فارسی کی بو آتی ہے، اس لئے وہ سنسکرت شکل کی "ہندستھانی" کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ فنی تحقیق میں، جب جذبات بھی شامل ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ ہم صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتے۔ اردو کا تصور، کم از کم، فارسی اجزا کے بغیر ناممکن ہے۔ فارسی جو ہند ایرانی کی بیٹی ہے، ہندوستان کی موجودہ ہند آریائی زبانوں کی سگی خالہ زاد بہن ہی تو ہوتی ہے،

موجودہ ہند آریائی زبانیں جیسے پنجابی، سندھی، گجراتی، مرہٹی، اودھی، بنگالی اور اردو، ان پراکرتوں کی بیٹیاں ہیں، جو آج سے تقریباً بارہ سو سال پہلے، آریائی ہندوستان یعنی دراوڑی حصوں کو چھوڑ کر سارے ملک میں رائج تھیں۔ پراکرتیں خود، قدیم ہند آریائی سے مشتق سمجھی جاتی ہیں، جس کی سب سے اہم یادگار، سنسکرت ہے۔ پراکرتوں کا دور ۶۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ء تک معین کیا جاتا ہے۔ اسی زمانے سے پراکرتوں کے اجزا بکھرنے لگے، اور صوتی اور صرف نحوی تبدیلیاں ہوتے ہوتے، خاص خاص علاقوں میں ان کی خاص خاص صورتیں بننے لگیں۔ زبانیں، زندہ جسد کی طرح، ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن ان کی تبدیلی، ان کی تعمیر کی طرح سیکڑوں سال میں چل کر محسوس ہوتی ہیں۔ زبانوں کی تبدیلی کے عام اصول، کفایتِ توانائی، سہولت اور آسانی ادا ہوتے ہیں۔

اردو زبان کا نقطۂ آغاز، مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا اور یہاں کی زبانوں سے اُن کا تعلق ہے۔ مسلمانوں کا سب سے پہلا قافلہ یہاں آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں پہنچا، گو ان کے اور خاص طور پر عربوں کے تعلقات، ہندوستان سے بہت قدیم ہیں۔

منظم طور پر، ساتویں صدی عیسوی [illegible] ہندوستان کی طرف رخ کرنا شروع کیا۔ ان کے اسباب سے متعلق کچھ کہنا بحث کو طول دینا ہے، لیکن [illegible] پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسباب، ان اسباب سے کچھ [illegible] نہیں تو برے بھی نہیں تھے، جنھوں نے [illegible] بہت پہلے، آریوں کو ہندوستان لانے پر مجبور کیا تھا۔ آریوں ہی کی طرح، یہ بھی مختلف اوقات اور مختلف گروہوں میں یہاں آئے۔ سب سے پہلا قافلہ [illegible] میں ملتان تک آ کر رک گیا تھا، اس کے تین چوتھائی صدی بعد، محمد بن قاسم کی ممتاز قیادت میں عراق اور ایران کے سرفروشوں کی ایک خاصی تعداد، سندھ میں آ کر مقیم ہو گئی اور ایک اسلامی نو آبادی یہاں بن گئی۔ اسلامی تہذیب اور شائستگی، عقائد اور اثر کا سب سے پہلا گہوارہ یہی تھا اور یہیں سے، ہندوستانی زبانیں بولنے والوں کا میل ملاپ، عربی اور فارسی بولنے والوں کے ساتھ شروع ہوا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسی کے عربی نام پر، سارے ملک کا نام "ہند"، اور یہاں کی زبانوں کے لئے، "ہندی" کا نام مخصوص ہو گیا، جو آج ملک کی عظمت کا نشان بن گیا ہے۔

اس وقت، ہندوستان کی، ہند آریائی زبانیں اپنے ارتقا کے دوسرے دور، یعنی پراکرتوں کی حالت میں تھیں، جس کا نقشہ یہ تھا کہ پنجاب، سندھ اور گجرات میں، جو زبانیں رائج تھیں، وہ ایک پراکرت سے تعلق رکھتی تھیں، جس کو بعض وقت بیرونی دائرے کی بولی سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ مہاراشٹر علاقے میں اس پراکرت کا نام "مہاراشٹری" تھا، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ، قدیم ہند آریائی کے حروفِ صحیح کے ساتھ اس کا سلوک کسی قدر بے دردانہ تھا، چنانچہ سنسکرت کے الفاظ، "پریا"، "راجا"، "کوکیلا"، کی شکل، اس میں "پیا"، "رایا"، (جس سے بعد کا رائے مشتق ہے)

اور "کو [illegible] ہے۔ مشرقی پنجاب اور صوبۂ متحدہ [illegible] تھا، جو سب سے اہم پراکرت [illegible] اور اس میں اُردو، اگرمی اور [illegible] میں ناگرمی رائج تھی۔ راجستان کے [illegible] پراکرت مروج تھی، جسے کچھ آدمی [illegible] وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ماہرینِ لسانیات کا کہنا ہے کہ "اس وقت یہ پراکرتیں، اور خاص طور پر شورسینی، پراکرت کے پنجہ سے [illegible] آپ بھرنشہ" یعنی مسخ ہو رہی تھی۔ اس سے جو زبانیں بنیں وہ برج بھاکا، بانگرو، بندیلی، قنوجی اور ہندستانی کہلاتی ہیں۔ راجستان کی پراکرت سے موجودہ مالوی، میواتی، مارواڑی اور گجراتی بولیاں پیدا ہوئیں۔

ان تمام بولیوں کی تشکیل کا آغاز ۱۰۰۰ء کے قریب ہوتا ہے اور یہ زمانہ محمود غزنوی کی فتح پنجاب سے کم و بیش مطابقت رکھتا ہے، اس وقت تک مسلمانوں کو ہندوستان میں بسے ہوئے تین صدی کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اردو کے اولین آثار، جو ہم کو دستیاب ہوئے ہیں، وہ اس کے دو سو سال بعد کے ہیں۔ گویا اس زبان کو تشکیل پاتے پاتے پانچ سو سال کا عرصہ لگ گیا۔ یہی زبانوں کی تشکیل اور ارتقا میں فطرتاً ہوتا ہے۔ اردو ہی کی طرح بدوش دوسری جدید ہند آریائی زبانیں بھی تشکیلی دور سے گزر رہی تھیں، چنانچہ ان کے اولین ادبی آثار بھی، بارھویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی عیسوی تک کے زمانہ پر حاوی ہیں اور سب سے پہلے نمونے جو ہم کو ملتے ہیں، وہ اردو ہی کے ہیں۔

محمود غزنوی اور اس کے جانشین مسعود کے زمانے میں، اردو کی پُرامن تشکیل کے لئے مواقع فراہم ہوگئے تھے، چنانچہ اس زمانے تک اس کو یہ حیثیت حاصل ہو چکی تھی کہ وہ ایک مستقل زبان سمجھی جانے لگی تھی اور نہ صرف فارسی، بلکہ عربی کو بھی وہ متاثر کرنے لگی تھی۔ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں اس کے الفاظ راہ پانے لگے تھے، چنانچہ کافور (کپور) انبج (آنب) صندل (چندن) قرنفل (کرن پھول) معرّب ہندوستانی الفاظ ہیں اور کوتوال، روئج، پانی، مور، توتا، رتی، ماشہ غرض بیسیوں اردو الفاظ، فارسی میں داخل ہوگئے تھے۔ کوتوال جو دراصل "کوٹ + وال" یعنی قلعہ والا یا قلعہ کا نگہبان ہے، فردوسی جیسے مستند فارسی شاعر کے کلام میں بھی ملتا ہے۔

یہی زبان تھی جس کو ساتھ لے کر مسلمان دہلی پہنچے تھے۔ اس سرزمین کی بولیوں نے اردو زبان کے ارتقاء کی دو اہم [illegible] پر اثر ڈالا۔ ایک تو اس موقع پر جب وہ ایک [illegible] کی صورت میں پنجاب سے ابھی ابھی آئی تھی۔ دوسرے، اٹھارویں صدی کے وسط میں، جب اس کی چار سو سالہ پہلے کی شکل دکن سے یہاں پہنچی تھی۔

دہلی دراصل چار بولیوں کا نقطۂ اتصال ہے۔ مشرقی پنجابی، برج بھاشا، اور راجستانی وہ بولیاں "او" یا "وہ" [illegible] گروہ کی زبانیں کہلاتی ہیں۔ یعنی ان کے اسما، صفات اور افعال کی آخری علامت "او" یا "او" ہوتی ہے۔ جیسے "میرا بیٹا آیا" کی صورت، ان زبانوں میں "میرو بیٹو آیو" ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں بانگرو اور راجستانی میں یہی صورت، میرا بیٹا یا پُت یا پُترّ آئیا، ہوتی ہے۔ ان لسانی صورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے، ظاہر ہے کہ وہ پرانا مقبول نظریہ جو اردو کا نشوونما برج بھاشا سے کرتا تھا، معلق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب بعض ماہرینِ لسانیات جیسے پروفیسر چٹرجی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے لسانی شہادتوں سے اس کو پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ہے۔ مثال کے طور پر اردو کے چند مروّجہ الفاظ جیسے

"سچ" "کل" "رتی" پیش کئے جا سکتے ہیں، جن کی شکل پنجابی ہے۔ مغربی ہندی میں یہ شکلیں ساچ، کال، رائی وغیرہ ہوتیں۔

اردو کے نشو و نما کے سلسلے میں برج بھاشا کا جو نام لیا جاتا تھا، اس کا دراصل ایک سبب تھا۔ اس نئی زبان کے نشو و نما پانے سے پہلے مغربی ہندی کی شاخوں میں یہی ایک بولی، گیتوں اور نظموں کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ دہلی کے بعض مسلمان شعرا، جیسے کتا نخانان اور رس خان، وغیرہ نے بھی اس کو استعمال کیا تھا۔ اس لئے دہلی کے بعد کے دور میں، اس پر کچھ اثر برج بھاشا کا بھی مشاہدہ کیا گیا تو بعض مصنفین نے جن میں میرامن اور آزاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس کے ڈانڈے برج بھاشا سے ملا دئے۔

اردو کو تشکیل دینے میں پراکرت یا اپبھرنشہ سے عام مسلمانوں کی ناواقفیت نے جو آسان طریقے اختیار کئے وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ زبانوں کو صرف نحو کے پیچیدہ اصولوں کے خلاف اپنی سہولت کے مطابق استعمال کرنا شروع کردیا تھا جس کی وجہ سے صیغے، حالتیں، تعداد اور جنس کی علامتیں سب خلط ملط ہوگئیں۔ اس کی ایک مثال موجودہ اردو کی حالت فاعلی ہے، جو دراصل اگلی زبانوں میں حالت واسطہ تھی۔ جس کی وجہ سے اردو جملوں کی ساخت، متعدی افعال کے ساتھ مجہول ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اردو کے جملے "میں نے روٹی کھائی" کا لفظی ترجمہ اگر ہم انگریزی میں کریں تو ......By me the bread was eaten ہوگا۔ الفاظ کی پراکرت صورت کی تبدیلیوں کی مثالیں بے شمار ہیں۔ مثلاً "آگی" کو آگ "اردھا" کو ادّھا یا آدھا "کنکلا" کو کنگال، "اکادیس" کو "گیارہ"، "کبھا" کو "کوبڑا" "اکھی" کو انکھی اور پھر آنکھ وغیرہ کر لیتے تھے۔ پراکرت کے مرکب فعل کی تمام خصوصیات کو ظاہر کرنے کے لئے جس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر لئے جاتے تھے، وہ بھی بڑی دلچسپ چیز ہے۔ مثلاً "پالیتی" پالی پراکرت کا فعل ہے جس کے معنی "وہ پالتا ہے" کے ہیں۔ اس میں "پال" مصدر کو باقی رکھ کر صیغے اور زمانے کے لئے "وہ" "تا" اور "ہے" کے ٹکڑے جا لئے گئے ہیں۔ یہ زبان کو آسان بنانے کا وہ عجیب و غریب عمل ہے جس کے سبب اردو دنیا کی سب سے زیادہ تجزیاتی یعنی (Analytic) زبانوں میں شامل ہوگئی ہے۔ فارسی اور عربی کے جو الفاظ انھیں استعمال کرنے پڑتے تھے، ان سے فعل بنانے کا آسان ترین طریقہ بھی انھوں نے اختیار کرلیا تھا، اور وہ اس طرح کہ لفظ جو عموماً اسم ہوتا تھا اس کے بعد "کرنا" بڑھا لیتے تھے جیسے "صاف کرنا" "دق کرنا" "شرمندہ کرنا" "جنگ کرنا" وغیرہ اس کو کبھی کبھی اور بھی آسان کرکے ہندی اسماء پر بھی حاوی کرلیا گیا جیسے "کھوجنا" "لڑنا" "جھگڑنا" وغیرہ "تجویزنا" اور دوسرے اس قسم کے افعال کی بھی یہی صورت ہے۔ اسی کے نمونے پر جامعہ عثمانیہ نے "برقانا" وغیرہ کے طریقے کو علمی زبان میں رائج کیا ہے۔ اردو (اور ہندی کے بھی) اس طرز عمل پر ابھی تک توجہ نہیں کی گئی۔ زبانوں کی تشکیل میں مثال یا مشابہت بڑا عمل کرتی ہے۔ ایسے تمام افعال بنانے کے لئے ان کے پاس فارسی کے نمونے "صاف کردن" "تجویز کردن" "جنگ کردن" وغیرہ موجود تھے۔ یہ تسہیل و ترکیب ہندوستانی زبانوں کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، جس کے سبب، اس کو دوسری زبانوں پر فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔

اردو اور ہندی کے موجودہ ارتقاء میں عربی، فارسی رسم خط کو بھی بڑا دخل ہے۔ چنانچہ

اس کی وجہ سے ایک طرف بعض ضروری آوازوں جیسے "ز" "ژ" "ت" کے ادا کرنے کے ذریعے جذب کئے، دوسری طرف سنسکرت کے اصول کے مطابق ہر لفظ کے آخری حرف میں جو ایک مختصر "آ" یا "ی" کی آواز پوشیدہ رہتی ہے، وہ فارسی میں علامت نہ ہونے کی وجہ سے ترک کر دی گئی اور لفظ فارسی اصول کے مطابق ساکن بن گیا جیسے "پدٔ" سے "پد"، "مگٔ" سے "مگ"، "پھلٔ" سے "پھل" وغیرہ۔

سب سے آخری بات یہ ہے کہ، قدیم زمانے سے ہندوستان کے علمی اجارہ داروں نے سنسکرت کے سوا کبھی کسی عوام کی زبان کو منہ نہیں لگایا، پالی کا نشو و نما دراصل اسی علمی اور مذہبی اجارہ داری کے خلاف ایک تحریک تھی، جس کا ہندوستان میں جو حشر ہوا، ہمارے سامنے ہے، اس کے علاوہ عوام کی زبانوں کی سرپرستی کے ثبوت بہت کم ملتے ہیں۔ اسی دباؤ کا اثر تھا کہ ہندوستان کے مصنفین، جب جدید زبانوں میں لکھنے بیٹھتے تو مجبوراً قدیم شکلوں اور طرز کی طرف مائل ہو جاتے تھے، اس عادت کو بیمس نے اس طرح ظاہر کیا ہے کہ "ہندوستانی مصنف جب لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ غیر فطری بن جاتا ہے۔ اور اس بات کا اعتراف تمام ماہرین لسانیات کو ہے"۔

لیکن مسلمان بادشاہوں نے، جب عوام کی زبانوں کی سرپرستی شروع کی تو چند سال کے اندر اندر ساری جدید زبانوں میں تصنیف و تالیف کے شوق کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ چنانچہ اودھی میں "پدماوت" اور "راماین" بنگالی میں "راماین" اور "ویدوں" کے ترجمے، راجستانی، گجراتی اور مرہٹی میں میرا بائی، پدمانا اور اکناتھ جیسے عظیم الشان شعرا اور مصنفین اٹھنے لگے۔ یہ ذہنی انقلاب سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا، جس نے سنسکرت اور دوسری جدید زبانوں کی سرپرستی کی اور معتبر شعرا، جیسے مسعود سعد سلمان، امیر خسرو، عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ سب نے عوام کی زبانوں میں لکھنا شروع کیا۔ اس تحریک سے ہندو مذہبی رہنماؤں نے بھی فائدہ اٹھایا، اور عوام تک پہنچانے کے لیے مذہبی ادب کو جلد جلد، عوام ہی کی زبانوں میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اس طرح، اردو، جدید ہند آریائی زبانوں کے نشو و نما کا بھی براہِ راست باعث ہوئی۔

عبدالقادر سروری

چرواہے

وہ بانکے ترچھے چرواہے یوں پھرتے ہیں میدانوں میں
جیسے رنگیلی تیتریاں منڈلاتی ہیں بستانوں میں
کہساروں میں لہراتے ہیں دَرّاتے ہیں ویرانوں میں
موسم کے ارادے تولتے ہیں پُروائی کی میزانوں میں
انگور کی لذّت پاتے ہیں مکئی کے جھکتے دانوں میں
دن بھر کی تھکی ہاری چڑیاں جب آتی ہیں کاشانوں میں
یہ اپنا جی بہلاتے ہیں! پریوں کے حسیں افسانوں میں
صدیوں سے اجڈ کہلاتے ہیں فیشن کے غلام انسانوں میں
لیکن یہ اِن سے بڑھ کر ہیں مضبوط اپنے ایمانوں میں
رکھتے نہیں اپنی مورتیاں تہذیبوں کے بت خانوں میں
تاریخ مرتب کرتے ہیں کھیتوں میں اور کھلیانوں میں

جب تک یہ گڈریے جیتے ہیں
گیتی کے گریباں سیتے ہیں

احمد ندیم قاسمی

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر ہے پیارے ہنوز دلّی دور

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد ہی سے کالج کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ ابھی نتیجہ بھی تو نہ نکلا تھا۔ جانے کیوں؟ کالج کے نام سے ایک خوشگوار کپکپی سی ہوتی تھی۔ جیسے ملیریا کا بخار چڑھ رہا ہو۔ جو ذرا جاڑا سا ہوتا۔ لیکن ایک لطف سا محسوس ہوتا۔ ہر روز سوچتی تھی کہ آخر کونسا مضمون لینا میرے لئے بہتر ہوگا۔

سائنس ــــ اونہوں ــــ کیا کروں گی سائنس لے کر۔ کونسے تیر مارنے ہیں۔ کونسی ایجاد کرنی ہے۔ ہم سلنڈر مشین گن بنانی ہے۔ آخر یہ کونسی مصیبت ــ ــ گھریلو زندگی کی سائنس ہی ہم ہندوستانی لڑکیوں کو آجائے تو کافی ہے۔ ایک ردی ٹھیک طور سے ڈالنی تو آتی نہیں اور چلے شان بگھارنے سائنس میں بھی تو کئی شعبے تھے۔ ایک شعبہ تھا نباتیات۔ آہاہ نباتیات دی تھی۔ ان کو چھٹیوں میں دیکھتی تھی۔ پتہ پتہ پھول پھول کسی چیز کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں۔ میں بار لگا کر تی ہیں۔ وہ نوچ نوچ کر مجھے زردہ کرتی تھیں۔ پوچھتی تو جواب ملتا۔ ارے ہم کو اس پھولوں میں کچھ ریسرچ کرنی ہے۔ ۔ جانے یہ ریسرچ کیا بلا ہوتی ہے۔ کون جانے یہ سب۔

لیکن میں نے بعض نباتیات لینے والے بی۔ ایس سی کے گھر دیکھے تھے۔ اجاڑ سے پڑے تھے۔ نہ درخت نہ گملے! نہ بیل نہ بوٹے!! باغ تو بڑی چیز ہے!!! میں سوچتی تھی! یہ لوگ کیوں قینچی شیخی کو کوئی ایسا مضمون لے بیٹھے ہیں؟ جس میں سلیقہ سے اپنی کارگزاری بتا بھی نہیں سکتے ــــ میں نے باغ میں کچھ سبزی لگائی تھی۔ میرے پودوں میں چیونٹیاں لگ رہی تھیں۔ بڑا افسوس ہوتا تھا اپنی محنت اور شوق کی چیزیں یوں ویران ہوتیں دیکھ کر۔ نباتیات کے ایک پروفیسر سے پوچھا کہ بتایئے کیا علاج کروں ان کے دفیعہ کا؟ آخر آپ لوگوں نے کچھ تحقیق کی ہوگی! ــ وہ بہ آپ توں سے ہو گئے۔ کچھ بھی تو نہ بتا سکے۔ کہہ دیا مجھے باغ داغ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور نہ کبھی ان خرافات کی تحقیق کی ہے۔ کتنی بدمذاقی ہے اس جواب میں ــــ! افسوس!! بہت سی آرزوئیں خاک میں مل گئیں ــ

حیوانیات سے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ اس شعبہ سے بھی ایک بدگمانی سی تھی۔ سنا مینڈک چیرنی ہوتی ہے۔ تمام وقت بدبو میں دن گزارنا ہوتا ہے۔ میں تو بڑی بددماغ ہوں۔ بدبو کی ذرا برداشت نہیں۔ نانی شاہ کا دماغ ہے اس حیثیت سے۔ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتی۔ یہ سب کیونکر سہہ لوں گی۔ ڈاکٹری کا بھی خیال تھا۔ مگر اس پیشہ سے بھی بدظنی تھی۔ ڈاکٹر جتنی صفائی کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں اتنے ہی غلاظت میں گھرے رہتے ہیں۔

پھر ایک لہر آئی کہ نہیں جی انٹر میں تاریخ لیں گے۔ یہ کیسی رہے گی۔ پھر سوچتی کہ یہ تو وہی لے سکتا ہے جس کا دماغ رٹو قسم کا ہوتا ہے۔ جس کا حافظہ زبردست ہے۔ جس کو برسوں کی باتیں یاد رہتی ہیں۔ مجھے تو اپنی تاریخ پیدائش بھی یاد نہیں رہتی۔ اپنی بے ہنگام زندگی کا کوئی اہم سے اہم واقعہ بھی بھول بھول جاتی ہوں ــ بس مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا۔

پھر آخر یوں کیا سر اپنا ــــ اب شعبۂ فنون کے دوسرے پہلو کو سوچتی کہ اردو، فارسی اچھی رہے گی۔ یا اردو کے ساتھ کوئی اچھا سا مضمون اور لے لوں گی۔ اپنی زبان ہے۔ اس پر ہی قدرت آجائے۔ مگر یہ اردو کے ساتھ ہندی بھی ضروری ہے۔ یہ ہندی کیا ہوتی ہے؟ ہاں ع گوگرد راہ ہے گر آندھی کے ساتھ ہے۔

سیکھ لوں گی۔ کیا ہوا ایک نئی زبان تو آجائے گی۔ کیا حرج ہے۔ ہندی میں ایک لوچ اور شیرینی ہے۔ بڑی پیاری زبان ہوتی ہے۔ غرض یہ جاگتے خواب دیکھتی ہوئی سو گئی ــ اب سپنوں میں دیکھئے کون آتا ہے۔ میں خواب ہی میں میٹرک کامیاب ہوگئی ہوں اور کالج کھلنے کی دھن ہے۔ ہر ایک سے پوچھتی تھی کہ کالج کب کھلے گا یہ اتنی لمبی لمبی چھٹیاں کیوں ہوتی ہیں؟ غرض بڑی بے چینی سے منتظر تھی کہ کالج کھلے اور میں جلد اپنی منزلِ مقصود پر گامزن ہو جاؤں۔ مگر کہاں۔ وہ تو کھلتا ہی نہ تھا۔ انتظار میں بھی کتنی تلخ لذت ملتی ہے۔ یہ تو کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔ جوں جوں وہ مبارک دن قریب ہونے لگا میری امیدیں سر اٹھانے لگیں۔ میں نے بہت سی اوڑھنیاں رنگ برنگ کی رنگ لیں کہ شاید پھر فرصت نہ ملے۔ اس رنگ کی چوڑیاں لیں۔ جو ان دوپٹوں کو "میچ" کر سکیں۔ امّی سے کہہ کر نئے نئے سینڈل خریدے۔ بھیا سے کہہ کر ایک اچھا سا فونٹن پن لیا۔ نوٹس جو لکھنے ہوتے ہیں۔ غرض کالج کھلا۔ اور ہم داخل گیٹ ہوئے۔

بھانت بھانت کی لڑکیاں۔ کالج کا صحن ان رنگا رنگ بوقلمونیوں سے ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دھنک پھیل گئی ہے سارے صحن میں ـــــ پہلا دن کھیلتے۔ باتیں کرتے ہی گزر گیا۔ یہ سوچتے۔ وہ پوچھتے۔ یوں تیوں شام ہوئی۔ ہم گھر لوٹے۔ نئے سائل کو بھیک کی جلدی ہوتی ہے۔ ہمیں بھی اپنی کلاس دیکھنے، اپنی لکچرار دیکھنے کا ایک مجنونانہ اشتیاق تھا۔ ہم نے فارم بھرے اور داخل کر دیئے۔ ایک ہفتہ تک جبیں سائی کی۔ خدا خدا کرکے وہ دن آیا کہ ہم تو واردِ مشتاقانِ علم کا انٹرویو ہوا۔ صحن کالج سے آفس تک ایک "کیو" بن گئی تھی۔ جگہ جگہ کی لڑکیاں، قسم قسم کی صورتیں، کبھی اتنے سب کو یکجا دیکھنے کا ــ اور پھر ایک ہی غرض کے لئے، کاہے کو اتفاق ہوا تھا۔ کالج بندھن ایک بکھرے شیرازہ کو سمیٹ کر ایک کر دیتا ہے۔ کسی کی صورت پسند آئی کسی کے لباس کا سلیقہ، کسی کے بال، کسی کی آنکھیں، اخلاق اور فطرت کا تو پتہ کیسے چلے، پہلی نظر میں۔ دن مہینے اور سال لگ جاتے ہیں بعض وقت تو جب اخلاق کے جوہر کھلتے ہیں۔ بہت سے حسین دیکھے تھے۔ گھر مل کر رہنے کے بعد بڑا ہی تلخ تجربہ ہوا۔ حسن دھوکا ہے۔ غرض ان خیالات کے آتے ہی فلاسفی کا خیال آیا۔ بہتر ہوگا اگر فلسفہ لے لوں ـــــ یہ دنیا یوں ہی آنکھوں سے اتر گئی ہے۔ اب اور بھی اتر جائے تو کیا اچھا ہو ـــــ

انٹرویو کے بعد ـــ ہم اپنی اپنی کلاس میں بھجوائے گئے۔ لکچرار صاحبہ آئیں۔ ہم منچلوں نے دبی زبان میں گنگنایا ؎

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

انھوں نے نام پوچھے۔ اختیاری مضامین سے متعلق سوالات کئے۔ کالج کیسے پسند آیا؟ کون سے اسکول کی ہو وغیرہ وغیرہ ـــ ہم کو لکچر سننے کی جتنی عجلت تھی ان کو دینے کی نہ تھی۔ دینے والے اپنی چیزیں کتنے تکلف سے نہیں بلکہ چونچلوں سے دیتے ہیں۔ اے خدا سمجھے ان سے ـــ

خیر۔ گھنٹہ ختم ہوا۔ دوسری لکچرار آئیں۔ انھوں نے بھی کچھ اسی سے ملتے جلتے سوال کئے۔ خود کو روشناس کیا اور یہ کہہ کر کہ آج موسم کتنا اچھا ہے، پڑھانے کا موڈ نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی ہمارا پڑھنے کا موڈ بھی یہ جا اور وہ جا ــ سرد پڑ گیا۔

ہم نے امتحان کے بعد بہت دن بے کاری میں گزارے تھے۔ پڑھنے اور نئے نئے لکچر سننے کے

افلاس جیسے ہو گئے تھے ۔ علم کی پیاس بھی کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے ۔ لیکن جب ہمارا ساقی ہی بخیل ہو تو ہم کیا پا سکتے ہیں ۔ کسی نے کہا پہلے چند روز تک پڑھانے کو طبیعت نہیں چاہتی ۔ کسی نے فتویٰ دیا، بیکار رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے ۔ اب ایکدم سے کام کرنے کو کس کا جی چاہے گا ۔ چلئے یہ سلسلہ بھی چار چھ روز قائم رہا ۔ اس کے بعد تو پڑھائی باقاعدہ ہونے لگی ۔ یہ تعبیر ہے میرے سپنوں کی

آپ اپنی کہانی لکھ رہی ہیں؟

ارے نہیں! یہ تو خواب تھا ۔

نہیں بلکہ ـــ

کبھی غم تھا کبھی احساسِ غم تھا اور کبھی دونوں
محبت میں گزاری سو طرح سے زندگی ہم نے

جہاں بانو بیگم

نویدِ امن

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
ہوائے سازگار ہے
فضائے کیف بار ہے
بہار لالہ کار ہے
نگاہ بادہ خوار ہے

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
روش روش، چمن چمن
کھلے ہوئے ہیں یاسمن
جوانیوں کی ہے پھبن
حیاتِ نو ہے نغمہ زن

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
نوید امن کی ملی
جہاں کو زندگی ملی
سکوں ملا خوشی ملی
گلوں کو تازگی ملی

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
گھٹائیں جھوم کر اٹھیں
اٹھا بھی جام ہمنشیں
پلا شرابِ آتشیں
سنا سرودِ دل نشیں

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
نہیں ہیں غم کی بدلیاں
وہ جنگ کی تباہیاں
تباہ کن لڑائیاں
اداس ہولناکیاں

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
جہاں کو اک قرار ہے
خوشی سے ہم کنار ہے
قدم قدم بہار ہے
کہ فضل کردگار ہے

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے

مظفر الدین ظفر

ایثار

جس وقت کسی شخص کو چاروں طرف سے مصیبتیں آگھیرتی ہیں تو اکثر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ بے خود سا ہو جاتا ہے اور اس کے دل و دماغ کی ساری قوتیں جواب دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، لیکن ایسے میں عورت کا عالم بالکلیہ جداگانہ ہوتا ہے۔ زندگی کے ناپیدا کنار سمندر میں اس کی کشتیٔ حیات ہچکولے کھاتی ہے اور آلام و مصائب کے قیامت خیز طوفان کی نذر ہونے لگتی ہے، آسمان کو چومنے والی سمندر کی موجیں اس کی زندگی کا شیرازہ بکھیر دینے کے لئے اس کی طرف بڑھتی ہیں، مگر اس کی پیشانی پر شکنیں تک نہیں آتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مرد ریت کے ذرّوں سے تیل نکال سکتا ہے، شراب کو پانی بنا سکتا ہے، مگر اس زندگی میں ایک عورت کے صبر و استقلال ضبط و تحمل کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ مصیبتیں جو مرد کی کمر کو دہرا کر ڈالتی ہیں، عورت ان کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے۔ مگر افسوس! کہ دنیا عورت کو جسم بے روح تصور کرتی ہے حالانکہ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ صنف نازک نے قوموں کی تقدیریں زیر و زبر کر دیں، حکومتوں کے تختے الٹ پلٹ کر ڈالے، دہر میں ایک ہل چل پیدا کر دی۔ ساتھ ہی مرد کو زندگیٔ جاوید بخشی، اس کی ہمدرد و غمخوار بنی۔ اس کی مصیبتوں میں ہاتھ بٹایا، اور اس طرح اس کی مقدر کی تاریکیوں کو اپنی ان تھک محنت و کوشش سے چکا چوند کر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کا سکونِ قلب بنا کر اس جہان فانی میں تخلیق فرمایا ہے کہ وہ اس وقت جب کہ مرد کی ہمت جواب دے چکی ہو، اس کے حوصلوں پر پانی پھر چکا ہو، ناکامیوں، نامرادیوں کے گھٹا ٹوپ بادل اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہوں، تو وہ نور بن کر، اس کے قلب کا سرور بن کر اس میں روح تازہ کی تخلیق کرے، وہ ہمت اور وہ حوصلہ بخشے جس سے اس میں آگے بڑھنے کی طاقت پیدا ہو جائے، حیاتِ مستعار کی ساری کلفتیں اطمینانِ قلب سے مبدّل ہو جائیں، امن اور چین اس کا رفیق ہو، عورت جس کی شفیق ہو .... غرض یہ مشاہدات ایک ایسے درد بھرے واقعہ کو تازہ کرتے ہیں جو اپنے اندر ایک داستان چھپائے ہوئے ہے،

انگلستان میں لیزلی نامی امیر گھرانے کا ایک شخص تھا، پشتوں سے دولت گھر میں چلی آتی تھی، قسمت کا ایسا دھنی تھا کہ مٹی پر ہاتھ پھیرتا سونا ہو جاتا، طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ دولت نے اسے کبھی راہِ انکساری و راستی سے نہ ہٹایا اور خوشامدی مصاحبوں کی چکنی چپڑی باتوں نے کبھی اس کا دماغ خراب نہ کیا، یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک اوسط درجہ کے شریف گھرانے کی ایک حسین لڑکی میری نامی سے شادی کی، میری کے بھاگ جاگ گئے اور سوسائٹی میں اس کے حسن اور خوش مزاجی کے چرچے ہونے لگے۔ ایک طرف دولتِ بے اندازہ، طرفِ دیگر محبتِ بے پناہ۔ اس پر لطف یہ کہ طبیعتیں جدا جدا، مشرق و مغرب کا فرق۔ ایک طرف سنجیدگی و متانت کا دَور دَورہ تو ایک جانب ظرافت و زندہ دلی کا راج۔ مگر کیا مجال جو دلوں میں بال برابر بھی فرق آیا ہو، لیزلی کی یہ آرزو کہ اس کے پاس جو کچھ مال و متاع ہے وہ بیوی کی نت نئی خواہشوں کی نذر ہو جائے اور میری کی یہ تمنا کہ اپنے شوہر کو مسرور و محفوظ رکھنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھے۔ پھر ایک دو روز نہیں، برسوں ان دونوں کی زندگی اسی طرح مہر و وفا اور ایک دوسرے کی رفاقت و محبت میں بسر ہوئی۔ دونوں کی رفتار سے کون بے خبر ہے؟ صبح شام اور شام صبح کچھ اس قدر تیزی سے آپس میں بدلے سدلے کا پتہ تک نہ چل سکا کہ کب صبح ہوئی اور کب شام، ایک دوسرے کی محبت میں سرشار، زندگی کی منزلیں طے کرتے ہوئے

چل رہے تھے اور یونہی چلتے رہتے اگر گردشِ روزگار ان کے درمیان حائل نہ ہوتی۔ فلک کینہ پرور اور تقدیر بے پیر کو میاں بیوی کا چین، سکھ ایک آنکھ نہ بھایا۔ ان پر ایک بلائے ناگہانی ٹوٹ پڑی، وقت نے پلٹا کھایا اور ایسا کہ لیبزلی کو دن ہی میں تارے نظر آنے لگے۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ اس نے ایک کاروبار شروع کیا تھا اور نفع کی امید پر اپنی دولت کا ایک کثیر حصہ صرف کر ڈالا، رنگ میں بھنگ، پھول میں کانٹا، خوشی میں غم کی چاشنی۔ ان چیزوں کا کچھ ازل ہی سے ساتھ چلا آیا ہے اور پھر دولت کا حال تو چلتی پھرتی چھاؤں کا سا ہے...... چنانچہ یہی حشر لیبزلی کا ہوا کہ ایک تو ناتجربہ کاری، دوسرے تقدیر کی ناسازگاری دیکھتے دیکھتے وہ شخص...... وہ شخص روپیہ جس کے ہاتھوں میں کھیلتا تھا پیسہ پیسہ پر نظر رکھنے پر مجبور ہوگیا اور وہ سرمایہ جس سے صدہا امیدیں وابستہ تھیں منٹوں میں ہاتھ سے جاتا رہا، نقصان ہوا جس سے لیبزلی کا صبر و شکیب جاتا رہا۔ چند روز تو اس نے کوشش کی کہ کسی طرح یہ حال اپنی مشفق بیوی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ لیکن آخر کب تک...... اس کی خاموشی، اس کے چہرے کی بے چینی بیوی کی نگاہوں سے کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی؟ اس نے فوراً تاڑ لیا کہ ہو نہ ہو لیبزلی پر آفتِ ناگہانی کا آسمان ٹوٹ پڑا ہے، لیکن وہ چاہتی تھی کہ لیبزلی خود ہی انکشافِ حال کرے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، گردشِ روزگار کا دھارا ضبط کے بندوں کو توڑ کر بہہ نکلا اور وہ لیبزلی جس نے اپنے احوال کے چھپانے کے ہزاروں جتن کیے تھے، اپنی بیوی کو ہمراز بنانے پر مجبور ہوا، حالات نے اسے مجبور کیا کہ کوئی اس کا غمخوار ہو، کوئی اس کا شفیق ہو، کوئی ہو جو اس کی مصیبتوں میں شریک ہو لیکن پھر رہ رہ کر یہ خیال ستاتا تھا کہ کہیں اس کی ناداری...... اس کی چہیتی بیوی کو بیگانہ نہ کر ڈالے اور کہیں وہ ذات جو اس کے قلب کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اس سے کنارہ کشی نہ کر بیٹھے۔ بے چین ہو ہو جاتا جب اسے خیال آتا کہ کہیں اس کا اظہارِ حال بیوی کے لبوں کی دلفریب مسکراہٹ اس کے دل خوش کن نغمات اور اس کی آنکھوں کی مستانہ جھلک اس سے چھین نہ لے...... مگر ایسے حالات آ ہی پہنچے جب کہ اس کے دل پر اندھیاری گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، مستقبل کی مصیبتیں ایک ڈراونا اور بھیانک منظر پیش کر رہی تھیں اور لیبزلی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا اپنی ماضی کی زندگی میں گردش کر رہا تھا، اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی کہ اتنے میں اس کی بیوی رحمت بن کر سامنے آ کھڑی ہوئی، لیبزلی گویا ایک خواب سے چونک پڑا، بیوی کی طرف دیکھا جس کے معصوم چہرے اور دلکش نگاہوں سے محبت و وفا ٹپکی پڑتی تھی، دونوں خاموش تھے۔

لیبزلی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ اپنے نورانی وجود سے اس کے دل کے ظلمت کدہ کو سکون و اطمینان کے نور سے منور کر رہی ہے، تھوڑی دیر تک کمرہ میں خاموشی چھا گئی، لیبزلی کو ایکبار چند لمحوں کے لئے پھر انھیں خیالات نے آگھیرا جو اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے، اس نے نگاہیں نیچی کر لیں، اس کے چہرہ پر مردنی سی چھا گئی، وہ سوچنے لگا بھلا کیسے یہ حسن و عیش کی دیوی مفلسی و ناداری کی ناقابلِ برداشت مصیبتیں جھیل سکے گی، کس طرح وہ عیش و آرام کی زندگی کو مصائب و آلام پر قربان کر سکے گی؟ لیبزلی انھیں خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ بیوی کی آواز نے اس کی ایک ایک گتھی سلجھا دی، آنکھ اٹھائی تو بیوی کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے تھا جو اس سے اس کی پریشانیوں کی کنہ پوچھ رہا تھا، اس نے اس وقت اپنے آپ میں ایک نئی طاقت محسوس کی اور وقت کی موزونیت سے فائدہ اٹھا کر صاف صاف الفاظ میں اپنی غم آلود زندگی کے

انقلاب کا حال کہہ سنایا، میری نے بلا چون وچرا سب سنا۔ لیبزلی اب نتیجہ کا منتظر تھا...... وہ عورت جس نے مدتوں تک زمانہ کی تلخیوں کا ایک گھونٹ نہ چکھا ہو، جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مسرتوں اور خوشیوں کی نذر ہوا ہو، گوش ہوش سے اپنی تقدیر کا فیصلہ اپنے شوہر کی زبانی سنا اور مسکرانے لگی۔ لیبزلی منتجر نگاہوں سے میری کو دیکھنے لگا جو زبانِ حال سے کہہ رہی تھی، قلبی محبت کو اس دولتِ فانی سے کیا نسبت ہے، میں تمہاری ہوں، تمہاری رہوں گی...... یہ بول نہیں تھے امرت پارے تھے، لیبزلی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے اپنی ساری کھوئی ہوئی دولت پائی"، اسے گویا قارون کا خزانہ ہاتھ آگیا۔ میری کے ان الفاظ نے اس میں حیاتِ نو کی تخلیق کی اور غیر فانی محبت کا پیام دیا، بیم و رجا کے پردے اس کی نگاہوں سے اتار پھینکے اور اس مقام پر پہنچایا جہاں وہ بڑی سی بڑی مصیبت اور بڑے سے بڑے رنج وغم کے مقابلہ کے لئے تیار تھا، اس کے دل پر خوشی کا راج تھا اور وہ اپنی رفیقِ حیات کے ہمراہ مفلسی و ناداری کی بھیانک وادیوں پر گلگشت کرنے پر آمادہ تھا...... کیا یہ روح اس میں عورت ہی کی پھونکی ہوئی نہ تھی؟

منیزہ بانو کاؤس جی

محبت کی چھاؤں ۔مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ ۱۴ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق ومحبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن وشباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العین، معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۴۲) صفحات۔ قیمت مجلد عہ

۱۔ مقام اقبال (از اشفاق حسین ایم۔ اے (عثمانیہ) حجم ۲۳۰ صفحے قیمت للعہ پتہ ادارۂ اشاعت اردو۔ حیدرآباد دکن

۲۔ قمر (افسانے) از سعید مظہر قیمت عہ پتہ انڈیا بک ہاؤس۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۳۔ نئی کرنیں (افسانے) از قمر تسکین " ۲ روپے " " "

۴۔ حاشیے (افسانے) از قمر انبالوی " ۲ روپے " " "

۵۔ ساز نظر (") " حسن عزیز احمد جاوید قیمت عاں " " "

۶۔ قسمت (") " " " " "

۷۔ نئی فضائیں (") از قمر تسکین قیمت عاں " " "

۸۔ سرخ افسانے (روسی افسانے) حجم ۳۰۰ صفحے قیمت ۴ روپے پتہ۔ نیا کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی

۹۔ سیر راہے گاہے (ادبی مضامین) از ڈاکٹر سید منظور حسین زیدی حجم ۱۹۰ صفحے قیمت عاں پتہ قریشی بک ایجنسی کشمیری بازار لاہور

۱۰۔ آثار اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید حجم ۳۲۰ صفحے قیمت ۳ روپے پتہ ادارۂ اشاعت اردو۔ حیدرآباد دکن۔

۱۱۔ تلخ و شیریں (افسانے) مترجمہ صلاح الدین قریشی قیمت عاں پتہ مکتبہ جہاں نما۔ اردو بازار۔ دہلی

۱۲۔ دیر و حرم (مجموعۂ کلام) از رعنا و صبا اکبرآبادی قیمت عہ " منظور احمد۔ کڑہ کا جی حسن۔ آگرہ

۱۳۔ ہندوستان کا نظام زر۔ از ڈاکٹر انور اقبال قریشی۔ حجم ۲۹۲ صفحے قیمت ۴ روپے پتہ ادارۂ معاشیات۔ فاطمہ منزل حمایت نگر حیدرآباد دکن

۱۴۔ ترقی پسند ادب۔ از عزیز احمد حجم ۲۵۶ صفحے قیمت ۳ روپے پتہ ادارۂ اشاعت اردو۔ حیدرآباد دکن۔

۱۵۔ تنقیدی حاشیے (تنقیدی مضامین) از مجنوں گورکھپوری حجم ۳۲۰ صفحے قیمت للعہ پتہ ادارۂ اشاعت اردو۔ حیدرآباد دکن

۱۶۔ بیداری (علی گڑھ میڈیکل کالج نمبر) مرتبہ ملک عابد حسین و ابوالخیر حجم ۱۳۶ صفحے قیمت ۱ روپے پتہ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

۱۷۔ رگِ سنگ (مجموعۂ کلام) از علی جواد زیدی قیمت عاں پتہ دکن بک ڈپو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۱۸۔ پرواز (") از علی سردار جعفری " عاں " "

۱۹۔ اسلام کے سیاسی تصورات (مضامین) مرتبہ غلام دستگیر رشید حجم ۲۴۲ صفحے قیمت ۳ روپے پتہ نفیس اکیڈیمی۔ حیدرآباد دکن

۲۰۔ شب تاب (مجموعۂ کلام) از اسرار الحق مجاز قیمت عاں پتہ نگارستان ایجنسی۔ اردو بازار۔ دہلی

۲۱۔ شرارے (افسانے) از طاہر میر۔ قیمت عاں " " " "

۲۲۔ پرانے خدا (") از کرشن چندر " عاں " " " "

۲۳۔ غبار (افسانے) از قیسی رامپوری " عاں " " " "

۲۴۔ ننگا پاؤں (افسانے) از شیر محمد اختر " عہ " ادارۂ ادبیات نو ۵۸ ٹمپل روڈ۔ لاہور

۲۵۔ انوکھی مصیبت (افسانے) از حیات اللہ انصاری قیمت عہ " " " "

۲۶۔ چاندی کے تار (") از مہندر ناتھ " عاں " " " "

۲۷۔ نئے پرانے (") " سہیل عظیم آبادی " عاں " " " "

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

یوروپین اور انڈو یوروپین شعرائے اُردو و فارسی

از
رائے بہادر رام بابو سکسینہ
نول کشور پریس لکھنؤ

یہ ضخیم کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ چار سو سے زیادہ صفحات کا ایک ضمیمہ بھی شامل ہے جس میں ان یوروپی اور انڈو یوروپین شعرائے اردو فارسی کے اردو کلام کے انتخابات درج ہیں جن کا ذکر اس مبسوط تاریخ میں کیا گیا ہے۔ کتاب پندرہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں بارہ ضمیمے الگ شامل ہیں۔ اس کا پیش لفظ رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو نے قلمبند فرمایا ہے جو اردو ادب کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور اردو شعر و سخن کے ہمدعاضرمیں سب سے بڑے سرپرست ہیں۔

رائے بہادر رام بابو سکسینہ اردو کے ایک خاص دلدادہ اور وسیع النظر ادیب ہیں ان کی تاریخ ادب اردو ایک عرصہ قبل شایع ہو کر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے ماہرین میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ان کی کئی اور کتابیں زیر ترتیب یا زیر طبع ہیں جن میں جدید اردو ادب پر تین جلدوں میں ان کی زیر ترتیب کتاب کا بڑے اشتیاق سے انتظار کیا جا رہا ہے۔

تاریخ ادب اردو کی اشاعت کے بعد سے رام بابو سکسینہ کی وسیع النظری اور ان کے مذاق سلیم کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ لیکن زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں علمی و ادبی تحقیق اور تلاش و جستجو کی بھی خاص صلاحیت موجود ہے اور وہ صبر و استقلال اور محنت و مشقت سے کبھی نہیں گھبراتے۔ چنانچہ اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں انھوں نے محنت و جستجو کا جو اعلیٰ ثبوت دیا ہے وہ اردو ادب کی تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے۔

یہ موضوع جس قدر وسیع ہے اس کا اندازہ بھی کتاب کے مطالعہ کے بغیر اردو کے بڑے سے بڑے ماہر تاریخ کو بھی نہیں مل سکتا اور بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ مصنف نے تلاش و تحقیق کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا اور اس طرح سے اردو ادب کے اس پہلو پر ایک ایسی مستند کتاب پیش کی جس پر شاید ہی کوئی اور اضافہ کیا جا سکے گا۔

اس کتاب کے پہلے پانچ باب در اصل ان اسباب کی وضاحت کرتے ہیں جن کی بنا پر مغربی ممالک کے نو واردوں نے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت سے انس پیدا کیا اور ہندوستانیوں سے اتنے قریب ہو گئے کہ ان کی زبان میں شعر و شاعری بھی کرنے لگے۔ یہ پانچ باب بجائے خود ایک جداگانہ کتاب ہیں جن کو فرنگیوں اور ہندوستانیوں کے ابتدائی تعلقات اور میل جول کے عنوان سے اردو میں الگ شایع کیا جا سکتا ہے۔ غرض اس پس منظر کو پیش کرنے کے بعد چھٹے باب سے مصنف نے اصل تذکرہ شروع کیا ہے پہلے یوروپین شعرائے اُردو و فارسی کو لیا ہے اور ان کے بعد ارمنی، ہند برطانوی، ہند پرتگالی، ہند فرانسیسی، ہند جرمن، ہند اطالوی شعراء میں سے ہر ایک طبقہ کے لئے ایک علٰحدہ باب وقف کیا ہے۔ تیرھواں باب "مختلف ہند یوروپین شعرا" سے اور چودھواں باب "ہند یوروپین شاعرات اردو" سے بحث کرتا ہے۔ آخری یعنی پندرھویں باب میں پوری کتاب کا مختصر خلاصہ خدمات اردو ادب کے عنوان سے قلمبند کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان بڑی خوش قسمت ہے اور اس کتاب کے مطالعے سے اردو کے مخالفین بھی اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ یہی زبان ہندوستان کی ایک مشترک قومی زبان رہی ہے جس نے نہ صرف اس ملک کے ہر حصے کے باشندوں میں مقبولیت حاصل کی بلکہ جو لوگ باہر سے ہندوستان آئے ان کا دل بھی موہ لیا۔ شاید ہی ہندوستان

کی کوئی اور زبان ایسی ہو جس میں اس کثرت کے ساتھ
بیرون ملک کے اشخاص نے شعر و شاعری کی ہو اور اپنے
دیوان یادگار چھوڑے ہوں۔ میری نظر میں اردو زبان
کی یہ خوش قسمتی ہی قابل رشک ہے کہ اس کے لئے رام بابو
سکسینہ جیسا وسیع النظر عالم و فاضل اور محقق فراہم ہو سکا۔
یہ کتاب اس قابل ہے کہ بہت جلد اس کا اردو ترجمہ شایع
کیا جائے اور یقین ہے کہ جب وہ شایع ہو جائے گا تو
اہل اردو بھی زبان اور ادب کے اس محسن کی حقیقی خدمات
سے واقف ہوں گے اور اس کا اعتراف کریں گے۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ زیر نظر کتاب
کی اشاعت سے اردو کے وقار اور ہمہ گیری میں بہت بڑا
اضافہ ہوا ہے اور اس کے مصنف نے نہ صرف اپنے
اعلیٰ پایہ محقق ہونے کا ثبوت فراہم کیا بلکہ اردو ادب کی بھی
ایک بنیادی خدمت انجام دی ہے۔

کتاب میں اردو شعرا کی متعدد تصویریں اور ان کے
خاندانی شجروں کے کئی نقشے بھی شامل ہیں جن کی وجہ سے
نہ صرف کتاب کی دیدہ زیبی میں اضافہ ہوا بلکہ یہ بھی ظاہر
ہوتا ہے کہ مصنف نے ہر شاعر کے حالات اور واقعات
جمع کرنے میں کیسی کیسی زحمتیں اٹھائیں۔

توقع ہے کہ رام بابو سکسینہ صاحب اسی طرح
اردو کی خدمت کرتے رہیں گے اور جدید اردو ادب پر
جو کتاب وہ مرتب کر رہے ہیں اس کی پہلی جلد جلد سے جلد
شایع ہو کر منظر عام پر آ سکے گی۔

اسرار حیات

از ڈاکٹر ایشورا ٹوپا۔ ناشر حیدرآباد تلگو اکیڈیمی۔

اس چھوٹی سی کتاب میں مشہور آندھرا صوفی ویما
کے تخیلات، حقایق زندگی سے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔
ابتدا میں پروفیسر آر۔ سبا راؤ پروفیسر تلنگی جامعہ عثمانیہ
و معتمد تلگو اکیڈیمی نے ویما یا ویمنا کی زندگی اور اس کی
شاعری پر ایک مختصر سا مقدمہ قلمبند کیا ہے۔ جس کے بعد
ڈاکٹر ٹوپا کا دیباچہ ہے اور پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے
جو بارہ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ ہر باب ایک مختلف عنوان
کے لئے وقف ہے اور ویما کی شاعری سے اس خاص عنوان
کے تحت خیالات ایک جا کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً پہلا باب
انسانی تہذیب کے راستے کے عنوان کے لئے وقف ہے
اور دوسرے میں انسانی برتری اور کمتری پر ویما کے خیالات
جمع کئے گئے ہیں۔

حیدرآباد تلگو اکیڈیمی نے اب تک "تلگو ادب" اور
"ایک شمالی حکمران" جیسی کتابیں شایع کی ہیں اور خاص کر
قرآن مجید کا تلنگی ترجمہ تین جلدوں میں مرتب کرایا ہے۔
ابتدائی دس پاروں پر مشتمل پہلی جلد شایع بھی ہو چکی ہے۔
زیر نظر کتاب بھی اسی کے سلسلۂ مطبوعات کی چھٹی کڑی ہے
اور توقع ہے کہ اس اکیڈیمی کی طرف سے ایسی ہی
مفید کتابیں شایع ہوتی رہیں گی۔

زیر نظر کتاب اسرار حیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا
ہے کہ تلنگانہ کے مشہور صوفی ویمنا نے زندگی کے حقائق
کو سمجھنے کی بڑی اچھی کوشش کی تھی۔ وہ وجیانگر کے راجا
کرشنا دیورائے سے قبل بمقام چنتا پلی پیدا ہوا تھا اور اپنی
زندگی کا زیادہ تر زمانہ ضلع گنٹور کے ایک قصبہ میں گزارا تھا۔
اس کے کلام میں ایک خاص سوز و گداز اور انسان دوستی
نمایاں تھی۔ ڈاکٹر ٹوپا صاحب کی یہ کوشش قابل قدر ہے
کہ انھوں نے اس کے کلام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور
مختلف عنوانات کے تحت اس کے شہ پارے یکجا کر دئے۔
ضرورت ہے کہ اسی طرح ہندوستان کی دوسری زبانوں
کے صوفی شعرا کے ملفوظات اور خیالات بھی اردو میں
پیش کئے جائیں۔

مولنا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں

از عبداللطیف اعظمی۔ ناشر شبلی اکیڈیمی دہلی۔

حال ہی میں مولنا
سید سلیمان ندوی کی مبسوط کتاب "حیات شبلی" شایع

ہو چکی ہے اور زیر نظر کتاب شبلی پر کوئی جامع تصنیف نہیں ہے بلکہ ایک چھوٹا سا مقالہ ہے جو جامعۂ ملیہ کے امتحان بی اے کے سلسلے میں ۱۹۴۰ء میں لکھا گیا تھا. یہ اگرچہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے لیکن اس کی ترتیب میں عبد اللطیف اعظمی صاحب نے صحیح ذوق ادب سے کام لیا ہے اور اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ نثر کے لئے وقف ہے اور دوسرا شاعری کے لئے۔ ہر حصے میں پہلے پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بعد شبلی کی اہمیت اور خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ چونکہ مولف کو شبلی سے خاص عقیدت ہے اس لئے انھوں نے شبلی کے معاصرین کے مقابلے میں شبلی کی فوقیت جتانے میں تھوڑے بہت مبالغے سے کام لیا ہے اس لئے اس کتاب کا صحیح نام دراصل محاسن شبلی رکھا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شبلی اردو کے ایک بہت بڑے ادیب، مورخ اور نقاد تھے اور انھوں نے اس زبان میں علمی و ادبی مضامین کے لئے ایک ایسا اسلوب ہموار کر دیا تھا جس پر آنے والی نسلیں کامیابی کے ساتھ گامزن رہیں گی۔ تاریخی نظموں کے لئے بھی انھوں نے جو اسلوب اور شکل استعمال کی تھی وہ بھی آج تک اردو شعرا کے لئے نصب العین کا کام دے سکتی ہے۔ ان حقیقتوں کے پیش نظر اس کتاب کا مطالعہ اردو ادب اور خاص کر تنقید کا ذوق رکھنے والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

یہ جنگ

مصنفۂ ٹامس مان۔ مترجمۂ محمد اعظم ایم اے۔ لکچرار شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

ٹامس مان عہد حاضر کا ایک بہت ہی ممتاز جرمن ادیب ہے جس نے اپنی اعلیٰ تصنیفات کی بدولت ۱۹۲۹ء میں ادب کا نوبل انعام حاصل کیا تھا۔ وہ جرمن ناول نگاروں کا سرتاج مانا جاتا ہے لیکن اس نے موجودہ جنگ کے متعلق بھی دو کتابیں لکھیں جن میں ایک "عمومیت کی فتح" اور دوسری "یہ جنگ" کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ موخر الذکر کتاب ۱۹۴۰ء میں اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ نازیوں کا اقبال معراج کمال پر پہنچ چکا تھا اور ان کے حملے ہر طرف زور و شور سے جاری تھے اور متحدین کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں۔ ایک ایسے نازک وقت میں بھی ٹامس مان نازیوں کے انجام کے متعلق جو عقیدہ رکھتا تھا وہ اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے اور جرمنی کی تباہی کی نسبت جو پیشین گوئیاں اس نے عین اس کے عروج کے زمانے میں کی تھیں وہ آخرکار صحیح ثابت ہوئیں اور ٹامس مان کی دوربین نگاہ اور سیاسی بصیرت کا ثبوت فراہم ہو گیا۔ اس اہم کتاب کا یہ ترجمہ قابل قدر ہے اور مترجم نے جرمن انداز بیان کی پیچیدگیوں اور فلسفیانہ مباحث کی خشکیوں کے باوجود اس کتاب کو حتی الامکان سلیس اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔

نئے زاویے

جلد دوم۔ مرتبہ کرشن چندر۔ ناشر مکتبۂ اردو لاہور۔

یہ دیدہ زیب کتاب دراصل ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے بہترین مضامین نظم و نثر کا ایک عمدہ انتخاب ہے جس کو اردو کے مشہور ادیب کرشن چندر نے خاص ذوق اور سلیقے سے مرتب کیا۔ ابتدا میں خود انھوں نے معروضات کے عنوان سے ایک دیباچہ لکھا جس میں جدید ادب کے رجحانات اور جدید ادیبوں اور شاعروں کے خصوصیات پر بڑی سلاست اور خوبی سے نظر ڈالی ہے۔ جدید یا ترقی پسند ادب کے علم برداروں کو اپنے علمی و ادبی تحریروں میں اسی قسم کا سنجیدہ انداز بیان اختیار کرنا چاہیئے اور اپنے ادب کے ایسے ہی اچھے نمونے موقع بموقع انتخابات کی شکلوں میں شائع کرنے چاہئیں جیسے کہ اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

اس واقعہ سے کوئی وسیع النظر دلدادۂ اردو انکار نہیں کر سکتا کہ اردو ادب اب ایک جدید راستے پر چل نکلا ہے۔ اور اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ نئے راستے پر چلنے والے ادیبوں اور شاعروں میں کیسی کیسی شخصیتیں شامل ہیں۔ اور یہ کہ اس قسم کے ادب میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی کیا کیا صلاحیتیں موجود ہیں۔ جو لوگ مستقبل کے اردو ادب کی تابناکیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم' اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم۔ ایس سی

تعداد اشاعت ۱۵۳
تعداد ... ۲۹۵۰
رجسٹری نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
... ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۶؍

جلد (۸) بابت ماہ نومبر ۱۹۴۵ء شمارہ (۱۱)

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس میں طبع ہو کر خیریت آباد سے شائع ہوا

نوادر

اضداد کی طرفہ دنیا میں ہر زیر و زبر کو دیکھ لیا
اللہ! وہی پھر مشقِ ستم، راحت کے اثر کو دیکھ لیا

اب خاک کے تا کس ذرّوں کو توفیقِ جہانبانی ہو عطا
اک طرح نہیں ہر پہلو سے خورشید و قمر کو دیکھ لیا

یہ کلیاں یہ غنچے بھی ہیں کچھ، اک سانس میں مرجھا جاتے ہیں
اب دیکھو کوئی فطرت کا نگیں تزئینِ گہر کو دیکھ لیا

دنیا کی فضا ہے اور ہی کچھ اور شمس و قمر کی ہے وہی گردش
اب کوئی نیا مقصودِ سفر، اس دورِ سفر کو دیکھ لیا

اب عصرِ جہاں میں وضع ہو کوئی جو رجدا، اخلاق نیا
کیا طرزِ وفا کیا رنگِ بلا، ہر خیر کو شر کو دیکھ لیا

چمن میں ہر طرف شبابِ رنگ کی پکار ہے
لٹا دے تو بھی آشیاں، بہار پھر بہار ہے!

وہاں نفس کی موج نے چمن میں جان ڈال دی
تجھے ہنوز جنبشِ صبا کا انتظار ہے؟

اس کے خیال کو نہ پوچھ، اس کا خیال ہی تو ہے
اشک بنا ٹپک گیا، درد بنا سما گیا!!

قصرِ مآل و فکر کے سارے ستون ہل گئے
عشق نے ایک سانس لی عقل کو ہوش آ گیا

حرماں خیرآبادی

اردو شاعری اور نئی تحریکیں

اردو شاعری عہد اصلاح کے بعد سے، اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ، ماحول کی تبدیلی کی وجہ سے، اس سر منزل پر پہنچ گئی تھی، جہاں سے، نوجوان شعرا کو، اس کے ارتقا کی رفتار بھی سست نظر آنے لگی۔ یوسف ظفر کے یہ مصرعے شاید اس ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہیں —

کیا مجھے اپنے خیالوں کے ادا کرنے کو
اسی رفتار سے چلنا ہے کہ جس سے اب تک
دھیرے دھیرے مرے ہم عصر چلے جاتے ہیں

ذہنیتوں کی یہ تبدیلی، کچھ تو گزشتہ جنگ عظیم کے بعد کے حالات کے ردعمل کا نتیجہ ہے، اور کچھ نئی عالمی تحریکوں کی صدائے بازگشت، جس نے شعرا کی نوجوان نسل کو انقلاب کی طرف مائل کر دیا۔ چنانچہ جدید اردو شاعری کے ارتقا کی تاریخ میں یہ آخری دس بارہ سال، نئی نئی تحریکوں اور انقلابی تصورات کی افزائش کے سبب پچھلے ادوار کے مقابلے میں، ممتاز نظر آتے ہیں۔ یہ دور اردو شاعری میں نئے شعری تصورات اور ایسی فنی تحریکات کا آغاز کرتا ہے، جو بحیثیت مجموعی اس سے پہلے اردو شاعری سے نامانوس اور اجنبی تھیں۔ نوعمر شعرا نے اپنی ساری توانائیوں اور جدت طرازانہ مساعی کے ذریعے، اردو شاعری کو ایک اچھے نہج پر ڈالنے کا بیڑا اٹھایا ہے، جو بعض حیثیتوں سے عالمی ادبی تحریکات سے ہم آہنگ ہے۔ وسیع تر عالمی پس منظر اور قریب ترین نوعی روابط کا یہ لازمی نتیجہ تھا، لیکن، ہمارے اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کی مناسبت سے، ان تحریکات میں سے، ایسے پہلو زیادہ موثر صورت میں جلوہ گر ہو رہے ہیں، جو ہماری زندگی سے زیادہ گہرا ربط رکھتے ہیں یا نوجوان شعرا کی ذہنیتوں پر زیادہ اثر ڈال سکتے ہیں۔

شاعری کی اصلاح کی جو تحریکیں، اس وقت برپا ہو رہی ہیں، وہ شعر کی صوری اور معنوی ہر حیثیت پر اثر انداز ہیں اور بہت کچھ ترمیم اور تنسیخ کی پیشین گوئی کر رہی ہیں، اور اگر ان کی ترقی، نئی راہوں میں بے روک جاری رہے تو عروض، قافیہ، ردیف اور دوسرے سارے اگلے فنی لوازم میں، اردو شاعری ایک نیا ورق الٹنے کو تیار ہے، جس میں، وقتی جذبات کی رو گزر جانے کے بعد، وہ رفتہ رفتہ ایک انفرادی جگہ پیدا کرتی جائے گی اور نئی شاعری ہندوستان کی دوسری زبانوں کی شاعری سے بھی اتنی ہی ممیز ہوگی، جتنی وہ، قدیم، عربی ایرانی اثر کی شاعری سے مختلف ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقی ہندوستانی شاعری ہوگی، جس میں عالمی شعری دبستانوں کا اثر، اس کے مخصوص مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوگا۔

نئی تحریکوں کا مقصد، سب سے پہلے، اردو شاعری کو، حیات کی من و عن ترجمان، بلکہ کنیز بنانا ہے۔ ادب اور زندگی کا اصول، اس دور میں اتنا ہی چھانا جا رہا ہے، جتنا کہ عصر اصلاح کے فوراً بعد، نیچرل یا فطری شاعری کا اصول مقبول انام ہو چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ، عصر اصلاح کے بعد سے لے کر موجودہ دور تک، جدید شاعری کا ارتقا بتدریج ہوتا رہا، اور سوائے اس عصر کے درمیانی ادوار میں، کوئی تحریک اس شد و مد کے ساتھ نہیں اٹھی، جیسی کہ موجودہ تحریک، 'ادب برائے زندگی' ہے۔ اس نقطۂ خیال کو مکمل کرنے میں اس عصر اور ہر عصر کے سب سے بڑے شاعر، اقبال کے شعری اور فنی نظریوں کو بہت کچھ دخل ہے، جو شعر و فن میں

ظاہری دلآویزی کے علاوہ، باطنی افادیت کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ "فنونِ لطیفہ" کے بارے میں فرماتے ہیں۔

اے اہلِ نظر، ذوقِ نظر خوب ہے، لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا!
مقصودِ ہنر، سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس، مثلِ شرر کیا!
شاعر کی نوا ہو، کہ مغنّی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو، وہ بادِ سحر کیا!

شعر کو وہ حیاتِ ابدی کا پیغام سمجھتے تھے۔

نئی تحریکات کے بارے میں، موافق اور مخالف بہت کچھ کہا گیا ہے .... اور کہا جاتا رہے گا اور جس طرح عصرِ اصلاح کی تحریکوں کے بارے میں خیال آرائیاں ہوتی رہی تھیں، لیکن، بے چینی، اضطراب اور تجدد پسندی کی وہ لہریں، جو، نوجوان ذہنوں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں، اپنا کام کرتی رہیں، اور اب بھی کر رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ اس ساری سعی کا مفہوم متعین ہوتا جائے گا، جو اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ زندگی کی بدلی ہوئی قدروں سے شعر اور ادب کو ہم آہنگ بنایا جائے۔ وقتی اور فنا پذیر جذبات، اپنی طبعی موت مرنے والے ہیں، لیکن فکر کی نئی دھارا، شکست و ریخت اور تعمیرِ جدید کے آثار چھوڑے بغیر نہیں جائے گی۔

ادب کو عام پسند اور عوام پسند بنانے کا رجحان بھی ان تحریکوں کا ایک پہلو ہے دوسرے الفاظ میں، ادب سے خواص پسندی، ذہنی امارت اور اجارہ داری کو مٹانا بھی، نئی تحریکات کے پیشِ نظر ہے، فی نفسہٖ یہ مسئلہ اختلاف سے بالکلیہ بری نہیں کہ ادب کو کس حد تک عوام پسند ہونا چاہیئے؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس تحریک کے اثر سے اردو شاعری میں، فرضی حسن و عشق کی داستانوں کی بجائے، زندگی کے مشاہدے اور مطالعے کے نئے نئے زاویۂ نظر پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ شاعری کو عوام پسند بنانے کا مقصد ابھی پورے طور پر اس طرح حاصل نہیں ہو سکا کہ، شاعری کی پچھلی روایات کا اثر، نئے نمونوں سے ابھی تمام تر زائل نہیں ہونے پایا ہے۔

موضوعات کے تنوع، اسالیب کی توسیع اور فنی تجدد پسندی کی تجربی کوششوں کے لحاظ سے، موجودہ دور کی شاعری ایک حقیقی عبوری دور سے گزر رہی ہے، اور اگر اپنے سارے خد و خال کے ساتھ کامیاب نہ بھی ہو، پھر بھی، چند بنیادی اصولوں میں ہماری شاعری، اگلے ادوار کی شاعری کے مقابلے میں بالکل مختلف ہوگی، جس کے اجزا میں، شعر کے قدیم تصور سے، مختلف ایک نیا فنی تصور ہوگا، جس کی عمارت، محض ردیف قافیے مخصوص اور معین اوزان، روزمرے اور محاورے کے سہاروں پر ٹکی ہوئی نہیں، بلکہ شاعر کے انفرادی احساس حسن کاری، اس کی روح کے ذاتی ترنم اور اس کی اپنی فکر کے عناصر پر کھڑی ہوگی۔

موجودہ شاعری، مسلمہ اور مخصوص اوزان سے بھی اتنا ہی جی چراتی ہے، جتنا وہ ردیف اور قافیے سے گھبراتی ہے۔ اوزان اور صُوَرِ شعریہ کا تنوع، جتنا اس دور میں مقبول ہو رہا ہے، اس سے پہلے اردو شاعری میں کبھی مقبول نہ ہو سکا تھا۔ اسمٰعیل میرٹھی، شرر، نظم طباطبائی اور ڈاکٹر بجنوری نے بے قافیہ نظم کو اردو میں کھپانے کی سعی کا جو انجام دیکھا تھا، اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت، شعرا کا احساسِ ترنم، ابھی ردیف اور قافیے کے سہاروں کو ترک کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اِس دور میں بے قافیہ نظم، نہ صرف مقبول ہو رہی ہے، بلکہ اس میں چند ایسی اصطلاحی خصوصیات بھی نشو و نما پا رہی ہیں، جو اس میں شک نہیں کہ پہلے پہل، مغربی شاعری سے در آمد کی گئیں، لیکن رفتہ رفتہ، وہ زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتی

جارہا ہے۔ اس طرح ہماری شاعری، مشرق اور مغرب کے فنونِ شعریہ کے متوازی، ایک نیا اور اپنا انفرادی راستہ نکال رہی ہے، جو اپنی ترقی یافتہ صورت میں اردو شاعری کی فنی خصوصیت سمجھا جائے گا۔

موجودہ شاعری میں، بعض خاص خاص موضوعات کی حد تک تو اردو، بلکہ تقلید کا شائبہ ضرور پیدا ہوگیا ہے، مثلاً، افلاس، بھوک، قحط، امراض، مزدور، کسان، سرمایہ داری وغیرہ کا ذکر بطور مثال کیا جا سکتا ہے؛ اس میں کچھ تو سیاسی تحریکات کا اثر ہے، اور کچھ اس لئے کہ یہ ایک شعری "وضعداری" اور "مسلک" سا بن گیا ہے، جس کے پیرو، تقریباً تمام نوجوان شاعر اور دو ایک جہاں دیدہ سخن سنج بھی ہیں، جس طرح غزل گوئی کا قدیم شاعر، مضمون پر مضمون کہنے پر فخر کرتا تھا، اسی طرح آج کا شاعر بھی غالباً یہی سمجھتا ہے کہ جب تک وہ اس زمرے کے موضوعات پر قلم نہ اٹھائے، ترقی پسندی کی سند پا ہی نہیں سکتا۔

عشق و محبت کا جادو اب بھی بول رہا ہے اور شاید سر چڑھ کر بول رہا ہے، لیکن اس سلسلے میں جو بات بنیادی ہے وہ یہ ہے کہ، موجودہ شاعری میں رسمی حسن پرستی کا شائبہ بہت کم ہوگیا ہے، نوجوان شاعر عشق و محبت کے جذبات کے اظہار میں، رمزیت، اشاریت اور استعاروں کے قدیم توبرتو پردوں کو چاک کرتے بڑھا ہوا ہے، ممکن ہے کہ نئے دبستان کے شعرا کے ہاں یہ چیز بعض وقت رسمی معلوم ہو، لیکن ہم کو جگہ جگہ ایسے نمونے بھی نظر آجاتے ہیں، جہاں شاعر کی فکر، پاک اور معصوم محبت اور کبھی کبھی، حسنِ ماوراکے سراپردۂ آستاں تک پہنچتی دکھائی دیتی ہے، اور کہیں کہیں رازِ درونِ پردہ کی جھلک بھی دکھائی پڑتی ہے۔ اصلی اور نقلی جذبات کی یہاں بھی گنجایش ہے، لیکن کام کی بات اس سلسلے میں دیکھنے کے قابل یہ ہے کہ موجودہ شاعر، عشق و محبت کے جذبات کے اظہار میں، کسی طرح کی ذہنی پیچیدگی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا۔ وہ دن کو دن اور رات کو رات کہنے پر مصر ہے۔ چنانچہ عاشقانہ اور رمزیہ شاعری میں، قدیم اور جدید دور کے شاعر بھی، معشوق کا اتا پتا بتانے سے گریز کرتے تھے، موجودہ شعرا نے، وہ رسم توڑ دی ہے، اور بعض تو شاید اس رو میں دور تک بہے چلے جارہے ہیں

ان تحریکات میں، جو نوجوان شعرا کی مساعی کا محور بنے ہوئے ہیں، یہ تحریک شاید، سب سے زیادہ دوررس نتائج کا باعث ہوگی کہ انھوں نے اسالیب شعر کو وسعت دے کر، اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیا ہے کہ اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں، بلکہ ایک ہی زبان کے دو مختلف اسالیب ہیں۔ صلح و آشتی پسندی جس کی شاعر سے توقع کی جا سکتی ہے، اس کا یہ ایک نہایت مستحسن اشارہ اور اقدام ہے۔

نئی تحریکات میں شعر کی نغمیت، سب سے زیادہ نمایاں چیز ہے۔ موجودہ شاعری کا یہ وہ پہلو ہے، جو سب سے زیادہ معرکۃ الآرا بنا ہوا ہے۔ نظم کی اصناف میں آزاد نظم، موجودہ عہد کی گویا خصوصیت بن گئی ہے، جو قدیم دبستان والوں کو ایک طرح کی دخیل چیز معلوم ہوتی ہے۔

جدید دور کے آغاز میں اردو شاعری نے اصلاح کا جو قدم اٹھایا تھا، وہ بظاہر موضوعات کی توسیع تک محدود رہا، لیکن ضمنی طور پر ایک بنیادی فرق قدیم اور جدید دبستانوں میں یہ بھی نمایاں ہوا کہ قدیم دور کی زیادہ تر محاورے، روزمرے اور صنائع بدائع کی نگہداشت کی شاعری کے مقابلے میں، جدید دور کی شاعری مطالب اور معانی پر زیادہ متوجہ رہی۔ موجودہ دور میں مطالب اور موضوعات کی بھی چھان بین شروع ہوئی اور فنی اعتبار سے نئے نئے تجربے شروع ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گزشتہ نصف صدی کے

دوران میں اردو شاعری میں حالات اور ذہنیتوں کی مناسبت سے تبدیلی ہوتی رہی، کیونکہ تبدیلی فطرت کا ایک اٹل قانون ہے، اور یہی قانون اس کائناتِ آب و گل اور حیات مادی پر حکمران ہے۔ ادبیات میں تبدیلی کا معیار حسن اظہار کی ترقی اور معنویت ہے۔ ہر ایسی تبدیلی، جس سے ان کو نقصان پہنچے نامقبول ہوگی۔

موجودہ شعری تحریکوں کو نہ تو ہم محض قدیم طرز سے بغاوت کے جذبے پر محمول کر سکتے ہیں اور نہ محض جدت طرازی کی عنان گسیختہ خواہش پر بلکہ یہ تحریکیں ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک وسیع پس منظر رکھتی ہیں۔ یہ سمجھ لینا بھی صحت پر مبنی نہیں کہ نئی شعری تحریکوں کو، اگلے دور سے کوئی واسطہ نہیں۔ نئی تبدیلیاں سارے یا چند طبقوں کی ذہنیتوں کی تبدیلی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں اور ذہنی تبدیلی کی ذمہ داری ماحول پر ہے۔ ہمارا حال، اگر ہمارے ماضی کی پیداوار ہے، تو نئی تحریکیں بھی پچھلے دور کے عمل اور ردِ عمل کا لازمی نتیجہ ہیں۔

موجودہ شعری پیداوار پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ نوجوان نسلوں کا رجحان، نئے نئے شعری تجربوں کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوتا جا رہا ہے۔ اظہار کے سانچے بدل رہے ہیں، اور جمالی معیاروں میں ایک تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ مظاہر فطرت کی تلاش میں، جن گوشوں کو موجودہ شاعر اور خصوصاً نوجوان سخن پرداز ٹٹول رہے ہیں، ان کی اپنی فطرت کی رہبری کا نتیجہ ہے، اور جن راہوں پر وہ گام زن ہیں، پہلے سے بنی بنائی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ خود انہیں کھولنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کی ہر وحشت خرامی، ایک نیا شعری آئین بن جائے گی، لیکن یہ تصور، خود کچھ کم خوشگوار نہیں ہے کہ وہ ایک حقیقی پُرعظمت شاعری کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

عبدالقادر سروری

غزل

غم بہر صورت چھپایا جائے گا — ضبط کر کے مسکرایا جائے گا
اٹھ رہی ہے کیوں مری جانب نظر — کیا نگاہوں سے گرایا جائے گا
خشک لب کیا کہہ سکیں گے دردِ دل — نم نگاہوں سے بتایا جائے گا
یہ مہکتی زلف کیوں کھولی گئی — کس کی دنیا کو بسایا جائے گا
یوں نشیمن پر نظر ہے برق کی — جیسے ہر تنکا جلایا جائے گا
تیرے دامن کی ہوا درکار ہے — شمعِ فرقت کو بجھایا جائے گا
دل کو بہلائیں گے دردِ دل سے ہم — درد کو درماں بنایا جائے گا
آئے کیوں طوفاں ڈبونے کے لئے — خود سفینہ زد پہ لایا جائے گا

بڑھ رہے ہیں اے علیؔ خود دستِ ناز
دامن اب کب تک بچایا جائے گا

علی احمد

مدرسہ محمود گاواں بیدر کی تباہی

جب دولت بہمنیہ تباہ ہو گئی اور شاہان بریدیہ کا تسلط قائم ہوا تو ہمسایہ سلطنتوں کی لشکر کشی کے اندیشہ سے دار السلطنت بیدر کے گرد حصار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ تنگ جگہ کے میسر نہ آنے کے باعث علی برید شاہ فرمانروائے بیدر نے کل امرائے دولت اور شاہ تخمین و معززین کو جمع کرکے دریافت کیا کہ آیا زندوں کی حفاظت ضروری ہے یا مردوں کی جنہوں نے کہا کہ حفاظت تو زندوں کی کی جائے۔ علی برید صاحب کا جواب پاکر ایک فتوے پر سب کے دستخط لے لئے اور عام طور پر جس قدر عظیم الشان عمارتیں شاہ عام کے ایوانات .... گنبدیں اور قصر تھے سب کو توڑ کر فصیل، حصار و برج تعمیر کئے گئے۔ مدرسہ محمود گاواں سے متعلق جو عمارتیں تھیں وہ بھی توڑ دی گئیں صرف مدرسہ اس صدمہ سے بچ گیا۔

عہد بریدیہ میں شاہان بیجاپور، احمد نگر و گولکنڈہ کی شورشوں سے مدرسہ کی موقوفہ جائداد میں دست درازی شروع ہوئی اور اکثر جاگیرات جو اس جنگ و جدل کے رقبے میں تھیں ان سے ہمسایہ سلطنتوں نے متمتع ہونے نہ دیا۔ رفتہ رفتہ سلطنت بریدیہ کا رقبہ اس قدر محدود ہو گیا کہ اس کے زیر نگیں صرف دو تین ضلع اور کوئی چار ہزار فوج رہ گئی۔ دار السلطنت بیدر سے وہ اگلی شان و شوکت مفقود ہو گئی اور اطراف و اکناف سے اہل غرض کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ سینکڑوں گھر ویران ہو گئے۔ اس طرح شہر کے ساتھ مدرسہ بھی ویران ہو گیا اور تقریباً [illegible] تک اس کی افتادہ حالی کا یہی عالم رہا۔ فرمانروایان بیجاپور کا بیدر پر قبضہ ہونے کے بعد قلعداری کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں تک کہ علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں ملک مرجان مختار الملک والا جاہ نائب سلطنت عادل شاہیہ قلعدار رہے تھے جائداد کو بھی سلطان کی بیگم ملکہ پری بانو کے ذاتی اخراجات کی مد میں شریک کر دیا۔ [illegible] تک عادل شاہیہ کی قلعداری رہی۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی نے [illegible] میں بیدر فتح کیا۔ مدرسہ کی بے کسی اور بربادی سے سخت متاثر ہو کر اس کی درستی اور تعمیر کا انتظام فرمایا اور حکم دیا کہ پچھلی حالت پر لانے کی کوشش کی جائے۔ متعدد صوبہ داران عالی مقام اور حکام وقت مثلاً نواب افتخار خاں بہادر عالمگیری، مختار خاں رنجیتی سبزواری، نواب ابو المظفر خاں اور نواب قلندر خاں نے اس کو اصلی حالت پر لانے کی ہر ممکنہ کوشش کی اور اس میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ [illegible] کے دورۂ دکن کے زمانہ میں شہنشاہ عالمگیر غازی نے بیجاپور تک تا سورما کی ایک بزرگ حضرت نائب رسول اللہ مولانا صبغۃ اللہ مدنی کے جانشین مولوی سید محمد حسینی تہامی کو منتخب فرما کر مدرسہ ... کا امام المدرسین مقرر کیا۔ مدرسہ محمود گاواں میں مولوی صاحب نے اشاعت علوم کی کوشش شروع کی۔ ان کے علم و فضل کی شہرت سن کر دور دور سے طالبان علوم و فنون آ آکر حلقۂ تلامذہ میں شریک ہونے لگے۔ اس زمانے کے تعلیمی کورس میں ادب کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ سلسلہ کم و بیش [illegible] تک جاری رہا۔ ۱۱ رمضان المبارک [illegible] کو جلال الدین قلعدار کے زمانہ میں بجلی گرنے سے اس مدرسہ کے جنوب و مشرق کی جانب کی عمارت منہدم ہو گئی۔ یہ بھی ایک حکمت الٰہی ہے کہ جلال الدین محمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں مدرسہ کی عمارت بنی اور وہ اسی عالم فاضل جلال الدین صوبہ دار کے زمانہ میں منہدم ہوئی۔ مدرسہ منہدم ہونے کے بعد عالمگیری درس و تدریس کا انتظام درہم ہو گیا۔ عہد مغلیہ کے خاتمہ پر ملک کی حالت بد سے بدتر ہو گئی تھی۔ سارے امرا اپنے اپنے علاقوں کے انتظامات کرنے اور آئے دن کی شورشوں کو مٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ دکن کا بہت سا حصہ نواب قمر الدین خاں بہادر

آصف جاہ اول بانیٔ خاندان آصفیہ کے قبضہ میں آچکا تھا۔ بیدر کے عالمگیری قلعدار داخل خان کو قلعداری سے معزول کرکے اور جاگیر کی جاگیر دے کر نواب آصف جاہ اول نے نواب میر کلان خان بہادر کو بیدر کی قلعداری عطا کی ۱۱۵۸ء تک بیدر پر شہنشاہ دہلی کی طرف سے قلعدار حکمران مقرر ہوتے رہے۔ اس کے بعد آصف جاہی قلعداری کی عملداری شروع ہوئی۔ اس زمانہ میں تعلیم و تعلم کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا اس لئے نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر کے زمانۂ وزارت تک مدرسہ کھنڈر بنا رہا اور جس قدر پتھر، چونا اور اینٹ کا انبار تھا اس کو عوام لے جا لے جا کر اپنے مکانوں کی تعمیر میں لگاتے رہے۔ تعلیم کی جانب جب نواب سر سالار جنگ بہادر کی توجہ مبذول ہوئی اور اضلاع میں مدرسین مقرر کئے گئے تو بیدر میں بھی اسی مدرسۂ محمود گاواں میں حافظ غلام مصطفی صاحب اول تعلقدار کے زمانہ سے نواب منصور یار جنگ بہادر کی تعلقداری تک (۱۳۰۰ف تک) فارسی درس ہوتا رہا۔ ۱۳۰۹ف میں مولوی اکرام الدین خان صاحب اول تعلقدار کے زمانہ میں مدرسہ فوقانیہ کی جدید عمارت علی باغ کے حوض پر تیار ہوئی اور مدرسہ اس میں منتقل ہوگیا۔ مدرسۂ محمود گاواں کی عمارت پھر کس مپرسی کی حالت میں رہی ۱۳۰۹ف کے قحط میں مدرسہ دو تین سال تک لاوارث، یتیموں کا وارڈ بنا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ پھر چمگادڑوں کا گھر بن گیا اور ۱۳۲۲ف تک کم و بیش اسی حال پر رہا۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ سابع فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے زریں کارناموں میں سے محکمہ آثار قدیمہ کا قیام بھی ایک زریں کارنامہ ہے کہ اس سے ازمنۂ ماضیہ کے آثار کی حفاظت، ان کی ترمیم اور داغ دوزی ہونے لگی ۱۳۲۲ف سے اس مدرسہ کو محکمہ آثار قدیمہ نے اپنی زیر نگرانی لیا ۱۳۲۹ف میں ہزار ہا روپے کے صرفہ سے ترمیم کرکے اندر کے حصہ کو پاک و صاف کیا گیا اور صحن میں جو اینٹ، چونہ پڑا ہوا تھا اس سے منہدمہ حصہ کا پایہ درست کرکے اسی پر چار چار فٹ اونچی دیوار بنائی گئی اور اوپر کی منزلوں کے دونوں حصوں میں دروازے لگا کر مقفل کر دیا گیا ہے ۱۳۴۴ف میں مدرسہ کو سنگ بستہ دیوار سے محصور کر لیا گیا۔ غرض محکمہ آثار قدیمہ کی توجہ سے اتنا ضرور ہوا کہ اب اس ویران مدرسہ میں کسی قدر رونق آچکی ہے۔

سید محمد (بیدری)

تاریخ گولکنڈہ :- حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقا، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم، نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بڑی سائز سوا تین سو سے زیادہ صفحات قیمت ہے

کنول رانی کے نام ——

معلوم نہیں کیوں میں نے رانی سے کہدیا۔ "رانی تم واقعی اچھی ہو۔ بالکل ہندی افسانوں کی ہیروئن۔" اسے سن کر جب رانی کے چہرے پر گلاب جھلکنے لگا تب خیال آیا کہ میں نے کیا کہدیا۔ کتنی بڑی بات۔ جانے کیوں میں نے یونہی کہہ دیا۔ زندگی کی بعض حماقتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ ہم انھیں سوچ سوچ کر پشیمان ہوا کرتے ہیں۔ رانی کو ایک زمانے سے دیکھ رہا تھا۔ جوہی کی بیل سے زیادہ نازک اور بیلے کی پھولوں سے لدی ڈال کی طرح لچک دار رانی۔ یوں تو میں نے ہزاروں ہی لڑکیاں دور اور نزدیک سے دیکھی تھیں اور ان میں سے کئی ایک مجھے پسند بھی تھیں لیکن رانی کی بات ہی اور تھی۔ اس کے کندنی رنگ میں ایک عجیب اداسی گھلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں ایک مایوس چمک کہ دیکھنے والے کی نگاہیں اس پر پڑتیں تو جذب ہی ہو کر رہ جاتیں اس کے چہرے پر ہی ٹھٹک جاتیں اور وہاں سے انھیں لوٹنا مشکل ہو جاتا۔ اس کا حسن مثالی حسن تو نہیں کہ میں اس کی آنکھوں کو نرگس، شہلا، اس کے ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑیاں، اس کے گالوں کو چاند اور سورج اور اس کی باہوں کو کنول کے ڈنٹھل کہہ سکوں۔ نہیں اس میں ایسی کوئی بات نہیں۔ عام لڑکیوں کی طرح وہ بھی ایک سیدھی سادھی لڑکی ہے۔ کوئی غیر معمولی لڑکی نہیں۔ ہاں جسم میں لچک ہے اور آواز میں لوچ۔ بناوٹ نام کو نہیں۔ اور میں —— میں ہی کیا اسے ہر دیکھنے والا دیکھتا اور شاید یہی سوچتا رہ جاتا ہے کہ اس کی آنکھوں کی مایوس چمک میں زیادہ کشش ہے کہ اس کے چہرہ کی پھیکی اداسی میں۔ کتنی عجیب سی بات ہے۔ لیکن اسے دیکھ دیکھ کر یہی خیال پیدا ہوتا ہے اور میں اب تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ مگر یہ تو میں نے صرف سوچا ہی تھا۔ کبھی کہنے کا ارادہ نہیں تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن میں اس سے ایک ایسی افسانوی بات کہہ دوں گا۔ مجھے اس کا ہرگز افسوس نہیں کہ میں نے اس کے حسن کو سراہا کیوں۔ لیکن اس دن میری بات سن کر اس کا خجل ہو جانا واقعی افسوس کے قابل تھا۔ اس نے خیال کیا ہوگا کہ میں اس کے حسن سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں اور جو کچھ میں نے کہا وہ میرے دل کی آواز تھی —— دل کی آواز کیا ہوتی ہے۔ یہی شاید محبت جسے کہتے ہیں۔ واللہ مجھے اس سے محبت نہیں۔ میں اس قسم کے اداس سراپا سے متاثر ہو کر اس کے بارے میں سوچتا ضرور ہوں لیکن اسے محبت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میری آنکھوں میں تو دو اور ہی آنکھیں بسی ہوئی ہیں۔ سوئی سوئی ٹھنڈی آنکھیں جن میں کوئی طویل اور میٹھا خواب گھلا ہوا ہے۔ جو شاید ہمیشہ سوئی سوئی ہی رہیں گی۔ کبھی نہ جاگیں گی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دیکھنے والے کی طرف نہ دیکھیں گی —— اور ان دو سوئی آنکھوں کے نیچے دو سرخ اور شاداب ہونٹ مسکراتے رہتے اور مجھے خیال ہوتا کہ ان میں جتنا شہد ہے وہ جنت میں بھی نہ ملے گا — رانی کی آنکھوں میں یہ بات تھی نہ ہونٹوں میں۔ اس کے ہونٹ تو خشک تھے بھیگے ہونے کے باوجود خشک سے لگتے۔ ان میں حلاوت اور نشہ میں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ پھر میں رانی سے کیسے محبت کر سکتا ہوں۔ کاش میں نے وہ الفاظ نہ کہے ہوتے۔ کاش اس نے ان کا غلط مطلب نہ سمجھا ہوتا۔

وہ محبت کے ناقابل تو نہیں لیکن میں اس کے لئے نہیں بنا۔ اس سے کوئی اور بھی تو محبت کرتا تھا۔ کمار۔ کمار میرا دوست تھا۔ اسی نے بار بار رانی کی باتیں کرکے، اس کے حسن کے گیت گا کے مجھے ادھر متوجہ کیا تھا۔ ایک دفعہ یوں ہی ہم دونوں میں بات ہونے لگی۔ ہم دونوں جب ملتے تو دنیا کا کوئی موضوع سخن باقی نہیں رہ جاتا۔ ایک دن یوں ہی حسن کی بات ہونے لگی۔ میرا خیال تھا کہ آج تک میں نے حسن کو ایک ہی آدمی میں مکمل نہیں دیکھا۔ کسی کی کوئی چیز اچھی ہوتی ہے کسی کی کوئی اور حامد کی

گردن کی تراش بڑی نازک ہے۔ حسنی کے ہاتھ خوبصورت ہیں' نفیس کی آنکھیں پیاری ہیں' توشیل کماری کی کمر' نیلو کے بال اور نازلی کے پھڑکتے ہوئے ہونٹ۔ اس قسم کی تنقید کرنے سے ہمارا مقصد عیاشی نہ تھا۔ ہم دونوں بڑے شریف انسان تھے۔ ہم فلسفیوں کی سنجیدگی کے ساتھ ان کو پرکھتے تھے اور بعض اوقات آپس میں بحث بھی ہونے لگتی' مجھے جو، دہ نازک معلوم ہوتی کمار اُسے بھدا سمجھتا۔ گھنٹوں سنجیدہ بحث ہوتی لیکن ذاتی دلچسپی کسی میں ہمیں محسوس نہ ہوئی۔ ہاں میں اُن ان دیکھی سوئی سوئی آنکھوں سے متاثر ضرور تھا جنھیں میں نے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن پھر بھی ہمیشہ دیکھا کرتا تھا۔ جو ہمیشہ مجھے جانی پہچانی لگتی ہیں۔ کمار اس بات پر مجھے بنایا کرتا کہ میں جاگتے میں خواب دیکھا کرتا ہوں وہ خوابوں کا نہیں حقیقت کا قائل تھا اور اسی وجہ رانی کے متعلق خیال آرائی کرتا رہتا۔

ایک دن رانی ہمارے قریب سے گزری' اچھی سے اچھی ساری بھی وہ بڑی لاپروائی سے باندھتی' بال بنانے کا انداز بھی اسے نہ آتا اور یوں اپنے آپ کو بالکل اداس بنا لیتی۔ کمار کچھ دیر تک تو اس کا نگاہوں سے پیچھا کرتا رہا پھر بولا "یار سچ کہتا ہوں اگر میں اپنی مرضی کے موافق اس کو سنواروں تو ہندی افسانوں کی ہیروئین لگنے گی۔ سارے کالج میں کوئی مقابلے کی نہ نکلے پھر ——" بات ہوئی بھی اور ختم ہوگئی۔

اس دن مولسری کے پیڑ کے نیچے میں کمار کا انتظار کر رہا تھا۔ رانی بھی لجائے جسم چرائے وہیں آکر کھڑی ہوگئی۔ میں بلا ارادہ اسے غور سے دیکھتا رہا اور خواہ مخواہ بغیر اپنے الفاظ اور ان کے معنی پر غور کئے میرے منھ سے نکل گیا "رانی تم واقعی اچھی ہو۔ بالکل ہندی افسانوں کی ہیروئین۔" مجھے شاید یاد نہیں رہا کہ میں کمار سے نہیں رانی سے کہہ رہا ہوں اور یوں کہہ رہا ہوں جیسے اس سے دلی لگاؤ ہے۔ رانی کے چہرے پر سرخی سمٹ آئی۔ گردن جھک گئی اور اس کے ہونٹ بھیگے ہونے کے باوجود سوکھے سوکھے معلوم ہوئے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ میں نے بڑی بے جا بات کہہ دی۔ اب میں اسے مفہوم سمجھا بھی تو نہیں سکتا کہ بات اور بری نہ ہو جائے۔

اس کے بعد ایک دن ونود کے ہاں وہ دعوت میں ملی اور جوں ہی مجھ سے نگاہیں چار ہوئیں گلابی ہوگئی۔ مجھے بھی اپنی حماقت یاد آگئی۔ اس نے شاید شیل کماری اور نفیس سے اس کا ذکر کیا تھا۔ باقاعدہ لڑکیوں میں بحث ہوتی رہی اور اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلا کہ میں دل ہار بیٹھا ہوں۔ ونود کے ہاں موقعہ پاتے ہی ساری لڑکیوں نے گھیر لیا۔ نفیس نے پوچھا "بتائیے آپ نے یہ سب کیوں کہا تھا؟" میں اس کا جواب کیا دیتا۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ میں نے کہا "بھئی یہ اچھی ضرور ہیں۔ لیکن وہ ہیروئین والا جملہ کسی اور کا تھا اور یوں ہی میرے منھ سے نکل گیا۔" لڑکیاں بھلا میری بات کیوں ماننے لگیں! نیلو بولی "آپ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے "اور" کی آڑ کیوں لیتے ہیں" میں بے بس ہوگیا کہنا پڑا کہ "سنئے 'کسی' نے کہا تھا کہ انھیں اگر ان کی پسند کے موافق سنوارا جائے تو یہ ہندی افسانوں کی ہیروئین لگیں گی۔" شیل یوں ہنسنے لگی گویا اسے ہمدردی ہو مجھ سے۔ وہ سمجھی میں بات بنا رہا ہوں۔ میں کھسیانہ ہوگیا۔

حسنی آنکھ مار کر بولی "اچھا اچھا کسی اور کی پسند بیان کرو' تاکہ ہم اسے اسی ڈھنگ سے سنوار کر ہیروئین بنا دیں۔" میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں' آخر میں نے کہہ دیا "کہو تو ان سے پوچھ کر بتا دوں!" —— سب ہنسنے لگے گویا میں جان جان کر جھوٹ بول رہا ہوں۔ ان کی غلط فہمی دور کرنا تو میرے بس کی بات نہ تھی۔ آخر انھوں نے وعدہ لے کر ہی چھوڑا کہ میں دوسرے دن ضرور پوچھ کر بتا دوں گا۔

دوسرے روز کمار سے کچھ بحث ہونے لگی اور مجھے

یاد آگیا۔ پہلے اپنی مصیبت کا سارا حال کہہ سنایا کہ کس
طرح رانی کو وہ چاہتا ہے اور الزام میرے سر ہے۔
سن کر وہ پہلے تو چپ رہا — "بات تو ٹھیک ہے۔
اسی طرح ایک بار تو میں اسے ہیروئن بنا دیکھ لوں گا —
سن اس کے پاس ایک سرمئی رنگ کی سلک کی ساری ہے
جس پر چوکور نقش بنے ہیں۔ وہ ایک دن ڈھنگ سے پہنے
ذرا اونچی آستینوں کا چست پھنسا پھنسا بلاؤز پہنے، کانوں
میں نئی وضع کے ٹاپس، بال اچھی طرح بنائے کہ پیشانی
نمایاں ہو اور ان میں پھول سجائے، کلائیاں بھر بھر چوڑیاں
پہنے، ماتھے کی بندیا کچھ نمایاں ہو۔ گلے میں وہ زنجیر ڈالے
جو وہ پہلے پہل پہنا کرتی تھی۔ بس اور ہاں وہ ساری اس قدر
پہنے کہ آنچل کو لہرانے دے۔ بس ایک دن صرف
ایک دن —" میں یہ سب کچھ سن کر ہنس پڑا۔ کمار کو کس قدر
تفصیلات یاد تھیں۔ مجھے عورت تو یاد رہتی ہے اس کا لباس
اور دوسری ذیلی باتیں یاد نہیں رہتیں۔ یہ باتیں سن کر میں نے
سوچ لیا کہ لڑکیوں کو یونہی ٹال دوں گا بھلا یہ باتیں بھی
ان سے کہنے کی ہیں۔

مگر تو کیجئے جو یہ حوا کی بیٹیاں مان جائیں کبھی۔
بات کہہ کر یہ کبھی نہیں بھولتیں۔ لائبریری کے برآمدہ میں
لڑکیوں کی فوج کھڑی تھی۔ میں بری طرح گھر گیا۔ اکیلا تھا اس لئے
گھبرا گیا۔ آخر مجبوراً رک رک کر مجھے بتانا پڑا کہ وہ "سرمئی رنگ
کی دھاری دار ساری پہنے، بالوں میں پھول سجائے، چست
اٹھی ہوئی آستینوں کا بلاؤز پہنے کہ مانو کندھوں پر دو کبوتر
بیٹھے ہیں۔ کانوں میں ٹاپس، کلائیوں میں چوڑیاں آنچل
لہراتا رہے۔" میں تو کسی ادبی جلسہ کی روداد ایک سانس میں
سنا گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو سب کی سب بری طرح ہنس
رہی ہیں۔ ان سب کے پیچھے میں نے رانی کو دیکھا سمٹی سمٹائی
لجائی ہوئی کھڑی تھی۔ گال زیادہ گلابی ہو گئے تھے۔ جھکی
جھکی آنکھوں کی اداسی اور زیادہ چمک گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں
کے کونوں میں دبی دبی کوئی چیز ابھری اور رک گئی —

مجھے میرے اپنے ہونٹ جلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں
پلٹ پڑا۔

شیلا نے مجھے روک لیا اور کہنے لگی "اچھا ہم رانی
کو بنا سنوار کر ہیروئین بنا دیں گے۔ لیکن ہمیں کیا ملے گا۔
چاکلیٹ کھائے بہت دن ہو گئے۔ وعدہ کرو تو ہم سفارش
کریں۔" "بھئی مجھے سفارش کی ضرورت نہیں اور نہ یہ
میری خواہش ہے تو تمہیں چاکلیٹ کھلاؤں۔" تو اس نے
کہا "اچھا تو کسی اور سے کہہ دیجئے کہ کھلا دیں" میں جھنجلا کر
بول اٹھا "بھئی میں اب زیادہ سفارت کا فریضہ انجام
نہیں دے سکتا مجھے چھوڑ بھی دو۔" ایک قہقہہ پڑا اور
میں نے دیکھا کہ ان ہنسی سے سرخ سرخ لڑکیوں کی
فوج کے پیچھے سے دو مسکراتی اداس آنکھیں ایک لمحہ کو
اٹھیں پھر نیچے جھک گئیں۔ شاید انھوں نے کچھ کہا بھی تھا
میں نے سمجھا نہیں یا اگر سمجھا تھا تو بھول جانا چاہتا ہوں۔

جب ہنسی ختم ہوئی تو ساری کا معاملہ پھر سے
شروع ہوا۔ کونسی ساری؟ کیسی تھی وہ؟ واللہ مجھے
خود اس ساری کا رنگ یاد تھا نہ وضع۔ میں کیا تفصیل
بتاتا۔ میں نے کبھی بھی اس کی ساری سے محبت نہیں
کی تھی۔ جب ہر لڑکی باری باری بول چکی تو آہستہ سے
کسی کی آواز آئی۔ معلوم نہیں ہمیشہ اس میں اتنی
موسیقیت رہتی ہے یا نہیں مگر اس وقت مجھے
یوں لگا کہ دور بہت دور کسی ٹھنڈی جھیل کے کنارے
پھولوں میں گھرا ہوا کوئی پپیہا چپکے سے "پی" بول اٹھا۔
رانی بولی "اس ساری پر میں نے دوسرا رنگ چڑھا دیا۔
اور وہ زنجیر بھی ٹوٹ گئی — —" وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے
اسے واقعی افسوس ہو معصوم رانی۔ بھولی بھالی لڑکی ان
شریر لڑکیوں کی بات کو حقیقت جان رہی تھی۔ کاش
اے کاش اسے معلوم ہوتا کہ یہ میرے دل کی نہیں کمار
کے دل کی آواز ہے۔ میں نے تو صرف ترجمانی کی تھی۔ خیال
اس کا زبان میری۔ اب میں کیسے سمجھاؤں؟

میں جانے مڑا ہی تھا کہ نیپو نے روک لیا "کہاں چلے ہیں جناب؟ لائیے ساری تحفہ دیجئے اور دوسری چیز مہیا کرنے روپے نذر دیجئے۔ اب آپ یوں سستے نہ چھوٹیں گے۔"
"میں گھبرا کر بولا" بھئی میں کب انھیں بنا سنوار دیکھنا چاہتا ہوں جو ساری تحفہ دوں" ——— وہ لڑکیاں سمجھ رہی تھیں کہ میں واقعی رانی کو چاہتا ہوں۔ وہ سب ہنسنے لگیں۔ حسنیٰ بولی "بڑے معصوم بنتے ہیں آپ۔ بہت چھپا کسی اور کی آڑ میں شکار چھپے رستم ہیں جناب نکالئے روپے۔ چاکولیٹ کھائے بھی بہت دن ہوگئے۔"
میں نے دل ہی دل میں گڑگڑا کر دعا مانگی "اے خدا تو مجھے بچالے۔ یہ کیسی حماقت ہوئی ہے مجھ سے۔ کیسی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اسے ہیروئن بنایا تھا۔ اے اللہ میں کیا کروں" میں نے ہمدردی کے لئے نفیس کو دیکھا۔ مگر وہ خود بھی ہنس رہی تھی مجھے بنا رہی تھی۔ جب میں بڑی مشکل سے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تو میری عجیب حالت تھی۔ برسات کے اس ٹھنڈے بھیگے موسم میں، میں پسینہ میں ڈوب گیا۔ بال پریشان، ہونٹ خشک اور جب میں نے مولسری کے جھنڈ میں پناہ لی تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا کہ یوں کبھی نہ دھڑکا تھا۔ دو۔ مجھے کمار آتا ہوا دکھائی دیا۔ میرے سینے میں دل خون ہوگیا اور بوند بوند آنتوں میں ٹپکنے لگا۔ اندر ہی اندر میں خوف کھا رہا تھا۔ کس سے؟ رانی سے! کمار سے یا پھر اپنے آپ سے! میں سمجھ نہ سکا۔

اور اب بھی جب رانی کہیں ادھر ادھر مل جاتی ہے اور ایک لمحہ کو ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ آسمان کی بلندی پر کئی ستارے آپس میں ٹکرا گئے اور ان کی چنگاریاں میرے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ رانی کا سر جھک جاتا ہے۔ چال میں زیادہ لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے اداس چہرہ پر مایوس شفق پھوٹنے لگتی ہے۔ وہ آخر کیا خیال کرنے لگی ہے۔ اور میرے ذہن میں دو سونی سونی آنکھیں ابھرتی ہیں۔ شاداب ہونٹ مسکرا اٹھتے ہیں اور میں چونک کر آپ ہی آپ کہتا ہوں "میں نے یہ کیا کیا ——— رانی سے مجھے محبت تو نہیں" ——— معلوم نہیں کیوں میں نے رانی سے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ تم ..."

زینت ساجدہ

رات کا بھولا اور دیگر افسانے: - پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائیٹل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

مَن کی دنیا - حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی ایم اے کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔ ہر فسانہ رعنائی خیال اور رنگینی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستارانِ افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہوں گے۔ صفحات ۱۶۰ قیمت مجلد عہ

جدید اردو ادب میں عورت کا مقام

مرد جذباتی انتہا پسند ہوتا ہے۔ عورت کے بارے میں اس کی انتہا پسندی بعض اوقات حد اعتدال سے گزر جاتی ہے۔ کبھی اس کے قلم سے عورت کی اتنی تعریف و توصیف نکلتی ہے کہ وہ اسے "دیوی" اور "حور" جیسے پاکیزہ ناموں سے یاد کرتا ہے اور کبھی "طوائف"، "کسبی" اور "پیشہ ور" جیسے نام دیتا ہے۔ عورت نے زندگی کی تصویر میں اپنے وجود سے رنگ بھرا ہے اور مرد اسی تصویر کو دیکھ کر جیتا ہے۔ اسی عورت کے لئے وہ سب کچھ کرتا ہے، کر رہا ہے اور کرے گا جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے اور ہوگا وہ "ایک عورت" کے لئے ہوا، ہو رہا ہے اور ہوگا۔ عورت نے مرد کے افسانۂ حیات کو مکمل کیا اور یہ افسانہ زبانوں سے نکلا، صفحۂ قرطاس پر رقم ہوا اور ہوتا رہے گا۔ ادب، آرٹ اور فن اسی عورت کے اطراف گھومتے رہے ہیں اور گھومتے رہیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زمانہ کسی خاص قسم کے عمل کا ہوگا تو دوسرا ردِ عمل کا اور یہ عمل و ردِ عمل کا سلسلہ جب تک دنیا باقی ہے، اس میں مرد و عورت کی زندگیوں کا وجود باقی ہے باقی رہے گا۔

ادب زندگی کی تصویر ہوتا ہے۔ زندگی داخلی اور خارجی اثرات کے دباؤ سے ادلتی بدلتی رہتی ہے اسی لئے ادب ان تمام ذہنی، احساساتی اور نظریاتی تغیرات کی عکاسی کرتا ہے جو زندگی کو نئے نئے سانچوں میں ڈھالتے رہتے ہیں اور جن کا تعلق براہ راست شعوری بہاؤ سے ہوتا ہے۔ ادب خواہ برائے ادب ہو کہ برائے زندگی دونوں صورتوں میں زندگی سے متعلق ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میں خیالات مسائل حیات کے نہیں بلکہ فنی لطافتوں کے گرد گھومتے ہیں اور دوسرے میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے صرف حیات اور اس کی ساری اچھائیوں اور برائیوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی قدروں کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اس کا اصل مطمح نظر ایک اعلیٰ زندگی کی تشکیل ہوتی ہے جس کی انتہائی شکل نیٹشے، برنارڈ شاہ کے "کامل انسان" یا (Superman) کی بسائی ہوئی دنیا کا تصور ہوتا ہے۔ دنیا کا ادب تو دنیا جیسا وسیع و بسیط ہے، میں صرف اردو ادب اور اردو ادب میں بھی جدید اردو ادب میں عورت کے مقام پر ایک طائرانہ نظر ڈالوں گی کیونکہ وقت کے پر ہوتے ہیں اور میں پندرہ منٹ جیسے قلیل عرصے میں اس سے زیادہ کی جرات نہیں کر سکتی۔

آج کل کے اردو ادب کے ناموں میں سب سے زیادہ نمایاں "ترقی پسند" ہے۔ یہ "ترقی پسند ادب" اگر بہ نظر غور دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ محض ایک ڈھونگ، ایک صریحی غلط پروپگنڈا اور صرف جنسیاتی مظاہروں کی نمائش گاہ نہیں ہے۔ اس پر تنقید کرنے سے پہلے ہمیں اپنے ارد گرد کی زندگی پر بھی نظر رکھنی چاہئے اور ادیب زبان، قلم سے وہی بولتا ہے، جو اس کی آپ بیتی ہوتی ہے یا جس کا وہ مشاہدہ کرتا ہے۔ صرف اس جنگ کے زمانے ہی سے نہیں بلکہ گزشتہ جنگ کے زمانے ہی سے ہندوستانیوں میں اتنی بیداری پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اپنے سیاسی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی اور ادبی ماحول کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنے لگے ہیں اور اگر سمجھنے نہ بھی لگے ہوں تو کم از کم شدت سے محسوس ضرور کرنے لگے ہیں۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزرے غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

اور آج کل غالب کا یہ احساس اس قدر شدید ہو گیا ہے کہ عام طور پر ادیب و شاعر یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ جیسے خدا کچھ کر ہی نہیں رہا ہے، وہ دیکھتا سب کچھ ہے پر کرتا کچھ نہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان آزادی، امن و سکون، اور سب سے بڑھ کر اطمینان قلب کے لئے جیسے ترس رہا ہے۔ سرمایہ دار سب کچھ رکھ کر نادار ہیں اور نادار کے تو پوچھنے ہی کیا۔

لیکن اب نادار کو اپنی ناداری کا احساس ہوگیا ہے اور سرمایہ کی اس غیر اصولی تقسیم کے خلاف وہ احتجاج کر رہا ہے۔ اس کی ایک اچھے پیمانے پر زندگی بسر کرنے کی خواہش اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہر "ذریعہ" کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ایسی خواہش ہی کیوں پیدا ہوئی تو آپ اس محرک کو کیا کہیں گے "جو نفس امارہ" کے نام سے موسوم ہے۔ ریشم و دیبا ایسے ہی اتنے نفیس و لطیف ہیں کہ ان پر ہاتھ پھیرنے کی خواہش ہر دیکھنے والے کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات اب افسانہ بن گئی کہ "نفس" یا "دل" کو قابو میں رکھنا ضروری تھا۔ اسے بس میں رکھنے والے جانے کس مٹی کے بنے ہوتے تھے۔ قناعت پسندی کے تصور سے جمود پیدا ہوتا ہے اور آدمی میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی حس خاموش ہو جاتی ہے۔ اس "مشینی دور" میں انسان کو کسی آسمانی امداد سے زیادہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ ہے زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف عقل کی روشنی مشعل راہ منزل نظر آتی ہے۔ ایسا محسوس کیا جا رہا ہے کہ مذہب و اخلاق کے اصول انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور بہ حیثیت انسان کے ان کو اب بھی توڑا جا سکتا ہے۔ ان میں رد و بدل ہو سکتا ہے اور انہیں ایک بلند ارتقائی شکل بخشی جا سکتی ہے، جنت و دوزخ، نرگ اور سورگ کا تصور اب دلوں سے محو ہو رہا ہے، زندگی کی خوشیاں جنت اور اس کی مصیبتیں جہنم ہیں۔

عورت کی فطرت بے حد لچکیلی ہوتی ہے جس طرح پانی جس برتن میں ڈالا جائے اسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے اسی طرح عورت جس ماحول، جس رنگ اور جن حالات میں رہتی ہے خود کو اسی کے موافق ڈھال لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذاہب عالم کی اساس اور اخلاق انسانیت کی بنیاد سچ پوچھئے تو عورت ہی کی ذات پر ٹکی ہوئی ہے۔ اس کے ذہنی اور دماغی توازن پر حیات انسانی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ جہاں یہ توازن بگڑا حیات انسانی بے بادبان کشتی کی طرح کائنات کے بحر ذخار میں ڈول جانے لگتی ہے کیونکہ کائنات کی جان مرد اسی کی گود کا پالا ہوتا ہے اسی کی گود میں افلاطون اور سقراط جیسے نابغۂ روزگار بچے اور اسی کی آغوش میں نیرو جیسا ظالم پرورش پایا، یہ دونوں قسم کی اولادیں اس کے مد و جزر حیات کی مظہر ہیں۔

وہ زمانہ گیا جب عورت پردوں میں رہا کرتی تھی، وہ اپاہج تھی، معذور تھی، اس میں کوئی قوت ارادی نہ تھی اس میں کوئی بیداری نہ تھی۔ اب وہ مردوں کے دوش بدوش زندگی کے میدان میں اتر آئی ہے۔ اگر کسی کو اس کی یہ آزادی ایک آنکھ نہیں بھاتی تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا یہ آنکھ کا اپنا قصور ہے۔ وہ آنکھ اس کے ہم دوش کی آنکھ نہیں آج سے پچاس برس پہلے کی پیدا شدہ آنکھ ہے اور اس آنکھ کی اسے کوئی پروا نہیں اس کی آنکھ تو دور کہیں افق پر لگی ہوئی ہے۔

آج سے پچیس سال پہلے کے اردو ادب میں اس "جمہوریت پسندی" کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں جو آج بہت زیادہ پھیل گئے ہیں۔ پہلے عورت نذیر احمد، رسوا، سرشار، شرر وغیرہم کے پاس گھر گرہستی، عقیل و فہیم، ایک خاص نوابی آن اور شاہانہ حیثیت کی مالک تھی تو اس ربع اول کے آخر میں وہ پریم چند کے متوسط اور ادنیٰ طبقوں کی قدرے خوش حال اور رو دھو کر زندگی بسر کرنے والی اور بعض اوقات فاقے کر کے گزارا کرنے والی عورت تھی۔ لیکن پریم چند والے طبقے میں بعض ایسے ادیب بھی ملتے ہیں جو محض فن برائے فن کے قائل ہیں۔ امتیاز علی تاج کے ہاں عورت کا مقام ملاحظہ فرمائیے، انارکلی جیسی عزیزہ سے گم ہوگئی اور شہزادہ سلیم نے اس کے ماتم کی بجائے اپنی "شکست آرزو" کا ماتم کیا!

دور حاضر کی ابتدا بہت ہی سست سی ہے۔

عظیم کونوی، علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی، اپندر ناتھ اشک اور شبیر حسن، عصری رجحانات سے متاثر ضرور ہیں لیکن ان کے افسانوں میں وہ حرکت اور وہ عمل نہیں جو اب چند سالوں سے، میرا خیال ہے ۱۹۳۸ء کے بعد سے، پیدا ہو گیا ہے اور اس شدت سے پیدا ہوا ہے جیسے کوئی رکا ہوا طوفان یکایک پھٹ پڑا ہو۔ ترقی پسندی اندھی حقیقت نگاری ہرگز نہیں ہوتی اس میں مشاہدہ اور تخیل ہوتا ہے، ادب نہ صرف ترجمان حیات ہوتا ہے بلکہ وہ ناقد اور مفسر حیات بھی ہوتا ہے۔ سچا ادب تو حال کی تصویر اور مستقبل کے لئے "اشاریہ" ہوتا ہے۔ نری حقیقت نگاری" فطریت ——— Naturalism) کی بے اثر تحریک میں گم ہو جاتی ہے۔

جدید اردو ادب میں ۱۹۳۸ء بہت اہم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت تک جو مطالعہ ادیب کرتے اور جن مسائل پر غور و خوض کرتے رہے وہ اب یکایک ان کے قلم سے نکل پڑ رہا ہے اور کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، مہندر ناتھ، فیاض محمود، دیوندر ستیارتھی، اختر انصاری، اختر اورینوی، حسن عسکری اور ممتاز مفتی اس بساط کے اہم مہرے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے ملک کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ادبی زندگی کا مطالعہ کیا ہے بلکہ یورپ اور امریکہ وغیرہ دیگر ممالک کے ان سارے مسائل کی بھی واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ ان ادیبوں میں اکثر نے جیمس جوئز، ڈی ایچ لارنس اور فرائیڈ جیسے موجودہ زمانے کے سب سے بڑے ماہران نفسیات و جنسیات کا مطالعہ کیا ہے اور بعضوں نے تو اپنی ادبی زندگی کی باگیں اسی راہ پر موڑ دی ہیں۔ یہ لوگ جنسیات اور اس کی مختلف کیفیات کے متعلق لکھتے ہیں اور ان کا ادعا ہے کہ جنسی مسائل ہر دور میں پائے جاتے ہیں البتہ انھیں سائنٹفک اصولوں سے اب تک حل نہیں کیا گیا تھا۔ اس جنسی تعلیم کی روشنی میں انھیں وہ اخلاقی قدریں جو انسان کو جکڑے ہوئے ہیں بری معلوم ہونے لگی ہیں اور وہ انھیں توڑ پھینکنے میں مصروف ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں ان کا فطری میلان لازمی ہے بعض معاشی اور معاشرتی پابندیوں نے ان دونوں کے اس بندھن کو توڑا ہے اور آج عورت کی سماج کے خلاف بغاوت انہی پابندیوں کو توڑنے کی کوشش ہے۔ احمد عباس کے افسانہ "بارہ گھنٹے" "کوڑھے" اور اس بغاوت کی معراج ملاحظہ فرمائیے جنسیات اور اس کے پیچیدہ مسائل کو سب سے پہلے عظیم بیگ چغتائی نے اپنے خاص رنگ میں پیش کیا۔ متوسط طبقے...... کی لڑکیوں کی ذہنی کیفیات ان کی الڑھ پن کی شوخیاں، بے باکیاں، انھوں نے اس رنگ سے بیان کیں کہ قاری کا ذہن اس تصویر میں فلم کا لطف لینے لگا۔ ان کے بعد عصمت چغتائی نے عورت کو اس زمانے کی عورت کی حیثیت سے اس کے خاص رنگ میں پیش کیا۔ عصمت کے نسوانی کردار زندہ، چلتے پھرتے، مصیبتوں میں روتے بعض وقت اس عالم میں بھی مسکراتے، خوشیوں میں ہنستے، خطروں اور حادثوں کے وقت دماغوں کو استعمال کرتے ہیں۔ اخلاق و کردار کا اعلیٰ سے اعلیٰ اور بدتر سے بدتر نمونہ اس نے پیش کیا۔ اس کے ہاں حجاب کی پریوں کی کہانیاں نہیں۔ فرانسیسی دیدیوں کی بجائے "جھری" ہے اور عالی شان، خوبصورت پائیں باغوں کی بجائے بڑا کی سڑی، گندی کوٹھڑی ہے۔ دادی زبیدہ، روحی اور نسرین کی بجائے الہ بی، زہرہ، طلعت، رفیعہ اور ریحانہ وغیرہ ہیں جو ہم سے ملتے ہیں، لڑتے ہیں، جھگڑتے ہیں۔ ان کی شرارتوں پر جی کھولتا ہے اور پھر ان کو پیار بھی کرتا ہے۔ ممتاز مفتی کی "آپا" اور "چھاجو باجی" ہندوستان کے

پچاس فی صد گھرانوں میں ملتی ہیں پچھلے زمانے میں اگر عورت چلمن سے جھانک لیتی تھی تو وہ اب عصمت کی کالج کی شوخ لڑکی اور حسن عسکری کی "حرامجادی" بن گئی ہے۔ رسوا کی تہذیب یافتہ امراؤ جان ادا اس صنعتی دور میں منٹو کی "ہتک" بن کر "کالی شلوار" پہن چکی ہے، عصمت نے "لحاف" اٹھایا ہے اور اس میں سے جو "بو" آنے لگی ہے وہ اس گندگی کا تصور ہے جو خوبصورت ریشمی لحافوں کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ منٹو نے "قحبہ خانوں" کا مشاہدہ کیا ہے بقول کرشن چندر "منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے، چھوا ہے، چکھا ہے، اور اب وہ تیز نشتر بن کر سماج کے فاسد مادہ کو خارج کر دینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مریض چیختا ہے چلاتا ہے، بین کرتا ہے۔ منٹو کو اس کی پروا نہیں وہ اس قدر بے رحم ہے کہ لوہ قائم دنیا بھی پسند نہیں کرتا" اور عورت کو یہ مقام در اصل مرد ہی نے عطا کیا ہے، محض اپنے جرم کو چھپانے کے لئے اس سے گریزاں ہے اس کے منہ پر انکار کر جاتا ہے کہ وہ اس سے محض آشنا بھی نہیں۔ منٹو کے ہاں مس فریا، مسز ڈی سلوا سے لے کر ممی تک لڑکی تک کئی کرسچین لڑکیاں ملتی ہیں جو آج کل خصوصاً اس جنگ کے زمانے کی "زیادہ سو لجر اگاؤ" مہم کی خصوصی پیداوار ہیں۔ کرشن چندر نے کشمیری عورت کی زندگی کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ کشمیر صرف جنت نظیر ہی نہیں صرف چشم و نظر کی راحت ہی نہیں اگر اسے چشم بینا سے دیکھیں تو رنگ و بو کی وہ تصویر ہے جس کو اندر ہی اندر کیڑا کھا چکا ہے۔ اور اس خطۂ ارم کی یہ ایک حقیقت ہے کہ اس چشمہ سے لے کر اس چشمہ تک اور اس لاری سے لیکر اس لاری تک کئی ایک "بشیدا بیب" پھرتی ہیں اور نہ معلوم کب تک ماحول انہیں اس طرح پھرنے پر مجبور کرے گا۔ کرشن چندر نے زندگی پر وسیع نظریں ڈالی ہیں اور "سورج کے چابک دست ماہی گیر" کی طرح زندگی کی اہم موضوعات کو اپنے فن اور تخیل کے جال میں سمیٹ لیا ہے۔ چنانچہ چندرا، دنتی، سرائے کی لڑکی وغیرہ اس کے ایسے کردار ہیں جو بیک وقت رومانی، خوددار اور افلاس زدہ ہندوستانی عورت کی زندگی کے علاحدہ علاحدہ ترجمان ہیں۔ اس طرح اس کی فن کاری نے سماج کے جنتی اور جہنمی دونوں رخوں کی تصویریں کھینچی ہیں۔ بیدی گو کرشن چندر تک نہ پہنچے لیکن عورت کی اس کے ہاں مکمل تصویر ہے۔ اس کی عورت کی نمایاں خصوصیت اس کی اس حد تک ذہانت ہے جہاں خشک مزاجی پیدا ہو جاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی "صبوحی" پنجاب کی "آتشیں گر شباب" کا لرزاں، رقصاں اور غنداں نمونہ ہے۔ اس کے ہاں عورت وہ بدستِ پنگھٹ والی ہے جس کے کانوں کو پتلی پتلی بالیاں چومتی رہتی ہیں، جس کی زلفوں میں گھٹاؤں کا سا رنگ اور آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک ہے۔ جن کے چلنے میں ہواؤں کا سا انداز ہے جس کا سینہ چھلکتا ہوا میکدہ ہے اور جس کے ہونٹ پیمانوں کے لب! دیویندر ستیارتھی خود خانہ بدوش ہے اس کے سارے کرداروں اور ان کی زندگیوں پر خانہ بدوشیت سی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی کشادگی "وسعت اور لاابالی پن بھی وابستہ ہے — علی عباس حسینی نے ایسا نوفیق تنہائی" ڈھونڈ رہے جس نے اپنے آپ کو قدامت کے شکنجوں سے چھڑا کر جدت کی شاہراہوں پر ڈال دیا ہے۔

بقول عبادت بریلوی ان ادیبوں کے علاوہ "دوسرے لکھنے والوں کا ایک جنگل نظر آتا ہے" جس کی زیادہ تر نمائندگی نوجوان طبقہ کر رہا ہے۔ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ریاض روفی، ممتاز شیریں، ابراہیم جلیس، عزیز احمد، شکیل اختر، قرۃ العین حیدر، شمس آغا وغیرہ کے نام سب سے نمایاں ہیں اس طبقے میں عورتیں بہت نہ ہی کچھ زیادہ ہی نظر آتی ہیں اور یہ آج کل کی تعلیم دیگر ممالک کے ادبیات، یا سیاسیات اور تمدن سے واقفیت کا نتیجہ ہے۔ تعلیم یافتہ عورتوں نے

ادب میں حصہ لیا اور نمایاں حصہ لے رہی ہیں' بقول سعود زاہدی صاحب "کہیں کہیں تو جنسی عریانی میں یہ عورتیں مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہیں" اور اس طرح جدید اردو ادب میں عورت اسکول مسٹریس' بھکارن' مہترانی' سڑک پر کنکر توڑنے والی' مزدورنی' کا چھن' بازاری عورت' کالج کی لڑکی' مغرب زدہ فیشن ایبل عورت' دیہاتی الہڑ سادہ لوح لڑکی' بے وقوف ادھیڑ سن رسیدہ عورت (جس کو اپنی جاتی جوانی کو سنبھالنے کا بڑا خیال ہوتا ہے) غرض مختلف حیثیتوں سے نظر آتی ہے - وہ پچھلے دور کی "دیویاں" اور "حوریں" اب نہیں رہتیں - اب تو کبھی گندی نالی کی سڑاند آتی ہے کبھی گھٹیا قسم کے عطر اور سینٹ کی بو' جن سے طبیعت الجھنے لگتی ہے اور کبھی کبھی خالص فرانسیسی سینٹ کا ایک ایسا بھپکا بھی آجاتا ہے جس سے طبیعت کو فرحت سی ہو جاتی ہے - لیکن بعد میں گرانی سی بھی ضرور ہوتی ہے -

جب سے غزل کی بجائے نظم کا رواج زیادہ ہوا نظموں میں محبوب کا تصور خصوصی طور پر عورت کی ہستی پر چھا گیا - اب مرد محبوب نہیں' وہ محبوب خاص پیش نظر ہے جس کی

بولتی آنکھوں کا اس گل رنگ عارض کا جمال

ایک "مسکراتا سا تصور" اور ایک "گنگناتا سا خیال" بنا ہوا ہے - لیکن زندگی اس دور سے گزر رہی ہے جس میں "آگے چلیں گے دم لے کر" کی فرصت نہیں اور یہ عدیم الفرصتی "محبت کی فرصت" تک نہیں دیتی - محبت کی "نعمت عظیم" عورت کی "لذت جاں بخش" اور اس کی آغوش کے "مسرت آگیں" ہونے میں کلام نہیں لیکن شاعر مجبور ہے اور اسے ع

انگنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم

توڑنے ہیں جو ع

ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے

ہیں - اس لئے وہ اپنے محبوب سے کہتا ہے ع

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

کیونکہ سے اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

لیکن اتنا سوچنے کے باوجود شاعر انسان ہے اس کا دل گوشت پوست کا ایک ٹکڑا ——— وہ "صرف روح" یعنی (Mere Soul) اور نہ ہی "صرف مضغۂ گوشت" (Just Flesh) محبوب کے عارض سیمیں پر اشکوں کے قطرے دیکھ کر وہ بے قرار ہو جاتا ہے - اسے ان آنسوؤں کی وجہ معلوم ہے' اس لئے وہ اسے اطمینان دلانا چاہتا ہے کہ تمہیں رونے کی ضرورت نہیں میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں سے

مجھ کو اک لمحہ کبھی چین بھی آیا تجھ بن

عشق ہی ایک حقیقت تو نہیں ہے لیکن

زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم!

اور انجم کو اپنے گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لے کر افلاس' سرمایہ و محنت کی جنگ' محکومت اور غلامی کے خلاف بغاوت کرنے کا مشورہ دیتا ہے سے

تو بھی آ وقت کے سینے میں شرارہ بن جا

تو بھی اب عرش بغاوت کا ستارہ بن جا

زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم!

اور جب وہ "زندگی" کے مصائب کو ختم کرنے کی مہم پر روانہ ہونے لگا تو اس کا دل ایک بار پھر لرزا ع

اف! یہ بھیگی ہوئی پلکیں یہ لرزتے ہوئے ہونٹ!

اور ان سے پریشان ہو کر وہ چیخ اٹھا سے

دیکھ! اب اور پریشاں تو نہ کر | زندگی ہے تو پلٹ آؤں گا
میں تری یاد کو دل میں لے کر | ہر مصیبت سے گزر جاؤں گا

دیکھ اب [illegible]

مجھ کو مت روک' مجھے جانے دے!

زندگی کی یہ پریشانیاں' لاچاریاں اور مجبوریاں ہیں لیکن

بقول شخصے "جب تک سانس تب تک آس" اسے امید ہے کہ اس کے دن بیک نہ ایک دن ضرور پھریں گے۔ یہ عصری رجحان ہے باوجود ہر قسم کی مایوسی کے امید کا دامن چھوڑا نہیں جاتا' اسی کے سہارے سب جی رہے ہیں' ایک اعلیٰ اقدار کی حامل زندگی سب کو نظر آرہی ہے اشار کہتا ہے ؎

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
چند روز اور ستم سہہ لیں' تڑپ لیں' رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

کیونکہ یہ ناجائز پابندیاں اس قدر سخت ہوچکی ہیں کہ ؎

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے رہتے ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں

ہے "حق کی فتح" کا اتنا یقین ہے کہ وہ عزم

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے یہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

اس طرح الطاف مشہدی و ندیم قاسمی سے لے کر فیض و جذبی یوسف ظفر و اختر الایمان سے لے کر مجاز و مخدوم' علی سردار جعفری و جاں نثار اختر سے لے کر روش صدیقی و سلام مچھلی شہری اور مخمور جالندھری سے لے کر میکش تک سبھوں نے عورت کو محبوبہ' بیوی' پجارن' بھکارن' طوائف' کالج کی تعلیم یافتہ' سوسائٹی گرل اور مزدورنی کے روپ میں پیش کیا ہے' یہاں تک کہ فیض نے اسے سیاست کے جھمیلوں میں گھسیٹا کیونکہ اب ہر طرف بغاوت کی آگ پھیلی ہوئی ہے انوال میں ۱۹۵۱ء میں [illegible] میں اور ساتھ ہی اسے یہ مشورہ دیا ہے کہ ؎

تو اس دامن کو اب پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

سعیدہ مظہر

بۂ استقبالیہ کل ہند ترقی پسند کانفرنس

(عالی جناب ڈاکٹر زور صاحب نے کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے اجلاس حیدرآباد دکن منعقدہ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا تھا وہ درج ذیل ہے)

خواتین و حضرات !

میں بڑی مسرت کے ساتھ آج آپ کے اس اجتماع کا خیر مقدم کرتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے
ول اور تبادلۂ خیال سے اردو زبان اور ادب کو دیرپا فوائد حاصل ہوں گے اور ہماری آپس کی بہت سی
ہموں اور خامیوں کا ازالہ ہو سکے گا۔ ہماری زبان کی ایک بہت بڑی خوبی آج ہماری سب سے نمایاں خرابی
ئی ہے۔ ہم سب اس حقیقت حال پر فخر کرتے ہیں کہ ہماری اردو زبان ہندوستان جیسے وسیع ملک کے
ے گوشے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس ملک کے ہر خطے میں۔ خواہ وہاں کی مقامی زبان کوئی ہو۔ اردو ہی
یسا ذریعہ ہے جس سے مختلف مذہبوں اور نسلوں کے لاکھوں انسان ایک دوسرے کے رنج و راحت کو
تے اور اپنی سماجی ضروریات کی سربراہی کر سکتے ہیں۔ لیکن مختلف اقطاع ملک کے اہل اردو کے باہمی اختلافات
[illegible] انتشار کے باعث ہماری زبان کا یہ ہنر ہمارے لئے عیب بنتا جا رہا ہے۔ ہمارے بڑے سے بڑے
یب اور شاعر وسیع نظری اور رواداری سے محروم ہیں اور ہماری اکثر و بیشتر انجمنیں اور جماعتیں پست
لی اور کوتاہ بینی کا شکار بنتی جا رہی ہیں۔ ایک جماعت دوسری جماعت کے قیام اور ایک فرد دوسرے
د کے وجود کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اہل اردو کی نظر میں ہر نئی تحریک کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔
ر ہر شخص دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔

سال گزشتہ جب کل ہند اردو کانگریس کا ایک اجلاس ترقی پسند تحریک کے لئے وقف کیا گیا تو میرے
ایک خاص دوست جو اس تحریک کے روح رواں ہیں اور آج کے اس اجتماع میں دوسری بار میں ان کا
ی مسرت سے استقبال کر رہا ہوں، بہت حیران ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ

> ”ہماری نظر میں حیدرآباد تو آخری مقام تھا جہاں یہ تحریک اثر انداز
> ہو سکتی تھی۔ لیکن اردو کانگریس کے اس اقدام سے ہم کو اپنی رائے
> بدلنی پڑی۔“

اس وقت تک میرے ان فاضل دوست کو ترقی پسند حیدرآباد کے دیرینہ رجحانات سے شاید واقفیت نہ تھی
اور یہ حقیقت ان کی نگاہ سے اوجھل تھی کہ یہ سرزمین صدیوں سے اس خصوص میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے
اور اردو زبان تو خاص طور پر اس ملک کے ترقی پسندانہ رجحانات ہی کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ آج سے
چار پانچ سو سال قبل جب کہ فارسی زبان تمام ہندوستان کی سرکاری اور علمی و ادبی زبان سمجھی جاتی تھی حیدرآباد ہی
نے جرأت کی اور ملک کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک پردیسی زبان کے طوق غلامی سے آزاد کرایا اور یہاں کے
عوام بازاروں اور گھروں میں جس زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے اس کو علم و ادب کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔
نانچہ آپ سب بخوبی واقف ہیں کہ اردو کا ابتدائی ادب جس میں نثر و نظم کی سیکڑوں کتابیں شامل ہیں دکن ہی [illegible]

لکھا گیا اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں تقریباً دو سو سال بعد ترقی پسندی کی یہ تحریک سرسبز ہو سکی ۔ اور وہ بھی محض دکن ہی کے ایک شاعر ولی کے سفر و قیام دہلی اور اس کے دیوان کی تشہیر کے بعد ہی خاطر خواہ ترقی کر سکی ۔ اسی واقعہ کی طرف میر تقی میر جیسے وضع دار شاعر نے جس کو شاید آپ قدامت پسند بھی کہیں، ایک ترقی پسندانہ انداز میں اشارہ کیا تھا کہ ؎

قائل نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اردو ادب اپنے ابتدائی دو سو سالوں میں زیادہ تر برج بھاشا سے متاثر رہا اور پہلے پہل دکن ہی کے ایک شاعر ولی نے اپنے سفر گجرات و دہلی کے بعد محسوس کیا کہ اس کی ترقی اور مقبولیت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے استعمال کئے جائیں اس لئے وہ اور اس کے اورنگ آبادی دوستوں اور معتقدوں نے وہ ترقی پسندانہ رجحان اختیار کئے جن کو آگے چل کر مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ ظہور الدین حاتم نے شاہجہان آباد میں رائج کیا اور اردو زبان کی وہ شکل قائم کر دی جو آج تک معیاری اردو کہلاتی ہے ۔

اردو زبان کی حد تک حیدرآباد کے ترقی پسندانہ رجحانات کی تاریخ یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اب تک جاری ہے ۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کا قیام تو اس سلسلہ کی ایک ایسی اہم کڑی ہے جو اردو کی تاریخ میں حیدرآباد کی ترقی پسندانہ خدمات کو زندگی جاوید بخشنے کا باعث ثابت ہوگی ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے مقامات کی طرح حیدرآباد میں بھی ایسے اصحاب موجود ہیں جو اس تحریک کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اردو ادب میں گندگی پھیل رہی ہے اور اس ادب کو پڑھ کر ہمارے نوجوان گمراہ ہوتے جا رہے ہیں ان کا یہ سمجھنا ایک حد تک غلط بھی نہیں ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس خوش آیند تحریک سے فائدہ اٹھا کر بہت سے خام کاروں اور آوارہ مزاج ادیبوں اور شاعروں نے اپنے پست جذبات اور زیادہ تر شہوانی الجھنوں کی نمود و نمائش شروع کر دی ہے ۔ اس لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے جیسا کہ میں نے یوم حالی میں بھی کہا تھا کہ "انجمن ترقی پسند مصنفین" جلد سے جلد اپنے تحت ایک ایسی احتسابی مجلس قائم کرے جو موقع بموقع ان نام نہاد ترقی پسندوں کے افکار نظم و نثر کا جائزہ لیتی رہے اور ان کی نسبت اپنی صریحی رائے کا اظہار دیانت اور جرأت کے ساتھ کرتی جائے ۔ اگر اس قسم کا کوئی اقدام جلد نہ کیا جائے گا تو ہر ناقص شاعر اور نااہل ادیب ترقی پسندی کے روپ میں اپنی کم علمی، ادبی بے بضاعتی اور اخلاقی نقائص کو چھپاتا رہے گا اور نہ صرف ترقی پسند تحریک کو نقصان پہنچے گا بلکہ حال اور مستقبل کے اردو ادب پر خامیوں اور گندگیوں کا ایک ایسا زنگ چڑھ جائے گا جس کی ذمہ داری اس تحریک کے مخلص بانیوں کے سر رہے گی اور جس کے دور کرنے میں مستقبل کے ادیبوں اور شاعروں کو بڑی زحمتیں اٹھانی پڑیں گی ۔

ایک ایسی ہی مجلس کی طرف سے صحیح قسم کے ترقی پسند ادب کے کئی مجموعے بھی شائع ہونے چاہئیں . جو کرشن چندر کے جدید مجموعے "نئے زاویے" کے انداز میں مرتب کئے جائیں تو جواں سال شاعروں اور نو مشق ادیبوں کی صحیح رہبری ہوگی اور وہ گمراہ ہو کر شہوانی جذبات کی ترجمانی اور عریانی کو ترقی پسندی کا لوازمہ سمجھنے سے باز رہ سکیں گے ۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کو اس وجہ سے بھی نقصان پہنچ رہا ہے اور شاید آئندہ بھی پہنچے کہ اس تحریک کے

بعض علم بردار ترقی پسندی اور اشتراکیت کو لازم و ملزوم سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ التزام اتنا ضروری نہیں جتنا کہ ترقی پسندی اور انسانیت میں ہونا چاہئے۔ انسانوں کی زبوں حالی سے متاثر ہونا اور انسانی حقوق کی پامالیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ایک ایسی وسیع الخیالی ہے جس کے مقابلہ میں کسی خاص سیاسی عقیدے کی تبلیغ کرنا ایک طرح کی تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اشتراکیت کی علم برداری کی بجائے اگر انسانیت کی علم برداری کا دعویٰ کریں تو محض ایک اصطلاح کی تبدیلی سے ان کے بہت سے عیب ہنر نظر آنے لگیں گے اور ان کے بہت سے مخالف ان کے ہم نوا بن جائیں گے۔

ایک اور بات جس کی طرف ہماری اس کانفرنس کو خاص طور پر توجہ کرنی چاہئے اور جس کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے گا، یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کو افراط و تفریط سے بچایا جائے۔ اعتدال ہر کامیابی کا لازمی ذریعہ ہے اور یہ خوبی اس وقت تک پیدا نہ ہوگی جب تک کہ ہم اپنی ہر کاوش پر سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غور نہ کریں۔ بڑا اندیشہ ہے کہ کہیں ترقی پسندی اور جوش و جذبات کی ہنگامہ آرائی مترادف نہ بن جائیں۔ لیکن یقین ہے کہ یہ اندیشہ دیرپا ثابت نہ ہوگا کیونکہ جیسے جیسے ترقی پسند ادیب اور شاعر پختہ مشق اور سلیم الطبع ہوتے جائیں گے، ہمارا ادب بھی نکھرتا جائے گا۔ سلامتی طبع اور خوش ذوقی بغیر اعتدال کے ممکن نہیں۔ اس لئے جب تک ترقی پسند تحریک کا ہر دلدادہ افراط و تفریط سے بچنے کی کوشش نہ کرے گا، وہ اس تحریک کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتا رہے گا اور اس کے ذاتی اعمال و اقوال دوسروں کو اس مفید تحریک سے بدظن کرانے کا باعث بنتے رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ حیدرآباد میں ترقی پسند مشاہیر کا یہ اجتماع اردو دنیا کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کامیاب ثابت ہوگا اور ترقی پسند ادب کی تاریخ میں یہ کانفرنس ایک نئے اور شاندار دور کی بنیاد رکھے گی اور اس توقع کے ساتھ میں آج آپ سب دوستوں کا دلی خلوص کے ساتھ استقبال کرتا ہوں اور حیدرآباد کی انجمن ترقی پسند مصنفین اور اس کے سرگرم کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ ان کے مساعی کے خوش گوار نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور یوم حالی کے بعد اس شاندار اجتماع کے انتظامات میں انھوں نے جس سرگرمی اور جانکاہی سے حصہ لیا وہ اس کی متقاضی ہے کہ اگر آپ کو اجلاس حیدرآباد میں کسی قسم کی زحمت یا ناگواری محسوس ہو تو یقیناً درگزر فرمادیں گے۔

سید محی الدین قادری زور

سرگزشت حاتم۔ دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعراء شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور اردو فارسی کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور قال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔ تشنگان ادب اور محققین کے لئے یہ نادر تحفہ ہے۔ صفحے ۱۲۸۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت

اُردو حروف اور رسم الخط

۱۔ اردو میں حسب ذیل حروف تہجی ہیں جن میں سے اکثر حروف عربی سے لیئے گئے ہیں۔

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے۔

بعض وہ آوازیں جو عام طور پر ہندی میں مستعمل ہیں مثلاً بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ گھ لھ وغیرہ ان سے بننے والے لفظ اکثر اردو میں بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ ان کی آوازوں کے لیئے اردو میں نئے حروف نہیں بنائے گئے بلکہ متعلقہ حروف میں ہائے دوچشمی (مخلوط) شامل کرکے ایک ہی آواز فرض کرلیا گیا ہے۔ ہندی کی حروف کو چھوڑ کر باقی حرفوں کے نام ہیں۔ حروف کے ناموں کے آغاز کی آواز' اس حرف کی آواز قرار دی گئی ہے جس سے ہم یہ تعبیر کرسکتے ہیں کہ سالم اکیلے حرف کا نام پکارا جاتا ہے اور حرف کی وہ صورت جو تحریر میں اتصال کی غرض سے فرض کرلی گئی ہے وہ تلفظ کہلاتا ہے۔

۲۔ اس کا رسم الخط متصل ہے اس لئے الفاظ میں حروف اپنی سالم شکل میں نہیں لکھے جاتے۔ اس میں خاص قاعدہ نظر آتا ہے۔ مستثنیات بھی موجود ہیں اور ان میں بھی ایک اصول کارفرما ہے۔

اکثر حرفوں کے دو حصے مانے گئے ہیں۔ جزو اول اور جزو دوم مثلاً ج = (۱) جر + (۲) ے اور س = ۳ + ں اور ک = کہ + ے وغیرہ پہلی علامت جزو اول اور دوسری جزو دوم ہے۔

۳۔ حروف تہجی میں سے ا د ڈ ذ ر ڑ ز ژ و یہ نو حروف منفصل ہیں۔ اس لئے کہ یہ حروف جہاں کہیں واقع ہوتے ہیں، آگے کے حرف سے ملائے نہیں جاتے، خواہ وہ ایک ہی لفظ کے درمیان ہی کیوں نہ واقع ہوں مثلاً تقابل، جذبات، دروازہ، بارش، مغرب، مشرق وغیرہ ہیں۔ اور باقی حروف ہیں ان منفصل حروف کے شامل رہنے کے باوجود اس خط کو متصل خط کہتے ہیں۔

۴۔ کل حرفوں میں سے یہ چار حروف "الف، ط، ظ، و" ایسے حروف ہیں جو کسی صورت اور کسی حال اپنی شکل نہیں بدلتے اور باقی سب حروف تحریر میں اپنی شکل کچھ نہ کچھ بدلتے ہیں اور جس طرح اوپر بیان کیا گیا ہے حرف جزو اول رہ جاتا ہے۔

۵۔ اختتام لفظ پر جو حرف واقع ہوتا ہے وہ سالم آتا ہے اور اس کے علاوہ ہر جگہ جزو اول۔ بجز منفصل اور منفصل (دفعہ ۳ کے حروف) حروف کے چونکہ ان میں جزو بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

۶۔ ب، پ، ت، ٹ، ث، ن، ی، ے ان کا جزو اول تین شکلوں میں ہوتا ہے مثلاً ۱۔ ﺑ، ۲۔ ﺒ، ۳۔ ﺐ، جو نقطوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان حرفوں کی اس وقت پہلی شکل بنتی ہے جب کہ یہ لفظ کے پہلے حروف ہوں اور ان کے بعد س ش ص ض، ط ظ ع غ ف ق میں واؤ سے کوئی حرف واقع ہوتا ہے۔ مثلاً بسم اللہ، پشتہ، بصرہ، بضاعت، بطخ، نظر، تعرض، بغاوت، تفصیل، تقابل، توبہ وغیرہ ہیں۔

الف۔ جب کوئی لفظ یائے مجہول پر ختم ہوتا ہے اور اس کے پہلے ب، پ، ت الخ میں سے کوئی حرف واقع ہو اور اس سے پیشتر کوئی متصل حرف واقع ہو تو ان حرفوں کی یہی "ﺒ" شکل آئے گی۔ مثلاً کھانے، کمانے، ڈنٹے، نمٹے، کھوٹے وغیرہ ہیں۔ مگر "ی" اس قاعدے سے الگ ہے۔

ب۔ دوسری شکل کا محل یہ ہے کہ ب پ ت الخ میں سے کوئی حرف لفظ کا پہلا حرف ہو اور اس کے بعد

ج چ ح خ ع غ م ہ میں سے کوئی حرف ہو مثلاً: بجلی، بچھو، بچھوا، تحفہ، تخیل، تمر، تمر، تماشا، بہت، پہلا وغیرہ

ج: تیسری شکل یہ ہے کہ ان حروف یعنی ب پ ت الخ میں سے کوئی حرف لفظ کا آخری حرف ہو اور اس کے بعد الف، ب، پ، ت، ٹ، ث، د ڈ ذ، ر ڑ ز ژ، ک گ ل ن ں ی ے میں سے کوئی حرف واقع ہو۔ جیسے:۔ بت، دبیر، تیر، طرف، لکھی، بہاری، بندوق، تیز وغیرہ اور ب پ ت الخ جب لفظ کے درمیان آتے ہیں تو اس وقت بھی ان کی یہی (ہ) تیسری صورت رہتی ہے۔

۷۔ اگر لفظ کے درمیان منفصل حرف واقع ہو جائے تو لفظ کے بقیہ حصے کا آغاز بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح لفظ کا کیا جاتا ہے۔ جیسے "خوشبو" میں واؤ منفصل ہے اس لئے اس کے بعد "ب" کی شکل پہلی رہے گی جیسے آغاز لفظ کے وقت ہوتی ہے۔ کیونکہ "ب" کے بعد "ش" واقع ہوا ہے۔ "آبکوش" کے لفظ میں پہلا حرف منفصل ہے۔ اس لئے دوسرے حرف "ب" کی شکل دوسری شکل ہے۔ اور "کابک" میں "ب" کی شکل تیسری ہے۔

۸۔ ان کے سوا باقی جتنے حروف ہیں لفظ کی ابتدا یا لفظ کے درمیان میں جہاں کہیں بھی واقع ہوں ان کا جزو اول ہی نظر آئے گا۔

۹۔ منفصل حروف میں سے "د ڈ ذ ر ڑ ز ژ" ایسے حروف ہیں کہ جن کے ماقبل کے حرف متصل ان سے آملیں تو ان کی شکلیں د ڈ ذ کے بجائے ـد ـڈ ـذ اور ر ڑ ز ژ کے بجائے ـر ـڑ ـز ـژ ہو جاتی ہیں۔

۱۰۔ ع غ کا جزو اول کبھی "ع" ہوتا ہے اور کبھی "ـعـ" کی علامت۔ ان حروف میں پہلی شکل کا محل یہ ہے کہ یہ حروف لفظ کی ابتدا میں واقع ہوں یا منفصل حروف کے بعد واقع ہوں جیسے عادت، عرفان اور ماعاملہ وغیرہ میں یا غضب، غرور، دریافت، مرغابی وغیرہ میں اور دوسری شکل اس وقت لکھی جاتی ہے جب اس کا ماقبل کوئی متصل حرف اس سے آملتا ہے۔ معبود، بدیع، شمع اور مغرور، تیغ، ارمغان وغیرہ میں۔

۱۱۔ "ہ" کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں ایک وہ شکل جو ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ ع غ ص ض ط ظ س ش ک گ ل م کے بعد واقع ہونے سے پیدا ہوتی ہے جیسے:۔ بہار، پہاڑ، تہمد، ٹہلنا، بہنا، شہر وغیرہ میں۔ دوسری وہ جو لفظ کا پہلا حرف ہ ہو اور اس کے بعد کوئی متصل حرف واقع ہو جیسے ہشت، ہم وغیرہ میں اور حرف واؤ کے ماقبل واقع ہو تو اس کی شکل یہ بنتی ہے۔ جیسے ہوش، ہوا وغیرہ میں اور اس کی وہ شکل جب کہ یہ کسی منفصل حرف یا ل ک گ سے پہلے واقع ہو جیسے:۔ ہد ہد، ہرن، ہاتھ، ہل، ہلکا وغیرہ میں (واؤ مستثنیٰ) وہ شکل جب یہ منفصل حرف کے بعد واقع ہو جیسے:۔ پردہ، دروازہ، قہوہ وغیرہ میں۔ ایک وہ شکل جب کہ یہ لفظ کا آخری حرف ہو اور ماقبل اس کا کوئی متصل حرف اس سے ملا ہو جیسے نوشتہ یا نقشہ وغیرہ میں اور ایک وہ شکل جس کو ہائے دو چشمی (مخلوط) کہتے ہیں جیسے:۔ جھرنا، گھر، آدھا، بوڑھا وغیرہ میں۔

۱۲۔ جہاں تک ہمیں علم ہے کسی اور زبان کے رسم خط میں اتنے قاعدے، اتنے ضابطے نظر نہیں آتے۔ شاید چینی یا جاپانی رسم الخط میں ہوں تو ہوں۔ اسی وجہ سے دوسری زبانیں جاننے والے نسبتاً اردو خط کو مشکل تصور کرتے ہیں۔ اگر کوئی اصلاح رسم الخط میں کرنی ہو تو اس وقت مفید ہو سکے گی جب اصولوں میں زیادتی کرنے کے بجائے موجودہ قاعدوں میں کمی کی جائے اور اس کی بنیادی خصوصیت اتصال میں فرق نہ آنے پائے۔ اکثر

مصلحین نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ اس موضوع پر رسالے ہیں۔ مقالے ہیں، مضامین ہیں اور سب کا خیال ہے کہ موجودہ رسم الخط میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ مگر سب کا مطمح نظر غالباً ایک نہیں ہے۔ اس مشکل کو آسان کرنے کی جتنی تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں ان کا نظر غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اس خصوص میں جن مشکلات کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ کسی نہ کسی صورت میں بدستور موجود ہیں اور کچھ قاعدوں کے اضافے کے ساتھ مزید پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی اصلاحِ رسم الخط کی کمیٹی نے اس طرف قدم اٹھایا ہے مگر وہی بات پھر پیدا ہوتی گئی ہے جو پہلے بھی موجود تھی۔ یہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو کوشش ناگپور کانفرنس میں سرخرو ہوئی۔ لیکن حال ہی میں حیدرآباد دکن میں آل انڈیا اردو کانگریس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں کمیٹی کی طرف سے کوئی تحریک اس بارے میں پیش نہیں ہوئی۔

۱۴ - سب سے پہلے ہم ان تجاویز پر غور کریں گے جو ناگپور کانفرنس میں (شاید ا"چالیس ماہرین" رسم الخط کے اجلاس میں پاس ہوئیں۔ جس کا تذکرہ اخبار "ہماری زبان" میں اور رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۴۲ء جلد ۱۴ میں" اصلاحِ رسم الخط" کے عنوان کے تحت مضمون کی شکل میں موجود ہے۔

دفعہ ۱ - میں تحریر ہے کہ" لفظِ مرکب کے دو لفظوں کے درمیان واضح فصل چھوڑا جائے"۔

مرکبات کے ہر دو لفظوں میں واضح فصل چھوڑا جائے تو ضروری ہوا کہ ہر دو مفرد لفظوں کے درمیان واضح تر فصل ہو۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس امر کا پتہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے کہ لکھا ہوا لفظ مرکب کا جزو ہے یا بجائے خود ایک جداگانہ مفرد لفظ۔ "گل کاری" لکھا جائے تو گل کو اس کے ماقبل سے متعلق یا کاری کو اس کے مابعد سے متعلق سمجھنے میں کیا امر مانع رہے گا؟ اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ جملے کے ہر لفظ میں اتنا فاصلہ رکھا جائے جس سے ظاہر ہو سکے کہ مرکب کے اجزا کون کونسے ہیں اور مفرد کون کونسے؟ اس سے تحریر کی سہولت معدوم، کاغذ کے خرچ کا لحاظ مفقود؟ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ مرکبات کے اجزا کے درمیان یا اوپر یا نیچے کوئی مختصر سی علامت وضع کی جاتی۔ یہ ہر طرح کی سہولت کا باعث ہوتا۔

اس سلسلے میں جناب ہاشمی صاحب کی "ضروری تاکید" میں صاحب موصوف نے بیان فرمایا ہے کہ "ہمارے یہاں لفظ کے ختم ہونے کی کوئی علامت نہیں ہے"۔ ہم اس بات کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ہماری تحریر پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب لفظ کا وہ حصہ جہاں سالم حرف کا وجود ہو اور اس کے بعد فصل واقع ہو تو اختتام لفظ ہے۔ یہ صورت منفصل حرف کے واقع ہونے سے بھی پیدا ہوتی ہے مگر وہ تلفظ کے احاطے میں مقید ہے۔ لہٰذا فصل کہلایا نہیں جاسکتا۔

دفعہ ۲ - ہمزہ کسی منفصل حرف کے بعد آئے تو جداگانہ لکھا جائے اور کوئی شوشہ نہ بنایا جائے مثلاً آری، ناری بجائے آئی اور نائی کے۔

اگر کوئی لفظ جس کے تمام حروف متصل واقع ہوں اور ان کے درمیان ہمزہ ہو تو کیا عمل کیا جائے؟ مثلاً "کئی، نئی" وغیرہ میں۔ اگر یہ بدستور رہیں تو ہمزہ کے لکھنے کے دو قاعدے ہوتے ہیں۔ بصورت دیگر ک ءی اور ن ءی لکھنا ضروری ہوگا۔ جیسا کہ دفعہ ۲ کا منشا ہے۔

دفعہ ۳ - میں تحریر ہے کہ "دھ، ڑھ وغیرہ میں ہائے مخلوط کو اصل حرف سے ملا کر لکھا جائے یعنی دھ، ڑھ الخ اصل کی شکل انھیں بھی حرف منفصل قرار دیا جائے اور دوچشمی ھ کو لفظ کے دوسرے ٹکڑوں سے ملانے کے بجائے حسب ذیل طریق پر لکھا جائے مثلاً دھن کے بجائے دھ ن، دھرتی کے بجائے دھ رتی اور پڑھنا کے بجائے پڑھ نا"
یہاں ایک خرابی تو یہ پیدا ہوتی ہے کہ د، ر وغیرہ جو منفصل ہیں ایک جگہ منفصل اور ہائے مخلوط کے ساتھ متصل، الخ ھ مخلوط جو ایک جگہ متصل ہے، کہیں دوسری جگہ منفصل۔ اس طرح پھر دو قاعدے بن گئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئی تجویز کے موافق حرف ھ مخلوط اپنے اصلی حرف کے ساتھ مل جاتا ہے تو مخلوط حرف کو منفصل ہونا چاہئے۔ تو "پھر، گھر، گھوڑا، گھبرانا، پن کھٹ وغیرہ پر بھی اس قاعدے کو منطبق ہونا چاہئے۔ اور انھیں "پھ ر، گھ ر، گھ وڑا، گھ برانا، پن کھ ٹ وغیرہ لکھا جانا چاہئے جس کی وضاحت دفعہ میں نہیں کی گئی ہے، اس طرح ہائے مخلوط کے لئے بھی دو قاعدے ہو گئے ہیں۔

دفعہ ۴: میں بھی، جو حروف ایک جگہ متصل نظر آتے ہیں وہی دوسری جگہ منفصل ہیں۔

دفعہ ۵ - یہ تجویز جن مشکلات کی خاطر وجود میں لائی گئی ہے اس کا حل حروف شمسی اور قمری کے سمجھنے میں موجود ہے۔ لہٰذا تحریر میں بے ضرورت ایک علامت کا اضافہ کسی اعتبار سے بھی کیوں نہ ہو دردسری کے سوا کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔

دفعہ ۸ - تحریر ہے کہ "صرف ابتدائی تعلیم کی حد تک علامات مصدر وغیرہ کو اصلی مادے سے دور لکھا جائے۔ لکھ نا، پڑھ نا وغیرہ۔ اسی دفعہ کی ضمن ب میں ہے کہ ابتدائی کتابوں میں ہر لفظ کے ایک ایک رکن کو جدا کر کے لکھا جائے مثلاً مصیبت کے بجائے مصی بت، قربتہ کے بجائے قری نہ وغیرہ"
اس تجویز سے ہمیں قطعی اختلاف ہے۔ ابتدائی نقوش جو دماغ میں گھر کر جاتے ہیں وہ بعد کو مٹ نہیں سکتے۔ پھر اس پر دوسرا نقش ؟ مسودے مشکوک ہونے کے اور کیا ہو سکتا ہے ؟ ماہرانِ فن تعلیم نے ابتدائی تعلیم کے وقت احتیاط برتنے پر اصرار کیا ہے، کیونکہ بعد کو اس کی صحت محال ہو جاتی ہے۔

دفعہ ۹ - " ی کو الف اور واؤ کی طرح منفصل قرار دیا جائے۔ یہ اہم تجویز ہے" مگر کیوں ؟ کونسی رکاوٹ پیدا ہوئی ؟ کس قاعدے سے ؟ کوئی قاعدہ پرانا ہے کہ کسی نئے قاعدے کے تحت ؟
ہمارے حروف عربی سے لئے گئے ہیں اور جس وقت انھیں اردو کے لئے لیا گیا بجنسہ لیا گیا چنانچہ حرف "ی" کے لئے ہی کیوں ایسا فرض کیا جائے ؟ اس کی معروف و مجہول اور ماقبل مفتوح صورتوں میں کوئی علامت کیوں نہ لگائی جائے ؟ کیوں بلا وجہ خلاف قاعدہ اس کو منفصل قرار دیا جائے ؟

دفعہ ۱۰ - یہ اہم قرارداد ہے "اس پر از سر نو رائے کے لئے اخبار "ہماری زبان" میں اس کو شائع کیا جائے۔ کیونکہ اس قسم کی اصلاح ضرور ہوتی جاتی ہے۔ تجویز یہ ہے "عربی کے ہم آواز حروف جن کی تین اور چار شکلیں آتی ہیں ان کو اردو تحریر میں گھٹا کر صرف دو شکلوں پر اکتفا کرنا جائز قرار دیا جائے۔ یعنی ث، س، ص جن میں سے ص کو ذ ز ض ظ میں سے ض ز کو حذف کر دیا جائے یا جو لوگ ان کے بجائے س اور ذ اور ظ سے کام لیں ان پر حرف گیری نہ کی جائے۔ ایسے حروف کی باقی قسمیں یعنی ا، ع، ت، ط، ح، ہ بدستور رہیں گی"
(غ، ق کے متعلق کچھ ارشاد نہیں ہوا۔ کیوں ؟) "اس دفعہ پر ناظرین اخبار اور اہل رائے حضرات کی رائے کی

درخواست کی گئی ہے"

ان تمام جدید تجاویز کا نہ سہی اس دفعہ ۱۰ کا تذکرہ آل انڈیا اردو کانگریس منعقدۂ حیدرآباد دکن میں آیا تھا۔ لیکن انجمن ترقی اردو یا اس کی رسم الخط والی کمیٹی یا مجوز صاحب کی طرف سے نہیں۔ افسوس کہ تحریک مسترد ہوگئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اہل الرائے نے اس تجویز کو پسند نہ فرمایا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس تجویز کی ضرورت اصلاح رسم الخط کے ساتھ ساتھ کیوں درپیش ہوئی ہے۔

"ہم آواز حروف" کے عنوان سے علٰحدہ مضمون کی شکل میں دفعہ ۱۰ کی ترویج سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ناگپور کانفرنس کی منظورہ تجاویز پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام تجاویز جا بجا تشنہ ہیں۔ اس لئے مزید پیچیدگیاں پیدا کرتی ہیں۔ ہر تجویز کے ساتھ کم از کم اور دو دو قاعدوں کا اضافہ ہوتا گیا ہے۔

اگر ٹائپ کی سہولت کے لئے یہ خط کارآمد نہیں ہوسکتا تو کسی نئے حروف کی ایجاد کی جاسکتی ہے۔ دستی تحریر کے لئے بھی اور طباعت کے لئے بھی۔ یا ٹائپ میں دیوناگری خط استعمال کیا جائے اور دستی تحریر کے لئے موجودہ اردو خط یا پھر اسی خط کو مکمل کھلا منفصل قرار دیا جائے جس سے یہ مشکلات یک قلم رفع ہوں۔ اور پوری تحریر بغیر انفصال کے رائج کی جائے۔

دامودر ذکی ٹھاکور

اطلاع

جن خریدار اصحاب کا سالانہ چندہ ختم ہوگیا ہے وہ براہِ کرم اپنا چندہ دفتر سب رس پر روانہ فرمادیں یا "سب رس" تقسیم کرنے والے سے باضابطہ مطبوعہ رسید لے کر چندہ عنایت فرمائیں۔ ورنہ دفتر ہذا کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔

اضلاع کے خریدار اصحاب اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرماکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ یا دفتر ہذا کو رسالہ وی پی کرنے کا آرڈر روانہ کریں۔ اگر رسالہ وی پی کے ذریعہ آئے تو براہِ کرم اندرون مدت اسے چھڑا لیا جائے ورنہ وی پی ہونے کی صورت میں دفتر کو اخراجات ڈبہ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

رسالہ نہ ملنے کی اطلاع ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ تک روانہ فرمائیں ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہوسکے گی۔ — مہتمم

جو آگ لگائی تھی میں نے ...... "ایک لڑکی" کے نام

وہ نیچی پیشانی ایک گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ جیتین کمرے میں داخل ہوا۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ چونک پڑی
جیسے ستار کے تاروں کو کوئی ایک دم چھیڑ دے۔ میں اس کی اس معصومانہ حرکت پر دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔ اسد کی
ہمت بڑھا۔ وہ سکڑ گئی۔ میں قریب بڑھتا رہا اور وہ مجھ سے دور ہٹتی رہی۔ 'قرب و بعد' کا یہ کھیل بھی بعض اوقات
کتنا دلچسپ ہو جاتا ہے۔ وہ کیوں ہٹ رہی تھی۔ میں سوچنے لگا 'میں کوئی درندہ تو ہوں نہیں جو اسے کھا جاؤں گا۔
یہ ہندوستانی لڑکیاں بھی کس قماش کی ہوتی ہیں۔ وہ 'ہرنوں' کی طرح مردوں کے سائے سے کیوں بدکتی ہیں ---- شاید
ان کی بھی فطرت میں 'رمیدگی' ہے۔ یہ 'رمیدگی' 'حسن و عصمت' سے کیوں وابستہ کر دی گئی۔ آخر نہ حسن کو 'دوام'
ہے نہ 'عصمت' کو قیام ---- یہ دونوں بھی 'ہرنوں' کی طرح 'رم' کر جاتے ہیں ---- لیکن وہ مجھ سے
کیوں گریزاں تھی ---- مجھ سے اجنبی بھی تو نہیں وہ 'میری' 'عمزاد' ساتھ کی کھیلی ساتھ کی پلی ---- پھر یہ
'تکلف' اور اجنبیت کیوں۔ "سنئے تو میں کوئی غیر نہیں" میں نے کہا اور دھیرے سے گھونگھٹ الٹ دیا۔ جھکی جھکی
آنکھیں میری طرف اٹھیں۔ سانولا سلونا رنگ۔ پتلے پتلے ہونٹ چہرے پر غضب کی معصومیت۔ آنکھوں میں ڈر اور حیرت
نے کچھ عجیب سی سہمی ہوئی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ شاعر 'پہلی نظر' کی قسم قسم سے تاویل کرتے ہیں کوئی 'بجلی کی چمک'
کہتا ہے تو کوئی 'تیر نیم کش' لیکن مجھے یہ دونوں تشبیہیں غیر حقیقی معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے تو ایسے معلوم ہوا نسیم سحر کا
ہلکا سا جھونکا مجھ پر جھرجھری کی کیفیت طاری کرتا ہوا گزر گیا " آخر آپ مجھ سے ڈرتی کیوں ہیں۔ کچھ باتیں کیجئے۔
اب تو ہمیں زندگی کی ناؤ مل کر کھینا پڑے گی۔ یہ ڈر ---- اس اجنبیت سے کیسے کام بنے گا" میں شاعرانہ
انداز میں کہنے لگا۔ مجھے معلوم ہو سکا عورتیں پر تکلف گفتگو سے بہت مرعوب ہوتی ہیں۔ وہ خاموش ہی رہی میں نے سلسلۂ
بیان جاری رکھا "عورت مرد کی رفیق ہوتی ہے۔ قدرت نے اسے مرد کی دل بہلائی کے لئے پیدا کیا۔ دیکھئے نا آدم جنت
جیسی جگہ سے بھی بیزار ہو گئے۔ آخر خداوند تعالیٰ کو ایک عورت پیدا کرنا پڑی" ۔ میں باتیں کرتے کرتے تھک سا گیا۔
انسان بالخصوص مرد اپنے مشغلوں سے کس قدر جلد تھک جاتا ہے۔ شاید قدرت نے انسان کے خمیر میں بیتابی
تڑپ رکھی ہے۔ شعلہ کی سی بے قراری ---- وہ میری باتیں سن کر کبھی کبھی مسکرا دیتی اس طرح ہماری شب عروسی
بسر ہوئی ---- رفتہ رفتہ اس کا حجاب دور ہوتا گیا لیکن تکلف نہ گیا۔ عورت کا ظرف کتنا وسیع ہے۔ وہ کتنی بردبار
ہوتی ہے۔ یہ مجھے نزہت سے مل کر معلوم ہوا۔ اگر صبح سورج نکلنے اور دن ڈوبنے کا نام زندگی ہے تو ہماری زندگی
گزرتی گئی۔ وہ میری غیر موجودگی میں بلبل کی طرح چہکتی لیکن میرے سامنے سدھ بدھ کھو دیتی۔ اسے شعر و ادب
کا کتنا اچھا ذوق تھا۔ میں اچھے اچھے افسانوں کی کتابیں لا کر دیتا اور اس کی رائے کا بے چینی سے منتظر رہتا
لیکن وہ میرے سامنے کچھ نہ بولتی۔ رکے ہوئے پانی میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری زندگی بھی
خشک ہو گئی۔ اس 'جمود' سے میں عاجز آ چکا تھا۔ میں زندگی میں حرکت و حیات کا قائل تھا وہ ایک برف
کا تودہ بن گئی۔ میں نے 'نیاز' چھوڑ کر ناز کرنا شروع کیا۔ وہاں خاموشی میرے سب کا جواب تھی۔ بے اعتنائی اس
امید پر کی تھی کہ 'قابل اعتنا' سمجھا جاؤں گا۔ لیکن عورت کی فطرت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے ....
اور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کو کون پا سکا ہے؟ مجھے یک گونہ بے خودی کی تلاش تھی۔ وہ مجھے نہ ملی۔ میں نے اپنے
دوستوں سے اپنی زندگی کی بے کیفی کا شکوہ کیا۔ جمیل کہنے لگا۔

"گھر میں کیف تلاش کرتے ہو ؟ !! ــــ بیوی کے پاس مسرت ڈھونڈھتے ہو ! گھر کی پالتو مرغی کا کوئی شکار نہیں کرتا دوست !! آسمان کی وسعتوں میں تیر چلاؤ۔ لطف آجائے گا" اختر کہنے لگا۔
"زندگی، زندگی ہمیں مسرت نہیں دے سکتی۔ وہ بخیل سرمایہ دار کی طرح مسرت کی متاع کو جمع کرتی جاتی ہے۔ تم میں ہمت ہے عزم ہے ولولہ ہے تو اس پر دھاوا کردو۔ زندگی سے بجبر مسرت لے لو پھر دنیا تمہاری ہے"
حمید نے کہا "کیف پانا چاہتے ہو تو خود کو کھونا پڑے گا۔ کسی مقصد کے حصول میں غرق ہو جاؤ ــــ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤ ــــ" لیکن میں نے اپنے ہم نشینوں کی رائے نہ سنی۔ سنا تھا "دوری محبت کو بھڑکا دیتی ہے۔ فراق کی آگ میں جل کر محبت کا سونا کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ اصلی "محبت" "فراق" کی آگ میں جل کر اور نکھر جاتی ہے۔ جھوٹی محبت جھوٹے سونے کی طرح ماند پڑ جاتی ہے" اور ایک اداس شام میں نے اپنی روانگی کی اطلاع دے دی۔ "میں جا رہا ہوں نزہت زندگی صرف حسین خواب ہی نہیں ــــ زمانے میں "محبت" کے سوا اور بھی غم ہیں۔ پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملائے جیسے فلک پر ستارے میرے لبوں پر ایک فاتحانہ "تبسم" کھیلنے لگا محبت کی بازی میں میں نے اسے مات دے دی تھی۔ "نہ جائیے! کیوں جاتے ہیں آپ" اس کے منہ سے نکلا۔
میں چل دیا تاکہ محبت کا شعلہ فراق کے تھپیڑوں سے پورا فروزاں ہو جائے۔ اور اب ــــ اب میں اس سے بہت دور ہوں۔ لیکن وہ، وہ میرے کتنے قریب ہے۔ اتنے ہی جیسے ستار میں نغمہ، چاند میں ضیا، پھول میں نکہت اور تصویر میں رنگت۔ میں نے سنا ہے، اس کی وہ پہلی کی حالت نہیں رہی۔ آنکھوں میں پھیلا پھیلا کاجل، ساری کی بے سلیقگی گویا زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ کوئی ہمیں دیکھنے والا نہیں۔ اب وہ مشہور افسانہ نگار ہے۔ میں جب اس کا تازہ افسانہ پڑھتا ہوں، ایک روحانی سرور مجھ پر طاری ہو جاتا ہے۔ وہ افسانوں میں اپنی زندگی سمو دیتی ہے۔ اس کے افسانے مرد کی 'سفاکی' کی داستان سے معمور ہوتے ہیں۔ آہ اسے سینہ چیر کر میں بتا سکتا کہ میرے دل میں اس کی کتنی محبت ہے۔ ہر تازہ افسانہ مجھے دعوت دیتا ہے کہ اس کے قدموں پر اپنا سر جھکا دوں۔ کبھی مسرت کے نشے میں سرشار محبت کی کامرانی پر مسکرا پڑتا ہوں۔ کبھی اپنے کئے کی پشیمانی پر رو پڑتا ہوں۔ کچھ آنسو اور کچھ ہنسی، اسی سے تو یہ دنیا بنی ہے۔
لیکن اب، اب میری زندگی کی صبح طلوع ہو رہی۔ محبت اپنا کام کر چکی اور انعام بھی پا چکی۔ آرٹ کی بلند عمارت خون جگر سے تعمیر ہوئی ہے اس کا فن ترقی کر چکا۔ مجھے اس کے فن سے حسد ہو رہا ہے۔ اس کا فن، میرا رقیب ہے۔ لیکن نہیں میرے سوا کوئی دوسرا اس کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکتا ــــ میں جاؤں گا ــــ اس کے پاس ضرور جاؤں گا ــــ

رفیعہ سلطانہ

حیدرآباد ۔ اس کتاب میں عوام اور بچوں کے لئے شہر اور ریاست حیدرآباد کے ضروری حالات سادہ اور سلیس زبان میں درج کئے گئے ہیں۔ اس کے کئی ابواب ہیں جن میں آب و ہوا، پہاڑ و دریا، پیداوار، تاریخ، طرز معاشرت، صنعتیں، زبانیں، طرز حکومت، آثار قدیمہ اور ذرائع حمل و نقل کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مرتبہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ بی اے جامعہ عثمانیہ ہیں جن کو انشاپردازی کا خاص ذوق ہے۔
قیمت ۱۰/

امریکہ کی صنعتی ترقی کی ابتدا

ممالک متحدہ امریکہ میں بھی انیسویں صدی حکومتی تعمیر کا ایک دور تھی۔ ۱۷۸۳ء کی صلح کے بعد تجارتی اور صنعتی معاملات کرنے کے لئے ایک مرکزی ادارہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور ملک کی معاشی ترقی کی ضروریات اس امر کی متقاضی تھیں کہ ایک سمجھ دار اور طاقتور مرکز کی جانب سے متحدہ طور پر معاشی ترقی کے میدان میں قدم بڑھایا جائے۔ ریاستوں کی باہمی رقابت اور رنجش کی موجودگی میں یہ کام مشکل نظر آتا تھا۔ الگزینڈر ہیملٹن کی کوششوں سے معاشی مسائل یکے طے کرنے کے اختیارات مرکز کے تفویض کر دئے گئے۔ خانہ جنگی سے قبل امریکہ کی معاشی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) ۱۷۸۳ء تا ۱۸۱۶ء۔ اس دور میں ریاستوں کے معاشی اتحاد، محاصل اور پبلک زمینات کے بندوبست کے مسائل زیر غور رہے۔

(۲) ۱۸۱۶ء تا ۱۸۳۳ء۔ اس دور میں بھی محاصل کا سوال تھا۔ جنوبی ریاستیں زرعی علاقہ پر مشتمل تھیں اور آزاد تجارت کی مدد سے شمال کی ریاستوں کی مصنوعات خریدنا چاہتی تھیں مگر شمالی ریاستیں محاصل بندی کا طریقہ اختیار کر رہی تھیں۔ جنوبی ریاستیں ان محاصل کی ادائیگی کا یہ مطلب لیتی تھیں کہ اپنا نقصان کر کے شمال کو فائدہ پہنچایا جا رہا ہے۔

(۳) ۱۸۳۳ء تا ۱۸۶۱ء اس زمانے میں صنعت نے آبادی کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف منتقل ہونا شروع کر دیا تھا۔ صنعتی ترقی کس نہج پر ہو اور غلاموں سے نئی آبادیوں میں کس حد تک کام لیا جائے۔ یہ مسائل اس دور میں درپیش تھے۔

خانہ جنگی کے بعد کا اہم مسئلہ یہ تھا کہ کیونکر یورپ کی سستی مصنوعات کا مقابلہ کیا جائے۔ یورپ میں شرح اجرت کم تھی جس کی وجہ سے مصارف پیدائش کم ہوتے تھے امریکہ کو یہ شکایت تھی کہ یورپ کی سستی محنت سے تیار کردہ اشیا کی امریکہ کی مہنگی محنت والی اشیا سے مسابقت ہو رہی ہے۔

ابتدائی دور میں امریکہ کی صنعت کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ اول تو یہ کہ امریکہ نوآبادی علاقہ تھا اور اس میں مزدوروں کی کمی ایک قدرتی امر تھی۔ دوسرے یہ کہ زراعت ملک کا اہم پیشہ تھی۔ محنت کی کمی کی وجہ سے کارخانہ جات کی ترقی مشکل تھی اور زراعت کے معاشی زندگی پر محیط ہونے کے باعث ملک کی صنعت زیادہ تر چمڑے کی دباغت، آلات زراعت کی تیاری، آٹا پیسنے کے کارخانوں اور گوشت کی پیکنگ تک محدود رہی۔

امریکہ میں صنعتی انقلاب کا آغاز نیو انگلینڈ میں ہوا کیونکہ یہاں آبادکاری بھی پہلے ہوئی تھی۔ اصل کی رسد موجود تھی اور پانی کی قوت محرکہ بھی آسانی سے دستیاب ہو سکتی تھی۔ نیو انگلینڈ کی آبادی نے اعلیٰ قسم کی ذہانت کے کاموں مثلاً پارچہ بافی کی مشینوں کی تیاری، گھڑی سازی، اسلحہ سازی، کٹلری، مشین کے پرزے، پیتل اور ٹین کے برتنوں کی تیاری میں مہارت حاصل کی۔ انگلستان کی طرح امریکہ میں بھی اصل کی فراہمی اور بازاروں کی دریافت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت ترقی کرتی گئی۔ انگلستان سے آزاد ہونے کے بعد امریکی نوآبادیات عارضی طور پر اس مرکز سے الگ ہو گئی تھیں جس سے کہ وہ مصنوعات حاصل کیا کرتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ امریکہ میں بھی صنعتی ترقی ہوتی گئی۔ لوہے اور اون کی صنعتوں کو انعامات اور رقمی امداد دے کر جاری کیا گیا۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۱۵ء تک کے دوران میں امریکی کارخانے برابر ترقی کر رہے تھے۔ مگر ۱۸۱۵ء میں صلح کے بعد انگلستان کا مال امریکہ میں تیزی سے برآمد ہونے لگا۔ امریکہ کی تمام منڈیاں انگلستان کے مال سے بھر گئیں۔ مگر انجام کار امریکہ کو اس گلوخراش مقابلے سے نجات مل گئی جس کے اسباب

حسب ذیل ہیں :-

(۱) ۱۸۱۶ء اور ۱۸۱۸ء کے نامیتی محاصل
(۲) اندرون ملک ایندھن اور خام پیداوار کی فراوانی
(۳) محنت کی بچت کرنے والی مشینوں کی ایجاد
(۴) سرمایہ داروں کی شغل اصل کے لئے آمادگی
(۵) عالمگیر خوش حالی کی تجدید
(۶) ملکی بازار کی مسلسل توسیع

امریکہ میں انگلستان کی ایجادات نے صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھی تھی مگر بہت جلد ان میں امریکی حالات کے مطابق اصلاح اور ترمیم کرلی گئی۔

سب سے پہلے سوتی اور اونی دھاگہ بننے کے کارخانے تیار ہوئے۔ تمگے مل کر اس دھاگے سے کپڑا تیار کرنے کے کارخانے قائم کئے گئے۔ ۱۸۱۴ء کے بعد جگہ جگہ کپڑا بننے کے کارخانوں کا قیام عمل میں آنے لگا۔ ۱۸۰۸ء سے ۱۸۱۵ء تک کے عرصے میں کپڑے کے پچاس کارخانے (Massachusetts) میں کھل گئے تھے۔ یہ ترقی مسلسل جاری رہی۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۵-۶۰ء میں امریکہ سے سوتی صنعت کی برآمد کی مقدار دوگنی ہوگئی اور چین، مشرقی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک کو سوتی کپڑے کی مسلسل برآمد ہونے لگی۔

ریلوں اور ذرائع حمل و نقل کی ترقی نے ملک کی مصنوعات کے لئے نئے نئے بازار پیدا کئے۔ سڑکوں کی تعمیر کی بدولت داخلی تجارت آسان ہوگئی۔ حالانکہ اس کے قبل خارجی تجارت زیادہ آسان تصور کی جاتی تھی۔ اوائل انیسویں صدی سے ۱۸۱۵ء تک اور بالخصوص ۱۸۱۲-۱۴ء میں انگلستان سے جنگ کے زمانے میں غیر ملکی درآمد گھٹ گئی تھی جس کی وجہ سے اندرون ملک مصنوعات کی قیمتیں بڑھ گئیں اور لوگوں نے اپنا اصل صنعتوں میں لگانا شروع کر دیا تھا۔ مگر جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ۱۸۱۵ء میں انگلستان کی مصنوعات کی درآمد بہت زیادہ ہوگئی، اس سے شدید نقصان سوت، اون اور لوہے کی صنعتوں کو ہوا۔ سوت کی غیر ملکی طلب اتنی بڑھ گئی تھی کہ امریکی صناع اسے مناسب قیمت پر حاصل نہ کر سکتے تھے۔ اون کی صنعت کا یہ حال تھا کہ نیو انگلینڈ میں کارخانوں کی نصف مشنری بے کار پڑی ہوئی تھی۔ مگر اس مسابقت کے دوران میں بھی بہ حیثیت مجموعی امریکی صنعتیں ترقی کر رہی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی کی رفتار بہت سست ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے ۱۸۱۶ء اور ۱۸۲۴ء میں محاصل عاید کئے گئے اور ۱۸۳۳ء سے پھر بڑی تیزی سے صنعتی ترقی ہونے لگی۔ ۱۸۳۳ء سے ۱۸۶۱ء تک کے عرصے میں سوائے ۱۸۸۶ء اور ۱۸۵۶ء کی دقتوں کے مسلسل صنعت و حرفت ترقی کرتی رہی۔ باوجود خام پیداوار کی کمی کے اون کی صنعت نے بھی کافی ترقی کی۔ ۱۸۴۸ء میں بنائی کے لئے "Power loom" کی ایجاد سے قالین سازی نے خوب فروغ حاصل کیا۔ ہوزری میں مشینوں سے کام لیا جانے لگا۔ جہاز سازی نے خوب ترقی کی اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس زمانے میں امریکہ کا Tonnage دنیا بھر کا ایک تہائی تھا۔

صنعتی انقلاب کے بعد دھاتوں کو صاف کرنے کے بہتر طریقے ایجاد ہوئے۔ ریلوں اور ذرائع حمل و نقل کی ترقی کی بدولت کوئلے اور لوہے کے ذخیروں کو ایک دوسرے سے ملا دیا گیا۔ لوہے کو صاف کرنے کے طریقے میں اصلاح ہوئی [illegible] میں لوہا صاف کرنے کے لئے چارکول کی جگہ بغیر دھوئیں کا کوئلہ (Anthracite) استعمال ہونے لگا۔ ۱۸۴۲ء میں انگریزی لوہے کی درآمد پر محصول عائد کیا گیا جس سے لوہے کی صنعت کو بڑی ترقی ہوئی۔ خانہ داری کی ضروریات اور سب سے بڑھ کر لوہے اور فولاد کی ریلوے کی پٹریوں کے استعمال کی بدولت آہنی مصنوعات کی طلب بہت بڑھ گئی۔ ۱۸۵۰ء تک شمال کے سب بڑے بڑے شہروں میں لوہے کے کارخانے قائم ہو گئے تھے۔ خانہ جنگی کے ختم ہو جانے کے بعد (Tennessee) الباما اور جارجیا کی ریاستوں کے لوہے کے ذخیروں سے پوری طرح فائدہ اٹھایا گیا۔

امریکہ کی صنعتی ترقی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۱۱ء - ۱۹۰۰ء کے درمیان فی سال اوسطاً ۷۷ اشیاء پیٹنٹ کرائی جاتی تھیں مگر ۱۹۵۰ء - ۶۰ء میں یہ اوسط ۲۸۰۰ سالانہ ہو گئی۔

خود بخود چلنے والی مشینوں (Automatic Machinery) کی ایجاد سے دھات کی بنی ہوئی اشیاء کی پیدائش بڑھ گئی کیونکہ اس کی مدد سے ایک ہی شکل اور ایک ہی سائز کی ہزاروں اشیاء تیار کی جاتی تھیں۔ معیار...... (Standardisation) سے اور بھی سہولت ہوئی۔ (Eli Whitney) نے مشین کے مختلف اجزا کی باہم منتقلی (Interchangeability) کے اصول سے امریکہ کو روشناس کرایا اور بہت جلد یہ اصول امریکی صنعت کا اہم جزو بن گیا۔ جوں جوں مغرب کی طرف آبادی بڑھی جہاں جہاں گیہوں کی کاشت کے لائق رقبے نظر آئے وہاں آٹا پیسنے کے کارخانے بھی کھل گئے اور جہاں پانی کی قوت محرکہ دستیاب نہ ہو سکی وہاں ان کو بھاپ سے چلایا گیا۔ آگے چل کر بجلی کا استعمال عام ہو گیا۔ وادی اوہیو (Ohio) کے بس جانے کے بعد گوشت بند ڈبوں میں بھیجنے کی صنعت نے بڑی ترقی کی بعد میں اس صنعت نے اپنے مراکز مغرب کی طرف شکاگو Omaha اور Kanasas میں منتقل کر دئے۔ آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ عمارتی لکڑی کی طلب فرنیچر وغیرہ کے لئے بڑھ گئی۔ ترقی یافتہ مشینوں کی بدولت لکڑی سستی ہو گئی۔ جوتا سازی کی صنعت کی ترقی دیر میں ہوئی۔ مگر قدیم ڈگر پر یہ صنعت وسیع ہوتی گئی۔ ۱۸۶۰ء میں اس کے لئے نئی مشینیں ایجاد ہو گئیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ میں ٹرسٹ قائم ہونے لگے جس سے مسابقتی (Competitive) صنعت کو خطرہ لاحق ہوا۔ ٹرسٹوں سے صارفین اور مزدوروں کو نقصان ہو سکتا ہے۔ وہ حکومت اور سیاست کو بھی اپنی دولت سے متاثر کر سکتے ہیں مگر ان سے فائدے بھی ہیں۔ وہ مصارف پیدائش کو گھٹا دیتے ہیں، غیر ملکی بازار حاصل کر لیتے ہیں اور کاروبار کو زیادہ احتیاط اور دور اندیشی سے چلاتے ہیں۔ بہر حال ۱۹۵۵ء کے بعد ٹرسٹوں پر حکومت نے اپنی نگرانی قائم کر لی۔

آیت اللہ بیگ عارف

سب رس کے قلمی معاونین سے :-

مضامین، افسانے اور نظمیں بھیجتے وقت ایک ادبی رسالے کے معیار کا ضرور خیال رکھیں یہ ضروری نہیں کہ ہر لکھی ہوئی چیز شائع بھی ہو — ادارہ

قمر

(مخدوم محی الدین کے نام)

قدم قدم پہ لرزتا سا جا رہا ہے قمر
شرابیوں کو سنبھلنا سکھا رہا ہے قمر

یہ بزمِ شاہِ شبستاں یہ ماتمی سا لباس
فرازِ چرخ سے آنسو بہا رہا ہے قمر

روش روش سے ہے مفہومِ زندگی پیدا
چمن کو شعرِ مکمل بنا رہا ہے قمر

کلی کلی ہے شرابی چمن چمن میکش
مئے جمال کے ساغر لنڈھا رہا ہے قمر

عجب تکلمِ خاموش ہے فضاؤں میں
کہ سن رہے ہیں ستارے سنا رہا ہے قمر

سنبھل سنبھل کے قدم اٹھ رہے ہیں کرنوں کے
یہ کس کی بزم میں تشریف لا رہا ہے قمر

بہارِ ساتویں جنت کا اک حسیں پرتو
بہار بن کے زمانے پہ چھا رہا ہے قمر

یہ کس کا تیرِ نظر اتنا خوبصورت ہے
یہ کس کے داغ کو دل میں چھپا رہا ہے قمر

ہر ایک شاخ رباعی ہر ایک پھول غزل
بساطِ شعر پہ مُہرے جما رہا ہے قمر

ہنسی خوشی کا زمانہ بھی آئے گا ساقی
ابھی تو خون کے آنسو رلا رہا ہے قمر

ساقی صدیقی

لرمنتوف (۱۸۱۴-۱۸۴۱) شاعر اور ناول نگار تھا۔ اکثر "شاعر قفقاز" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ماسکو کے ایک اسکاچ نسل کے گھرانے میں پیدائش ہوئی۔ ماسکو کے جمنازیم سے دارالعلوم میں داخل ہوا لیکن کسی عدول حکمی کے سلسلے میں تعلیم منقطع ہو گئی۔ اس نے کیڈٹوں کی درسگاہ میں شرکت حاصل کی اور کوئی عہدہ مل گیا۔ پشکن کی وفات پر زار کو مخاطب کرکے ایک ولولہ انگیز نظم "شاعر کی موت پر" لکھی جس کی بنا پر گرفتاری عمل میں آئی، کورٹ مارشل ہوا اور فوج سے علیحدہ کرکے قفقاز بھیج دیا گیا۔ یہ جلاوطنی صرف ایک سال جاری رہی۔ وطن لوٹا تو اپنی مشہور تصنیف "ہمارے زمانے کا ایک جواں مرد" لکھی (جس میں خود اپنی شخصیت کو پیش کیا ہے۔ شاعرانہ بانکپن اور آوارگی کا نقطۂ کمال میں مل گیا تھا، اور اس نے اپنی اس دہری شخصیت کو "ہمارے زمانے کا ایک جواں مرد" ہیرو "پچورن" میں نکھار دیا ہے۔ وہ ہر لڑکی پر ڈورے ڈالتا ہے اور جب وہ گھائل ہو جاتی ہے تو نظریں پھیر لیتا ہے اس لئے کہ گھائل کرنا ہی اس کی فطرت ہے۔ (مترجم)

۱۸۴۱ء میں پیاٹیگورسک کے قریب ڈوئیل لڑنے میں مارا گیا۔ اس کی مشہور نظمیں یہ ہیں۔ "اسمٰعیل بے"، "حاجی ابرک"، "نوآموز" اور "والکرک" وغیرہ۔ "زار ایوان ویسلی وچ اور بہادر سوداگر کلاشنکوف کا گیت" اس حیثیت سے مابہ الامتیاز ہے کہ قدیم روسی بیلڈ (Ballad) کے انداز میں کامیاب کوشش ہے۔

سوویت یونین کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ لرمنتوف کی تصانیف ان دنوں ہزاروں کی تعداد میں سالانہ شایع ہوتی ہیں اور اس کا شمار سوویت یونین کے محبوب شعرا میں ہے۔

پشکن (۱۷۹۹-۱۸۳۷) کو بحیثیت شاعر روسی ادب میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ بائرس کے ایک قدیم خاندان میں بمقام ماسکو پیدا ہوا۔ بچپن میں سینٹ پیٹرزبرگ کے قریب ایک مکتب میں شریک کر دیا گیا۔ ۱۸۱۱ء میں مکتب چھوٹا تو محکمۂ وزارت خارجہ سے وابستہ ہو گیا اور اسی سال "رسلان لیود میلا" نظم شروع کی۔ ایسے میں وہ خوش باشوں کی محفل میں کچھ ایسا گھل مل گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ شاعری کی بجائے ایک فیشن زدہ ہو کر رہ جائے گا لیکن اسی زمانے میں "آزادی کا گیت" لکھ کر زار کی نظروں میں پڑا جس کے رد عمل کے طور پر جنوبی روس میں شہر بدر کر دیا گیا۔ اسی جلاوطنی کے دوران میں وہ بائرن کی تصانیف سے متعارف ہوا جو کچھ عرصے کے لیے اس کی طبع شاعرانہ کی تحریک کا باعث ہوئی۔ یہ امر نہایت ہی تعجب انگیز ہے کہ زندگی نے اس سے کچھ زیادہ دن نباہ نہ کی اور حالات بھی بیحد ناسازگار رہے (مضمون نگار کا مطلب شاید اس احتساب سے ہے جو نہ صرف حکومت نے عائد کر رکھا تھا بلکہ خود زار نے اسے اپنے دربار میں جگہ دے کر پابند کر دیا تھا۔ ساتھ ہی یہ نشاط انگیز صحبت تخلیقی کام کے لیے سنگ راہ ثابت ہوئی۔ مترجم) لیکن اس مختصر اور ناسازگار دور میں روسیوں کا قومی شاعر بن گیا۔ وہ وسیع القلب، آزاد خیال اور غیر معمولی طور پر مہذب و شائستہ تھا۔ ایک طرف تو وہ انتہائی روسی تھا اور دوسری طرف یکا یورپین۔

اس نے اپنا تاریخی ڈراما "بورس گوڈونوف" شکسپیر کے زیر اثر لکھا۔ بعض ابتدائی نظموں میں بائرن کا رنگ جھلکتا ہے اور دو نثری تصانیف میں سر والٹر اسکاٹ کا اثر نمایاں ہے۔ ان ادیبوں کے اثرات دیرپا تھے بلکہ اس کی تخلیقی جبیں کے سنوارنے اور نکھارنے کے لئے سنگ بنیاد تھے۔ پشکن کی پہلی نثری تصنیف "پیتر اعظم کا حبشی" ہے جس کے بعد "کپتان کی بیٹی"، "پگاشیف کی بغاوت کی تاریخ"، "ڈبراسکی"، "گوریوخو کی تاریخ" وغیرہ بھی لکھیں۔ پشکن کی نثر کے کتنے ہی دور رس اثرات کیوں نہ ہوں لیکن اس کا منظوم ناول (جیسا کہ وہ خود کہتا ہے)

"ایوجین دگین" زیادہ اہم ہے۔

گوگول (۱۸۰۹-۵۲) بمقام سارو شنسکی یوکرینی زمیں خاندان میں پیدا ہوا۔ اُس نے بچپن کا زمانہ یوکرین کی دیہاتی فضا میں بسر کیا۔ ۱۸۳۰ء میں مستقبل کی کامرانیوں کی تلاش میں سینٹ پیٹرز برگ روانہ ہوا لیکن قدم قدم پر ناکامیات نے خیر مقدم کیا۔ دکنی جوش، شگفتگی اور اداکارانہ مہارت کے ساتھ تخلیقی کام شروع کیا اور نتیجتاً "دکانکا کے قریب ایک کھیت کی شام" پیش کیا اس کتاب کا اس لئے بھی سرگرم خیر مقدم کیا گیا کہ متداول عقائد و رسومات اپنی پوری آب و تاب دکھلا رہے تھے جو اس زمانے کا فیشن تھا۔ سب سے زیادہ قابل توجہ چیز گوگول کی زبان ہے جو قافیہ، ترنم اور صنائع لفظی و معنوی سے پرکار ہو گئی ہے۔ گوگول کی نثر کا کامل نمونہ "وحشیانہ انتقام" ہے۔ کلاسک واقعاتی اسلوب پشکن کی نثر میں اپنی تکمیل کو پہونچ چکا تھا، گوگول نے نثر کی سیمابی طبیعت کو بلند کیا اور مرصع و مترنم نثر کو اس کے نقطۂ کمال پر پہونچا دیا۔ اس کا دوسرا مجموعہ "میرگورد" نثر میں ایک طرح کی قازق "الید" ہے۔

گوگول کی تخلیق میں اگلے وقتوں کے زمیندار "ادان وچ اور ادان نکورووچ کی لڑائی"، "ایک خاتون کی سرگزشت"، "نفسکی پراسپکٹ" (یہ ایک سڑک کا نام ہے۔ مترجم) "لبادہ"، "تصویر" اور "انسپکٹر جنرل" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گوگول کی تصانیف کا یہ دھندلا سا خاکہ اس وقت تک کا ہے کہ اس کا شہکار "مردہ روحیں" پیش نہ ہوا تھا۔ یہ تخلیق یورپی ادب کی حسن کامانہ کامرانی کاوشوں میں عظیم تر اہمیت رکھتی ہے۔ مردہ روحوں میں روسی معاشرے اور صوبائی زندگی کی ناقابل فراموش تصویروں کا ایک لا متناہی سلسلہ ملے گا۔

دستہ ئفسکی (۱۸۲۱-۸۱) ماسکو میں پیدا ہوا ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ کے حربی انجینیری کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۴۲ء میں فوجی کمیشن حاصل کیا۔ لیکن تین سال بعد اس سلسلے کو منقطع کرکے اپنے آپکو ادب کے لئے وقف کر دیا۔ اس کی پہلی تصنیف "غربا" ہے۔ اس کتاب کی اشاعت ان اہم واقعات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو نئے ادبی دور کی غمازی کر رہے تھے۔ نوجوان ناول نگاروں میں دستہ ئفسکی سب سے زیادہ ہونہار معلوم ہوتا تھا۔ نیم انقلابی سیاسی انجمن (پیترا شوفسکی کا حلقہ جس میں اشتراکیت کا پرچار ہوتا تھا اور مارکسی تعلیمات پر بحث و تمحیص ہوا کرتی تھی۔ اس حلقے کے زیادہ تر ارکان اشتراکی تھے۔ ایک دفعہ ارکان انجمن کو یکایک گرفتار کر لیا گیا۔ نہ جرم بتلایا گیا نہ صفائی طلب کی گئی۔ خود ارکان کو بھی اپنے جرم سے کوئی آگاہی نہ تھی۔ مترجم) کے رکن کی حیثیت سے اس کی گرفتاری عمل میں آئی اور سزائے موت تجویز کی گئی۔ دستہ ئفسکی اور اس کے رفیقوں کو قتل گاہ پہونچایا گیا، قتل کے تمام مراسم طے پا چکے تھے کہ عین گردن زدنی کے وقت معافی کے احکام سنائے گئے۔ (زار کے حکم سے سزائے موت جلا وطنی میں بدل دی گئی۔ مترجم) ان ساعتوں نے دستہ ئفسکی پر گہرا رنگ چھوڑا، چنانچہ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے۔ چار سال تک سائبریا میں قید رہا اور اس کے بعد مزید چار سال سمی پلد ئسنک میں سپاہی کی حیثیت سے کام کرنا پڑا۔ رہائی کے بعد ہی دو تصانیف شائع ہوئیں "مردوں کا گھر" اور "بےکس و مظلوم"۔ "جرم و سزا" "فاطر العقل"، "بھوت پریت" "برادران کرامازوف"، "سدا سہاگی"، "خام کار نوجوان" اور "مصنف کا روزنامچہ" وغیرہ بعد میں شائع ہوئے۔ موخر الذکر تصانیف اگرچہ مختصر ہیں لیکن دستہ ئفسکی کو سمجھنے میں اہم ہیں۔ ان نگارشوں میں اس کی وہ تمام صلاحیتیں نمایاں ہیں جو

اسے بلا قید زماں سب سے بڑے ناول نگار کا مقام بخشتی ہیں اور غیر معمولی استثنائی شخصیت کی بلند ترین عظمت کی شاہد ہیں۔

نکراسوف (۱۸۲۱-۱۸۷۷) یاڈولیا میں ایک زمیندار کے سلسلے سے پیدا ہوا اس نے اپنے باپ کے منشاء کے خلاف سینٹ پیٹرز برگ میں تحصیل علم شروع کی جس نے بیٹے کو اپنے معاشی وسائل آپ تلاش کرنے کے لئے اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسا۔ انیس سال کی عمر میں نکراسوف کی نظموں کا پہلا مختصر مجموعہ "خواب و صدا" شایع ہوا۔ وہ عوامی شاعر تھا اس لئے اس نے غریب دکھیارے عوام کی چپنا اور دکھ درد کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے جس کی بناء پر وہ مصلحین کے لئے ایک نمونہ بن گیا۔ نکراسوف کی نظموں کے مشہور مجموعوں میں "سرخ کرا" اور "روس میں چین و آرام سے کون رہ سکتا ہے؟" شامل ہیں۔

ترگنیف - (۱۸۱۸-۱۸۸۳) صوبہ کے ایک معزز گھرانے میں بمقام اورل پیدا ہوا۔ تعلیم گھر پر، جامعات ماسکو، سینٹ پیٹرز برگ اور بالآخر برلن میں ہوئی۔ جہاں تعلیم یافتہ روسی نوجوانوں سے میل جول کی وجہ سے وہ بھی مغربی خیالات کا پیرو بن گیا۔ کچھ دنوں سرکاری ملازمت کی لیکن بعد میں ملازمت ترک کر کے اپنے آپ کو ادب کے لئے وقف کر دیا۔ پہلی کامیاب ترین کوشش "کھلاڑی کے خاکے" سے عبارت ہے۔ جس میں کسان اپنے آقاؤں سے زیادہ جاذب نظر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے شہ پاروں میں "سکون" "آسیا" "نگاہ اولین" جیسے فسانے اور "ردوف استراف کی خلوت گاہ" "دو جھٹیا" اور "باپ و بیٹے" جیسے ناول شامل ہیں۔ جن میں پلاٹ اور عصری معاشری مسایل تار و پود کی طرح پیوست ہیں۔ ترگنیف کی تمام تصانیف پر چوٹی کے نقادوں نے تبصرے اور تنقیدیں کیں۔ اس کی حساس طبیعت تنقیدی نیش زنی کی تاب نہ لا سکی اور اس نے وطن کو خیرباد کہہ کے پردیس میں سکونت اختیار کی۔ بعد کی تصانیف اسی تنقید کی صدائے بازگشت ہیں۔ اپنے دو ناولوں یعنی "دھواں" اور "اچھوتی زمین" میں اس نے انہیں حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اس کی طبیعت کی شدت اور حساسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر معمولی حساسیت، بے مثال قوت مشاہدہ، خاص طور پر انسانی کردار کا — طریق اثر پسندی، ماہرانہ بے رنگ، صلاحیت توازن اور زبان کا ترنم، روانی اور فصاحت ترگنیف کی چند ایک نمایاں خصوصیات ہیں۔ ترگنیف ہی وہ سب سے پہلا روسی ادیب ہے جسے فرنگیوں نے پڑھا اور بے حد پسند کیا۔

تالستائے (۱۸۲۸—۱۹۱۰) اپنے والدین کے دیہی مستقر یاسنایا پولیانا میں پیدا ہوا جو طولا کے صوبہ میں واقع ہے۔ ابتدائی تعلیم فرانسیسی (و جرمن۔ مترجم) اتالیق کی نگرانی میں ہوئی۔ (لیکن یہ سلسلہ ماں باپ کے انتقال پر ختم ہو گیا بعد میں کچھ دنوں صرف فرانسیسی اتالیق کی نگرانی رہی۔ مترجم) اور بعد میں دارالعلوم قازان میں شریک کر دیا گیا۔ قازان معاشری مرکز تھا، اس لئے تالستائے کا زیادہ تر وقت سوسائٹی میں بسر ہوتا تھا۔ اس کے بعد کا زمانہ ماسکو میں بسر ہوا لیکن ۱۸۴۷ء میں قفقاز چلا گیا اور توپ خانہ کی جمعیت میں بھرتی ہو گیا۔ (جہاں اس کا بھائی نکولائی کپتان تھا۔ تالستائے کے قفقاز جانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نکولائی نے قفقاز کے موسم، باشندوں اور فطری حسن کی تعریف سے اس کے دل میں۔ اس دیس کو دیکھنے کی امنگ پیدا کر دی تھی جس کی شاعر قفقاز لرمنتوف اور پشکن نے اپنی تصانیف میں بے حد ستائش کی تھی۔ خود تالستائے نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایسی رومانی اور زندگی بخش فضا میں کیا۔ "بچپن، لڑکپن اور جوانی" "جنگل کی کٹائی" "قازق"،

"جنگ کے قلعے" "سیباسٹاپول دسمبر میں" "اور سیباسٹاپول مئی میں" اس کے افسانوں کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ (مترجم)
اور ترکوں سے مقابل اور سیباسٹاپول کے محاصرہ میں بہادرانہ حصہ لیا۔ قلعہ کی تسخیر کے بعد اسے سینٹ پیٹرز برگ بھیج دیا گیا۔

تالستائے کی مشہور تصانیف میں "جنگ و امن" "آننا کرینین" "اعترافات" "بچپن، لڑکپن، اور جوانی" "قازق" "بازیافت" "کرائسٹر سوناٹا" "باطل کی قوت" "روشن خیالی کا پھل" اور "زندہ لاشیں" شامل ہیں۔ ۱۸۷۶ء کے لگ بھگ تالستائے نے اپنی غیر اثر پذیر اور خوش حال زندگی سے الجھن سی محسوس کرنی شروع کی۔ سر پر کھڑی ہوئی موت کا ناقابل تسخیر خیال آسیب کی طرح دل پر مسلط ہو گیا، اس لئے وہ اپنی زندگی کے مذہبی جواز کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا اور یہ قوت اس پر پوری شدت کے ساتھ محیط ہو گئی۔ اس کا شر سے عدم مقاومت کا نظریہ (اک زمانہ گزرنے اور اس کے رجعت پسند ہو جانے کے باوجود بھی گاندھی جی اسی نظریے کے پرچار میں مصروف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی اپنے "استاد" سے زیادہ باعمل ہیں۔ مترجم) اس کے عقیدے کی بنیاد بن گیا جو بہت جلد ہی "تالستائیت" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ تالستائے نے اپنی اس معکوسیت کی بعد کی روئداد "میرے اعترافات" میں بیان کی ہے۔ اس کی مذہبی تعلیمات پر بہت زیادہ بحث و تمحیص اور تنقید ہوئی لیکن لزف رن نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ "تالستائے کی اہمیت بہ حیثیت مفکر مختلف فیہ ہو سکتی ہے لیکن حسن کار تالستائے کا شمار بہر حال عظیم ترین شخصیتوں میں ہے"
تالستائے کی طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ ساری زندگی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ یوں بھی اس کے عزائم اور خواہشات ہمیشہ اس کی دست رس سے آگے ہوتے لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ اور عبرت انگیز وہ کشمکش تھی جو خاندانی روایات اور اپنے عقاید کے مابین پیدا ہو چلی تھی۔ اس کے عقاید اسے مجبور کر رہے تھے کہ روایات، قدامت اور تمول کے ٹھاٹھ ختم کر دے لیکن خاندان بالخصوص بیوی اور اولاد پر نہ تو اس کی تعلیمات کا کوئی اثر پڑا اور نہ وہ اپنی قدیم وضع بدلنے کو تیار تھے بلکہ الٹے ان کی یہی کوشش رہتی کہ وہ بھی ان کا شریک رہے۔ اسی کشمکش سے تنگ آ کر اس نے بیوی کو ایک خط لکھا اور گھر چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ اسی سفر میں موت نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس نے کسی تیسرے درجے کے تاریک اسٹیشن میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مترجم)

چیخوف (۱۸۶۰-۱۹۰۴) ڈراما نگار اور فسانہ نویس تھا۔ تگن روگ میں پیدا ہوا جو بحر ازوف کے ساحل پر واقع ہے۔ اس کا باپ ایک کاروباری آدمی تھا اور دادا زرعی غلام (جس نے روپیہ جمع کر کے آزادی "خرید" لی تھی اور تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ مترجم) چیخوف نے اسی زمانے سے لکھنا شروع کیا جب کہ وہ جامعہ ماسکو میں طب کا طالب علم تھا۔ ابتدا کی کہانیاں زیادہ تر مزاحیہ اور طنزیہ ہوتی تھیں اور ایسے ہی پرچوں میں شایع ہوتی تھیں۔ "گل کار کہانیاں" اسی مزاح و ظرافت کا شکار رہیں۔ لیکن بہت جلد اس میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی جو سب سے پہلے اس کے ڈرامے "ایوانوف" اور افسانوں کے مجموعے "اداس انسان" میں ظاہر ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں زندگی کے اس گم نام موڑ کے نشان راہ کی وارفتگی پر غمازی کرتی ہیں جو عنفوان شباب کا سرمایہ ہے۔

چیخوف کے شہ پاروں میں "ماموں وانیا" "تین بہنیں" "گلستان ناشپاتی دانہ" "میری زندگی" "سنگیت کنھیا" "کہنائے" "اسٹیپ" "مسرت"

"ایسٹر کی شام" "ڈویل" "وارڈ نمبر ۶" وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا شمار ڈراما نگار کے علاوہ دنیا کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

چیخوف کا اثر روسی ادب پر دیرپا نہ رہا۔ اس کی موت کے فوراً بعد ہی نئی ادبی تحریک کو عروج ہوا اور چیخوف کی ادبی روایات کے جاری رہنے کے تمام تر امکانات ختم ہوگئے۔ آج کے روس میں چیخوف اپنے ہم رتبہ ادیبوں میں سب سے زیادہ بیگانہ ہے۔ لیکن دوسری طرف روس کے باہر پچھلے چند برسوں میں اس کے اثرات بڑھتے جا رہے ہیں (چیخوف کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کی زندگی کے دوران ہی میں اس کے افسانوں کا اکیس زبانوں میں ترجمہ ہوا تھا۔ اس کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ جب اس کا انتقال برلن کی صحت گاہ باڈن وائلر میں ہوا تو چھ سال بعد اس کی یاد میں ایک مجسمہ نصب کیا گیا۔ اس کا جنازہ اس اہتمام اور تزک و احتشام سے اٹھایا گیا کہ دنیا کے دوسرے ادیبوں میں دستہ ئفسکی کے علاوہ کسی اور کی مثال آج تک نہیں ملتی۔ مترجم)

گورکی (۱۸۶۸-۱۹۳۶) اس کا نام الکسی مکسی موویچ پشکوف تھا۔ نشنی نوف گورود (شہر استرافان) میں پیدا ہوا، جو اب اسی کے نام سے معنون ہے۔ اس کا باپ فرنیچر ساز تھا (ایک تذکرے میں لکھا ہے کہ کسی جہاز راں کمپنی کا نمائندہ تھا۔ مترجم) پانچ سال کی عمر میں یتیم ہوگیا اس لئے ماں کے ساتھ نانا کے گھر رہنے لگا نو سال کی عمر میں (جب کہ اس کی ماں نے دوسرا عقد کرلیا اور بہت جلد دق کا شکار ہوگئی۔ مترجم) خود اپنا پیٹ آپ پالنے پر مجبور ہوا اور پندرہ سال تک مختلف پیشے اختیار کرتے ہوئے مشرقی و جنوبی روس کی خاک چھانی۔ اسی دوران میں اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور دندیدوں کی طرح کتابوں پر ٹوٹ پڑا۔ ساتھ ہی انشاء پردازی بھی شروع کردی۔ صوبائی جرنلسٹ بننے دیر نہ لگی اور ۱۸۹۵ء اس کی کہانی "چیلکاش" سینٹ پیٹرزبرگ کے کسی چوٹی کے ریویو میں قبول کرلی گئی۔ دو سال بعد کہانیوں کا مجموعہ شائع ہوا اور اس طرح بہت جلد دنیائے شہرت پر آفتاب بن کر چمک اٹھا۔ لینن کے دوست کی حیثیت سے انقلابی تحریکوں میں سرگرمی کے ساتھ عملی حصہ لیا۔ وہ سب سے پہلا چوٹی کا اشتراکی ادیب ہے جس کی تصانیف اور سرگرمیاں مزدور جماعت کے نام معنون ہیں۔

۱۹۰۱ء میں گورکی کو اس کی انقلابی ذہنیت اور سرگرمیوں کی بناء پر شہر بدر کرکے نوف گورود بھیج دیا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں شاہی اکادمی کا رکن منتخب کیا گیا لیکن اس کی معروفیات اور عقاید کی بناء پر یہ انتخاب مسترد کردیا گیا۔ چیخوف ان دنوں زندہ تھا، وہ ایک ادیب کی توہین برداشت نہ کرسکا اور احتجاجاً خود بھی شاہی اکادمی کی رکنیت سے مستعفی ہوگیا۔ تین سال بعد پھر گورکی کو قید کردیا گیا۔ لیکن اس سزا کے خلاف سارا فرنگ اٹھ کھڑا ہوا، مجبوراً زار شاہی کو اپنا فیصلہ منسوخ کرنا پڑا۔ گورکی کا کمال فن یہ ہے کہ اگرچہ وہ غیر تعلیم یافتہ تھا اور کٹر انقلابی لیکن اپنے آرٹ کی انفرادیت اور حسن کارانہ شخصیت کو برقرار رکھا اور اپنے آرٹ و شخصیت کو انقلاب کی ہنگامہ خیزی میں گم نہ ہونے دیا۔ اس کے باوجود اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بناء پر عوامی ادب کا رہبر بن گیا۔ مترجم)

اس کی تخلیقی شہ کاروں میں .... "میرا ہم سفر" "چھبیس مرد اور ایک لڑکی" "ماں" "دنیا میں"، "میری تعلیم گاہیں" "بچپن" "فوما گوردے یف" اور "وہ تینوں" وغیرہ شامل ہیں۔

مرژ کوو سکی (۱۸۶۵-؟) سینٹ پیٹرزبرگ میں پیدا ہوا۔ ناول نگار اور ناقد تھا عدالت کے کسی عہدہ دار کا لڑکا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے ناکام رہا تو فلسفیانہ تنقید، تاریخی ناول، ڈرامے

اور پمفلٹ لکھنے شروع کئے۔ اگرچہ اپنی تصانیف میں بڑے سلیقہ و ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ حقیقت ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ وہ نظریہ پرست تھا۔ اس لئے اسے زندگی کی جیتی جاگتی تصویروں سے زیادہ قدامت کی دستاویزی میں سکون نصیب ہوتا ہے۔ انقلاب کے بعد پیرس چلا گیا اور وہیں انشا پردازی جاری رکھی۔

"خداؤں کی موت" "تیوے نارڈو دا ونسی" "پیٹر اور الکسس" "تالستائے اور دستو ئفسکی" وغیرہ اس کی مشہور تصانیف ہیں۔

حسینی شاہد

حشرِ جذبات

ہو گیا مخصوص سوزِ بندگی میرے لئے
سجدہ گاہِ عشق ہے تیری گلی میرے لئے

ہوشیاری میں تو بڑھ جاتی ہیں دل کی کاہشیں
ہے پیامِ زندگی اب بے خودی میرے لئے

ایک لطفِ خاص تھا جب مضطرب تھی زندگی
اب قیامت ہے غمِ آسودگی میرے لئے

ہو چکی تکمیل ثاقب کیا جنونِ عشق کی؟
اب نہیں ہے فرض شاید بندگی میرے لئے

— ۲ —

آج پھر محفل میں اس کی اجتماعِ جلوہ ہے
دیکھئے پھر اوج پر نازِ متاعِ جلوہ ہے

غور کرتا ہے عبث تو زندگی کے راز پر
زندگی کیا چیز ہے بس اک شعاعِ جلوہ ہے

ایک ہی جلوے سے پیدا ہے یہ ساری کائنات
دہر کی نیرنگ سازی اختراعِ جلوہ ہے

آہ وہ پہلی سی رونق صحنِ گلشن میں نہیں
آج یہ معلوم ہوتا ہے وداعِ جلوہ ہے

آج ثاقب اس کی محفل میں ہے مخمورِ حیات
کس قدر پُر کیف یارب اجتماعِ جلوہ ہے

ثاقب (کانپوری)

قطعات

بے کیفی

درد میں اب کسک نہیں ہوتی
زندگی کے ہیں اور ہی آثار
یوں مرے دل میں ہے تمہاری یاد
جیسے دم توڑتا ہوا بیمار

تنہائی

کاش ایسے میں تم بھی آجاتے
چاندنی رات مسکراتی ہے
رو بھی لیتا ہوں یاد کر کے تمہیں
زندگی پر ہنسی بھی آتی ہے

یہ کیا کرتے ہو؟

ذکر بھولے ہوئے افسانوں کا
چھیڑ دیتے ہو برا کرتے ہو
تم جو برسات کی راتوں میں مجھے
یاد آتے ہو یہ کیا کرتے ہو

صدائے غم

کاش ایسے میں کوئی مجھ کو سہارا دیتا
سوجھتا ہی نہیں کچھ اور بجز راہِ فرار
یوں مرے درد بھرے دل سے صدا اٹھتی ہے
جیسے سنسان بیاباں میں پپیہے کی پکار

سرابِ خیال

دلِ خانہ خراب کے ہاتھوں
مبتلائے عذاب رہتے ہیں
ایک موہوم آرزو کے سوا
زندگی اور کس کو کہتے ہیں

سکوت نما حرکت

تم نے کیا کر دیا خدا جانے
اور ہی ہے خیال لوگوں کا
یوں پریشان حال رہتا ہوں
جیسے بیمار چند ہفتوں کا

تصور و تسلّط

رہزنی کر رہی ہے شامِ فراق
منزلِ زندگی ہے بے مشعل
یوں تخیل پہ چھا رہا ہے کوئی
جیسے برسات کے گھنے بادل

احساس

یہ بھی جینے میں کوئی جینا ہے
پیار ہی ہے نہ پیار کی باتیں
یوں جوانی کے دن گزرتے ہیں
جیسے جاڑوں کی چاندنی راتیں

شاطر حکیمی (کامٹی)

سادھو کے بول

قصہ ہے داستانِ حیات

پھول ڈھونڈے ہیں خار پائے ہیں

وہ کھیل کھیل میں ایسے کچھ گزرا کہ کبھی سوچا بھی نہیں کہ کب صبح ہوتی تھی اور کیونکر دیکھتے دیکھتے شام ہو جاتی تھی۔ البتہ شام کی آمد کا بہت انتظار رہتا تھا کیونکہ کھیل کی اجازت لے دے کر اسی وقت تو ملتی تھی۔ لڑائی، جھگڑا، دھول دھپا، ٹھوکر لگی، گرے، خون بہہ رہا ہے، گھٹنے چھٹ گئے، بھاگے جا رہے ہیں۔ آتشبازی چھوڑی، دامن جل گیا، خوب ڈانٹ سنی، گالیاں، کوسنے، دھمکیاں، لیکن پھر جیسے کے ویسے، نہ احساس، نہ رنج نہ تکلیف نہ ملال لڑکپن کی فہرست میں یہ سب گورکھ دھندے کہاں۔ دیکھتے دیکھتے صبح زندگی کی شام ہونے لگی۔ بھرپور شام، بڑے ہونے لگے آفت آگئی۔ دھیرے دھیرے عقل آنے لگی۔ غضب ہو گیا۔ یہ نہ کرو، وہ کرو، یہاں مت جاؤ، وہاں مت بیٹھو، باہر مت نکلو، پابندیاں، اصول، نصیحتیں، غرض صبح سے شام تک کی نصیحتیں، جی بیزار ہو گیا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ سب کیوں کریں جس کے کرنے کو کہا جاتا ہے اور وہ کیوں نہ کریں جس کے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ سمجھ آئی بھی کیوں۔ کون بلایا تھا اسے ہم ایسے ہی بھلے تھے ع

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

رفتہ رفتہ اسکول سے کالج کے دن آئے۔ ۱۴ سال میں میٹرک کامیاب کیا۔ سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نظر لگنے لگی۔ صدقے اترے۔ ٹوٹکے ہوئے غرض الابلا سب ہی کچھ ہوا۔ دو سال انٹر کے بھی خیریت سے گزرے۔ شاندار کامیابی، مبارکبادیاں، دعوتیں، گلپوشی، کالج کو چھٹیاں ہو گئیں اور ہم بی اے کے سپنوں میں کھو گئے۔ دن گنتی تھی۔ کب کالج کھلے گا۔ گریجویٹ ہونے میں دو ہی سال تو رہ گئے ہیں۔ پھر کیا ہے اور پھر اس کے بعد؟ اللہ دیکھا جائے گا۔ ادھر یہ تو میرے من کے سپنے تھے۔ ادھر گھر کے جس گوشے میں دیکھوں گھسر پھسر شروع ہو گئی تھی۔ تیکھی نظریں، سرگوشیاں، سر جوڑ کر چپ چپ سی باتیں، مجھے دیکھتے ہی سب کے سب خاموش، جیسے کوئی سنسنی خیز گفتگو جس سے میرا تعلق ہے۔ نانی جان اور پھپھی جان تو میری [illegible] بن گئی تھیں جانے ان کا کیا جاتا تھا۔ بس بہت پڑھ لیا ہے اس نے۔ اب شادی کر دو اس کی۔ جیسے سب ان کا کھا رہی تھی۔ ان پر بوجھ تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا منصوبے ہیں۔ کون سے ارادے ہیں، کس قسم کی اسکیمیں ہیں۔ [illegible] شادی کے سلسلے میں ان کی کیا کیا تیاریاں ہیں۔ [illegible]

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگزر کو کیا خبر ہے!

گھر کی فضا سے جی اکتانے لگا تھا۔ اب جیسے دیواروں سے ہول سی ہونے لگی تھی۔ وہ کالج کی چہل پہل، ہم سبقوں کی صحبت، ہم نواؤں کے ہجوم، ہم عصروں کا جھرمٹ۔ ایک جمعہ آتا تھا۔ وہ [illegible] ہو جاتا تھا۔ نہ کسی کی بات بھلی لگتی تھی نہ کسی سے بات کرنے کو طبیعت چاہتی تھی

دل کشمکشِ زیست سے ہے مرگ در آغوش
جینے پہ بھی اصرار ہے معلوم نہیں کیوں

جمعہ تھا۔ نصاب کی کتابوں کو دیکھتی تو الجھن سی ہونے لگی۔ افسانوں کی ایک کتاب لے لی اور مہندی کی باڑھ کے قریب ہری ہری دوب پر جہاں نیم کے پیڑ کے ہلکے ہلکے سائے تھے، لیٹ گئی۔ ایک افسانہ شروع کیا۔ ہمہ تن گم ہو گئی۔ قصہ کی ہیروئن کے حالات کچھ کچھ مجھے اپنی زندگی کا پلاٹ محسوس ہونے لگے۔ کچھ سوچ سی لگ گئی۔ مستقبل کی سوچ کہ واقعی کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ خیالات بھٹکنے لگے۔ دماغ کی نامعلوم وادیوں میں۔ کہ نجمہ دوڑی دوڑی آئی۔ کیا ہے؟ کیوں ہانپ رہی ہے بدتمیز؟ کچھ چل تو نہیں گیا دماغ؟

"کچھ نہیں باجی۔ اچھا تم کو کب سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ اور تمہیں آج چھٹی کے دن بھی پڑھنا سوجھا ہے۔ یہ دیکھو میں اپنی گڑیا کے گھروندے بنا رہی تھی۔ چلو امی تمہیں بلاتی ہیں۔

ان کے پاس کچھ مہمان بی بیاں آئی ہیں۔ وہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں"

"کیا کریں گی مجھے دیکھ کر، کچھ لعل تو نہیں لگے ہیں۔ عجائب گھر کی کوئی مخلوق تو ہوں نہیں"

یہ سب مجھے نہیں معلوم چلو بس۔

ہماری امی بڑی ہر دل عزیز ہیں۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب ابا کہا کرتے تھے کہ "اگر مجھے اس کا علم پہلے سے ہوتا کہ تمہاری سماجی گردیدگی کا یہ عالم ہے، تمہاری سہیلیوں کی اتنی زبردست پلٹن ہے تو شاید میں تم سے شادی نہ کرتا"۔ لیکن میں اتنی ہی آدم بیزار تھی ——— کتنی مختلف تھیں ہم دونوں! خیر، تجمہ تو میری ڈانٹ ڈپٹ سے گھبرا کر چلدی - اب کیا دیکھتی ہوں بوڑھی عشرت اپنا بھاری بھرکم توند اور بوٹا سا وزنی قد لئے تھل تھل چلی آرہی ہے - وہیں سے الاپ رہی ہے :-

"اے بی بی کہاں چلی جاتی ہو - لوچ، ایک دن جمعہ کا آتا ہے - اس دن بھی پڑھنا، پڑھنا - جانے کس موئے نے یہ پڑھنا دڑھنا نکالا ہے - خدا ہی تو سمجھے اس سے یہ لو، یہاں بیٹھی ہیں گٹ پٹ ہو رہی ہے - دیکھو آنکھیں ستیاناسی ہو جائیں گی - دماغ دشمنوں کا بیکار ہو جائے گا"۔ قطع کلام کرتے ہوئے :- کیا ہے بوا؟ کیوں بڑبڑا رہی ہے؟ میرا کیوں پیچھا کیا ہے آج تم لوگوں نے؟ کہیں جینے بھی نہیں دیتے چین سے کم بخت ———"

"اے کچھ نہیں بی بی تمہاری امی کی ایک سہیلی لکھنؤ سے آئی ہیں - بہت دنوں کے بچھڑے ملے ہیں۔ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں ———"

"ہٹاؤ بوا اس دیکھنے دکھانے کے قصہ کو۔ بھاگو یہاں سے - میرا سر نہ کھاؤ۔ نہیں آتے ہم۔ کیا کر لوگی ہمارا، وہ لکھنؤ کی ہوں یا بھوپال کی - ہم پر ان کا رعب نہیں جم سکتا سمجھیں؟ جاؤ سنا دو امی کو"۔ میں نے اس طرح اس پر اپنا رعب جما دیا۔ جانتی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ کہے گی امی سے - وہ اپنا منہ لے کر جا رہی تھی - کچھ چپ چپ بڑبڑاتی بھی رہی۔ جو میں برابر سن نہ سکی۔ شاید میری بدتمیزی کی داد دے رہی تھی - میری ناقص تعلیم کی پھبتی اڑا رہی تھی۔ سچ بھی تو ہے - کہیں ڈگری لینے سے اخلاق آجاتے ہیں؟ انسان میں مکمل انسانیت آجاتی ہے؟ ڈگری تو محض ایک اشتہار ہے - شہرت کا ٹھیکہ جیسے - اب مجھے فلسفہ اور منطق کو چھوڑ کر زندگی کی نفسیات کو سوچنا تھا۔ اس بگولے کے سر سے ٹلنے کے بعد میں نے اطمینان کی ایک سانس لی اور قصہ پڑھنے لگی - قصہ کی ہیروئن۔ کتنی ملتی جلتی تھیں اس کی اکثر باتیں مجھ سے - ایسے لگتا تھا جیسے میری ہی اپنی زندگی کا نقشہ ہے - لکھنے والے نے لکھنے سے پہلے میری زندگی کو کونہ کونہ سے جھانک کر دیکھا ہے - کتاب میں بڑی دیر سے پڑھتی ہوں - بعض فقروں پر پہروں سوچ سی لگ جاتی ہے - غرض یوں تیوں ختم کرنے کی ٹھانی تھی کہ تیسرا جوہری بم پھٹا - دیکھتی کیا ہوں امی سر پر سوار ہیں - ان کی شخصیت مجھے بہت متاثر کر دیتی ہے۔ ان کی خوبصورت آنکھیں، ان کا رعب اور ان کی گہرائی - میں انھیں دیکھ کر اپنا سب کچھ بھول گئی۔ اف! میں ان سے بہت ڈرنے لگی تھی - یونہیں بچپن سے حالانکہ وہ مجھے بہت چاہتی تھیں - سب بچوں سے زیادہ ——

"فریدہ! یہاں کیا کر رہی ہے بچی - ساری دنیا سے نرالی طبیعت ہے - جی نہیں گھبراتا تنہائی سے؟ آخر ہمارے پاس بھی کبھی بیٹھا کرو - اتنی پڑھائی سے الجھن نہیں ہوتی تجھے؟ پگلی کہیں کی ———"

کتنا رس اور کتنا پریم تھا ان فقروں میں - ماں کی محبت وہ بدنصیب کیا جانے جس نے کبھی ماں کا

پیدا ہی نہ دیکھا ہو جن بچوں کی مائیں لڑکپن میں ہی
رہ جاتی ہیں ان کے دل بڑے پتھر ہو جاتے ہیں۔
ماؤں کے روپ میں بھگوان بستے ہیں۔ میں امّی کا
کچھ بھی تو جواب نہ دے سکی۔ لیکن اس غیر معمولی
آؤ بھگت، اتنی خلاف عادت خاطر داری کا پس منظر
میری نگاہ دوررس کے لئے تشویشناک ضرور تھا
ہزار شکوک ہونے لگے۔ لیکن پھر ان توہمات کو میں
ان کی محبت پر ہی محمول کرتی رہی۔ چپکے چپکے یہ گنگناتے
ہوئے ان کے ساتھ ساتھ ہو گئی ع

تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

یہ امائیں بھی کیسی کیسی ترکیبیں ہم کو دام فریب میں پھنسانے
کی سوچتی ہیں۔ ان کے فتراک کے یہ معصوم نخچیر ———
دیکھئے ان کا کیا حشر ہو۔ ہمارا کھلانا پلانا جیسے انہیں
کھلتا ہے۔ بجّی بھیا کی فکر ہی نہیں ہوتی کسی کو۔
اتنے سیانے ہو گئے ہیں۔ جب کبھی ان کی شادی کا
ذکر چھیڑا، اماں نے منہ چڑا دیا۔ "ارے اس کا
کیا ہے۔ کوئی عمر گئی ہے" تو بھیا تو مجھ سے کافی
بڑے ہیں۔ ان کی تو ابھی عمر نہیں گئی۔ اور میں
آنکھوں کا ٹھیکرا بن گئی۔ کہیں پڑھا تھا۔ یاد نہیں
کہاں۔ امّی کی باتوں سے اس فقرہ کا مفہوم اب
سمجھ میں آنے لگا تھا۔ "شادی ——! جوان کو
ابھی نہیں۔ بوڑھے کو کبھی نہیں" ———

خیر۔ تو مجھے اس بہانے سے بلایا تھا۔ سچ مچ مجھے
دیکھنے آئی تھیں ان کی سہیلی۔ خوب گھور گھور کر دیکھا۔
جیسے جوہری کسی انمول کنکر کو دیکھے۔ یا شاہ کسی درشہوار
کو پرکھے۔ قریب بٹھالیا۔ بلائیں لیں۔ ان کے ساتھ
بھی ایک بوا تھیں۔ وہ بھی سرکتے سرکتے بہت قریب
آگئیں۔ کئی نگاہیں دفعتہً واحد میں مجھ پر فلڈ لائٹ
کی طرح چاروں طرف سے پڑ رہی تھیں۔ میں پاگل سی
ہو گئی تھی۔ جیسے جان ہی نہ تھی سارے بدن میں۔

اتنی تنقیدی نگاہیں میرا جائزہ لیں اور میں کچھ محسوس
نہ کروں۔ ع یہ وہ نگاہ ہے اے خدا کیا ہے
جیسے میرا طبی معائنہ ہو رہا تھا۔ گھوڑا جب لیتے ہیں تو
اس کی بال بھنوری دیکھی جاتی ہے۔ ایک انسان کو
انسان ایسے دیکھتا ہے جیسے اس میں خود کسی قسم کا عیب
نہیں اور انسان کی نگاہیں ہی تو انسان میں عیب
ڈھونڈھ سکتی ہیں۔ غالب کہتا ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

خیر۔ تو آپس کی سرگوشیوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
اس معائنہ تنقیدی میں ہم کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہمارے
دیکھنے والے نے اطمینان کی سانس لی اور بڑی محبت سے
ہمارے سر اقدس پر دست شفقت رکھا۔ گاہک کو جنس
پسند آگئی تھی اور ادھر میرا جو حال ہو سو ہو۔ من میں
لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اب کیا ہو گا۔ یہ سوچ لگ گئی
تھی۔ کاش اس امتحان میں ناکامی ہوتی تو پھر دنیا
میں کیا کچھ نہ کر لیتی ع

سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

صیاد آیا، بلا د آیا، بیداد آیا قسم کے کئی قافیے ذہن
کی خلا، میں گونجنے لگے۔ قصہ کی یہ ذہنیت کا پلاٹ، کتنا
سچا واقعہ تھا، کتنی ملتی جلتی تصویریں تھیں، کیسی ہو بہو
عکاسی تھی میری اپنی زندگی کی۔ جیسے واقف تھا
میری زندگی سے اس قصہ کا مصنف۔!

گاہک نے اپنی اس جنس ناقص کی نظر ثانی کا
دن مقرر کیا۔ گویا دن گنے جانے تھے اس دن
کے لئے۔ اپنے گھر سدھاریں اور مجھے ایسے محسوس
ہونے لگا جیسے ہزاروں کے نرغے سے کسی نے مجھے
کھینچ لایا ہے۔ تنہائی کتنی اچھی ہوتی ہے۔ لیکن کہاں۔
یہ تو صرف ایک احساس ہی ہے۔ وہ تو چند دن۔
لیکن اب میں کیا کروں گی۔ ذرا سوچئے۔ میری زندگی۔

اوراق کتنے منتشر کر دئے تھے انھوں نے گریجویٹ ہونے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ یہ کروں گی' وہ کروں گی۔ اپنی بہنوں کی خدمت اور نہ جانے کیا کیا' سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ میرے نظام العمل کی ترتیب درہم برہم ہوگئی۔ ابھی دنیا ہی کیا دیکھی تھی۔ یہ خیال و خواب کی بستی۔ یہ میکہ کا سہانا پن' یہ بے فکری' یہ الٹے تلے سب کے سب صرف یاد اور تخیل ہی ہو کر رہ جائیں گے ؀

با کسے وقتی وصالے داشتم
سالہا بگذشت و آں از دل نرفت

اب ذرا ادھر کی سنئے۔ وہ بھی تو بڑے مزے کی کہانی ہے۔ ممّی کی سہیلی کے صاحبزادے جو ہمارے ہونے والے کچھ ہوتے ہیں۔ ان سے بچنا اب انھیں مشکل تھا۔ سوالات کی انھوں نے بھرمار کر دی۔ کیسی ہے' کیا ہے' سچی سچی باتیں ہوں سب جھوٹ موٹ بناوٹی تعریف نہیں۔

بیچاری لگیں وہ ہماری تعریف کے پل باندھنے۔ کہ ایسی ہے ویسی ہے۔ چاند کا ٹکڑا ہے' اس میں میل نہیں۔ قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اپنی فرصت کے لمحے میں سوچ بچار سے ڈھلی ہوئی مورتی کوئی قاجی کوئی ٹسر' ایک شہ کار ہے اس کے فن کا۔ کتنا سبک نقشہ' کیسے خوبصورت بال۔ آنکھوں کو نرگس سے کیوں نہ تشبیہ دوں۔ ایک شاعر کا تصور۔ ایک مصور کا کمال ہے۔ بوا کریمن جو ساتھ تھیں انھوں نے ان کی شاعرانہ عکاسی میں اپنے دو بول شریک کر دیے :۔ بی بی آپ نے غور نہیں کیا بال میں ذرا الجھتیں سی ہیں۔ سیدھے سیدھے بال نہیں ہیں دلہن کے' اف! کتنی زبردست تنقید' کتنا گہرا تبصرہ' کیسی نکتہ رس نظریں! سلمیٰ بہن جو ہماری نند ہونے والی تھیں۔ بوا کی اس والہانہ دخل در معقولات سے جھلا گئیں۔ "بس بھی یا [illegible] ...

خیر بھئی تو رفتہ رفتہ زندگی کا وہ دن آ ہی گیا کہ پر باندھنے صیاد آیا۔ کنوار پتے کے سہانے سلونے دن سپنے ہوگئے۔ در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہم میکہ سے رخصت ہوئے۔ جس گھر کو ہم اب تک اپنا سمجھتے تھے وہ حقیقت میں اپنا نہ تھا۔ اپنے تو غیر تھے' اپنے تو پرائے تھے جو پھر اپنے ہی ہوگئے۔

سسرال میں ہماری بڑی قدر و منزلت تھی۔ بڑے چاؤ ارمان تھے' حامد مجھے بے انتہا چاہتے' میری ہر خواہش ایک حکم کا اثر رکھتی۔ میرے اشاروں پر دنیا ناچ رہی تھی۔ سب مجھے اس طرح گھیرے رہتے جیسے شمع کو پروانے۔ اتنی گرویدگی' اتنا دیوانہ پن' اس ہر دل عزیزی کا اب ردِّ عمل شروع ہوا۔ مجھ میں غیر ارادی تبدیلی سی مجھے خود محسوس ہوتی' نشۂ حسن نے مدہوش کر دیا۔ پیش نظر تھا آئینہ دائم نقاب میں' میرا سر پھر گیا' غرور نے دھاوا بول دیا۔ میں بھی خود کو کوئی چیز سمجھنے لگی تھی۔ غرض حسن اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا' اتنی محبت و گرویدگی سے بجائے اس کے کہ مجھ میں انکساری پیدا ہوتی الٹا اثر ہونے لگا۔ بے حس پتھر جیسے۔ ان سب کی محبت اکتا دیتی۔ وارفتگی بیزار کر دیتی۔ طبیعت میں چڑچڑا پن' بدمزاجی' غرض میں کیا تھی اور کیا ہو کر رہ گئی تھی۔ واقعی صرف شکل و شمائل پر ریجھ کر جو گرفتار ہوتے ہیں وہ کتنی غلطی کرتے ہیں۔ غلط بیں نگاہوں کا یہ رنگین دھوکا اب خود فریب دینے لگا تھا۔ حامد کی اور میری محبت کو نظر بد سے بچانے کے لئے میرے میکے والوں نے جنتر منتر کا ایک ڈھونگ رچایا تھا۔ شاید یہ نفرت اور تبدیلی ان ہی تعویذوں کا اثر تھا۔ ان سب نے ایک دن ہم دونوں کو مخاطب کیا اور کہنے لگیں "تم دونوں حسن صورت میں یکتا ہو۔ نظر لگتی ہے اس جوڑے کو' یہ تعویذ ہے' اس کو علحدہ علحدہ دونوں پہن لو۔ اپنے سے کبھی جدا نہ کرنا' اس کی تاثیر سے نظر بد نہ اثر ہو جائے گی" حامد۔ ایک آلھڑ تبسم

تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اس نے کبھی ان توہمات پر اعتقاد نہ کیا تھا۔ لیکن جانے کیا اثر تھا اس چاپلوسی و مکاری میں اب آٹھوں پہر تعویذ حامد کے سینہ پر سوار ہے۔ میری تعویذ بھی میرے گلے کا ہار ہے۔ دھیرے دھیرے ان ہی تعویذوں نے رنگ لایا تھا کہ سسرال اور سسرال والوں سے جی متنفر ہونے لگا۔ جہاں سے ایک شریف گھرانے کی لڑکی کو مر کر ہی نکلنا چاہیئے، وہاں سے گھر منے پر جیتے جی نفس آمادہ تھا۔ عورت کا ایک ہی تو حربہ ہے نا؟ رونا۔ میں نے بات بات پر رونا شروع کر دیا۔ یہ دانستہ نہیں۔ بلکہ میرا جی چاہتا کہ میں خوب ساروؤں حامد جو مجھے ذرا بھی متفکر دیکھتا تو پریشان ہو جاتا تھا، اب پہروں مجھے روتا بسورتا دیکھ کر تو گھلا گیا۔ میں نے حامد کو باور کروا دیا کہ اب میں اس گھر میں نہ رہوں گی۔ ایسا نہ ہوگا زہر کھالونگی جہالت اور کیا۔ حامد مجبور ہوگیا۔ ماں، بہنوں، بھائیوں سب کو روتا بلکتا چھوڑ میں اور حامد علحدہ ہوگئے۔ اب حامد کو میں ایک کٹ پتلی کی طرح جس طرح چاہتی نچاتی۔ جہاں من مانے جاتی۔ جو چاہے کرتی۔ حامد ایسے ہی چپ تھا جیسے کچھ دیکھتا ہی نہ تھا۔ کچھ سنتا ہی نہ تھا۔ بیکاری میں دل اب کیسے لگے؟ مجھے شاپنگ کا شوق چرایا۔ دکان دکان کی خاک چھاننی شروع کی۔ کئی بڑی بڑی دکانوں میں اپنی شان جتانے، اپنا رعب جمانے "اکاؤنٹ" کھولے۔ دنیا کی چیزیں آئے دن خریدتی۔ ضرورت کی بھی، بے ضروری بھی۔ انجانی سے دیکھتی کہ وہ کیا کہتا ہے لیکن وہ تو چپ تھا۔ ان تعویذوں نے اس کو چپ کر دیا تھا اور مجھے خود سر بنا دیا تھا۔ حامد تر ضدار بن گیا تھا۔ کہیں دعوت میں جاتی، کسی کا زیور پسند آتا فوراً پوچھ لیتی کہاں بنوایا ہے اور جھٹ حامد سے کہتی۔ ایسے ضد کرتی جیسے ایک بچہ کسی کھلونے کے لئے مچل جاتا ہے۔ فرمائش کی تکمیل ہو جاتی۔ زیور بن کر آجاتا۔ حامد مقروض ہو جاتا

لیکن میری خواہش رد نہ ہوتی۔

اف! یہ تعویذ، یہ گنڈے، یہ جنتر منتر کتنوں کے گھر تباہ کئے ہوں گے۔ کون پوچھے اور بتائے بھی کون۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے میں اپنے طرز عمل کو سوچ رہی تھی کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ انجام ــــ ایک خوفناک دیو کی شکل میں اپنا بھیانک روپ دکھاتا۔ اور میں اس کی طرف سے بالکل انجان ہو جاتی۔ اتفاق کی بات۔ ایک سادھو اس طرف سے گزرا، گیروی لباس میں، منکوں کی تسبیح لئے، وہ کچھ بول رہا تھا ــ الفاظ کا مفہوم کچھ یہ تھا:ــ

"پھول جب کانٹوں سے نکل جاتا ہے۔ غیر محفوظ ہو جاتا ہے، چپ کا انجام ایک طوفان میں بھی بدل سکتا ہے۔ سمندر تلاطم سے پہلے ساکت ہی رہتا ہے"۔ کتنے موثر بول تھے۔ سنسنی سی ہونے لگی۔ دل پر ایک ہول ہول سی طاری ہوگئی۔ اوسان خطا ہونے لگے۔ میں اپنے انجام کو سوچنے لگی۔ آخر یہ کیوں گزرا ادھر سے؟ میں نے یہ سوچا اور پھر گردن جھٹک لی۔ خیالات کی الجھنوں کو بھی جھٹک دیا۔

لیکن ــــ لیکن آخر کیا حشر ہوگا میرا؟

اللہ جانے! ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

جہاں بانو

پرچھائیاں

یوکلپٹس کا درخت پُراسرار طور پر جھوم رہا تھا —
ہلکی ہلکی چاندنی اور خوبصورت تاریکی میں سرو کے درخت کانپ رہے تھے۔ سارا باغ "ملکۂ شب" کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ رات بہت حسین اور رومان انگیز تھی' مگر میں ان سب سے بے پرواہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ میری نظروں میں بہت سے بلند و بالا قد' حسین انداز اور مسکراتے چہرے گھوم رہے تھے۔ رؤفی اور اس کی دلربا مسکراہٹ — احمد۔ شرارت سے لبریز آنکھیں' ہر وقت مسکراتا رہتا ہے۔ کالج کی فضا میں سب سے زیادہ اسی کے قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ شغو سراپا رحم۔ اس کے انداز کچھ ایسے تھے کہ بعض اوقات مجھے اس پر رحم آنے لگتا۔ کیسے جیتا ہے یہ اتنا سنجیدہ رہ کر۔ اور اس وقت جب کہ سب لڑکے میری کسی چیز کی تعریف کرنے لگتے تو ان حضرت کی سنجیدگی اور بڑھنے لگتی۔ میں اکثر اس کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو جاتی۔ شیام گھنگر والے پریشان بال' معصوم چہرہ' یونس اور اس کی خوبصورت باتیں — فرخ جدید شاعری کا بہترین نقال۔

اوہ! — ان لوگوں نے مختلف اوقات میں میرے قدموں پر اپنے سر جھکائے تھے — کپکپاتے ہونٹوں سے اظہار کیا تھا۔ اپنی محبت کا یقین دلایا تھا اور وفا کے عہد و پیمان باندھے تھے۔ مگر شغو۔ اس نے اب تک مجھ سے بات بھی نہیں کی تھی۔ جب کبھی میں اس کے پاس سے گزرتی اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں' گر میرے ساتھ کسی اور کو دیکھ کر اس کی نظریں گہری ہو جاتیں' ان میں عجیب قسم کی وحشت چھا جاتی' اس کا سر اس کے ہاتھوں پر جھک جاتا اور وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگتا۔

ایک شام میں لائبریری میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ شغو نہ جانے کہاں سے آگیا۔ اس کے چہرے پر وہی سنجیدگی طاری تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا' مسکراتے ہونٹوں سے اس نے کہا "عذرا" اور جب میں اٹھ کر جانے لگی تو اس کے چہرے پر غم کی ایک لہر چھا گئی۔ اس نے آہستہ سے پھر ایک بار کہا "عذرا" اور چپ ہو گیا۔ بہت دیر تک میں انتظار کرتی رہی مگر وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ آخر میں غصے سے واپس چلی گئی۔ کتنا عجیب ہے یہ — ہر وقت نہ جانے کیا سوچا کرتا ہے۔ مجھے اس کے انداز ذرا بھی پسند نہیں۔ میں چاہتی کہ کالج کے لڑکے جب میری کسی چیز کی تعریف کریں تو اس میں شغو بھی شامل ہو مگر وہ ایسے موقعوں پر نہ جانے کہاں رہتا تھا۔ اور اس کی یہی بات مجھے پسند نہ تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے اس کی خاموشی میرا مذاق اڑا رہی ہے اور میری نفرت میں اضافہ ہو جاتا۔

سب سے زیادہ تعجب مجھے اس بات پر تھا کہ احمد جس کے قہقہے کالج میں سب سے زیادہ گونجا کرتے تھے' جو شرارت میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھا وہی شغو کا گہرا دوست تھا — شغو جو کسی پارٹی میں حصہ نہ لیا کرتا تھا احمد کے کہنے سے کبھی کبھی ان مجلسوں میں نظر آجایا کرتا۔ مگر چہرے پر وہی سنجیدگی اور آنکھوں میں عجیب طرح کی بے بسی۔ اس کی آنکھیں سب سے زیادہ خوبصورت تھیں — جن میں نرم سرخ ڈوروں نے ان کے حسن میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے نہ جانے کیا کہا کرتیں مگر مجھے ان کی باتیں سمجھنے کی فرصت ہی کہاں تھی — ہاں کبھی کبھی جب میں تنہا ہوتی اس وقت سوچا کرتی کہ کاش سنجیدگی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں شرارت ہوتی۔

بہار کے دن تھے۔ ہلکی ہلکی گھٹائیں اٹھ رہی تھیں' احمد نے تجویز پیش کی کہ بجائے کلاس میں پروفیسروں کی بکواس سننے کے کیوں نہ کہیں پکنک کے لئے چلے جائیں۔ احمد کی رائے سب کو پسند آئی کیونکہ موسم ہی اتنا دلفریب تھا۔ چنانچہ رؤفی کی موٹر میں سب روانہ ہوئے۔ آج احمد نے زبردستی شغو کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ فرخ نے کسی نے

کانے کی فرمائش کی اور اس نے طلعت محمود کا گانا شروع کیا۔ اس کی آواز سب سے زیادہ پیاری تھی اور وہ جب اس شعر پر پہنچا ــــ

وہ صباحتیں، وہ ملاحتیں، وہ نزاکتیں وہ لطافتیں وہ نظر میں جب سے سمائی ہیں مجھے آنکھ اٹھانا بھی بار ہے

اس کی اس جرأت پہ بے اختیار قہقہے بلند ہوئے اور میں شرما کر رہ گئی ــ یہ فرخ ہمیشہ یونہی کیا کرتا تھا ــــ میری نظریں اس وقت بے اختیار شفو کی طرف اٹھ گئیں ـ سب ہنس رہے تھے مگر شفو کھڑکی میں سے باہر نہ جانے کس چیز کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے گہرے رنج کا پتہ چلتا تھا۔ بال اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کی بھویں کمانوں کی طرح کھنچی ہوئی تھیں ۔۔ اس وقت اچانک میرے دل نے کہا " کتنا خوبصورت ہے یہ ــــ کاش! زندہ دل بھی ہوتا ــــ" اور اس کے ساتھ ہی اس کی سنجیدگی نے مجھے پژمردہ کر دیا ـ

چشمے کے کنارے پہنچ کر شفو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ــــ سرخ پھولوں کی گھنی چھاؤں کے نیچے چشمہ بہہ رہا تھا ـ میں نے ان پھولوں کا ایک گچھا توڑتے ہوئے کہا " کتنا پیارا رنگ ہے ان پھولوں کا ــــ" اور احمد نے شرارت سے فوراً کہا " بالکل تمہارے ہونٹوں کی طرح ــــ اف! کتنا شریر ہے یہ ــ

آفتاب غروب ہو رہا تھا اور ہم سب چشمے کے کنارے کھڑے غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہے تھے ـ حد نظر تک آنکھوں کے سامنے چشمے کا پانی سونے کی طرح دمک رہا تھا ـ روفی کیمرہ لئے اس خوبصورت منظر کی تصویر لے رہا تھا ـ ہم نے آخری نظر آسمان کے زریں کناروں پر ڈالی اور لوٹ آئے ــ"

زندگی حسین خوابوں کے سہارے گزرتی رہی ـ

بی اے کے پہلے سال کا نتیجہ نکلا ــــ ہم سب دوست پاس ہو گئے تھے اور شفو فیل ـ جس وقت نتیجہ سنایا گیا اور اسے معلوم ہوا کہ وہ فیل ہو گیا تو اس وقت بھی وہ ہمیشہ کی طرح بے حس بیٹھا رہا ـ ہاں اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ــــ اس دن کے بعد شفو کالج میں نظر نہیں آیا ــــ احمد سے معلوم ہوا کہ وہ فوج میں شریک ہو کر کہیں دور چلا گیا ہے ـ

دن اب بے کیف گزر رہے تھے کیونکہ پہلی سی باتیں نہ رہی تھیں ــــ احمد جسے میں سب سے زیادہ پسند کرتی تھی کسی امیر لڑکی سے منسوب ہو گیا تھا اور اس کا دل دولت کے انبار میں کہیں دب گیا تھا ـ فرخ کی شاعری کا مرکز اب ایک شرمیلی لڑکی لیلیٰ تھی ــــ شیام نے اوشا کو اپنے دل کی رانی بنا لیا تھا ـ غرض کہ کالج کی فضا بالکل بدل گئی تھی ـ اف یہ مرد ــــ ان کے لئے زندگی ایک حسین کھیل ہے اور لڑکیاں کھلونے ـ جب تک جی چاہا کھیلتے رہے اور پھر توڑ پھوڑ دیا ــ اس سے پہلے کبھی زندگی مجھے اتنی اداس نظر نہ آئی تھی گو کہ اب بھی روفی کی دلربا مسکراہٹ میرے سامنے اور حسین ہو جاتی اور یونس کی باہیں جھوم کر آگے بڑھنا چاہتیں مگر میں ان کی طرف بہت کم متوجہ ہوتی ــــ میری آنکھیں کھل چکی تھیں ـ آخر میں نے کالج جانا چھوڑ دیا ـ

ایک دن میں اداس بیٹھی تھی کہ احمد نہ جانے کیسے آ گیا اور آتے ہی اس نے مجھ سے کہا کہ شفو نے جاتے وقت اسے ایک لفافہ دیا تھا کہ مجھ تک پہنچا دے اور التجا کی تھی کہ بھول نہ جائے مگر اس کے باوجود احمد مجھے لفافہ دینا بھول گیا تھا ــ جسے آج لے کر وہ آیا تھا ـ وہ بہت دیر تک بیٹھا کالج کی باتیں کرتا رہا پھر وہ چلا گیا اور میں نے خط کھولا ـ اندر سے ایک رنگین کاغذ نکلا جس پر یہ عبارت لکھی تھی :ــ

"جب بہار کے دنوں میں دور۔ کہیں جھاڑیوں میں چھپی ہوئی بلبل نغمہ زن ہو اور پھولوں کی خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی ہو، فطرت بے حد رنگین اور جاذبِ نظر ہو جائے، اس وقت جب کوئی "خوش نصیب" تمہارے حسن کی تعریف کرے اور تم شرما جاؤ تب سوچنا کہ کبھی تمہاری انہیں آنکھوں کے سحر نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ سیاہ بالوں کی پریشان لٹیں جو تمہارے شانوں پر بکھری رہتی تھیں میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھیں۔ تمہارے دمکتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ کتنی دلفریب معلوم ہوتی تھی۔ اسی حسین مسکراہٹ نے میرا دل موہ لیا تھا۔ میرے نزدیک تمہارا حسن بہار کی رنگینیوں سے کہیں زیادہ رنگین تھا۔ میں تمہارا پرستار تھا۔ تمہارا نام لے لے کر جیتا تھا اور کتنے خوش گوار تھے وہ لمحے جو میں نے تمہیں دیکھ کر گزارے تھے۔ پھر یاد کرنا کہ تمہاری محبت میرے لئے کتنی حسین تھی جس سے میری دنیا جگمگا اٹھی۔ پھر تمہارے تغافل نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ میری آرزوئیں میرے سینے میں دفن ہو گئیں۔ اور اپنی آنکھوں میں ہزاروں مایوسیاں لئے میں ہمیشہ کے لئے تم سے جدا ہو گیا ———"

اور میری آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے اور نگاہیں دھندلی ہو گئیں۔ اس دھندلکے میں پچھلے گزرے ہوئے دنوں کی باتیں اجاگر ہونے لگیں۔

چشمے کے سوئے ہوئے پانی کے کنارے —
پھولوں کی جھاڑی کے نیچے مخملیں گھاس پر شفو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں پھولوں کے گچھے توڑتے ہوئے وہاں پہنچی مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں کنول کی طرح کھل گئیں۔ مدھم آواز میں اس نے کہا "عذرا — مجھے تم سے کچھ کہنا ہے" یہ کہہ کر اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جس میں التجا تھی۔ میں سبزے پر بیٹھ گئی اس کا سر جھک گیا اور وہ نہ جانے کس سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کی خاموشی سے اکتا کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے کھڑے ہوئے دیکھ کر اس نے گہری سانس لی اور کہا "میں سمجھتا تھا کہ میری آنکھیں وہ سب کہہ دیں گی جو میں زبان سے ادا نہیں کر سکتا مگر تم نے کبھی توجہ نہیں کی۔ تم —" وہ چپ ہو گیا۔

"میرے پاس آپ کی آنکھیں پڑھنے کا وقت نہیں" یہ کہہ کر میں وہاں سے چلی آئی حالانکہ اس کی نگاہیں مجھے ٹھہرنے کی التجا کر رہی تھیں۔

میرے اس جواب کے بعد ہی سے شفو کی سنجیدگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ پہلے احمد کے اصرار پر کبھی کبھی ہمارے ساتھ تفریحوں میں شریک ہو جایا کرتا تھا مگر اب جیسے اسے ان چیزوں سے واسطہ ہی نہ رہا ہو — کلاس میں بھی وہ سب سے پیچھے بیٹھے نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا۔ شاید وہ لیکچر بھی نہ سنتا ہو۔ کبھی مجھے اس کا خیال آ جاتا مگر میں پھر بہت جلد کالج کی رنگین فضا میں کھو جاتی۔ مگر آج اس کی اس تحریر نے مجھ پر سب کچھ ظاہر کر دیا تھا جس سچی محبت کی میں متلاشی تھی وہ اس کے خط سے نمایاں تھی۔ جس کے لئے میرے دل میں ذرا بھی جگہ نہ تھی اسی کے لئے اب میرا دل بھٹکا مارا تھا تھا۔ کاش وہ ایک بار آ جائے۔ صرف ایک بار — مگر وہ مجھ سے دور — بہت دور۔ نہ جانے کہاں ہے۔

نگہت ناز

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

زیر ادارت
معین الدین احمد انصاری
بی ایس سی (علیگ)

[illegible] ۱۰۳
[illegible] ۲۹۰۵۰
[illegible] نمبر ۲۲۰۹
چندہ [illegible] روپے [illegible] آنے
[illegible] ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ
۲/

سب رس

بچوں کے لئے

جلد (۸) | بابت ماہ نومبر ۱۹۴۵ء | شمارہ (۱۱)

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے (عثمانیہ) کے اہتمام سے صحیفہ پریس میں طبع ہو کر خیرت آباد سے شائع ہوا

[illegible] اس کی عمر کے آٹھ سال ختم ہوا چاہتے ہیں، جنوری ۱۹۹۲ میں اس کی سالگرہ منائی جائے گی۔ کہئے آپ نے اس کی سال گرہ کے لئے کیا تیاری کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس دفعہ اس کی سال گرہ ہمیشہ سے اچھی منائی جائے۔ جنوری کا پرچہ سال گرہ کی خوشی میں شاندار نکالا جائے، یعنی ہم اس خاص نمبر کے لئے اس کے صفحات بڑھائیں گے اس میں اچھے اچھے مضامین اور دوسری دلچسپ باتیں شائع ہوں گی۔ دسمبر کی ۵ تاریخ تک ہمارے پاس اپنے مضامین بھیج دیجئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سال گرہ نمبر بے حد دلچسپ نکلے اور یہ صرف آپ لوگوں کی کوشش سے ہو سکتا ہے۔

نومبر کا پرچہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ نے اسے یقیناً دلچسپ پایا ہوگا۔ ہر قسم کی دلچسپیاں ہیں۔ اس سے متعلق اپنی رائے سے مطلع کیجئے اور سال گرہ نمبر سے متعلق آپ اپنی رائے لکھ بھیجئے کہ آپ کس قسم کے مضامین چاہتے ہیں اور اس پرچہ میں کیا کیا دلچسپیاں ہوں۔ ہم آپ کے مشوروں پر غور کریں گے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ سال گرہ نمبر میں ان بچوں کے نام بھی شائع کریں گے جو اس سلسلہ میں ہمیں مفید مشورے دیں۔ لفافہ کے ایک بازو "سال گرہ" لکھ دیجئے، تاکہ ہم یہ سمجھ جائیں کہ آپ نے سال گرہ سے متعلق کچھ لکھا ہے۔ اسے ہم دوسرے خطوط اور مضامین سے علحدہ رکھیں گے۔ نومبر کے مضامین کو غور سے پڑھئے، بعض آپ کے لئے مفید ثابت ہوں گے "جراثیم کیا ہیں" مفید مضمون ہے اور ساتھ ہی ساتھ معلومات آفریں۔ دنیا کے سب سے چھوٹے جاندار اجسام یہی ہیں۔ مضمون پڑھنے سے آپکو پتہ چلے گا کہ ان میں سے بعض فائدہ پہنچاتے ہیں اور بعض نقصان۔ مضمون کے ساتھ شکلیں بھی دی گئی ہیں۔ "عقلمند بادشاہ" کی دلچسپ کہانی ہے۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنی چاہئیں۔ آج کل اس قسم کی مختصر کہانیاں زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ "لفافہ" اور "بارہ خطوط مستقیم" بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہم کوشش کریں گے کہ سال گرہ نمبر اس سے بھی زیادہ دلچسپ نکلے۔

معین الدین احمد انصاری

مشاہیر کے آخری الفاظ

سکندر اعظم :۔ جس نے ساری دنیا کو ہلا دیا تھا اور جس نے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا تھا، جب موت سے ہم آغوش ہوا تو اس نے کہنا شروع کیا کہ :۔

"میں دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا مگر موت نے مجھ ہی کو فتح کر لیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے کتنے انسانوں کا خون بہایا ہے اور آخری وقت میں کیا لے کر جا رہا ہوں۔ افسوس کہ مجھے وہ سکونِ زندگی بھی حاصل نہ ہو سکا جو ایک معمولی انسان کو حاصل ہے۔ بہتر ہوا کہ میں دنیا فتح نہ کر سکا۔ اگر میں دنیا فتح کر لیتا تو اس سے زیادہ کچھ حاصل نہ ہوتا کہ اپنے گناہوں میں اور اضافہ کر کے دنیا سے جاتا۔ مجھے فوجی لباس میں دفن کرنا کیونکہ میں سپاہی تھا اور ہوں"۔

نپولین اعظم :۔ جس نے انتہائی مایوسی میں جان دی اور جس نے سینٹ ہلینا میں قید رہ کر دنیا کو دکھایا کہ کوشش ہر حال میں جاری رہ سکتی ہے۔ اس کے الفاظ سکندر سے بھی زیادہ دردناک تھے اس نے کہا کہ :۔

"مایوسی میرے نزدیک گناہ تھی۔ مگر مجھ سے زیادہ مایوس انسان دنیا میں نہیں ہے۔ میں دنیا میں دو چیزوں کا بھوکا تھا۔ ایک حکومت دوسری محبت۔ حکومت مجھے ملی مگر وہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ محبت کو میں نے تلاش کیا مگر حاصل نہ کر سکا۔ جس سے محبت کی اس نے مجھے دغا دی۔ شاید محبت کا جواب دغا ہی ہوتا ہے۔ اگر کسی انسان کی زندگی کا یہ مقصد رہا ہے تو وہ زندگی بے معنی ہے۔ میرے نزدیک دنیا مایوسی ہے اور مایوسی ہی کا نام دنیا ہے"۔ یہ ایک ایسی ہستی کے آخری الفاظ ہیں جس نے سارے یورپ کو ہلا دیا تھا اور جسے آج بھی دنیا کی تاریخ میں ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید :۔ خلیفہ ہارون الرشید طوس میں بستر علالت پر پڑا ہوا تھا۔ موت گھیرے ہوئے تھی۔ اس نے اسی مکان میں جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا اپنی قبر کھدوائی جب قبر کھد کر تیار ہو گئی تو اس نے اپنی چارپائی قبر کے کنارے پر بچھوائی اور پڑے پڑے قبر کو دیکھتا رہا۔ ہارون کی زبان سے

یہ الفاظ نکلے :-

"لوگو! گواہ رہنا کہ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں اور رسول اللہ کی رسالت کا سچے دل سے قائل ہوں۔ میں ایک معصیت وگناہ کا پیکر ہوں جس لے ساری عمر غم غلط کرنے کی کوشش کی لیکن پھوٹا بیں غم غلط کر نہ سکا۔ میں نے بیحد مغموم اور فکر مند کی زندگی گزاری۔ حکومت کے کاموں اور لعنتوں نے مجھے اکثر خدا اور مذہب سے غافل رکھا ہے خدا مجھے معاف کرے۔ مجھے زندگی کا کوئی دن ایسا یاد نہیں ہے جو میں نے بے فکری کے ساتھ گزارا ہو۔ اب میں موت کے کنارہ پر ہوں۔ موت تم سب سے جدا کر دے گی اور یہ قبر جو اس وقت منہ کھولے ہوئے سامنے ہے میرے جسم کو نگل لے گی۔ یہی ہر انسان کا انجام ہے مگر انسان اپنے انجام سے میری طرح غافل رہتا ہے۔"

پھر خلیفہ نے کچھ حکومتی معاملات میں دخل دے کر مفید مشورہ دیا۔ بعد ازاں خلیفہ کا چراغِ حیات گل ہو گیا۔

عبدالملک مدائنی کہتے ہیں کہ جب خلیفہ عبدالملک کو اپنے مرنے کا یقین ہوا تو اس نے کہا :-

"جب سے میں پیدا ہوا ہوں میری یہی آرزو ہے کہ میں اپنے آپ کو کسی طرح سے مسرور کر سکوں لیکن مجھے کبھی سچی مسرت حاصل نہ ہو سکی۔ میں نے حکومت کا بوجھ اپنے سر اس لئے لیا تھا کہ میں سمجھتا تھا کہ بادشاہت انسانی ترقی کی معراج ہے مگر مجھے دھوکہ ہوا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اور میں کرتا رہا ہوں اس پر نادم ہوں مگر ندامت کا وقت گزر چکا ہے اور میں ناکام و نامراد دنیا سے جا رہا ہوں۔ میں نے جو راستہ اپنے لئے منتخب کیا تھا وہ غلط تھا۔"

یہ ہیں الفاظ اس عبدالملک ابن مروان کے جس کی خلافت میں حجاج نے خانہ کعبہ پر حملہ کیا۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے افعال پر نادم تھا اور موت کے وقت اسے اندازہ ہوا کہ حکومت ایک بے معنی چیز ہے۔

محمد عبدالمتین اجگیاں

بتائیے یہ چار حرفی لفظ کیا ہے ؟

چار سے ایک اگر جائے تو رہیں چار کے چار — چار سے دو اگر جائیں تو رہیں چار کے چار

چار سے تین اگر جائیں تو رہیں چار کے چار — چار سے چار اگر جائیں تو رہیں چار کے چار

(نوٹ) دوسرے اور تیسرے مصرعہ میں ابجد کی گنتی کو دخل ہے۔ اس لئے ہم آپ کی سہولت اور اضافۂ معلومات کی خاطر مقررہ اعداد بھی لکھے دیتے ہیں۔

ا ب پ ج چ د ڈ ہ و ز ژ ح ط ی ک گ ل م ن س ع ف ص ق ر ش ت ٹ
۱ ۲ ۲ ۳ ۳ ۴ ۴ ۵ ۶ ۷ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۲۰ ۲۰ ۳۰ ۴۰ ۵۰ ۶۰ ۷۰ ۸۰ ۹۰ ۱۰۰ ۲۰۰ ۳۰۰ ۴۰۰ ۴۰۰

ث خ ذ ض ظ غ۔
۵۰۰ ۶۰۰ ۷۰۰ ۸۰۰ ۹۰۰ ۱۰۰۰

ہدایات

۱۔ تمام حل اس مہینہ کی آخری تاریخ تک دفتر سب رس پر پہنچ جانے چاہئیں۔

۲۔ مقابلے میں شرکت کے لئے حل کے ساتھ آٹھ پائی کا ٹکٹ یا پوسٹ کارڈ سادہ آنا ضروری ہے۔

۳۔ ایک حل ایک ہی نام سے قبول کیا جائے گا۔

۴۔ اپنا پورا نام اور صحیح پتہ صاف خط میں لکھئے۔

۵ صحیح حل پر ایک باتصویر کتاب (نظام الملک آصف جاہ اول) انعام میں دی جائے گی۔

۶۔ زیادہ تعداد میں صحیح حل وصول ہوں تو قرعہ اندازی ہوگی۔

سید مراد علی طالع

آج ہم آپ کو ایک دلچسپ چیز بتاتے ہیں۔ آپ میں سے اکثر ایسے ہوں گے جن کو ڈرائنگ سے دلچسپی ہوگی۔ یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک کی ڈرائنگ اچھی ہو لیکن آج ہم آپ کو جس قسم کی ڈرائینگ سکھا رہے ہیں وہ بے حد آسان ہے اور ہر شخص بے کاری کے وقت اسے اتار سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ سے یہ کہا جائے کہ بارہ خطوط مستقیم اور ایک نقطہ سے مختلف شکلیں بنائیے تو آپ کچھ اسی قسم کی شکلیں بنائیں گے جو نیچے دی گئی ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ اچھا اب آپ خود سے کوشش کیجئے اور زیادہ سے زیادہ تصویریں اور شکلیں بنائیے مگر شرط یہ ہے کہ اس میں بارہ خطوط مستقیم ہوں اور صرف ایک نقطہ۔

سارس　　شمع　　آدمی

کتّا　　بوڑھا آدمی　　مینڈک

ادارہ
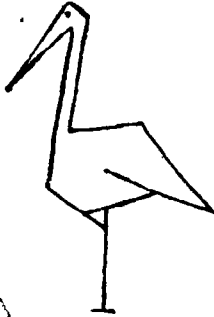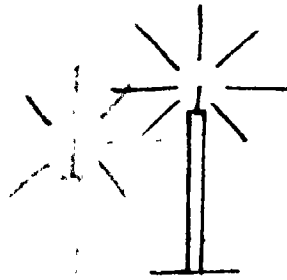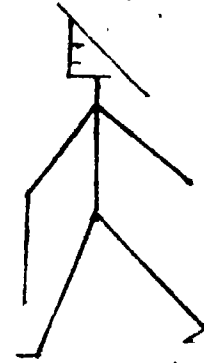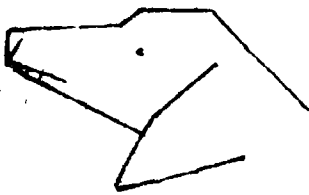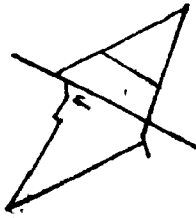
آج ہم آپ کو ایک مفید کام کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی چیز اور نیا کام سیکھنا چاہئے۔ آئیے آج ہم آپ کو لفافہ بنانے کی ترکیب سکھاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ آپ بازار سے لفافہ خرید لائیں، اپنے ہاتھ سے بنائیے، یہ لفافہ بڑی سائز کا ہے تاکہ آپ اس میں اپنا مضمون رکھ کر ہمارے پاس بھیج سکیں آئندہ جو مضامین ہمارے پاس وصول ہوں گے ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے لفافے آپ ہی کے ہاتھ سے بنائے ہوئے ہوں۔

اس کی ترکیب بہت آسان ہے۔ یہ اگر بادامی (براؤن) کاغذ سے بنایا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ مدرسے میں آپ جیومٹری تو ضرور سیکھتے ہوں گے اور جیومٹری کا ڈبہ بھی آپ کے پاس ہوگا ورنہ اپنے بڑے بھائی یا بہن سے حاصل کر لیجئے۔ کاغذ پر ۱۰½ انچ کا مربع بنائیے اور پھر اسی حساب سے جو کہ شکل میں دکھایا گیا ہے کاغذ پر شکل بنا لیجئے اور بے ضرورت حصہ جس پر نشانات بنا دیئے گئے ہیں کاٹ کر علیحدہ کر دیجئے۔ اب اس شکل کو موڑ دیجئے اور پھر گوند لگا دیجئے بس لفافہ تیار ہو جائے گا اس پر "سب رس" کا پتہ لکھ دیجئے اور اپنا مضمون یا نظم، لطیفے یا پہیلیاں رکھ کر بھیج دیجئے۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ کاغذ پر پنسل سے نشانات ہلکے بنائے جائیں اور موڑتے وقت بھی احتیاط ضروری ہے۔ اگر آپ کو یہ لفافہ پسند آئے تو ہم اس سلسلہ میں اور بھی مختلف کام کی چیزیں بنانے کا طریقہ اور ترکیب بتائیں گے۔

ادارہ

۵½"
۱"
½"
۵½"
۴½"
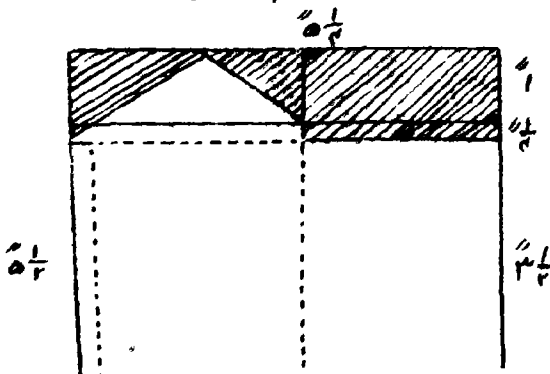
بوجھو تو جانیں

۱۔ آدھا تل اور آدھا دار — سپاہی کرتا دل سے پیار

۲۔ پہیلی سن کر کوئی نہ ہنسے — ناک اور کان دونوں پہنے

۳۔ گول مول اور چھوٹا موٹا — ہر دم وہ تو زمیں پر لوٹا

۴۔ ایک جانور ایسا تھا ندی کنارے رہتا تھا — چونچ تھی اس کی مینا کاری دم سے پانی پیتا تھا

۵۔ ایک گڑھے میں چار چوہے — لڑتے لڑتے لہولہان

۶۔ ظاہر میں ہے سفید تو باطن میں ہے کالی — لذت میں ہے عجیب تو خوشبو میں نرالی

۷۔ کھیت میں ہو تو سب کوئی کھائے — گھر میں ہو تو سب کو کھائے

پہلے بوجھنے کی کوشش کیجئے اور پھر حل صفحہ (۱۱) پر دیکھئے

راشدہ سلطانہ

کیا تم جانتے ہو؟

(۱) حیدرآباد کے حالیہ وزیر مالیات کون ہیں؟

(۲) برطانیہ عظمیٰ کے وزیر اعظم کون ہیں؟

(۳) صدر کانگریس کون ہیں؟

(۴) امریکہ کے موجودہ پریسیڈنٹ کون ہیں؟

(۵) حیدرآباد کے رزیڈنٹ کون ہیں؟

(نوٹ، اس کے جوابات صفحہ (۱۱) پر دیکھئے۔

میر اعظم علی خاں

جراثیم کیا ہیں
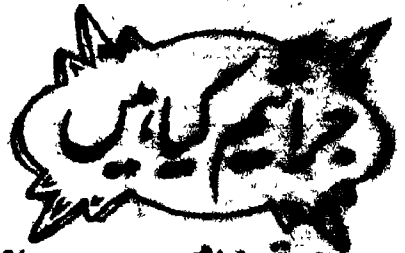
دنیا میں بہت سے جاندار ہیں۔ بعض تو ایسے جاندار ہیں جن کو ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں اور بعض جاندار اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کا نظر آنا بھی مشکل ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے خردبین کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان ننھے اور چھوٹے جاندار اجسام کو جراثیم کہتے ہیں۔ جراثیم بہت چھوٹے ہوتے ہیں اگر پچیس ہزار جراثیم ایک ایک دوسرے کے ساتھ قطار باندھ کر نکلیں تو ان کا طول ایک انچ کے برابر ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ جراثیم کس قدر چھوٹے ہوتے ہیں۔

جراثیم مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ اور..... مختلف قسم کے کام انجام دیتے ہیں۔ ان میں کوئی تو مفید جراثیم ہوتے ہیں اور کوئی مضر تو کوئی بے ضرر ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو بہت ہی مفید ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک قسم کا جرثومہ جو دودھ کو دہی بنانے میں مدد دیتا ہے اور دوسرا انگور اور گنے کے رس کو سرکے میں تبدیل کردیتا ہے اور تیسرا اہم جرثومہ جو خمیر کی تیاری میں مدد دیتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اور بھی جراثیم ہیں جو گندگی کو ضائع کرنے میں بہت کچھ مدد دیتے ہیں اور ایک لحاظ سے یہ بھی مفید ہوتے ہیں کیونکہ گندگی کی وجہ سے ہزاروں قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جراثیم سڑی گلی چیزوں میں پیدا ہوتے ہیں چنانچہ زمین کے اندر بھی مفید جراثیم پائے جاتے ہیں جو پودوں کی نشو ونما کے لئے ضروری اجزا فراہم کرتے ہیں۔ یہ تو سب مفید جراثیم ہوئے۔ لیکن بعض جراثیم نقصان دہ ہوتے ہیں۔ جو انسان اور پودوں میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا کردیتے ہیں مثلاً چیچک، پلیگ، ہیضہ وغیرہ یہ سب بیماریاں نقصان پہنچانے والے جراثیم سے پھیلتی ہیں۔ خردبین سے دیکھنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جراثیم الگ الگ شکلوں میں پائے جاتے ہیں بعض پیچ دار ہوتے ہیں اور بعض سلاخ نما تو کوئی گول ہوتے ہیں۔ دق کے جراثیم سلاخ نما ہوتے ہیں۔ ہیضہ کے جراثیم پیچ دار۔ نمونیا اور خون میں زہریلا مادہ پیدا کرنے والے جراثیم گول ہوتے ہیں۔ معیادی بخار کے جراثیم کے
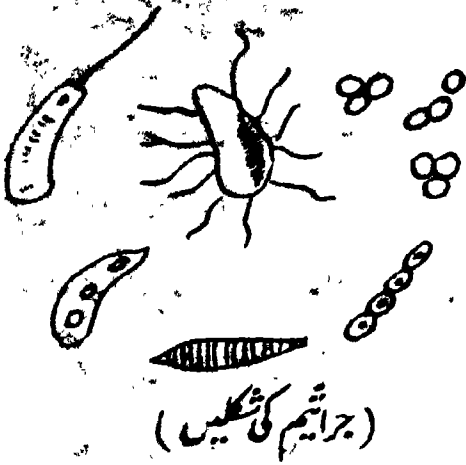
جسموں پر باریک روئیں ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ بہ آسانی حرکت کرتے ہیں اب یہ دیکھنا چاہیے کہ جراثیم کس طرح بڑھتے ہیں اور کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ گرمی، نمی اور غذا کے بغیر جراثیم پرورش نہیں پاتے اور یہ تینوں چیزیں انسان کے جسم میں موجود ہیں۔ خون میں جراثیم اچھی طرح پیدا ہوسکتے ہیں جراثیم تعداد میں

(جراثیم کی شکلیں)

اسی طرح بڑھتے ہیں کہ ایک جرثومہ کے دو ہو جاتے ہیں اور دو کے چار اور چار کے آٹھ۔ اسی طرح سے بے شمار جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ اس تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں کہ آدھے گھنٹے میں ایک جرثومہ کے دو ہوتے ہیں ایک گھنٹے کے اندر چار اور اگر اس تیزی سے بڑھتے رہیں تو بارہ گھنٹوں میں ایک کروڑ ستر لاکھ ہو جاتے ہیں۔

یونانی فلسفیوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بعض بیماریاں ننھی ننھی جانوں کے سبب پیدا ہوتی ہیں۔ انیسویں صدی تک اس خیال کی تصدیق تجربوں کے ذریعے نہیں کی گئی۔ گو کہ سترھویں صدی میں آسٹن داں لیون ہاک نے جراثیم کو دیکھا۔ مگر وہ صرف بڑے بڑے جراثیم کو دیکھ سکا کیونکہ اس کی خوردبین زیادہ طاقت ور نہیں تھی۔ بعد ازیں لوئی پاسچر اور روبٹ کوخ نے اس سلسلہ میں بہت کام کیا اور ثابت کر دیا کہ متعدی امراض جراثیم کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔ پاسچر نے دریافت کر لیا کہ خمیر بعض ننھے ننھے جراثیم کے سبب تیار ہوتا ہے اور دودھ بھی انہی کی وجہ سے کھٹا ہو جاتا ہے تو اس نے خیال کیا کہ جراثیم کی وجہ سے انسان کے جسم میں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ پاسچر نے مرغیوں میں ہیضہ پیدا کرنے والے ریشم کے کیڑوں میں بیماری پیدا کرنے والے اور بھیڑوں میں

بیماری پیدا کرنے والے جراثیم کو دریافت کیا۔ پاسچر کے بعد کوخ نے اس کام کو جاری رکھا جراثیم کے مطالعہ کرنے میں اسے بہت سی مشکلیں اٹھانی پڑیں۔ اس کے بعد اس نے جراثیم کو رنگنے کا طریقہ دریافت کیا اس طریقہ سے اسے بہت آسانی ہوگئی اور دق کے جراثیم کا پتہ لگا لیا اس نے انسان کے جسم میں ہیضہ کے جراثیم کی بھی دریافت کی پاسچر اور کوخ کے علاوہ اور سائنس دانوں نے اس سلسلہ میں مفید کام انجام دیئے۔ رفتہ رفتہ دوسری بیماریوں کے جراثیم معلوم ہونے لگے مگر ابھی سیکڑوں بیماریوں کے جراثیم معلوم ہونے ہیں۔

انسان کا جسم اس انداز سے بنایا گیا ہے کہ جراثیم کا جسم میں داخل ہونا ذرا مشکل ہے۔ یوں تو منہ اور ناک جراثیم کے اندر جانے کے دروازہ ہیں مگر جراثیم منہ میں پہنچنے کے بعد لعاب دہن کی وجہ سے نشو و نما نہیں پا سکتے اور اگر منہ کے ذریعے معدے میں جا پہونچتے ہیں تو ترش رطوبت جس میں ہائیڈروکلورک ترشہ موجود ہوتا ہے مر جاتے ہیں۔

مگر بعض دفعہ جلد پھٹ جانے کی وجہ سے جسم میں جراثیم داخل ہو جاتے ہیں اور اپنی نسل بڑھاتے ہیں۔ خون کے سفید جسیمے جراثیم کو کھا جاتے ہیں۔ اگر جراثیم کی تعداد زیادہ ہو تو سفید جسیمے جراثیم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور جراثیم کی انسان کے جسم میں اچھی طرح نشو و نما ہوتی ہے۔

میر معظم علی خاں

پہیلیوں کے حل

تلوار　　عینک

لوٹا　　لیمپ

پان، سپاری، چونا، کتھا　　الائچی

پھوٹ

راشدہ سلطانہ

کیا تم جانتے ہو (جوابات)

آنریبل زاہد حسین ۲ مسٹر اٹیلی ۳ مولنا ابوالکلام آزاد ۴ مسٹر ٹرومن ۵ سر آغر تعبیا

میر اعظم علی خاں

جوہری بم

آج ہم اپنے سب ننھی بھائیوں کو بتلائیں گے کہ جوہری بم کیا چیز ہے جس کے دو ہی حملوں نے جاپان کا تختہ الٹ دیا۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ زمین میں ایک میل اندر جا سکتا ہے اور پانچ مربع میل کے رقبہ کی جتنی چیزیں ہوں ان کو برباد کر دیتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ دھاتوں میں سب سے قیمتی دھات سونا ہے۔ لیکن سائنس دانوں نے اس سے قیمتی دھات "ریڈیم" کا پتہ لگا لیا تھا۔ اس قسم کا بلکہ اس سے بھی زیادہ کارآمد دھات "یورانیم" کا پتہ ملا ہے۔ جس کی چمک آفتاب عالمتاب کے مانند ہوتی ہے اور اس میں اتنی گرمی ہوتی ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس دھات کا ایک ذرہ جو کسی طاقتور خوردبین سے دیکھنے سے نظر آتا ہے۔ اس کے ½ حصے کو ایک بم میں دوسرے تباہ کن اشیاء کے ساتھ بھر دیا جاتا ہے۔ یہ بم دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی ایجاد کا سہرا اتحادی سائنس دانوں کے سر ہے جو امریکہ کے تجربہ خانوں میں بڑی رازداری کے ساتھ برابر کوشش کئے جا رہے تھے۔ اس بم کا پہلا نشانہ جاپان کا ایک شہر ہیروشیما بنا ہے۔ اطلاعیں بتاتی ہیں کہ ہیروشیما کے ¾ رقبہ کے تمام جاندار ہلاک ہو گئے۔ اور اس علاقہ میں جو چیز بھی زمین پر نظر آتی تھی غائب ہو گئی۔ گویا ¾ ہیروشیما مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس بم کا وزن ۴۰۰ پونڈ ہے یعنی تقریباً سوا دو من پختہ۔ جب یہ گرایا جاتا ہے تو اس کی روشنی آفتاب عالمتاب کی اس روشنی کا مقابلہ کرتی ہے جیسے ہم ماہ مئی کی دوپہر میں دیکھتے ہیں اور جب یہ گرتا ہے تو اتنی شدید گرمی پیدا کرتا ہے کہ ہر چیز کوئلہ بن جاتی ہے اور اتنی زبردست آگ لگاتا ہے کہ چالیس ہزار فٹ تک دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔ ہیروشیما پر جوہری بم کے حملے کے دو دن بعد ایک اور جوہری بم جاپان کے ایک بندرگاہ "ناگاساکی" پر گرایا گیا۔ اس بم کی ایجاد پر تمام دنیا حیران ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر قسم کی کوشش جرمنی میں بھی جاری تھی لیکن ان کو کامیابی نہ ہو سکی۔ اگر اس بم کی ایجاد کچھ پہلے ہوتی تو پھر بہت جلد کئی ملک تباہ ہو جاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس ایجاد نے دنیا کو بالکل بدل دیا۔ آئندہ لڑائیوں میں اگر یہ بم استعمال کیا جائے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ موجودہ دنیا باقی بھی رہے گی یا نہیں۔ اس وقت تک یہ ایجاد ایک راز ہے۔ لیکن یہ راز سب پر ظاہر ہو جائے گا اور ہر وہ حکومت جس کے پاس ذرائع ہوں گے جوہری بم بنا سکے گی

مرزا ابراہیم بیگ

صبح

گئی رات اٹھو سویرا ہوا　　اندھیرا گیا اور اجالا ہوا

وہ مسجد سے آئی اذاں کی صدا　　وہ مندر سے ٹن ٹن کا اک غل مچا

وہ چڑیوں کی آواز آنے لگی　　وہ شاما بھی تانیں اڑانے لگی

سہانا عجب وقت ہے صبح کا　　وہ چلنے لگی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

پرند آشیاں چھوڑ اڑنے لگے　　چنبیلی، گلاب اب تو کھلنے لگے

اٹھو، بستر اچھوڑ، اب باہر آؤ
عتیق ایسے منظر کا بھی لطف اٹھاؤ

محمد عتیق اللہ

مسٹر ونسٹن چرچل

مسٹر چرچل ۳۰ر نومبر ۱۸۷۴ء کو انگلستان کے ایک غیر معروف گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام رینڈالف چرچل تھا جو انگلستان کے بڑے بڑے امراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی ماں امریکہ کی رہنے والی تھیں۔ چرچل کی ابتدائی زندگی بڑی دلچسپ ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اکثر نامور لوگ ایسے ہیں جنھیں بچپن میں پڑھنے لکھنے سے بڑی نفرت رہی ہے۔ بالکل یہی حالت مسٹر چرچل کی تھی۔ ابھی یہ تین چار برس کے تھے کہ ان کی نرس نے انھیں پڑھانا شروع کیا۔ جب نرس انھیں پڑھانے لگتی تو یہ بالکل انجان ہو کر اس کے بالوں سے کھیلا کرتے۔ جب ماں نے دیکھا کہ چرچل نرس سے پڑھتے نہیں تو ان کی پڑھائی کے لئے ایک استانی مقرر کی گئی۔ چرچل اس سے بہت ڈرا کرتے تھے اور اس کے آنے کے وقت پر باغ میں چھپ جاتے تھے۔ اس کے بعد ان کو نار وے کے ایک اسکول میں شریک کیا گیا جہاں یہ پڑھنے کے بجائے کھیلا کرتے تھے۔ ان کا شمار جماعت کے کند ذہن اور نکھٹو طالب علموں میں ہوتا تھا۔ یہ اکثر مدرسہ سے بھاگ جایا کرتے اور شہر کے آوارہ لڑکوں سے لڑنے کی مشق کیا کرتے۔ ان کو جتنی پڑھنے لکھنے سے نفرت تھی اتنی ہی کھیل سے دلچسپی تھی۔ ان کا شمار اسکول کے اچھے کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ ان کی غیر حاضریوں پر استاد نے ان کے باپ سے شکایت کی اور کہا کہ یہ لڑکا ہر روز ایک نہ ایک شرارت کرتا ہے۔ چھوٹا سا تو ہے مگر بڑے بڑوں سے لڑ لیتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ انھیں فوج میں ملازم کروا دیا جائے۔ جب باپ نے ان کی یہ شکایت سنی تو ان کا نام مدرسے سے خارج کر الیا۔

۲۱ر سال کی عمر میں ۱۸۹۵ء میں انھیں فوج میں ملازم کروا دیا گیا تاکہ یہ اپنی روز افزوں

شرارتوں سے باز آتے تھے - انھیں لڑنے بھڑنے کے کاموں سے تو دلچسپی تھی اس لئے مدرسہ کا یہ کھلنڈرا طالب علم بہت جلد فوج میں ترقی کرکے ایک نمایاں عہدے پر پہنچ گیا -

چرچل کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا - جب طالب علمی کا زمانہ ختم ہوا تو اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے نکلے اور بہت سے علاقوں کی سیر کی - اسی سیر کے بہانے ہندوستان بھی آئے - یہاں پر انھوں نے تاریخی مقامات کا تفصیل سے معائنہ کیا - حیدرآباد بھی آئے تھے - قیام ہند کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ انھیں یہیں سے مطالعہ کا شوق ہوا جو بعد میں جنون کی حد تک پہنچ گیا - چرچل ابھی ہندوستان ہی میں تھے کہ افریقہ کی جنگ چھڑ گئی - یہ چاہتے تھے کہ خود بھی جنگ میں شریک ہوں مگر انھیں کوئی عہدہ نہ ملا - اس کے بعد انھیں مختلف عہدے دئے گئے - جنگ عظیم کے ختم پر ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک آپ وزیر جنگ رہے - ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک چرچل مصروف زندگی سے ہٹ کر گوشہ نشین ہوئے مگر جب بھی پارلیمان کے رکن تھے - دس سال ختم ہونے کے بعد وہ وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوئے -

وہ استاد جو ان کی غیر حاضری پر آنکھیں نکالتے تھے اگر آج وہ زندہ رہتے تو چرچل کی پیٹھ ٹھوکنے میں پیش پیش دکھائی دیتے - یہ کسے معلوم تھا کہ اسکول سے چھپ چھپ کر آوارہ لڑکوں سے لڑنے والا لڑکا نصف صدی گزرنے کے بعد سلطنت برطانیہ کا وزیراعظم ہوگا - مسٹر چرچل نے اس عالمگیر جنگ کے دوران میں جو جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ اپنی آپ نظیر ہیں - انگلستان میں یہ طریقہ ہے کہ ہر پانچ سال کو نئے انتخابات ہوتے ہیں - اس سال یعنی ۱۹۴۵ء میں صدارت عظمیٰ کے لئے آپ کا انتخاب نہ ہوسکا بلکہ آپ کی جگہ مسٹر ایٹلی وزیراعظم منتخب ہوئے ہیں -

مسٹر چرچل کے بعض عادات بڑے دلچسپ ہیں وہ یہ کہ ہاتھ میں ہر وقت سگار رہتا ہے اور یہ ہر کام کو بستر پر لیٹے ہوئے انجام دیتے ہیں - دفتر میں بھی ان کے لئے پلنگ تیار رہتا ہے جب کبھی

انھیں تقریر کرنی ہو تو دھات بھر اپنے سر کو دونوں تکیوں میں دبا کر تقریر کا مضمون سوچا کرتے ہیں اور پھر صبح ایسی بہترین تقریر کرتے ہیں کہ سب عش عش کرتے رہ جاتے ہیں۔ اب مسٹر چرچل کی عمر ۸۱ سال کے قریب ہے۔

سید شاہ مصباح الدین حسین

عقلمند بادشاہ

سنتے ہیں کسی زمانے میں سالمین نامی ایک بادشاہ کسی وسیع سلطنت کا فرمانروا تھا۔ وہ اپنی دولت سے زیادہ عقلمندی میں . . . مشہور تھا۔ مختلف ملکوں کے عقلمندوں نے مختلف طریقوں سے اس کی دانائی کا امتحان لیا اور ہر مرتبہ شاہ سالمین کامیاب رہا۔

ایک مرتبہ شہاما نامی ایک شہزادی اس کے ہاں مہمان آئی۔ یہ نوجوان اور خوبصورت شہزادی بھی اپنی عقلمندی کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ اس نے دورانِ قیام میں شاہ سالمین کی عقلمندی کا امتحان لینے کا تہیہ کیا چنانچہ ایک روز اس نے دو گلاب کے پھول میز پر رکھ دیئے۔ اس میں ایک اصلی پھول تھا اور دوسرا مصنوعی اس نے شاہ سالمین سے دریافت کیا کہ "اصلی پھول کونسا ہے اور مصنوعی کونسا؟

شاہ سالمین نے ایک لمحہ تک سوچا پھر مسکرا کر کہا

"کمرے کی سب کھڑکیاں کھول دو۔"

اس کے حسبِ حکم سب کھڑکیاں کھول دی گئیں

جب پائیں باغ کی طرف کی کھڑکی کھلی تو ایک تیتری اڑتی ہوئی آئی اور تھوڑی دیر ادھر ادھر اڑنے کے بعد اصلی پھول پر بیٹھ گئی۔ شاہ سالمین نے کہا "یہی اصلی پھول ہے۔ تیتری کبھی دھوکا نہیں کھا سکتی"

شہزادی اس عقلمندی پر دم بخود ہوگئی اور اس نے سالمین کی عقلمندی کو مان لیا۔

رضیہ رضویہ

ادارۂ ادبیات اُردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت		
من کی بتیا	۸۰	-	۸	.
سرگزشت غالب	۶۴	-	۸	.
نظام الملک	۴۰	-	۶	.
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	[illegible]	-
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	[illegible]	۱	-	.
ارمغان جذب	۱۲۰		۱۲	
سوتیلی ماں	۴۸	.	۴	.
سرسید احمد خاں	۱۶	.	۲	.
سر سالار جنگ	۴۸	-	۶	.
...نی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	.
...ت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	.
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	.
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	.	.
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	.
مثنویات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	-
داد ابھائی	۱۶	-	۲۰	-
اردو نامہ	۲۰۰	۲	-	.
رسطو جاہ	۶۵	-	۶	.
اد الملک	۴۰	-	۶	.
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	-	۵	.
" " دوسری کتاب	۵۹	.	۵	.
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	-	
...غذ کی ناؤ	۱۳۰	۱	۴	.
...ن تقریر	۹۲	-	۱۲	.
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	.	.
ہندوستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸	.
ادب کی کہانی	۸۰	:	۱۰	.
مرقعا	۱۰۰	۱	.	.
...ی کی کہانی	۴۸	.	۶	.
مسائل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	.
ملک گوہر	۴۰	.	۴	-
تاریخ ادب اردو	۱۰۶	۱	۸	.
ورڈسورتھ اور اس کی شاعری	۱۸۴	۱	۴	-
دکن کے ناظم	۹۴	۱	-	.
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	-	.
نقاد اقبال	۱۰۶	۱	۸	.
سیانی زبانیں	۱۰۴	۱	.	.
غلام علی خاں	۳۲	.	۴	.
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	.	.

نام کتاب	صفحات	قیمت		
بچ کا ...دو	۴۸	.	۴	.
طبیعیات کائنات	۶۸	.	۸	
متاع سخن	۱۲۴	.	۱۲	.
کیف سخن	۱۲۲	.	۱۲	.
بادۂ سخن	۱۲۷	.	۱۲	.
سراج سخن	۱۵۲	.	۱۲	.
ایمان سخن	۱۲۰	.	۱۲	.
فیض سخن	۱۴۴	.	۱۲	.
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	.	.
" " دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	.	.
نقد سخن	۱۰۵	۱	.	.
نذر ولی	۲۴۸	۲	.	
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	.	
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	[illegible]	.	.
من کی دنیا	۱۴۵	۱	.	
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	.
محرم نامہ	۱۱۲	۱	-	.
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	.
رقیع غالب	۱۴۰	۲	۸	.
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	.
دفتری معلومات	۵۶	.	۶	.
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸		۶	.
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	.
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	.
سرگزشت ادارہ	۳۰۴	.	۱۲	.
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	.
بلقان	۳۲	.	۳	.
خطابیات	۱۱۳	.	۱۲	.
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	.	
چینو اتی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	.
انوار	۱۲۸	۱	۸	.
کشمکش نانی (۴) تصاویر	۸۰	:	۱۰	.
گلستاں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	.
بات کا بھولا	۱۶۸	۱	.	.
...کہ رباہ	۲۴	.	۴	
...لعت	۵۶	.	۸	
ادارہ ۱۹۴۲ء میں	[illegible]		۸	
...الدولہ	۳۲		۴	
...النعل	۳۲		۴	

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

جلد ۸ بابت ماہ ڈسمبر ۱۹۴۵ء شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس اعظم پورہ میں چھپکر حضرت شاہ آباد سے شائع ہوا

غزل

طلسمِ فکر و فریبِ نظر ہے کیا کہیئے
شبابِ موسمِ دیوانہ گر ہے کیا کہیئے

مچل رہا ہے کوئی بات نا تمام ہیں دل
تری نگاہ کے زیرِ اثر ہے کیا کہیئے

ہر التماس پہ کہتے ہیں جانتے ہیں ہم
جب اپنے حال کی ان کو خبر ہے کیا کہیئے

حریمِ دل کی مرے راہ پوچھنے والے
مرا خیال تری رہگزر ہے کیا کہیئے

رموزِ عشق بتائے گئے اشاروں میں
حیات فرصتِ رقصِ شرر ہے کیا کہیئے

کھلے نہ راہ میں اسرار زندگانی کے
ازل سے پیکِ اجل ہم سفر ہے کیا کہیئے

کمالِ شوق اسیری جنوں نہیں ہمدم
یہ رازِ تربیتِ بال و پر ہے کیا کہیئے

زمانہ درپئے آزار اور میں چپ ہوں
ہنوز حوصلہ درگزر ہے کیا کہیئے

یقینِ دورِ مسرت مجھے بھی ہے لیکن
ابھی تو گردشِ شام و سحر ہے کیا کہیئے

چمن میں نرگسِ بیدار کو سکوں نہ ملا
وطن مخالفِ اہلِ نظر ہے کیا کہیئے

میں فصلِ گل میں دکھاتا نہ دل کے داغ کبھی
وفورِ جوشِ جنوں پردہ در ہے کیا کہیئے

سکندر علی وجد

[illegible]

([illegible] تعلیم اسلامی [illegible]
[illegible] جنگ بہادر نے جو خطبہ
[illegible] یونیورسٹی کے [illegible] کا خلاصہ
[illegible] ذیل ہے)

نواب صاحب ممدوح نے مسلم یونیورسٹی سے اپنے
[illegible] خاندانی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-
"مجھے اس خیال سے اس دعوت کے قبول کرنے
کی جرأت ہوئی کہ میرے بعض اراکین خاندان کے جو گہرے
تعلقات یونیورسٹی سے رہے ہیں ان کی بنا پر ایک حیثیت
سے میرا بھی تعلق یونیورسٹی سے ہے۔ میرے ایک چچا
نواب عماد الملک بہادر سید حسین بلگرامی سرسید کی تحریک کے
بہت بڑے حامی تھے اور میرے دوسرے چچا ڈاکٹر
سید علی بلگرامی علی گڑھ کالج کے عملی کارکنوں میں سے ایک
تھے جنہوں نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں اس
وقت جب کہ علی گڑھ کالج یونیورسٹی کی صورت میں
منتقل ہو رہا تھا اس کا دستور مرتب کیا تھا اس طرح
آپ کو معلوم ہوگا کہ کیوں اس ادارہ کی ترقی اور
فلاح سے میں ایک حقیقی اور پائیدار دلچسپی رکھتا ہوں۔

مسلم یونیورسٹی کیا تھی

آدھی صدی سے زیادہ زمانہ گزرا جب سے مسلم تہذیب
اور افکار کے ارتقاء سے مسلم یونیورسٹی کا تعلق رہا ہے۔
شاید یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ اس زمانہ میں
مسلم ہندوستان کی تاریخ فی الاصل مسلم یونیورسٹی کی
تاریخ ہے۔ بہت سے بڑے لیڈر جن کی کوششوں پر مسلمانوں
کی تہذیب اور افکار کی ترقی منحصر رہی جیسے کہ مولانا
محمد علی، مولانا شوکت علی، مسٹر سر راس مسعود ان سب کا
کبھی نہ کبھی زمانہ میں مسلم یونیورسٹی سے تعلق رہا تھا۔
اس فہرست میں مجھے جسٹس سید محمود، نواب محسن الملک
اور نواب وقار الملک کے نام بھی شامل کرنے چاہئیں
جنہوں نے اپنے نہ مٹنے والے نشانات مسلم یونیورسٹی
کی تاریخ میں چھوڑے ہیں۔ وہ سب ایسے مبلغ
تھے جو قوت عمل رکھتے تھے اور ان کے اندر ایک قسم
کی ایسی خوش مزاجی اور یار باشی بھی تھی جو علی گڑھ
کی خصوصیت ہے اور جس کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں
کہ آج بھی مسٹر وائس چانسلر! آپ کے طلباء ریلوے
اسٹیشنوں پر ٹکٹ کلکٹروں کی نگرانی سے بچ نکلتے ہیں

....

بانی کا مقصد

اس عظیم المرتبت بانی کا ایک مقصد
یہ بھی تھا کہ ہمارے نوجوانوں کے کردار کو بلند کیا جائے
ان کے خیال میں کردار کی مناسب تربیت اس محقق
علم سے جو بڑی محنت کے ساتھ سبق کے کمروں اور
اور کتب خانوں میں حاصل ہوتا ہے زیادہ ضروری
تھی میری رائے میں کردار کی تربیت کے لیے ضبط نظم
ایک ضروری چیز ہے۔

ضبط و نظم

ہماری یونیورسٹیوں میں
ضبط و نظم پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے اس لئے کہ
آج جو طالب علم ہے وہی کل اس ملک کا شہری بننے
والا ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب ہم نے برطانوی
قوم کو جلتی ہوئی آگ سے فتحمند نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔
جن لوگوں نے لندن کی بمباری اور بموں کی ہلاکت
آفرینی کو دیکھا ہے وہ عام لوگوں کے اس ضبط و نظم
کی بے حد تعریف کرتے ہیں جو (اس موقع پر) ظاہر ہوا۔
...... یاد رکھئے کہ جنگ کا شور و غوغا ابھی ختم نہیں
ہوا ہے اور جذبات کا سیلاب جاری ہے اور مزاجوں
کی گرمی باقی ہے ایسی حالت میں ضبط نفس کی ضرورت
اور بھی زیادہ ہوگئی ہے .... جنگ کے
زخموں کے اندمال میں بہت وقت صرف ہوگا اور ہمیں
اپنی پوری قوت کی ضرورت ہوگی تاکہ ہم اس آنے والے
زمانہ سے گزر سکیں جس میں فلاح اور امن یقینی ہیں۔
بہتر ہوگا کہ ہم اس بات کو بھی سمجھ لیں کہ دریاؤں اور

پہاڑوں کی حد بندی ختم ہو چکی ہے اور بڑے بڑے فاصلوں کو ہوائی جہازوں نے کم کر دیا ہے اس حالت میں کوئی قوم اپنے ہمسایہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی اور نہ اپنے علاقہ میں سب سے جدا رہ سکتی ہے۔ زمین سکڑ گئی ہے اور اس کی سطح پر کوئی مقام راکٹ اور ایٹم بم سے محفوظ نہیں رہا ہے۔ انسانیت کا مستقبل اب قوموں کی باہمی رفاقت، میل جول اور مفاہمت پر منحصر ہوگا ....

ڈگری کے علاوہ بھی کچھ اور

نوجوان طلبہ کو مخاطب فرماتے ہوئے نواب صاحب نے انہیں یاد دلایا کہ "جب تم ایک ایسی یونیورسٹی سے جیسی کہ یہ یونیورسٹی ہے رخصت ہوتے ہو تو تم اپنے ساتھ ایک ڈگری کے علاوہ بھی بہت کچھ لے جاتے ہو۔ اقتباس .... یونیورسٹی کے بڑے فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں ہم آہنگی اور رفاقت کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے کہ دوسروں کی رائے کو سننا گوارا کرو۔ اس لئے کہ رواداری ہی جمہوریت کی روح ہے۔ جب تم اس بات کو تسلیم کر لو کہ کسی ایک مسئلہ کے متعلق دو رائیں بھی ہو سکتی ہیں تو گویا تم نے جمہوریت کی بنیادی حقیقت کو تسلیم کر لیا ...... ہمیں معلوم ہے کہ اندھا تشدد آمیز تعصب ...... انسانوں کی روح کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتا ہے۔ اسلامی مبلغین کے ترغیبی طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے سر تھامس آرنلڈ نے لکھا تھا کہ:۔

"اسلام کے مبلغ کی روح کلیتہً نہ تو ہم ظالم کی بے رحمیوں تعصب اور غضبناکی میں پا سکتے ہیں اور نہ قصے کہانیوں کی شخصیتوں کے کارناموں میں۔ جہاں مسلمان جنگ آزما ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک میں قرآن لئے ہوئے بتایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ روح ہم کو اس خاموش اور سنجیدہ اور محنتی واعظ اور تاجر میں ملتی ہے جو اپنے مذہب کو کوہ ارض کے ہر گوشہ میں لے کر گیا۔" ....

رواداری

میں نے رواداری کا ذکر کسی قدر طویل کیا ہے اس لئے کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جمہوری طرز زندگی کا رواداری سنگ بنیاد ہے اس لئے بھی کہ آج جب کہ فصاحت و بلاغت کی جگہ

عمومی نعروں اور [illegible] ترغیب کے طریقوں کا چلن [illegible] جن کو اسلام سے جمہوری اصول [illegible] تہیہ کریں کہ ہر شخص کی بات انصاف [illegible] ساتھ سنی جائے گی۔

....

اہل قلم شعراء اور ماہرین خصوصاً [illegible] سے میں کہوں گا کہ زمانہ ماضی کا نوحہ اور گزری ہوئی باتوں [illegible] ہماری قوم کی موجودہ تاریخ کا رخ نہیں بدل سکتا۔ برٹرانڈ رسل کے الفاظ ہیں۔ جن کی جوانی کی توانائی بڑھاپے کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ میں کہوں گا کہ:۔

"سمجھنے کی کوشش کرنا چھوڑ دو اور اس کے بجائے نہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ دنیا کی وسعت میں نکل کر سمندری ڈاکو بن جاؤ۔ بورنیو کے بادشاہ بن جاؤ سوویٹ روس کے مزدور بن جاؤ جو چاہے بن جاؤ مگر اپنا وجود ایسا بناؤ جس میں تمہاری تمام ضرورتوں کے پورا کرنے میں تمہاری تمام قوتیں مصروف رہیں۔"

ان لوگوں کے لئے یہ ایک اچھا علاج جو دنیا کی ویران حالت .... سے آزردہ ہوتے ہیں اور جن کے دل انسانیت کی معیبت سے بیزار ہو گئے ہیں لیکن جو اپنے گھروں میں پڑے رہتے ہیں اور مایوسی کے خیالات میں مبتلا رہتے ہیں اور زندگی کو اپنے گھر کے دروازوں سے باہر نکال دیتے ہیں۔

خواتین

مسٹر وائس چانسلر۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ خواتین بھی آپ کی یونیورسٹی میں شامل ہیں اور ان کو بھی مردوں کے ساتھ ساتھ ڈگری حاصل کرنے کی اجازت ہے۔ اس صورت میں تو آپ کیمبرج یونیورسٹی سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ کیونکہ سمجھ میں نہیں آتا کہ [illegible] کے دار العلوم نے صنف نازک .... سے خارج رکھا ہے۔ یہ تو ہم سب کو معلوم ہے کہ [illegible]

[illegible] بہت قدیم ہے حضرت آدم
[illegible] جنت سے نکالے جانے کے بعد سے
[illegible] کوشش کرتا رہا ہے کہ اصل تنقیح
[illegible] اور اسی لئے وہ اپنے شریک زندگی
[illegible] تو یاد دلاتا ہے مگر اپنی آسانی کے لئے
[illegible] بھول جاتا ہے لیکن مرد کے اس تفوق کا
[illegible]۔ اب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مردوں
کی دنیا میں عورتیں بھی کام کرنے کے قابل ہیں کسی مہذب
سماج میں اب ان کے حقوق نظرانداز نہیں کئے جا سکتے۔
[illegible] میں اسقفوں کی مجلس ...... میں یہ
سوال زیر بحث آیا تھا۔ اس مجلس میں ایک اسقف نے
یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ عورتوں کو انسان نہیں سمجھا جا سکتا۔
مگر بحث و مباحثہ کے بعد دوسرے اسقفوں نے اس بحث
کا فیصلہ مدعی کے خلاف کیا اور اس دن سے عورت تمدنی
کی منزلیں یکے بعد دیگرے طے کر رہی ہے اور مجھے یقین ہے
کہ ایک وقت آئے گا جب مرد کی وحشت اور عامیانہ
بدتہذیبی عورت ہی کے اثر سے کم ہو سکے گی۔

...... اب تمام دنیا میں ایک انقلاب ہے
اور میں تو اس انقلاب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

....

لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ایسے
ملکوں میں جیسے کہ ہمارا ہے جہاں کثیر آبادیاں بہت زیادہ
جہالت، زندگی کا یہ پست معیار اور سماجی خرابیاں موجود
ہیں عورتوں کا کام گھروں کے اندر رہے۔ جس وقت
معاشی دست نگری کا خوف باقی نہ رہے اور مردوں کے
ساتھ مساوی حیثیت قائم ہو جائے تو ہندوستان کی
عورت اپنے گھر کے انتظام کو درست کر کے ایسی نسلیں
پیدا کر سکتی ہے جو شہری ذمہ داریوں کا وزن اٹھا سکیں۔
یہ کام میرے خیال میں زیادہ بڑا اور زیادہ محنت کا کام ہے
بہ نسبت اس کے کہ سرکاری دفتروں میں مناسب عہدے

ل جائیں یا ہوائی جہاز میں پرواز کی جائے یا ہمالیہ کی
سب سے اونچی چوٹی پر چڑھا جائے۔

علی گڑھ کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ اس کو
ہز اگزالٹیڈ ہائی نس حضور نظام حیدرآباد و برار جیسی بلند
مقام شخصیت کا چانسلر نصیب ہوا۔ اعلیٰ حضرت کی
علم نوازی اور تعلیم کے مقصد کی ترقی کے لئے اعلیٰ حضرت
کی آرزومندی نے ان کے لئے سلطان العلوم کے
حق بجانب خطاب کو بہت موزوں بنا دیا ہے۔

....

میں اس موقع پر یونیورسٹی کے ایسے دوسرے مشاہیر کی
شخصیتوں کا ذکر کرنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ جیسے کہ
ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی
ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی تہذیب اور افکار کی نمایاں
خدمات انجام دی ہیں ...... آخر میں اس سال کے
گریجویٹس کو مخاطب کرتے ہوئے نواب صاحب ممدوح نے فرمایا کہ۔

علم ایک غم ہے

علم در اصل ایک غم ہے۔ اگر وہ
تہذیب کے مجتمع خزانوں کی بربادی
میں مدد کرے مجھے امید ہے کہ اپنی طالب علمی کے قیمتی سالوں
میں جو علم تم نے حاصل کیا ہے وہ تمہیں اس قابل بنائے گا
کہ تم وحشیانہ جہل کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ بغیر
خوف اور بغیر تعصب کے کر سکو ....

خدائے تعالیٰ صداقت اور حق کے راستے پر تمہاری
رہنمائی کرے اور گزرے ہوئے زمانہ کے ساتھ تم ایک
عظیم الشان ملک کے قابل سپوت اور اقوام عالم میں
اپنی صحیح جگہ حاصل کرنے کے قابل ثابت ہو۔ میں اپنے
خطبہ کو اس دعا کے ساتھ ختم کروں گا جو ہمارے محبوب
شاعر اور فلسفی سر محمد اقبال نے مانگی تھی ۔

خود کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

(ماخوذ از پیام)

اکیلی عورت

نیلا تم پوچھتی ہو کہ میں تمھارے خطوں کے جواب میں ایسی پراسرار خاموشی کیوں اختیار کیے ہوئے ہوں کہ تمھیں اپنی ازدواجی زندگی کا ایک لفظ بھی سنانا نہیں چاہتی۔ تم یہ کیسے سمجھ بیٹھی ہو کہ میں شیام کے ساتھ رنگ رلیوں میں ایسی محو ہوں کہ نہ صرف تم بلکہ کالج کی تمام ساتھی سہیلیاں بھی فراموش کر چکی۔ تم تو رنگنار کی رفیق نہیں نیلا بلکہ میری روح اور میری زندگی ہو۔ تمھارا ہی تو سہارا لیکر میں نے کالج کی زندگی کے تمام منازل طے کیے ہیں۔ میرے جو اس نے ابھی جواب نہیں دیا ہے کہ میں نیلا کو بھول جاؤں اور اسے پہچان بھی نہ سکوں۔ میری طویل اور پراسرار خاموشی ایک دردناک حقیقت ہے۔ انہی خاموش دنوں میں میری زندگی کا جنازہ نکل چکا ہے۔ نصیب کی کمی ساری خوشیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا کی گود میں سو چکیں۔ نیلا بہن اب میں ایک ٹوٹا ہوا رباب ہوں جس سے کوئی نغمہ نہیں نکل سکتا۔ تم مجھ سے کالج کی چہلیں بیان کرتی ہو اور مجھ سے چاہتی ہو کہ شیام کا حال سناؤں اگر تم میری بدنصیبیوں اور محرومیوں کی دردناک داستان سننے کی سکت رکھتی ہو تو میرے پتی شیام کی داستان بھی سن لو اور میری زندہ موت کا ماتم کرتی رہو۔ یہ نہ سمجھو نیلا کہ شیام کا مزاج، نصیب دشمنان ہو گیا ہے۔ بلکہ میری تقدیر تقدیر دشمنان بن چکی ہے۔ یہ جان کر درد و غم میں ڈوب نہ جاؤ کہ شادی کے تین چار مہینے بعد ہی میری تقدیر کیوں پھوٹی۔

شیام کچھ عجیب سا جوان ہے۔ بہکا بہکا، الجھے خیالوں میں گرفتار، نگاہوں میں معمے، حرکتوں میں بھی داستانیں، گفتگو میں خاموشی، خاموشی میں پہیلیاں۔ اس کو بوجھنے جو چلی تو اپنا پتہ بھی بھولی۔ اس رات جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو ایک الجھن میں پڑ گئی کہ پرماتما نے مجھے کس وحشی کے پلے باندھا ہے۔ لیکن نیلا میری زندگی

[illegible] کی کہ اس کی [illegible] [illegible] میں چلا گیا۔ اس نے دنیا چھوڑ [illegible] اور آتما کے بندھنوں سے گرفتار ہو کر [illegible] باپ اور میں، بلکہ تمام رشتوں ناطوں کو [illegible] بناکر آشرم میں جا بیٹھا۔ آشرم میں جیسا [illegible] نصیب ہونے والی ہے۔ نیلا وہ آشرم چلا گیا۔ [illegible] جانے کہ وہ کبھی لوٹ کر بھی آئے گا یا نہیں۔ میں اس کی [illegible] یہاں رہ کر کیا کرتی تھی۔ عورت کا آشرم اس کا پتی اور اس کی [illegible] بھی تو اس کا پتی ہے میں بھی ابھی تو وہیں چل دی۔ میرے آشرم پہنچنے سے وہ گڑ بیٹھا۔ قہر و غضب کا جیسا [illegible] برس پڑا۔ میری ساری کوششوں کے باوجود مہاراج [illegible] آشرم والوں کو بھی میرا قیام گراں گزر رہا تھا۔ گرو [illegible] چیلوں نے کہا کہ آشرم میں ایک سندری آئی ہے جو بی اے پاس ہے اور اسکول میں لڑکیوں کو پڑھاتی بھی ہے۔ شاید شیام کی بیوی ہے۔ لیکن اس کا قیام آشرم پر کلنک کا ایک ٹیکہ بن جائے گا۔ مہاراج نے مالا جپتے ہوئے آنکھیں بند کئے شیام سے کہا کہ وہ مجھے آشرم سے چلے جانے کو کہے ورنہ اس کو بھی آشرم میں جگہ نہ مل سکے گی۔ شیام بے چین ہوا میرے تار و پود بکھیرنے چلا آیا۔ میں سوائے اس کے اور کیا کر سکتی تھی کہ آشرم سے گھر واپس چلی آؤں۔

نیلا میں درد و غم کی اسی دنیا میں سانس لیتی رہی [illegible] تم کناں تھی کہ ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ شیام کی ماں نے [illegible] وہ میری وجہ سے آشرم چلا گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک میم بیاہ لائے جو نہ گھر کی لاج ہو سکتی ہے اور نہ نیک بیوی بن سکتی ہے۔ اسکول اور کالج کی پڑھی لڑکی کی آنکھوں کا پانی مر جاتا ہے۔ شرم و حیا انہیں چھو بھی نہیں سکتی اور پھر اس پر طرہ یہ کہ اب بھی یہ لڑکیوں کو پڑھاتی [illegible] کی لڑکیاں جو آج اپنا فیصلہ آپ خود کر رہی ہیں [illegible]

[illegible] اس کا مجھ سے نفرت ہو کر
[illegible] پاکر رہنے [illegible]
کر [illegible] ہے لیکن تم اب تک بھی فراموش نہیں کیا
[illegible] ۔ شیام کی دماغی اور خیالی الجھنوں
کو [illegible] پوری کوشش کی ہے۔ لیکن اسپر
[illegible] آشرم کے بھوت سوار تھے، ان بھوتوں
کے مقابلہ میں ایک عورت کیا کر سکتی ہے جس کی مخالفت میں گھر
کی [illegible] ایک [illegible] بن کر رہ گئی ہوں۔ شیام چلے جانے
کے [illegible] کے طعنے کستے اور مجھ ہی پر سارا الزام مجھے دیوانہ
بنا رہے تھے۔ لیکن نیلا پھر بھی میں خاموش رہی۔ ماں کو
خوش کرنے کی خاطر میں نے اسکول کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔
لیکن ان کی نظروں میں میں ایک خاری ہی رہی۔ مجھے اسکول کی
استانی سے انھیں شکایت ہی رہی کہ میرے رکھ رکھاؤ ہی کو
دیکھ کر وہ ڈرا ہے۔

نیلا اس دیس میں استانی اور نرس کبھی تقدیس
و عفت کا احترام حاصل نہیں کر سکتے۔ استانی اور نرس،
سماج کی تمام عورتوں نے انھیں اپنے مقام سے بے دخل
کر دیا ہے چونکہ یہ مخلوق مردوں سے آنکھیں ملاتی ہے اور
ہر ایک کے درد و غم میں بے حجابانہ شریک ہوتی ہے۔ استانی
اور نرس کو دیکھ کر وہ بیویاں اپنا دامن بچا لیتی ہیں۔ استریاں
سائے سے بھاگ کھڑی ہوتی ہیں اور قصہ پھر شروع
ہو جاتی ہے کہ یہ پڑھی لکھی عورتیں جو بھی قیامت ڈھائیں
کم ہے۔ طعن و طنز کے انہی نشتروں سے زخمی، درد و کرب
کے مارے آہیں بھرتی رہی لیکن یہ ظلم اور بڑھتے گئے گھر
ہو گئے۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ
میں نے شیام کو آشرم کیسے بھیج دیا۔ کیا میں اپنے پتی
کو چھوڑ کر اپنی جوانی کی بربادی گوارا کر سکتی ہوں؟ ہمارے
ملک کا دستور بھی ہے کہ اپنی بربادیوں اور ناکامیوں کا
ذمہ دار انھیں بنایا جائے جو یہ سب سن سکتے نہیں اس کے
[illegible]

نیلا! میں اسی درد و غم کے اتھاہ سمندر میں ہچکولے کھا رہی
تھی، نہ کوئی لنگر اور نہ کہیں بادبان کہ اس کے سہارے آگے
بڑھ سکوں۔ ان دنوں تمھارے اور دوسری سہیلیوں کے
خطوط آتے رہے جنھیں پڑھ کر مجھ میں ایک بھونچال آ جاتا
تھا۔ روزی لکھتی تھی ساری رات میں نائن کے ساتھ سمندر
کی سیر کرتی رہی۔ نجمہ شفیق نے کشمیر سے خط بھیجا تھا کہ وہ
جھیل ڈل کی رنگینیوں میں غرق ہیں۔ پاروتی اپنے
شوہر کی شرارتوں کا ذکر کرتی تھی۔ ارمیلا کہتی ہے کہ اس کا
شوہر دھوئیں کے مرغولے یوں چھوڑتا ہے کہ وہ اس کے
گلے کا ہار ہو جاتے ہیں جس پر وہ کہتا ہے چاند ہالے میں
گرفتار ہے۔ نیلا یہ سب پڑھ کر میرا قرار بے قراریوں کا
روپ دھار کے مجھ سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ مجھ میں
ایسی حرکت بیدار ہوتی ہے کہ میں دو جہاں پر چھا جانا چاہتی
ہوں۔ چاند، ستارے، بادلوں کے جزیرے، غرض کائنات
کے سارے حسن سے کھیلنا چاہتی ہوں۔ نیلا، میرے ٹوٹے
ہوئے رباب سے بھی نغمہ تڑپ اٹھتا ہے۔ لیکن نیلا۔
میں وہ چنگاری ہو گئی ہوں جو راکھ میں بجھی جا رہی ہے۔
ماں کے نشتروں سے زخمی اور نڈھال ہو کر میں
پھر آشرم پہونچی کہ شیام کو واپس لا سکوں۔ لیکن وہ اب کبھی
نہیں لوٹ سکتا۔ اس کی جٹائیں اور سینے تک لہراتی ہوئی
ڈاڑھی اس بات کا ثبوت ہو چکی ہے کہ وہ آشرم ہی میں اپنی
سمادھ بنا لے گا۔ مجبور ہو کر میں نے شیام سے کہہ بھی دیا
کہ مجھے شرعاً چھوڑ دو اور دوسری نئی زندگی کی اجازت دو۔
میں نے کوئی قصور کیا ہے کہ تمھارے لئے میں بھی زندگی کو
طعن و طنز کی آگ میں جھلسنے دوں۔ لیکن خدا کا بندہ صاف
انکار کر گیا۔ وہ مجھے تو صرف تڑپانا اور جھلسانا چاہتا ہے۔
اب میرے لئے کیا رہا کہ زندگی کے حسین تصور کو اپنے میں آنے
دوں۔

نیلا! تم ہی کہو کہ شیام کے آشرم چلے جانے کی مجھ پر
کوئی ذمہ داری ہے وہ [illegible]

اپنے ساتھ میری دنیا کو کیوں خراب کرتا ہے۔ وہ مجھے کیوں ستا رہا ہے۔ اس دیس کی یہی ریت ہے۔ لڑکیاں قربانی کے جانور ہیں جو مردوں کی خوشی کے لئے بھینٹ چڑھتی ہیں۔ اسلم پاگل تھا جب اس پر دورے پڑتے تھے وہ نیک اور بد کا کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا لیکن پھول سی نازک اور گلاب کی پنکھڑی شاہدہ اس کے ساتھ بیاہی گئی جانتی ہو تم پھر کیا ہوا۔ اسلم پاگل خانہ گیا اور شاہدہ ملک کے سینی ٹوریم میں شریک کی گئی۔ مہندر قلب کا مریض تھا۔ لیکن ڈاکٹروں نے اسے رائے دی تھی کہ اگر وہ بیاہا جائے تو اس کا مرض جاتا رہے گا۔ کملا اس کی بیوی بن کر آئی مگر کچھ ہی دنوں بعد قلب کے مریض نے کملا کو مفارقت کا دائمی مرض عطا کر دیا۔ اور میں شیام کے آشرم کے جنون پر بھینٹ چڑھ رہی ہوں۔ اس دنیا میں بیویاں اپنے شوہروں کی باندیاں ہی بن کر نہیں رہتی ہیں بلکہ بھینٹ چڑھنے کے لئے بھی پیدا کی جاتی ہیں۔ عورت کی تقدیر ہی میں لکھا ہے کہ وہ اپنی بربادیوں پر اُف نہ کرے۔ ان ناانصافیوں کے خلاف اگر کوئی جہاد کرنے کا ارادہ کرے تو وہ مسمار کر دیا جائے گا۔ یا ستی کی رسم دوبارہ شروع کر دی جائے گی تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

شیام کے باپ کہہ رہے تھے کہ اس نئے زمانے نے دھرم کو بھی بگاڑ دیا۔ ان کے خیال میں وہ بڑے اچھے دن تھے جب کہ شوہر کے مرنے پر اس کی بیوی بھی چتا میں جل کر اپنے شوہر کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ اب جو یہ طریقہ اٹھ گیا ہے زمانہ میں کیسی کیسی برائیاں پھیل رہی ہیں۔ بیوہ لڑکیاں مردوں سے میل جول کرتی ہیں۔ تم نے اس گفتگو کا مطلب سمجھا نیلا؟ وہ ستی پر اس لئے غور کر رہے تھے کہ بیوہ ہو جاؤں

کے لئے طرح طرح [illegible] تھا لیکن ان [illegible] ہو سکتا ہے جن کے شوہر زندہ ہوں لیکن آشرم میں [illegible] ہوں۔ وہ یا تو مجھے جلا دینا چاہتے ہیں یا [illegible] ہیں تاکہ ان پر کلنک کا کوئی ٹیکہ نہ لگنے پائے۔ مجبوریاں اور لاچاریاں کہاں پہنچا رہی ہیں کہ لکیر میں نہ جانے کب سے چلی جا رہی ہوں۔ کالج میں شیکسپیر کا انتھولوجی اور [illegible] رومیو جولیٹ جب پڑھتی تھی تو مجھے زندگی پیاری لگتی تھی۔ جب کالج چھوڑ کر زندگی میں چلی آئی تو کالج کے وہ دن ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں جن میں دور کے ڈھول ہی سہانے تھے۔ اس دنیا میں شیام بھی بستا ہے جس کو آشرم کی پروا ہے جو زندگی کی حقیقت کو پہچاننا چاہتا ہے۔ روح اور جسم کے تعلقات سے پردے ہٹا رہا ہے لیکن ایک عورت کا دل نہیں پڑھ سکتا۔ اس کی نگاہوں کو پہچان نہیں سکتا۔ اس کی دھڑکنوں کو سن نہیں سکتا۔ ایک عورت کی بربادی پر وہ اپنے عرفان کا محل تعمیر کر رہا ہے۔

نیلا شیام کی ماں صبح سے مجھ پر طعن و طنز کر رہی ہے کہ میرے قدموں کی برکت سے اس کا چاند سا بیٹا ہاتھوں سے جاتا رہا۔ اگر مجھ سے ممکن ہوتا تو میں شیام کی جٹائیں پکڑ کر آشرم سے کھینچ لاتی۔ اور محبت کی ماری ماں سے کہتی کہ اپنے لاڈلے سے پوچھیے وہ آشرم میں کیوں گیا؟ اپنی ماں کے محبت بھرے دل کو کیوں دکھ پہنچایا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اگر مناسب سمجھو تو پوچھو کہ ایک جوان لڑکی کی زندگی بھی کیوں تباہ کر گیا؟

نیلا میں یہی سوچتی رہتی ہوں کہ کیا ہمارے ملک میں کوئی ایسا شخص بھی پیدا ہوگا جو آشرم جانے والوں سے نوجوان لڑکیوں کو بچا کر انہیں زندگی عطا کر سکے۔ میں بھی یہ طاقت رکھتی ہوں کہ آشرم جانے والوں کو آشرم جانے دوں لیکن ان کے ساتھ ایک دوسری زندگی بھی تباہ ہونے سے بچا لوں۔ لیکن نیلا میں اکیلی ہوں، کام بہت دشوار ہے اور راستہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ اگر کوئی ساتھی مل جائے تو میں ناانصافیوں سے لڑنے چل نکلوں لیکن ابھی میں اکیلی ہوں تنہا۔ اکیلی —— وقت اور ساتھی دونوں کا انتظار کر رہی ہوں۔

محمد محبوب حسین جگر

دیکھ رہی ہے۔

یہ بات بالکل قدرتی اور تقریباً لازمی ہے کہ ہم لوگ یعنی اس فرقہ کے موجودہ آدمی جن کی تربیت ایسے اشخاص نے کی ہے جو انھیں ان کی زندگی میں دیکھ چکے ہیں — اپنے فاؤنڈر اور فادر جان ہنری نیومن کو احترام کے ساتھ یاد رکھیں۔ یہ مکان مقدس روایات کا حامل ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں وین چرچ اسے صرف ہولی فادر سینٹ فلپ نیری اپاسل آف روم سے مدد دوسرے درجہ پر سمجھتا ہے۔

یہ صورت حال اعتراضات سے بالاتر ہے۔ ہم ان سے ذاتی اور نجی عقیدت رکھتے ہیں کیونکہ ہم پر ان کے بہت سے احسانات ہیں اور ہم ان کے ساتھ بہت سے رابطے رکھتے ہیں۔ ایک بڑا سوال یہ ہے کہ ان کی لیاقت اور ذہانت کی وجہ سے رومن کیتھولک مذہب کو وہ کونسے فائدے حاصل ہوئے جن کی وجہ سے وہ دنیا کے احترام کے مستحق ہیں۔ وہ ۹ راکتوبر ۱۸۴۵ء کو کلیسائی نظام میں داخل ہوئے جس کی ہم اس سال صد سالہ سالگرہ منا رہے ہیں۔ اسے کیوں ایک اہم واقعہ سمجھا جائے؟

نیومن نہایت ممتاز تھے مگر وہ کلیسا میں کوئی سرکاری حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ شروع سے آخر تک برطانیہ کے ایک قصبے میں ایک چھوٹی مذہبی جماعت کے رہنما رہے۔ لیکن حالات کے تقاضے سے یا اپنی ذاتی ترجیح کی وجہ سے برطانیہ کے کلیسائی معاملات کے ہنگاموں سے الگ رہے۔

وہ ان معاملات سے اس قدر الگ تھلگ رہتے تھے کہ ۱۸۶۸ء میں ایک خط میں انھوں نے لکھا کہ میں لوگوں سے عجیب و غریب طریقہ سے منقطع ہو گیا ہوں۔ اس وجہ سے میں نہیں جانتا کہ کیا کام ہو رہا ہے، کیا ہونا چاہیے اور اسے کون کر رہا ہے۔" جب انھیں ویٹیکن کونسل میں شرکت کی دعوت دی گئی تو انھوں نے اسے بھی رد کر دیا۔ اور کہا کہ میں اپنی قابلیتوں اور کامیابیوں کے لحاظ سے اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی بڑے مذہبی مقصد کو ترقی دے سکوں۔ چنانچہ ہنری بریمنڈ نے جو فرانسیسی تھے اور نیومن سے عقیدت رکھتے تھے کہا کہ "وہ بہت بڑے راہب تھے اور انھوں نے اپنی مرضی سے فقیری اختیار کی تھی۔"

نیومن کو جو اثر حاصل تھا وہ ان کے مرتبہ کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ان کی شخصیت کی وجہ سے تھا اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعہ لوگوں پر ان کی شخصیت کا اثر پڑا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے صاحب طرز انشا پرداز تھے اور ان کی تحریریں انگریزی نثر میں ایک خزانہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ ان کی قدر و قیمت کا گھٹا کر اندازہ لگاتے تھے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ ان کے کثیر موضوعات پر کتابیں لکھنے پر اعتراض نہ کریں چنانچہ انھوں نے ۱۸۶۸ء میں کہا تھا "مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا ہے کہ میں نے نہایت کثیر موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں کیونکہ اس طرح سطحیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتابوں کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کرلی اور انھیں اپنی مرضی سے منتخب نہیں کیا، بلکہ اپنے فرائض اور حالات کے تقاضے کے مطابق کتابیں لکھیں۔ اس وجہ سے وہ وقتی کتابیں ہیں (جیسی کہ انگریزی کی اکثر کتابیں ہوتی ہیں) یا آزمائشی۔ وہ اپنے انکسار کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ انھیں آزمائشی ہی ہونا چاہیے۔ ان کی دو کتابیں نہایت زبردست ہیں مگر انھیں بھی مضامین کہا گیا ہے۔

جو لوگ خاص موضوعات پر کتابیں لکھتے ہیں ان پر انھیں رشک آتا تھا کیونکہ یہ لوگ اپنے موضوع کے متعلق قابل اطمینان طریقہ سے ساری باتیں پورے طور پر معلوم کر سکتے ہیں۔ شاید یہ درست ہو۔ مگر ہم ان کی ۴۰ کتابوں کو الگ کر کے ان کی جگہ اپنے پاس چند ایسی علمی کتابیں نہیں رکھ سکتے جو اب تقریباً لازمی طور پر پرانی ہو گئی ہیں۔

لیکن پوپ لیو سیزدہم نے کارڈینل بنانے کے ذریعہ جو خطاب دیا تھا اس میں انھوں نے نیومن کو کارڈینل کا اعلیٰ منصب عطا کرنے کی خواہش کا اعلان کیا تھا اور اس کی یہ وجہ بتائی تھی کہ نیومن ذہین عالم، پارسا اور جوشیلے ہیں اور "ہولی سی" کے وفادار ہیں۔

نیومن نے ۱۲ مئی ۱۸۷۹ء میں بگلیٹو میں جو تقریر کی اس میں انھوں نے اپنی زندگی کا اصلی مقصد یہ بتایا کہ "مذہب میں آزادی کے جذبہ کی مخالفت کی جائے" یعنی ایسے معاملات میں خیال آرائی کی مخالفت کی جائے جن میں انسانی دماغ غور کر کے کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا ان کے خیال میں ان معاملات میں ابتدائی اصول شامل ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مقدس اور اہم وحی کے حقایق ہیں اور وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا کلام رسول پر نازل ہوتا ہے۔

لڑکپن میں نیومن کے ذہن میں جو اصول جم گئے تھے ان کے نقوش کبھی مدہم یا زائل نہیں ہوئے۔ آکسفورڈ میں انھیں لبرل پارٹی کے مقابلہ میں کام کرنا پڑا۔ ٹریکٹیرین تحریک کے ماتحت وحی کے حقایق کا اعلان ان لوگوں کے مقابلہ میں کیا گیا جو ان کے متعلق شبہ رکھتے تھے یا ان کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ لبرل پارٹی ہی نے انھیں آکسفورڈ سے نکال دیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد لبرل تحریک الحاد کا ایک بڑا فتنہ بن گئی۔ ہر جگہ اس کی ایک ہی حیثیت تھی۔ مگر ایک ملک کی بہ نسبت دوسرے ملک میں اس کے مظاہرے کی شدت میں تھوڑا بہت فرق تھا۔ نیومن ابتدا ہی سے اس تحریک کو "اصولی مذہب" کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ اور وہ اس تحریک کی مخالفت اور اصول کی حمایت کے سلسلہ میں اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔

انھوں نے انگلستان کے کیتھولک آدمیوں کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور ترغیب دی کہ وہ فکر و نظر کی ترقی کے ساتھ ساتھ چلیں۔ انھوں نے ۱۸۵۱ء میں ایک لکچر میں کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ عام لوگ اپنے مذہب سے واقف ہو جائیں، جو اپنی حیثیت کو سمجھیں جو یہ سمجھیں کہ ان کے پاس کیا چیز ہے اور کیا نہیں ہے۔ جو اپنے مذہب سے اتنی اچھی واقفیت رکھتے ہوں کہ اس کی وضاحت کر سکیں اور جنھیں تاریخ کا اتنا علم ہو کہ اپنے مذہب کا دفاع کر سکیں۔

میں چاہتا ہوں کہ عام آدمی اچھی واقفیت رکھتے ہوں۔ آپ اپنے علم کو وسعت دیں۔ استدلال کی قوت بڑھائیں۔ چیزوں کا صحیح طور پر مشاہدہ کریں۔ یہ سمجھیں کہ ایک حقیقت کا دوسری حقیقت کے ساتھ کیا تعلق ہے عقیدہ اور عقلیت کے درمیان کیا تعلق ہے۔ کیتھولک مذہب کی بنیاد اور اصول کیا ہیں۔ اگر آپ ان موضوعات سے واقفیت حاصل کریں تو آپ کی مذہبیت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوگی۔ بشرطیکہ آپ کو اس بات پر اعتقاد ہو کہ آسمان پر خدا موجود ہے اور آپ کی روحوں سے حساب لیا جائے گا اور انھیں نجات حاصل کرنی ہوگی۔"

مگر انگلستان ان کے نصب العین پر پورا نہیں اترا۔ انھوں نے ۱۸۶۳ء میں ایک یادداشت میں شکایت کی کہ "انگلستان کے کیتھولک آدمی اپنے نابینا ہونے کی وجہ سے یہ نہیں دیکھ سکتے کہ وہ نابینا ہیں۔ اس وجہ سے ان کا خیال ہے کہ کیتھولکوں کی حالت اور مرتبہ کو ترقی دینے کے لیے کیتھولکوں کی حیثیت کی استدلالی بنیاد اور فلسفہ اور موجودہ زمانہ کی خصوصیت کے باہمی تعلق کا احتیاط سے جائزہ لینا ان میں وہ معقول خیالات پیدا کرنا اور ان کے دماغوں کو روشن کرنا مختصر یہ کہ انھیں تعلیم دینا فضول مشغلہ ہے بلکہ توہین ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ٹھوس دلائل کی کمی ہے۔ اب شروع سے آخر تک میرا کام یہ ہے کہ تعلیم ان وسیع معنوں میں دی جائے۔"

چونکہ انھوں نے برابر اس قسم کے خیالات ظاہر کیے اس لیے بعض حلقوں میں ان پر طرح طرح کے

اعتراضات کیے گئے۔ زیادہ تعلیم یافتہ کیتھولک کی کم عزت کی جاتی تھی اس وجہ سے انھوں نے سنہ ۱۸۶۲ء میں لکھا "میں محسوس کرتا ہوں کہ اعلیٰ حلقوں میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کلیسا پادریوں اور غریبوں پر مشتمل ہے اور تعلیم یافتہ حصہ کے مردوں اور عورتوں کو ایک سخت بار سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہی لوگ بدعتیں پھیلاتے ہیں اور وہ کیتھولک جماعت سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے اس لئے اگر ممکن ہو تو انھیں تباہ کر دیا جائے۔ اس طرح بڑا فائدہ حاصل ہوگا۔" اس نظریہ کے خلاف ان کی یہ پختہ رائے تھی کہ تعلیم یافتہ لوگوں سے انہی کے مفاد کی خاطر نرمی کا برتاؤ کیا جائے اور ان کا احترام کیا جائے۔ نیز ان سے مصالحت کی جائے کیونکہ دوسرے طبقوں پر ان کا اثر ہے۔ ہم لوگ جنھیں نیا دور دیکھنے کا موقعہ ملا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیومن اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ تعلیمی ترقی کے حامی تھے۔

ان رہنماؤں کا موجودہ کیتھولک مذہب پر بہت اثر پڑا ہے اس وجہ سے وہ ہمارے احترام کے مستحق ہیں۔ انھیں اپنی بڑھی ہوئی روحانیت کی وجہ سے ان باتوں کا احساس ہوا تھا۔ ایک غیر کیتھولک شخص نے جو ان سے کبھی کبھی ملتا تھا ان کے متعلق لکھا ہے "وہ خدائی روشنی سے زیادہ قریب تھے اور یہ قربت بہت کم آدمیوں کو حاصل ہوتی ہے نیز انہیں اس روشنی سے فیض حاصل تھا۔" اس سلسلہ میں فادر اگنیشس رائڈر کی تصدیق خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ وہ ان کے ماتحت بچپن سے کام کرتے تھے اور ۴۰ سال تک کام کرتے رہے تھے۔ انھوں نے بھی اسی قسم کی رائے ظاہر کی ہے لیکن زیادہ موثر اور دوات پیرائے میں "نیومن کی باتوں سے ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خدائے بزرگ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی باتیں لازمی طور پر موثر ہوتی تھیں۔ وہ دوسرے لوگوں کے خلاف بچوں کو نرمی سے سمجھاتے تھے اور ان کے رفیقانہ انداز سے بچوں پر ان کی بات کا جلد گہرا اثر ہوتا تھا:

ہنری بریمنڈ، نیومن کی محو گفتگو خاص طرز اور عمدہ نثر نگاری سے اتنے متاثر نہیں جتنے وہ ان کی کتابوں کے کرداروں سے متاثر ہیں اور انہی کے ذریعہ بریمنڈ نیومن کو حقیقی طور پر سمجھا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ نیومن کی خداداد قابلیتوں اور ذاتی خوبیوں کے علاوہ اس بات کا ان کے اہل وطن پر زیادہ اثر ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت خدا کو حاضر و ناظر محسوس کرتے تھے۔ اس وجہ سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں پر مسلک کے امتیاز کے بغیر ——— ایسا گہرا اثر پڑا جیسا انگلستان میں کسی دوسرے پادری کا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

شاہد کے نام

آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

بادۂ تلخ سے لبریز ہے یہ جامِ حیات
کتنی صدیوں سے جواں ہیں غم و آلامِ حیات
کتنی افسردہ و غمگین سی ہے شامِ حیات
زندگی آج بھی اک بارِ گراں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

نغمۂ شوق کوئی جھوم کے گائے بھی تو کیا!
سر بہ مہر غم کی حکایت ہے سنائے بھی تو کیا
پردۂ جبرِ مشیت کو اٹھائے بھی تو کیا!
کیوں مری سمت یہ حیرت نگراں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

کتنے سینوں میں ہے گھٹتی ہوئی آہوں کا دھواں!
یہ تبسم کا مزار! آہ یہ قلبِ انساں!
چلتی پھرتی ہوئی لاشوں کا یہ مدفن ہے جہاں!
مری نظروں پہ غمِ دہر عیاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

غنچہ و گل کا خزاں بار تبسم بھی اداس
زہرہ و اختر و پرویں کا ترنم بھی اداس
مہ جبینانِ سمن بر کا تکلم بھی اداس
زندگی دردِ مسلسل ہے فغاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

ہر مصیبت میں جو خنداں تھا وہ دل ٹوٹ گیا!
جو ہر اک درد کا درماں تھا وہ دل ٹوٹ گیا!
جو حریفِ غمِ دوراں تھا وہ دل ٹوٹ گیا!
مضمحل اب وہ دلِ گرم و جواں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
اور افسانے بھی ہیں تیری حقیقت کے سوا
فرض کچھ اور بھی ہیں عشرت و راحت کے سوا
زندگی صرف محبت ہی کہاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

جذبۂ عزمِ بغاوت کو جگانے کے لئے!
مادرِ ہند کو آزاد کرانے کے لئے!
تجھ سے جاتا ہوں بہت دور نہ آنے کے لئے!
منتظر کشمکشِ دورِ جہاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!
رخصت! اے دوست کہ منزل نے پکارا ہے مجھے!
رخصت! اے دوست جدائی بھی گوارا ہے مجھے!!
رخصت! اے دوست کہ طوفاں کا سہارا ہے مجھے!!

عزمِ محکم پہ مرے اب بھی گماں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

مجیب خیرآبادی

سٹہ بازی

(۱) حیدر .... سٹہ باز نوجوان
(۲) تراب .... حیدر کا باپ امیر آدمی
(۳) تنویر .... حیدر کی بیوی
(۴) اعظم، اسلم، رستم .... حیدر کے اوباش احباب

بجلی طوفان۔ بادلوں کی گرج۔
(بارش اور ترنم ساز کے ساتھ تیز تیز چلنے کی آواز۔
گھڑی ٹن ٹن گھنٹے مارتی ہے۔ قدم؟ دروازے پر
کھٹکا۔ کھلنے کی آواز)

حیدر۔ تنویر!
تنویر۔ جی! اندر آجائیے بارش تیز ہے۔ (اندر آنے کی
اور دروازہ بند ہونے کی آواز)
حیدر۔ (چلتے ہوئے) ابا نے پوچھا تو نہیں؟
تنویر۔ جی نہیں!
حیدر۔ ابھی تک جاگ رہی تھیں؟
تنویر۔ جی! نہیں تو!۔
حیدر۔ جھوٹی! تمہاری آنکھیں بتلا رہی ہیں۔ کتنی بار کہا
میرا انتظار نہ کیا کرو۔ راتوں کو دیر گئے آنے
کا عادی ہوں۔
تنویر۔ کھانا نہیں کھائیے گا؟
حیدر۔ ہوٹل میں کب کا کھا چکا!
تنویر۔ گھر سے زیادہ آپ کو باہر کی چیزیں بہت پسند
آتی ہیں؟
حیدر۔ تم نے کھانا نہیں کھایا؟
تنویر۔ آپ کو اس سے کیا!
حیدر۔ خفا معلوم ہوتی ہو؟
تنویر۔ میں شروع ہی سے بدنصیب ہوں۔

حیدر۔ اور ــــ کیا کہتی ہو!!
تنویر۔ میں آپ کے لائق نہیں تھی۔
حیدر۔ تنویر! کیا ہو گیا تمہیں؟
تنویر۔ جب ہی تو آپ راتوں کو باہر باہر رہتے ہیں۔
حیدر۔ مجھے غلط نہ سمجھو تنویر!
تنویر۔ تنویر! خود سراپا غلط ہے۔ کاش! مجھ میں وہ
سب کچھ ہوتا جو کسی اور میں ہے۔
حیدر۔ تنویر!! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اتنا نیچ نہیں ہوں
تنویر۔ (گلوگیر آواز میں) پھر کہاں رہتے ہیں آپ؟ برسات
کی بھیگی راتیں۔ چاندنی دلفریب چاندنی کیسی پُرسکون
ہوگی؟ کیوں اداس ہو گئی؟
حیدر۔ بس کرو تنویر! تم کافی بدگمان ہو چکی ہو میں سب کچھ
بتا دوں گا۔ لیکن وعدہ کرو ابا جان سے کچھ نہ کہو گی!
تنویر۔ منع کرنے کے بعد میری کیا مجال ہو سکتی ہے۔
حیدر۔ تم دیکھو گی میں عنقریب دولت مند آدمی بن جاؤں گا
سٹو سونار کی چل رہی ہے ایک لوہار کی چلنے بس اسی کا
انتظار ہے۔
تنویر۔ میں کچھ بھی نہیں سمجھی۔
حیدر۔ میں نے کہا ــــ دولت بہت جلد ہمارے گھر کی لونڈی
ہو جائے گی۔
تنویر۔ لیکن دولت تو دن کے وقت کمائی جاتی ہے؟
حیدر۔ یہ کھیل ہی ایسا ہے جو رات کی تاریکی میں ہوتا ہے۔
تنویر۔ او خدا!! مجھے تو آپ سے ایسی امید نہ تھی۔ خدا کے لئے
ایسا غضب نہ ڈھائیے۔ اپنا نہیں تو ابا جان کی
عزت کا خیال کیجئے۔ ان کو دنیا میں منہ دکھانے
کے لائق رکھئے۔
حیدر۔ بے وقوف پاگلوں کی طرح کیا بک رہی ہو؟ میں چوری
تھوڑی کر رہا ہوں۔
تنویر۔ خدا نہ کرے۔ لیکن شریف لوگ دن کے وقت دولت
کمانے کی فکر کرتے ہیں نہ کہ رات کے اندھیرے میں۔

حیدر۔ لیکن سٹہ تو......

تنویر۔ (بات کاٹ کر) سٹہ!! ــــ سٹہ کھیلتے ہیں آپ؟

حیدر۔ ہاں اور سٹہ بازوں کی قسمت کا فیصلہ رات کی تاریکی میں ہوتا ہے۔

تنویر۔ جو دولت اندھیرے میں آتی ہے وہ اندھیرے میں رہتی ہے اور اندھیرے ہی میں جاتی ہے
حیدر! خدا کے واسطے اسے چھوڑ دو۔ بُری لت ہے بیکار عادت ہے۔ تباہ کن مشغلہ ہے۔ اس نے ہزار ہا گھرانے بے چراغ کر دیئے۔ غریبوں کو کنگال اور امیروں کو افلاس کے گندے کیچڑ میں ٹھونس کر رکھ دیا۔

دروازے کو زور زور سے مارنے کی آواز ــــ

تراب۔ (باہر سے) دولہن بیٹی دروازہ کھولو!

تنویر۔ او خدا! ابا جان!!! (سرگوشی کے انداز میں)

حیدر۔ جاگ رہے تھے؟!

تنویر۔ شاید۔

تراب۔ دروازہ کھولو بیٹی! دولہن بیٹی!

تنویر۔ جی! آئی ابا جان۔

حیدر۔ تنویر! میں سو جاتا ہوں

تنویر۔ (چیختے ہوئے) اچھا۔ اچھا (دروازہ کھلنے کی آواز ــــ بھاری بھاری قدم اندر داخل ہو جاتے ہیں)

تراب۔ حیدر! کب آیا؟

تنویر۔ جی وہ ــــ جی وہ تو جب ہی......

تراب۔ یعنی کب؟!

تنویر۔ یعنی۔ یعنی۔ کوئی نو بجے کے قریب۔

تراب۔ کیا کہنا؟ دولہن بیٹی! کیا تمہارا خیال ہے کہ جب کوئی بوڑھا ہو جائے تو اس کو دھوکہ دینا یا غلط باور کروانا اتنا ہی آسان ہے جتنا ایک معصوم بچے کو۔

تنویر۔ نہیں۔ نہیں ابا جان!! لیکن؟؟

تراب۔ بنانے کی کوشش نہ کرو۔ وہ نالائق تمہاری نظروں میں سراپا محبت ہے اس لئے تم اس کا ہر عیب چھپانا چاہتی ہو۔ چونکہ میں اس کا باپ ہوں اس کو سراپا محبت سمجھنے کے علاوہ اس کے اپنے روپ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں ــــ حیدر!!

حیدر۔ (گھبرا کر) جی ابا جان!

تراب۔ کہاں۔ رہتے ہو برخوردار راتوں کو؟

تنویر۔ ابا جان آج تو میں نے بھیجا تھا انہیں۔

تراب۔ اچھا کل رات یہ کیوں غائب تھے؟

تنویر۔ کل رات ــــ کل رات تو۔

تراب۔ ہاں ہاں کہہ دو سینما گئے تھے۔ پرسوں آلکمیں شریک تھے ترسوں ڈانس پارٹی میں مدعو کئے گئے تھے۔ حیدر! آج میں صاف طور پر جاننا چاہتا ہوں۔ کیا تم دولہن بیٹی سے ناراض ہو؟

حیدر۔ بالکل نہیں۔

تراب۔ کیا دولہن بیٹی تم سے ناراض ہے۔

حیدر۔ یہ بھی نہیں۔

تراب۔ پھر تم آوارہ باش کی طرح راتوں کو کیوں بھٹکتے پھرتے ہو۔ کون چیز ہے جو تمہاری نیند حرام کر دیتی ہے۔ راتوں کو گھر میں ٹکنے نہیں دیتی۔

حیدر۔ کچھ بھی تو نہیں ابا جان۔

تراب۔ برخوردار ٹال مٹول سے کام نہیں چلے گا۔ بتاؤ وہ چار سو روپیوں کا کیا کیا جو تم کو پرسوں بینک میں جمع کرانے دیئے تھے۔

حیدر۔ چار سو روپے۔ ابا جان وہ۔ وہ تو۔

تنویر۔ وہ تو میرے پاس محفوظ ہیں۔

تراب۔ جھوٹ مت بول لڑکی۔ میں اس مردود کو خوب جانتا ہوں۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ سٹہ کھیلنے لگے ہیں برخوردار۔ ایک دن ہمارا خاندان خراب کریں گے۔ ایک دن ہماری مکمل بربادی کر کے رہیں گے۔ پھر کیوں نہ وقت سے پہلے ان کو کان پکڑ کر باہر

نکال دیں تاکہ دنیا کی ٹھوکریں کھا کھا کر خود اپنا راستہ
ڈھونڈنے کے قابل ہو جائیں۔

حیدر۔ اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو بندہ ہر طرح تیار ہے۔
تنویر۔ چپ رہئیے! بڑوں کے منہ نہیں لگتے۔ ابا جان
انہیں معاف کر دیجئے۔ یہ نادانی کرتے ہیں۔
تراب۔ دکھی کیوں ہو بیٹی۔ حیدر نے کوئی بدتمیزی نہیں
کی اچھی باتیں کہہ رہا ہے۔ کتنی ہمت آگئی اس میں۔
کتنے بلند ہو گئے اس کے حوصلے۔ وہ انسان ہی کیا
جس کو اپنے مستقبل کا خیال نہ ہو۔ آخر اپنے پیروں پر
کھڑا ہونا بھی تو ہے۔ میرا تو چل چلاؤ ہے آج ہوں
کل نہیں۔ حیدر کچھ روپیہ تم کو اد دوں گا۔ اسی سے
اپنی زندگی سنوارو۔ اپنے آپ کو کام کے اہل ثابت کرو
یہ تمہارا امتحان ہوگا اگر کامیاب ہو جاؤ تو میری
ساری کائنات تمہاری ہے۔ ہاں جب تک
تمہاری حالت درست نہ ہو جائے دولہن بیٹی
یہیں رہیں گی۔
تنویر۔ لیکن ابا جان!
تراب۔ اپنے فرض کا خیال ہے۔ اچھا تم بھی جاؤ۔ تم اپنا
فرض ادا کرتی رہو۔ میں اپنا فرض ادا کرتا رہوں گا
——— خدا حافظ۔ (تیز تیز قدموں سے جانے کی آواز
ایک سال)
تنویر۔ کیا کہہ دیا تم نے؟ کیا کرو گے الگ جا کر؟ [illegible]
اب کیا ہوگا؟؟
حیدر۔ ویسا ہی ہوگا جو ابا جان نے کہہ دیا!

(ایک ساز جس سے گھبراہٹ اور غم کا اظہار ہوتا ہے۔)
داستان گو۔ حیدر باپ کے گھر سے نکل کر سٹہ بازی کے سہارے
اپنی زندگی بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن سٹہ بازی
جو انسانیت کے لئے مرض دق سے زیادہ خطرناک
ہے۔ حیدر کی شرافت عزت دولت کو اندر ہی
اندر کھا گئی۔ وہ گمراہی کے سمندر میں ڈوبتا گیا۔
بدکاروں کی صحبت نے اسے مستقبل سے بالکل بے نیاز کر دیا
روز بروز اس کی عزت ذلت کے [illegible] گئی۔
تراب الگ تھلگ بیٹھے بیٹے کی بربادی کا تماشا دیکھتے اور
خون کے گھونٹ پی کر چپ سادھ لیتا۔ عورت دو چار
تنویر کا زیور سٹے کی نذر کرنے کے بعد آج پہلی
مرتبہ حیدر کے گھر اناج نہیں تھا۔ سننے وہ بھوکا پیاسا
شام کو لوٹ کر دروازہ پیٹ رہا ہے۔ ناعاقبت
اندیش (دروازہ پر کھٹکا کھلنے اور بند کرنے کی آواز
زم سا سناٹا اوٹ ———)
حیدر۔ تنویر کھانا کھا لیا تم نے؟
تنویر۔ آپ تو ہوٹلوں میں کھا چکے ہوں گے۔
حیدر۔ لیکن گھر کے پکوان میں بھی میرا حصہ ہونا چاہیئے۔
تنویر! تم بھی مصیبت کے وقت ذلیل سمجھ رہی ہو۔
تنویر۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ جب اناج ہی نہ ہو تو کھانا
کہاں سے پکے چولہا کیسے جلے؟
حیدر۔ یعنی آج ہم کو فاقہ کرنا ہوگا۔ او خدا کتنا گر گیا میں کیا کرنا
تھا۔ کیا کرنا چاہیے۔ کیا کرنا ہوگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا
کچھ نہیں آتا۔ کچھ نہیں آتا۔
تنویر۔ ابا جان نے ہم کو علیحدہ اس لئے کیا تھا کہ آپ کو اپنی
ذمہ داریوں کا احساس ہو۔ سنبھل کر اپنی راہ بنانا
آپ کرنا سیکھ جائیں۔
حیدر۔ بکومت۔ میں ابا جان کو صورت بتانے کے لائق نہیں
ہوں۔ تم جا سکتی ہو۔
تنویر۔ اسے جا کر ابا جان کی نظروں میں ذلیل ہونا نہیں چاہتی
کوشش! پہلے کی نہیں آتی۔
حیدر۔ (اپنی دھن میں) سنا ہے سنار کی ایک لوہار کی۔ آخر
کب تک سنار کی چلتی رہے گی۔ لوہار کو بھی گھمن لگانی
ہو گی۔ ضرور لگانی ہوگی۔ صرف ایک گھمن بالکل ایک۔
سب کسر نکل جائے گی سارا افلاس دور ہو جائے گا۔
پھر ایک بار ہم ابا جان کو منہ دکھلانے کے لائق ہو جائیں گے۔

تنویر۔ تمہارا زیور تو دے دو جو کچھ ہو دے دو۔ میں آخری بازی لگانا چاہتا ہوں بالکل آخری —

تنویر۔ بس اسی دیوانی امید نے ہم کو بربادی تک پہنچا دیا۔ آنکھیں کھولو حمید! اب بھی وقت ہے آپ کا ساتھ اگر پکا ہو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔

حمید۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اپنا زیور دے دو۔

تنویر۔ باقی ہی کیا رہ گیا ہے!

حمید۔ جو کچھ بھی ہو حوالے کر دو۔

تنویر۔ تمہیں بربادی کا احساس کیوں نہیں ہوتا ہوگا حمید!

حمید۔ اس کا بھی وقت ہوتا ہے طوفانوں میں گھر کر تنکے کے سہارے کنارے کی امید کرنا پاگل پن ہے آخری بالکل آخری بازی لگانا چاہتا ہوں۔

تنویر۔ وعدہ کرتے ہو۔؟

حمید ر۔ قسم کھاتا ہوں یہ بازی بالکل آخری ہوگی کب تک سسکتی چلتی رہے گی۔ تو بار کو برسنا ہوگا گھن لگانی ہوگی۔ لا ؤ تنویر! دے دو تمہارا زیور۔

تنویر۔ یہ انگوٹھی ہماری شادی کی ایک ہی یادگار رہ گئی تھی۔

حمید ر۔ ڈرو نہیں یہی انگوٹھی ہماری زندگی کے انقلاب کی یادگار ہوگی۔

تنویر۔ یہ لیجئے۔

حمید ر۔ تم کتنی نیک ہو واقعی تمہاری مصیبت کا باعث میں ہوں صرف میں!

تنویر۔ آپ میرے لئے سب کچھ ہیں۔

حمید ر۔ اچھا خدا حافظ (چلنے کی آواز)

تنویر۔ خدا حافظ جلد آئیے گا — ارے ہاں سنیے!!

حمید ر۔ (ٹھیر کر) کہو۔

تنویر۔ وہ آپ کے کتنے دوست؟

حمید۔ کون؟ اسلم، اعظم، رستم۔

تنویر۔ جی! بڑے خود غرض اور بیہودہ معلوم ہوتے ہیں بہتر ہے آپ ان کے مشورے اور صحبت سے پرہیز کیا کریں۔

حمید۔ بس اتنی سی بات — اچھا میری سرکار آپ کا حکم سر آنکھوں پر دروازہ بند کر لو — خدا حافظ (نرم ساز کے ساتھ چلنے کی آواز اور دروازہ بند کرنے کی آوازیں۔ دروازے پر چرچراہٹ — ٹھا ور شٹ۔

تنویر۔ پھر آگئے آپ (چلتے ہوئے) شاید ٹوپی بھول گئے (دروازہ کھلتا ہے ایک بری آواز سے تیز اور تیکھا ساز)

تنویر۔ کون؟؟؟

(اسلم داخل ہوتے ہوئے) اسلم ہا ہا ہا ہا۔
(اعظم داخل ہوتے ہوئے) اعظم ہو ہو ہو ہو۔
(رستم داخل ہوتے ہوئے) رستم ہی ہی ہی ہی

تنویر۔ وہ گھر میں نہیں ہیں۔!

اسلم۔ ہم جانتے ہیں۔

تنویر۔ پھر کیوں آئے آپ لوگ؟

رستم۔ آپ سے ملنے۔

تنویر۔ میں ان کی غیر موجودگی میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی مہربانی فرما کر آپ لوگ چلے جائیے۔

اعظم۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جانے کے لئے نہیں آئے۔

تنویر۔ فوراً چلے جائیے۔

اسلم۔ محترمہ ہم اپنا فطری حق طلب کرنے آئے ہیں۔

تنویر۔ ایک غیر عورت سے اپنا حق طلب کرتے ہوئے شرم نہ آئی۔

رستم۔ دنیا کے ایک بہت بڑے فلسفی کا قول ہے کہ زر، زمین، زن کسی کی ملک نہیں ہوتی۔

اعظم۔ اور اس اصول کی رو سے تم صرف حمید کی یا حمید صرف

تھارا احسن کا دھیان نہیں کرتے۔

تنویر۔ بدمعاش!! ذلیل کہیں کے۔ شرم آنی چاہیے جس کو بہن کہہ کر منہ سوکھاتے تھے آج اس کے ساتھ ایسا سلوک۔

اسلم۔ دیکھئے ہمارے فلسفی نے صرف ان کے لئے نسخ فرمایا ہے ورنہ ہر عورت ہر مرد کی ملکیت ہے۔

تنویر۔ افسوس! تمہارے فلسفی نے ہماری ماں پر کیوں ظلم ڈھایا اس کو بھی ہر قید سے آزاد کر دیا ہوتا۔

رستم۔ جانے کس موڈ میں تھے گئے ورنہ فطرت کی رو سے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ خیر ہم آپ کی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔

تنویر۔ پھر تو جانور بھی آپ کی شرم و حیا پر آنسو بہانے لگیں گے۔ خدا آپ کو نیک ہدایت دے۔

اسلم۔ خدا ــــ خدا ہمارے فلسفی کے پاس کوئی مقام نہیں رکھتا۔ ہماری پیدائش ڈاروِن کے نظریے کی رو سے ہوئی ہم خود بخود بندر سے انسان بنے۔ ایسی صورت میں خدا کیا حقیقت رکھتا ہے۔

تنویر۔ جب ہی تو آپ کا بندر پن فطرت انسان کو حیوانیت کی طرف لیجا رہا ہے۔ پاجی بدمعاش چلے جاؤ یہاں سے۔

تینوں۔ (ایک آواز) کیا کہا ؟؟؟

تنویر۔ نکل جاؤ یہاں سے!

اعظم۔ اچھا ــــ اسلم لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے

رستم۔ جانتی ہو! جب بھونرہ پھول پر آتا ہے تو پھول اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ ہم آغوش ہونے پر مجبور ہے۔

اسلم۔ حسین دلربا۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر اچھا نہیں۔ ہم تمہیں ہر قیمت پر حاصل کرنے آئے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ موت سونا بچا ہے۔

(بھاری بھاری قدموں کی بڑھنے کی آواز خوفناک سماں)

(پریشان ہوکر) نہیں۔ ٹھہرو! میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میں خود بدل جانا چاہتی ہوں۔ بدل جاؤں گی۔ ہاں ضرور بدل جاؤں گی۔ مجھے اس زندگی سے نفرت ہوگئی ہے۔

اسلم۔ اب آئیں رستے پر۔

تنویر۔ ہاں دیکھو گے میرا رستہ مجھے بہت بلندی پر لے جائے گا۔ میرا مقام بہت بلند ہو جائے گا۔

اعظم۔ ہاں بلند۔ بہت بلند۔ آسمان سے بھی زیادہ بلند ہو جاؤ

رستم۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہر چیز نیا روپ دھار رہی ہے

تنویر۔ ہر چیز نیا روپ دھار رہی ہے۔ انسانیت بھی کروٹ لے رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دن اور اس ذلت کی زندگی میں گزارنے ہوں گے۔ لیکن نہیں میرا وقت آگیا۔ میں سب چھوڑ دوں گی۔ ہاں سب چھوڑ دوں گی

اسلم۔ ایک دم چھوڑ دو تاکہ دنیا تمھاری ترقی دیکھ کر دنگ رہ جائے۔

تنویر۔ میں کوشش کروں گی۔ دنیا کو میری جرأت دیکھ کر حیرت ہو۔ مجھے اچھے نام سے یاد کرے۔ باوفا عورت کے نام سے یاد کرے۔

اعظم۔ انسان کچھ کھو کر ہی پاتا ہے۔

تنویر۔ میں بھی اپنا سب کچھ کھو کر وہ سب کچھ پالوں گی جو عورت کے لئے لازم ہے جو ایک مسلم عورت کے شایان شان ہے۔

رستم۔ تم بھول گئیں ہم مسلم نہیں ہیں۔

تنویر۔ کوئی ہوں۔ ہماری فطرت مسلم ہے ہر عضو مسلم ہے ساری کائنات مسلم ہے۔

اسلم۔ ہوگی! فی الوقت ان باتوں کا وقت نہیں آؤ ہماری زندگی کو رونق بخشو۔ دل بہلاؤ ہمارا آؤ شراب بن کر آؤ اور ہماری ہستی پر چھا جاؤ۔

تنویر۔ بغیر شراب کیا مزہ آئے گا؟

جان دیدی۔ (لڑکھڑا کر گرنے کی آواز) بیٹی!

تنویر۔ چراغ جلائیے اباجان۔ اندھیرا ہوگیا۔ کچھ دکھائی نہیں۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ (آواز بتدریج کم ہوجاتی ہے)

تراب۔ بیٹی —— دولہن بیٹی (دیا سلائی جلانے کی آواز) بیٹی کیا ہوگیا تجھے او خدا تیرا چہرہ کیوں سیاہ پڑ گیا۔ یہ کیا کیا۔ زہر پی لیا تو نے؟؟ بیٹی —— بیٹی۔ اب میں کس کے سہارے جیوں گا؟ کون ہے میرا؟

تنویر۔ (رکتے ہوئے) اباجان۔

تراب۔ حیدر نے موٹر کے نیچے آکر خودکشی کر لی۔ تو نے زہر پی لیا۔

تنویر۔ حیدر نے خودکشی کر لی؟ وہ بھی چلے گئے۔ اب مجھے تنہائی کا ڈر نہیں۔ موت کو خوشی سے قبول کروں گی۔

تراب۔ (روتے ہوئے) بیٹی میں تباہ ہوگیا۔ میری دنیا تاریک ہوگئی۔ سٹہ بازی نے بڑھاپے کا سہارا چھین لیا۔ میں کہیں کا نہ رہا۔ میرا بچہ۔ میرا خون میری تمنا۔ میری زندگی (رونے کی آواز سن کر) آپ روتے ہیں؟ باپ ہو کر روتے ہیں؟ حیدر ہمیشہ ہارتے رہے کبھی افسوس نہ کیا۔ ہمیشہ سوسنار کی ایک لوہار کی فکر کرتے رہے۔ مجھے، بچے سٹہ بازوں نے ہوس کی بازی لگائی تھی جس سے میں نے زندگی دیکر ایک آبرو کو بچایا۔ میں زندگی دیکر بھی نہیں روتی کیونکہ میں جیت گئی دنیا ہار گئی۔ لیکن آپ ہار کر رونے لگے۔ ایک ہی بازی میں سب کھو دیا

تراب۔ بازی۔ میں نے کب بازی لگائی تھی۔ کب کھیلا تھا سٹہ میں نے؟ بیٹی!

تنویر۔ بھول گئے۔ آپ نے بہت بڑی بازی لگائی تھی جس اولاد کا ذمہ دار باپ رہبری چھوڑ دے اس کی خدا بھی رہنمائی نہیں کرتا۔ حیدر کو گمراہ چھوڑ کر آپ نے راہ راست کی امید کی تھی۔ کیا یہ اچھائی اور برائی کے سٹہ میں اولاد کی بازی نہیں تھی۔ اولاد کی بازی! بہت بڑی بازی لگائی تھی آپ نے سب کچھ لگا دیا تھا۔ سب ہار بیٹھے۔ کچھ نہ رہا سب کھو دیا کچھ نہ رہا کچھ نہ رہا۔

(آواز بتدریج کم ہوجاتی ہے)

تراب۔ بیٹی۔ بیٹی۔ خاموش ہوگئی؟ چلی گئی؟ سچ سچ کچھ بھی تو نہ رہا۔ سب تباہ ہوگیا۔ سارا برباد ہوگیا۔ میں سٹہ باز ہوں؟۔ میں نے حیدر کی بازی لگائی تھی؟ نہیں نہیں جگر کا خون دے دے کر اس کی زندگی سنواری تھی۔ چاند سی دولہن بیاہ لایا تھا۔ پھر ایسا کیوں میں نے ان کی بازی کیوں لگا دی؟ نہیں نہیں باپ کے اعمال کا باپ ذمہ دار نہیں۔ کوئی اور طاقت ہے کوئی اور اقتدار ہے لیکن میری بربادی مظلوم باپ کی مظلوم آہیں۔ امراد تمنائیں بے خبر اقتدار کا خاتمہ کر دیں گی۔ آسمان ٹوٹے گا۔ بجلیاں گریں گی۔ زلزلے آئیں گے دیکھو ہوشیار ہوجاؤ! مجبور! ان انقلاب کی چنگاری کو سرخ بنا رہی ہیں۔ ایک دن سب بھسم ہوجائے گا۔ ختم ہوجائے گا۔ بھسم ہوجائے گا بھسم ہوجائے گا۔ آ ہا ہا ہا ہا کچھ بھی نہ رہا۔ سب مٹ چکا آ ہا ہا سب مٹ گیا۔ آ ہا ہا ہا ہا (ایک غمگین ساز) ——— فیڈ آؤٹ!

تلاوت یداللٰہی

کہتی لگا گلی سے تو دانڈو اگل کی توڑ لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے کرار بڑے اور کھڑ بڑے اور ما گلے اور مھور لے

(۱۵) گن ایک کا بابا کچھ پکڑ معرفت کو تحقیق کر یعنی سمجھ تحقیق تو ہے نہتا کچے پیڑ و جڑ
پھر دو کی پیتی کر فنحی اللہ محمد یک دگر مرشد سے لے گن تمن تو اسمی یداشک پکڑ

پھر چار لے گھوڑے پہ چڑ اسب نفسوں کو گھیر لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۱۶) گن پانچہ میں پنجہ من خدا اور گن خدا میں پنجتن اس پانچہ میں پنج گنج گن گن شش جہت چودہ تن

اس راز کو مت فاش کر برقعہ حیا کا اوڑ لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۱۷) سب شش جہت کو دید میں ڈانڈو سے گن کر آنکھ لے اس کے سوا جو ہو عدد دل کی اگل میں جھانک لے
پھر سب خدائی سات میں گن ایک جھلا ٹانک لے اس ایک میں پھر دیکھ تو دو نو جہاں لولاک لے

چودہ طبق ارض و سماں وہاں لہا گئے اور تھور لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۱۸) سب لہا گئے اور تھور لے چھوٹے بڑے سب ایک جا تو جب خبر اس کھیل کی پہونچا سے ہر ایک جا بجا
اس وقت سارے مولوی شیخوں کے تئیں بلوا بجا تب جیت کا وذنفس دے فتح کا طبلہ بجا

پھر خلق سب ہو گی جمع آواز سن گھمن گھور لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۱۹) آواز یہ جب فتح کا ملکوں کے اوپر جائے گا گوکل ستے بندر بن سے لے کو بال گرد ہرائے گا

مرلی بجاتا ناچتا سنگ گاؤ گوروڈ ہور لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۲۰) پھر سب کتیں یکہ شاہدی نفس عدو سے آج لے سب کا بھی اس سے ... ہر وقت اپنے کاج لے
ٹوپی اوڑا اس نفس کے سر پر ادب کا تاج لے اقرار کر کر چھوڑ دے مت سب میں اس کی لاج لے

اطاعت کا لگا کر ... تو گل کھوڑ لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۲۱) مرحبا اس شخص پر جو نفس پر سر بر ہوا کر نفس کو زیر و زبر کیا نامور اکور ہوا
جس کھیل سے ہے عشق کا دل میں شہر کے شہرہ ہوا وہ کھیل سارے کھیل کے دفتر کا سر دفتر ہوا

جس کھیل کا جن و ملک گئے آسمان پر شور لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

۴ سمل جا تجے کتیں پھراوے نہ آدل — سبھے کئیں یہ دنیا بھولاوے نہ اے دل
کہیں دل ترے سے رگا دے نہ آدل — دوا بر ماکے تجھ کو کھلاوے نہ اے دل
وہ میوہ متر تجھ کو فتر کی ڈالی
تو جا کھیل اے دل کنب کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا تن کی پہلی

۵ ہے چوسر بھی جیو چہار کنج پنچ آنور — دھرے اس کے بازی پو کئی گنج آنور
تو لالچ نہ کر اس کی دم سا پنچ آنور — یہ دنیاں کی ہے سخت شطرنج آنور
لے اپنے زیارت کی سوتی وگلی
تو جا کھیل اے دل کنب کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا تن کی پہلی

شادی کی مبادکبادی

یارب مری مرادیں سب یہ حصول ہوئے — شادی ہو یہ مبارک عرض قبول ہوئے
نصریں لنگار کنگنا باندھوں ہیں اس سب کو — گو ہر راہ میں جس کے زہرا نزول ہوئے
خورشید زلف ہر ایک زر تار ہر لڑی میں — ماہ مہ جبنے کے سہرے کے پھول ہوئے
ایام شادمانی نت رہ بنا بنی پر — ہرگز کبھی نہ ان کی خاطر ملول ہوئے
بنڑے کی مشکلاتیں مشکل کشا کو سونپا — بنڑی کے سر پہ دائم دست بتول ہوئے
کر عمر کی درازی اسطوران کی یارب — دن خوش ہزار سالہ شب عیش طول ہوئے
شاہد وکیل جن کے ہوئے امام ضامن — آنور مشاہدی میں شاید رسول ہوئے

سید محمد بیدی

ہندوستانی تمدن

پروفیسر ڈاکٹر ایشوری ٹوپا ڈی فل پروفیسر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ

یہ تقریبا پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کجا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی جو لوگ قدیم ہندوستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کو ضرور پڑھیں۔

صفحات (۳۴۰) قیمت سے

ملنے کا پتہ
سب رس کتاب گھر خیرت آباد سے طلب فرمایئے۔

زندگی

(منشی پریم چند کا لکھا ہوا)

ہندو فلسفہ میں قنوطیت کی جھلکیاں ہیں۔ بدھ مذہب
میں بھی دکھ کے سوا کچھ نہیں، اور عیسائی مذہب کا بھی یہی حال
ہے۔ انسان ابتدا ہی سے سکھ کی کھوج میں رہا ہے اور
اس کا حصول اس کی زندگی کا خاص مقصد رہا ہے۔ دکھ سے
وہ اتنا گھبراتا ہے کہ اس زندگی ہی میں نہیں بلکہ آنے والی
زندگی کے لئے بھی ایسا انتظام کرنا چاہتا ہے کہ وہاں بھی
وہ سکھ چین کا تصور کر سکے۔ جنت اور سورگ، نجات اور
نروان سب اسی آرزو کی پیداوار ہیں۔ سکھ کے حاصل کرنے
کے لئے ہم نے زندگی کو ڈھلتی پھرتی چھاؤں اور دنیا کو فانی
کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب زندگی
کو ثبات ہی نہیں اور دنیا فانی ہے تو پھر کیوں نہ اس سے
منہ موڑ کر بیٹھیں؟ مگر ہم نے آج تک اس پر غور ہی نہیں کیا
کہ ہم کیوں مغموم ہوتے ہیں؟ وہ کونسی ذہنیت ہے جو ہمیں
غم کی جانب لیجاتی ہے؟ آج ہم اس سوال پر غور کریں گے
اور دیکھیں گے کہ اس اندھیارے میں کہیں اجالا بھی نظر
آ سکتا ہے یا نہیں۔

دکھ کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک تو وہ سخت قدیم
قوانین ہیں جن میں ہم نے اپنے کو اور سماج کو جکڑ رکھا ہے، دوسرے
وہ شخصی الجھنیں ہیں جو ہمارے دل کو الجھائے رکھتی ہے، اور اس
میں باہر کی ہوا اور روشنی کو جانے نہیں دیتیں۔ ان قدیم بندشوں
سے تو ہم اس وقت بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ان کی اصلاح
ہمارے بس کی بات نہیں، کیونکہ ان کا دارومدار تو اس پورے
نظام پر ہے۔ البتہ شخصی الجھنیں ہمارے بس کی بات ہیں اور
ہم اپنا خیال یہیں تک محدود رکھیں گے۔

اکثر ایسے لوگ بہت کبیدہ خاطر دکھائی دیتے ہیں
جو بےاعتدالی کے باعث اپنی صحت کھو بیٹھتے ہیں، یا جن کے
پاس مال و دولت کی کمی ہے۔ لیکن درحقیقت دیکھا جائے تو
مسرت کے لئے نہ دولت کی ضرورت ہے نہ صحت کی۔ کئی متمول
دکھی ہیں اور کئی بیمار خوش ہیں۔ سکھی جیون کے لئے دل کا
صحت مند ہونا نہایت ضروری ہے مگر اس کے لئے بیمار نہ ہونے
والا جسم بھی لازمی ہے۔ سب ہی تو رشی نہیں ہوتے جانتو
اور صحت مند جسم اور دل میں علت و معلول کی نسبت ہوتی ہے
گر ایک معمولی انسان عقل سے کام لے اور صحت مند زندگی کی
طرف سے آنکھیں نہ بند کرلے تو وہ اپنے جسم کو امراض سے محفوظ
رکھ سکتا ہے۔ جسم ایک مشین ہے۔ اسے جس طرح کوئلے پانی کی
ضرورت ہے اسی طرح اس سے کام لینے کی ضرورت ہے۔
اگر ہم اس مشین سے کام نہ لیں تو بہت تھوڑے دنوں میں اس کے
پرزوں میں زنگ لگ جائے گا۔ مزدوروں کے لئے تو یہ سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ ان لوگوں کے لئے جو گدی یا کرسی پر
بیٹھ کر کام کرتے ہیں کسی نہ کسی ورزش کی سخت ضرورت
ہے۔ کرکٹ اور ٹینس کے لئے ہمارے پاس اسباب نہیں نہ ہوں
تو کیا ہم اپنے گھر میں سو پچاس ڈنڈ بیٹھک بھی نہیں لگا سکتے؟
اگر ہم اپنی صحت کے لئے ایک گھنٹہ بھی نہیں دے سکتے تو اس کا
یہ صاف مطلب ہے کہ ہم سکھ کو ٹھوکروں سے مار کر اسے
اپنے ہی دروازے سے بھگا دیتے ہیں۔

کھانے کا سوال بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کونسی چیز
کس طرح اور کتنی کھائی جائے؟ اس بارے میں بیوقوفوں سے
زیادہ عقلمند غلطیاں کرتے ہیں۔ اکثر ایسے ملیں گے جو اس معاملے
میں بالکل کورے ہیں۔ زندگی کا سب سے بڑا کام ہے کھانا،
اسی پر تو دنیا کا سارا چکر چلتا ہے اور اسی کے بارے میں ہم
کچھ نہیں جانتے۔ بچوں کا پہلا سبق پیسے اور بڑوں کا کھانے سے
شروع ہوتا ہے۔ یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے اور ہم اس سے
بے خبر ہیں کہ ہماری صحیح نشوونما اور ترقی کا راز کھانے میں ہے۔

رنج کا بڑا سبب ہے اپنے آپ میں غرق رہنا۔ ہمیشہ اپنے
ہی بارے میں سوچتے رہنا۔ ہم یوں کرتے تو یوں ہوتے۔ وکالت
پاس کر کے مٹی خراب کی۔ اس سے کہیں اچھا ہوتا کہ نوکری کر لی
ہوتی۔ اگر نوکر ہیں تو یہ افسوس ہے کہ وکالت کیوں نہ کرلی۔

لڑکے نہیں ہیں تو یہ فکر مارے ڈالتی ہے کہ لڑکے کب ہوں گے۔ لڑکے ہیں تو رو رہے ہیں کہ یہ کیوں ہیں؟ یہ بچے نہ ہوتے تو کتنے آرام سے زندگی کٹتی۔ کئی ایسے ہیں جو اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں۔ کوئی ماں باپ کو کوستا ہے جنہوں نے ان کے گلے میں زبردستی جوا ڈال دیا۔ کوئی ماموں یا چچا کو جنہوں نے یہ رشتہ جوڑا تھا۔ اب ان کی صورت بھی انہیں پسند نہیں۔ بیوی سے آئے دن ٹھنی رہتی ہے۔ وہ سلیقہ نہیں رکھتی۔ میلی ہے، پھوہڑ ہے، بدمزہ ہے، محرّمی ہے، جب دیکھو منہ لٹکائے بیٹھی رہتی ہے۔ یہ نہیں کہ شوہر صاحب دن بھر کے بعد گھر میں آئیں تو ایک دم ان کے گلے سے لپٹ جائے۔ اس گروہ میں زیادہ تر وہ ہیں جو نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سے ہیں۔ دوسروں کی بیویوں کو دیکھ کر اپنی قسمت کو روتے پیٹتے ہیں۔ وہ کیسی سلیقہ مند ہے۔ کتنی ہنس مکھ۔ کتنا خیال رکھنے والی۔ دن رات بیچارے اسی خیال میں مبتلا رہتے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی تعریف کرتی رہے۔ خود جب موقع پاتے ہیں اپنی تعریف شروع کر دیتے ہیں۔ وہ خود کسی کی تعریف نہیں کرتے۔ کسی سے محبت نہیں رکھتے۔ لیکن آرزو ہے کہ دنیا ان کے آگے سر تسلیم خم کرکے کھڑی رہے، ان کے گن گائے۔ وہ اس فکر میں گھلے جاتے ہیں کہ دنیا ان کی قدر نہیں کرتی۔ اس کے باعث ان کے کردار میں حسد آجاتا ہے اور ایسے لوگ تو گھر گھر ملیں گے جو ننانوے کے پھیر میں پڑ کر زندگی کو مستقل عذاب بنا لیتے ہیں۔ فکر ـــــ فکر۔ اس میں ان کی زندگی ہے۔ ایسے آدمی صرف انھیں سے خوش ہوتے ہیں جو ان کی فکر اور ان کے مقاصد میں مددگار ہوں۔ اور کسی سے انھیں سروکار نہیں ہوتا۔ ان کے پاس بیوی سے گفتگو کرنے کو وقت نہیں۔ بچوں کو پیار کرنے کی انھیں بالکل فرصت نہیں۔ گھر میں کسی سے ایک پائی کا نقصان ہو جائے تو گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ بیوی نے اگر ایک آنے کے بجائے سات پیسے کی ترکاری منگوالی تو خاوند کو رات بھر جھینکنے کا مسالہ مل گیا۔ تم گھر لٹا دو گی۔ تمھیں کیا خبر پیسے کیسے آتے ہیں؟ آج مر جاؤں تو بھیک مانگتی پھرو۔ ایسی دل جلانے والی باتیں کرکے آپ بھی روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتے ہیں۔ لڑکے سے کوئی چینی پلیٹ پھوٹ گئی تو کچھ نہ پوچھو۔ بیچارے معصوم و بے قصور بچے کی شامت آگئی۔ مارتے مارتے اس کی کھال ادھیڑ ڈالی ـــــ ناحق کیسے نقصان کیا۔ تم غریب ہو اور تمھارے لئے دو چار آنے کا نقصان بھی بہت ہے۔ لیکن لڑکے کو مار پیٹ کر تم نے کیا پایا؟ چینی تو جڑ نہیں گئی؟ ہاں محبت کا بندھن ضرور ڈھیلا ہو گیا۔ یہ سب اپنے آپ [illegible] ہے۔ جلنے والوں کا حال ہے۔ اس کی دوا صرف یہی ہے کہ اپنے دل میں اتنی تسکین پیدا کریں۔ دوسروں میں کچھ دلچسپی لیں۔ پرندے پالنا، پھول پودے لگانا۔ گانا بجانا۔ گپ شپ کرنا۔ کسی تحریک میں حصہ لینا۔ غرض دل کو اپنی جانب سے ہٹا کر باہر کی طرف لیجانا ایسی طبیعت والوں کے لئے سکھ کا باعث ہو سکتا ہے۔

اداس طبیعت والے بھی اکثر غم میں رہتے ہیں۔ دنیا میں ان کے لئے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ مرض زیادہ تر اونچے درجے کے عالموں کو ہوتا ہے۔ انھوں نے دنیا کے فلسفہ کو جانا بوجھا ہے اور اب زندگی میں انھیں ایسی کوئی شے نہیں ملتی جس کے لئے وہ زندہ رہیں۔ دنیا تحت الثریٰ کی طرف جا رہی ہے، لوگوں سے محبت اٹھ گئی، ہمدردی کا کہیں نام نہیں۔ ادب کی کشتی ڈوب گئی۔ جس سے محبت کرو وہ بے وفائی کرتا ہے۔ دنیا میں کس پر اعتماد کیا جائے؟ یہ چیز تو اب دنیا سے اٹھ گئی۔ اب لکشمن کے بھائی، ہنومان جیسے خدمت گزار کہاں؟ یہ اداسی انہیں لوگوں میں ہوتی ہے جو گھر کے اچھے ہیں۔ جنھیں زندگی کے لئے کوئی کام نہیں کرنا ہوتا۔ مزے سے کھاتے اور سوتے ہیں۔ وہ دنیا میں صرف رونے کے لئے آئے ہیں۔ ان کی ذات سے کسی پر احسان کی توقع نہیں۔ ہر ایک چیز میں عیب نکالنا، ہر ایک چیز سے غیر مطمئن رہنا۔ بس یہی ان کا کام ہے۔ ایسے لوگوں کا علاج یہی ہے کہ فوراً کسی کام میں لگ جائیں اور کچھ نہ ہو سکے تو تاش ہی کھیلنا شروع کر دیں، کوئی بھی کام ہو رونے سے

اچھا ہے۔
دنیا کب تحت الثریٰ کی طرف نہیں جا رہی تھی؟ جب کوروؤں
نے دروپدی کو بھری محفل میں عریاں کرنا چاہا اور پانڈو بیٹھے
ٹکر ٹکر دیکھتے رہے، کیا دنیا اس وقت زوال کی طرف نہیں
جا رہی تھی؟ کس زمانہ میں بھائی نے بھائی کا گلا نہیں کاٹا؟
دوستوں نے کب احبا کا گلا نہیں گھونٹا؟ عیاشی کب نہیں
ہوئی؟ شراب کے دور کب نہیں چلے؟ لڑائیاں کب نہیں ہوئیں؟
دنیا آج بھی وہی ہے جہاں دس ہزار برس پہلے تھی۔ نہ تحت الثریٰ
کی طرف گئی اور نہ اسے زوال ہوا۔ اور اسی طرح آخر تک رہے
گی۔ اضطراب زندگی کا راز ہے۔ خاموش دل میں ہمیشہ اضطراب
کی موجیں اٹھتی رہتی ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ترقی ہو رہی ہے یا
ہوئی ہے اس میں اسی مطمئن نہ ہونے کے احساس کا بڑا ہاتھ
ہے۔ لیکن اس اضطراب کو حرکیاتی Dynamic
قسم کا ہونا چاہیے جو نت نئی راہیں پیدا کرے اور نئے مقاصد
معلوم کرتا رہے جو ادب اور آرٹ کی تخلیق کرتا رہے ——
دنیا اگر فانی ہے تو آپ کو اس کی کیوں فکر؟ یقین مانئے آپ کی
زندگی میں سکون ہوگا۔ اور اگر سکون ہو جائے تو آپ کے
فکر کرنے کی چنداں ضرورت؟ جو سب کی حالت ہوگی وہی آپ کی
بھی ہوگی گھر سے باہر نکل کر دیکھئے میدان میں کتنی دلکش ہریالی
ہے درختوں پر پرند کیسی خوش الحانی کے ساتھ گا رہے ہیں
ندی میں چاند کیسا تھرک رہا ہے۔ کیا ان مناظر سے آپ کو ذرا بھی
خوشی نہیں ہوتی؟ کسی جھونپڑی میں جاکر دیکھئے ماں فاقے کر رہی
ہے مگر کتنی محبت سے بچے کو اپنی دکھی چھاتی سے چمٹائے ہوئے
ہے۔ بیوی اپنے بیمار شوہر کے سرہانے بیٹھی موتی برسا رہی ہے
اور خدا سے یہ التجا کر رہی ہے کہ شوہر کے بجائے وہ خود بیمار
ہو جائے —— یقین کیجئے آپ خدمت، ایثار اور یقین
کے ایسے ایسے مناظر دیکھیں گے کہ آپ کی آنکھیں کھلی رہ
جائیں گی۔ ہو سکے تو ان کی کچھ مدد کیجئے۔ محبت کرنا سیکھئے اس
دکھ کا، ان انسانی مصیبتوں کا علاج بھی ہے۔ آج کل دکھ کی
ایک نئی شکل نکل گئی ہے اور وہ ہے زندگی کی جنگ۔ جدل حیات

جدھر دیکھئے یہی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس جنگ میں کسی سے
ہمدردی کی، رحم کی امید نہیں کر سکتے۔ سب ہی اپنے اپنے ناخن
اور دانت نکالے شکار کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ ان کی بھوک
بحر الکاہل سے بھی زیادہ گہری ہے۔ کسی طرح سیر نہیں ہوتی۔
کاش یہ دن چوبیس گھنٹوں کے بجائے اڑتالیس گھنٹوں کا
ہو جاتا۔ ادھر سورج نکلا اور ادھر مشین چلی پھر وہ دو بجے رات
سے پہلے نہیں بند ہو سکتی۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں۔ ناشتہ
کھڑے کھڑے کیجئے۔ کھانا دوڑتے دوڑتے کھائیے۔ دوسروں
سے ملنے کے لئے وقت نہیں۔ فالتو باتیں سننے کی فرصت نہیں۔
مطلب کی بات کیجئے صاف صاف [illegible] وقت کا ایک ایک منٹ قیمتی
ہے [illegible] اسے فضول نہیں کھو سکتے۔ اس جنگ کی وبا تہذیب
مغرب سے آئی ہے اور بڑے زور سے ہندوستان میں پھیل
رہی ہے۔ بڑے بڑے شہروں پر تو اس کا قبضہ ہو چکا اب
چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی اس کی عملداری
ہوتی جا رہی ہے۔ مندی تیزی، بازار کے چڑھاؤ اتار، حصول
کا گھٹنا بڑھنا یہی زندگی ہے۔ یہ نیند میں بھی تیزی مندی کا
خواب دیکھتے ہیں۔ کتابیں پڑھنے کی کسے فرصت! سینما
دیکھ لیں گے۔ ناول کون پڑھے چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے
دل بہلا لیتے ہیں؟ لیکن یہ خبط بھی ہے کہ ہم کسی میدان میں
بھی پیچھے کسی سے نہ رہیں۔ ادب، آرٹ، سیاست ہر موضوع
پر نئی سے نئی باتیں بھی ہم سے نہ چھپنے پائیں۔ ہمہ دانی اور
ہمہ خوانی کی نمائش کے لئے نئی سے نئی کتابیں میز پر ہونی
ہی چاہئیں۔ کسی طرح ان کا خلاصہ مل جائے تو کیا کہنا۔ دس
منٹ میں کتاب کا لب لباب معلوم ہو جائے۔ تبصرہ پڑھ کر بھی
تو کام چل سکتا ہے۔ اسی لئے لوگ تبصرے بڑے شوق سے
پڑھنے لگے ہیں۔ اب ہم ان کتابوں پر اپنی رائے دینے کا حق رکھتے
ہیں۔ مہذب محفل میں ہمیں کوئی بیوقوف نہیں کہہ سکتا۔ اس
بھاگ دوڑ کی زندگی میں مسرت کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟
زندگی میں سکون و اطمینان یقیناً زندگی کے اہم جزو ہیں مگر ہمیں
اس تیز گھوڑے کو اپنی رانوں کے نیچے رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ

وہیں جدھر جیا ہے لئے دوڑتا پھرے۔ زندگی کو جنگ سمجھنا، یہ سمجھنا کہ یہ صرف پہلوانوں کا اکھاڑہ ہے اور ہم صرف اپنے ہی مقابل کو پچھاڑنے کے لئے دنیا میں آئے ہیں، ایک طرح کا فریب ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہماری آرزو تو طاقتور ہو جاتی ہے لیکن سکون تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم سکون و اطمینان کی قیمت سمجھیں۔ زندگی کی خوشی کھو کر جو اطمینان لے وہ لیا بھی ہے جیسے اندھی آنکھوں کے سامنے کوئی تماشا۔ سکون کی غایت ہے مسرت۔ اگر کامیابی سے دکھ بڑھے، اضطراب بڑھے تو وہ حقیقی مسرت نہیں۔

مستقبل کی فکر دکھ کا سبب ہی نہیں بلکہ علت غائی ہے۔ کل کہیں چل بسیں تو کیا ہوگا گھر کا کچھ انتظام نہ کر سکے۔ مکان نہ بنوا سکے۔ پوتے کا بیاہ بھی نہ ہو سکا۔ ادھر ہم نے آنکھیں بند کیں اور ادھر ساری گرہستی تین تیرہ ہوئی۔ لڑکا آزاد ہے پیسے کی قدر نہیں کرتا نہ زمانہ کا رخ دیکھتا ہے، اسی فکر سے اکثر رات کو نیند نہیں آتی جس کی وجہ سے صحت پر برا اثر پڑتا ہے ایسی ذہنیت نئی نئی فکروں کے پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ دو چار دن کھانسی ہوئی تو فوراً تپ دق کا شک ہو گیا دو چار روز ہلکا سا بخار آگیا تو ٹائیفائڈ کا شبہ ہونے لگا۔ اگر جوانی میں آنکھیں بہک گئی تھیں تو اب گناہ کا احساس دل کو دبائے جا رہا ہے، یہی فکر دامن گیر ہے کہ اس گناہ کا بدلہ کیا آفت لائے؟ لڑکا بیمار ہو گیا اور منت مرادیں ہونے لگیں۔ بس اسی کی سزا ہے۔ کسی بڑے مقدمہ میں ہارے اور وہی خیال سر پر سوار کہ یہ سب اسی کا پھل ہے۔ اتنا بوجھ رکھ کر زندگی کیسے بیتے گی۔ دوزخ کا ہیبت ناک تصور کھانا پینا حرام کر دیتا ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ آدمی ٹھنڈے دل سے ہر ایک موضوع پر غور کرے یہاں تک کہ اس پر اس کے سارے پہلو روشن ہو جائیں، تم کیوں سمجھتے ہو کہ تمھارے لڑکے تم سے زیادہ نالائق ہوں گے؟ اسی طرح تمھارے باپ نے بھی تو تمھیں نالائق سمجھا تھا۔ مگر تم تو لائق ہو گئے اور آج گرہستی کی دیکھ بھال مزے سے کر رہے ہو، تمھارے بعد تمھارا لڑکا بھی اسی طرح گھر سنبھال لے گا۔ ممکن ہے تم سے زیادہ عقلمند نکلے

اور گناہ کو تو ایک ڈھکوسلا بنا رکھا ہے۔ ہمارے حساب سے تو کوئی شرابی نہیں، ہم نے پی لی تو گناہ کے مرتکب ہوئے۔ کیوں گناہ کیا؟ کروڑوں آدمی روز پیتے ہیں علانیہ پیتے ہیں۔ اسے گناہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کی نگاہ میں جو شراب نہیں پیتے وہی پاپی ہے۔ ہمارے کُل میں گوشت کھانا پاپ ہے۔ ہم نے کھا لیا تو کوئی پاپ نہیں کیا۔ ساری دنیا کھاتی ہے پھر ہمارے لئے گوشت کھانا کیوں پاپ ہے؟

گناہ وہی ہے جس میں اپنا یا دوسروں کا نقصان ہوتا ہے اگر شراب پینے سے تمھارے سر میں درد ہونے لگتا ہے یا تم بہک کر گالیاں بکنے لگتے ہو تو بے شک شراب تمھارے لئے گناہ ہے۔ اگر تم شراب کے لئے اپنے بچوں کو کھانے پینے کی تکلیف دیتے ہو تو وہ بے شک گناہ ہے۔ اور اسے فوراً چھوڑ دو۔ اسی طرح اگر گوشت کھانے سے تمھارے پیٹ میں درد ہونے لگے تو وہ تمھارے لئے جائز نہیں۔ گوشت ہی کیوں، دودھ پینے سے تمھارا ہاضمہ بگڑ جائے تو دودھ بھی تمھارے لئے جائز نہیں۔ مذہبیت و لا مذہبیت کے جھگڑوں میں پڑ کر خدا کے متعلق بحثیں کر کے کیوں خود کو دکھی کرتے ہو؟ بابا ناممکن ہے اس قسم کی غلامی اگر تمھارا اکثر قسم کے لوگوں میں کچھ رسوخ بڑھا دے۔ لیکن یہ ہے بیوقوفی تم خود سوچو کہ حقیقت میں برا کام کونسا ہے۔ اپنے کاروبار میں اوچھا پن، نوکروں سے خراب برتاؤ، بچوں پر ظلم اور سختیاں اپنے ساتھیوں سے رشک بغض و حسد، دوسروں پر اتہام، بری نیت، دغا، فریب یہ سب حقیقت میں برے جذبے اور برے کام ہیں جن کی قانون میں بھی سزا نہیں۔ لیکن جس کے باعث انسانی سماج تباہ ہو رہا ہے۔ دل میں گناہ کے تصور کا بیٹھ جانا ہماری خودی کو مٹا دیتا ہے۔ اور جب خودی کو ٹھیس پہنچے تو سمجھو بہت کچھ چلا گیا۔ پاپی سدا بغض و حسد سے جلا کرتا ہے۔ ہمیشہ دوسروں کے عیب دیکھا کرتا ہے۔ سدا مذہب کا ڈھونگ رچا کرتا ہے۔ جب تک وہ دوسروں کے گناہ کا پردہ نہ کھول دے اور اپنے

ذہب پہنچ کے مسلک وعاک نہ بٹھائے اس کو تسلی نہیں ہوتی۔ ہمارے ایک دوست ایسے ہیں جنہیں ہمیشہ یہ فکر ستایا کرتی ہے کہ لوگ ان سے جلتے ہیں۔ ان کے مضمونوں کی کوئی تعریف نہیں کرتا۔ ان کی کتابوں پر تبصرے ہوتے ہیں، کچھ لوگوں نے ضرور ایک جتھا بنا کر ان کی بے عزتی کی ٹھانی ہے۔ ایسے آدمی دوسروں سے اس طرح خائف رہتے ہیں گویا وہ خفیہ پولس ہوں۔ پس جس نے ان کی تعریف نہ کی اسے اپنا دشمن سمجھ لیا۔ اس کا سبب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کو اس سے کہیں بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔ جتنے وہ ہیں، دنیا کو کیا غرض پڑی ہے کہ ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے۔ ہم اپنی تحریروں کو انمول سمجھیں لیکن دوسرے تو اسے انمول اسی وقت سمجھیں گے جبکہ درحقیقت وہ انمول ہوگی۔ یہ ذہنیت جب بہت بڑھ جاتی ہے تب آدمی اپنے لڑکوں کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال کرتا ہے کہ اس کے لڑکے اس کا زیادہ خیال رکھیں، یہ خلاف فطرت ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو خواہ وہ اس کا لڑکا ہی کیوں نہ ہو اس کی فطری راہ سے ہٹا کر اپنی راہ پر لگائے۔

(مترجمہ) امجد یوسف زئی

غزل

رازِ الفت عیاں نہ ہو جائے
بے زبانی زباں نہ ہو جائے

ہے تغافل سے رازِ عشق نہاں
وہ کہیں مہرباں نہ ہو جائے

عشق کرتے تو ہو مگر اے دل
زندگی بے اماں نہ ہو جائے

ضبط ہے خوب پر نگاہِ شوق
تو سراپا زباں نہ ہو جائے

اپنی بیباک نظر کو دیکھو
پھر کوئی نیم جاں نہ ہو جائے

تری فرقت ملی ہے قسمت سے
یہ بھی آرامِ جاں نہ ہو جائے

یوں نہ گردن جھکا کے شرماؤ
درد کا امتحاں نہ ہو جائے

ان کو کھو تو دیا ہے پر بیتاب
یہ بھی غم جاوداں نہ ہو جائے

بیتاب مظفر نگری

وقت کا نقاش

ہو نہ جائے زندگی مایوس لمحوں کا شکار
مضمحل افکار ہیں ماحول یاس انگیز ہے
مشتعل جذبات میں جوشِ قیامت خیز ہے
حادثاتِ زندگی سے آرزوئیں پاش پاش
زندگی تو ہیں' ذوقِ زندگی بے دل خراش
کچھ نہیں ہے عظمتوں کے قافلے کا اعتبار
اختتامِ مرگ ہے گل کو تبسم کا قمار
چاندنی کرنیں بھی ہیں تاریکیوں سے ہمکنار
زندگی کا خواب اک خوابِ فسوں انگیز ہے
وقت کا نقاش ہے ہنگامہ گر افسوں تراش

نور کے تڑکے چمن کیا جلوہ در آغوش تھا
ڈالیاں گلزار کی گویا سراپا نور تھیں
مستیاں تھیں، نکہتیں تھیں، زندگی تھی جوش تھا
کیف میں ڈوبی ہوئی تھیں قہقہوں میں چور تھیں
اک طرف یہ رنگِ محفل پھول تھے نکھرے ہوئے
دوسری جانب' ادھر یہ کیف ہنگاموں سے دور
زندگی کا منظر غمناک وحشت کوش تھا
عشق پیچاں کے قریب ان زرد رو آہوں کے دور
ایک ننھی سی کلی تھیں جس کی آشائیں جواں
موت کے آغوش میں کچھ پتیوں کے درمیاں
اور اس مرقد پہ آنسو جا بجا بکھرے ہوئے

زندگی کے میکدے پر ابر پاروں کا خرام
چھوڑ پی لینے دے پی لینے دے جرعاتِ شباب
مستیوں کے آبشاروں پر بہاروں کا خرام
جھیل کی موجیں درخشندہ ستاروں کا خرام
یہ حسیں لمحات آنے کے نہیں پھر بار بار

میرے ہونٹوں پر ترے بوسوں کی ہلکی سی پھوار
ہاں سمو سکتی ہے تشنہ کام آنکھوں میں نکھار
بخش سکتی ہے دلوں کو خندۂ درخشندہ بہار
روح کو بالیدگی اور زندگی کو برگ و بار
مضطرب سینے میں اک جذبات کا طوفان ہے
دل میں ارماں اور ارمانوں میں اک ہیجان ہے
سر ترے سینے پہ ہو مدہوش سا کھویا رہوں
اس طرح سوؤں ہمیشہ کے لیے سویا رہوں

چھوڑ پی لینے دے پی لینے دے جرعاتِ شباب
یہ شبابِ چند روزہ اور کیف آور شراب
ہاں میسر ہو نہیں سکتے ہیں پھر بار بار
ایک دن ہو جائیں گے مایوس لمحوں کے شکار
مضمحل افکار ہیں ماحول یاس انگیز ہے
حادثاتِ زندگی سے آرزوئیں پاش پاش
زندگی کا خواب اک خوابِ فسوں انگیز ہے
وقت کا نقاش ہے ہنگامہ گر افسوں تراش

افسر آذری

پکنک

برسات کا دل فریب موسم، رات بھر برس کر بارش تھم چکی تھی۔ آسمان پر چھایا ہوا ابر غائب ہو چکا تھا اور سنہری دھوپ دھندلے بازاروں کو روشن کر رہی تھی۔ ایسے میں ناہید باجی نے پھولوں کو گلدان میں رکھتے ہوئے پوچھا — "اب کا اتوار کہاں گزارا جائے؟"
ننھے بھیا جھٹ سے بول اٹھے "قطب!"

ہم نے منہ چڑا دیا۔ "قطب، بڑے آئے قطب کے۔ دھرا ہی کیا ہے وہاں۔ — ایک ادھوری مسجد۔ چند ٹوٹی پھوٹی قبریں — ایک اجڑا سا باغ —"

ابا جی ہنستے ہوئے بولے "سچ تو کہتی ہے ننھی۔ گزشتہ اتوار قطب ہی میں تو گزرا۔ کوئی نئی جگہ بتاؤ —"

ناہید باجی نے ہمیں اشارے سے رات والی بات یاد دلائی۔ میں جلدی سے بول اٹھی۔ "اچھے ابا جی اوکھلا چلئے اب کے —" بھیا نے منہ بنایا۔ امی واہیات کہہ کر خاموش ہو گئیں اور ابا جی کچھ سوچنے سے لگے۔ کچھ دیر بعد بولے۔ "اچھا اس دفعہ اوکھلا سہی۔ یہ کوئی خاص جگہ نہیں —"

"واہ اس دن سنا نہیں نازو کتنی تعریف کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی دلّی میں رہ کر جس نے اوکھلا کی سیر نہ کی اس نے سیر کا لطف اٹھایا ہی نہیں۔" ہم نے ابا جی کی گھڑی کی زنجیر سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو اتوار کب ہے؟" ابا جی نے پوچھا۔

"پرسوں —" سعیدہ باجی نے پہلی دفعہ ہماری باتوں میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ یہ سعیدہ باجی ہماری بس کچھ یوں ہی سی ہیں۔ فلسفہ سے بڑی دلچسپی ہے انھیں۔ لیکن پڑھتی نہیں۔ بس یوں ہی بغیر پڑھے لکھے چاہتی ہیں کہ ایک دم سے فلسفی بن جائیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ان کی۔ بغیر جانے بوجھے کوئی ڈاکٹر بن جائے، کوئی فلسفی بن جائے اور جانے کیا کیا کچھ بن جائے۔ گزشتہ اتوار جب ہم قطب گئے تھے تو اس وقت ابا جی اور امی تو جانے کیا کیا بیٹھے ہنس رہے تھے اور ہم تینوں بھیا بہن اور ناہید باجی قطب کی سیڑھیاں بار بار اپنی بے پناہ باتوں اور ہنسی میں بھول کر پھر سے ٹھیک گننے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے تو ہماری سعیدہ باجی، ابا اور امی سے کچھ دور ایک ننھی سی جھاڑی کے نیچے بیٹھی ہیں تو کچھ اونگھتی سی لگیں۔ جانے کیا کیا سوچ رہی تھیں۔ جب میں نے قریب آ کر انھیں گدگدایا تو وہ یوں چونک سی گئیں جیسے ان کے سنہرے سپنے کے تار ٹوٹ گئے ہوں —!

ہاں تو میں کہاں بہک گئی — کہہ رہی تھی اوکھلا کی بات اور پہنچ گئی قطب۔ تو ہفتہ کے دن میں نے اور ناہید باجی نے کل ساتھ لے جانے والے سامان اور مختلف کھانوں کی فہرست تیار کی۔ کچھ سامان خود درست کیا اور باقی شرفو نے کر لیا۔ کھانوں کی فہرست باورچی کو دے دی اور چپکے سے کہہ دیا میٹھی چیزیں زیادہ تیار کرے اور پھر رضیہ اور نزہت کو نوکر بھیج کر بلا لیا اور پھر باتوں میں دن گزر گیا جیسے کبھی آیا ہی نہ ہو — رات بھر اوکھلا کے خواب دیکھتے رہے۔

صبح ابھی چڑیوں کی چوں چوں بند نہ ہوئی تھی کہ ہارن کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ کھڑکی میں سے جھانکا کچھ نظر نہ آیا۔ ہر چیز دھند کے پردوں میں چھپی ہوئی تھی۔ جلدی سے بستر سے اتری۔ ابا جی اٹھ چکے تھے۔ موٹر گیٹ کے اندر آ گئی تھی [illegible] — ابا جی کے دوست اور

ان کی بیوی۔ اور ارے یہ ہماری شمسی ــــ "ٹھیک موقع پر آئی بھئی ۔ چل اوپر ۔ یہاں تو ٹھنڈی ہوا سے جان نکل رہی ہے۔" اور ہم دونوں اوپر بھاگے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شمسی نے بتایا کل اباجی نے ٹیلی فون پر کہا کہ ہم سب صبح سات بجے تک اوکھلا جارہے ہیں شام تک واپس آجائیں گے تم لوگ ضرور آنا۔ رضیہ اور ناہید باجی تو جاگ اٹھی تھیں مگر نیند کی ماتی فرحت سو رہی تھی۔ شرارت جو سوجھی تو ایک گلاس بھر ٹھنڈا پانی اس کی گردن اور منہ پر الٹ دیا۔ معصوم گھبرا کر اٹھ ہی تو بیٹھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ جانے اس ٹھنڈے پانی کے اثر سے یا پھر خواب میں کسی ہیبتناک دیو کو گلا گھونٹتے دیکھ پایا ہو۔ پانچ منٹ بعد ہوش میں آئی تو لگی غصہ کرنے ــــ سیکڑوں صلواتیں سنا ڈالیں ــــ بدلہ لینے کی دھمکی دی ــــ اور پھر کھو گئے سب باتوں میں ــــ کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں ــــ بے سروپا باتیں ــــ

"اے لڑکیو ـ بس ختم بھی کرو اپنی باتیں ــــ کب سے انتظار ہو رہا ہے چائے پر تمہارا ــــ اوئی! تونے ابھی تک کنگھی چوٹی نہیں کی ـ" امی نے میرے بکھرے بالوں کی لٹ کھینچتے ہوئے کہا۔

"ابھی پانچ منٹ امی اور ہم آئے ــــ" کہہ کر بھاگی، میں غسل خانہ میں ــــ بس ذرا یوں ہی سا منہ دھو ـ کپڑے بدل کمرے میں آئی ـ فرحت، رضیہ، ناہید اور شمسی سب ہی تو چلنے تیار کھڑے تھے ـ ایک دوسرے کے رنگ برنگے لباس پر قہقہے لگاتے ہوئے نیچے آئے۔ اباجی کے دوست کو چچا کہہ کر سلام کیا اور ان کے قریب ہی بیٹھ گئی ـ یہ ہماری شمسی کے ابھی تو چچا ہیں نا۔ باجی نے جلدی جلدی سب کو چائے بنا کر دی اور کوئی قریب آدھ گھنٹہ لگا چائے پینے میں ـ اسی دوران میں شوفر نے اطلاع دی کہ موٹریں تیار ہیں اور سب

سامان موٹروں میں رکھ دیا گیا ہے ہم نے سوچا اپنی والی موٹر میں بیٹھیں ـ بھیا جو ڈرائیو کریں گے بڑا مزا رہے گا ـ جلدی سے میں اور رضیہ بھاگے ــــ کیمرہ اور گراموفون بھولا آئے تھے پکنک بغیر گراموفون اور کیمرے کے کچھ پھیکی پھیکی سی لگتی ہے یہ رضیہ کہتی ہے ہم نہیں ـ بوجھل سا گراموفون اور کیمرہ سنبھالے جب ہم نیچے آئے تو موٹروں میں سب بیٹھ گئے تھے ـ سامنے والی سیٹ پہ بھیا کے پاس شمسی اور ننھی سی فرحت بیٹھی تھی ـ فرحت کو گدگدایا شمسی کے چٹکی لی ــــ "ہٹ یہاں سے نہیں تو کہہ دوں گی سب سے رات والی بات ـ" وہ کچھ کسمسائی اترنے کے لئے ـ بھیا نے شمسی کا بازو پکڑ لیا "نہ جاؤ شمسی یہاں سے ـ یہ یہاں بیٹھ کر چیزوں کو چھیڑ چھیڑ کر بیکار سوالوں سے میرا دماغ چاٹ جائے گی ـ" بڑی مشکل سے بھیا راضی ہوئے اپنے ساتھ بٹھانے ـ شمسی اور فرحت پیچھے چلی گئیں ــــ راستہ قہقہوں اور دلچسپ باتوں میں گزرا ــــ سرسراتی ہوئی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے دل کو گدگدا رہے تھے ـ آسمان پہ اجلے اجلے بادل منڈلا رہے تھے اور جب ہم بند کے قریب پہنچے تو بادل نیچے کی طرف پھیل رہے تھے ـ ہوا میں جان بخش خنکی تھی اور ایک عجیب سی خوش بو ـ شکر ہے سعیدہ آپا اس دفعہ بجائے امی کے ساتھ بیٹھ کر ہم پر رعب جمانے کے ہمارے مسکراتے قہقہوں میں شریک تھیں ـ

دہلی کے تفریحی مقامات میں اوکھلا ایک پرفضا تفریح گاہ ہے ـ یہاں ایک چھوٹا سا بند اور ایک ننھا سا آبشار ہے جس سے اطراف میں ایک دلفریبی پیدا ہو گئی ہے اور جس وقت دریائے جمنا کا چمکتا ہوا پانی لاکھوں پیچ و تاب کھاتا ہوا اس چھوٹے سے بند سے ٹکراتا ہے اور پھر اس ننھے سے آبشار سے چادر بن کر شور کرتا نیچے گرتا ہے تو بے حد

دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ آبشار بہت زور شور سے گرتی ہے جس وقت یہ ہزاروں ننھے ننھے تاروں سے بھری ہوئی پانی کی چادر نیچے گرتی تو پانی میں ایک تلاطم ایک ہیجان برپا کر دیتی — ان گنت بلبلے بنتے اور پھر بگڑ جاتے اور اس بننے اور بگڑنے نے نظارے کو افسانوی اور دل فریب بنا دیا ہے

موٹر سے اتر کر ہم لوگ ریشم کی طرح نرم اور ملائم گھاس پر لیٹ گئے۔ ابا جی اور چچا سگار پیتے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ امی اور ان کی سہیلی بھی کچھ باتیں کرنے لگیں جو ہماری سمجھ میں خاک نہ آئیں — یہی خاندان کی باتیں — کسی کی شادی کی — کسی کے مرنے اور کسی کی پیدائش کی۔ اور خدا جانے وہ لوگ کیا کیا کہتے رہے ایک دوسرے سے۔ بھیا بندوق میں کارتوس بھر رہے تھے اور شرفو مچھلیاں پکڑنے ڈور کو درست کر رہا تھا اور ہم ان سب کے درمیان بیٹھیں کچھ احمق سی لگ رہی تھیں — کسی نے رائے دی کہ گراموفون لے کر یہاں سے نو دو گیارہ ہو جانا چاہئے اور اس طرف دور پرے جو بڑا سا درخت ہے اس کے موٹے سے تنے کی اوٹ میں بیٹھ کر گراموفون بجایا جائے۔ میں نے اور رضیہ نے اس کی تائید کی اور گراموفون اٹھا کر چلے۔ ابا جی نے جاتے جو دیکھا پوچھا —

"کہاں چلیں —؟"

"کہیں نہیں — بس ذرا یہاں تک — اس درخت تک — ذرا وہ —" بات پوری کہنے نہ پائی کہ چچا جو شاید کچھ لکچر دے رہے تھے اس ڈر سے کہ وہ اپنی تقریر بھول نہ جائیں جلدی سے بولے — "اچھا تو جاؤ" کچھ دور تیز تیز قدموں سے چلے پھر کسی کو دھکا دیا۔ کسی کو گدگدایا اور کسی کے کان میں زور سے سیٹی سی بجا دی — یوں ہنستے کھیلتے اس تناور درخت تک پہنچے۔ کہ اگر اس کے تنے کی اوٹ میں ہم میں سے چار چھپ جائیں تو اس پار والے بالکل نہ دیکھ پائیں۔ اور پھر دھپ دھپ کر کے گھاس پہ یوں جم کر بیٹھ گئے جیسے اب وہاں سے اٹھنے کے ارادے ہی نہیں — کچھ دیر گراموفون بجایا۔ پھر رضیہ نے، شمسی نے اور ناہید باجی نے فلمی گیت سنائے اور پھر بس یوں ہی ایک دوسرے کو گدگداتے رہے اور ہنستے رہے اور جب جلدی جلدی ان سب باتوں سے جی بھر گیا تو Opinions کھیلتے رہے اور پھر جب یہ کھیل بھی ناہید باجی کے کوئین (Queen) بن جانے پر ختم ہو گیا تو آنکھ مچولی شروع ہوئی۔ آنکھ مچولی میں بڑا لطف آیا۔ کھیل بہت دلچسپ رہا۔ سعید باجی ہر بار چور بن جاتیں۔ کچھ ان کے چور بننے پر رحم سا آ رہا تھا اور کچھ کھیل کود سے نڈھال سے ہو رہے تھے اور کچھ بھوک بھی لگ رہی تھی، اس لیے کھیل ختم کیا اور واپس آ گئے۔

شرفو اور یحییٰ بھیا نے چار پانچ مچھلیاں پکڑی تھیں۔ بھیا کے بے حد اصرار پر سعید باجی اور شمسی نے مچھلیوں کو تلا اور پھر سب نے وہیں ہری ہری گھاس پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ شرفو اپنی بانسری بجاتا رہا اور ہم کھاتے رہے۔ اسے بھوک نہ تھی — کم بخت نے کھا لیا ہوگا ڈٹ کر صبح — اور پھر کھانے کے بعد دیکھتے دیکھتے آسمان پر کالے کالے بادل چھاتے ہی گئے۔ ہلکا سا جھکڑ بھی چلنے لگا — بارش کے آثار تھے۔ جلدی جلدی سب سامان موٹروں میں ڈالا — بس تھوڑی سی دیر ہلکی سی بارش ہو کر آسمان صاف ہو گیا اور ہم ایک درخت کے

کھڑے قدرت کے مذاق کی اس آن کا ملاحظہ کرتے رہے۔
قریب کوئی چار بجے چائے پی اور وہ مٹھائیاں وسالہ تھیں خوب کھائیں اور پھر یوں ہی باتیں کرتے کرتے شام ہوگئی۔ بھیا نے کہا آؤ چلو شکار کریں۔ فرحت اور سعید باجی وہیں رہیں اور ہم چاروں اور بھیا اور شرفو چلے شکار کرنے۔ پیاری پیاری مرغابیاں چمکیلے پر پھیلائے نہر میں تیر رہی تھیں۔ بھیا نے ان کا اشارہ لگایا تو شمسی نے سہم کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"نہیں بھیا ان تیرتی ہوئی خوبصورت مرغابیوں کو تو نہ مارو۔" بھیا نے ہنس کر اڑتے ہوئے جل کوے کا نشانہ لگایا۔ ٹھائیں کی آواز اور دور پرے بیچارا جل کوا مرا پڑا تھا۔ شمسی بندوق کی آواز سے کانپ اٹھی، اس نے بھیا سے بندوق چھین لی۔
اب کسی کو نہ مارنا۔ وعدہ لے کر دیدی۔ ہائے رے! کتنے کمزور دل کی لڑکی ہے یہ شمسی اور پھر شرفو سے بھیا نے اپنا سوئمنگ ڈریس لیا اور چلے درخت کی آڑ میں پہننے۔ شمسی اور ناہید ریت پر کچھ نیم دراز باتوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ میں اور رضیہ ہم دونوں نہر میں پاؤں لٹکائے پانی میں ننھی ننھی کنکریاں پھینک رہے تھے۔ لہریں ہمارے پاؤں سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔ ایک لہر آ کر ٹوٹتی تو دوسری دور سے سربلند کرتی اور وہ بھی یوں ہی آ کر ٹوٹ جاتی۔ شلوار گیلی گیلی سی ہوگئی تھی مگر ہم لہروں کی دلچسپیوں میں گم سوچ رہے تھے "اگر ہم جل پریاں ہوتیں تو ——" غڑاپ کی آواز کے ساتھ ہی ہم دونوں پلٹیں۔ "کوئی گرا۔" رضیہ نے تقریباً پریشان ہوکر کہا —— میری چیخ نکل گئی "بھیا" اور دوسرے لمحہ متلاطم پانی کی سطح پر بھیا کا مسکراتا چہرہ نظر آیا اور ہم دونوں ہنس پڑیں اپنی بھول پر —— رضیہ بھاگی کیمرہ لینے۔ بھیا کی نہاتے ہوئے تصویر لی۔ نہر کا پانی شیشہ کی طرح چمک رہا تھا۔ آسمان پر گھٹائیں سی چھائی ہوئی تھیں اور ایک طرف دور نہر کے اس پار افق پر دھنک نکلی ہوئی ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کوئی الہڑ دوشیزہ رنگ برنگ کی چندری اوڑھے کھڑی ہو۔ پانی سے بھیگی ہوائیں طبیعتوں کو گدگدا رہی تھیں۔ نہر کی پُرشور لہریں ابھر ابھر کر پیاری پیاری راگنیں سنا رہی تھیں۔ ناہید باجی گا رہی تھیں ——
"گھر کر آئی بدریا گھر آؤ" شام کا وقت، نہر کی مضطرب لہریں، ہوا کے سرور انگیز جھونکے، —— ناہید باجی کی سحر انگیز آواز، فضا ایک روح افزا سرور میں ڈوب گئی۔ ہستی کا ذرہ ذرہ مدہوش سا ہونے لگا۔ اس وقت کی یاد مدتوں ہمارے دل میں رہے گی اور پھر جب آسمان پر گھٹائیں کچھ کالی اور کچھ اودی سی ہونے لگیں تو ناہید باجی اور شمسی نے ایک گیت "چھائی ہے کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے" گا کر فضا میں ایک سحر آلود کیفیت پیدا کر دی اور پھر ایک دوسرے کو گدگدا کر، ہنس ہنس کر وہیں ریت پر لوٹ لوٹ گئے۔ نہر کا چمکتا ہوا پانی اور اس چھلکتے پانی کی مچلتی لہروں کے سینے پر غروب آفتاب کی ارغوانی کرنوں کا عکس، پانی سے بھیگی ہوا کے سرور انگیز جھونکے، دور تک کھلے میدان اور لہلہاتی کھیتیاں اور ذرا دور پر شور مچاتا ہوا وہ ننھا سا آبشار ہماری لااتنہا ہی مسرتوں میں برابر کے شریک تھے۔ فضا کی لامحدود وسعتوں میں تاریکیاں پھیل رہی تھیں۔ اباجی اور سب ہماری طرف آ رہے تھے اور جب گھر واپس چلنے کو کہا —— "گھر، اتنی جلدی" ایسے دلفریب اور حسین نظارے کو چھوڑ کر کس کا جی جانے کو چاہے گا۔ لیکن رات آ گئی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں کوئی ستارہ نظر آ رہا تھا۔ پھیکا پھیکا زرد زرد

[illegible] سے چھائی ہوئی سیاہ گھٹاؤں کے
[illegible] جھولوں میں وقت کا اندازہ
[illegible] انداز میں ہم سب
[illegible] کا سہانا لئے کھولی
[illegible] ہوئے متلاطم پانی، ننھے
سے شور مچاتے آبشار اور کالی کالی اودی اودی
گھٹاؤ اور فضا کی سحر آلودگی کا [illegible]
رضیہ نے گدگدایا اور میں چونک سی پڑی [illegible]
یوں کھو گئی جیسے۔ جیسے ۔" اور ہم دونوں ہنس
پڑے وہ مثال نہ دے سکی۔

اختر محمود

غزل

ان کی باتوں میں دلِ امیدوار آ ہی گیا — جھوٹے وعدوں پر بھی مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

پھر مری اجڑی سی دنیا میں پلٹ آئی بہار — پھر خیالِ یار جنت در کنار آ ہی گیا

رفتہ رفتہ حد سے افزوں بے قراری ہو گئی — آتے آتے قلبِ مضطر کو قرار آ ہی گیا

آخرش سامان شکستِ توبہ کے ہو ہی گئے — آسماں پر جھوم کر ابرِ بہار آ ہی گیا

جب شبِ وعدہ ذرا سی بھی کوئی آہٹ ہوئی — میں نے یہ سمجھا وہ جانِ انتظار آ ہی گیا

دل میں برپا ہو گیا طوفانِ رقت اے بہار — لب پہ میرے نالۂ بے اختیار آ ہی گیا

شوراج بہل

ستی

اتنی جلدی اپنی دنیا اجڑتی دیکھ کر لیلا دم بخود رہ گئی۔ اس کا پتی دیو اتنی جلدی دنیا سے آنکھیں پھیر لے گا اور اس کے سپنوں کی دنیا پتی کی چِتا کے ساتھ یوں جل کر راکھ ہو جائے گی، اسے تو اس کا گمان بھی نہ تھا۔ آہ! وہ اندوہناک لمحہ ــــ! جب اس کی نم آگیں اور اشک آلود آنکھیں اس کی چوڑیوں سے بھری خوبصورت کلائی کو آخری بار نظر بھر کر دیکھ رہی تھیں ــ! پھر اس نے سب چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ ٹوٹی ہوئی نیلی پیلی چوڑیوں کا ڈھیر اس کے سامنے تھا ــــ اس کی پھوٹی امنگوں کا انبارِ عظیم ــــــــ

اب اس کے کان اس کی چوڑیوں کی نشاط آور کھنک کبھی نہ سنیں گے، اس کی آنکھیں اس کا عکسِ جمال کبھی نہ دیکھیں گی، اور اس کے ماتھے پر وہ من موہن تلک کبھی نہ چمکے گا ــ وہ کتنی مجبور تھی بیوگی کا سوانگ بھرنے پر ــ! جیسے اسے دنیا میں ڈھنڈورا ہی تو پیٹنا تھا کہ بھئی میں بیوہ ہو گئی ہوں! مجھے نہ چھوؤ، میں اپیچ ہوں، سہاگنو! مجھ سے دور رہو، دلہنو! مجھ سے خوف کھاؤ، میں ابھاگن ہوں، رانڈ ہوں رانڈ۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو لو دیکھ لو میرے نچھلے[1] ہاتھ، میری بے نور آنکھیں، میرے بےترتیب بال؛ میری زندہ در گور جوانی ....!!

لیلا کی عمر سولہ سال کی تھی جب اس کی ماں نے اسے پرائی کر دی تھی۔ بے چاری نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے بیٹی کا بیاہ رچایا تھا، مگر بیٹی کے دکھ سکھ دیکھنے کے لئے وہ زندہ نہ رہی اور شادی کے ایک سال بعد ہی کرموں جلی لیلا کا سہاگ لٹ گیا کتنے مختصر تھے اس کی خوشی کے لمحے ــ! صبح کے کیف آور سحاب کی طرح مختصر و مہمل ــــ

اب دنیا میں لیلا کی صرف ایک بڑی بہن بملا اور اس کے شوہر شیو رام تھے۔ جب انھوں نے یہ غمناک خبر سنی تو بہت افسوس کیا اور دوسرے دن ہی لیلا کے گھر جا پہنچے۔

بملا نے جب اپنی بیوہ بہن کو کمرے کے کونے میں دبکی بیٹھے پایا تو وہ بے اختیار اس کی طرف لپکی اور اس سے لپٹ کر خوب رو دی، خوب واویلا مچایا، جیسے اسی کا گھر اجڑ گیا تھا جیسے اسی کی مٹی پلید ہو گئی تھی۔ لیلا سوچتی کیا میری بہن کو مجھ سے اتنی محبت ہے، کیا میرے برباد ہونے کا اسے اتنا دکھ ہے ــ! وہ اس سے بھی نہ سہا گیا، یہ بھی رو دی مگر اس کا دل شدتِ غم سے جیسے پھٹ گیا تھا اور آنکھوں میں آنسو جیسے خشک ہو گئے تھے۔ وہ صرف سسکیاں بھر کر رہ گئی، ایک موت تو اتنی خوفناک چیز نہیں، موت تو سب کو آتی ہے، مگر ایک نوجوان ہندو شوہر کی موت ــــ! اف!! ایک جوان بیوہ کا پتی کی یاد کو چھاتی سے چمٹائے جیون بِتانا کتنا کٹھن ہے ــــ!

شیو رام جو اب تک دور کھڑے آنکھوں میں آنسو لانے کی کوشش کر رہے تھے لیلا کے قریب آ کر نہایت شفقت و محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے "نہ رو لیلا! دنیا میں کس کے دن ایک سے رہے ہیں؟ کبھی سکھ کبھی دکھ، بھگوان کی یہی مرضی تھی!!"

"بھگوان" لیلا سوچنے لگی کیا بھگوان کو ہم دکھیاروں کو رلانے میں اتنا مزا آتا ہے؟ وہ کتنا چاہتی تھی کہ اس سے کوئی والہانہ محبت کرتا

---

[1] چوڑیوں سے خالی ہاتھ

[illegible] کے دن وہ مر گئی ہوتی، زندگی بھر
[illegible] انتقام لیتی خوب...... اور اسے
[illegible] غصہ آنے لگا، بھلا اتنی جلدی مرتا تھا
[illegible] بچوں کی تسلی مجھ سے ....
[illegible] "سرپرستانہ" وقار سے لیلا کی طرف
[illegible] ہوئے کہنے لگے، لیلا! تم چنتا نہ کرو۔ آخر ہم
کس دن کے لئے ہیں۔ ہمارا گھر تمہارا ہی گھر ہے
اور ہمارے بچے......" کملا نے بھی اڑتے ہوئے
گلے سے کہنا شروع کیا "ہاں ہاں سب کچھ تمہارا
ہی تو ہے۔ تم کوئی غیر ہو" اور قدرے توقف
کے بعد ایک آہ بھر کر کہنے لگی "اچھا ہی ہوا اماں
بابا چل بسیں، ورنہ اس صدمہ کی تاب نہ لاتیں
گھل گھل کر مر جاتیں"

لیلا کو آسرا مل گیا۔ ایک سال بیت گیا۔ اب
کملا بالکل بے فکر تھی۔ اب اس کے جسم پر موٹاپے
کے آثار نمایاں تھے۔ وہ مزے سے کھا کر ایک جگہ
پڑی رہتی اور دن بھر بہن کو حکم دیتی رہتی۔ کبھی کبھی
"لیلا میری اچھی بہن ذرا وہ تو کر ذرا یہ تو لا" ایک
کنبے میں ایک جوان بیوہ کا رہنا کتنا ضروری ہے۔!
اس کے گوشت سے بھرے قوی اعضاء پر سماج
کی نگاہیں کس حسرت سے پڑتی ہیں ——!! شاید
انھیں اسی لئے زندہ سلامت رکھا جاتا ہے تاکہ وہ
سماج کے بے دام غلام بن کر رہ جائیں تاکہ ان کی
انفرادیت ملیامیٹ ہو کر ان کی زندگی اور ان کا سنسار
کسی اور کے سنسار کا جزو بن کر رہ جائے۔ لیلا
سوچتی کتنے اچھے دن .... تھے وہ جب بیوی
پتی کے جلتی چتا میں زندہ جھونک دی جاتی تھی۔!
گھل گھل کر مرنے سے تو وہ کہیں اچھا تھا ——
لیلا حد درجہ جذباتی عورت تھی۔ وہ سوچنا ہی
نہیں چاہتی تھی کہ وہ بیوہ ہے اور سماج اس سے
گھن کھاتا ہے۔ اسی لئے وہ اب بھی بال بناتی،
مانگ چوٹی سنوارتی، باہیں ننگی رکھتی اور چہرے
پہ غازہ ملتی تھی۔ کملا اس کے یہ رنگ دیکھ کر
خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔
گھر کا سارا کام کاج اب لیلا ہی کے سپرد تھا۔
رسوئی بنانا، بچوں کو نہلانا، کھلانا، پلانا سب کام
یہی کرتی تھی۔ کام کی دھن میں اسے کچھ احساس
نہ ہوتا تھا، ایک مشین کی طرح کام میں الجھی رہتی
—— مگر جب رات ہوتی اور سارا عالم نیند کی
میٹھی آغوش میں سانسیں لینے لگتا تو اسے اپنی
ہولناک تنہائی کا احساس ہوتا۔ اس کے دل میں
آتشیں جذبات کروٹیں لینے لگتے اور اس کے
خیالات بہک بہک جاتے۔ وہ سوچتی پتی برتا
استری۔! کتنا مکروہ لفظ ہے ——! عفت و
پاکدامنی۔! استری کی متاع عزیز ——! کتنا
فریب ہے!! اور اس کا جی چاہتا اس دکھاوے
کی عزت و عصمت کا لباس تار تار کر دوں اور
بر سرِ عام لوگوں سے چیخ چیخ کر کہوں "اے سنگدل
انسان! دیکھ میں ہوں عورت، تمہاری خوشیوں
کا مرکز، تمہاری زندگیوں کا سرمایۂ بے بہا، لوٹ لو
اس سرمایہ کو —— میں ہوں عورت ——
حسین ..... جوان دیکھتے نہیں میرے سینے سے
جوانی کس بے باکی سے جھانک رہی ہے ——!
کیا تم مجھ سے دور بھاگتے ہو، ٹھکراتے ہو اس
سرمایہ کو، ہنستے ہو مجھ پر ——؟" اور اس کے
اعضا میں خوفناک تشنج پیدا ہوتا۔ وہ ایک بپھری
ہوئی شیرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوتی، وہ چاہتی میں
ایک زلزلہ ہوں، ایک خوفناک زلزلہ اور سارے
نظام کائنات کو درہم و برہم کر دوں، مہاکالی بن کر

سارے عالم پر چھا جاؤں، ساری انسانیت کو کچل کے رکھ دوں، ہر طرف تاراجی پھیلا دوں — تباہی —— تاراجی —— خون —— خوب پی لوں خون، خوب۔ روح کی پیاس بجھاؤں ——" اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بستر پر اوندھے منہ گر پڑی —

اور جب صبح ہوتی تو اس کے جذبات کا سمندر پرسکون ہو جاتا اور متلاطم لہریں تھم جاتیں جیسے تھک کر چور ہو گئی ہوں اور وہ روز کے کام دھندوں میں کھو سی جاتی، پھر اُسے نہ منگل کی سُدھ رہتی نہ بدھ کی، ایک دن شیورام نے اسے بےطرح چھیڑا۔ وہ ایک دھلا ہوا فراک الگنی پہ سکھا رہی تھی، پاس ہی شیورام چارپائی پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا دو سالہ بچہ ان کے زانوں پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ شیورام بچے کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہنے لگے "لیلا! تم کتنی سگھڑ ہو، دیکھتے دیکھتے گھر کا نقشہ بدل ڈالا تم نے، تمہاری بہن سے کچھ ہونا نہ تھا اور اگر تم نہ آتیں ...." لیلا کا گلابی چہرا ایکدم تمتما اٹھا، اس کے تن بدن میں ابال سا آنے لگا، اس کے دل سے گرم اور کھولتے ہوئے خون کے فوارے سے چھوٹنے لگے۔ اور اس کی نسیں تن کر بے حس سی ہو گئیں، اسے شیورام پر بے حد غصہ آ رہا تھا وہ سوچتی کیا انھوں نے مجھے اسی لئے گھر پر بلایا ہے کیا اس کام کے لئے میں ہی رہ گئی تھی؟ جیسے میرا کوئی دوسرا مصرف ان کی سمجھ میں آتا ہی نہیں، بزدل ——! نامرد ——!! آج بہن کے تیور بھی بگڑے ہوئے تھے۔ لیلا کام کاج سے فارغ ہو کر سنگار کرنے بیٹھ گئی تھی۔ بملا کمرے میں آ اسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ جب وہ سنگار ختم کر چکی تو بملا نے کہا "لیلا تمہارے یہ لچھن ٹھیک نہیں۔ تم ودھوا ہو۔ تمہیں یہ بناؤ سنگار کی کیا ضرورت ہے۔ اور یہ منہ پر منوں پاؤڈر کیوں تھوپ لیا تم نے ——؟ دنیا کیا کہتی ہے تمہیں کچھ پتہ بھی ہے ——؟

لیلا کے جی آئی کہاں نوچ لوں، کپڑے پھاڑ ڈالوں اور چہرے پر کولتار مل لوں... مجھے کیا حق ہے میں ودھوا....... آج کام میں کسی طرح اس کا جی نہ لگا۔ دن بھر دل میں بے کلی سی رہی، پھر رات کی مہیب تنہائی کے خیال کر کے ابھی سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا مگر آج اس کا مضمحل اور تھکا ہوا جسم بہت جلد نیند کی سکون آمیز زنجیروں میں جکڑ گیا۔—— رات میں اس نے عجیب عجیب خواب دیکھے۔ اس نے دیکھا ہندوستانی بیوہ استریوں کا ایک جلوس چلا آ رہا ہے۔ زرد زرد مرجھائے ہوئے چہروں والی بیوائیں جن میں جوان بھی تھیں اور ادھیڑ بھی۔ بیوائیں جن کے بہادر اور کڑیل نوجوان شوہر جنگ میں آخری وقت تک لڑتے لڑتے دم توڑ دئے تھے اور جن کی بہادری کے صلے میں انھیں "وکٹوریا کراس" عطا کیا گیا تھا! سب کی سب ایک جہنمی بھٹی، ایک مردوی الاؤ کے گرد آ کھڑی ہوئی تھیں۔ الاؤ سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور ایک قوی جثہ اہرمنی شکل کا دیو باری باری سے انھیں پکڑ کر دہکتی آگ میں جھونک رہا تھا۔ ان کے نالہ و شیون اور دیو کے خوفناک قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی...... لیلا چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ وہ کانپ رہی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے ان ابھاگنوں میں

...ہل تھی ۔

تین چار دن سے شیو رام کے گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی - پٹنہ سے ان کا چھوٹا بھائی ہری رام آیا ہوا تھا - پچیس چھبیس سال کا سن تھا، بشرہ زرد اور مرجھایا ہوا، کوئی عاشقِ تشنہ کام معلوم ہوتا تھا -

لیلا دن بھر ہری رام کی دلجوئی میں لگی رہتی تھی - اس کام میں اسے ایک قسم کا سکھ ملتا تھا اور لذت سی محسوس ہوتی تھی - ان دنوں وہ ہشاش بشاش بھی نظر آنے لگی تھی، چہرے پر نہ وہ افسردگی کی زردیاں تھیں اور من پر نہ وہ غموں کی کالی بدلیاں - اب راتوں میں جھلملاتے تارے اسے ان جانے سے اشارے کرتے اور چندرما مسکراتا ہوا اس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے گھورتا ---- جب وہ نیند کی گود میں سر دئے بے خود پڑ جاتی تو رات کے سناٹے میں چپکے چپکے اس کے من کے چور دروازوں سے کوئی انجانی ان دیکھی موہوم سی ہستی دبے پاؤں داخل ہوتی اور اس کے من پر چھا جاتی - پھر وہ سپنوں کی دنیا میں کھو جاتی، سندر اور سہانے سپنے ---- اسے خود تعجب تھا کہ وہ یوں کیسے بدلتی جا رہی ہے اور اس کی روح کی گہرائیوں میں ایک روحانیت سی کیوں اترتی جا رہی ہے - مگر لیلا ہری رام کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی - وہ اس کے [illegible] ڈھنگ دیکھ کر دل میں بہت کڑھتا تھا - بظاہر خندہ پیشانی سے ملتا اور اس کے ہر سوال کا سیدھے منہ جواب دیتا مگر اس کے دل میں لیلا کے خلاف شدید تنفر کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا - دنیا کی اس دنیاداری

اور دندی ہوئی مخلوق کو کیا حق تھا کہ سولہ سنگار کرے اور مسکرا مسکرا کر اس کی طرف یوں دیکھے جیسے صرف اس کی بیوی ہی دیکھ سکتی تھی ---!

ہری رام کو آئے آج پانچواں دن تھا - آج لیلا معمول سے زیادہ مسرور نظر آتی تھی - دن بھر وہ ہنستی بولتی رہی - رات میں کھانے کے بعد شیو رام اور ہری رام دونوں میں بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں - جب رات بہت ہو چکی تو شیو رام اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے - ہری رام بالکونی میں آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ رہے - مگر لیلا کی کسی طرح آنکھ نہ لگتی تھی - جب بہت دیر تک بستر پر پہلو بدلتے بدلتے آنکھ نہ لگی تو وہ ہولے ہولے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر کھسک آئی - فضا میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور ہر سو خاموشی سو رہی تھی - آبادی سے قدرے دور جہاں گاؤں کے ڈھوروں کا ریوڑ سوتا تھا، کوئی گوالا دھیمے دھیمے سروں میں بانسری بجا رہا تھا، بانسری کی مدھر مدھر لڑکھڑاتی تانیں لیلا کے کانوں میں جیسے رس گھول رہی تھیں ---- اس کی روح وجد میں آ کر ناچنے لگی، اس کا من جھولنے لگا - وہ چاہتی تھی کہ اس کو کوئی اپنی مضبوط باہوں میں بھینچ لے ...... اس کی ہستی کسی کی ہستی میں سما جائے - اس کی روح کسی کی روح میں اتر جائے - وہ پلٹ کر ہری رام کی چارپائی کی طرف بڑھی مگر قریب پہنچ کر اس کے پاؤں خود بخود رک گئے - تھوڑی دیر کے لئے وہ ٹھٹکی - مگر اس کے دل میں ہیجان بپا تھا اور جذبات میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی --- قریب پہنچ کر وہ اپنے بائیں ہاتھ کی لرزتی ہوئی انگلیاں ہری رام کے خشک بالوں میں الجھا کر کانپتی ہوئی

دھیمی آواز میں بولی "سو رہے ہیں آپ ؟" ہری رام ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور مندی مندی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ لیلا اب ان کی چارپائی کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی اور کہہ رہی تھی "دیکھئے موسم کتنا خوش گوار ہے ...... ہر طرف چاندنی ... اور ...." اس کی آواز گلے میں اٹک گئی —
ہری رام کی کرخت آواز اس کے کانوں میں آئی "ذلیل عورت ! تیرے یہ لچھن — !! ناشدنی تجھے لاج نہیں آتی — آخ .... تھو ...... ہاپاپی ...... !!"

لیلا کے دل پر جیسے ہزاروں بجلیاں گر پڑیں۔ اس کی جوانی جیسے کسی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ وہ دم سادھے تھوڑی دیر کے لئے مبہوت و مضطرب کھڑی رہی اور پلٹ کر بے تحاشا دوڑتی ہوئی آئی اور کمرے کے اندر گھس کر بستر پر اوندھے منہ گر پڑی۔

اب وہ سچ مچ بیوہ معلوم ہونے لگی تھی۔ اب نہ بناؤ تھا نہ سنگھار۔ اس کا دل اب چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ اس کی زندگی میں کئی ایسے موقعے آئے جب اس کا دماغ بہک جاتا اور دل بے قابو ہو سکتا تھا۔ مگر مگر اس کے پیروں کو کبھی لغزش نہیں ہوئی اور اس کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ وقت گزرتا رہا۔ بسنت رت آتی رہی اور ان گنت چڑیاں ہری بھری گھنیری شاخوں پر جھوم جھوم کر گاتیں الاپتی رہیں، ساون کی کالی گھٹائیں آسمان کے لامحدود پھیلاؤ میں ... کے پر غروروں کی طرح رنگینی ... مگر لیلا کے من میں وہ ترنگیں ... اور وہ وجد آفریں نغمے کبھی نہ پہونچے ....

اب راتوں میں کبھی کبھی اس پر غشی طاری ہوتی تھی۔ اور دن میں کام کرتے بہت جلد تھک جاتی تھی۔ اس کی روح ایک ابدی سکون کے لئے بہت تڑپتی تلملاتی، مگر اس کی منزل جیسے بہت دور تھی اور وہ تھکی ہاری ...... نڈھال مضمحل ...... افسردہ ......

وقت کا بوڑھا دیوتا بیٹھا اونگھتا رہا .... اونگھتا رہا ...... ہر چیز آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر اپنے انجام کی طرف بڑھتی اور مٹتی گئی۔ فطرت کی پر اسرار وسعتوں میں گم ہوتی گئی۔

مدتیں بیت گئیں ...... دن گزرتے گئے۔ اب شام ہونے والی تھی، اس کی زندگی کا اداس سایہ ڈھلنے والا تھا۔ ناکام و نامراد وہ صفحۂ ہستی سے گم ہونے والی تھی ...

سی - ایم - ریڈی (عثمانیہ)

[illegible] ہم ایک "برخوردار" بیمار کو میسور لے گئے تھے، یہ بیمار کوئی آٹھ مہینے سے ہلکے بخار میں
[illegible] سارے پاپڑ بیل ڈالے مگر بخار نہ جانا تھا نہ گیا! "تدب ازجا نمی جنبد" کا مضمون تھا!!
[illegible] "ٹائیفائیڈ" میں مبتلا رہنے کے بعد تین ہفتوں تک ٹمپریچر نارمل بلکہ سب نارمل رہا مگر بعد ۹۹
[illegible] کے درمیان رہنے لگا۔ "ٹائیفائیڈ" کے دوران میں جو ڈاکٹر صاحب علاج کرتے تھے کوئی دو درجن
[illegible] بدل جانے کے دئے مگر کچھ نہ ہوا! ایک اور مشہور ڈاکٹر ان کے شریک ہوئے بعد "غور کامل" ایک
[illegible] اور انجکشن دینے کی رائے ہوئی، اس کے بعد بھی بخار کا وہی حال تھا!!

تنگ آمد بجنگ آمد! ہم نے ڈاکٹروں کو خیرباد کہہ کر طبیبوں سے مشورہ کیا، ایک مشہور طبیب نے "جگر کی خرابی" تشخیص کی۔ گولیاں، جوارش، معجون، سفوف، عرق وغیرہ وغیرہ سب کچھ دئے مگر ہنوز روز اول!! ایک مہینہ اس طرح گزرا۔ ایک حاذق مشہور ڈاکٹر باقی رہ گئے تھے ایک دن انھیں بھی تکلیف دی گئی۔ ان کے ساتھ قدیم معالج بھی بلائے گئے۔ دونوں نے کوئی ایک گھنٹہ تک امتحان کرکے مشورہ دیا کہ بجلی کا علاج کرانا چاہئے کیونکہ ہنسلی کے غدود بڑھ گئے ہیں۔ دس مرتبہ بجلی دینے کے بعد وہ ٹھیک ہو جائیں گے، یہی سبب بخار رہنے کا ہے۔ یہ پکی تشخیص تھی! اب ہفتہ میں تین مرتبہ بجلی کے علاوہ کے لئے موجود پیٹرول کی سخت راشننگ کے مریض کو موٹر میں ہسپتال لے جانا پڑتا تھا۔ یہ بنفشی شعاعوں کا علاج تھا، روشنی بڑی خوبصورت ہوتی تھی۔ ایک بڑے لیمپ کے نیچے بیمار بیٹھا رہتا تھا، دس مرتبہ کے عوض ہسپتال کے "بجلی ڈاکٹر" کے مشورہ سے ہم نے بیس مرتبہ مریض کو لیمپ کے نیچے بٹھایا مگر چراغ تلے اندھیرا ہی رہا! اب کیا کیا جائے؟

ہمارے ایک دوست "صادق" نے مشورہ دیا کہ ایک ڈاکٹر پرانے بخاروں کے ماہر حال ہی میں کہیں سے آئے ہیں، ان سے مشورہ کرنا چاہئے۔ ایک دن ہم ان سے ملے، کوئی ایک گھنٹہ تک ڈاکٹر صاحب نے بیمار کو بٹھا کر، لٹا کر، اٹھا کر، پلٹا کر، ٹھونک کر، بجا کر دیکھا۔ رائے ہوئی کہ ریڑھ کی ہڈی کی مختلف زاویوں سے تصویریں لینی چاہئیں۔ حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ تصویریں دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کچھ صاف نہیں آئی ہیں، دوبارہ لینی چاہئیں۔ بجلی کا علاج کراتے کراتے اور تصویریں لیتے لیتے اب ہم بیزار ہو گئے تھے۔ اس لئے سوچا کہ کیوں نہ بیمار کو میسور کے "سینا ٹوریم" میں لے جا کر تشخیص کرائیں۔ اللہ کا نام لے کر ہم مریض کو لے کر نکل پڑے۔ ریل کی نشستیں کوئی پندرہ دن پہلے محفوظ کرائی تھیں لیکن خدا جنگ کا بھلا کرے ٹرین میں مسافروں کا وہ ہجوم تھا کہ پناہ بخدا! ہمارے ڈبہ میں کوئی سولہ مسافروں کی "کمسڈ پارٹی" تھی۔ برتھ کے علاوہ ٹرنکوں پر، بستروں پر، بعض باسکٹوں پر مسافر ہی مسافر تھے، ہم بھی ایک ٹرنک پر بیٹھ گئے بیمار کو بڑی مشکل سے برتھ پر جگہ ملی۔ ڈورنا چلم تک ڈبہ میں میلہ لگ رہا تھا۔ جب یہاں سے ٹرین چلی صرف کچھ مسافر رہ گئے تھے۔

ٹرین کی رفتار اب کچھ بڑھ گئی تھی، ہمارے سامنے کی برتھ پر ایک بھاری بھرکم خاتون کچھ بیٹھی اور کچھ لیٹی کتاب پڑھ رہی تھیں، محترمہ نے پانی کچھ زیادہ پی لیا تھا، ٹرین کی رفتار بڑھتے ہی کچھ عجیب قسم کی

آوازیں ان کے پیٹ میں سے آنے لگیں! محترمہ شرما کر اٹھ بیٹھیں پھر ہنس [illegible] ہم [illegible]
ایک مرتبہ کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھ کر مسکرائیں ہم نے بھی ہمدردانہ نظروں سے ان کی
مسکراہٹ کا جواب دیا۔ اتنے میں ٹرین کی رفتار کم ہونا شروع ہوئی اور [illegible] ہونے
لگی محترمہ کے چہرے پر بحالی آنے لگی۔ یہاں تک کہ ٹرین ایک جنگل کے بیچوں بیچ [illegible]
مسافروں نے سمجھا شاید سگنل نہیں گرا!! ہم نے ڈبے سے گردن نکال کر جو دیکھا تو کہیں سگنل
کا پتہ نہیں تھا! ایک آدمی انجن سے اترا اور جنگل میں پھرنے لگا!! ہم نے ٹرین ٹھہرنے کی
وجہ پوچھی تو اس نے کہا "ڈرائیور صاحب کی ٹوپی ہوا سے اڑ گئی ہے تلاش کر رہا ہوں"! اتنے
میں گارڈ صاحب تشریف لائے اور انجن کی طرف جانے لگے، ہم نے ان سے ٹرین رکنے کا سبب
پوچھا تو ارشاد ہوا "یہی معلوم کرنے تو جا رہا ہوں!" ہم بھی ان کے ساتھ ہو گئے، انجن ہمارے
ڈبے سے قریب ہی تھا، گارڈ صاحب انجن پر چڑھ گئے۔ اور لگے ڈرائیور کو ڈانٹنے!! اس نے کہا
ٹوپی بالکل نئی تھی، پندرہ روپے میں خریدی تھی، اس کے بغیر وہ انجن چلانے تیار نہیں ہے،
تلاش کرنے کی اجازت دی جائے! اس وقت وہ آدمی جو جنگل میں ٹوپی ڈھونڈھ رہا تھا واپس
آیا کہ ٹوپی کہیں نہیں ملی، گارڈ نے ڈرائیور سے پوچھا اب کیا کروگے؟ اس نے کہا ٹرین کو واپس
لے جائیں گے، کہیں نہ کہیں تو ٹوپی مل جائے گی! اس وقت ہمیں جناب شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل"
یاد آگئی!!

ٹرین واپس چلی، کوئی تین چار فرلانگ پیچھے جانے کے بعد ایک درخت پر ٹوپی اٹکی ہوئی نظر
آئی، .... ٹوپی کا نظر آنا تھا کہ سارے مسافروں نے ٹوپی! ٹوپی!! چلانا شروع کیا۔
گویا سبھوں نے عید کا چاند دیکھ لیا! ڈرائیور نے ٹھیک ٹوپی کے درخت کے سامنے انجن ٹھہرایا،
ٹوپی اتاری گئی اور ڈرائیور نے پہن لی، تب کہیں ٹرین چلی!! ڈرائیور نے آنے والے اسٹیشن پر بروقت
پہنچنے کے لئے ٹرین کی رفتار اس قدر تیز کردی کہ ہماری ہم سفر خاتون کا بیٹھنا بھی دشوار ہوگیا۔
سب مسافروں کے ساتھ وہ بھی اچھلنے لگیں۔ سب کے سب اچک رہے تھے اور ہنس رہے تھے مگر
محترمہ مارے شرم کے پانی پانی ہو رہی تھیں۔

رات کے کوئی دس بجے ہوں گے کہ ایک ایسے اسٹیشن پر پہنچے جہاں "صاحب لوگ" بڑا کھانا
کھاتے ہیں، ان کی خاطر ٹرین یہاں کوئی پون گھنٹہ ٹھہری، ہم نے اور ہماری ہم سفر خاتون نے اپنے
اپنے توشہ دان کھولے اور کھانا شروع کیا، محترمہ نے اپنے توشے میں سے سالن ملے ہوئے چاول
ہماری طرف بڑھائے اور کہا "ہمارے گھر کی یہ خاص چیز ہے تھوڑا سا چکھ کر دیکھئے!" واقعی یہ چاول
بڑے مزیدار تھے!! چٹنی، اچار، بگھارے بیگن، ماہی قلیہ اور دو چار قسم کے سالن کا مزہ آ رہا تھا۔
ہم نے تعریف کی تو محترمہ نے اصرار کے ساتھ ہمیں اس قدر کھلایا کہ پیٹ میں مطلق گنجائش نہیں
رہی، ہم دونوں کھانے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے بستر صاف کر رہے تھے کہ ایک تربوز فروش چار چھے
تربوز ٹوکرے میں لئے نازل ہوا۔ ہماری دوست نے ایک تربوز خریدنا چاہا [illegible]

[illegible] کہ وہ پھسل پڑا اور پلیٹ فارم پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا !! اب تو [illegible] پڑا اور ہمیں رات کے بارہ بجے اس کو زہر مار کرنا پڑا - ہزار ہم نے انکار کیا کہ [illegible] زیادہ کھانے سے نزلہ ہو جائے گا' حلق میں خرابی پیدا ہوگی' مگر محترمہ نے ایک نہ سنی [illegible] خراب ہو جائے گا' بارہ آنے کا خون ہوگا' مجبوراً کچھ کم آدھا تربوز ہمیں کھانا پڑا [illegible] نوش فرمایا' یہاں سے کچھ جاگتے کچھ سوتے صبح کے چھے بجے بنگلور پہنچے - یہاں ٹرین کوئی [illegible] میسور جانے کے لئے ٹرین بدلنی پڑی - ہماری دوست نے ہمیں "خدا حافظ" کہا کیونکہ وہ [illegible] والدہ کے ہاں گرمیاں گزارنے آئی تھیں - بنگلور ان کا وطن تھا مگر اردو ایسی صاف بولتی تھیں کہ گویا ان کی مادری زبان ہے ! وہ ہمارے ہاں کے ایک بڑے عہدے دار کی رفیق حیات ہیں - خدا انہیں اچھا رکھے کہ ان کی وجہ سے ہمارا سفر پر لطف رہا -

میسور کے اسٹیشن پر اترتے ہی دو چار ہوٹل والوں نے ہمیں گھیر لیا کہ ان کے ہوٹل کو چلیں' ہم نے "وسنتی کپل" کے "آنند بھون" کی تعریف سنی تھی' سیدھا وہاں پہنچے !! ہوٹل کے کمرے نہایت نفیس اور آرام دہ تھے جگہ بھی بڑی پرفضا تھی مگر یہاں ایک دو دن بھی چین سے رہنے نہ پائے تھے کہ مینجر نے کمرے خالی کرنے کے لئے کہا - وجہ پوچھی تو بتایا کہ ہمارے ساتھ "دق" کا بیمار ہے ہم نے کہا بیمار کو "دق" ہو نا کس نے بتایا؟ اس نے جواب دیا خود بیمار نے ! جس طرح ناٹک میں مار مار کر جبراً حکیم بنایا جاتا تھا اسی طرح ہمارے برخوردار بیمار نے خود کو "دق" کا بیمار بنا لیا !! ہزار اس کو سمجھایا کہ بھئی دق وق کچھ بھی نہیں ہے صرف ہلکا بخار کبھی رہتا ہے کبھی نہیں رہتا - تبدیل آب و ہوا کی غرض سے آئے ہیں مگر اس نے ہرگز یقین نہیں کیا - مجبوراً ہوٹل چھوڑنا پڑا !

بڑی تلاش و جستجو کے بعد مارکٹ کے قریب ایک ہوٹل میں اچھا کمرہ مل گیا' مگر یہ مقام ویسا پرفضا نہیں تھا - ہم نے بیمار کو سخت تاکید کردی کہ اپنا حال زار کسی کو نہ سنائے' نہ ہوٹل کے مینجر سے دوستی کرے ورنہ یہاں سے بھی کوچ کرنا ہوگا اور یہی رفتار رہی تو ایک دن ہم "خانہ بدوش" ہو جائیں گے - اس تقریب میں دو دن بیکار گئے - چوتھے دن بیمار کو لے کر ہم سینا ٹوریم پہنچے - ڈاکٹر نے بیمار کو بٹھا کر خوب ٹھونک بجا کر امتحان کیا' بجلی سے تصویر بھی لی - بجلی کے مشین کے سامنے کھڑا کر کے جسم کے اندر کا حصہ بھی دیکھا - خون کا امتحان بھی ہوا اور ان سب امتحانوں کی فیس صرف چالیس روپے ہوئی - اپنے وطن کے ہسپتال میں ایسے ہی امتحانوں کے اخراجات جب ہمیں یاد آئے تو یہاں نہیں بلکہ اپنے ہی وطن میں ہم نے "غریب الوطنی" محسوس کی ! صرف بجلی سے تصویریں لینے کی فیس ہم نے اڑتالیس روپے دی تھی - اس کے باوجود تصویریں بھی صاف نہیں آئی تھیں - غرض کہ یہ سارے امتحان ہونے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ بیمار کو کوئی مرض نہیں ہے ! نہ علاج کی ضرورت ہے نہ دوا کی !! کوئی چار ہفتے میسور میں رہنے کے بعد بیمار بالکل چنگا ہوگیا ! جان بچی لاکھوں پائے - خیر سے اب وہ گھر کو آئے !!

باغبان

[illegible] ادہ خرگوش نے زندگی میں [illegible] تھا مگر - اب - [illegible] پھر سے آگیا اور بڑا دہ [illegible]

[illegible] کے اندر دیکھ پڑی رہی اور اس کی [illegible] لال پلکوں کے اندر سے اس دور تیز چاند سے [illegible] ریت کا پھیلاؤ دیکھ سکتی تھیں جھاڑیوں سے نیادہ [illegible] تھا ایک طرح کا کھلا میدان، جہاں وہ بھی اپنی جوانی کے [illegible] دنوں میں اچھلتی کودتی تھی اور اپنی ہی پرچھائیں کا پیچھا کیا تھا یا ان راتوں کو، جب چاند خوب تیز چمکتا ہوتا، اپنے محبوب کا انتظار کیا تھا۔

ریت پر ایک پرچھائیں جھولتی تھی اور پھر دوسری، بوڑھی مادہ خرگوش نے سوچا کہ وہ یقیناً ایک خواب ہی دیکھ رہی ہے، لیکن پرچھائیاں پھر لوٹ آئیں، رکیں اور پھر اپنا طلسمی کھیل جاری کر دیا۔ اس بارے میں کوئی بھول اس کی نہ تھی۔ وہ دو خرگوش تھے اور تب اس بوڑھی نے جان لیا کہ کیوں اس کا کالا دشمن، شکاری، رات کو ایک بار پھر ٹاپو پر آیا ہوا تھا۔ شکاری نے مار ڈالا تھا۔

ایک بچہ اپنے بھائی کے سر اور کان کو چاٹ رہا تھا۔ جب اس کی نظر بوڑھی مادہ خرگوش پر پڑی اس نے اسے غور سے دیکھا۔ اپنی ناک باہر کو نکالی اور پھر اپنی جرأت پر خوف زدہ ہو کر دہشت کھا کر، اسے پھر اندر سمیٹ لیا۔

بوڑھی خرگوش اپنی راہ گئی لیکن کچھ دیر بعد پھر واپس آئی اور اس نے دونوں غریب خرگوش کے بچوں کو ساتھ کھیلتے اور ایک دوسرے کو چاٹتے دیکھا۔

وہ ایک اداس ٹھنڈا دن تھا، لگ بھگ شام کے [illegible] ہونے لگی اور بوڑھی مادہ خرگوش پھر اپنی پرانی جھیل کے [illegible] کناروں پر پیڑ کے تنے والے گھونسلے کو [illegible] بارش ہوتی رہی اور ہوتی رہی لیکن بوڑھی مادہ خرگوش کو اور کوئی زیادہ اداسی محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے نزدیک بارش کا مطلب اچھے موسم کا خاتمہ ہوتا تھا۔ جلد ہی ریت پھر دھنسنے کے قابل ہو جائے گی اور پھر کوئی شکاری گیلے، سپاٹ جنگل کو پار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

اور ان بے چارے خرگوش کے بچوں کا کیا ہوگا؟ ان کے اس چھوٹے سے کھوکھلے میں ان پر کیا بیتے گی؟ کیا اس بوڑھی مادہ کو خود اپنے ننھے بچوں کا، ان کے گھونسلے کی گرمی، اپنی بڑھتی ہوئی امنگوں کا یکایک خیال آگیا؟ یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن سویرے کے وقت اس نے اپنی چھپنے کی جگہ چھوڑی اور ان خرگوش کے بچوں کو پھر دیکھنے گئی۔ وہ بے چاری، ننھی سی جانیں سو رہی تھیں ایک پر دوسری، لیکن نیند میں بھی وہ ضرور ہی اپنی ماں کا انتظار کرتے رہے ہوں گے کیونکہ جب وہ بوڑھی مادہ ان تک آئی، انھوں نے اپنی ناک بڑھائی اور اپنے ذرا ذرا سے کان ہلائے اور بوڑھی مادہ نے انھیں اپنی بڑی چمکیلی آنکھوں سے دیکھا اور اس نے بھی اپنی ناک بڑھا دی گویا وہ گھونسلوں کی بو سونگھ رہی ہے۔

بارش پھر سے ہونے لگی آٹھ دن اور آٹھ رات، کہر اور مینہ کا ایک تھوڑا سا پردا ٹاپو کو گھیرے اور ڈھنکے رہا۔ جھیل، کالی چمکتی ہوئی سیاہی سے بھری نظر آنے لگی اور پانی چڑھتا رہا اور چڑھتا رہا یہاں تک کہ آخرکار اس نے بوڑھی مادہ کے جسم کو چھو لیا۔ اس نے لوٹ کر، ان خرگوشوں کے بچوں کو پھر دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے قدموں کے پاس کی ریت بہت جگہوں پر اندر دھنسنے کو تھی اور پانی سے بالکل دلدلی ہو رہی تھی اس چھوٹی سی ترائی تک پہنچنا اس کے لئے بالکل ناممکن تھا۔ پانی برستا رہا اور برستا رہا اور دوری پر اس علاقے سے گزرتی، سب کو تہس نہس

کرتی، اپنی قوت پر نازاں سنساتی ہوئی کوئی چیز آرہی تھی بالکل ویسے ہی جیسے کسی چڑھائی کرنے والے کی فوج ہو۔

بوڑھی مادہ خرگوش اس آواز کو، اس چیز کو اچھی طرح جانتی تھی، وہ فتح اور کامیابی کے ساتھ دوڑنے والی ندی کی آواز تھی۔ اسے اپنی جگہ چھوڑنے کی ہمت نہ ہوئی اور ساتھ ہی بھوک اسے ستا رہی تھی اور اس کے پاس کھانے کے لئے کچھ سوکھی پتیوں کو چھوڑ کر اور کچھ نہ تھا۔ ایک دن اسے فاقے سے بھی رہنا پڑا کیونکہ پانی بالکل تنوں تک پہنچ گیا تھا اور اس وقت ذرا بھی ہلنا جلنا خطرناک تھا۔

بھورا اور یک رنگ کا لا پانی چڑھا اور زیادہ چڑھا، زمین اور آسمان اور دیوانی ہوا سب ٹھنڈے ہوگئے تھے اور گندے پانی کا ایک ڈھیر سا ہوگیا تھا۔ لیکن آٹھویں دن کی شام کو پانی رکا اور اچانک بادل پھٹ گئے۔ کہر کو چیر کر، یہاں وہاں، ہرا پیلا سا آسمان نکل آیا اور بادلوں کی اوٹ سے، دھندلکے کی گہرائیوں میں سے چاند کا چہرہ دکھنے لگا۔

پانی نیچے ہٹا، گویا اپنی فتح پر نازاں اپنی موجوں میں پتیوں، شاخوں، ریت اور مردہ جانوروں کو بٹور کر واپس پھر رہا ہو۔

دوسرے دن سورج نے [illegible] اپنی روشنی پھینکی اور قریب [illegible] دوسری مادہ خرگوش نے اپنے [illegible] کو گرم کیا اور چاروں طرف کی سیر کی۔

ننھی سی جھیل کا پتہ نہ تھا جہاں چھوٹا سا گدلا نالا اس اونچے کگار کے نیچے شور کرتا بہا جا رہا تھا، جو کہ ایک بندھ کی طرح کھڑا ہوا تھا وہ اپنی لوٹ اور اپنے شکاروں کو بہا ہی لے گیا — اور یکایک سوکھی ٹہنیوں اور سوکھی پتیوں اور ایک ٹوٹے ہار کے دانوں کی طرح بالکل بلبلوں کے بیچ ہی مادہ خرگوش نے ان دو ننھے خرگوش کے بچوں کو دیکھا۔ مرے ہوئے لمبے اور پتلے، ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی اور کان تنے ہوئے تھے۔ وہ پانی پر دوڑ رہے تھے اور دوڑتے رہے، وہ اچھے نادان بچوں کی طرح جو موت کے بعد بھی ایک دوسرے کو پیار کرتے تھے۔

اب بوڑھی مادہ خرگوش ٹاپو پر سچ ہی اکیلی تھی —

(ترجمہ۔ ہندی سے)

وحید یوسف زئی

[illegible] ان پیار بھری نظروں سے
[illegible] میں تلی نظروں سے
[illegible] زاہد سی بنی نظروں سے
[illegible] شرابی ہوئی نظروں سے
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

تم بھی معصوم ہے فطرت بھی تمہاری معصوم
کتنا چنگیز ہے یہ وقت تمہیں کیا معلوم
دہر میں عشق کا سمجھا ہی گیا کیا مفہوم
مجھ کو منظور نہیں حسن کو دیکھوں مغموم
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

چاہتی ہو کہ یونہی مل کے رہیں گنگ و جمن
چاندنی رات ہو، دو دل ہوں دھڑکنے میں مگن
اور کہتی ہو کہ اب جیسے پڑے گا نہ گہن
میری مانو کہ تمہارا تو نہیں ہوں دشمن
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

زندگی صرف گلِ تر ہی کی رعنائی نہیں
خمِ گیسو و مہِ نو ہی کی انگڑائی نہیں
نغمہ و شعر نہیں، مستی و برنائی نہیں
ایک زہراب کسی کے بھی جو کام آئی نہیں
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

دور کی بات نہیں میں بھی کبھی تھا ناداں
غور کرنے ہی نہ دیتے تھے مچلتے ارماں
خون کے بدلے رگوں میں تھی رواں برقِ تپاں
آج لیکن مرے دل سے فقط اٹھتا ہے دھواں
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

میری چھوڑو کہ میں اک شاعرِ آشفتہ مزاج
میرا فردا نہ کوئی دوش نہ میرا کوئی آج
کتنی مدت سے ہے جانے مری دنیا تاراج
کیوں مگر ٹوٹے تمہارے حسیں خوابوں کا زجاج
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

دل کی باتیں نہ سنو اک ذرا میری بھی سنو
عشق اک آگ ہے اور آگ کی لپٹوں سے بچو
تم تو خود شمع ہو، پروانوں پہ کیوں جل کے مرو
دامنِ زیست میں کانٹے ہی نہ کانٹے بھر لو
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

سلیمان اریب

دو گھنٹے

گھنٹی بجی، ہم سب دو گھنٹوں کے لیے پیریڈ روم میں داخل ہوئے۔ [illegible] سے فضا گونجنے لگی، ہماری نظریں آواز کی طرف اٹھ گئیں —— [illegible] سے فضا جھنک رہی تھی —— دیکھیں کون آ رہے ہیں —— اچھا! آپ ہیں —— [illegible] ارے ادھر اوہو، شاعر صاحب —— ارے یہ کون؟ کون! جانتی نہیں۔ نہیں تو —— اچھا اب [illegible] ادھر [illegible] شمشاد کو واقعی پسینہ آ گیا۔ نجمہ نے شمشاد کے بازو چٹکی لی، کیوں اب پہچان لیا نا —— شمشاد کا چہرہ لال گلال ہو گیا۔ ہٹ، ہر وقت ایسی ہی باتیں۔ واللہ کیسے رنگین مزاج ہیں کیا [illegible] پائی ہے۔ آپ کے انداز قدم تو ملاحظہ ہوں —— قہقہے۔

نجمہ نجمہ مجھے دیر تو نہیں ہو گئی۔ کیا ابھی تک پروفیسر نہیں آئے۔ گلاب گھڑی دیکھتے ہوئے بولی، اوہو اب آ تیں ہیں۔ کہاں دیر لگا دی تھی۔ تیوری پر بل ڈال کر نجمہ نے رقیبانہ انداز میں کہا۔ نجمی ساڑی کی بہار۔ شفق کو بھی مات کر رہی ہے۔ چھیڑتے ہوئے کملا بولی —— گلاب کا سانس پھول رہا تھا وہ قدرتی طور پر موٹی تھی۔ اس کا رنگ گلاب جیسا سرخ تھا۔ جب وہ تیز چلتی تو ہانپنے لگتی گلاب کو اس حال میں دیکھ کر اس کی سہیلیاں ہنسنے لگتیں۔ کلثوم تو ہر وقت گلاب کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ کلثوم نے آہستہ سے کملا کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ کملا ہنس پڑی، کملا نے نجمہ کے کان میں بھی وہی بات کہہ دی۔ سب سہیلیاں ہنسنے لگیں۔ گلاب دیوانوں کی طرح ہر ایک کا چہرہ تک رہی تھی —— "آخر میں بھی تو جانوں۔ تم سب ہنس کیوں رہی ہیں؟" گلاب بولی، اس جملے پر اور بھی قہقہے پڑے۔ "مائی ڈیر گلاب۔ تجھے دیکھ کر میرا دل انار کھانا چاہتا ہے" کملا بولی، اب تو گلاب کالج بھر میں انارکلی کے نام سے مشہور ہو گئی۔

اس دلچسپ محفل سے دور ثریا پھولوں کے تختے کے قریب کھڑی، سر کے بال الجھا رہی تھی۔ چند ماہ سے ثریا نے اپنی تمام سہیلیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ ثریا سنجیدہ لڑکی تھی، کملا ہر وقت ثریا کو بنایا کرتی تھی، ثریا کو یہ بات پسند نہ تھی۔ باتوں باتوں میں ثریا اور کملا میں جھڑپ ہو گئی۔ سہیلیوں نے بھی کملا کا ساتھ دیا۔ ثریا نے اپنی سہیلیوں سے بالکل کاٹ کر رکھا تھا —— تنہائی میں ثریا کو سوائے سر کے بال الجھانے کے اور کوئی کام نہ تھا —— کئی ماہ بعد آج کالج کھلا، کملا اور دوسری لڑکیاں کامیاب ہو گئی تھیں، ایک زمانہ بعد جب سب کی سب ملیں تو دل کے سوئے ہوئے خواب بیدار ہو گئے ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی کی بجلیاں رگ رگ میں کوندنے لگیں —— اب بھی ثریا کے دل کا ناسور ہرا تھا۔ وہ اپنی تمام سہیلیوں سے علیحدہ کھڑی کچھ سوچ رہی تھی، کملا کا دل صاف تھا وہ لڑتی تھی اور بہت جلد سہیلیوں کو منا بھی لیتی تھی، آج ثریا کو منانے کا اچھا موقع تھا۔ آہستہ سے کملا ثریا کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے ثریا کی آنکھیں بند کر دیں، دوسری لڑکیاں بھی ان کے اطراف جمع ہو گئیں۔ قہقہے برسنے لگے، وہ دستے ثریا تلملا اٹھی، چند لمحوں کی کشمکش کے بعد کملا نے اپنا ہاتھ ثریا کی آنکھوں سے ہٹا لیا۔ دونوں میں پھر دوستی کی پینگیں بڑھنے لگیں —— نجمہ کی نظریں ثریا کے قیمتی لباس پر [illegible] —— ثریا انگوری رنگ کا دوپٹہ اور سلمہ ستارے والے بلاؤز کو دیکھ کر نجمہ کی آنکھوں میں ستارے جھلملا گئے۔

[illegible] اس ڈوپٹہ کا رنگ کتنا پیارا ہے۔ کیوں فریدہ۔ کتنا پیارا [illegible] وہی اپنی دیوانی باتیں۔ نجمہ، تجھے زندگی میں سوائے رنگ، قیمت، دکان [illegible] تھا۔ جب دیکھو ' اہا کتنا پیارا رنگ ہے، کتنا قیمتی لباس ہے، کہاں سے [illegible] رہا ہے ' یہ کیوں نہیں کہتی کہ خریدنے کی سکت نہیں ہے' جمیلہ نے فریدہ پر طعن کی۔ [illegible] بدن میں آگ سی لگ گئی ' جمیلہ میں تجھے جانتی ہوں ' مکار ' دستر خوان کی بلی ' غصہ سے فریدہ [illegible] کیا رٹ لگا رکھی ہے ' کوئی کام بھی کرنے دوگی یا یوں ہی بک بک کئے جاؤگی ' [illegible] ہوئے فہمیدہ بولی ــــ اچھا اب مینڈک کو بھی زکام ہونے لگی ' بڑی آئی پڑھنے والی فہمیدہ کی [illegible] ہوئے کملا بولی۔ ایم اے میں فہمیدہ نے فلسفہ لے رکھا تھا ' جب دیکھو بغل میں موٹی موٹی کتابیں ' [illegible] پر موتی سی عینک ' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ــــــ علم کے ذوق شوق نے فہمیدہ کو عجیب وغریب فہمیدہ بنا دیا تھا۔ سوسائیٹی ' ہنسی مذاق ' سے وہ ہمیشہ بیگانہ رہی ' شاید ہی کسی نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی ہو ' جب دیکھو ہاتھ میں پنسل ' نوٹ بک اور سامنے کھولی ہوئیں بڑی بڑی کتابیں ' فہمیدہ کے اس دیوانے مطالعہ سے دیکھنے والوں کی آنکھیں دکھ گئی تھیں ' کملا کو فہمیدہ کے اس مطالعہ سے چڑ سی ہوگئی تھی ' جب کبھی فہمیدہ کوئی کتاب پڑھتی تو کملا اس سے نوٹ بک کھینچ لیتی ' کتابیں بند کردیتی اور پنسل سے کھیلنے لگتی ' کملا کی ان حرکتوں پر فہمیدہ تلملا اٹھتی ' غصہ سے کانپنے لگتی ' کئی بار کالج کے برانڈے میں ان دونوں میں خوب نوک جھونک ہوئی ' لیکن کملا کبھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی ' جب کبھی فہمیدہ غصہ سے نیلی پیلی ہوجاتی تو کملا مسکراتے ہوئے اس کے قریب آتی اپنی باہیں فہمیدہ کے گلے میں حمائل کرکے کہتی " ڈیر فہمیدہ تو اس حال میں مجھے کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے " [illegible] فہمیدہ مسکرا دیتی۔

ادہر نجمہ اور ثریا میں سینما جانے کی تیاریاں ہورہی تھیں ' ثریا انگلش پکچر کی دیوانی تھی ' ثریا کی ساتھ داری نے نجمہ کو بھی سینما بینی کا چسکا لگا دیا تھا۔ موٹر نجمہ کی ہوتی اور ٹکٹ ثریا کے ــــ نجمہ سنا ہے کہ گریٹا گاربو کا پکچر آیا ہوا ہے ' چلوگی ' نجمہ کی پیشانی خوشی سے چمکنے لگی ' سچ ــــ تو پھر کملا کو بھی لے چلو ' کیوں کملا تیار ہے ــ ہاں ہاں ' کیوں نہیں ' ایسے دکھانے والے مل جائیں تو انکار کیسے ہوسکتا ہے ' ــــ ہم بھی دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں ' عینک درست کرتے ہوئے فلسفی فریدہ بولی ــــ اوہ یہ زاہد خشک کیسے ٹپک پڑے ' سب لڑکیوں نے ہنسنا شروع کیا۔ کملا نے موٹی موٹی کتابیں فریدہ کے سامنے رکھدیں ' اور کہنے لگی ' بی فلسفی کہاں کا کھیل ' کیسا تماشا ' تمہاری دلچسپی تو گوئٹے ' نطشے ' شوپن ہاویر میں دفن ہے ' کانٹ کا فلسفہ چھانتی رہو ' کہاں تم اور کہاں یہ پیار ' محبت کی باتیں ' توبہ توبہ ــــ نجمہ ' جمیلہ ' ثریا سب کی سب ہنسنے لگیں ' واللہ اچھا پارٹ ادا کیا ' کمال ہی کردیا ' میں کہتی ہوں کہ تو کسی تھیٹر کمپنی میں شریک ہوجا ــــ نقال کہیں کی ۔ یہ ہے اسی کام کی ' فریدہ نے چوٹ کی ' [illegible] کیا طے ہورہا ہے ' آخر ہم بھی تو سنیں ' اچھا سینما جانے کی تیاریاں ہونے لگیں ' ہم بھی دیکھیں گے [illegible] جاتے ہیں ۔ سنا نہیں ' آج ریڈیو پر ریحانہ کا افسانہ نشر ہورہا ہے [illegible]

اس کے ہاں کھانا ہے۔ نزہت بولی' یہ سنتے ہی سب کی توجیوں پر اوس کی پڑ گئی [illegible] تھا نہیں کیں جائیں گے' ہونٹ لٹکائے ہوئے ثریا نے کہا'

یہ ریحانہ کو کیا ہو گیا۔ کالج کیوں نہیں آ رہی ہے' مجھے تو معلوم ہوگا۔ بتا بات کیا ہے' فہمیدہ انگڑائی لیتے ہوئے بولی' سنا ہے کہ اس کی شادی ہو رہی ہے ——— آپ بتا مجھے کب سے رنگے جا رہے ہیں۔ کملا بولی — مہندی کا نام سنتے ہی فہمیدہ کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں' نظروں کے سامنے تاج محل جگمگانے لگے۔ مسرت بھری زندگی کا دلفریب تخیل دماغ میں گھومنے لگا ——— ابھی تک پروفیسر نہیں آئے! بات بدلتے ہوئے فہمیدہ بولی — بھاگو بھاگو پروفیسر آ گئے' فریدہ چلا اٹھی'

کھٹ پٹ' کھٹ پٹ کرتی ہوئیں' لڑکیاں اپنے لکچر روم میں داخل ہوئیں' چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری ہو گئی' تعظیم کے لئے لڑکے اور لڑکیاں اٹھ گئیں' لڑکیوں کے چہروں سے علم کے چشمے ابل رہے تھے' ان کی آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں ہم نے علم کے میدان میں قدم رکھا ہے ہم کو لڑکوں کا مقابلہ کرنا ہے' ہم کو انھیں نیچا دکھانا ہے۔ خواہ مردوں نے اپنا سکہ جما رکھا ہے' زندگی کے ہر شعبہ میں ان کو نیچا دکھانا ہوگا ——— بہار زندگی کی ان نوشگفتہ کلیوں کو دیکھ کر پروفیسر کے مرجھائے ہوئے چہرے پر اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ گئی' ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

پروفیسر کے چہرے کو دیکھ کر لڑکیاں سہم گئیں' ان کے دہ دلولے اور دہ چہچے کچھ دیر کے لئے دب گئے وہ بید کی طرح کانپنے لگیں' جب کبھی پروفیسر کوئی سوال کرتے' ادھر سے خاموشی کے سوائے کوئی جواب نہیں آتا۔ ادھر لڑکوں کے قہقہوں سے فضا گونجنے لگتی' لڑکیوں کی خودداری نے اپنا زور دکھایا۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ آخر ہمت کر کے ایک لڑکی نے اپنی سہیلیوں کی وکالت کا ذمہ لیا۔ اس نے اپنا اور اپنی سہیلیوں کا تعارف کر دیا ——— "آپ میں سے اول کون آئی ہیں؟" پروفیسر کی آواز کمرے کی فضا میں تیرنے لگی۔ لڑکیوں کی قطار سے جی جی کی سرگوشیاں فضا میں گونجنے لگیں' ادھر سے قہقہے ابلنے لگے —" جی یہ آئی ہیں" ہمت کر کے ایک لڑکی بولی' پروفیسر لکچر دے رہے تھے' ادھر اور ادھر باتیں ہو رہی تھیں ——— یہ کیا ہو رہا ہے۔ میز پر مکا مار کر گرجدار آواز سے پروفیسر نے پوچھا۔ لڑکیاں اپنی جگہ سے اچھل پڑیں ——— ڈرتے ڈرتے ایک نے کہا' جی۔ آج مضمون کا دن تھا ——— آج مضمون کا دن ہے! کیا آپ لڑکیوں نے مضمون لایا ہے۔ پروفیسر نے پوچھا۔ "ہاں لایا ہے" پروفیسر کی نظریں لڑکوں کی طرف اٹھ گئیں ——— کیا آپ لوگوں نے بھی لایا ہے ——— بڑی مصیبت میں پھنس گئے' ان لڑکیوں کو خدا سمجھے' اب کیا کہیں — بیٹھے بیٹھے لڑکوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک کونسل کر ڈالی ——— ایک صاحب اٹھے اور پروفیسر سے لڑکیوں کے مضامین سننے کی خواہش کی' پروفیسر موقع ہی ڈھونڈ رہے تھے' کسی نہ کسی طرح سے لڑکیوں کے مضامین سنا کر لڑکوں کو غیرت دلائیں۔ پروفیسر نے عینک درست کی' مضامین پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اپنے نپے تلے الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے کہا

[illegible] ہے۔ ایک مضمون کی دو چار سطریں بھی ختم نہ ہوئی تھیں کہ ایک صاحب نے مضمون [illegible] میں بھیجنے کی فرمایش کی اور کہا فی الحال ہمارے سیاسی لیڈروں کو غیرت کی سخت ضرورت ہے۔
[illegible] سے خوب قہقہے پڑے "دہان" کے عنوان کا ایک اور مضمون فضا میں لہرانے لگا۔
[illegible] ہی میرے تخیل میں غالب کا ایک شعر گھومنے لگا ——— ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی ——— واقعی میں کہاں ہوں میں دیوانوں کی طرح اپنے اطراف دیکھنے لگا ——
میرے [illegible] بازو چند لڑکے بیٹھے ہوئے تھے، دائیں بازو لڑکی کا ایک چھوٹا سا خوبصورت گروہ تھا۔
سامنے ایک کالا تختہ اور اسٹیج پر پروفیسر کا مرجھایا ہوا چہرہ، فضا میں ہنسی، قہقہے، سرگوشیاں اور مہین آوازیں۔
یہ وہاں تھا جہاں مجھے سب کچھ میسر تھا۔ مضمون شروع ہوا اور ختم بھی، لیکن میں تخیلات کی دنیا میں کچھ اس طرح بھٹک رہا تھا کہ مجھے اپنی حماقت کا اس وقت احساس ہوا جب کہ ایک نیلا کاغذ پروفیسر کی انگلیوں میں پھیلنے لگا۔ کاغذ کی رنگینی اور خوش خطی کو دیکھ کر میرا ذوقِ تجسس پرواز کرنے لگا۔ میری دلچسپی خط کی رنگین عبارت آرائی کی طرف تیز ہونے لگی ——— مضمون اب شروع ہوگیا — پروفیسر نے بڑا کھولا گلوری ہونٹوں میں دابی، اچٹتی ہوئی نظر سے ہمیں دیکھا اور اپنی نشست کا رخ بدلتے ہوئے مضمون کا عنوان پڑھا۔ جس کا مجھے بڑا اشتیاق تھا، میرے ایک ساتھی نے اس زور سے چھینکا کہ عنوان چھینک کی زد میں بہہ گیا۔ تب کچھ بھی سن نہ سکا۔ میں نے صرف اتنا سنا۔

"بارش کے دن تھے، تاریک راتیں تھیں، ہم کو ایک طویل سفر درپیش تھا۔ میں، دادی، امی اور بھائی سب کے سب موٹر میں بیٹھ گئے، امی کہتی رہیں، لمبا سفر ہے، رات کا وقت ہے، صبح سے سفر شروع کیا جائے تو مناسب ہے، ابا ضدی تھے، اپنی ہٹ پر اڑے رہے۔ ابا کو اپنے پستول پر بڑا ناز تھا۔ انھوں نے اپنے اس پستول کی ہمت پر بڑے بڑے خطرناک سفر کئے تھے.................. یہ سفر ان کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ مجھے تو سفر کے نام سے خوشی ہوتی۔ خوش کیوں نہ ہوتی۔ مجھے اپنی پرانی سہیلی ذکیہ سے ملاقات کی زمانہ سے آرزو تھی۔ میں تو چاہتی تھی کہ جتنا جلد ہوسکے میں اپنی سہیلی کے ہاں پہنچ جاؤں" —— واقعی مضمون بڑا ہی دلچسپ تھا۔ الفاظ کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ ہمارا اشتیاق بڑھتا جارہا تھا۔ ہماری دلچسپی مضمون میں تھی —— ایسے وقت، رنگ رنگ، رنگ گھنٹی بجنی شروع ہوئی۔ پروفیسر نے کاغذ کو میز پر رکھ دیا۔ جانے کی تیاری کرنے لگے،

رات کا وقت تھا۔ آٹھ بجے تھے، میں یوں ہی ریڈیو کا ڈائل گھما رہا تھا۔ ۴۱۱ میٹر پر کوئی لڑکی اپنا افسانہ نشر کر رہی تھی، لڑکی کی آواز کے ساتھ آج کے دو گھنٹوں کی پرلطف زندگی کا سہانا ماحول آنکھوں میں پھر گیا۔ افسانہ ختم ہوا — میں یوں ہی اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ایک حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ چاندنی رات تھی چاند آسمان کے سمندر میں ہلکورے کھا رہا تھا۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے میرا دماغ مہکنے لگا۔ میرے دماغ کی چٹانوں سے تخیلات کے حسین ٹکڑے ٹکرانے لگے۔ —— وہی لکچر روم، کھڑکی کھڑکی کے رنگین پردے اسٹیج، میرے ساتھی، ساتھیوں کی دلچسپ اور شیریں گفتگو کے دل آویز ٹکڑے —— آہستہ آہستہ میری آنکھیں نیند کے پیمانوں سے چھلکنے لگیں۔

سید محی الدین احمد

خواہش

ٹوٹے ہوئے سفینۂ ہستی کی ناخدا — صحرائے زندگی پہ برستی ہوئی گھٹا

پژمردہ دل کی حسرتِ بیدار بھی تو ہے — دل اپنا دے کے دل کی طلبگار بھی تو ہے

مہتاب کی کرن کا سہارا تو ہی تو ہے — دریائے زندگی کا کنارا تو ہی تو ہے

دوشیزگی تو ہی ہے عروسِ بہار کی — صورت تری سحر ہے شبِ انتظار کی

تاروں کی روشنی، گلِ تر کی شگفتگی — تیری جبینِ ناز ہے معراجِ بندگی

تیرا شباب عہدِ جوانی کی آرزو ! — سینے میں تیرے دفن محبت کی آبرو

تو بے حجاب ہوتی ہے بادل کے سائے میں — سوتی ہے زندگی ترے آنچل کے سائے میں

موجوں کے اضطراب کو تجھ سے ملے قرار — عمرِ رواں کے ساتھ ٹھہر جائے آبشار

خوابیدہ ہے فسوں تری نظروں کی گود میں — دل بن کے میں رہوں تری نظروں کی گود میں

آ میری شامِ ہجر کی زلفیں سنوار دے — آ مجھ خزاں زدہ کو پیامِ بہار دے

آ اے چراغِ حسن کہ پروانہ ہو نثار — آ میرے آنسوؤں کو بنالے گلے کا ہار

آ ! مدتوں سے ہوں میں ترے انتظار میں — ماتم ہے حسرتوں کا دلِ بے قرار میں

پورا نہ ہو سکا اگر ارمان دید کا

نکلے گا میرے ساتھ جنازہ امید کا

جبریل
(جبل پور)

۱۔ [illegible] (افسانے) از حجاب امتیاز علی ... حجم ۲۰۰ صفحے قیمت عا/ پتہ دفتر رسالہ شہاب بیرون دبیر پورہ۔ حیدر آباد دکن

۲۔ [illegible] (افسانے) از ابراہیم جلیس۔ حجم ۲۰۰ صفحے قیمت ے/ پتہ نفیس اکیڈمی۔ عابد روڈ۔ //

۳۔ [illegible] (افسانے) مترجمہ قاضی زین العابدین قیمت عا/ پتہ مکتبۂ علمیہ۔ قاضی واڑہ۔ میرٹھ

۴۔ [illegible] (ریڈیائی ڈرامے) از سعادت حسن منٹو۔ حجم ۲۰۸ صفحے قیمت عا/ پتہ اردو اکیڈمی۔ لاہور

۵۔ جرسول (افسانے) از نور الحسن بی اے۔ // ۲۳۱ // // عا/ // حیدر آباد بک ڈپو۔ حیدر آباد دکن

۶۔ دنیائے [illegible] (ورق کے حالات) از محمود رضویہ۔ حجم ۱۹۴ صفحے قیمت عا/ پتہ شعاع اردو دار الاشاعت۔ کراچی

۷۔ علم دوستی (بادشاہ کا فدا) مترجمہ برزوجی فیروز شاہ ۲۶۴ // // ے/ // نفیس اکیڈمی۔ عابد روڈ۔ حیدر آباد دکن

۸۔ مسلمان عورت۔ از ابو الکلام آزاد۔ قیمت عا/ پتہ ادبستان۔ موچی دروازہ۔ لاہور

۹۔ پگڈنڈیاں (افسانے) از شیریں // عا/ // کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی

۱۰۔ تاریخ گجرات۔ از شمیم احمد۔ حجم ۱۵۸ صفحے۔ قیمت عہ۔ پتہ ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس۔ الہ آباد

۱۱۔ تجلیات (مجموعۂ کلام) از میر عثمانی۔ قیمت عا/۔ پتہ۔ مکتبۂ قصر الادب۔ آگرہ

۱۲۔ دلکش شخصیت۔ مترجمہ۔ فیروز شاہ تاراپوری حجم ۲۱۱ صفحے۔ قیمت مجلد عا/

۱۳۔ جام شکستہ (افسانے) از ایم اسلم۔ قیمت ے۔ پتہ کتب خانہ دار البلاغ محمد نگر میو روڈ۔ لاہور

۱۴۔ اجالے سے پہلے (//) از مدھوسودن۔ حجم ۲۱۶ صفحے قیمت عا/ پتہ اردو محل۔ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدر آباد دکن

۱۵۔ دنیا ہماری (//) از پردیسی // ۲۲۹ // // عا/ // راج محل پبلشرز۔ جموں۔ کشمیر

۱۶۔ پہلو (افسانے) از لطیف اللہ عدیل۔ حجم ۱۶۲ صفحے // عا/ // محمد امان اللہ خان ۲۲۲ نذر علی بلڈنگ۔ دھوبی اسٹریٹ بمبئی

۱۷۔ پریشاں جلوے (مضامین نظم و نثر) مرتبہ حیات ترین حجم ۲۳۹ صفحے قیمت عا/ پتہ عباسیہ اکادمی بغداد الجدید۔ بہاول پور

۱۸۔ ادب پارے (ریڈیائی تقاریر) از ضیاء الاسلام حجم ۱۰۹ // پتہ حلقۂ ادب ۱۳۔ اسٹینلی روڈ۔ الہ آباد

۱۹۔ شب تاب (مجموعۂ کلام) از اسرار الحق مجاز۔ قیمت عا/۔ // ہندوستانی پبلشرز۔ اردو بازار۔ دہلی۔

۲۰۔ مجھے خرید لو۔ (ریڈیائی ڈرامے) // // // // // ۱۲/ // // //

۲۱۔ ایک جام میں (ناول) از نواب خواجہ محمد شفیع // عا/ // // // // //

۲۲۔ معاہدۂ ہند و برطانیہ از سر سلطان احمد // عہ/ // // // // //

۲۳۔ قندیل (آزاد نظمیں و غزلیں) از قیوم نظر // عہ/ // اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ۔ لاہور

۲۴۔ تعمیر ملت۔ از محمد شریف چشتی // عہ/ // // //

۲۵۔ اس نظم میں از میرا جی۔ قیمت ے پتہ ساقی بک ڈپو۔ دہلی

۲۶۔ پائل (گیت) از سلام۔ // ۱۲/ // // //

۲۷۔ دھنک (نظمیں) از ضیاء الاسلام قیمت عا/ پتہ حلقۂ ادب ۱۳۔ اسٹینلی روڈ۔ الہ آباد

۲۸۔ نظمیں اور زنجیریں (مجموعۂ کلام) از مخمور جالندھری۔ حجم ۱۷۲ صفحے قیمت ے پتہ مکتبۂ جدید۔ بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

۲۹۔ شہید و نفیس (افسانے) از سیاح سنامی قیمت عا/ پتہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز۔ لاہور

۳۰۔ کچھ آثار (افسانے) از انور کمال قیمت عہ // // // // //

اردو شاعری کی خدمت

(مدیر [illegible] سے گزارش ہے کہ [illegible])
کی اطلاع کے لیے شائع [illegible]

غالباً آپ کو علم ہوگا کہ اردو شاعری کا ایک جامع انتخاب بترتیب خاص بنام "سلسلۂ منتخبات نظم اردو" [illegible] سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اور اس کے تین عنوان مستقل قرار پائے ہیں۔
(۱) "معارف ملت" جلد اول، دوم، سوم و چہارم (۲) "جذبات فطرت" جلد اول، دوم، سوم و چہارم (۳) "مناظر قدرت" جلد اول، دوم، سوم و چہارم۔ ہر عنوان کے تحت چار چار جلدیں چار ہی سال میں [illegible] تک شائع ہو گئیں۔ جملہ بارہ جلدوں میں دور قدیم و جدید شعراء کا کلام [illegible] کی شکل میں کم و بیش دو ہزار صفحات پر پھیل گیا جو کیفیت و کمیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر قرار پایا۔ چنانچہ سلسلۂ [illegible] علمی و ادبی حلقوں میں، تعلیمات و جامعات میں اور عام طبقات میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے اور نکل رہے ہیں۔ [illegible] یہ کہ تا حال پچاس ہزار سے زیادہ نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ حالانکہ تجارتی معمول کے پیمانے پر اس سلسلہ کا اشتہار کبھی نہیں نکلا۔ پہلے اشاعت کا مرکز مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ رہا۔ چند سال سے اس کی اشاعت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے [illegible]
اردو میں ماشاء اللہ جس جس رنگ کی شاعری جس پیمانے پر ترقی کر رہی ہے اس میں اردو ادب کا نیا دور نظر آتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ بیس پچیس سال میں بہت کچھ قابل قدر کلام شائع ہو چکا ہے۔ مجموعوں میں، رسالوں میں اور بہت کچھ کلام غالباً بیاضوں میں موجود ہے۔ جو آئندہ شائع ہوگا۔ غرض اردو شاعری کا مستقبل بفضلہٖ امید افزا نظر آتا ہے۔ رہا کلام کا ذوق اور معیار۔ سو یہ ماحول کے بے شمار اثرات سے بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہیگا دوامی یک رنگی نا ممکن ہے اور نامناسب بھی کہ فطرت ہی خود تغیرات کا تسلسل ہے۔
اس دوران میں بعض جوانب سے تقاضا بلکہ ابرام ہوتا رہا کہ بعد کی شاعری بھی سلسلے میں منسلک کر لی جائے تاکہ انتخاب کا مقصد کمل ہو جائے۔ ہر سہ عنوانات مذکورہ کے تحت مزید جلدیں ساتھ ساتھ شائع ہوں۔ خود مرتب کا بھی مدت سے یہ خیال تھا۔ لیکن کثرت کار نیز [illegible] تاہم اردو کی خدمت بہر حال واجب ہے اور قصد ہے کہ حضرات شعرا اگر اردو کی صلاح و فلاح کی خاطر حسب سابق ازراہِ کرم تعاون فرمائیں تو قدیم طریق کے یا جو منتخبات کی مزید جلدیں ترتیب دے دے کر حسب صراحت بالا شائع کی جائیں تاکہ اردو کلام کا انتخاب اس سلسلے کی حد تک مکمل ہوتا جائے اور اردو شاعری کی نت نئی نوعیت و وسعت بھی اجمالی شکل میں ملک کے پیش نظر ہوتی رہے انشاء اللہ۔
حضرات شعرا کے تعاون کی وہی شکل ہے کہ اول تو کلام کے مطبوعہ مجموعے عنایت ہوں جو بعد مطالعہ واپس کر دئے جائیں گے یا جن کی قیمت ارسال کر دی جائے گی۔ البتہ ہدیتہً عنایت ہوں تو دوسری بات ہے شکریہ۔ دوسرے جو کلام رسالوں میں متفرق شائع ہوا ہو۔ یا جو بیاضوں میں جمع ہو جسب صوابدید اس کی نقلیں ارسال فرمائی جا سکتی ہیں۔ لیکن وہ واپس نہ ہو سکیں گی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جو بیاضیں دست بدست وصول ہوں۔ ان کو بعد مطالعہ دست بدست واپس کر دیا جائے۔ توقع ہے کہ مستقل تعاون کے ساتھ کلام کی ترسیل اور منتخبات کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا [illegible] غرض کہ جوں جوں کلام کافی منتخب ہوتا جائے گا۔ معارف ملت، جذبات فطرت، مناظر قدرت ہر سہ عنوانات کے تحت ایک ایک جلد ترتیب پا کر تینوں جلدیں ساتھ ساتھ شائع ہوتی جائیں گی۔ جیسے ہر سہ عنوان کی جلد ہائے پنجم یا جلد ہائے ششم وغیرہ۔
جو حضرات ازراہِ کرم اپنا کلام ارسال فرمائیں۔ اس کے ساتھ اپنے مکتوب میں اجازت طبع تحریر بھی فرما دیں تو بہتر ہو اور اپنے متعلق ضروری معلومات بھی درج فرما دیں یعنی اپنا پورا نام، اپنا تخلص، اپنا وطن یا پتہ، سن ولادت، اگر کچھ کلام شائع ہو چکا ہے تو مجموعوں کے نام اور اشاعت کے مقام تاکہ انتخاب کلام کی صورت میں ضروری معلومات متعلقہ جلد کے ضمیمے میں درج ہو سکیں۔ جن حضرات کا کلام کسی جلد میں شائع ہوگا۔ ان کی خدمت میں متعلقہ جلد کا نسخہ ہدیتہً پیش ہوگا۔ اگر کسی صاحب کا کلام انتخاب میں نہ آ سکے تو ان سے پیشگی معذرت چاہی جاتی ہے۔ اور عدم انتخاب سے خدانخواستہ ان کے کلام پر حرف نہیں آتا۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ مذکورہ کلام کا علمی و ادبی معیار انتخاب کے عام فہم معیار سے [illegible]
جن حضرات شعرا کے پتے معلوم ہو چکے ہیں یا آئندہ معلوم ہوں گے ان کی خدمت میں یہ معروضہ بذریعہ ڈاک روانہ [illegible] ہوگا۔ [illegible] حضرات اگر دوسرے پتوں سے مطلع فرمائیں تو باعث تشکر ہوگا۔ پھر بھی جن حضرات کے پتے معلوم نہ ہو سکیں ان سے عدم ترسیل معروضہ کی معذرت چاہی جاتی ہے۔ اطلاع ملنے پر وہ خود ہی التفات فرمائیں تو کرم اور بھی زیادہ ہوگا۔ اردو رسائل و اخبارات سے بھی استدعا کی جاتی ہے کہ وہ ازراہِ کرم پورا معروضہ یا اس کا خلاصہ بشرط گنجائش شائع کر کے تعاون فرمائیں۔ توقع ہے کہ یہ استدعا کسی نہ کسی حد تک ضرور قبول ہوگی اور رسائل کے ذریعے بھی حضرات شعرا تک عام اطلاع پہنچ جائے گی۔ حامیان اردو کی خدمت میں اردو کے ایک ادنیٰ خادم کی یہ ناچیز [illegible]
"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

[illegible]

نتیجۂ امتحان اُردو فاضل بابت ۱۹۴۵ء

ناموں کی ترتیب بلحاظ نتائج مصنوعی گئی ہے۔

۲۳ سید ناظم حسین دوم (بلدہ نوح)

۲۴ سید عبدالعزیز دوم (میسور)

۲۴ شفیع احمد دوم (بولی)

ناموں کی ترتیب بلحاظ رول نمبر

مرکز بشیر آباد

۳۔ سید بدرالدین احمد شہرت دوم

۴۔ سید کریم الدین دوم

۵۔ جیلانی بیگم ناہید سوم

مرکز بلدہ

۹۔ سید عثمان دوم

۱۰۔ مرزا محمد بیگ سوم

۱۱۔ سید شاہ قطب الحق دوم

۱۲۔ محمد مظہر الرحمٰن سوم

۱۳۔ محمد عبدالقدیر خاں سوم

۱۴۔ غلام محمد سوم

۱۵۔ محمد عبدالباری خاں شوز سوم

۱۶۔ محمد عبداللطیف دوم

۱۸۔ سید ظہور احمد سوم

۲۰۔ محمد عبدالسلیم شمیم سوم

۲۱۔ نیاز محمد خاں درانی سوم

۲۲۔ محمد شہاب الدین احمد سوم

مرکز بلولی

۲۴۔ محمد عبدالجلیل سوم

۴۸۔ غلام معین الدین سوم

۴۹۔ شفیع احمد دوم

مرکز ٹاکلی جاگیر

۲۶۔ محمد عبدالقادر خاں دوم

۲۷۔ قاضی محمد تاج الدین سوم

۲۸۔ افضل النسا بیگم سوم

مرکز کوڑنگل

۲۹۔ فیاض علی سوم

۳۱۔ محمد عبدالکریم سوم

۳۴ محمد عبدالسلیم سوم

مرکز میسور اسٹیٹ

۳۵۔ ایم قادر علی خاں دوم

۳۷۔ بی عبدالبصیر دوم

۳۸ بی پیر خاں سوم

۴۰۔ قاضی عبدالقادر فیاض دوم

۴۱۔ علی اکبر دوم

۴۲۔ عبدالمجید بیگ دوم

۴۳۔ سید عبدالعزیز دوم

۴۴۔ رقیہ بی سوم

نتیجہ امتحان اُردو عالم بابت ۱۹۶۶ء

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات حصلہ

۷۵ - منیرہ قانم اول (بمبئی)
۶۵ - کیپٹن حبیب حسین اول (بلدہ فوج)
۲۷ - علیم اللہ صدیقی اول (بلدہ ذکور)

ناموں کی ترتیب بلحاظ رول نمبر

مرکز الند

۱ -	محمد عبدالقادر	سوم
۲ -	نارائن چاری	سوم
۵ -	لکشمن راؤ	سوم
۷ -	نسیم النسا بیگم	دوم
۹ -	سلیم النسا بیگم	سوم

مرکز بشیر آباد (پائیگاہ)

۹ -	محمد عبدالباری	سوم
۱۰ -	محمد عبدالرشید	دوم

مرکز بلدہ (اناث)

۱۲ -	حفیظ فاطمہ	سوم
۱۹ -	چاندنی بیگم	سوم

مرکز بلدہ (ذکور)

۲۷ -	محمد علیم اللہ صدیقی	اول
۲۸ -	ہریش چندر	دوم
۳۱ -	محمد احمد محی الدین قادری	سوم
۳۳ -	رشید احمد خاں	دوم
۳۵ -	محمد جعفر علی	دوم
۳۸	بہادر علی مرزا	سوم
۴۰ -	محمد ممتاز علی خاں صدیقی	دوم
۴۱ -	محمد عبدالقادر حبیب	دوم
۴۳ -	سید عبدالرزاق اعجاز	دوم
۴۴ -	سردار علی خاں	دوم
۴۸ -	سید نظام الدین احمد	سوم
۴۹ -	محمد بدرالدین سلیم	سوم
۵۰ -	حمیدالدین احمد	دوم
۵۱ -	محمد عبدالصمد	دوم
۵۲ -	محمد عبدالعلیم خاں مظہر	سوم
۳ -	داوا داؤ مورے	سوم
۱۵۸ -	سید احمد حسین	سوم

مرکز بلدہ (فوج)

۶۲ -	محمد موسیٰ	سوم
۶۳ -	سید محمد عارف	سوم
۶۴ -	محمد خواجہ	سوم
۶۵ -	کیپٹن حبیب حسین	اول
۶۶ -	شیر محمد خاں	دوم
۶۷ -	سید احمد عطاس	سوم
۶۸ -	عبداللہ قریشی	سوم
۷۰ -	محمد باکوبن	سوم
۷۱ -	عبداللہ بالاصبع	دوم

مرکز بلولی

۷۳ -	مرزا قاسم بیگ	سوم

مرکز بمبئی (اناث)

۷۵ -	منیرہ قانم	اول

مرکز ٹاکلی جاگیر

۷۸ -	محمد سراج الدین	سوم

مرکز [illegible]

[illegible]	[illegible]	دوم
[illegible]	[illegible]	سوم
[illegible]	محمد عبد الکریم ہزاری	دوم
۸۹-	محمد عبد الرشید	دوم
۹۰-	محمد عزیز الدین	دوم

مرکز کوڑنگل

۹۱-	محمد صدیق صدیقی	سوم
۹۲-	محمد عبد الحمید	سوم
۹۴-	منور بی	دوم
۹۹-	فضیلت النسا بیگم	سوم

مرکز گدوال

۱۰۱-	سید نور الدین	سوم

مرکز میسور اسٹیٹ

۱۲۲-	سید عبد الرزاق	سوم
۱۲۳-	محی الدین شریف	دوم
۱۲۴-	محمد نذیر احمد	سوم
۱۲۶-	سید محمد	دوم
۱۲۷-	ایم غوث محی الدین	سوم
۱۲۸-	کے عبد الوہاب خاں	دوم
۱۳۳	طاہر النساء بیگم	دوم

مرکز ناگر کرنول

۱۳۰-	محمد عبد الوہاب	دوم

مرکز نظام آباد

۱۴۲-	نظام محی الدین انصاری	سوم
۱۴۰-	محمد نذیر احمد عشرت	دوم
۱۴۸	محمد حبیب الدین احمد منصور	دوم

امتحان اُردو دانی دوم

۱۹۴۵ء کا دوسرا امتحان اردو دانی بتاریخ ۹، ۱۰ دسمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۹ بہمن ۱۳۵۵ف حسب ذیل مرکزوں میں منعقد ہوا:- بلدہ (فوج) بلدہ (ذکور) بلدہ (اناث) بمبئی، دوم کنڈہ، نظام آباد، ناگر کرنول -

ادارے کی طرف سے حسب ذیل علم دوست اصحاب بحیثیت صدر نگران کار تشریف لے گئے تھے جنہوں نے تاریخ اور وقت مقررہ پر امیدواروں کا امتحان لیا

نواب غازی الدین احمد صاحب (بمبئی) نواب باقر علی خاں صاحب (دوم کنڈہ) مولوی مظہر الدین صاحب (نظام آباد) مولوی [illegible] الدین صاحب (ناگر کرنول) مرکز فوج اور مرکز بلدہ کے امیدواروں کی نشستوں کا انتظام نظام کالج میں کیا گیا تھا۔ زنانہ مرکز حسب سابق زنانہ ہائی اسکول نام پلی قرار دیا۔

نظام کالج کے امتحان گاہ کے صدر نگران کار پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی تھے۔ صاحب موصوف کی نگرانی میں تحریری اور زبانی امتحانات لئے گئے۔ امتحان گاہ کی نگرانی اور زبانی امتحان میں حسب ذیل اصحاب نے مدد فرمائی -

پروفیسر سید محمد صاحب، مولوی عبد الحفیظ صاحب صدیقی ایم ایس ایم، مولوی عبد الحفیظ صاحب تبسّل ایم اے - مولوی عبد الرحمٰن شریف صاحب، مولوی اظہر [illegible] صاحب مولوی مرزا ضیاء الحق صاحب وکیل - زنانہ مرکز کی نگرانی محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ، محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر اور مس بشیر النساء نے فرمائی -

ادارہ ان جملہ خواتین و اصحاب کا شکریہ خاص طور پر ادا کرتا ہے جنہوں نے اپنا قیمتی وقت ادارے کے [illegible]

عملی کام کے لئے دے کر امتحان گاہ کی نگرانی کی زحمت اٹھائی۔

مرکز نظام آباد | ۱۰ ڈسمبر ۱۹۴۵ء یوم سہ شنبہ سہ پہر کو روانہ ہو کر رات میں سوا نو بجے نظام آباد پہنچا۔ اسٹیشن پر مولوی محمد حسین خاں صاحب معتمد شاخ نظام آباد موجود تھے۔ صاحب ممدوح نے میرے قیام و طعام کا انتظام اپنے گھر پر نہایت ہی فراخدلی و سلیقہ کے ساتھ کر کے میرا ہر طرح خیال رکھا جس کا میں دل سے ممنون ہوں۔

امتحان گاہ کے انتظامات قبل از قبل مدرسہ فوقانیہ میں نہایت عمدگی سے عمل میں لائے گئے تھے۔ ڈرائنگ ہال میں ذکور اور اسی سے متصل ایک وسیع کمرہ میں اناث کی نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ امتحان ۹ ڈسمبر ۱۹۴۵ء کو وقت مقررہ پر شروع ہوا اور دوپہر میں زبانی امتحان ٹھیک ۲ بجے سے شروع ہو کر پانچ بجے اختتام کو پہنچا۔ ذکور میں منجملہ (۳۱) امیدواروں کے (۲۲) امیدواروں نے شرکت کی اور اناث میں منجملہ (۳۵) طالبات کے (۳۰) حاضر تھیں۔

صاحبزادہ میر احمد علی خاں صاحب مہتمم تعلیمات نظام آباد و میر مجلس ادارۂ ادبیات اردو شاخ نظام آباد کی ادب نوازی اس بات کا یقین دلا رہی ہے کہ جناب والا کی سرپرستی ادارہ کے لئے ایک فال نیک ہے۔

مولوی سید انیس الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ نظام آباد بہت زیادہ شکریہ کے مستحق ہیں کہ جناب والا کی عنایت اور مہربانی سے مدرسہ کی وسیع عمارت اور امتحانی ضروریات کی جملہ چیزیں میسر آ سکیں۔

مولوی محمد حسین خاں صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ قلعہ اس شاخ کے معتمد ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے انتہائی مسرت ہوتی ہے کہ صاحب موصوف ادارہ کے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ خلوص و ایثار اور بلا تفریق مذہب و ملت طلبہ کی تعلیم کا انتظام فرما کر شریک امتحان کراتے ہیں۔ اس کے لئے وہ ہر طرح لائق مبارکباد ہیں۔ اگر ادارہ کی باگ ڈور چند ایسے ہی مخلص کارکنوں کے ہاتھوں رہے تو قدم قدم پر کامیابی یقینی ہے۔

مولوی غلام احمد صاحب وکیل کا نظامی نگرانی فرماتے ہوئے زبانی امتحان کے وقت بڑی مدد فرمائی۔ [illegible] کی خدمتگزاری اور ذوق ادب یہ [illegible] بڑھتے ہوئے ہیں۔ یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ مولانا موصوف کی سعی سے امیدواروں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مسٹر کاشی ناتھ راؤ کمپال کر وکیل ہائی کورٹ ادارہ کے مخلص معاون ہونے کے علاوہ نادار طلبہ کی اعانت سے دریغ نہیں فرماتے۔ وکیل صاحب کا یہ ایثار قابل تقلید ہے۔

مولوی محمود عالم صاحب ستالک مدرس مدرسہ تحتانیہ پھیلانگ و مولوی عبدالواحد صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ قلعہ نے ہر دو پرچوں میں نگرانی فرماتے ہوئے ہر موقع پر میری مدد فرمائی جس کا دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالغنی صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ پالم نے بھی معہ دو امیدواروں کے امتحان گاہ تک آنے کی زحمت کی۔ امید ہے کہ آئندہ زیادہ سے زیادہ امیدوار متعدد امتحانوں میں شریک کروا کر ادارہ کو شکریہ کا موقع دیں گے۔

مولوی محمود علی خاں صاحب محمود نے مرکز کے ضروری انتظامات میں غیر معمولی دلچسپی لے کر اپنے خلوص کا اظہار فرمایا و نیز صاحب موصوف کے محبت آمیز سلوک کو جو شروع سے آخر تک میرے ساتھ روا رکھا گیا میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔

طبقہ اناث کی صدر نگران کار جناب صفیہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ وسطانیہ نسواں نے باوجود اپنے خانگی مصروفیات کے محض ادارہ کے امتحان کی خاطر تجربہ کر غیر معمولی دلچسپی لی جس کا دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

جناب حلیمہ بائی صاحبہ نے اگرچہ کہ یہ مرہٹی داں ہیں لیکن اردو ادب کی طرف ان کا زیادہ میلان پایا جاتا ہے۔ موصوفہ نے بھی صدر معلمہ صاحبہ کا ہاتھ بٹایا اور ہمیں شکریہ کا موقع دیا۔

مظہر [illegible]

مرکز کرنول [illegible] ہو اسٹیشن [illegible] بذریعہ موٹر بس مرکز کرنول پہونچا۔ وہاں معزز سرپرست ادارہ مولوی سید عارف الدین حسن صاحب [illegible] میری آمد کے منتظر تھے۔ میرے قیام وطعام [illegible] وغیرہ تک معزز سرپرست ادارہ نے [illegible] دولت کدہ پر فرمایا تھا۔ سرپرست صاحب کی [illegible] دلچسپی کی وجہ امتحان گاہ کا انتظام بہترین تھا۔ امیدواروں کی نشستیں بہت ہی اصولی طریقہ پر تھیں۔

امتحان اردو دانی کا آغاز ہوا۔ طبقۂ ذکور کے (۲۹) امیدواروں میں سے (۲۳) شریک امتحان تھے۔ تحریری پرچہ ختم ہونے کے بعد زبانی امتحان میں نے خود لے کر نمبرات دئے۔

طبقۂ اناث کی (۷) امیدواروں میں سے (۵) شریک امتحان تھیں جن کا زبانی امتحان اور زنانہ مرکز کی نگرانی محترمہ اہلیہ عبدالحمید صاحب ڈاکٹر حیوانات نے کی۔

جن مقامی عہدہ داروں نے شاخ کی سرگرمیوں میں دلچسپی لی اور ادارہ کی قدر ومنزلت بڑھانے میں اپنے عزیز وقت کو آغاز امتحان سے آخر وقت تک صرف فرمایا اور ضروری انتظامات اور کاروبار امتحان میں شاخ کی اعانت فرمائی ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مولوی عبدالحفیظ صاحب مددگار مہتمم پولیس
۲۔ ” مظہر الحق صاحب تحصیل دار
۳۔ ” حبیب الرحمٰن صاحب بی۔ سی۔ او
۴۔ ” غلام محی الدین صاحب انسپکٹر انجمن امداد باہمی
۵۔ ” عبدالحمید صاحب ڈاکٹر حیوانات

معزز سرپرست ادارہ جہاں بھی رہتے اردو زبان کی اشاعت اور ترویج میں سعیٔ بلیغ فرماتے رہے اور اس وقت مقامی ادارہ نے جو بھی ترقی کی وہ معزز سرپرست کی انتہائی دلچسپی ایثار اور جوش عمل کا نتیجہ ہے۔ ایسے مخلص اور با اثر حضرات کی وجہ یقیناً ادارہ کو تقویت پہونچے گی۔

ظہیر الدین احمد

مرکز دوم کنڈہ سمستان دوم کنڈہ میں ادارۂ ادبیات اردو کا یہ دوسرا سال ہے اس عرصہ میں یہاں تین مرتبہ مرکز کا قیام عمل میں آیا اور مجھے دو مرتبہ بحیثیت صدر نگران کار جانے کا اتفاق ہوا۔

اس مرتبہ میں نے دوم کنڈہ میں غیر معمولی انقلاب محسوس کیا وہ یہ کہ یہاں کے بسنے والوں میں سے عموماً ہر شخص کے دل میں اردو تعلیم کے حصول کا شوق موج زن ہے۔

مجھے اکثر امیدواروں سے گفتگو کا موقع ملا۔ بہت ہی سلجھے ہوئے پیرایہ کے ساتھ سلیس اردو زبان میں آئندہ کے لئے اپنے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھنے کے علاوہ انھوں نے ادارہ کی خدمت کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

عام طور پر بلا لحاظ پیشہ و عمر ہر شخص کے خیالات میں اس قسم کا بڑھتا ہوا شوق ادارہ کی کامیابی کا بین ثبوت ہے۔ بہرکیف اس لہلہاتے ہوئے باغ اردو کی یہ پرزور ترقی حضرت زورؔ کے لئے مبارک ہو۔ بالخصوص دوم کنڈہ میں ادارہ کی یہ نمایاں ترقی جناب مولوی سید غوث صاحب ڈویژن افسر و نیز مسٹر لکشمی نارائن راؤ کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

اغراض و مقاصد ادارہ سے دلچسپی وشغف رکھنے والے ایسے ہی حضرات اگر دوسرے اضلاع اور تعلقات و قصبات وغیرہ کے لئے دستیاب ہوجائیں تو

خدمت تو قع بلکہ یقین کامل ہے کہ اس آفتاب ادارۂ
ادبیات اردو کی شعاعیں ارض مملکت ابدمدت کے کناروں
کو بھی جلد سے جلد منور کردیں گی۔

اردو عالم و فاضل کی تعلیم کے لئے اساتذہ
کی فراہمی وغیرہ کا مسئلہ فوری توجہ کا محتاج ہے
تاکہ ان امتحانات میں بھی طلبہ کافی تعداد میں
شریک ہوسکیں۔

میں بتاریخ ۸ر ڈسمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۵ بہمن ۱۳۵۵ف
یوم شنبہ بوقت تین بجکر بیس منٹ روز بلدہ
سے روانہ ہوکر اسٹیشن تلمنڈلہ پر شب کے آٹھ بجے
پہونچا۔ اسٹیشن پر جناب لکشمی نارائن راؤ صاحب
منتظر تھے۔ موصوف کے ہمراہ کھاچر کے ذریعہ
مرکز دوم کنڈہ کو رات کے گیارہ بجے پہونچا۔

دوسرے روز یعنی ۹ر ڈسمبر ۱۹۴۵ء کو بوقت
ساڑھے نو بجے امتحان گاہ پہونچا۔ صاحب موصوف
نے نشستوں کا نہایت معقول انتظام فرمایا تھا۔ میں نے
پہلا تحریری پرچہ گیارہ بجے امیدواروں میں تقسیم کردیا
جو ایک بجے ختم ہوا

دوسرا زبانی پرچہ دو بجے سے شروع کیا گیا
جو شام کے پانچ بجے ختم ہوا۔

جملہ چونتیس امیدواروں میں سے اکتیس حاضر
تھے جن میں ایک بی بی سوشیلا بائی بھی شریک امتحان
تھیں۔ پرچہ جات سربمہر لفافہ میں محفوظ کئے جاکر
روانہ خدمت کئے جاچکے ہیں۔ براہ کرم اس کا اطمینان
فرمالیا جائے۔

جناب لکشمی نارائن راؤ صاحب کا میں ممنون
ہوں کہ موصوف کے قابل ستائش اخلاق کی وجہ
سے قیام وغیرہ میں مجھ کو انتہائی آرام ملا۔

میر باقر علی خاں

شاخوں کے قاعدے اور [illegible]

(۱) حیدرآباد سے باہر اگر کسی مقام کے اہل [illegible]
اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت کی [illegible]
کوشش کرنا چاہتے ہوں تو ادارۂ ادبیات اردو [illegible]
کے نام پانچ علم دوست اصحاب کے دستخطوں [illegible]
خط روانہ فرمائیں تاکہ قیام شاخ کے لئے اجازت [illegible]
بھیجا جائے۔ اس فارم کو بعد خانہ پری واپس کرنے پر
معتمد صاحب مذکور ادارہ کی مجلس انتظامی سے منظوری
حاصل کرکے قیام شاخ کی اطلاع دیں گے اور اس سلسلہ
میں ضروری کارروائی کریں گے۔

(ادارے کی شاخوں کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں)

۱۔ ادارہ کے اردو امتحانات کا چرچا کرنا۔

۲۔ امتحان اردو دانی کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کرنا۔

۳۔ اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات کی تعلیم
کے لئے معاوضہ کے ساتھ انتظام کرنا۔

۴۔ اردو مطالعہ خانہ قایم کرنا۔

۵۔ سب رس کے لئے قلمی معاون اور خریدار فراہم کرنا۔

۶۔ ادارہ کے قواعد کے تحت اپنے ارکان بنانا اور
جمع شدہ رقم میں سے نصف صدر ادارہ کو روانہ کرنا اور
نصف سے اپنی شاخ اور مطالعہ خانہ کے اخراجات کا
انتظام کرنا۔

۷۔ شاخیں سب رس کے جو خریدار فراہم کریں گی
ان کے چندے کا ایک چوتھائی حصہ ادارے کی جانب
سے بطور امداد اخراجات و رسائل کی صورت میں شاخ
کو دیا جائے گا۔

۸۔ ہر شاخ کے دارالمطالعہ کے لئے ادارے کی
تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ نصف قیمت پر دیا جائے گا اور
شاخوں کی کوشش سے جس قدر مطبوعات فروخت ہوں گی ان پر
۲۵ فیصد کمیشن شاخوں کو دیا جائے گا۔

۹۔ ان کے علاوہ شاخوں کے مزید قواعد و ضوابط [illegible]
جو ادارۂ ادبیات اردو کے مطبوعہ کتابچے [illegible]

ادارہ کی مطبوعات دوسروں کی نظر میں

اشوک اعظم :-

بچوں کے لئے یوں تو ہر صوبے سے کتابیں
شائع ہوتی ہیں اور ان میں تعلیمی پہلو بھی خاصا نمایاں
ہوتا ہے لیکن صحیح معنوں میں جو کام حیدرآباد نے
کیا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔
یہ سلسلہ جہاں بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھتا ہے
وہاں ان کی تعلیم اور تاریخی واقفیت کو ترقی دینے میں
تمام دوسرے صوبوں کے ادب پر سبقت لے گیا ہے۔
اشوک اعظم ہندوستان کی تاریخ میں ایک بہت
ممتاز اور زندۂ جاوید حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی
زندگی اور حکومت کے واقعات بہت آسان اور
شستہ زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ
والدین اور اسکولوں کے لائبریرین اس کتاب کی
سرپرستی قبول فرمائیں گے۔ صفحات ۴۸ قیمت ۱۰ر

ہمایوں لاہور۔ جولائی ۱۹۴۵ء

اشوک اعظم کے نام سے ہندوستان کا
ہر تعلیم یافتہ شخص بخوبی واقف ہے۔ اشوک کے
کتبے اور فرامین مشہور ہیں جو اس نے جگہ جگہ پہاڑوں
پر کندہ کرائے تھے۔ اس رسالہ میں جو سیدہ
مہدی جعفری حیدرآبادی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔
اشوک اعظم کے آباء و اجداد، اس کے طریقۂ حکومت،
مذہبی تبلیغ و اشاعت، فرامین، کتبہ جات، نظم و نسق،
عمارات وغیرہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور
خوب لکھی گئی ہے جس سے بڑے بھی مستفید ہو سکتے
ہیں۔ کتاب کی عبارت سلیس اور عام فہم ہے۔

زمانہ۔ کانپور۔ اگست ۱۹۴۵ء

حیدرآباد :-

حیدرآباد کی تاریخ اور جغرافیائی نوعیت پر
تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بچوں کو
حیدرآباد کے بارے میں مفصل معلومات حاصل
کرنے کے لئے یہ کتابچہ بہت مفید ثابت ہوگا۔
قیمت ۱۰ر

ہمایوں۔ لاہور۔ جولائی ۱۹۴۵ء

یہ چھوٹی سی کتاب ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن
کے مطبوعات کی چودھویں اور ادارۂ مذکور کے شعبۂ
ادبیات اطفال کے سلسلہ کی پانچویں کڑی ہے جس
میں ایک ہونہار خاتون رفیعہ سلطانہ (متعلمہ بی اے
عثمانیہ) نے بچوں کو ریاست حیدرآباد دکن اور اس کے
متعلقات کی نہایت آسان اور سلیس زبان میں سیر
کرائی ہے۔ یہ کتاب کیا ہے گویا ریاست حیدرآباد دکن
کی مختصر تاریخ اور جغرافیہ ہے جس میں ریاست کی
صنعت و حرفت، پیداوار، طرز معاشرت وغیرہ پر بہت
عمدگی اور خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔
یہ چھوٹی سی کتاب اس قابل ہے کہ اس کے نمونے پر
ہندوستان کے دوسرے ممالک میں بھی بچوں کے
لئے درسی کتابیں لکھی جائیں۔ ہم اس عمدہ تصنیف
پر مصنفہ کو مبارکباد کی مستحق سمجھتے ہیں۔

زمانہ۔ کانپور۔ اگست ۱۹۴۵ء

سرگزشت حاتم :-

شاہ ظہور الدین حاتم اردو کے ان قدیم شعراء
میں سے ہیں جنھوں نے ولی دکھنی کے تتبع میں مستقلاً
اردو شاعری کی اور اس کو پروان چڑھایا اور
اپنے بعد شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ چھوڑ گئے۔
جنھوں نے اردو شاعری کی انگلی پکڑ کر اسے اور
آگے بڑھایا۔ زور صاحب نے اس کتاب میں آپ
ہی کے حالات و سوانح خصوصیات کلام اور بعض

اور مختلف مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔ طرز گفتگو محققانہ ہے۔ مولانا آزاد کے بیانات پر اس ذیل میں خاص تنقید ہوگئی ہے۔ مرحوم حاتم کا مجموعۂ کلام "دیوان زادہ" بھی ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام طبع ہو رہا ہے۔ دیوان زادہ کے ساتھ سرگزشت حاتم کا مطالعہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کے طالب علم کے لئے بہت مفید و سودمند ثابت ہوگا۔

برہان۔ دہلی۔ بابت جون ۱۹۴۵ء

معلم بالغاں :-

کچھ دن ہوئے نواب مہدی یار جنگ بہادر دارالمہام صیغہ تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن نے پبلک میں تعلیم بالغاں سے دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے اسی موضوع پر عمدہ اور بہترین مقالات لکھنے والے حضرات کے لئے انعامات کا اعلان کیا تھا۔ سید زاہد حسین صاحب ایم اے (عثمانیہ) ہیڈ ماسٹر مدرسۂ وسطانیہ مشقی عثمانیہ ٹریننگ کالج نے بھی ایک مقالہ قلم بند فرمایا تھا جس پر فاضل مصنف کو اول انعام عطا ہوا تھا۔ بعد میں اسی مقالہ میں اضافہ کرکے اس کو "معلم بالغاں" کے نام سے کتابی صورت میں شایع کیا گیا اور واقعی یہ کتاب اپنے موضوع پر کافی غور و فکر کے بعد لکھی گئی ہے۔ بالغوں کا پڑھانا بھی ایک خاص فن ہے جو اس فن میں مہارت نہیں رکھتا وہ عموماً اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں بالغوں کو تعلیم دینے کے خاص اصول بتائے گئے ہیں۔ کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

زمانہ۔ کانپور۔ اگست ۱۹۴۵ء

یورپ جنگ سے پہلے :-

۱۹۳۸ء میں یعنی جنگ سے پہلے سوئزرلینڈ کے شہر زیورخ میں ایک بین الاقوامی [illegible] منعقد ہوئی تھی جس کے لئے کتاب [illegible] مصنف مسٹر ہارون خاں شروانی نے "[illegible]" کے عنوان سے ایک اس قدر [illegible] لکھا تھا کہ اسے مبصرین و ماہرین فن نے [illegible] دیکھا اور اس کا کانگریس میں پڑھا جانا [illegible] چنانچہ فاضل مصنف نے کانگریس مذکور میں شرکت کرنے کے علاوہ مشرقی، جنوبی و مغربی یورپ کے اکثر ممالک کی سیر کرکے اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ہندوستان واپس ہوئے۔ اس قلیل مدت میں فاضل مصنف نے سواحل عرب، اطالیہ، بحیرہ ایڈریاٹک، [illegible] استنبول یا قسطنطنیہ، ایڈریانوپل یا ادرنہ، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، فرانس، انگلستان، سوئزرلینڈ وغیرہ کے اکثر مقامات کی سیر و سیاحت میں جن باتوں سے [illegible] متاثر ہوئے وہ آپ نے اس مختصر سفرنامے میں بہت عجیب پیرائے میں درج کردئے ہیں۔ سفرنامہ کا وہ حصہ جو سواحل عرب، استنبول، بلغاریہ، یوگوسلافیہ سے تعلق رکھتا ہے مسلمانوں کے لئے اور بقیہ سفرنامہ عام ہندوستانیوں کے لئے خاص دلچسپی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ حالات سے متاثر ہوکر آپ نے جگہ جگہ ایسے ریمارک بھی کئے ہیں جو نہ صرف عبرت انگیز بلکہ سبق آموز بھی ہیں۔ سوئزرلینڈ وسطی یورپ میں ایک چھوٹا سا کوہستانی ملک ہے جو بلحاظ سلسلۂ مواصلات اور قدرتی وسائل و ذرائع دولت ہندوستان کے مقابلہ میں کچھ بھی وقعت نہیں رکھتا لیکن جن طریقوں سے وہاں کے لوگ حصول معاش اور زندگی بسر کرتے ہیں ان سے ہم ہندوستانیوں کو ضرور سبق لینا چاہئے۔

اس سفرنامے کا پیرایۂ بیان دلچسپ اور طرز نگارش حلاوت انگیز، اخذ کردہ نتائج سبق آموز اور زبان سلیس و عام فہم ہے۔

[illegible] بند سعید کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف نے لفظ "[illegible]" استعمال کیا ہے جو انگریزی لفظ میٹروپولٹن Metropolitan کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بہت خوب [illegible] بلکہ تعریف سے مستغنی ہے۔ کتاب میں گیارہ ہاف ٹون تصویریں بھی دی گئی ہیں جن سے کتاب کی معنوی و صوری حیثیت [illegible]

مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
من کی بہتا	۸۰	•	۸	•
سرگزشت غالب	۶۴	•	۸	•
نظام الملک	۴۰	•	۴	•
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	•
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر) ...	۱۶۰	۱	•	•
ارمغان جذب	۱۲۰	۱	۱۲	•
یورپ جنگ سے پہلے ...	۴۱۸	۲	۸	•
تاریخ سیاسیات	۲۷۲	۳	۸	•
سرسالار جنگ	۴۸	•	۶	•
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴	•
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	•
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	•
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	•	•
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	•
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	•
دادا بھائی	۱۶	•	۲	•
اردو نامہ	۲۰۰	۲	•	•
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	•	•
عماد الملک	۴۰	•	۶	•
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	•	۵	•
دوسری کتاب ...	۵۶	•	۵	•
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	•	•
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	•
فن تقریر	۹۲	•	۸	•
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	•	•
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸	•
پودوں کی کہانی	۸۰	•	•	•
مرلقا	••	۱	•	•
پانی کی کہانی	۴۸	•	۶	•
رسایل طیبہ	۳۱۲	۳	۸	•
سلک گوہریں	۴۰	•	۴	•
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	•	۸	•
رفیق اردو داں	۲۲۴	۱	۱۲	•
آشوب	۵۹	۱	۸	•
حیدرآباد	۸۹	•	•۱	•
شاد اقبال	۱۷۹	۳	۸	•
آریائی زبانیں	۱۰۴	۱	•	•
نظام علی خاں	۳۲	•	۴	•
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	•	•
عرب اور عربستان	۵۶	•	۱۰	•

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
سچ کا جادو	۴۸	•	۳	•
طبیعیاتی کائنات	۹۸	•	۸	•
متاع سخن	۱۳۴	•	۱۲	•
کیف سخن	۱۲۲	•	۱۲	•
بادہ سخن	۱۲۷	•	۱۲	•
سراج سخن	۱۵۲	•	۱۲	•
ایمان سخن	۱۲۰	•	۱۲	•
فیض سخن	۱۴۴	•	۱۲	•
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	•	•
دوم (۵۰)	۴۳۲	۵	•	•
نقد سخن	۱۷۵	۱	•	•
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	•
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	•	•
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	•	•
من کی دنیا	۱۴۵	۱	•	•
مدراس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	•
محرم نامہ	۱۱۲	۱	•	•
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	•
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	•
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	•
دفتری معلومات	۵۶	•	۶	•
آبدوزکشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	•	۶	•
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	•
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	•
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	•	۱۲	•
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	•
بلقان	۳۲	•	۳	•
خطابات	۱۱۳	•	۱۲	•
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	•	•
چیونٹی (۱۶) تصاویر ...	۸۰	•	۱۲	•
انوار	۱۶۸	۱	۸	•
کشمش نانی (۴) تصاویر ...	۸۰	•	۱۰	•
گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	•
رات کا بھولا	۱۶۵	۱	۴	•
سید جاہ	۲۴	•	۴	•
بلاغت	۵۹	•	۱۰	•
ادارہ سفر ۱۹۴۳ء میں ...	۲۰۰	•	۸	•
ناصر الدولہ	۳۲	•	۴	•
افضل الدولہ	۳۲	•	۴	•
نواب میر محبوب علی خاں	۳۴	•	[illegible]	•

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن